

کلیاتِ لطیف

پطرس بخاری

مترجم
نواز چوہدری

مکتبہ شعروادب ○ سمن آباد ○ لاہور

جملہ حقوق محفوظ

ناشر..... نواز چوہدری
مطبع..... نادر اڈرز پرنٹرز لاہور
قیمت..... = / ۱۵۰ روپے

پطرس کے مضامین

اے۔ ایس۔ بخاری

بی۔ س۔ اے (کنیٹب) ایم۔ اے پریسل گورنمنٹ کالج لاہور

سابق ڈائریکٹر جنرل براڈ کاسٹنگ

اظہار عقیدہ

میں اپنے استاد محترم پروفیسر مرزا محمد سعید صاحب
دہلوی کا ممنون ہوں۔ جنہوں نے اس کتاب پر نظر ثانی کی اور اسے
بعض لغز تشویش سے پاک کیا۔
نہیں اس بات پر فخر کرتا ہوں کہ مجھے اب بھی ان سے
سنیض تلمذ حاصل ہے۔

پطرس

ذیباچہ

اگر یہ کتاب آپ کو کسی نے مفت بھیجی ہے تو مجھ پر احسان کیا ہے اگر آپ نے کہیں سے چرائی ہے تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں اپنے پیوں سے خریدی ہے تو مجھے آپ سے مدد دی ہے اب بہتر یہی ہے کہ آپ اس کتاب کو اچھا سمجھ کر اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت کریں ان مضامین کے افراد سب خیالی ہیں حتیٰ کہ جن کے لیے وقتاً فوقتاً واحد متکلم کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے وہ بھی ہر چند کہیں کہ میں نہیں ہیں آپ تو اس نکتے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں لیکن کئی پڑھنے والے ایسے بھی ہیں جنہوں نے اس سے پہلے کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی ان کی غلط فہمی اگر دور ہو جائے تو کیا حرج ہے۔

جو صاحب اس کتاب کو کسی غیر ملکی زبان میں ترجمہ کرنا چاہیں پہلے اس ملک کے لوگوں سے اجازت حاصل کر لیں۔

فہرست مضامین

ہاسٹل میں پڑھنا
سویرے جو کل آنکھ میری کھلی
کھتے

اردو کی آخری کتاب
میں ایک میاں ہوں
مرید پور کا پیر
انجام بخیر
سینما کا عشق
میبیل اور میں
مرحوم کی یاد میں
لاہور کا جغرافیہ

ہاسٹل میں پڑھنا

ہم نے کالج میں تعلیم تو ضرور پائی اور رفتہ رفتہ جی اے بھی پاس کر لیا، لیکن اس نصف صدی کے فقدان میں جو کالج میں گزارنی پڑی، ہاسٹل میں داخل ہونے کی بہانہ تھی صوف ایک ہی مرتبہ ملی۔

خدا کا فیصل ہم پر کب اور کس طرح ہوا؟ یہ سوال ایک داستان کا محتاج ہے

جب ہم نے انٹرس پاس کیا تو قاضی اسکولوں کے ہیٹھا سٹروا جب خاص طور پر ہمارا کہا دوسرے کے لئے آئے تو یہی رشتہ داروں نے دعویٰ میں دیکھ کر محلے والوں میں مٹھالی مٹھالی مٹھی مٹھی اور ہاتھ گھروالوں پر ایک گفت میں بات کا انکشاف ہوا۔ وہ لڑکا جسے آج تک کوٹاہ مٹھی کی وجہ سے ایک بیکار اور تالاقی فرد نہ سمجھتے رہے تھے وہ اصل ماسٹر کا بیٹا تھا۔ کھانا کھانا ہے جس کی نشوونما بے شمار آنسوئی نسلی کی بیسوی کا انحصار ہے پچنانچہ ہماری آئندہ زندگی کے مطابق طرح طرح کی تجویزوں پر غور کیا جانے لگا۔

تھرڈ ڈیڑھ میں پاس ہونے کی وجہ سے انور سٹی کے ہم کو خطیہ دینا سمجھا چونکہ — ہمارا خاندان نے خوراک کے فضل سے آج تک کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے، اس لئے وظیفے کلنا بھی خصوصاً رشتہ داروں کے لئے جو رشتہ کے لحاظ سے خاندان کے معاملات میں بہتے تھے، فرد ہا بات کا باعث بن گیا، اور مرکزی دستہ داروں نے اس کو پاس دینا اور حفظ مراتب سمجھ کر مستحقوں کی شرائط و خواہش کو بے انتہا سزا۔ بہر حال یہ طلبہ خاندان میں ناقابل توجہ پے کی بہتات تھی اس لئے بلا حلف یا بیعت کر لیا گیا کہ نہ صرف ہماری بلکہ ملک و قوم کی اور اپنی نوجوان انسان کی بہتری کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایسے ہونہار طالب علم کی تعلیم جاری رکھی جائے۔

اس بارے میں ہم سے بھی مشورہ لیا گیا۔ عمر بھر میں اس سے پہلے ملک کے کسی معاملے میں ہم سے

راے طلب نہیں کی گئی، لیکن اب تو حالات بہت مختلف تھے، اب تو ایک غیر جانبدار ایمان دار مصنف یونیورسٹی میں ہماری بیلاغزی کی تصدیق کر چکی تھی، اب میں کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ ہمارا مشورہ یہ تھا کہ ہمیں فوراً ولایت بھیج دیا جائے ہم نے مختلف ایڈریسوں کی تقریروں کے حوالے سے یہ ثابت کیا کہ ہندوستان کا طریقہ تعلیم بہت ناقص ہے۔ اخبارات میں سے اشتہارات دکھا دکھا کر یہ واضح کیا کہ تعلیم کے ساتھ فرسٹ کے لمحات میں بہت تھوڑی تھوڑی فیس لے کر بیک وقت جو نلزم، فوٹو گرافی، نفسیہ و تالیف، نڈال سازی، سینک سازی، ایجنٹوں کا کام، غرضیکہ بے شمار مفید و کم خرچ بالانشیہ پیشے کیجے جاسکتے ہیں، اور تھوڑے عرصے کے اندر انسان ہر فن مولانا سکتا ہے۔

لیکن ہماری تجویز کو فوراً رد کر دیا گیا، کیونکہ ولایت بھیجنے کے لئے ہمارے شہر میں کوئی روایات موجود نہ تھیں۔ ہمارے گرد و نواح میں کسی کالرا کا بھی ابھی تک ولایت نہیں گیا تھا۔ اس لئے ہمارے شہر کی پبلک ورلڈ کے حالات سے قطعاً ناواقف تھی، لیکن پھر بھی ہم سے رائے طلب نہ کی گئی اور ہمارے والد بڑھاپا صاحب اور تحصیلدار صاحب ان تینوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں بلاہور بھیج دیا جائے۔ جب ہم نے یغبرنی تو شروع شروع میں بہت سخت مایوسی ہوئی، لیکن جب ادھر ادھر کے لوگوں سے ملا ہو کر حالات سنے تو محظوم ہوا کہ لندن اور لاہور میں چندال فرق نہیں بعض واقف کار دوستوں نے سینما کے حالات پر کشمیری ڈالی اور بعض نے تھیٹروں کے مقاصد سے آگاہ کیا، بعض نے ٹھنڈی سڑک وغیرہ کے مشاغل کو سلجھا کر سمجھایا، بعض نے شاہد سے اور شالامار کی رومان انگیز فضا کا نقشہ کھینچا۔ چنانچہ جب لاہور کا جغرافیہ پوری طرح جان لیا تو ثابت ہوا کہ جو غلطی ہو رہی ہے، اور اعلیٰ درجے کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھروسہ ہے، اس پر ہم نے اپنی زندگی کا پرکھ لیا اور واضح کرنا شروع کر دیا جس میں بڑھنے لکھنے کو جگہ تو ضروری گئی لیکن بیک مناسب حد تک، تاکہ طبیعت پر کوئی جائز بوجھ نہ پڑے، اور فطرت اپنا کام حسن و خوبی کے ساتھ کر سکے۔

لیکن تحصیلدار صاحب اور بڑھاپا صاحب کی نیک نیتی یہ ہے کہ ہمیں تک محدود نہ رہی، مگر صرف ایک عام اور محل سا مشورہ دے دیتے کہ لڑکے کو لاہور بھیج دیا جائے تو بہت خوب تھا، لیکن انہوں نے تو تفصیلات میں دخل دینا شروع کر دیا اور ہاشل کی زندگی اور گھر کی زندگی کا مقابلہ کر کے ہمارے والد صاحب پر یہ ثابت کر دیا کہ گھر کی پاکیزگی اور طہارت کا ایک کعبہ اور ہاشل گناہ و مصیبت کا ایک دوزخ

ہے، ایک تو تھے وہ چرب زبان، اس پر انہوں نے بیشمار غلط بیانیوں سے کما لیا چنانچہ گھروالوں کو یقین ساہر گیا کہ کلج کا ہوشل جو اتم پیشہ اقوام کی ایک بستی ہے۔ جو طلبا باہر کے شہروں سے لاہور جاتے ہیں اگر ان کی پوری طرح نگہداشت نہ کی جائے تو اکثر شراب کے نشے میں چوڑھی نالے میں گمے ہوئے پائے جاتے ہیں یا کسی جوڑے خلعے میں ہزار بارہ سو روپے ہار کھو کھٹی کر لیتے ہیں، یا پھر فرسٹ ایر امتحان پاس کرنے سے پہلے دس بارہ شادیاں کر بیٹھتے ہیں۔

چنانچہ گھروالوں کو سوچنے کی مادت ہو گئی کہ بڑے کو کلج میں داخل کیا جائے، لیکن ہاسٹل میں نہ رکھا جائے۔ کلج ضرور لیکن ہاسٹل ہرگز نہیں، کلج مفید مگر ہاسٹل مضر، وہ بہت ٹھیک مگر یہ نامکن، حسب انہوں نے اپنی زندگی کا نصب العین ہی یہ بنالیا کہ کوئی ایسی تریب سوچی جائے جس سے کلج ہاسٹل کی نذر سے محفوظ رہے۔ تو کسی تریب کا سر جو بھاننا کیا شکل تھا۔ ضرورت آکلنگ ماں ہے۔ چنانچہ از حد غور و خوض کے بعد لاہور میں ہمارے ایک ماموں دیانت کئے گئے اور ان کو ہالا سرپرست بنا دیا گیا۔ میرے دل میں ان کی عزت پیدا کرنے کے لیے بہت سے شجروں کی دستگردانی سے مجھ پر یہ ثابت کیا گیا کہ ناضی میرے ماموں ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ جب میں ایک شیر خوار بچہ تھا تو وہ مجھ سے بے انتہا محبت کیا کرتے تھے

چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ ہم پڑھیں کلج میں، اور میں ماموں کے گھر۔ اس سے تحصیل علم کا جو دلولہ سا ہائے دل میں اٹھرا تھا وہ کچھ بیٹھ سا گیا۔ ہم نے یہ سوچا ماموں صاحب اپنی سرپرستی کے زعم میں والدین سے بھی زیادہ احتیاط برتیں گے جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہمارے حاضری اور روحانی قوی کو پھلے پھولنے کا موقع نہ ملے گا اور تعلیم کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔ چنانچہ وہی ہوا جس کا ہمیں خوف تھا۔ ہم روز بروز مرجھاتے چلے گئے اور سانسے دماغ پر کھپ پھونسی جھنڈی لگی۔ سینا جانے کی کبھی کبھار اجازت مل جاتی تھی، لیکن اس شرط پر کہ بچوں کو بھی ساتھ لیتا ہاؤں۔ اس صحبت میں میں بھلا سینا سے کیا اخذ کر سکتا تھا، تھیرٹر کے معاملے میں ہماری سطوات اندر سجا سے آگے بڑھنے نہ پاتیں، تیرنا ہمیں نہ آیا کیونکہ ہمارے ماموں کا ایک قول ہے کہ ڈو بتاوتی ہے جو تیراک ہو جے تیرنا آتا ہو، وہ پانی میں گھستا ہی نہیں۔ گھر پر آنے جانے والوں کا انتخاب ماموں کے ہاتھ میں تھا۔ کوٹ کتا لبیا پہننا جاتے، اور بال کتنے لمبے رکھے جاتیں ان کے متعلق ہدایت بہت کڑی تھی۔ سفٹے میں دو بار خط لکھنا ضروری تھا مگر ٹیکسٹل خلعے میں چھپ کر پیتے تھے، گانے بجانے کی سخت ممانعت تھی، یہ سپاہیانہ زندگی تھی

لاس نہ آئی، یوں تو دوستوں سے بھی ملاقات مہجانی تھی، سیر کو بھی چلے جاتے تھے، ہنس بول بھی لیتے تھے لیکن زندگی میں جو ایک آزادی، ایک فراخی، ایک سادگی ہونی چاہئے، وہ ہمیں نصیب نہ ہوئی۔ رفتہ رفتہ ہم نے اپنے ساجھول پر غور کرنا شروع کیا کہ ماسوں جان عموماً کس وقت گھر میں ہوتے ہیں، کس وقت باہر جاتے ہیں، کس کمرے کے کس کمرے تک گھومنے کی آواز نہیں سنائی جاسکتی، کس دروازے سے کس کمرے کے کونے میں جھانکنا ناممکن ہے، گھر کا کونسا دروازہ رات کے وقت کھولا جاسکتا ہے کونسا ملازم ناموافق ہے، کونسا نمک مٹل، جب تجربے اور مطالعے سے ان باتوں کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا تو ہم نے اس زندگی میں نشوونما کے لئے چند گھنٹیاں پیدا کر لیں، لیکن پھر بھی مفاہم دیکھتے تھے کہ ہاسٹل میں رہنے والے طلباء کس طرح اپنے پاؤں پر کھڑے زندگی کی شاہراہ پر چل رہے ہیں، ہم ان کی زندگی پر رشک کرنے لگے۔ اپنی زندگی کو شعور دینے کی خواہش روز بروز بڑھتی گئی ہم نے دل سے کہا والدین کی نافرمانی کسی ذریعہ میں جائز نہیں ہے لیکن ان کی خدمت میں درخواست کرنا اپنی ناقص رائے کا اظہار کرنا ان کو صحیح واقعات سے آگاہ کرنا میرا فرض ہے، امدنیالی کوئی طاقت مجھے اپنے فرض کی ادائیگی سے نہیں روک سکتی۔

چند گھنٹوں کی تعطیلات میں میں ملن کو واپس گیا تو چند منٹ بعد جارج اور موٹر تقریریں اپنے ریمانچ میں تیار کر لیں، گھر والوں کو ہاسٹل پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ وہاں کی آزادی نوجوانوں کے لئے اشد خطر ہوتی ہے، اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ہزار واقعات ایسا تصنیف کئے جن سے جوش کے قواعد کی تفسیر ان ہر اچھی طرح روشن ہو جائے۔ سپرٹنڈنٹ کے ظلم و تشدد کی چند مثالیں برقت انگیزہ ذخیرہ پراتے میں شامل ہیں، انھیں بند کر کے ایک آہ بھری اور بیچارے اشفاق کا واقعہ بیان کیا۔ ایک دن شام کے وقت بچا ہاسٹل سے واپس آ رہا تھا۔ چلتے چلتے پاؤں میں موریچ آگئی، وہ سنٹیر سے پہنچا، صرف وہ سنٹیر میں صاحب بس، پھر سپرٹنڈنٹ صاحب نے تار پے کر اس کے والد کو بلوایا، پولیس سے تحقیقات کرانے کو کہا۔ امدینیالی بھر کے لئے اس کا جیب خرچ بند کر دیا تو بہ ہوا ہوا۔ لیکن یہ واقعہ سن کر گھر کے لوگ سپرٹنڈنٹ کے مخالف ہو گئے۔ ہاسٹل کی خوبی ان پر واضح نہ ہوئی، پھر ایک دن موقع پا کر کچھ ایسے محسوس کا واقعہ بیان کیا کہ ایک خوش قسمت اعمال بیچارہ سینا دیکھنے چلا گیا، حضور اس سے یہ ہوا کہ ایک ٹیپے والے درجے میں جانے کی بجائے وہ دو ٹیپے والے درجے میں

چلا گیا۔ پرنی تیزی فضول خرچی پر اسے ٹکڑے کر دینا جانے کی ہدایت ہو گئی ہے۔
 لیکن اس سے بھی گھوٹے سا اثر نہ ہوتے ان کے نزدیک سے میں مجھے فوراً احساس ہوا کہ
 ایک دوسرا دھندلے پے کی بجائے آٹھ آنے اسی ایک دوسرا دھندلے پے تھا
 انہیں ناکاؤ کوششوں میں تیلیات گنگوئیس نے ہم نے پھولوں کی چوکٹ پر آکر سجدہ کیا۔
 اہلی گویوں کی چھٹیوں میں جب ہم پہنچے تو ہم نے ایک نیا ڈھنگ اختیار کیا۔ وہاں تعلیم
 پانے کے بعد ہمارے خیالات میں بھی آگئی تھی پچھلے سال ہاسٹل کی حمایت میں جو مطالب ہم نے پیش کی تھیں
 وہ اب نہایت بوری معلوم ہونے لگی تھیں، اب ہم نے اس موضوع پر ایک ٹیکہ پڑھا کہ جو شخص ہاسٹل کی زندگی
 سے محروم ہوا اس کی شخصیت ناکمل رہ جاتی ہے۔ ہاسٹل سے باہر شخصیت پختہ نہیں ہوتی۔ چند دن تو ہم
 اس پر فلسفیانہ گفتگو کرتے رہے اور ان خیالات کے نقطہ نظر سے اس پر بہت کچھ روشنی ڈالی۔ ہم کو محسوس ہوا
 کہ بغیر ہاسٹل کے کام نہ چلے گا۔ اور جب ہاسٹل کی ذمت آئی تو زور وقت محسوس ہوتی۔ کلچر کے جن طلباء
 کے تعلق میا ایمان تھا کہ وہ زبردستی شخصیتوں کے ملک میں، ان کی زندگی کچھ ایسی تھی کہ والدین کے
 سامنے بطور نمونے کے پیش کی جاسکے، بہت شخص جسے کلچر میں تیس سال کرنے کا موقع ملا ہے جانتا ہے کہ
 والدین کی مفرات کے لئے واقعات کو ایک نئے چہرے پر لے کر بیان کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے
 لیکن اس نئے چہرے کا سوچنا نا اہل اہل اتفاق پر منحصر ہے۔ بعض بلاشبہ خیال بیٹے والدین کو اپنے غیر
 اوصاف کا قائل نہیں کر سکتے اور بعض نالائق سے نالائق طالب علم والدین کو کچھ اس طرح طعنت کرتے ہیں
 کہ بہت بڑے ہوں گے ہم سنی آئندہ پر سنی آؤں گے اور چلا آتا ہے۔

بتاں واں آں چوں روزی روانہ

کہ وانا اندراں حیران مانہ

جب ہم ڈیڑھ بیٹے تک شخصیت ان ہاسٹل کی زندگی پر اس کا مخصوص ان کا نمونہ پر وقتاً فوقتاً اپنے

خیالات کا اظہار کرتے ہے تو ایک دن والد نے پوچھا۔

تمہارا شخصیت سے آخر کیا مطلب ہے؟

میں تو خدا سے یہی چاہتا تھا کہ مجھے عرض ہو کہ میں اس کا نمونہ میں نے کیا۔

تو دیکھتے نا مثلاً ایک طالب علم کے وہ کچھ میں پڑھتا ہے اب ایک تو اس کا دماغ ہے

ایک اس کا جسم ہے۔ جسم و صحت بھی ضروری ہے اور دماغ کی صحت تو ضروری ہے ہی۔ لیکن ان کے علاوہ ایک اور بھی بات ہوتی ہے جس سے آدمی گویا پہچانا جاتا ہے، میں اس کو شخصیت کہتا ہوں اس کا تعلق جسم سے ہوتا ہے نہ صرف دماغ سے ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی کی جسمانی صحت بال خراب ہو اور اس کا دماغ بھی بیکار ہو۔ لیکن پھر بھی اس کی شخصیت مکمل ہو۔ دماغ تو بیکار نہ ہونا چاہئے ورنہ انسان خلی ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر پھر بھی اگر ہو بھی۔ تو بھی۔ گویا شخصیت ایک ایسی چیز ہے۔۔۔ ٹھہرتی ہے جس میں بھی ایک منٹ میں آپ کو بتانا ہوں :-

ایک منٹ کی بجائے والد صاحب نے مجھے آٹھ گھنٹے کی ہولت دی جس کے دوران میں وہ خاموشی کے ساتھ میرے جواب کا انتظار کرتے رہے۔ اسکے بعد میں وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔ تین چار دن کے بعد مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ مجھے شخصیت نہیں سیرت کہنا چاہئے۔ شخصیت ایک بے رنگ سلف ہے، سیرت کے لفظ سے کسی شکستہ بے چہاں میں نے سیرت کو اپنا کلام بنایا۔ لیکن یہ بھی مفید ثابت نہ ہوا۔ والد کہنے لگے کیا سیرت سے تمہارا مطلب چال چلن ہے یا کچھ اور؟

تو گویا دماغی اور جسمانی صحت کے علاوہ چال چلن بھی اچھا ہونا چاہئے؟

میں نے کہا: چال چلن ہی کہہ لیجئے :-

"اور یہ چال چلن ہاشل میں رہنے سے بہت اچھا ہوتا ہے۔"

میں نے نسبتاً نحیف آواز میں کہا جی ہاں۔۔۔

یعنی ہاشل میں رہنے والے طالب علم نماز، نفل کے زیادہ پابند ہوتے ہیں۔ ملک کی زیادہ

خدمت کرتے ہیں، سچ زیادہ بولتے ہیں، نیک زیادہ ہوتے ہیں۔

میں نے کہا: جی ہاں :-

کہنے لگے: وہ کیوں؟

اس سوال کا جواب ایک دفعہ پرنس صاحب نے تقسیم انعامات کے جلسے میں نہایت

وضاحت کے ساتھ بیان کیا تھا۔ کاش میں نے اس وقت توجہ سے سنا ہوتا۔

اس کے بعد سال بھر میں اسوں کے گھوس۔۔۔ زندگی بے توجہیوں کے دن بھی گند

جائیں گے: گاتا رہا۔

ہر سال میری درخواست کلابھی حشر ہوتا رہا۔ لیکن میں نے ہمت نہ باری، بہر حال ناکامی کا سہو دیکھنا پڑتا، لیکن اگلے سال گرمیوں کی چھٹی میں پہلے سے بھی زیادہ شدومہ کے ساتھ تبلیغ کا کام جاری رکھتا، ہر دفعہ نئی نئی دلیلیں پیش کرتا، نئی نئی مثالیں کام میں لانا، جب شخصیت اور صورت والے مضمون سے کام نہ چلا تو اگلے سال ہائل کی زندگی کے انضباط اور باقاعدگی پر غور کیا، اس سے اگلے سال یہ دلیل پیش کی کہ ہائل میں رہنے سے پردہ فیسول کے ساتھ ملنے جلنے کے موقعے زیادہ ملتے رہتے ہیں۔ اور ان بیرون از کلج مطلقاً توں سے انسان پائسا ہو جاتا ہے اس سے اگلے سال یہ طلب یوں ادا کیا کہ ہائل کی آب ہوا بہت اچھی ہوتی ہے، صفاً کافی طور پر خیال رکھا جاتا ہے، کتھیاں اور پتھر مارنے کے لئے کسی مقرر میں۔ اس سے اگلے سال یوں سخن پیرا ہوا کہ جب بڑے بڑے حکام کو حج کو سماندہ کرنے آتے ہیں تو ہائل میں رہنے والے طلباء سے فوٹو فوٹا ہاتھ ملاتے ہیں اس سے روض بڑھتا ہے۔ لیکن جوں زمانہ گزرتا گیا، میری تقریروں میں جوش بڑھتا گیا۔ حقویت کم ہوتی گئی، شروع شروع میں ہائل کے مسئلے پر دلالت سے باتیں کی کرتے تھے، کچھ غصے کے بعد انھوں نے ایک لفظی منکار کا رویہ اختیار کیا، پھر ایک آدھ ماں مجھے ہنس کے ٹالتے رہے، آخر میں یہ نوبت آن پہنچی کہ وہ ہائل کا نام سنتے ہی ایک طنز آمیز قہقہے کے ساتھ مجھے تشریف نہ جانے کا حکم دے رہے تھے۔

ان کے اس سلوک سے آپ یہ اندازہ نہ لگائیے کہ ان کی شفقت کچھ کم ہو گئی تھی، ہرگز نہیں حقیقت صرف اتنی ہی ہے کہ بعض ناوار حادثات کی وجہ سے گھر میں میرا اتنا کچھ کم ہو گیا تھا۔ اتفاق یہ ہوا کہ جب میں نے پہلی مرتبہ بی، اے کا امتحان دیا تو فیل ہو گیا، اگلے سال ایک مرتبہ پھر یہی واقعہ پیش آیا۔ اس کے بعد بھی میں چار دفعہ یہی قصہ ہوا تو گھر والوں نے میری منگولوں میں دلچسپی لینی چھوڑ دی، لیکن میں نے پے در پے فیل ہونے کی وجہ سے میری آنکھوں میں ایک سوز تو ضرور آ گیا تھا لیکن کھانا میں وہ پہلے جیسی شوکت اور میری راستے کی پہلی جیسی وقعت نہیں رہی تھی۔

میں زمانہ طالب علمی کے اس دور کا عمل ذرا تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں کہ یہ کھاس سے آپ میری زندگی کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف ہو جائیں گے، اور اس کے علاوہ پوری سچی

کی بعض بے قاعدگیوں کا راز بھی آپ پر آشکار ہو جائے گا۔

میں پہلے سال بی اے میں کیوں نفل ہوا، اس کا سمجھنا بہت آسان ہے، بات یہ تھی کہ جب ہم نے ایف اے کا امتحان دیا تو چونکہ ہم نے کاغذ خوب دل لگا کر کیا تھا اس لئے ہم کچھ پاس ہی ہو گئے۔ ہر حال نفل نہ ہوئے۔ یونیورسٹی نے یوں تو ہلا ڈاؤن ڈیڑھے اچھے الفاظ میں لیا، لیکن ریاضی کے تعلق سے ایشیا ہوا اور صرف اس ضمن میں امتحان لایا۔ آج کل پھر لے گا۔ ایسے امتحان کو اصطلاحاً کاپاڈنٹ کا امتحان کہا جاتا ہے، شاید اس لئے کہ غیر مضامندی اپنے ہمراہی مسافروں کے گھر اس میں کوئی سفر کر رہے ہوں نقل نویسی کی سخت ممانعت ہے۔

اب ہم جب بی اے میں داخل ہونے لگے تو ہم نے سوچا کہ بی اے میں کیا مشاغل ہیں گے۔ اس طرز سے کاپاڈنٹ کے امتحان کے لئے غلاموں کو نکرنا پڑے گا۔ لیکن ہمیں سب لوگوں نے یہی مشورہ دیا کہ ہم ریاضی مت لوجہ ہم نے اس کی وجہ پوچھی تو کسی نے ہمیں عقل جواب نہیں دیا۔ لیکن جب پرنسپل صاحب نے ہمیں یہ سن لیا تو ہم مضامندی گئے چنا چلے، اے میں چاہے مضامین یا انگریزی تالیف اور تالیف کی قرار پائے۔ ساتھ ساتھ ہم ریاضی کے امتحان کی بھی تیاری کرتے رہے۔ گویا ہم میں کد بجائے پڑھنے اور پڑھنے تھے۔ یہی طرح جو صورت حالات پیدا ہوئی اس کا اندازہ وہ دن لوگ لگا سکتے ہیں جنہیں یونیورسٹی کے استحقاقات کا کافی تجربہ ہے۔ ہائی ٹوت مطالعہ منتہی اور خیالات میں پرائیڈنی پیدا ہونے لگا۔ مگر مجھے چاہیے کہ جاتے وقت میں مضامین پڑھنے اور وقت فی الحال چوتھے مضمون کو دے رہا تھا وہ بات کر ان تینوں مضامین کو دیتا۔

آپ یہ جانتے اس سے بڑا فرق پڑ جائے گا۔ ہرگز نہیں کہ میں وقت میں کو بائٹ لرنڈ یا بلکہ سب کا سب ان تینوں میں سے کسی ایک مضمون کے لئے وقت کر لیا تو کم از کم اس مضمون میں تو وضو پاس ہو جائے گا۔ لیکن جو وہ حالت میں تو وہی ہو گا اور کم تھا جو کہ ہوا۔ یعنی یہ کہ میں کسی مضمون پر کبھی کبھی توجہ نہ کر سکا کہ پرنٹ کے امتحان میں تو پاس ہو گیا لیکن بی اے میں ایک تو انگریزی میں نفل ہوا۔ وہ تو ہونا ہی تھا۔ انگریزی بلکہ اسی زبان میں تھی اس کے علاوہ تاریخ اور فلسفہ میں کو نفل ہو گیا۔ اب آپ یہ سوچنا کہ وقت مجھے کاپاڈنٹ کے امتحان میں ہونے کا پڑا اس کا وہی وہاں ہونے کا تھا بلکہ اس کی بجائے مگر غیرہ بات پہلے ہی عرض کر چکا ہوں۔

فارسی میں کسی ایسے شخص کا خیال ہونا جو ایک علم و دست خاندان کے تعلق رکھتا ہو لوگوں کے لئے خود حیرت کا موجب ہو، اور چچ پوچھے تو ہمیں بھی اس پر سخت ندامت ہوتی۔ لیکن خیر اگلے سال سیندھت واصل گئی اور ہم فارسی میں پاس ہو گئے۔ اس سے اگلے سال تہذیب میں پاس ہو گئے اور اس سے اگلے سال انگریزی میں۔

اب تادمے کی نو سے کہیں بنائے کا مشغول مل جانا چاہئے تھا، لیکن یونیورسٹی کی اس مغلطانہ ضد کا کیا سلطان کہ تینوں مضمونوں میں ایک وقت پاس ہونا ضروری ہے۔ بعض طبائع ایسے ہیں کہ جب تک یکسوئی نہ ہو مطالعہ نہیں کر سکتیں، کیا ضروری ہے کہ ان کے دماغ کو بڑھتی یا کچھری سا بنا دیا جائے

ہم نے ہر سال صرف ایک مضمون پر اپنی تمام تر توجہ دی اور اس میں کامیابی حاصل کی، باقی دو مضمون ہم نے نہیں دیکھے، لیکن ہم نے یہ تو ثابت کر دیا کہ جس مضمون میں ہم چاہیں پاس ہو سکتے ہیں۔

اب تک تو دو مضمونوں میں فیل ہوتے رہے تھے، لیکن اس کے بعد ہم نے تہیہ کر لیا کہ جہاں تک ہو سکے گا اپنے مطالعے کو وسیع کریں گے۔ یونیورسٹی کے بیورو اور بے سنی قواعد کو ہم اپنی مرضی کے مطابق نہیں بنا سکتے تو اپنی طبیعت پر ہی کچھ زور ڈالیں۔ لیکن جتنا غور کیا اسی نتیجے پر پہنچے کہ تین مضمونوں میں بیک وقت پاس ہونا مشکل ہے، پہلے دو میں پاس ہونے کی کوشش کرنی چاہئے چنانچہ ہم پہلے سال انگریزی اور فارسی میں پاس ہو گئے اور دوسرے سال فارسی اور تاریخ میں پاس ہو گئے۔

۱۔ انگریزی۔ تاریخ۔ فارسی۔

۲۔ انگریزی، تاریخ۔

۳۔ انگریزی۔ فارسی۔

۴۔ تاریخ۔ فارسی۔

گویا جن طریقوں سے ہم دو مضامین میں فیل ہو سکتے تھے، وہ ہم نے سب پورے کر دیئے اس کے بعد باقی لے دو مضامین میں فیل ہونا ناممکن ہو گیا اور ایک ایک مضمون میں فیل ہونے کی باری آئی چنانچہ اب ہم نے منہ جذیل نقشے کے مطابق فیل ہونا شروع کیا۔

۵۔ تاریخ میں فیل۔

۶۔ انگریزی میں نفل۔

آئی دفعہ امتحان دے چکنے کے بعد جب ہم نے اپنے تجویزوں کو پڑھا اپنے سامنے دیکھا کہ رفرور کیا تو ثابت ہوا کہ تم کی رات ختم ہونے والی ہے ہم نے دیکھا کہ اب ہمارے نفل ہونے کا وقت آ رہا ہے۔ یہاں پر قبائلی رہ گیا، وہ یہ کہ فارسی میں نفل ہوتا ہے لیکن اس کے بعد تو پاس ہونا لازم ہے۔ ہر چند کہ یہ ساخا زرد جانکا ہو گا لیکن اس میں یہ صلت تو ضرور مضمر ہے کہ اس سے ہیں ایک تم کا ٹیڈ لگ جائے گا بس یہی ایک کسر باقی رہ گئی ہے۔ اس سال فارسی میں نفل ہونے کے اور سہرا لگے سال قلمی پاس ہو جائینگے۔ چنانچہ ساتویں دفعہ امتحان دینے کے بعد ہم بیابانی سے نفل ہونے کا انتظار کرنے لگے، یہ انتظار دراصل نفل ہونے کا انتظار نہ تھا بلکہ اس دفعہ پاس ہونے کا انتظار تھا کہ اس نفل ہونے کے بعد ہم اگلے سال ہمیشہ کے لئے بی لے ہو جائیں گے۔

ہر سال امتحان کے بعد جب گھر آتا تو والدین کو نتیجے کے لئے پہلے ہی سے تیار کر دیتا۔ رفتہ رفتہ نہیں بلکہ یک لخت اور فورا۔ رفتہ رفتہ تیار کرنے سے خواہ مخواہ وقت ضائع ہوتا ہے بڑا پریشانی مفت میں طول کھینچتی ہے، ہمارا قاعدہ یہ تھا کہ جاتے ہی کہہ دیا کرتے تھے کہ اس سال تو کم از کم پاس نہیں ہو سکتے۔ والد کو اکثر یقین نہ آتا۔ ایسے موقع پر طبیعت پر بڑی الجھن ہوتی تھی اچھی طرح معلوم ہوتا ہے میں پرچوں میں کیا لکھ آیا ہوں۔ اچھی طرح جانتا تھا، مسخین لوگ اگر نشے کی حالت میں پرچے نہ دیکھیں تو میرا پاس ہونا قطعاً ناممکن ہے۔ چاہتا ہوں کہ میرے تمام یہی خواہوں کو کبھی اس بات کا یقین ہو جائے تاکہ وقت پر انھیں صدمہ نہ ہو۔ لیکن یہی خواہوں ہیں کہ میری تہا تر تشہیحات کو محض کس نفسی سمجھتے ہیں، ۲۰ سالوں میں والد صاحب کو فورا یقین آجایا کرتا تھا۔ کیونکہ تجربے سے ان پر ثابت ہو چکا کہ میرا اعلا زہ غلط نہیں ہوتا۔ لیکن ادھر ادھر کے لوگ "اجی نہیں" "اجی صاحب کیا کہہ رہے ہو" "اجی یہ کبھی کوئی بات ہے"۔

ایسے فظروں سے ناک میں دم کرتیے۔ بہر حال اب کے گھر پہنچتے ہی ہم نے حسب دستور اپنے نفل ہونے کی پیشین گوئی کر دی۔ دل کو یہ تسلی ہوتی تھی کہ بس یہ آخری دفعہ ہے اگلے سال مشین گوئی کرنے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔

ساتھ ہی یہ خیال آیا کہ وہ ہاسٹل کا قہقہہ پھر شروع کرنا چاہتے اب تو کلج میں صرف ایک سال باقی رہ گیا ہے اب کبھی ہوسٹل میں رہنا نصیب نہ ہو تو عمر بھر گویا آزادی سے محروم رہے۔ گھر سے نکلے تو ماموں کے ڈر بے میں، اور جب ماموں کے ڈر بے سے نکلے تو شاید اپنا ایک کمرہ بنا پاؤں گا۔ آزادی کو ایک سال صرف ایک سال۔ اور یہ آخری موقع ہے۔

آخری درخواست کرنے سے پہلے میں نے تمام ضروری مصالحوں بڑی امتیاط جمع کیا۔ پروفیسروں سے محاسبہ ہمہ پھری کا فخر حاصل تھا، ان کے سامنے نہایت بے تکلفی سے اپنی آندھوں کا اظہار کیا۔ اور ان سے والد کو خط لکھوا سنے تک اگلے سال لڑکے کو آپ ہاسٹل ضرور بھیج دیں، بعض کامیاب طلباء کے والدین سے کبھی اس مضمون کی عرضداشت کھیلا دیں۔ خود اعداد و شمار ثابت کیا کہ یونیورسٹی سے جتنے طلباء پاس ہوتے ہیں ان میں سے اکثر ہوسٹل میں رہتے ہیں اور یونیورسٹی کا کوئی وظیفہ یا تمغہ یا انعام تو کبھی ہاسٹل سے باہر گیا ہی نہیں، میں حیران ہوں کہ یہ دلیل مجھے اس سے پیشتر کبھی کبھی کیوں نہ سوجھی تھی، کیونکہ یہ بہت ہی کارگر ثابت ہوئی۔ والد کا انکار نرم ہوتے ہی غور و خوض میں تبدیل ہو گیا لیکن پھر بھی ان کے دل سے یہ شک رفع نہ ہوا، کہنے لگے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جس لڑکے کو پڑھنے کا شوق ہو وہ ہاسٹل کی بجائے گھر کیوں نہیں پڑھ سکتا۔

میں نے جواب دیا کہ ہاسٹل میں ایک علمی فضا ہوتی ہے جو ارسطو اور افلاطون کے گھر کے سوا اور کسی گھر میں دستیاب نہیں ہو سکتی، ہاسٹل میں جسے دیکھ کر گھر العلوم میں غوطہ زنی ہے، باوجود اس کے باہر ہاسٹل میں دو دو تین تین سولہ کے رہتے ہیں پھر کبھی وہ خاموشی طاری رہتی کہ قبرستان معلوم ہوتا ہے۔ وجہ یہ کہ ہر ایک اپنے اپنے کام میں لگ جاتا ہے۔ شام کے وقت ہاسٹل کے صحن میں جا جا طلباء علمی مباحثوں میں مشغول نظر آتے ہیں۔ علی الصبح ایک طالب علم کتاب ہاتھ میں لے کر ہاسٹل کے صحن میں نظر آتا ہے۔ کھانے کے کمرے میں، کلاس روم میں، غسل خانوں میں، برآمدوں میں، ہیز جگہ لوگ فلسفہ، ریاضی اور تاریخ کی باتیں کرتے ہیں جن کو ادب، انگریزی کا شوق، دو دو رات کو آپس میں شکیپنر کی طرح گفتگو کرتے ہیں۔ ریاضی کے طلباء اپنے ہر ایک خیال کو الجبر میں ادا کرتے کی عادت شمال لیتے ہیں۔ فلسفی کے طلباء ریاضیوں میں تبادلہ خیالات کرتے ہیں، تاریخ کے دلدادہ.....

والد صاحب نے اجازت دے دی۔

اب میں یہ انتظار تھا کہ کب فیل ہوں اور کب اگلے سال کے لئے عرضی بھیجیں۔ اس قدر ان میں ہم نے ان تمام دستوں سے خطوط کتابت کی جن کے متعلق یقین تھا کہ اگلے سال پھر ان کی رفاقت نصیب ہوگی، اور انہیں یہ مزرعہ سنلایا کہ آئندہ سال ہمیشہ کیلئے کلچ کی تاریخ میں یادگار رہے گا، کیونکہ ہم تعلیمی زندگی کا ایک سچے تجربہ اپنے ساتھ لے کر آ رہے ہیں جس سے ہم نئی پود کو مفت مفید فرمائیں گے، اپنے ذہن میں ہم نے ہاشل میں اپنی حیثیت ایک ماہر ماہر کی سی سوچ لی جس کے ارد گرد نا تجربہ کار طلباء مرغی کے بچوں کی طرح بھاگتے پھرتے گئے سہنڈنٹ صاحب جو کسی زمانے میں ہمارے ہم جماعت رہ چکے تھے لگو بھیجا کہ جب ہاشل میں آئیں گے تو فلاں فلاں مراعات کی توقع آپ سے رکھیں گے، اور فلاں فلاں قواعد سے آپ کو مستثنیٰ بھیجیں گے،
اطلاعات عرض ہے۔

اور یہ سب کچھ کر چکنے کے بعد ہاری نصیبی دیکھتے کہ جب نتیجہ نکلا تو ہم پاس ہو گئے۔
ہم پر تو جو ظلم ہوا سو ہوا۔ یونیورسٹی والوں کی حماقت ملاحظہ فرمائیے کہ ہمیں پاس کر کے اپنی آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ ہاتھ سے گنوا بیٹھے۔

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی

گیدڑ کی جب موت آتی ہے تو شہر کی طرف بھاگتا ہے، ہماری جو شامت آتی تو ایک دن اپنے پڑوسی لالہ کرناشنکر جی، بھپاری سے بزیل تذکرہ کہہ بیٹھے کہ لالہ جی امتحان کے دن قریب آتے جاتے ہیں۔ آپ سحر خیز ہیں ذرا، ہمیں بھی صبح جگا دیا کیجئے۔

حضرت نے ہی معلوم ہوتا ہے غفلتوں کے سہو کے بیٹھے تھے، دوسرے دن اٹھتے ہی انہوں نے ایفورا کا نام لے کر ہمارے دوازہ پر پڑنا بازی شروع کی، کچھ دیر تک تو ہم سمجھے کہ عظیم خواب ہے، ابھی سے کیا فکر، جاگیں گے تو سول پڑھیں گے۔ لیکن یہ گولہ باری تیز، لمبو بہ لمبو تیز ہوتی گئی اور صاحب جب کمرے کے چوبی دروازے لڑنے لگے، ہماری پرکھا ہوا اس جلتنگ کی طرح بجنے لگا اور دیوار پر لٹکا ہوا کلٹر پنڈولم کی طرح ہلنے لگا تو بیداری کا قائل ہونا ہی پڑا، مگر اب دوازہ ہے کہ برابر لٹکا ہوا کلٹر پنڈولم کی طرح ہلنے لگا تو بیداری کا قائل ہونا ہی پڑا، مگر اب دوازہ جاگ اٹھی ہوگی۔ بہتیرا آوازیں دیتا ہوں۔ — اچھا اچھا متھنک۔ ٹو۔ — جاگ گیا ہوں۔ — بہت اچھا۔ — لارٹش ہے۔ — آں جناب ہیں کہ سنتے ہی نہیں، خدایا کس آنت کا سامنا ہے۔ — یہ سوتے کو جگا رہے ہیں یا مریے کو جگا رہے ہیں اور حضرت میسٹی بھی تو جس طرحی طور پر ہلکی سی ٹم کو دیا کرتے ہوں گے۔ زندہ ہو گیا تو ہو گیا نہیں تو چھوڑ دیا کوئی مردے کے پیچھے لٹھ لے کر تھوڑی پڑ جاتے تھے، تو میں داغا کرتے تھے تو ہم سے بھلا۔ کیسے ہو سکتا ہے کہ اٹھ کر دوازے کی چٹنی کھول دیتے؟ پشتر اس کے بستر سے باہر نہیں دل کو جس قدر سمجھانا، سمجھانا پڑتا ہے اس کا اندازہ کچھ عالمِ ندق ہی لگا سکتے ہیں۔ آنکھار جب لپ بلیا تو ان کو باہر سے سڑنی نظر آئی اب ہم جو کھڑکی کے پاس پہنچے آسمان کو دیکھتے ہیں تو جناب ستارے جگمگا رہے ہیں، سوچا آج پتہ چلا میں گے۔ — یہ سورج آخر کس طرح

نکلتا ہے۔۔۔ لیکن جب ہم نے گھوم گھوم کر کھڑکی اور درشنندان میں سے دیکھا اور بڑیوں سے صبح کاذب کی حقیقی نشانیاں سنی تھیں، ان میں سے ایک بھی کہیں نظر نہ آئی۔۔۔ تو فکر سا لگ گیا کہ آج کہیں سورج گہن نہ ہو؟ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو پڑوسی کو آواز دی۔

”لالہ جی!“

”لالہ جی!“

”مجااب آیا۔ ہوں۔“

میں نے کہا: ”آج یہ کیا بات ہے کچھ اندھیرا اندھیرا سا ہے۔“

کہنے لگے: ”اور کیا تین بجے ہی سورج نکل آئے؟“

”تین بجے کا ٹائمن کر ہوش گم ہو گئے چونک کر پوچھا، کیا کہا تم نے؟“

”تین بجے میں؟“

کہنے لگے: ”تین۔۔۔ نہیں۔۔۔ کچھ سات، ساڑھے سات منٹ اوپر

ہیں۔۔۔“

میں نے کہا: ”ارے کسخت، خدائی فوج دار بد تمیز کہیں آئے ہیں نے تمکو سے یہ کہا

تھا کہ صبح جگا دینا۔۔۔ یا یہ کہا تھا کہ سر سے سونے ہی نہ دینا۔۔۔ تین بجے

جاگنا بھی کرنی شرافت ہے؟ ہیں تو نے ریلوے گارڈ سمجھ رکھا ہے؟ تین بجے اٹھا کرتے تو

دادا کے منظر نظر نہ ہوئے؟ اے جنت کہیں کے تین بجے اٹھ کر ہم زندہ رکھتے ہیں؟ امیراؤں

کوئی مذاق ہے؟“

”لا حول ولا قوۃ۔“

دل تو چاہتا تھا کہ عدم تشدد کو حیرا باد کہہ دوں، لیکن پھر خیال آیا کہ تیری نوح انسان کی

اصلاح کا ٹھیکہ ہم لے لے رکھا ہے؟ ہیں اپنے کام سے غرض لمب بچایا اور بڑ بڑا تے

ہوئے پھر سو گئے۔

اور پھر سب معمول پہلے آدمیوں کی طرح نہایت المینان سے دس بجے اٹھے، بارہ بجے

تک ہتھ دھوا اور بار بجے پائے پی کر ٹھنڈی سڑک کی سیر کو نکل گئے۔

شام کو واپس ہوٹل میں وارد ہوئے، جوشِ شباب تو ہے ہی، اس پر شام کا زمانہ انگیز
وقت، ہوا بھی نہایت لطیف تھی، طبیعت بھی ذرا مچلی ہوئی تھی۔ ہم ذرا ترنگ میں گالتے ہوئے
کمرے سے داخل ہوئے۔

بہائیں زلفِ جاناں کی اگر لیتے تو ہم لیتے

کساتے میں پڑوسی کی آواز آتی "میسٹر:

ہم اس وقت چکی جانے لگے تھے ہم اٹھتیاں وہیں پر رُک گئیں۔ اسکان آواز کی

طرف لگ گئے، ارشاد ہوا "آپ گار ہے ہیں"

میں نے کہا "اجی میں کس لائق ہوں، لیکن خیر فرمائیے"

یولے "نہا — دہ میں — ڈسٹرب ہوتا ہوں"

بس صاحب، ہم میں جو موسیقیت کی روح پیدا ہو گئی تھی، فوراً مر گئی۔ دل نے کہا

"اونا بکار انسان دیکھ، پڑھنے والے یوں پڑھتے ہیں — صاحب خدا کے حضور میں

گھوگڑا کر دعا مانگی کہ "خدا یا ہم بھی اب باقاعدہ مطالعہ شروع کرنے والے ہیں، ہماری مدد کر

اور ہمیں بہت دے"

آنسو پونچھ کر اور دل مضبوط کر کے میز کے سامنے آ بیٹھے، دانت بکھینچ لئے، نکٹائی کھول

دی، آستین چڑھا لیں — لیکن سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کریں، سامنے سُرُخ، سبز، زرد، سبھی

متم کی کتابوں کا انبار لگا تھا، اب ان میں کونسی پڑھیں، فیصلہ یہ ہوا کہ پہلے کتابوں کو ترتیب

سے میز پر لگادیں کہ باقاعدہ مطالعے کی پہلی منزل یہی ہے۔

جڑی تقطیع کی کتابوں کو علیحدہ، چھوٹی تقطیع کی کتابوں کو سائز کے مطابق علیحدہ رکھ کر

تظار میں کھڑا کر دیا۔ ایک نوٹ بک پر ہر ایک کتاب کے صفحوں کی تعداد دیکھ کر سب جمع کر لیا

پھر پندرہ اپریل تک کے دن گنے، صفحوں کی تعداد کو دنوں کی تقسیم پر تقسیم کیا۔ ساڑھے پانچ سو

جواب آیا، لیکن اضطراب کی کیا مجال جو چہرے پر ظاہر ہونے پاتے، دل میں کچھ تھوڑا سا کھپتاتے

کہ صبح تین ہی بجے کیوں نہ اٹھ بیٹھے، لیکن کم خوابی کے طبعی پہلو پر غور کیا تو فوراً اپنے آپ پر طاقت

کی، آخر کار اس نتیجے پر پہنچے کہ تین بجے اٹھنا تو لغویات ہے البتہ پانچ..... چھ..... سات

بچے کے قریب اٹھنا نہایت محنت بھرا کام رہے گی اور امتحان کی تیاری بھی باقاعدہ ہوگی، ہم فریاد ہم تو اب۔۔

یہ تو ہم جانتے ہیں کہ سوریے اٹھنا ہو تو جلدی ہی سو جانا چاہئے۔ کھانا یا پھر ہی سے کھاتے تھے بستر میں داخل ہو گئے، چننے چلنے خیال آیا کہ لالہ سے جگانے کے لئے کہہ ہی نہیں؟ یوں ہماری قوتِ ارادی کافی زبردست ہے جب چاہیں اٹھ سکتے ہیں۔ لیکن پھر بھی کیا صرح ہے؟ ڈرتے ڈرتے آواز دی "لالہ جی؟"

انہوں نے پتھر کی سیج کر مارا، بس۔۔۔

ہم اور بھی سہم گئے کہ لالہ کچھ ناراض معلوم ہوتے ہیں، تھلا کے درخواست کی کہ لالہ جی صبح آپ کو بڑی رحمت ہوئی، میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ کل ذرا مجھے چھوٹے بھئی جس وقت چھوٹے تھے۔۔۔۔۔

جواب نہ دیا۔

میں نے پھر کہا۔۔۔۔۔ جب چھوٹے تھے چلیں تو۔۔۔ سنا آپ نے؟ چپ۔۔۔۔۔

"لالہ جی۔۔۔۔۔!"

کوڑھتی ہوئی آواز نے جواب دیا: "سن لیا۔ چھوٹے جگانے کا۔ تھری گلا ظن فرما۔"

ہم نے کہا: "ب۔۔۔۔۔ ب۔۔۔۔۔ بہت اچھا۔۔۔"

"تو بس۔۔۔۔۔ خدا کسی کا محتاج نہ کرے۔"

"لالہ جی آدمی بہت شریف ہیں، اپنے وعدے کے مطابق دوسرے دن صبح چھ بجے انہوں نے دروازے پر گھونسلوں کی بارش شروع کر دی، ان کا جگانا تو محض ایک سہارا تھا، ہم خود ہی انتظار میں تھے کہ یہ خواب ختم ہو لے تو بس جاگتے ہیں، وہ نہ جگانے تو میں خود ایک منٹ بعد آنکھیں کھول دیتا، بہر صورت جیسا کہ میرا فرض تھا میں نے ان کا شکریہ ادا کیا، انہوں نے اسے اس شکل میں قبول کیا کہ گولہ باری بند کر دی۔"

اس کے بعد واقعات ذرا بحثِ طنب سے ہیں بلکہ ان کے متعلق روایات میں کسی قدر

اختلاف ہے، بہر حال اس بات کا تو مجھے یقین ہے، اور میں مستم بھی کھا سکتا ہوں کہ آنکھیں میں

نے کھول دی تھیں، پھر یہ بھی یاد ہے کہ کٹھنے سے پیشتر ربا چے کے طور پر ایک آکر وٹ بھی
 ن، پھر کا پتہ نہیں، شاید لحاف اوپر سے دیا، شاید سراسر کی لپیٹ دیا، تاہم کھانا کہ خدا جلنے غلاما

یاد وغیرہ یہ یقینی امر ہے کہ دس بجے ہم بالکل جاگ رہے تھے، لیکن لالہ جی کے جگانے کے بعد
 دس بجے سے پیشتر خدا جانے ہم پڑھ رہے تھے یا سو رہے تھے، نہیں ہمارا خیال ہے ہم پڑھ رہے
 تھے یا شاید سو رہے تھے، بہر صورت یہ نسیات کا مسئلہ ہے جس میں آپ ماہر ہیں نہیں کیا پتہ؟
 لالہ جی نے جگایا ہی دس بجے ہو یا اس دن چھری دیوے کے بجے ہوں، خدا کے کاموں میں آپ کیا
 دخل دے سکتے ہیں۔ لیکن ہمارے دل میں پھر یہ شبہ رہا کہ تصور کچھ اپنا ہی معلوم ہوتا ہے، جناب
 شرافت ملاحظہ ہو کہ اس شبہ کی بنا پر صبح سے شام تک ضمیر کی ملامت سُتتا رہا اور اپنے آپ کو
 سُتتا رہا مگر لالہ جی سے جس میں کس باتیں کہیں اور ان کا شکر یہ ادا کیا اور اس خیال سے کہ
 ان کی دل شکنی نہ ہو، صرف جے کی طمانیت ظاہر کی، آپ کی نوازش سے میں نے صبح کا سہانا اور
 رोज افزا وقت بہت اچھی طرح صرف کیا اور نہ لوہے کی طرح آج بھی دس بجے ہی اٹھتا
 لالہ جی صبح کے وقت دعا کی کیا صاف ہوتا ہے، جو پڑھو خدا کی قسم یاد ہو جاتا ہے، بھئی خیرانے
 صبح بھی کیا چیز بناتی ہے یعنی اگر صبح کی بجائے صبح شام ہو کر تھی تو دن کیا بڑی طرح کھٹا۔
 لالہ جی نے ہماری اس جاودہیلانی کی داد دی اور پوچھنے لگے۔

”تو میں آپ کو چہ بچے جگا دیا کروں گا۔“

میں نے کہا۔

”ہاں ہاں! عا د یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، بیشک۔“

شام کے وقت آنے والی صبح کے لئے مطالعہ کے لئے دو کتابیں چھانٹ کر علیحدہ جوڑ دیں۔
 کرسی کو چار پائی کے قریب سر کا لیا اور کوٹ اور گلو بند کو کرسی کی پشت پر لٹوئیں کر دیا کنٹروپ
 اور ہاتھ پاس ہی رکھ لئے۔ دیا سلائی کو نیکٹے کے ٹھولا۔ تین دفعہ آیتہ الکرسی پڑھی اور دل میں
 نہایت ہی نیک منصوبے بانہ کر سوا گیا۔

صبح لالہ جی کی پہلی دستک کے ساتھ جھٹ آنکھ کھل گئی، نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ
 لحاف کی ایک کھڑکی میں سے سر نکالا، ان کو گفٹ مارنگ کیا، اور نہایت بے دردانہ لہجے میں

کھانا، لالہ جی مطمئن ہو کر واپس چلے گئے۔

ہم نے اپنی تعبت اور الو العز می کو بہت سراہا کہ ہم آج فوراً ہی جاگ اٹھے تھے۔ دل سے کہا: دل بھیا صبح اٹھنا تو محض ذرا سی بات ہے، ہم یوں اس سے ڈرا کرتے تھے۔ دل نے کہا: اور کیا؟ تمہارے تو یوں ہی اوسان خطا ہو جایا کرتے تھے:

ہم نے کہا: سچ کہتے ہو: یعنی ہم سستی اور کلت کو خود اپنے قریب نہ آنے دیں تو ان کی کیا مجال ہے کہ ہمارے قریب سے بھی گنہ جائیں، یا ہماری باقاعدگی میں خلل انداز ہوں۔ اس وقت اس شہر لاہور میں ہزاروں ایسے کابل لوگ ہوں گے جو دنیا و مافیہا سے بے خبر، نیند کے خولے اڑاتے ہوں گے، اور ایک ہم ہیں کہ ادا تے فرض کی خاطر نہایت شگفتہ طبعی اور غنچہ ذہنی سے جاگ رہے ہوں گے۔ بھتی کیا برزور دار سعادت آثار واقع ہوئے ہیں۔ ناک کو سرری سی موس ہوتی تو اس کو ذرا سالیوں ہی لحاف کی اوٹ میں کر لیا، اور پھر سوچنے لگے۔ خوب تو ہم آج یہ وقت پر جاگیں گے، بس ذرا اس کی عادت ہو جائے تو باقاعدہ قرآن مجید کی تلاوت اور فجر کی نماز بھی شروع کر دیں گے، آخر نہ سب سب سے مقدم ہے۔ ہم بھی کیا روز روز الحاد کی طرف مائل ہوتے جا رہے ہیں۔ نہ خدا کا ڈر، نہ رسول کا خوف سمجھتے ہیں کہ بس اپنی محنت سے امتحان پاس کر لیں گے۔ اکبر، چارہ یہ کہتا کہتا مر گیا، لیکن ہمارے کانوں پر جوں تک نہ ملتا، لحاف کانوں پر سرک آیا۔ تو گویا آج ہم لوگوں سے پہلے جاگے ہیں۔ بہت ہی پہلے۔ یعنی کالج شروع ہونے سے بھی چار گھنٹے پہلے کی بات ہے!

خداوند! یہ کالج والے بھی کس قدر سست ہیں، سب ایک مستند انسان کو چھ بجے تک

قطعاً جاگ اٹھنا چاہئے، بچہ میں نہیں آتا کہ کالج سات بجے کیوں نہ شروع ہوا کرے۔

دعائے سر پہ، بات یہ ہے کہ تہذیب جدید ہماری تمام اعلیٰ قوتوں کی بیخ کنی کر رہی ہے۔ عیش پسندی روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ آنکھیں بند تو اب چھ بجے ہیں تو گویا تین گھنٹے مطالعہ کیا جاسکتا ہے، سوال یہ ہے کہ کون سی کتاب پڑھیں، ہشیکسیر یا ورڈ روز تھ؟ میں جانوں شیکسیر بہتر ہوگا، اس کی عظیم شان تصانیف میں خدا کی عظمت کے آثار دکھائی دیتے ہیں، اور صبح کے وقت اللہ میاں کی یاد سے بہتر اور کیا چیز ہو سکتی ہے؟

پھر خیال آیا، دن کو جذبات کے محشرستان سے شروع کرانا ٹھیک نہیں، ورڈ روزتھ
 رحیں۔ اس کے اوراق میں نظرت کو سکون و اطمینان میسر ہوگا، اور دل و دماغ کی خاموش
 لادیزیوں سے ہلکے ہلکے لطف اندوز ہوں گے۔۔۔۔۔ لیکن شیکسپیر۔۔۔۔۔ نہیں ورڈ
 لذتہ ہی ٹھیک رہے گا۔۔۔۔۔ شیکسپیر۔۔۔۔۔ ہیٹ۔۔۔۔۔ لیکن ورڈ روزتھ۔۔۔۔۔
 بڑی لیکتھ۔۔۔۔۔ دیوانگی۔۔۔۔۔ سبزہ زار۔۔۔۔۔ سحر۔۔۔۔۔ بلوہاری۔۔۔۔۔ صید ہوس
 شمیر۔۔۔۔۔ میں آفت کا پر کالا ہوں۔

یہ کتاب فلسفہ مابعد الطبیات ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر جو ہم نے لحاف سے
 سر باہر نکالا تو ورڈ روزتھ پڑھنے کا ارادہ ہی کیا، تو دس بج رہے تھے۔ اس میں نہ
 علوم کیا بھید ہے۔

کالج کے ہال میں لالہ جی ملے، کہنے لگے "مستر! صبح میں نے آپ کو آواز دی
 تھی۔ آپ نے جواب نہ دیا۔"

میں نے زور کا تہقہ لگا کر کہا "اوہو لالہ جی، یاد نہیں، میں نے آپ کو گڈ مارنگ
 کہا تھا، میں تو پہلے ہی سے جاگ رہا تھا۔"

بولے "وہ تو ٹھیک ہے لیکن بعد میں۔۔۔۔۔ اس کے بعد کوئی سات بجے کے
 قریب میں نے آپ سے تاریخ پوچھی تھی۔۔۔۔۔ آپ بولے ہی نہیں۔"

ہم نے نہایت تعجب کی نظروں سے انہیں دیکھا، گویا وہ پاگل ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔ اور
 پھر ذرا متین چہرہ بنا کر ماتھے پر تیوریاں چڑھائے غور و فکر میں مصروف ہو گئے، ایک آدھ
 منٹ تک ہم اس تعلق میں رہے، پھر یکایک ایک محبوبانہ اور معشوقانہ انداز سے مسکرا کے کہا
 "اے ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، میں اس وقت۔۔۔۔۔ اے۔۔۔۔۔ نماز پڑھ
 رہا تھا۔"

لالہ جی مرعوب ہو کر چل دئے، اور ہم اپنے زبرد تقویٰ کی شکستہ کیٹی میں سرچا کے کمرے
 کی طرف چلے آئے۔

اب یہی روز مرہ کا معمول ہو گیا ہے۔ جاگنا نمبر چھ بجے، جاگنا نمبر دس بجے اور

اس دوران للہی آواز دیں تو نماز۔!

جب دلِ مرحوم ایک جہانِ آرزو تھا تو یوں جاگنے کی تمنا کیا کرتے تھے کہ ہمارا فریقِ ناز
محبالش کم خواب نہ ہو، اور سوچ کی پہلی کرنیں ہمارے سسیلہ پڑیج بالوں پر پڑ ہی ہوں،
کمرے میں پھولوں کی خوشبو ٹوٹے سحری کی رُوحِ انزاسیاں کر رہی ہو، نازک اور حسین ہاتھ اپنی
انگلیوں سے ہر بٹ کے تاروں کو ہلکے ہلکے چھیڑ رہے ہوں، اور عشق میں ٹوٹی ہوئی سُرلی اور نازک
آواز مسکراتی ہوئی گارہی ہو۔

”تم جاگو موہن پیارے“

خواب کی سنہری دُھند آہستہ آہستہ موسیقی کی لہروں میں تحلیل ہو جائے۔ اور بیداری ایک
خوشگوار طلسم کی طرح تاریکی کے باریک نقاب کو خاموشی سے پارہ پارہ کر دے، چہرہ کی نگاہ
اشتیاق کی تری غموس کر دے۔ آنکھیں سٹور ہو کر کیلیں اور چار ہو جائیں، دلاؤ نیرتسم صبح کو اور کبھی
رخندہ کر دے اور گیت ”سانوری صورت تری من کو بھاتی“ کے ساتھ ہی شرم و حجاب
میں ڈوب جائے۔

نصیب یہ ہے کہ پہلے میسٹر میسٹر کی آواز دہانے کی نادان سامعہ نوازی کرتی، اور پھر چار
گھنٹے بعد کلج کا گھڑیاں دماغ کے ریشہ ریشے میں دس بجانا شروع کر دیتا ہے، اہل اس چار گھنٹے کے سرے
میں گھڑیوں کے گر پڑنے، دیگچوں کے ٹٹ جانے، صدانوں کے بند ہو جانے، کتابوں کے جھاڑنے،
کرسیوں کے گھسیٹنے، گلیاں اور غرارے کرنے، کھنکھارنے اور کھانسنے کی آوازیں تو گویا فی البدیہہ پھریاں
ہیں، امانہ کر لیجئے کہ ابن ساندوں میں مال کی کس قدر گناہش ہے۔

موت مجھ کو دکھائی دیتی ہے

جب طبیعت کو دیکھتا ہوں میں

کُتے

علم الحیوانات کے پروفیسروں سے پوچھا، سلوتریوں سے دریافت کیا، خود سرکھپاتے رہے
 کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر کُتوں کا کیا فائدہ ہے، گلے کو لیجئے، دودھ دیتی ہے، بکری کو لیجئے دودھ دیتی ہے،
 بیگنیاں بھی۔ یہ کُتے کیا کرتے ہیں؟ کہنے لگے وفادار جانور ہے۔ اب جناب وفاداری اگر اسی کا نام ہے
 تو ہم کے وقت سات بجے سے جو بھونکنا شروع کیا تو گلاب وغیرہم لئے صبح کے چھ بجے تک بھونکتے ہی چلے
 ۔ تو ہم لٹو رہے ہی بٹلے۔

کل ہی کی بات ہے کہ رات گیارہ بجے ایک کُتے کی طبیعت ذرا گدگدائی تو انہوں نے باہر نکل کر
 طرح کا ایک صرغ دے دیا۔

ایک آدھ منٹ بعد سامنے جنگلی میں سے ایک کُتے نے مطلع عرض کر دیا، اب جناب ایک کُتہ مشق
 ہوا کو جو غنٹہ آیا تو ایک حلوائی کے چڑھے سے باہر نکلے اور ٹھنکار کر ٹھنکار کر غزل مطلع تک کہہ گئے۔ اس پر شمال
 شرق کی طرف سے ایک قدر شناس کُتے نے زوروں کی آواز دی۔

اب تو حضرت ہا مشاعرہ گر مہوا کہ کچھ نہ پوچھتے، بعض تو دغغزے، سبغزے لکھ لائے تھے، کئی ایک
 نے فی البدیہہ قصیدے کے قصیدے پڑھائے، وہ ہنگامہ گر مہوا کہ ٹھنڈا ہونے نہیں دیتا تھا، ہم نے کھڑکی
 سے بزاروں وضع آرڈر آرڈر پکھلا لیکن بس موقعوں پر پردھان کی بھی کوئی نہیں آتا، اب ان سے کوئی پوچھے
 میاں تمہیں ایسا ہی ضروری مشاعرہ کرنا تھا تو دریا کے کنارے کھلی ہو ایں جا کر طبع آزمائی کرتے۔ یہ گھروں کے
 بیان آکر سوتوں کو ستانا کوئی شرافت ہے؟ اہ پھر ہم ایسی لوگوں کے کُتے بھی کچھ عجیب بہتیز واقعہ ہوتے
 یں۔ اکثر تو ان میں سے ایسے قوم پرست میں کہ تپلون اور کوٹ کو دیکھ کر ہی بھونکنے لگ جاتے ہیں۔ خیر یہ تو ایک
 مد تک قابل تعریف بھی ہے، اس ذکر کو جانے ہی دیجئے، اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے، یعنی ہمیں بار بار

ڈایاں لے کر صاحب لوگوں کے جگلوں پر جانے کا اتفاق ہوا۔ خدا کی تمہاں کتوں میں وہ شائستگی دیکھی کہ عموماً کتوں کے نوٹ آتے ہیں جو نہی ہم بچلے کے دروازے میں داخل ہوتے، کتے نے برآمدے میں کھڑے ہو کر ایک ہلکی سی پیچ کر دی اور پھسندہ بند کر کے اہو گیا۔ ہم آگے بڑھے تو اس نے بھی چار قدم آگے بڑھ کر ایک نازک اور پاکیزہ آواز میں پھر پیچ کر دی۔ چوکیداری کی چوکیداری، موسیقی کی موسیقی۔

ایک ہمارے کتے ہیں کہ راک نہ ٹر، سر نہ پیر، تان پر تان نکلے جاتے ہیں، بے آلے کھیں کے، نہ موقع دیکھتے ہیں نہ وقت پہچانتے ہیں، بس گلے بازی کتے جاتے ہیں۔ اور گھنڈا اس بات پر ہے کہ کان سین اس ملک میں پیدا ہوا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے تعلقات کتوں سے ذرا کشیدہ ہی رہے ہیں۔ لیکن ہم سے متم لے لوجو ایسے موقع پر ہم نے کبھی ستیہ گرد سے منہ موڑا ہو۔ شاید آپ اس کو نقلی سمجھیں، لیکن خدا شاہد ہے کہ آج تک کبھی کسی کتے پر ہاتھ اٹھ ہی نہ سکا۔ اکثر دوستوں نے صلاح دی کہ رات کے وقت لاشمی چٹھری خند ہاتھ میں رکھنی چاہتے کہ دفعِ بلیات ہے، لیکن ہم کسی سے خواہ خواہ مداوت پیدا کرنا نہیں چاہتے، حالانکہ کتے کے بھونکنے ہی ہماری طبعی شرافت ہم پر اس قدر غلبہ پاجاتی ہے کہ آپ ہمیں اگر اس وقت دیکھیں تو یقیناً ہی سمجھیں گے کہ ہم بزدل ہیں۔ شاید آپ اس وقت بھی یہ اندازہ لگالیں کہ ہالا گلا خشک ہوا جاتا ہے، یہاں تک ٹھیک ہے ایسے موقع پر کبھی گانے کی کوشش کروں گا تو کھرج کے سروں کے علاوہ اور کچھ نہیں نکلتا۔ اگر آپ نے بھی ہم جیسی عادت پائی ہو تو دیکھیں گے کہ ایسے موقع پر آیتہ الکرسی آپ کے ذہن سے اتر جائے گی، اس کی جگہ شاید آپ دوائے قنوت پڑھنے لگ جائیں۔

بعض اوقات ایسا بھی اتفاق ہوا ہے کہ رات کے دو بجے چھڑی گھمانے تھکے سے واپس آ رہے ہیں اور نامک کے کسی نہ کسی گیت کی طرز میں میں بٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں، کیونکہ گیت کے الفاظ یاد نہیں اور نوبختی کا عالم بھی ہے اس لئے سٹی پر اتفاقاً ہے کہ بے سُر بھی ہو گئے ہیں تو کوئی یہی سمجھے گا کہ شاید آنریری سٹی ہے اتنے میں ایک موڑ پر سے گزرے تو سامنے ایک بگری بندھی تھی، ذرا قصور ملاحظہ فرمائیے۔ آنکھوں نے اسے بھی کتا ہی دیکھا۔ ایک تو کتا اور پھر بگری کی جسامت کا، گویا بہت ہی کتا۔ بس ہاتھ پاؤں پھول گئے چھڑی کی گردش دہمی دہمی ہونے پر تے ایک نہایت نامقول راوی سے پر ہوا میں ٹھہر گئی، سٹی کی موسیقی بھی تھر تھر آواز میں ہو گئی، لیکن کیا مجال جو ہماری تھو تھنی کی مخرومی شکل میں ذرا بھی فرق آیا ہو۔ گویا ایک بے آواز لے بھی تک شکل پری

ہے۔ طب کا مسئلہ ہے، ایسے موقع پر اگر سردی کے موسم میں کبھی پسینہ آجائے تو کوئی مضائقہ نہیں، بعد میں ٹھیک ہو جائے۔ چونکہ ہم طبعاً ذرا محتاط ہیں اس لئے کبھی تھک گئے کے کاٹنے کا اتفاق نہیں ہوا یعنی کسی کتے نے آج تک ہم کو نہیں کاٹا۔ اگر ایسا سا خدشہ آیا ہوتا تو اس سرگذشت کی بجائے آج ہمارا مریض چھپ رہا ہوتا، تاریخی معنی میں دماغیہ ہوتا کہ اس کتے کی مٹی سے کتا گھاس پیلا ہو۔ لیکن ۵

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے سب رہ بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا

جب تک اس دنیا میں کتے موجود ہیں اور بھونکنے پر متبر ہیں سمجھ لیجئے کہ ہم قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں اور پھر ان کتوں کے بھونکنے کے اصول بھی تو نزلے ہوتے ہیں یعنی ایک تو مستعدی مرض ہے، اور پھر بچوں اور بھولوں سبھی کو لاحق ہے۔ اگر کوئی بھاری بھکم اسفندیار کتا کبھی کبھی اپنے رطب اور دبے بے تو قائم رکھنے کیلئے بھونک لئے تو ہم بھی چاروں پاؤں چار کبہ دریں کہ بھتی بھونک۔

اگرچہ ایسے وقت میں اس کو زخمیر سے بندھا ہوا ہونا چاہئے۔ لیکن یہ کجنت در روزہ، سہ روزہ دو دو تین تین تو لے کے پٹے بھی بھونکنے سے باز نہیں آتے۔ بلکہ آواز ذرا سا بھی پھڑا، اس پر کبھی اتنا دیر کزور لگا کر بھونکتے ہیں کہ آواز کی لرزش دم تک پہنچتی ہے، اور پھر بھونکتے ہیں کہ پتی موٹر کے سامنے آکر گویا روک دیں گے، اب یہ خاکسار موٹر چلا رہا ہو تو قطعاً ہاتھ کام کرنے سے اکھڑ کر دیں، لیکن ہر کوئی یوں ان کی جان بخشی، توڑا ہی کرے گا۔

کتوں کے بھونکنے پر مجھے سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ ان کی آواز سوچنے کے تمام قوی مشعل کر دیتی ہے خصوصاً جب کسی مکان کے تختے کے نیچے سے ان کا ایک پورا خفیہ جلسہ شرک پر آکر تبلیغ کا کام شروع کر دے تو آپ ہی کیجئے۔ ہوش ٹھکانے رہ سکتے ہیں، ہر ایک طرف باری باری سوچنا پڑتا ہے، کچھ ان کا شور کچھ باری صدائے احتجاج (زیر لب) بے ڈھنگی حرکات و سکنات۔ اس ہنگامے میں بھلا کام کر سکتا ہے، اگرچہ یہ مجھے بھی نہیں معلوم اگر ایسے موقع پر مدعا کام کرے کبھی تو کیا تیر مارے گا، بہر صورت کتوں کی یہ پرلے درجے کی ناانسانی میرے نزدیک ہمیشہ قابلِ نفی رہی ہے۔ اگر ان کا ایک نامندہ شرافت کے ساتھ ہم سے آکر کہہ دے کہ عالی جناب شرک بند ہے تو خدا کی قسم ہم بغیر چون و چرا کتے واپس لوٹ جائیں۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، ہم نے کتوں کی درخواست کئی بار کی، ہر ایک نامندے کو گزارا ہو، لیکن، دوری مجلس، کاہن متفقہ طور پر سنا، زور دیا کہ ناام

یہ حرکت ہے۔ لیکن تازین کرام کی خدمت میں عرض ہے اگر ان کا کوئی عزیز و محرم کتاب لکھے میں موجود ہو تو یہ مضمون
 مد آواز سے نہ پڑھا جائے۔ مجھے کسی کی دل شکنی مطلوب نہیں، خدا نے ہر قوم میں نیک افراد بھی پیدا کئے ہیں۔ کتے اس
 پتے سے مستثنیٰ نہیں۔ آپ نے خدا ترس کتاب بھی ضرور دیکھا ہو گا۔ یمنو جس کے جسم پر تپتیا کے اثرات ظاہر مٹنے ہیں
 نوب چلتا ہے تو اس کی مسکینی اور مجرت سے گویا بارگناہ کا احساس آگیا نہیں اٹھانے دیتا۔ دم اکثر پریٹ کے ساتھ لگی
 رہتی ہے، شرک کے بچوں بیچ غور و فکر کے لئے لیٹ جاتا ہے۔ اور آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ شکل بالکل
 غلاموں جیسی اور تجربہ دیر جاس کبی سے ملتا ہے۔ کسی گاڑی بولے نے متواتر بجل بجایا۔ گاڑی کے مختلف حصوں کو
 کھٹکھٹایا، لوگوں سے کہلایا، خود پس بارہ دفعا آوازیں دیں تو لپٹنے سر کو میں ذمکن ہر کھے متوجہ غموریا کھول کر
 کھولا جو نبت حالات کو ایک نظر دیکھا، اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ کسی ایک نے پاک بگلا۔ آپ نہایت اہلینان
 کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر ایک گز پر جا بیٹھے، اور خیالات کے سلسلے کو جہاں سے وہ ٹوٹ گیا تھا وہاں
 سے پھر شروع کر دیا کسی ہائیکسل بولے نے گھٹی بجائی تو وہ لیٹے لیٹے ہی سمجھ گئے کہ ہائیکسل ہے۔ یہی
 پچھوری چیزوں کے لئے وہ سوت چھوڑ دینا فقیری کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ رابع کے وقت یہی
 کتاب اپنی خشک ہٹا سی دم کو ناحیہ مکان شرک پر کھینچا کر رکھتا ہے۔ اس سے محض خطا کے برگزیدہ بندوں کی
 آرا تیش مقصود ہوتی ہے، جہاں آپ نے ظلی سے پاؤں دکھ دیا انھوں نے بغیر غضب کے لہجے میں آپ
 سے چرسش شروع کر دی تکتہ فقیروں کو پھیرتا ہے، نظر نہیں آتا ہم سادھو لوگ یہاں بیٹھے ہیں۔ بس
 اس فقیر کی بدعا سے اسی وقت دوشہ شروع ہو جاتا ہے، بعد میں کئی باتوں تک سہی خواب نظر آتے رہتے
 ہیں کہ بیشمار کتے ملا گروں سے لپٹے ہوئے ہیں اور بولے نہیں رہتے، کتے کھٹکتے ہیں تو پاؤں پہلوانی کی پٹھان
 میں پھنسے ہوئے ہیں۔

اگر خانا نے مجھے کچھ عرصے کے لئے اہلی جسم کے بغیر کھنڈ کاٹنے کی طاقت عطا فرمائی تو جنوں اسام
 میرے پاس کافی مقدار میں ہے۔ رفتہ رفتہ سب کتے ملاح کے لئے کسلی پہنچ جائیں۔ ایک شر ہے
 عربی تو میںندیش زعفرانے رقیباں
 آواز سگاں کم نہ کتہ مذق گھارا
 کتہا و غلاب غلرت شامری ہے ہا ایشیا کے لئے ہا مشنگ ہے۔ مگر زری میں ایک شل ہے کہ
 بخونکتے ہوتے کتے کا نام نہیں کرتے۔ یہ بکاسی۔ لیکن کون ہا سہ ہے کہ ایک بخونکتا تھا کتا کب بخونکتا بند
 کدے؟ اھکا شام شروع کرے۔

اردو کی آخری کتاب

ماں کی مصیبت

ماں بچے کو لے بیٹھی ہے، باپ گلوٹھا ہوس رہا ہے، اور دیکھو دیکھو کر خوش ہوتا ہے، بچہ حسب
سمول سنجیں کھولے پڑا ہے، ماں محبت بھری نگاہوں سے اس کو تک رہی ہے، اور پیار سے حسب ذیل
باتیں پڑھتی ہے۔

(۱) وہ دن کب آئے گا جب تو بیٹی بیٹی باتیں کرے گا۔

(۲) بڑا کب ہوگا؟ مفصل لکھو۔

(۳) قلعہ کب بنے گا، اور کھن کب بیاہ کر لائے گا؟ اس میں شہانے کی ضرورت نہیں۔

(۴) ہم جیسے کب ہوں گے؟

(۵) تو کب کھائے گا؟

(۶) آپ کب کھائے گا، اور میں کب کھائے گا، ہاتھ داتا تم شیل بنا کر دیکھ کر۔

بچہ سکراتا ہے، اور کھانے کی مختلف چیزوں کی طرف اشارہ کرتا ہے، تو ماں کامل باطن باطن ہوجاتی ہے

جب تھا ہونٹ کھل کر ————— رونی صوت بناتا ہے تو بے چین ہوجاتی ہے۔ ماسے پنگوڑا

لنگ رہا ہے، سلاتا ہو تو آئیوں کھلا کر اس میں بیٹا دیتی ہے، رات کو اپنے ساتھ سلاتی ہے، باپ کے ساتھ

فوسرا چھوٹا ہے، جاگ اٹھتا ہے تو جھٹھ جھٹھ ہونک پڑتی ہے، اور گلے والی سے مانی مانگتی ہے، کبھی نیند

میں رونے لگتا ہے تو پھادی مٹائی ماری تاک جلا کر فوسہ کو اُپال دیتی ہے۔ صبح جب بچے کی آنکھ کھلتی ہے

تو آپ بھی اٹھ بیٹھتی ہے، اس وقت تین بجے کامل ہوتا ہے۔ دن پڑھے نونہ دھلتی ہے، آنکھوں میں کامل لگاتی

ہے، اور جی نکلا کر کے کہتی ہے، کیا چاند ما کھڑا گل آیا۔ واہ۔ واہ۔ واہ۔

کھانا خود پک رہا ہے

دیکھنا بیوی آپ بھٹی کھانا پکارتی ہے، ورنہ دراصل یہ کام میاں کا ہے، ہر چیز قرینے سے رکھی ہے۔ دھوئے دھلتے برتن دھرے ہیں، کسی میں دال ہے، کسی میں آٹا، ٹھیکنی اور پانی کا لوٹا پڑھے کے پاس ہے تاکہ جب تک پانچا ہے آگ جلاتے، اور جب پانچا ہے پانی ڈال کر بھجوادے۔ آٹا گندھ رہا ہے، چاول پک چکے ہیں نیچے آٹا کر رکھے ہیں، دال پڑھے پڑھی ہے، غرضیکہ ہر کام ہو چکا ہے، لیکن یہ کبھی پاس بھٹی ہے، میاں جب آٹا ہے کھانا لاکر سامنے رکھتی ہے، پیچھے کبھی نہیں رکھتی، کھانا کھا لیتا ہے تو کھانا اٹھا لیتی ہے۔ ہر روز یوں نہ کرے تو میاں کے سامنے ہزاروں روپے کا ڈھیر لگ جاتے۔ کھانا پکانے سے فارغ ہوتی ہے تو کبھی سینالے بھٹتی ہے کبھی چرخہ کا تنے لگتی ہے۔ کیوں نہ ہو ہاتھ لگاؤ کی بدولت بیماریاں آئیں سکیں ہیں، آپ ہاتھ پاؤں دھلائے تو ڈاکٹر سے علاج کرا لیتا ہے۔

دھو بی آج کپڑے دھورہا ہے

بڑی محنت کرتا ہے، شام کو بھٹی چڑھاتا ہے، دن بھر بیکار بیٹھا رہتا ہے، کبھی بیل پر لادی لاتا ہے اور گھاٹ کا رستہ لیتا ہے۔ کبھی نالے پر دھوتا ہے، کبھی دیوار پر، ٹلکے کپڑوں والے نہ کپڑے کیس جاڑا ہوا تو سردی ستاتی ہے، گرمی ہو تو دھوپ جلاتی ہے، صرت بہار کے موسم میں کام کرتا ہے، دھوپ ہونے کو آئی، اب تک پانی میں کھڑا ہے، اسے ضرور سرسرا ہوا جائے گا، وضت کے نیچے بیل بندھا ہے، جھاڑی کے پاس کتا بیٹھا ہے، دریا کے اُس پار گلہری نڈھری ہے، دھو بی اسی سے جی بیٹھا ہے۔

دیکھنا دھو بن روٹی لاتی ہے، دھو بی کو یہاں اتھا آلی ہے، کتے نے بھی کان کھڑے کر دیئے، اب دھو بن کا ہاتھ لگی، دھو بی دریا سے گلے گا، دریا کا پانی پھر نچا ہو جائے گا۔

میاں دھو بی! یہ کتا کیوں پال رکھا ہے، صاحب کی کہوت کی وجہ سے، اور پھر یہ تو تمہارا چوکیدار ہے، دیکھتے ہیوں کے کپڑے میدان میں پھیلے پڑے ہیں، کیا حال کوئی پاس آجاتے، جو ایک دفعہ کپڑے دھو بی میں پھولیں نہیں لے جاسکتے۔ میاں دھو بی تمہارا کام بہت اچھا ہے۔ بیل کھلی سے پاک وضات کرتے ہو، ننگا بھرتے ہو۔

میں ایک میاں ہوں

میں ایک میاں ہوں، مطہح و فرمانبردار۔ اپنی بیوی روشن آوا کو اپنی زندگی کی ہرات سے آگاہ کرنا اصول زندگی سمجھتا ہوں اور ہمیشہ اس پر کار بند ہوں، خلا میں انجام بخیر کرنے۔

چنانچہ میری اہلیہ میرے دوستوں کی تمام مادات و خصال سے واقف ہیں جس کا نتیجہ ہے کہ میرے دوست جتنے مجھ کو عزیز ہیں اتنے ہی روشن آواز کو ترہے لگتے ہیں۔ میرے احباب کی اماؤں نے مجھے مستحکم کر رکھا ہے۔ انہیں میری اہلیہ ایک شریف انسان کے لئے باعثِ ذلت سمجھتی ہے۔

آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ خدا نخواستہ کوئی ایسا آدمی ہیں جن کا ذکر حضرت محمد میں نہ کیا جاسکے بلکہ اپنے ہنر کے طفیل، اور کچھ خاکسار کی صحبت کی بدولت سب کے سب ہی مغیبت پوش ہیں، لیکن اس بات کو یاد رکھیں، ان کی ملتی میرے غم کے ان میں ظلم و انانیت ہوتی ہے کہ کچھ کہ نہیں سکتا۔

مثلاً مرزا صاحب ہی کو لیجئے، اچھے خاصے بھلا آدمی ہیں۔ گویا حکم و جملات میں ایک عقول و عیب سے پرہیزگار ہیں، لیکن اصل صورت ایسی پاکیزہ پاتی ہے کہ لہذا سجدہ مطوم ہوتے ہیں۔ جو وہ نہیں کہتے، جلی ڈنڈے نکالیں شوق نہیں جیب کترتے ہوتے وہ کبھی نہیں پکڑے گئے، البتہ کبوتر تو حضور و پال رکھے ہیں۔ انہیں سے جی پہلے ہیں۔ ہاری اہلیہ کی کیفیت ہے کہ غمگینے کا کوئی بدعاش جوڑے میں قید ہو جاتے تو اس کی ماں کے پاس مزاج پرسی تک کو چلی جاتی ہیں، جلی ڈنڈے میں کسی کی آنکھ پھوٹ جائے تو مرہم پٹی کرتی رہتی ہیں جب کوئی جیب کٹر پکڑا جائے تو گھنٹوں آنسو بہاتی رہتی ہیں۔ لیکن وہ بزرگ جن کو دنیا بھر کی زبان مرزا صاحب کہتے شگفتی ہے ہمارے گھر میں مروتے کبوتر باز کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ کبھی بھولے سے بھی آسمان کی طرف نظر اٹھا کر کسی

کمزوری کے تقاضے سے مرغوں کی طرح تڑکے کٹھننے میں کوتاہی کریں تو فوراً کبہ دریا جاتا ہے کہ یہاں نکھٹو کا صحبت کا نتیجہ ہے۔ ایک دن صبح صبح ہم نہا رہے تھے۔ سردی کا موسم، ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے، صابن سر پر ملتے تھے تو ناک میں گھٹتا تھا کہ اتنے میں ہم نے خدا جانے کس پر اسرار جذبے کے تحت غسل خانے میں الٹا پنا شروع کیا اور پھر گانے لگے۔ "توری چیل بل ہے نیاری"۔

اس کو ہماری انتہائی بدذاتی سمجھا گیا، اور اس بدذاتی کا اہل میجر ہمارے دوست پنڈت جی کو غمہ آیا گیا۔ لیکن حال ہی میں مجھ پر ایک سانحہ گزرا ہے میں نے تمام دوستوں کو ترک کر دینے کی قسم کھالی ہے۔ تین چار دن کا ذکر ہے کہ صبح کے وقت روشن آرا نے مجھ سے میکے جانے کے لئے اجازت مانگی، جب سے شادی ہوئی ہے مدشن آرا سرت و دفعہ میکے گئی ہے۔ اور پھر اس نے کچھ عجیب و آکساری سے کہا کہ میں انکار نہ کر سکا۔ کہنے لگی۔ "تو پھر میں ڈیڑھ والی گاڑی سے چلی جاؤں۔"

میں نے کہا۔

"اور کیا؟"

وہ جھٹ تیار ہی میں مشغول ہو گئی، اور میرے دماغ میں آزادی کے خیالات چکر لگانے لگے، یعنی اب بیشک دوست آئیں، بیشک لودھم پچائیں۔ میں بیشک جب چاہوں کھاؤں بیشک جب چاہوں اٹھوں بیشک تعیض جاؤں۔ میں نے کہا

"روشن آرا راجلدی کرو، نہیں تو گاڑی چھوٹ جائے گی۔"

ساتھ ایشن گیا۔۔۔ جب میں گاڑی میں سوار کرا چکا تو کہنے لگی۔

"خط ضرور لکھتے رہتے۔"

میں نے کہا۔

"مہر روز۔۔۔ اور تم بھی۔۔۔"

"کھانا وقت پر کھالیا کیجئے، اور ہاں دھلی ہوئی جبرابیں اور رومل اللاری کے نخلے خانے میں پٹے

ہیں۔۔۔"

اس کے بعد ہم دونوں خاموش ہو گئے۔۔۔ ایک دوسرے کے چہرے کو دیکھتے رہے۔۔۔

گیارہ بجے آنڈر کے میں داخل ہوا، کہنے لگا: حضور حجام آیا ہے۔

ہم نے کہا یہیں بلا لو۔ یہ عیش و عشرت مدت کے بعد نصیب ہوا کہ بستر میں لیٹے لیٹے حجامت بنو الیس، المینان سے اٹھے اور نہاد ہو کر باہر جانے کے لئے تیار ہوئے، لیکن طبیعت میں وہ شگفتگی نہ تھی جس کی امید لگائے بیٹھے تھے، چلتے وقت الماری سے رومال نکالا تو خدا جانے دل میں کیا خیال آیا، کرسی پر بیٹھ گیا، اور سودائیوں کی طرح رومال تکتا رہا۔ الماری کا ایک خانہ کھولا تو سرسری رنگ کا ایک دشمنی دوپٹہ نظر پڑا۔۔۔۔۔ باہر نکالا، ملکی ملکی معطر کی خوشبو آ رہی تھی، بہت دیر تک اس پر ہاتھ پھیرتا رہا۔۔۔۔۔ دل بھر آیا، گھر سونا معلوم ہونے لگا۔ بہتیر اپنے آپ کو ہلایا لیکن آنسو ٹپک ہی پڑے۔ آنسوؤں کا گذرنا تھا کہ بیتاب ہو گیا اور سچ پچ رونے لگا۔ کپڑوں کے سب جوڑے باری باری نکال کر دیکھے لیکن نہ معلوم کیا کیا یاد آیا کہ اور بھی بے قرار ہوتا گیا۔

آخر نہ رہا گیا۔۔۔۔۔ باہر نکلا۔۔۔ اور سیدھا تار گھر پہنچا، وہاں سے تار دیا کہ میں بہت اداں ہوں تم فوراً آ جاؤ۔

تار دینے کے بعد دل کو المینان ہوا۔۔۔۔۔ یقین تھا کہ روشن آرا جسد زہو کے گا جلدی آجائے گی۔ اس سے کچھ ڈھارس بندھ گئی، جیسے ایک بوجھ ہٹ گیا۔ دوسرے دن دوپہر کو مرزا کے مکان پر تلاش کا سرکہ گرم ہونا تھا۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ مرزا کے والد سے کچھ لوگ ملنے آئے ہیں اس لئے یہ تجویز ٹھہری کہ یہاں سے کسی اور جگہ سرک چلو۔ ہمارا مکان تو خالی تھا ہی، سب یار لوگ وہیں جمع ہوئے۔ اچھ سے کہہ دیا کہ تھے میں اگر ذرا بھی خلل ہو تو تمہاری خیر نہیں، اور پان اس طرح سے پہنچے رہیں کہ تانا لگ جاتے۔

اب اس کے بعد کے واقعات کو کچھ مردہی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ شروع شروع میں تو تلاش باقاعدہ اور باضابطہ ہوتا رہا، جو ابھی کھیلا گیا۔ بہت معمول طریقے سے قواعد و ضوابط کے مطابق اور متانت و سنجیدگی کے ساتھ۔ لیکن ایک دو گھنٹے کے بعد کچھ خوش طبعی شروع ہوئی، یار لوگوں نے ایک سرکے کے پتے دیکھنے شروع کر دیے۔ یہ حالت تھی کہ آنکھ بھی نہیں اور ایک آدھ پتہ اڑا نہیں۔ اور ساتھ ہی قبچہ پر قبچہ اڑنے لگے۔۔۔۔۔ تین گھنٹے کے بعد یہ حالت تھی کہ کوئی گھنٹہ بلا ہلا کر کارہائے کوئی فرش پر بانٹکیے سیٹی بجا رہا ہے، کوئی تھیمٹر کا ایک آدھ مزاحیہ فقرہ لاکھوں بار دہرا رہا ہے۔ لیکن تلاش برابر

ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد دھول دھپا شروع ہوا۔ ان خوش نعلیوں کے دوران ایک سفرے نے ایک ایسا کھیل تجویز کیا کہ جس کے آخر میں آدمی بادشاہ بن جاتا ہے۔ دوسرا وزیر، تیسرا کو تو ال، اور چوتھا سب سے ہار جاتا ہے وہ چور۔

سب نے کہا واہ واہ!۔ کیا بات کہی ہے۔ ایک بولا، پھر آج جو چور بنا اسکی شامت آجائے گی۔

دوسرے نے کہا، اور نہیں تو کیا، بھلا ایسا دیکھیں ہے، سلطنتوں کے معاملے میں سلطنتوں کے۔ کھیل شروع ہوا، بد قسمتی سے ہم چور بن گئے، طرح طرح کی سزائیں تجویز ہونے لگیں، کوئی کہنے لگا، ننگے پاؤں بھاگتے ہوئے جاتے اور علوانی کی دوکان سے ٹھالی خرید کر لایے۔ کوئی بولا، انہیں حضور۔ سب کے پاؤں پڑے، اور ہر ایک سے دوپاٹے کھائے۔

دوسرے نے کہا، نہیں حضور، ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر ہائے ساتھ ناچتے۔ آخر میں بادشاہ سلامت بولے، ہم یہ حکم دیتے ہیں کہ چور کو ایک لمبوتری ناک دار ٹوپی پہنائی جائے اور اس کے چہرے پر سیاہی مل دی جائے۔ کیا دماغ پایا ہے حضور نے، کیا سزا تجویز کی ہے، فقاہ، فقاہ!۔

ہم بھی مرتبے میں آتے تھے، ہم نے کہا، تو کیا ہوا؟ آج ہم ہیں کل کسی اور کی باری آجائے گی۔ نہایت خندہ پیشانی سے اپنے چہرے کو پیش کیا۔ سنس سنس کر وہ بیہودہ سی ٹوپی پہنی، ایک شان استغنا کے ساتھ حلہ اٹھالی، اور زنانے کا دروازہ کھول کر بلورچی خانے کو چل دئے، اور ہائے پیچھے کرہ تہقہوں سے گونج رہا تھا

صحن میں پہنچے ہی تھے کہ باہر کا دروازہ کھلا۔ اور ایک برقعہ پوش خاتون اندر داخل ہوئی، ہنستے برقعہ اٹھا تو روشن آلا۔

دم خشک ہو گیا۔۔۔ بدن پر ایک لرزہ سا طاری ہو گیا۔ زبان بند ہو گئی۔۔۔ سانس نہ رہا۔ وہ روشن آلا جس کو میں نے تار دے کر بلایا تھا کہ، تم فوراً آ جاؤ، میں بہت اُلاس ہوں، اور اپنی یہ حالت کہ تمہارے سیاہی ملی ہے، سر پر وہ لمبوتری سی کافذ کی ٹوپی پہن رکھی ہے، اور ہاتھ میں حلہ اٹھائے کھڑے ہیں، اور مروانے کمرے سے تہقہوں کا شور برابر آ رہا ہے۔

روح بچھڑ ہو گئی۔۔۔ اور تمام حواس نے جواب دے دیا، روشن آلا کھدیر ٹھکی کمری

دیکھتی رہی — اور پھر کہنے لگی۔

لیکن میں کیا بتاؤں کہ کیا کہنے لگی — اس کی آواز تو میرے کانوں تک جیسے
 بیہوشی کی حالت میں پہنچ رہی تھی — اب تک آپ اتنا تو جان ہی گئے ہوں گے کہ
 میں بذاتِ خود شریف واقع ہوا ہوں، جہاں تک کہ میں ہوں، مجھ سے بہتر میاں بیوی دنیا پیدا
 نہیں کر سکتی، میری سسرال میں سب کی وہی راتے ہے، اور میرا اپنا ایمان بھی یہی ہے لیکن
 ابن دوستوں نے مجھے رسوا کر دیا ہے، اس لئے میں نے مقصود ارادہ کر لیا ہے کہ اب یا تو گھر میں
 رہوں گا، یا کلام پر جایا کروں گا۔ نہ کسی سے طوں گا، اور نہ کسی کو اپنے گھر آنے دوں گا سوائے
 ڈاکیر یا حجام کے، اور ان سے بھی نہایت مختصر باتیں کیا کروں گا۔

”خط نہ“

”جی ہاں —!“

”دیئے جاؤ، چلے جاؤ۔“

”ناخن تراش دو۔“

”بھاگ جاؤ۔“

بس اس سے زیادہ گفتگو نہ کروں گا، آپ دیکھتے تو ہیں۔

112479

22-12-87

مرید پور کا پیر

اکثر لوگوں کو اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ میں اپنے وطن کا ذکر کبھی نہیں کرتا، بعض اس بات پر حیران ہیں کہ میں اب کبھی اپنے وطن کو نہیں جاتا جب کبھی لوگ مجھ سے اس کی وجہ پوچھتے ہیں تو میری بات ٹال دیتا ہوں، اس سے لوگوں کو طرح طرح کے شبہات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ کوئی کہتا، وہاں اس پر ایک مقدمہ بن گیا، اس کی وجہ سے روپوش ہے، کوئی کہتا وہاں کہیں ملازم تھا، ضمنی کا الزام تھا ہجرت کرتے ہی بنی، کوئی کہتا والد اس کی بدعنوانیوں کی وجہ سے گھر میں نہیں گھسنے دیتے۔ غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ آج میں ان سب غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے والا ہوں، خدا آپ پڑھنے والوں کو انفسان کی توفیق دے۔

بعض میرے بھتیجے سے شروع ہوتا ہے۔ میرا بھتیجا یوں دیکھنے میں عام بھتیجوں سے مختلف نہیں میری تمام خوبیاں اس میں موجود ہیں، اور اس کے علاوہ نئی پودے تعلق رکھنے کے باعث اس میں بعض فالتوا اوصاف نظر آتے ہیں۔ لیکن ایک صفت اس میں ایسی ہے کہ آج تک مجھے خانانہ میں اس شدت کے ساتھ رو نہانا ہونی تھی، وہ بڑوں کی عزت کرتا ہے اور میں تو اس کے نزدیک ایک دیوتا ہوں، یہ ضبط اس کے زلیغ میں کیوں سکایا ہے، اس کی وجہ میں بتا سکتا ہوں کہ نہایت اعلیٰ سے اعلیٰ خاندانوں میں کبھی کبھی ایسا دیکھنے میں آجاتا ہے۔ میں نے شائستہ شائستہ وقدانوں کے فرزندوں کو بعض وقت بزرگوں کا اس قدر احترام کرتے دیکھا ہے کہ ان پر نیچ ذات کا دھوکہ ہونے لگتا ہے۔ ایک سال میں کانگریس کے جلسے میں چلا گیا، بلکہ یہ کہنا صحیح ہو گا کہ کانگریس کا جلسہ میرے پاس چلا آیا۔ مطلب یہ کہ میں جس شہر میں موجود تھا وہیں کانگریس والوں نے بھی اپنا سالانہ اجلاس منعقد کرنے کی ٹھان لی۔ میں پہلے بھی اکثر جگہ یہ اعلان کر چکا ہوں، اور اب بھی بائبل دہل یہ کہنے کو تیار ہوں کہ

اس میں میرا ذرا بھی تصور نہ تھا۔ بعض لوگوں کو یہ شک ہے کہ میں نے محض اپنی تختینِ نخوت کیلئے کانگریس کا جلسہ اپنے پاس ہی کرایا۔ لیکن یہ محض حاسدوں کی بدینتی ہے۔ بھانڈوں کو میں نے اکثر شہر میں بلوایا ہے۔ دو ایک مرتبہ بعض تھیٹروں کو بھی دعوت دی ہے۔ لیکن کانگریس کے مقابلے میں میرا رویہ ایک گنا م شہری کارہ ہے۔ بس اس سے زیادہ میں اس موضوع پر کچھ نہ کہوں گا۔

جب کانگریس کا جلسہ سالانہ نعل میں ہو رہا ہو تو کون ایسا مستی ہو گا جو بلے سے گریز کرے ہنرناہ بھی تسلیات اور فرصت کا تھا، چنانچہ میں نے شغلِ بیکاری کے طور پر اس جلسے کی ایک تقریبی دن بھر تو بلے میں رہتا، رات کو آکر اسی دن مختصر حالات اپنے بھتیجے کو لکھ بھیجتا کہ سند ہے اور وقتِ ضرورت کا آئے۔ بعد کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ بھتیجے صاحب میرے ہر خط کو بجا ادب اور احترام کے ساتھ بلکہ بعض باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس امتحانِ تقریب سے پیشتر وہ باقاعدہ حفظ بھی کر لیتے تھے، خط کو خود پڑھتے پھر دوستوں کو سناتے۔ پھر اخبار کے ایجنٹ کی دوکان پر مقامی لال بھنگڑوں کے طلقے میں اس کو خوب بڑھا چڑھا کر سناتے۔ پھر مقامی اخبار کے ایڈیٹر کے حوالے کر دیتے جو اسے بڑے اہتمام کے ساتھ چھاپتا۔ اس اخبار کا نام 'مرید پور گزٹ' ہے۔ اس کا مکمل فائل کسی کے پاس موجود نہیں۔ دو بیسے تک جاری رہا، پھر جس مالی مشکلات کی وجہ سے بند ہو گیا۔ ایڈیٹر کا علیہ حسبِ ذیل ہے۔

نگ گندی، گفتگو فلسفیانہ، شکل سے چور معلوم ہوتے ہیں کسی صاحب کو ان کا پتہ معلوم ہو تو مرید پور کی خلافت کمیٹی کو اطلاع پہنچادیں اور خدا شکر ماجور ہوں، نیز کوئی صاحب ان کو چندہ نہ دیں، ورنہ خلافت کمیٹی ذمہ دار نہ ہوگی۔

یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ اس اخبار نے میرے ان خطوط کے بل پر اپنا ایک کانگریس نمبر بھی نکال مارا جو اتنی بڑی تعداد میں چھپا کہ اس کے اوراق اب تک بعض پٹاریوں کی دوکان پر نظر آتے ہیں، بہر حال مرید پور کے بچے بچے نے میری قابلیت، انساں پر داری، صحیح الدماغی اور جوشِ قومی کی داد دی۔ میری اجازت اور میرے علم کے بغیر مجھے مرید پور کا قومی لیڈر قرار دیا گیا۔ ایک دو شاعروں نے مجھ پر یہ لکھیں جو وقتاً فوقتاً مرید پور گزٹ میں چھپتی رہیں۔

میں اپنی اس عزت افزائی سے بے خبر تھا۔ سچ ہے خدا جس کو چاہتا ہے عزت بخشتا ہے، مجھے کیا معلوم تھا کہ میں نے اپنے بھتیجے کو محض چند خطوط لکھ کر اپنے ہموطنوں کے دل میں

اس قدر گھر کر لیا ہے؟ اور کسی کو کیا معلوم تھا کہ یہ معمولی سا انسان جو ہر روز چپ چاپ سر نیچا کتے بازار میں سے گذر جاتا ہے، مرید پور میں جاتا ہے۔ میں خطوط لکھنے کے بعد کانگریس اور اس کے تمام متعلقات کو قطعاً فراموش کر چکا تھا۔ مرید پور گزٹ کا میں خریدار نہ تھا کھینچنے نے میری بزرگی کے رعب کی وجہ سے کبھی سبیل نہ کرے اتنا بھی نہ لکھ سچا کہ آپ لیڈر ہو گئے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ مجھ سے یوں کہتا تو برسوں تک اس کی بات میری سمجھ میں نہ آتی۔ لیکن بہر حال مجھے تو معلوم ہوتا تھا کہ میں ترقی کر کے کہاں تک پہنچا ہوں۔

کچھ غرصے کے بعد خون کی خرابی کی وجہ سے ملک میں جا بجا جلے نکل آئے جس کو ایک میز کرسی اور ایک گھلان تیار آیا، اسی نے جلے کا اعلان کر دیا۔ جلسوں کے اس سہم میں ایک دن مرید پور کی اگن نوجوانان ہند کی طرف سے میرے نام سے اس مضمون کا ایک خط موصول ہوا کہ آپ کے شہر کے لوگ آپ کے دیدار کے منتظر ہیں، یہاں تک کہ آپ کے روتے اور کودیکھنے اور پاکیزہ خیالات سے مستفید ہونے کے لئے بیتاب ہیں۔

ما مالک بھر کو آپ کی ذات بابرکات کی از حد ضرورت ہے، لیکن وطن کا حق سب سے زیادہ ہے، چونکہ ہمارے وطن از سنبل اور سیال خوشتر۔ اس طرح کی تین چار براہین کا طعنے مجھ سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ آپ یہاں آکر لوگوں کو ہندو مسلم اتحاد کی تلقین کریں۔

خط پڑھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی، لیکن جب ٹھنڈے دل سے غور کیا تو رفتہ رفتہ باشنگان مرید پور کی مردم شناسی کا قائل ہو گیا۔ میں دیکھ کر ذرا انسان ہوں، اور پھر لیڈری کا نشا ایک ہی لمحے میں چھو جاتا ہے۔ اس ایک لمحے کے اندر مجھے اپنا وطن بہت پیارا معلوم ہونے لگا، اہل وطن کی بے حسی پتہ بڑا ترس لیا۔ ایک آواز نے کہا، ان چاروں کی بہوری اور منالی کا ذمہ دار تو ہی ہے، تجھ خدانے تیر کی قوت بخشی ہے، ہزار ہا انسان تیرے منتظر کھڑے ہیں، اٹھ کر سینکڑوں لوگ تیرے لئے حاضر تھے بیٹھے ہوں گے، چنانچہ میں نے مرید پور کی دعوت قبول کر لی۔ اور لیڈرانہ انداز میں بغیر تار اطلاع دی کہ پندرہ دن کے بعد فلاں ٹرین سے مرید پور پہنچ جاؤں گا۔ ایشین پر کوئی نہ آئے، شخص کو چاہئے کہ اپنے کام میں مصروف ہے، کیونکہ ہندوستان کو اس وقت عمل کی ضرورت ہے۔

اس کے بعد جلے کے دن تک میں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنی ہونے والی تقریر کی تیاری

میں صرف کر دیا۔ طرح طرح کے فقرے دماغ میں صبح و شام پھرتے رہے۔ ”ہندو مسلم بھائی بھائی ہیں۔“
”ہندو مسلم شیر و شکر ہیں۔“

”ہندوستان کی گاڑی کے دو پہیے، اے میرے دوستو! ہندو اور مسلمان ہی تو ہیں۔“
”جن قوموں نے اتفاق کی رسی کو مضبوط پکڑا وہ اس وقت تہذیب کے بھفت اٹھارہ پر ہیں۔
جنہوں نے نفاق اور پھوٹ کی طرف رجوع کیا۔ تاریخ نے ان کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں، وغیرہ وغیرہ۔
بچپن کے زمانے میں کسی دسی کتاب میں سنا ہے کہ دو بیل رہتے تھے، ایک دلاوا اتر چھا تھا، اُسے
کال کرتے سرے سے پھر پھا اور اس کی تمام تفصیلات کو نوٹ کر لیا۔ پھر یاد آیا کہ ایک اور کہانی پڑھی
تھی، جس میں ایک شخص مرتے وقت اپنے تمام لاکھوں کو بلا کر لکڑیوں کا ایک گٹھا ان کے سامنے رکھ دیتا ہے
انہاں سے کہتا ہے کہ اس گٹھے کو توڑ دو۔ وہ توڑ نہیں سکے۔ پھر اس گٹھے کو کھول کر ایک ایک لکڑی ان سب
کے ہاتھ میں دے دیتا ہے جسے وہ آسانی سے توڑ لیتے ہیں، اس طرح وہ اتفاق کا سبق اپنی اولاد کے بچپن
نشین کرتا ہے۔ اس کہانی کو بھی لکھ لیا۔ تقریر کا آغاز ہوا۔ سوچا تو کچھ اس طرح کی تہذیب مناسب ہوئی کہ
پیارے ہم وطنو! —

گٹھا سر پہ ادبار کی چھارہ ہی ہے
فلاکت سماں اپنا دکھلا رہی ہے
نخواست پس و پیش منڈلا رہی ہے
یہ چاروں طرف سے ہوا آ رہی ہے
کد کون کون تھے آج کیا ہو گئے تم
ابھی جا گئے تھے، ابھی سو گئے تم

ہندوستان کے جس مایہ ناز شاعر یعنی مولانا الطاف حسین حالی پانی پتی نے آج سے کئی برس پہلے
یہ اشعار ظلم بند کئے تھے اس کو کیا معلوم تھا کہ جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا اس کے المناک الفاظ روز بروز
صحیح تر ہوتے جائیں گے۔ آج ہندوستان کی یہ حالت ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ —

اس کے بعد سوچا کہ ہندوستان کی حالت کا ایک دردناک نقشہ کھینچوں گا۔ افلاس، غربت، بغض
وغیرہ کی طرف اشارہ کروں گا، اور پھر پوچھوں گا کہ اس کی آخر وجہ کیا ہے؟ ان تمام وجوہ کو دہراؤں کا جو لگ

اکثر بیان کرتے ہیں، مثلاً غیر ملکی حکومت، آب و ہوا، مغربی تہذیب، لیکن ان سب کو باری باری غلط قرار
دوں گا۔ اور پھر اہلی وجہ بتاؤں گا کہ اہلی وجہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا تعلق ہے، پھر میں آخر میں اتحاد کی حیثیت
کوں گا اور تقریر کو اس اشعار پر ختم کرتا ہوں کہ

آمند لبِ بل کے کریں آہ و زاریاں

تو ہاتے گل پکار میں چلاؤں ہاتے دل

دس بارہ دن اہمی وطن مغرور کر لینے کے بعد میں نے اس تقریر کا ایک خاکہ سنا لیا اور اس کو ایک
کانفرنس پر لٹ کر لیا، تاکہ جلسے میں اسے اپنے سامنے رکھ سکوں، وہ خاکہ کچھ اس طرح کا تھا۔

(۱)۔ تمہید - اشعار حلی (ہند اور دُردنک آواز سے پڑھو)

(۲)۔ ہندوستان کی موجودہ حالت -

الف - اظاس

ب - بفس

ج - قومی رہنماؤں کی خود غرضی

(۳)۔ اس کی وجہ -

کیا غیر ملکی حکومت ہے؟ نہیں۔

کیا آب و ہوا ہے؟ نہیں۔

کیا مغربی تہذیب ہے؟ نہیں۔

تو پھر کیا ہے؟ (وقف) جس کے ذہان سکراتے ہوئے تمام ماضین پر ایک نظر ڈالو۔

(۴) پھر بتاؤ کیوں ہندوؤں اور مسلمانوں کا اتفاق ہے (غوروں کے لئے وقف) اس کا نقشہ کھینچو، فسادات

وغیرہ کا ذکر کرتے وقت رقت انگیز آواز میں کرو۔

(۵) خاتمہ - مام نصاب، خصوصاً اتحاد کی تلقین (شعر) کے بعد شاید پھر چند غرض بلند ہوں ان کے

لئے ٹھہر جاؤ۔ اس کے بعد انکساری کے امانتوں میں جا کر اپنی کرسی پر بیٹھ جاؤ، اور لوگوں کی دان کے جواب میں

ایک ایک لمحے کے بعد ماضین کو سلام کرتے رہو۔

اس خاکے کو تیار کر چکنے کے بعد جلسے کے دن تک ہر روز اس پر ایک نظر ڈالتا اور آئینے کے

سامنے کھڑے ہو کر بعض معرکتہ آرا انقروں کی مشق کرتا رہا۔ نمبر ۳ کے بعد کی مسکراہٹ کو خاص مشق بہم پہنچائی۔ کھڑے ہو کر راتیں سے باتیں، باتیں سے راتیں گھومنے کی عادت ڈالی تاکہ تقریر کے دوران میں آواز سب تک پہنچ سکے، اور سب لوگ اطمینان کے ساتھ ایک ایک لفظ سن سکیں۔

مُرید پور کا سفر آٹھ گھنٹے کا تھا۔ راستے میں سانگا کے اسٹیشن پر گاڑی بدنی پڑی تھی۔ انہن نوجوانان ہند کے بعض جو شیلے ارکان وہاں استقبال کے لئے آتے ہوتے تھے، انہوں نے ہار پہنائے اور کچھ پل وغیرہ کھانے کو دئے۔ سانگا سے مُرید پور تک ان کے ساتھ اہم سیاسی مسائل پر بحث کرتا رہا۔ جب گاڑی مُرید پور پہنچی تو اسٹیشن کے باہر کم از کم ہزار آدمیوں کا ہجوم تھا جو متواتر نعرے لگا رہا تھا۔ میرے ساتھ جو والنٹیر تھے انہوں نے کہا: سر باہر نکالئے، لوگ دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں نے حکم کی تعمیل کی، ہاں میرے گلے میں تھے، ایک ستر میرے ہاتھ میں تھا، مجھے دیکھا تو اور لوگ بھی جوش کے ساتھ نعرہ زن ہوئے۔ بمشکل تمام باہر نکلا۔ موٹر پر مجھے سوار کرایا گیا، اور جلوس جلسہ گاہ کی طرف چلا۔

جلسہ گاہ میں داخل ہوئے تو ہجوم پانچ چھ ہزار تک پہنچ چکا تھا جو ایک آواز ہو کر میرا نام لے لے کر نعرے لگا رہا تھا۔ داتیں باتیں شرح جمنڈیوں پر عجیب خاکسار کی تعریف میں چند کلمات بھی درج تھے، مثلاً ہندوستان کی نجات تمہیں سے ہے، مُرید پور کے فرزند خوش آمدید، ہندوستان کو اس وقت مل کی ضرورت ہے۔ مجھ کو شیخ پر بٹھایا گیا۔ صدر جلسہ نے لوگوں کے سامنے مجھ سے دوبارہ مصافحہ کیا اور میرے ہاتھ کو بوسہ دیا، اور پھر اپنی تعریفی تقریر اس طرح شروع ہوئی۔

حضرت! ہندوستان کے جس بلند پایہ لیڈر کو آج کے جلسے میں تقریر کرنے کیلئے بلا یا گیا ہے..... تقریر کا لفظ سن کر میں نے اپنی تقریر کے تہیدی نعروں کو یاد کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس وقت ذہن اس قدر مختلف تاثرات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا کہ نوٹ بک دیکھنے کی ضرورت پڑی۔ جیب میں ہتھ ڈالا نوٹ بک نکالا۔ ہاتھ پاؤں میں یک لخت خفیف سی شکنی محسوس ہوئی، دل کو سنبھالا کہ ٹھہرو! ابھی اور کئی چیزیں دیکھنی ہیں، گھبر تو نہیں۔ ریشے کے عالم میں سب جیسے دیکھ ڈالیں لیکن وہ نوٹ بک نہ ملی۔ تمام سال آنکھوں کے سامنے چکر کھانے لگا، دل نے زور زور سے دھڑکنا شروع کیا۔ ہونٹ خشک ہوتے ہوئے محسوس ہوئے، دس بارہ دفعہ تمام جیبوں کو ڈھونڈا، لیکن کچھ بھی ہاتھ نہ آیا، جی چاہا کہ زور زور سے روٹنا شروع کر دوں، مگر سب سے پہلے ہی ہونٹ کاٹنے لگا۔ صدر جلسہ اپنی تقریر ختم کر رہے تھے۔

”مرد پر کاشمیران پر جتنا بھی فکر کرے کم ہے، ہر صدی ممالک میں صرف چند ہی ایسے آدمی پیدا ہوتے ہیں جن کی ذات نوع انسانی کے لئے.....“

خایا، اب میں کیا کروں گا؟ ایک تو ہندوستان کی حالت کا نقشہ کھینچنا ہے۔۔۔ نہیں۔ اس سے پہلے یہ بتانا ہے کہ ہم کتنے نالائق ہیں۔۔۔ نالائق کا لفظ تو غیر موزوں ہو گا، جاہل کہنا چاہئے۔۔۔ یہ کمی ٹھیک نہیں۔۔۔ غیر ہندوب۔۔۔ ان کی اعلیٰ سیاست دانی کا قومی جوش اور مخلصانہ ہمدردی سے کون واقف نہیں، یہ سب باتیں تو خیر آپ جانتے ہیں لیکن تقریر کرنے میں جو ملکہ ان کو حاصل ہے۔۔۔ ہاں وہ تقریر کہان سے شروع ہوتی ہے، ہندو مسلم اتحاد پر تقریر، چند صفحات ضرور کرنی ہیں لیکن وہ تو اخیر میں ہیں، وہ درمیان میں سُکرا نا کہاں تھا۔

”میں آپ کو یقین دلانا ہوں کہ آپ کے دل ہلا دیں گے اور آپ کو خون کے آنسو رلائیں گے۔۔۔ صدر جلسہ کی آواز نعروں میں ڈوب گئی، دنیا سیرنی آنکھوں کے سامنے تاریک ہو رہی تھی۔ اتنے میں صدر نے مجھ سے کہا، مجھے الفاظ بالکل سنائی نہ دیتے۔ اتنا محسوس ہوا کہ تقریر کا وقت سوچاں پہنچا ہے، اور مجھے اپنی نشست سے اٹھنا ہے۔ چنانچہ ایک نامعلوم ملاقات کے ذریعہ اُٹھا۔ کچھ لڑکھڑایا، پھر سنبھل گیا میرا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ ہال میں ایک شور تھا، میں بیٹھنی سے فدا ہی ٹوڑ تھا، اور نعروں کی گونج ان لوگوں کے شور کی طرح سنائی دے رہی تھی جو ڈوبتے ہوئے انسان کے سر سے گزرتی ہوں، تقریر شروع کہان سے ہوتی ہے؟ لیٹروں کی خود مرضی بھی بیان کرنی ہے، اور کیا کہنا ہے؟ ایک کہانی بھی تو تھی، سچے اور مڑی کی کہانی۔۔۔ نہیں ٹھیک ہے روبیل۔۔۔“

اتنے میں ہال میں سنا ہوا چھا گیا۔۔۔ سب لوگ میری طرف دیکھ رہے تھے میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔۔۔ اور ہال کے لئے میز کو کھینچ لیا، میرا دوسرا ہاتھ بھی کانپ رہا تھا۔۔۔ وہ کمی میں نے میز پر رکھ دیا، اس وقت ایسا معلوم ہوا کہ میز بھاگنے کو ہے اور میں اُسے روک رہا ہوں۔۔۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور سکرانے کی کوشش کی۔ گلا خشک تھا، بھدک میں نے یہ کہا کہ پیارے بھولنو!

آواز غلاف تو قح بہت سی باہر اور منحنی سی اُٹھی، ایک شخص منبہ دیتے، میں نے گلے کو صاف کیا تو کچھ لوگ اٹھنا شروع ہوئے، میں نے جی سخت کر کے زور سے بولنا شروع کیا۔ پچھڑوں پر یک لخت جو بیل زور ڈالا تو آواز بہت ہی بلند آئی۔ اس پر بہت سے لوگ کھل کھلا کر منبہ دے، منبہ بھی تو میں نے کیا۔

”پیارے بھوٹنو۔“

اب کے بعد فلام لیا اور کہا۔

”پیارے بھوٹنو۔“

کچھ یوں آیا کہ اس کے بعد کیا کہنا چاہتے، بیسیں باتیں دلخ میں چکر لگانی تھیں۔ لیکن زبان تک ایک شائی تھی۔

”پیارے بھوٹنو۔“

اب کی بار لوگوں کی کنسی سے میں بھنا گیا۔ اپنی تو جین پر بڑا منقہ آرا تھا، ارادہ کیا کہ اس دفعہ جو منہ میں آیا کہہ دوں گا، ایک دفعہ تقریر شروع کر دوں تو کوئی مشکل نہ رہے گی۔

”پیارے بھوٹنو! بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان کی آب و ہوا خراب یعنی ایسی ہے کہ ہندوستان میں بہت سے نقص ہیں۔ بھجپ؟ (وقف) نقص ہیں۔ لیکن یہ بات یعنی جس امر کی طرف میں نے

اشارہ کیا ہے۔ گویا چنداں صحیح نہیں۔ (تہقیر)

حساس معطل ہو رہے تھے، سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر تقریر کا سلسلہ کیا تھا؟
 ایک لخت بیلوں کی کہانی یاد آئی اور راستہ کچھ صاف ہوتا دکھائی دیا۔
 ہاں تو بات رد آئی۔ ہے کہ ایک جگہ دو بیل اکٹھے رہتے تھے، جو باوجود آب و ہوا اور غیر ملکی حکومت کے
 (زور کا تہقیر)

یہاں تک پہنچ کر محسوس لیا کہ کلام بے ربط سا ہو رہا ہے، میں نے کہا چلو، وہ لکڑی کے گٹھے کی کہانی شروع کر دیں۔

”مثلاً آپ لکڑیوں کے ایک گٹھے کو لیجئے، لکڑیاں چونکہ اکثر لوگ غریب ہیں اس لئے ہندوستان میں انلاس بہت ہے، گویا چونکہ اکثر لوگ غریب ہیں اس لئے گویا لکڑیوں کا گٹھا، یعنی آپ دیکھتے ناکہ لکڑی۔“
 (بلند اور طویل تہقیر)

حضرات! اگر آپ نے عقل سے کام لیا تو آپ کی قوم فنا ہو جاتے گی، خواہست مند لاتی ہے۔
 (تہقیر اور شور و غوغا) ”اسے باہر نکالو، ہم نہیں سنتے۔“

”شیخ سعدی نے کہا ہے کہ ۵ جواز قویے یکبے دانشی کرد۔“

آمان آتی کیا کہتا ہے — خیر اس بات کو جانے دیجئے، بہر حال اس بات میں تو کوئی شبہ نہیں
 ہو سکتا کہ ————— آئندہ لیٹل کے کریں آہ و زاریاں
 تو ہائے دل پکا میں چلاؤں ہائے دل
 اس شعر نے دورانِ خون اور تیز کر دیا، ساتھ ہی لوگوں کا شور بھی بہت زیادہ ہو گیا چنانچہ میں بڑے
 جوش سے بولنے لگا۔

جو قویں اس وقت بیداری کے آسمان پر چڑھی ہوئی ہیں ان کی زندگیاں لوگوں کے لئے
 شاہراہ ہیں اور ان کی حکومتیں چار دانگ عالم کی بنیادیں بنا رہی ہیں (لوگوں کا شور اور
 ہنسی اور بڑھتی گئی) آپ کے لیڈروں کے کان پہ خود غرضی کی پی بندھی ہوئی ہے، دنیا
 کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ زندگی کے وہ تمام شعبے —————
 لیکن لوگوں کا شور و غوغا اور قہقہے اتنے بلند ہو گئے کہ میں اپنی آواز بھی نہ سن سکتا تھا۔ اکثر لوگ
 اٹھ کھڑے ہوئے اور گلا پھاڑ پھاڑ کر کہہ رہے تھے میں سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ جھوم میں سے
 کسی شخص نے بارش کے پہلے قطرے کی طرح ہمت کر کے سگرٹ کی ایک خلی ڈبیہ مجھ پر پھینک دی اس کے
 بعد چارپنچ کاغذ کی گولیاں میرے ارد گرد اسی طرح بر آئیں۔ لیکن میں نے اپنی تقریر کا سلسلہ جاری رکھا۔
 ”حضرات! تم یاد رکھو، تم تباہ ہو جاؤ گے!“
 ”تم روہیل ہو۔“

لیکن جب بوچھاڑ بڑھتی ہی گئی تو میں نے اس نامعقول مجمع سے کناہ کشی ہی مناسب سمجھی اسٹیج
 سے پھلانگتا، زقند بھر کے دروازے سے باہر بھاگا۔ جھوم بھی میرے پیچھے لپکا میں نے مڑ کر دیکھے نہ دیکھا بلکہ
 سیدھا بھاگتا گیا۔ وقتاً فوقتاً نامناسب کلمے میرے کالوں تک پہنچ رہے تھے، ان کو سن کر میں نے اپنی رفتار
 اور تیز کر دی اور سیدھا اسٹیشن کا رخ کیا ایک ٹرین پلیٹ فوڈ پر کھڑی تھی میں بے تماشاً اس میں گھس گیا۔
 ایک لمحے کے بعد ٹرین وہاں سے چل دی۔

اس بلان کے بعد آج تک نہ مرید پور مجھے ملو کیا گیا ہے، اور نہ مجھے خود وہاں جانے کی خواہش پیدا

ہوتی۔

انجام بخیر

منظر ۱۔ ایک تنگ و تاریک کمرہ جس میں بجز ایک پرانی سی میز اور لرزہ برانڈا کرسی کے اور کوئی فرنیچر نہیں۔ زمین پر ایک طرف چٹائی بھی ہے جس پر بے شکل کتابوں کا انبار لگا ہے، جہاں جہاں کتابوں کی پشتیں نظر آتی ہیں وہاں شیکسپیر، مہاشائی، ورڈزور تھ وغیرہ مشاہیر ادب کے نام دکھائی دے جاتے ہیں۔ باہر کہیں پاس کتے بھونک رہے ہیں، قریب ہی ایک برت آتری ہوئی ہے۔ اسکے مینڈ کی آواز بھی سنائی دے رہی ہے جس کے جانے والے دن، در، کھانسی اور اسی قسم کے دیگر امراض میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں۔ ڈھول بجانے والے کی صحت البتہ اچھی ہے۔

پطرس نامی ایک نادار معلم میز پر کام کر رہا ہے، نوجوان ہے لیکن چہرے پر گزشتہ تندرستی اور خوش باشی کے آثار کہیں کہیں باقی ہیں۔ آنکھوں کے گرد سیاہ طلقے پڑے ہوئے ہیں، چہرے سے ذہانت پسینہ بن کر ٹپک رہی ہے، سامنے ٹکلی ہوئی جبتی سے معلوم ہوتا ہے کہ مہینے کی آخری تاریخ ہے۔ باہر سے لونی دروازہ کھٹکتا ہے، پطرس اٹھ کر دروازہ کھول دیتا ہے، تین طالب علم نہایت عمدہ لباس زیب تن کئے اندر داخل ہوتے ہیں۔

پطرس ۱۔ حضرات اندر تشریف لائیے، آپ دیکھتے ہیں کہ میرے پاس صرف ایک کرسی ہے لیکن جاہ و حشمت کا خیال بہت بوجھ خیال ہے، علم بڑی نعمت ہے۔ لہذا اے میرے فرزندو! اس انبار سے ضخیم کتابیں انتخاب کر لو، اور ان کو ایک دوسرے کے اوپر چرچن لو، پھر ان پر بیٹھ جاؤ۔ معلم ہی تم لوگوں کا اور صفا اور علم ہی تم لوگوں کا بچھونا ہونا چاہئے۔

کمرے میں پراسرار نور سا چھا جاتا ہے، فرشتوں کے پردوں کی پھر پھر اہٹ سنائی دیتی ہے۔ طالب علم ۱۔ (میںوں مل کر) اے خدا کے برگزیدہ بندے، اے ہمارے محترم استاد، ہم آپ کا حکم ماننے کو

تیار ہیں، علم ہی لوگوں کا اور حنا ہے اور علم ہی بچھونا ہونا چاہتے۔

(کتابوں کو جوڑ کر ان پر بیٹھ جاتے ہیں)

پطرس۔ کہو اے ہندوستان کے سپوتو! آج تم کو کون سے علم کی تشنگی میرے دروازے تک کشاں کشاں لے آئی۔

پہلا طالب علم۔ اے نیک انسان! ہم آج تیرے احسانوں کا بدلہ اٹارنے آئے ہیں۔

دوسرا طالب علم۔ اے فرشتے! ہم تیری نوازشوں کا ہدیہ پیش کرنے آئے ہیں۔

تیسرا طالب علم۔ اے ہلکے مہربان! ہم تیری محنتوں کا پھل تیرے پاس لاتے ہیں۔

پطرس۔ یہ نہ کہو، یہ نہ کہو۔ یہ میری محنت کا پھل ہے۔ کلچ کے مقررہ اوقات کے علاوہ جو کچھ میں نے تم کو

پڑھایا اس کا معاوضہ مجھ سے وقت وصول ہو گیا جب میں نے تمہاری آنکھوں میں زکات کی چمک دکھی،

اے! کیا تم جانتے ہو کہ تعلیم و تدریس کیسا آسانی پیش ہے؟ تاہم تمہارے الفاظ میرے دل میں ایک عجیب

سرت سنبھرتے ہیں، مجھ پر اعتماد کرو اور بالکل مت گھبراؤ، جو کچھ کہنا ہے تفصیل سے کہو۔

پہلا طالب علم۔ (سرو قد اور دست بستہ کھڑا ہو کر) اے محترم استاد! ہم علم کی بے بہا دولت سے محروم

تھے۔ دس کے مقررہ اوقات سے ہماری پیاس بجھ سکتی تھی، پولیس اور سول سروس کے امتحانات کی آزمائش

کڑی ہے، آپ نے ہماری دست گیری کی، اور ہمارے تارک دماغوں میں اجالا ہو گیا۔ محرز استاد! آپ جانتے

ہیں آج ہنس کی آخری تاریخ ہے، ہم آپ کی خدمتوں کا حقیرانہ صلہ پیش کرنے آئے ہیں آپ کے علاوہ تجربہ

اور بزرگانہ شفقت کی حیرت کوئی ادا نہیں کر سکتا، تاہم ظاہر تشکر کے طور پر جو کم مایہ رقم ہم آپ کی خدمت میں پیش

کریں اسے قبول فرمائیں۔ ہماری احسان مندی اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔

پطرس۔ تمہارے الفاظ سے ایک عجیب بے قراری میرے جسم پر طاری ہو گئی ہے۔

(پہلے طالب علم کا اشارہ پا کر مائی طالب علم بھی کھڑے ہو جاتے ہیں۔ باہر بیٹریک لخت بجنگلتا ہے)

پہلا طالب علم۔ (آگے بڑھ کر) اے مہربان محمد حقیر کی خدمتوں فرمائیے (بڑے ادب و احترام کے ساتھ

الٹنی پیش کرتا ہے)

دوسرا طالب علم۔ (آگے بڑھ کر) اے نیک انسان! مجھ ناچیز انسان کو تفریح فرما۔ (الٹنی پیش کرتا ہے)

تیسرا طالب علم۔ (آگے بڑھ کر) اے محترم استاد! مجھ ناچیز انسان کو تفریح فرما۔ (الٹنی پیش کرتا ہے)

پطرس۔ (جنابت سے بے قابو ہو کر رقت انگیز آواز سے) اے میرے فرزندو! خدا کی رحمت تم پر

بازل ہو۔ تمھاری حادثہ مندی اور فرض شناسی سے میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ تم لوگوں میں دنیا میں آرام اور آخرت میں نجات نصیب ہو۔ اور خدا تمھارے علم کے نور سے سینوں کو منور کرے۔ (تینوں اٹھنیاں اٹھا کر بیزپر رکھ لیستائے)

طالب علم :- (تینوں مل کر) اللہ کے برگزیدہ بندے! ہم فرض سے سبکدوش ہو گئے۔ اب ہم اجازت چاہتے ہیں کہ گھر پر ہمارے والدین ہمارے لئے بیتاب ہوں گے۔

پطرس :- خدا تمھارا حامی و ناصر ہو۔ اور تمھاری عم کی پیاس اور جی بڑھتی رہے۔

(طالب علم چلے جاتے ہیں)

پطرس :- (تہائی میں سر سجد ہو کر) باری تعالیٰ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے مجھ اپنی ناہیز محنت کے ثمرے کے لئے بہت دنوں انتظار میں رکھا۔ تیری رحمت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ لیکن ہماری کم مانگی اس سے بھی کہیں بڑھ کر ہے۔ اور یہ تیری ذاتی فضل و کرم ہے کہ تیرے وسیلے سے اوندوں کو بھی بزدق ملتا ہے۔ اور جو ملازم بے شہری خدمت کرتا ہے اس کا تو کنفیسل مجھ کو بنا رکھا ہے۔ تیری رحمت کی کوئی انتہا نہیں۔ اور تیری بخشش ہمیشہ ہمیشہ جاری رہے والی ہے۔

کمرے میں ایک بار پھر ایک پڑا پڑا سی لٹائی چھاتی ہے، اور فرشتوں کے ہرول کی پھر پھر اہٹ سنائی دیتی ہے۔ کچھ دیر کے بعد پطرس بندے سے سر اٹھاتا ہے اور ملازم کو آواز دیتا ہے۔

پطرس :- اے خدا کے دیانت دار اور بھتی بندے! یہاں تو آؤ۔

ملازم :- (باہر سے) "اے میرے غرش خصال آقا! میں کھانا پکا کر آؤں گا۔" قہیل شیطان کا کام ہے۔

(ایک طویل وقفہ جس کے دوران درختوں کے سائے ڈونگنے لے جھگٹے ہیں)

پطرس :- آہ! انتظار کی گھڑیاں کس قدر شیریں ہیں۔ کتوں کے بھونکنے کی آواز کس خوش سسلوبی سے جینڈکی آواز کے ساتھ مل رہی ہے۔ (سر سجد کرتا ہے)

پھر کھڑکریز کے سامنے بیٹھ جاتا ہے، اٹھنیوں پر نظر پڑتی ہے، ان کو فوراً کتاب کے نیچے

چھپا دیتا ہے۔

پطرس :- آہ! مجھے زرد دولت سے نفرت ہے، خدا یا میرے دل کو دنیا کے لالچ سے پاک کیو۔

(ملازم اندر آتا ہے)

پطرس ۱۔ لے مزدور پیشہ انسان۔! مجھے تجھ پر رحم آتا ہے کہ ضیاعِ علم کی ایک کرن بھی تیرے سینے میں داخل نہ ہوئی۔ خداوند تعالیٰ کے دربار میں تم ہم سب برابر ہیں۔ تو جانتا ہے آج مہینے کی آخری تاریخ ہے، تیری تنخواہ کی ادائیگی کا وقت سوسہ آگیا، خوش ہو کہ آج تجھے تیری مشقت کا معاوضہ مل جائے گا، یہ تین آٹھنیاں قبول کر اور باقی ساڑھے اٹھارہ روپے کے لئے کسی لطیفہ غیبی کا انتظار کر۔ دنیا امید پر قائم ہے اور مایوسی کفر ہے۔ (ملازم آٹھنیاں زود سے زمین پر پھینکا گھر سے باہر نکل جاتا ہے)۔ (بینڈ زور سے بجنے لگتا ہے)

پطرس ۲۔ خدایا بکتر کے گناہ سے ہم سب کو چپاے اور ادنیٰ طبقے کے لوگوں کا ساغر وہ ہم سے دوا لے۔ (پھر کام میں مشغول ہو جاتا ہے)

باورچی خانے سے کھانا جلنے کی بو آ رہی ہے۔ ایک طویل وقفہ جس کے دوران یہ درختوں کے ساتھ پہلے سے چوگنے لے ہو گئے ہیں۔ (بینڈ بے ستونج رہا ہے)

یک نخت باہر سڑک پر موٹروں کے آکر رُک جانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ستھوڑی دیر یہ کوئی شخص دروازے پر دستک دیتا ہے۔

پطرس ۱۔ (کام پتے سے سر اٹھا کر) اے شخص تو کون ہے؟

ایک آواز۔ (پتے کے حضور میں غلاموں کا غلام ہوں، اور یا ہر دست بستہ کھڑا ہوں بلکہ اجازت ہو تو اندر آؤں اور عرض حال کروں۔

پطرس ۱۔ (دل میں) میں اس آواز سے نا آشنا ہوں، لیکن لہجے سے پتہ چلتا ہے کہ بولنے والا آٹھنیاں کا شخص ہے۔ (بلند آواز سے) اندر آ جاتیے۔

دروازہ کھلتا ہے اور ایک شخص لباسِ فاخر پہنے اندر داخل ہوتا ہے، گوچرے سے قلعہ بنا ہے لیکن نظر میں زمین دوز ہیں، اور ادب و احترام سے ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔

پطرس ۱۔ آپ دیکھتے ہیں کہ میرے پاس صرف ایک ہی کرسی ہے، لیکن جاہ و شہرت کا خیال ہی پہنچ خیال ہے۔ علم بڑی نعمت ہے۔ لہذا اے محترم اجنبی! اس دربار میں سے چند منعم کتلا انتخاب کر لو، اور ان کو ایک دوسرے کے اوپر چن کر بیٹھ جاؤ۔ علم ہی لوگوں کا بھونٹا اور علم ہی آٹھنیاں کا اور حنا ہونا چاہئے۔

اجنبی :- "اے برگزیدہ شخص! میں تیرے سامنے کھڑے رہنے میں ہی اپنی سہولت سمجھتا ہوں۔

پطرس :- تمہیں کون سے علم کی تشنگی میرے دروازے تک کٹاں کٹاں لے آتی ہے؟

اجنبی :- "اے ذی محترم! آپ میری صحت سے واقف نہیں، میں محکمہ تعلیم کا افسر اعلیٰ ہوں۔ اور

شرمندہ ہوں کہ کبھی آج تک نیاز حاصل کرنے کے لئے حاضر نہ ہوا۔ میری اس کوتاہی اور غفلت کو اپنے علم و فضل کے صدقے معاف کر دو۔ (آبریدہ ہو جاتا ہے)

پطرس :- "اے خدا! یہ سب کیا وہم ہے! یا میری آنکھیں دھوکہ کھا رہی ہیں؟

اجنبی :- مجھے تعجب نہیں کہ تم میرے آنے کو وہم سمجھو، کیونکہ آج تک ہم نے تم جیسے برگزیدہ انسان

تو اس قدر غفلت برتی کہ مجھے خود اچھا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مجھ پر یقین کرو میں نبی الحقیقت یہاں

تمہاری خدمت میں کھڑا ہوں اور تمہاری آنکھیں تمہیں برگزیدہ دھوکہ نہیں دے رہی ہیں، اے شریف

اور غمزدہ انسان، اگر یقین نہ ہو تو میرے جسم پر چنگی لے کر میرا امتحان کر لو۔

(پطرس اجنبی کے چنگی لیتا ہے اور اجنبی زور سے چختا ہے)

پطرس :- "آپ فرمائیے میں سن رہا ہوں، گو مجھے یقین نہیں ہے کہ یہ عالم بیداری ہے۔

راجن تلی بجاتا ہے، پھر خدام چوبڑے بڑے منہوق اٹھا کر اندر داخل ہوتے ہیں اور زمین

پر رکھ کر بڑے آرب سے کورنش بجا کر چلے جاتے ہیں)

اجنبی :- (صندوقوں کے ڈھکنے کھول کر) میں بادشاہِ معظم شاہزادہ دلیز، دیسلرے ہند اور کمانڈر ان

اس پاہوں کے ایار پر بربریت کاغذ آپ کی خدمت میں آپ کے علم و فضل کی قدر دانی کے طور پر لے کر حاضر

ہوا ہوں (جہرائی ہوئی آواز سے) ان کو قبول کیجئے اور مجھے مایوس نہ کیجئے ورنہ ان سب کا دل ٹوٹ جائیگا

پطرس :- (صندوقوں کو دیکھ کر سونا! اشرفیاں! جواہرات! مجھے یقین نہیں آتا) آیتہ الکرسی

پڑھنے لگتا ہے!

اجنبی :- ان کو قبول کیجئے اور مجھے واپس نہ بھیجئے۔ (انسٹوٹپ ٹپ کرتے ہیں)

گانا۔ "آج موری آنکھیاں پل نہ لائیں"

پطرس :- "اے اجنبی! تیرے آنسو کیوں گرنے لگے ہیں، اور تو گانا کیوں گارہا ہے، مسموم ہوتا ہے تجھے

اپنے بندبات پر قابو نہیں ہے، یہ تیری کمزوری کی نشانی ہے۔ خدا تجھے تقویت دے اور بہت دے، میں

خوش ہوں کہ تو اورتی ہے آقا علم سے اس قدر محبت رکھتے ہیں۔ بس اب ہمارے مطالعے کا وقت ہے کل کل میں اپنے لیکچر سے میں چار پانچ سو رُوحوں کو خوابِ جہالت سے جگانا ہے۔
 اجنبی :- (سبکیاں بھرتے ہوئے) مجھے اجازت ہو تو میں حاضر ہو کر آپ کے خیالات سے مستفید ہوں؟

پطرس :- خدا تمہارا حامی و ناصر ہو، اور تمہارے علم کی پیاس اور کھبی بڑھتی ہے۔
 (اجنبی رخصت ہو جاتا ہے۔ پطرس صندوق کو کھولی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہتا ہے اور پھر کتختِ مستر کی ایک چیخ مار کر گر پڑتا ہے اور مر جاتا ہے) اگے میں ایک پراسرار نور چھا جاتا ہے اور فرشتوں کے پروں کی پھر پھر اہٹ سنانی دیتی ہے۔ بارہ بیٹے باج بیج رہا ہے۔

سینا کا عشق

”سینا کا عشق“ عنوان تو عجیب ہو س خیز ہے لیکن افسوس کہ اس مضمون سے آپ کی توقعات مجروح ہوں گی، کیونکہ مجھے تو اس مضمون میں کچھ دل کے داغ دکھانے مقصود ہیں۔ اس سے آپ یہ نہ سمجھیے کہ مجھے فلموں سے دلچسپی نہیں، یا سینا کی سوتیلی اور تارکین میں جو کچھ رومان انگیزی ہے، میں اس کا قائل نہیں، میں تو سینا کے معاملے میں اوائل عمری سے ہی بزرگوں کا موردِ عقاب رہ چکا ہوں۔ لیکن آج کل ہمارے دوست مرزا صاحب کی مہربانیوں کے طفیل سینا گویا میری ایک دکھتی ہوئی رگ بن کر رہ گیا ہے۔ جہاں اس کا ہم سُن پاتا ہوں بعض رزدا انگیز واقعات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جس سے رفتہ رفتہ فطرت ہی کج بیس بن گئی ہے۔

اول تو خدا کے فضل سے ہم سینا کبھی وقت پر نہیں پہنچ سکے، اس میں میری سستی کو ذرا دخل نہیں، یہ سب تصور ہمارے دوست مرزا صاحب کا ہے جو کہنے کو تو دوست ہیں لیکن خدا شاہد ہے کہ ان کی دوستی سے جو نقصان ہیں پہنچے ہیں کسی دشمن کے بھی قبضہ قدرت سے باہر ہوں گے۔ جب سینا جائے کا ارادہ ہوتا ہے تو ہفتہ بھر پہلے انھیں کہہ دیتا ہوں کہ کیوں کبھی مرزا جی، اگلی جمعرات کو سینا چلو گے نا؟ میری مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ پہلے سے تیار رہیں اور اپنی تمام مصروفیتیں کچھ اس ڈھب سے ترتیب دے لیں کہ جمعرات کے دن ان کے کام میں کچھ حرج واقع نہ ہو۔ لیکن وہ جواب میں عجیب قدر شناسی فرماتے ہیں۔

”ارے کبھی چلیں گے کیوں نہیں؟ کیا ہم انسان نہیں؟ ہمیں تفریح کی ضرورت نہیں ہوتی اھ پھر کبھی ہم نے ایسی بے مروتی آج تک برتی ہے کہ تم نے چلنے کو کہا ہوا ہے پھر ہم نے تمہارا ساتھ نہ دیا ہوا؟“ ان کی تقریر سن کر میں کھسیانا سا ہوجاتا ہوں، کچھ دیر چپ رہتا ہوں اور پھر دبی زبان سے کہتا ہوں۔

”بھئی اب کے ہو سکا تو وقت پر پہنچیں گے۔ ٹھیک ہے نا؟“
میری یہ بات عام طور پر ٹال دی جاتی ہے، کیونکہ اس سُن کا منیر کچھ تھوڑا سا بیدار ہو جاتا ہے،
خیر میں بہت زور نہیں دیتا، صرف ان کو بات سمجھانے کے لئے اتنا کہہ دیتا ہوں۔

”کیوں بھئی! آج کل سینا چوبکے شروع ہو جاتا ہے نا؟“
مرزا صاحب عجیب مصومیت کے انداز میں جواب دیتے ہیں۔
”بھئی یہ تم کو معلوم نہیں؟“

”میرزا خیال ہے چوبکے ہی شروع ہوتا ہے۔“
”اب تمہارے خیال کی کوئی سند نہیں۔۔۔“
”نہیں مجھے یقین ہے، چوبکے شروع ہوتا ہے؟“
”تمہیں یقین ہے تو میرا دلغ کیوں مفتد میں چاٹ رہے ہو؟“
اس کے بعد آپ ہی کہتے کہ کیا بولوں؟

خیر جناب! جمعرات کے دن چوبکے ہی ان کے مکان پر روانہ ہو جاتا ہوں اس خیال سے کہ
جلدی جلدی انہیں تیار کر کے وقت پر پہنچ جائیں، دولت خانے پر پہنچتا ہوں تو آدم نہ آدم زاد۔ سارے
مردانے کمرے گھوم جاتا ہوں، ہر کھڑکی سے جھانکتا ہوں، ہر کھٹکے سے آواز دیتا ہوں، لیکن کہیں سے سید
نہیں ملتی۔ آخر تنگ آ کر ان کے کمرے میں بیٹھ جاتا ہوں، وہاں دس پندرہ منٹ بیٹھاں بجاتا رہتا ہوں۔

دس پندرہ منٹ بلاٹنگ پیپر پر تصویریں بنانا رہتا ہوں، پھر سگریٹ سلگاتا ہوں اور باہر
ڈیوڑھی میں کھل کر ادھر ادھر جھانکتا ہوں۔ وہاں بدستور ہو کا عالم دیکھ کر کمرے میں واپس آ جاتا
ہوں اور اخبار پڑھنا شروع کر دیتا ہوں۔ ہر کام کے بعد مرزا صاحب کو آواز دے لیتا ہوں،
اس امید پر کہ شاید ساتھ کے کمرے میں یا عین اوپر کے کمرے میں تشریف لے آتے ہوں؟
سورجے تھے تو سمکن ہے جاگ اٹھے ہوں؟ یا نہا رہے تھے تو شاید غسل خانے سے باہر نکل
آتے ہوں؟ لیکن میری آواز مکان کی دستوں سے گونج کر واپس آ جاتی ہے، آخر کار ساڑھے
پانچ بجے کے قریب زنانے سے تشریف لاتے ہیں۔ میں اپنے کھولتے ہوئے خون کو قابو میں
لا کر متانت اور اخلاق کو بڑھی شکل سے مد نظر رکھ کر پوچھتا ہوں۔

”کیوں حضرت — آپ اندر ہی تھے؟“

”میری آواز آپ نے نہیں سنی؟“

”اچھا یہ تم تھے، میں سمجھا کوئی اور ہے۔“

”آنکھیں بند کر کے سر کو پیچھے ڈال لیتا ہوں اور دانستہ میں کر غصے کو پی جاتا ہوں اور پھر

کانپتے ہوئے ہونٹوں سے پوچھتا ہوں۔

”تو اچھا آپ طلپیں گے یا نہیں؟“

”وہ کہاں —؟“

”ارے بندہ خدا، آج سینا نہیں جانا۔“

”ہاں ہاں، سینا سینا، یہ کہہ کر وہ کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں، ٹھیک بے سینا میں بھی سوچ

رہا تھا کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے ایسی جو مجھے یاد نہیں آتی، اچھا ہوا تم نے یاد دلایا — ورنہ

مجھے رات بھر الجھن رہتی۔

”تو پھر اب طلپیں۔“

”ہاں وہ تو طلپیں گے ہی، میں سوچ رہا تھا کہ آج ذرا کپڑے بدل لیتے، خدا جانے دھوبی

کبھی کپڑے بھی لایا ہے یا نہیں، یا ان دھوبیوں کا تو کوئی انتظام کرو۔ اگر قتلِ انسانی ایک

سنگین جرم نہ ہوتا تو ایسے موقع پر مجھ سے ضرور سرزد ہو جاتا، لیکن کیا کروں، اپنی جوانی پر حرم

کھاتا ہوں، بے بس ہوں، صرف یہ ہی کہہ سکتا ہوں۔

”بھئی مرزا، اللہ مجھ پر رحم کرو، میں سینا چلنے کو آیا ہوں، دھوبیوں کا انتظام کس نے نہیں

آیا، یا رب بے بدتیز معلوم ہوتے ہو، پونے پونے چمکے ہیں اور تم جوں کے توں بیٹھے ہو۔“

مرزا صاحب عجیب مریا تہ بستم کے ساتھ کرسی سے اٹھتے ہیں گویا یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ

اچھا بھئی منخاری طفلانہ خواہش آخر ہم پوری کر ہی دیں چنانچہ پھر یہ کہہ کر تشریف لے جاتے ہیں

کہ اچھا کپڑے پہن آؤں۔

مرزا صاحب کے کپڑے پہننے کا عمل اس قدر طویل ہے کہ اگر میرا اختیار چلے تو قانون کی

رُو سے انھیں کپڑے اتارنے ہی نہ دوں۔ آج گھنٹے کے بعد وہ کپڑے پہنے ہوئے تشریف لائے

ہیں۔ ایک پان منغ میں اور دوسرا ہاتھ میں بھی، اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ دہانے تک پہنچ کر مڑ کے دیکھتا ہوں تو مرزا صاحب غائب، پھر اندر جاتا ہوں، مرزا صاحب کسی کونے میں کھڑے کچھ کڑید کر رہے ہیں۔

”ارے بھائی چلو۔“

”ہل تو رہا ہوں یار، آخر اتنی بھی کیا آفت ہے۔“

”اور یہ تم کیا کر رہے ہو۔“

”پان کے لئے تمباکو لے رہا تھا۔“

تمام راستے مرزا صاحب پہل قدمی فرماتے رہے، میں ہر دو تین لمحے کے بعد اپنے آپ کو ان سے چار پانچ قدموں آگے پاتا ہوں، کچھ دیر ٹھہر جاتا ہوں تو پھر چلنا شروع کر دیتا ہوں..... پھر آگے نکل جاتا ہوں..... پھر ٹھہر جاتا ہوں..... غزنی کے چلتا دوگنی رفتار سے ہوں اور پہنچتا ان کے ساتھ ہوں۔

بھٹ لے کر اندر داخل ہوتے ہیں تو اندھیرا گھپ۔ بہتیرا آنکھیں جھپکاتا ہوں، کچھ بھجائی نہیں دیتا۔ ادھر سے کوئی آواز لگاتا، دروازہ بند کر دو جی۔ یا اللہ اب جاؤں کہاں۔۔۔ رستہ کرسی، دیوار، آدمی کچھ بھی تو نظر نہیں آتا، ایک قدم اور آگے بڑھاتا ہوں تو سہ ان بالٹیوں سے جا ٹکراتا ہے جو آگ بھجانے کے لئے دیوار پر لٹکی رہتی ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد تاریکی میں کچھ دھنسلے سے نقش دکھائی دینے لگتے ہیں، جہاں ذرا تاریک سا دھبہ دکھائی دے جائے وہاں سمجھتا ہوں خالی کرسی ہوگی، خمیدہ پشت ہو کر اس کا رخ کرتا ہوں، اس کے پاؤں کو پھاند، اس کے گھٹنوں کو ٹکرا، خواتین سے دامن بچا، آخر کار کسی کی گود میں جا بیٹھتا ہوں تو وہاں سے نکال دیا جاتا ہوں، اور لوگوں کے دھکوں کی مدد سے کسی خالی کرسی تک جا پہنچتا ہوں، مرزا صاحب سے کہتا ہوں۔ میں نہ بکتا تھا کہ جلدی چلو، خواہ مخواہ ہم کو رسوا کر دیا نا! گدھا کہیں کا! اس شگفتہ بیانی کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ساتھ کی کرسی پر جو بزرگ بیٹھے ہیں اور جن کو میں مخاطب کر رہا ہوں وہ مرزا صاحب نہیں کوئی اور بزرگ ہیں۔

اب تماشے کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ فلم کونسا ہے؟

اس کی کہانی کیا ہے، اور کہاں تک پہنچ چکی ہے، سمجھ میں صرف اس قدر آتا ہے کہ ایک عورت اور ایک مرد جو پہلے پر بغل گیر نظر آتے ہیں ایک دوسرے کو چاہتے ہوں گے۔ اس انتظار میں رہتا ہوں کہ کچھ لکھا ہوا سامنے آئے تو معاملہ کھلے۔ اتنے میں سامنے کی کرسی پر بیٹھے ہوئے حضرت ایک وسیع اور فرخ انگیزی لیتے ہیں جس کے دوران میں کہا کہ دو تین سو فٹ فلم گزر جاتا ہے جب انگیزی کی لپیٹ لیتے ہیں تو پھر سر کھجانا شروع کرتے ہیں، اور اس عمل کے بعد ہاتھ کو تہ نہیں ہٹاتے بلکہ بازو کو ویسے ہی خمیدہ رکھے رہتے ہیں، میں مجبوراً سر کو نیچا کر کے چلتے دلتی کے دستے کے بیچ میں سے اپنی نظر کے لئے راستہ نکال لیتا ہوں اور اپنے بیٹھنے کے انداز سے باہر مختلف ایسا معلوم ہوتا ہوں جیسے ٹکٹ خریدے بغیر اندر گھس آیا ہوں، اور چوروں کی طرح بیٹھ ہوا ہوں، تھوڑی دیر کے بعد انھیں کرسی کی پشت پر کوئی پتھر یا پالتو پتھر معلوم ہوتا ہے، چنانچہ وہ دائیں طرف سے اُونچے ہو کر بائیں طرف کو جھک جاتے ہیں، میں مصیبت کا مارا دوسری طرف جھک جاتا ہوں، ایک دو لمحے بعد ہی وہ پتھر دوسری طرف ہجرت کر جاتا ہے، چنانچہ ہم دونوں پتھر سے مینٹرا بل لیتے ہیں، غرض یہ دل لگی یوں ہی جاری رہتی ہے، وہ دائیں تو میں بائیں، میں بائیں تو وہ دائیں۔ ان کو کیا معلوم کہ اندھیرے میں کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے، دل یہی چاہتا ہے کہ اگلے درجے کا ٹکٹ لے کر ان کے آگے ہا بیٹھوں اور کہوں "لے بیٹا" دیکھوں تو اب اُ کیسے فلم دیکھتا ہے۔

"پچھلے سے مرزا صاحب کی آواز آتی یا تم سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا اب جو ہیں ساتھ لائے ہو تو تم فلم دیکھنے دو"

اس کے بعد غصے میں آکر آنکھیں بند کر لیتا ہوں، اور قتل عدا، خود کشی، زہر خورانی کے معاملات پر غور کرنے لگتا ہوں، دل میں کہتا ہوں، ایسی کی تیسی اس فلم کی، سو ستی میں کھاتا ہوں کہ پھر کبھی نہ آؤں گا، اور اگر آیا بھی تو اس کمبخت مرزا سے ذکر نہیں کروں گا، پانچ چھ گھنٹے پہلے آجاؤں گا، اوپر کے درجے میں سب سے اگلی قطار میں بیٹھوں گا، تمام وقت اپنی نشست پر بیٹھا رہوں گا، بہت بڑے طرے والی پگڑی پہن کر آؤں گا، اپنے اُوپر کوٹ کو دو چھریوں پر رکھا رہوں گا

بہر حال مرزا کے پاس نہ پھٹکوں گا۔

لیکن اس کمبخت دل کو کیا کروں، اگلے سفتے پھر سی اچھے فلم کا اشتہار دیکھ پاتا ہوں تو
 سب سے پہلے مرزا کے پاس جاتا ہوں، اور لغت کو پھر وہیں سے شروع ہوتی ہے کہ کیوں کھتی مرزا
 اگلی جمعرات کو سینا چلو گے نا۔؟

— (۴) —

میل اور میں

میل ٹرکیوں کے کالج میں تھی، لیکن ہم دونوں کیمبرج یونیورسٹی میں ایک ہی مضمون پڑھتے تھے اس لئے اکثر لیکچروں میں ملاقات ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ہم دوست بھی تھے کبھی لچسپوں میں ایک دوسرے کے شریک ہوتے تھے۔

تصویروں اور موسیقی کا شوق اسے بھی تھا۔ میں بھی جمہ دانی کا دعویٰ کرتا تھا۔ اکثر لیلریوں یا کانٹروں میں اکٹھے جایا کرتے تھے دونوں انگریزی ادب کے طالب علم تھے، کتابوں کے متعلق باہم مباحثے رہتے۔ ہم میں سے اگر کوئی نئی کتاب یا نیا مصنف دریافت کرتا تو دوسرے کو ضرور اس سے آگاہ کر دیتا۔ اور پھر دونوں مل کر اس پر اچھے برے کا حکم صادر کرتے۔

دیکھو۔ اس تہم یک جہتی اور آہنگی میں ایک غلطی ضرور تھی، ہم دونوں نے بیسویں صدی میں پورے ریش پائی تھی، سورت مردکی مساوات کا قائل تو ضرور ہوں، تاہم اپنے خیالات اور بعض اوقات اپنے رویہ میں کبھی نہ کبھی اس تہمت کو ضرور کر دیتا تھا، بعض حالات کے ماتحت میل اپنی ایسی عاریت کو اپنا حق سمجھتی جو صرف مصنف ضعیف ہی کے ایک فرد کو ملنی چاہئیں اور بعض اوقات میں مستحکم اور رہنمائی کا رویہ اختیار کر لیتا جس کا مطلب یہ تھا کہ ایک مرد بونے کی حیثیت سے میرا ہی فرض ہے خصوصاً اس میر کے لئے بہت زیادہ تکلیف دہ تھا کہ میں کا مطالعہ مجھ سے بہت وسیع

ہے۔ اس سے مردانہ وقار کو صدمہ پہنچتا تھا، کبھی کبھی میرے جسم کے اندر میرے ایشیائی آباؤ اجداد کا خون جوش ملتا، اور میسارول جدید تہذیب سے باہنی ہو کر مجھ سے کہتا کہ مرد اشرف المخلوقات ہے اس طرف میل عورت مردکی مساوات کا اظہار مبالغہ کے ساتھ کرتی تھی، یہاں تک کہ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ عورتوں کی کائنات کی رہبر اور مردوں کو حشرات الارض سمجھتی ہے۔

لیکن اس بات کو میں کیوں نظر انداز کرتا کہ میل ایک طنز دس بارہ کتابیں خریدتی اور سفتہ بھر کے بعد انہیں میرے کمرے میں پھینک دیتی اور یہ کہہ جاتی کہ میں انہیں پڑھ چکی ہوں، تم بھی پڑھ چکو گے تو ان کے متعلق باتیں کریں گے۔ اول تو میرے لئے سفتے میں دس بارہ کتابیں ختم کرنا محال تھا لیکن فرض کیجئے مردوں کی لالچ رکھنے کے لئے راتوں کی نیند حرام کر کے ان سب کا پڑھ ڈالنا ممکن بھی ہوتا تو بھی ان میں دو تین کتابیں فلسفے یا تنقید کی ضرور ساہی ہوتیں کہ ان کے سمجھنے کے لئے کافی عرصہ دیکر ہوتا۔ چنانچہ سفتے بھر کی جانفشانی کے بعد مجھے ایک عورت کے سامنے اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا کہ میں اس دوا میں پیچھے رہ گیا ہوں۔ جب تک وہ میرے کمرے میں بیٹھی رہتی، میں کھسیا ناسا ہو کر اس کی باتیں سنتا رہتا۔ وہ نہایت علما نہ انداز میں بھوس اور کھڑکھا کر باتیں کرتی۔ جب میں اس کیلئے دروازہ کھولتا، یا اس کے سگریٹ کے لئے دیا سلائی جلاتا، یا سب سے زیادہ آرام دہ کرسی اُسکے لئے خالی کر دیتا۔ تو وہ میری خدمات کو حق نسوانیت نہیں بلکہ حق استادی سمجھ کر قبول کرتی۔

میل کے چلے جانے کے بعد زنا مت بتدریج غصے میں تبدیل ہو جاتی ہے جان یلال کا ایشیا رہل ہے، لیکن ان کی خاطر نیک سے نیک انسان بھی ایک نہ ایک دفعہ تو ضرور نا جا ناز ذرائع سے استعمال پر اتر آتا ہے۔ اسے میری اخلاقی پستی سمجھتے لیکن وہی حالت میری بھی ہوئی اگلی دفعہ جب میل سے ملاقات ہوئی تو جو کتابیں میں نے نہیں پڑھی تھیں ان پر بھی میں نے ماتے زنی شروع کر دی، لیکن جو کچھ کہتا۔ سنبھل سنبھل کر کہتا تھا تفصیلات کے متعلق کوئی بات منہ سے نہ نکالتا تھا، سرسری طور پر تنقید کرتا تھا اور بڑی ہوشیاری اور دانائی کے ساتھ اپنی رائے کو جدت کا رنگ دیتا تھا۔

کسی ناول کے متعلق میل نے پوچھا تو جواب میں نہایت ملامت آبا لانا کہا۔

ہاں اچھی ہے، لیکن کچھ ایسی اچھی نہیں، مصنف سے دور جدید کا نقطہ نظر نہہرہ سکا لیکن پھر بھی نقطے نزلے ہیں۔ بُری نہیں، بُری نہیں۔

کنکھیوں سے میل کی طرف دیکھتا گیا، لیکن اسے میری بریا کاری بالکل معلوم نہ ہونے پائی، ڈرامے کے متعلق کہا کرتا تھا۔

ہاں پڑھا تو ہے، لیکن ابھی فیصلہ نہیں کر سکا کہ جو کچھ پڑھنے والا کچھ ہے۔

وہ ایچ پر جا کر بھی باقی رہے گا، یا نہیں؟ تمہارا کیا خیال ہے؟
اور اس طرح سے اپنی آن بھی قائم رہتی اور گفتگو کا بار بھی میل کے کندھوں پر ٹٹل دیتا
تنقید کی کتابوں کے جلسے میں فرماتا۔

اس نقاد پر اسٹار ہو جس صدی کے نقادوں کا کچھ کچھ اثر معلوم ہوتا ہے لیکن یونہی نامعلوم
کہیں کہیں باہل بلکاسا، اور شاعری کے متعلق روتیہ دلچسپ ہے، بہت دلچسپ۔
دلہ رفته مجھ اس فن میں کمال ہو گیا، جس روانی اور نفاست کے ساتھ میں ناخوشہ کتابوں
پر گفتگو کر سکتا تھا اس پر میں خود حیران رہ جاتا تھا۔ اس سے جذبات کو ایک آسودگی نصیب
ہوتی۔

اب میں میل سے نہ دبتا تھا۔ اُسے میرے علم و فضل کا مستحق ہونا پڑا۔ وہ اگر سنتے میں
دس کتابیں پڑھتی تھی تو میں صرف دو دن کے بعد ان سب کتابوں پر رائے زنی کر سکتا تھا۔ اب
اس کے سامنے علامت کا کوئی موقع نہ تھا۔

میری مردانہ روح میں احساس فتمندی سے بلیدگی سی آگئی تھی۔ اب میں اس
کے لئے کرسی خالی کرتا، یا دیوانی جلاتا تو عظمت و برتری کے احساس کے ساتھ جیسے ایک تجربہ کار
اور نونہل نوجوان ایک نادان کمزور بچے کی حفاظت کر رہا ہو۔

صلوہ مستقیم پر چلنے والے انسان میرے اس فریب کو نہ سراہیں تو نہ سراہیں، لیکن کم از کم
مردوں کے طبقے سے اس کی داد ضرور چاہتا ہوں، خواتین میری اس حرکت کے لئے مجھ پر دوہری
لعنتیں بھیجیں گی کی ایک تو میں نے منکاری سے کام لیا، اور دوسرے ایک عیب کو دھوکہ دیا۔
ان کی تسلی کے لئے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ یقین ملنے کے کئی دفعہ تنہائی میں نے اپنے
آپ کو بُرا بھلا کہا۔ بعض اوقات اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی، ساتھ ہی اس بات کا بھلنا بھی
محسوس ہو گیا کہ میں بغیر بڑے ہی علمیت جتنا تار ہا ہوں۔ بس تو یہ سب کتابیں پڑھ چکنے کے
بعد گفتگو کرتی ہے تو بہر حال اس کو مجھ پر تفوق ضرور حاصل ہے۔ میں اپنی کم علمی ظاہر نہیں ہونے
دیتا لیکن حقیقت تو یہی ہے کہ وہ کتابیں نہیں پڑھتا، میری جہالت اس کے نزدیک نہ سہی
میرے اپنے نزدیک تو مسلم ہے۔ اس خیال سے اطمینان قلب مقصود ہو جاتا اور اپنے آپ ایک

عورت کے مقابلے میں پھر فقیر نظر آنے لگتا ہے، پہلے تو قبل کو صرف ذی علم سمجھتا تھا، اب وہ اپنے مقابلے میں پاکیزگی اور راست بازی کی دیوی معلوم ہونے لگی۔

علامت کے دوران میرا دل زیادہ نرم ہو جاتا ہے، بغاکی حالت میں کوئی بہناری سا ناول پڑھتے وقت بعض اوقات سیرنی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں صحت یاب ہو کر مجھے اپنی اس کمزوری پر ہنسی آتی ہے، لیکن اُس وقت کمزوری کا احساس نہیں ہوتا۔ سیرنی بدستی کسانیں دلوں مجھے خیف سا انفلوئنزا ہوا۔ ٹہلک نہ تھا، بہت زیادہ کھلیف رہ گئی نہ تھا، تاہم گزشتہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات گناہ کبیرہ بن کر نظر آنے لگے۔ قبل کا خیال آیا تو ضمیر نے سخت علامت

کی، اور میں بستر پر بہت دیر تک بیچ و تاب کھاتا رہا، شام کے وقت قبل کچھ پھول لے کر آئی، خیریت ہو چھی، دوا پلائی، مانتھے پر ہاتھ رکھا۔ میرے آنسو ٹپ ٹپ کرنے لگے۔ میں نے کہا، میری آواز بھڑائی ہوئی تھی، بیل خدا کے لئے مجھے معاف کر دو۔ اس کے بعد میں نے اپنے گناہ کا اعتراف کیا اور اپنے آپ کو سزا دینے کے لئے میں نے مکاری کی تفصیل بیان کر دی، ہر اس کتاب کا نام لیا جس پر میں نے بغیر پڑھے لمبی لمبی فاضلانہ تقریریں کی تھیں۔ میں نے کہا "بیل پھیلے ملتے جو تین کتابیں تم مجھے دے گئی تھیں ان کے متعلق میں تم سے کتنی بحث کر چکا ہوں۔ لیکن میں نے ان کا ایک لفظ بھی نہیں پڑھا، میں نے کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور کہی ہوگی جس سے میرا دل تم پر کھل گیا ہوگا۔"

کہنے لگی۔

"نہیں تو"

میں نے کہا۔

"مثلاً ناول تو میں نے پڑھا ہی نہ تھا، کیریکٹروں کے متعلق میں جو کچھ تک رہا تھا وہ سب

من گھڑت تھا۔"

کہنے لگی۔

"کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔"

میں نے کہا، اس پلاٹ کے متعلق میں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ زرا ڈھیلا ہے، یہ بی

ٹھیک تھا۔؟

اس کے بعد گلاشتہ فریب کاری پر میں اور وہ دونوں بہتے رہے۔ یہیل رخصت ہونے لگی تو بولی۔ وہ کتابیں میں لیتی جاؤں؟

میں نے کہا، ایک تا تب انسان کو اپنی اصلاح کا موقع تو دو۔ میں نے ان کتابوں کو اب تک نہیں پڑھا۔ لیکن اب میں انہیں پڑھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ انہیں پڑھیں رہنے دو، تم انہیں پڑھ چکی ہو۔
کہنے لگی۔

”ہاں۔ میں پڑھ تو چکی ہوں۔ اچھا یہیں چھوڑے جاتی ہوں۔“
اس کے چلے جانے کے بعد میں نے ان کتابوں کو پہلی مرتبہ کھولا۔
تینوں میں سے ایک بھی اوراق نہ کٹے تھے، یہیل نے ابھی تک نہ پڑھے تھے۔
مجھے مودا اور عورت دونوں کے برابر ہونے میں کوئی شک باقی نہ رہا۔

مرحوم کی یاد میں

ایک دن مرزا صاحب اور میں، برآمدے میں ساتھ ساتھ کرسیاں ڈالے چپ چاپ بیٹھے تھے جب دوستی پرانی ہو گئی ہے تو گفتگو کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی اور ہر دو ایک دوسرے کی خاموشی سے بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں، یہی ہماری حالت تھی۔ ہم دونوں اپنے اپنے خیالات میں غرق تھے۔ مرزا صاحب تو خدا جانے کیا سوچ رہے تھے، لیکن میں زمانے کی ناسازگاری پر غور کر رہا تھا۔ درر سڑک پر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک موٹر گزر جاتی تھی، میری طبیعت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ میں جب کبھی کسی کی موٹر کلر دیکھتا ہوں مجھے زمانے کی ناسازگاری کا خیال ضرور سستا ہے اور میں کوئی ایسی ترکیب ضرور سوچنے لگتا ہوں جس سے تمام دنیا کی تمام دولت سب انسانوں پر تقسیم کی جاسکے۔ اگر میں سڑک پر پیدل جا رہا ہوں، اور کوئی موٹر اس ادا سے گزر جائے کہ گرد و غبار میرے کھپچھڑوں، میرے دماغ، میرے معدے اور میری کلی تک پہنچ جائے تو اس دن گھر میں اگر علمِ کیمیا کی وہ کتاب نکال لیتا ہوں جو میں نے ایف۔ اے میں پڑھی تھی، اور اس غرض سے اس کا مطالعہ کرنے لگتا ہوں کہ شاید ہم بنانے کا کوئی نسخہ ہاتھ آجائے۔

میں کچھ دیر تک اس میں بھرتا رہا۔ مرزا صاحب نے کچھ توجہ نہ کی، آخر میں نے خاموشی کو توڑا۔

اور مرزا صاحب سے مخاطب ہو کر بولا۔

”مرزا صاحب! ہم میں اور حیوانوں میں کیا فرق ہے؟“

مرزا صاحب بولے ”بھئی کچھ تو ہو گا نا آخر؟“

میں نے کہا۔ ”میں بتاؤں تمہیں؟“

یہ کہہ کر میں بڑے استغنا کے ساتھ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

مرزا بولے۔

”کیا کہا تم نے؟ کیا خریدنے لگے ہو؟“

میں نے کہا: ”منا نہیں تم نے۔ میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں۔ موٹر کار ایک ایسی گاڑی ہے جس کو بعض لوگ موٹر کہتے ہیں، بعض لوگ کار کہتے ہیں۔ لیکن چونکہ تم ضرورت سے زیادہ ذہین ہو اس لئے میں نے دونوں لفظ استعمال کر دیئے تاکہ تمہیں سمجھنے میں کوئی رقت پیش نہ آئے۔“

مرزا بولے۔

”ہوں۔“

اب کے مرزا نہیں میں بے پردائی سے سگریٹ پینے لگا۔ بھو میں نے ادھر کو چڑھا لیں، پھر سگریٹ والا ہاتھ منہ تک اسی انداز سے لاتا اور لے جاتا تھا کہ بڑے بڑے ایکٹراس پر رشک کریں۔

تھوڑی دیر کے بعد مرزا بولے: ”ہوں۔“

میں نے سوچا اثر ہو رہا ہے، مرزا پر عرب پڑ رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ مرزا کچھ بولے

تاکہ مجھے معلوم ہو کہ کہاں تک مرغوب ہوا ہے، لیکن مرزا نے پھر کہا۔

”ہوں۔“

میں نے کہا: ”مرزا کہاں تک نئے معلوم ہٹے تم نے اسکول اور کالج اور گھر میں دو تین زبانیں

سیکھی ہیں، اور ان کے علاوہ تمہیں کئی ایسے الفاظ بھی آتے ہیں جو کسی اسکول اور کالج یا مشرفین گھرانے میں نہیں بولے جاتے، پھر بھی اس رقت تمہارا کلام ”ہوں“ سے آگے نہیں بڑھتا۔ تم جلتے ہو مرزا۔ اس وقت تمہاری جو ذہنی کیفیت ہے اسے عربی زبان میں حسد کہتے ہیں۔“

مرزا صاحب کہنے لگے ”نہیں یہ بات تو نہیں، میں تو صرف خریدنے کے لفظ پر غور کر رہا

تھا، تم نے کہا کہ میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں، تو میاں خریدنا تو ایک ایسا فعل ہے کہ

اس کے لئے روپے وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔“ وغیرہ ”کابند و بست تو بخوبی ہو جائے گا، لیکن

روپے کا بند و بست کیسے کرو گے؟“

”یہ نکتہ مجھے نہ سوجھا تھا، لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ میں نے کہا:“

”میں اپنی کئی قیمتی اشیاء بیچ سکتا ہوں“

مرزا بولے ”کون کون سی مثلاً“

میں نے کہا: ایک تو میں اپنا سگریٹ کیس بیچ ڈالوں گا۔

مرزا کہنے لگے: چلو دس آنے تو یہ ہو گئے، باقی ڈھائی تین ہزار کا انتظام بھی اسی طرح ہو جائیگا

تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

اس کے بعد ضروری بھی معصوم ہوا۔ وہ گاگفتگو کا سلسلہ کچھ دیر کے لئے روک دیا جاتے چنانچہ

میں مرزا سے بیزار ہو کر خاموش رہا۔ یہ بات سمجھ میں نہ آتی کہ لوگ رہا یہ کہاں سے لاتے ہیں۔ بہت

سوچا اور آخر اس نتیجے پہ پہنچا کہ لوگ چوری کرتے ہیں۔ اس سے ایک گونا گونا لینا ہوا۔

مرزا بولے۔

”تمہیں ایک ترکیب بتاؤں۔۔۔ ایک بائیسکل لے لو۔“

میں نے کہا: وہ روپے کا مسئلہ تو پھر بھی جوں کا توں رہا۔

کہنے لگے مفت۔

میں نے حیران ہو کر پوچھا: مفت۔۔۔۔۔ وہ کیسے؟

کہنے لگے ”مفت ہی سمجھو۔۔۔ آخر دوست سے قیمت لینا بھی کہاں کی شرافت

ہے، البتہ تم احسان قبول کرنا گوارا نہ کرو تو اور بات ہے؟“

ایسے موقع پر جو ہنسی میں ہنستا ہوں اس میں معصوم بچے کی مسرت کی جوائی کی خوش

ولی، اُبلتے فواروں کی سوسنی، اور بلبوں کا نغمہ سب ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ہوتے

ہیں۔ چنانچہ میں یہ سبھی ہنسا۔ اور اس طرح ہنسا کہ کھلی ہوتی باپمیں گھنٹوں تک اپنی جگہ پر

واپس نہ آئیں۔ چنانچہ جب مجھے یقین ہو گیا کہ ایک لخت کوئی خوشخبری سننے سے دل کی حرکت بند

ہو جانے کا جو خطرہ پیرا ہوتا ہے اس سے محفوظ ہوں، تو میں نے پوچھا۔

”بے کس کی۔۔۔“

مرزا بولے ”میرے پاس ایک بائیسکل پڑی ہے وہ تم لے لو۔“

میں نے کہا: پھر کہنا۔۔۔ پھر کہنا۔

کہنے لگے: بھئی ایک بائیکل میرے پاس ہے، جب میری ہے تو تمھاری ہے تم لے لو۔
یقین مانتے مجھ پر گھڑوں پلنی پڑ گیا۔ شرم کے مارے پسینہ پسینہ ہو گیا۔ چودھویں صدی
میں ایسی بے غرضی اور ایثار بھلا دیکھنے میں کہاں آتا ہے۔ میں نے کرسی سرکار مرزا کے پاس کر لی
مجھ میں نہ آیا کہ اپنی ندامت اور منونیت کا اتھاہ کرن الفاظ میں کروں۔

میں نے کہا: مرزا صاحب سب سے تو میں اس گستاخی اور دشمنی اور بے ادبی کی مافی
مانگتا ہوں جو ابھی ابھی میں نے تمھارے ساتھ گفتگو میں روا رکھی، دوسرے میں آج بھئی
سامنے ایک اعتراض کرنا چاہتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ تم میری صلحت گوئی کی داد دو گے،
اور مجھے اپنی رحم دلی کے صدقے میں معاف کر دو گے۔ میں ہمیشہ تم کو از حد کمینہ ہمہ دمک، خود
غرض، اور عیار انسان سمجھتا رہا ہوں۔ دیکھو ناراض مت ہو۔ انسان سے غلطی ہو ہی جاتی
ہے۔ لیکن آج تم نے اپنی شرافت اور دوست پروری کا ثبوت دیا ہے اور مجھ پر ثابت کر دیا
ہے کہ میں کتنا قابل نفرت، تنگ خیال اور حقیر شخص ہوں، مجھے معاف کر دو۔

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے، قریب تھا کہ میں مرزا کے ہاتھ کو بوسہ دیتا اور اپنے
آنسوؤں کو چھپانے کے لئے اس کی گود میں سر رکھ دیتا۔ لیکن مرزا صاحب کہنے لگے۔
"واہ اس میں فیاضی کیا ہوتی۔ میرے پاس ایک بائیکل ہے، جیسے میں سوار ہوا
ویسے تم سوار ہوتے۔"

میں نے کہا: "مرزا مفت نہ لوں گا۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

مرزا کہنے لگے: "بس اسی بات سے ڈرتا ہوں۔ تم حساس اتنے ہو کہ کسی کا احسان لینا
گوارا نہیں کرتے۔۔۔ حالانکہ خدا گواہ ہے۔۔۔ احسان اس میں کوئی نہیں۔۔۔"
میں نے کہا: "خیر کچھ کبھی سہی، تم سچ ہی مجھے اس کی قیمت بتا دو۔
مرزا بولے: "قیمت کا ذکر کر کے گویا تم مجھے کانٹوں میں گھسیٹتے ہو۔ اور جس قیمت پر میں
نے خریدی تھی، وہ تو بہت زیادہ تھی، اور اب تو وہ اتنے کی۔۔۔ سی نہیں۔"

میں نے پوچھا: "تم نے کتنے میں خریدی تھی؟"

کہنے لگے۔ میں نے پونے دو سو روپے میں خریدی تھی، لیکن اس زمانے میں بائیکلوں

کاروانج ذرا کم تھا۔ اس لئے قیمتیں ذرا زیادہ تھیں۔

میں نے کہا: کیا بہت پُرانی ہے۔؟

یوے: نہیں ایسی پُرانی بھی کیا ہوتی، میرا لڑکا اس پر کلچ آیا کرتا تھا اور اُسے کلچ
چھوڑے ابھی دو سال بھی نہیں ہوئے، لیکن اتنا ضرور ہے کہ آج کل کی بائیسکلوں سے ذرا مختلف
ہے۔ آج کل تو بائیسکلیں ٹین کی بنتی ہیں جنھیں کلچ کے سر پھرے لونڈے سستی سمجھ کر خرید لیتے
ہیں پُرانی بائیسکلوں کے ڈھانچے مضبوط ہوا کرتے تھے۔“

”مگر مرزا پونے دو سو روپے تو میں ہرگز نہیں دے سکتا۔ اتنے روپے میرے پاس
کہاں سے آئے، میں تو اس کی آدمی قیمت بھی نہیں دے سکتا۔“

مرزا کہنے لگے: تم سے قیمت کھوڑا ہی مانگتا ہوں۔۔۔ اول تو قیمت لینا نہیں
چاہتا۔۔۔ لیکن۔۔۔“

میں نے کہا: نامرزا قیمت تو تمہیں لینی پڑے گی۔۔۔ اچھا تم یوں کرو۔۔۔
میں تمہاری جیب میں کچھ روپے ڈالے دیتا ہوں۔۔۔ تم گھر جا کر گرن لینا۔۔۔ اگر تمہیں
منظور ہوتے تو کل بائیسکل بیچ دینا۔۔۔ ورنہ روپے واپس کر دینا۔۔۔ اب یہاں بیچ کر
میں تم سے سودا کر چکا ہوں۔۔۔ یہ تو کچھ دو کالماری کی سی بات معلوم ہوتی ہے۔
مرزا بولے: بھئی جیسے تمہاری مرضی، میں تو اب بھی یہی کہتا ہوں کہ قیمت و قیمت جانے
دو۔۔۔ لیکن میں جانتا ہوں، تم نہ مانو گے۔“

میں اٹھ کر اندر کمرے میں آیا۔۔۔ میں نے سوچا۔۔۔ استعمال شدہ چیزوں کی قیمت
لوگ آدمی دیتے ہیں۔۔۔ لیکن جب میں نے مرزا سے کہا تھا کہ مرا میں آج ہی قیمت بھی
نہیں دے سکتا۔۔۔ تو مرزا اس پر معترض نہ ہوا تھا وہ تو بچارہ بالکل یہی کہتا تھا کہ تم مفت
ہی لے لو۔ لیکن میں کیسے لے لوں، آخر بائیسکل ہے، ایک سواری ہے، فیشنوں، گھوڑوں اور
موٹرول اور تانگوں کے زمرے میں شمار ہوتی ہے۔۔۔ بکس کھولا تو معلوم ہوا کہ ہسٹ و پوڈ
کل چھپالیس روپے ہیں۔ چھپالیس روپے تو کچھ ٹھیک رقم نہیں، پینتالیس یا پچاس ہوں جب
بھی بات ہے، پچاس تو ہو نہیں سکتے، اگر پینتالیس ہی دینے ہیں تو پچالیس کیوں نہ دے

جائیں جن رقموں کے آگے صفر آتا ہے، وہ رقمیں کچھ زیادہ معطل معلوم ہوتی ہیں، بس ٹھیک ہے چالیس روپے سے دوں گا۔
خدا کیسے مریزا قبول کرے۔

باہر آیا، چالیس روپے مٹی میں بند کر کے مرزا کی جیب میں ڈال دیئے اور کہا، مرزا اس کو قیمت نہ سمجھنا، لیکن ایک منگلیں دوست کی حقیر سی رقم منظور کرنا۔ تمہیں اپنی توہین معلوم نہ ہو تو کل بائیسکل سبجو ادینا۔

مرزا چلنے لگے تو میں نے پھر کہا، مرزا کل صبح ہی صبح سبجو ادینا، رخصت ہونے سے پہلے میں نے ایک دفعہ پھر کہا۔

کل صبح آٹھ بجے تک پہنچ جائے۔۔۔۔۔ دیر نہ کرنا۔۔۔۔۔ خدا حافظ۔۔۔۔۔ اور دیکھو مرزا میرے تھوٹے سے روپوں کو زیادہ سمجھنا۔۔۔۔۔ خدا حافظ۔۔۔۔۔ اور تمہارا بہت بہت شکریہ۔۔۔۔۔ میں تمہارا بہت ممنون ہوں۔۔۔۔۔ اور میری گستاخی کو معاف کر دینا دیکھو، کبھی کبھی یوں ہی بے تکلفی میں۔۔۔۔۔ کل صبح آٹھ بجے تک۔۔۔۔۔ ضرور۔۔۔۔۔ خدا حافظ۔۔۔۔۔

مرزا کہنے لگے، ذرا اُسے جھاڑ پونچھ لینا۔۔۔۔۔ اور تیل وغیرہ ڈال دینا، میرے نوکر کو فرصت ہوئی تو میں خود ہی ڈلوادوں گا۔۔۔۔۔ وہ دم خود ڈال لینا۔۔۔۔۔ میں نے کہا، ہاں ہاں، وہ سب کچھ ہو جائے گا۔ ہم کل ضرور سبج وینا، اور دیکھنا آٹھ بجے یا ساڑھے آٹھ بجے تک پہنچ جائے۔۔۔۔۔ اچھا خدا حافظ۔۔۔۔۔

رات کو بستر پر لیٹا تو بائیسکل پر سیر کرنے کے مختلف پروگرام تجویز کرتا رہا، یہ ارادہ تو پختہ کر لیا کہ دو تین دن کے اندر اردگرد کی تمام مشہور تاریخی عمارت اور کھنڈرات کو نئے سرے سے دیکھ ڈالوں گا، اس کے بعد اگلے گرمی کے موسم میں ہو سکا تو بائیسکل پر کشمیر وغیرہ کی سیر کر لیں گا۔ صبح صبح ہو، خوری کے لئے ہر روز نہرتک جایا کروں گا، ملور شام کو ٹھنڈی سڑک پر جاں اور لوگ سیر کو چلیں گے، میں سڑک کی صاف شفاف سطح پر لپکے لپکے خاموشی کے ساتھ اسی دانت کی ایک گیند کی طرح گنڈہ اڑوں گا۔ ڈر بتے ہوئے آنتاب کی

روشنی جب بائیسکل کے چمکیے حصوں پر پڑے گی تو بائیسکل جگمگا اٹھے گی، اور ایسا معلوم ہوگا کہ جیسے ایک راج ہنس زمین کے ساتھ اڑ رہا ہو۔۔۔ وہ مسکراہٹ جس کا ذکر کر چکا ہوں ابھی تک میرے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی، بار بار دل چاہا کہ بھاگ کر جاؤں۔۔۔ اور مرزا کو گلے سے لگالوں۔ رات تو خواب میں دعائیں مانگتا رہا کہ خدایا مرزا بائیسکل دینے پر رضامند ہو جائے۔ صبح اٹھا تو اٹھتے ہی نوکرنے یہ طوطا شجری سنانی کہ حضور، وہ بائیسکل آگئی ہے۔

میں نے کہا: اتنے سویرے؟

نوکرنے کہا: وہ تو رات ہی آگئی تھی، آپ سو گئے تھے، میں نے جگا نامناسب سمجھا اور ساتھ ہی مرزا کا آدمی ڈیریاں کسنے کا ایک اوزار بھی دے گیا ہے۔

میں حیران ہوا کہ مرزا صاحب نے بائیسکل سنبھالنے میں اتنی جھلت کیوں کی۔۔۔ لیکن اس نتیجے پر پہنچا کہ آدمی نہایت شریف اور عیانت دار ہیں، روپے لےتے تھے تو سائل کیوں روک رکھتے۔

نوکرنے سے کہا: دیکھو یہ اوزار یہیں چھوڑ جاؤ اور دیکھو، بائیسکل کو کسی کپڑے سے خوب اچھی طرح جھلا لو، اور یہ موڑ پر جو بائیسکل والا بیٹھا ہے اس سے جا کر بائیسکل میں ڈالنے کا تیل لے آؤ، اور دیکھو "ابے بھاگا کہاں جاتا ہے، ہم ضروری تم سے کہہ رہے ہیں بائیسکل والے سے تیل کی کپٹی لے آنا" اور جہاں جہاں تیل دینے کی ضرورت ہو وہاں تیل دے دینا، اور بائیسکل والے سے کہنا کہ کوئی گھٹیا سا تیل خریدے جس سے تمام پٹنڈے خراب ہو جائیں بائیسکل کے پٹنڈے بڑے نازک ہوتے ہیں، اور بائیسکل بلہر کال رکھو، ہم ابھی کپڑے پہن کر آتے ہیں۔ ذرا جلدی جلدی چاہتے ہیں، غسل خانے میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ پیل پیل چنبیلی باغ میں چھلنا رہا۔ اس کے بعد کپڑے بدلے، اذکار کو جیب میں ڈالا اور کمرے سے باہر نکلا۔ برآمدے میں آیا تو دیکھا کہ ایک عجیب و غریب مشین نظر پڑی، ٹھیک طرح پہچان نہ سکا کہ کیا چیز ہے، نوکر سے دریافت کیا کیوں بے یہ کیا چیز ہے؟

نوکرنے بولا: حضور یہ بائیسکل ہے۔

میں نے کہا: بائیسکل؟ کس کی بائیسکل؟

کہنے لگا، مرزا صاحب نے آپ کے لئے بھجوائی ہے۔
 میں نے کہا، اور جو سائیکل رات کو انھوں نے بھجوائی تھی وہ کہاں گئی؟
 کہنے لگا، ”یہی تو ہے۔“
 میں نے کہا، ”کیا بکتا ہے جو بائیسکل مرزا صاحب نے کل رات کو بھجوی تھی وہ بائیسکل
 یہی ہے؟“

کہنے لگا، ”جی ہاں۔“

میں نے کہا، ”اچھا۔۔۔ پھر آسے دیکھنے لگا۔
 ”اس کو صاف کیوں نہیں کیا؟“
 ”حضور فقہین و فو صاف کیا ہے؟“
 ”تو یہیلی کیوں ہے؟“
 نوکرنے اس کا جواب دینا شاید مناسب خیال نہ کیا۔
 ”اور تیل لایا؟“

”ہاں حضور لایا ہوں۔“

دیا۔؟

”حضور و تیل دینے کے پھید ہوتے ہیں، وہ نہیں ملتے۔“

”کیا وجہ۔۔۔؟“

”حضور و دھروں میں رنگ جا ہے، وہ سوراخ کہیں بیچ میں دب جا گئے ہیں۔“
 رفتہ رفتہ میں اس چیز کے قریب آیا جس کو میرا نوکر بائیسکل بتا رہا تھا، اس کے
 مختلف پرنسوں پر غور کیا تو اتنا ثابت ہو گیا کہ بائیسکل ہے لیکن محل ہیئت سے یہ صاف
 ظاہر تھا کہ ریل، رہٹ اور چرخہ اسی طرح کی جدید ایجادات سے پہلے کی بنی ہوئی ہے۔ پھر
 پتے کو گھاگھا کر سوراخ کیا جہاں کسی زمانے میں تیل دیا جاتا تھا، لیکن اب سوراخ میں
 سلسلہ آمدرفت بند تھا، چنانچہ نوکر بولا

”حضور و تیل تو سب ادھر ادھر بہہ جاتا ہے، بیچ میں جاتا ہی نہیں۔“

میں نے کہا: اچھا اوپر ہی ڈال دو، یہ بھی مفید ہوتا ہے۔
آخر کار بائیسکل پر سوار ہوا، پہلا ہی پاؤں چلایا تو معلوم ہوا کہ جیسے کوئی مودہ ٹھیاں

چٹخا چٹخا کر اپنی مرضی کے خلاف زندہ ہو رہا ہو۔ گھر سے نکلتے ہی کچھ تھوڑی سی آڑی تھی، اُس پر بائیسکل خود بخود چلنے لگی، لیکن اس رفتار سے کہ جیسے کہ تارکول زمین پر بہتا ہے اور ساتھ ہی مختلف حصّوں سے طرح طرح کی آوازیں برآمد ہونا شروع ہوتی ہیں۔ ان آوازوں کے مختلف گروہ تھے۔ جیسے چاں، چوں کی مٹم کی آوازیں زیادہ تر گتّی کے نیچے اور پیچھے پہیوں سے نکلتی تھی..... گھٹ، گھڑ، گھڑ گھڑ کے قبیلے کی آوازیں ڈگڈگازوں سے آتی تھیں۔ چر، چرخ مٹم کے سُرخیر اور پیڈل سے نکلتے تھے، زنجیر ڈھیلی ڈھیلی تھی۔ جب کبھی میں پیڈل پر زور ڈالتا تھا زنجیر میں ایک انگڑائی سی پسیدا ہو جاتی تھی جس سے وہ تن جاتی تھی اور چرچر اُکرا کر بولنے لگتی تھی اور پھر ڈھیلی ہو جاتی تھی۔ پچھلا پہیہ گھومنے کے علاوہ جموتا تھا، یعنی ایک تو آگے کو چلتا تھا، اور اس کے علاوہ دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں کو بھی حرکت کرتا تھا، چنانچہ سڑک پر جو بھی نشان بن جاتا تھا اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مخمور سانپ لہرا کر نکل گیا ہے۔ ڈگڈگتّے تو سہی، لیکن پہیوں کے عین اوپر نہ تھے، ان کا فائدہ صرف یہ ہوتا تھا کہ انسان شمال کی سمت سیر کو کھلے اور آفتاب مغرب میں غروب ہو رہا ہو تو ڈگڈگازوں کی بدولت دھوپ سے بچے نہیں گئے۔

اگلے پہیے کے دائرے میں ایک بڑا سا پیوند لگا تھا، جس کی وجہ سے پہیہ ہر چکر میں ایک دفعہ اوپر کو اٹھ جاتا تھا۔ اور میرا سر سونوں جھٹکے کھار ہا تھا جیسے کوئی متواتر تھوڑی کے نیچے مٹکے مارے جا رہا ہو۔ پھلے اور اگلے پہیے کو بلا کر چوں چوں پھٹ پھٹ چوں چوں کی صدا نکل رہی تھی۔ جب اتار پر بائیسکل فری تیز ہوئی تو فضا میں ایک بھونچال سا آگیا اور بائیسکل کے کئی پُرنے جھاب تک سو رہے تھے بیدار ہو کر گویا ہوتے۔ ابھرا دھر کے لوگ چوٹکے ماؤں نے اُپے چوں کو سینوں سے لگایا۔ کھڑکھڑ کے نیچے میں پہیوں کی آواز جیسا سُنانی دے رہی تھی۔ لیکن چونکہ بائیسکل اب پہلے سے تیز تھی اس لئے چوں

چوں پھٹ پھٹ، چوں چوں پھٹ پھٹ کی آواز نے اب چوں پھٹ چوں پھٹ کی صورت اختیار کر لی۔ تمام بائیسکل کسی آدق افریقی کی زبان کی گردانیں دہرا رہی تھی۔ اس قدر تیز رفتاری بائیسکل کی طبع نازک پرگراں گذری، چنانچہ اس میں یک لخت دو تبدیلیاں واقع ہو گئیں، ایک تو ہینڈل ایک طرف کو مڑ گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں جاتا تو سامنے تھا لیکن میرا تمام جسم دائیں طرف کو مڑا ہوا تھا اس کے علاوہ بائیسکل کی گدائی دفعتاً چو داغ کے قریب بیٹھ گئی۔ چنانچہ جب پیڈل چلانے کے لئے میں بانگیں نیچے اُپر کر رہا تھا تو میرے گھٹنے کھوڑی تک پہنچ جاتے تھے۔ کمر دہری ہو کر باہر کو نکلی ہوئی تھی اور ساتھ ہی لگے پہیوں کی اٹھکھیلوں کی وجہ سے سر برابر جھٹکے کھا رہا تھا۔

گدائی کا نیچا ہونا از حد تکلیف دہ ثابت ہوا۔ اس لئے میں نے مناسب یہی سمجھا کہ اس کو ٹھیک کروں، چنانچہ میں نے بائیسکل کو ٹھہرایا اور نیچے اُترا۔ بائیسکل کے ٹھہ جانے سے یک لخت جیسے دنیا میں خاموشی سی چھا گئی، ایسا معلوم ہوتا جیسے میں کسی ریل کے اسٹیشن سے باہر نکل آیا ہوں۔ جیب کے اندر سے میں نے اوزار نکالا، گھڑی کو اُدھنچا کیا اور کچھ ہینڈل کو ٹھیک کیا اور دوبارہ سوار ہو گیا۔

دس قدم بھی نہ چلنے پایا تھا کہ ہینڈل یک لخت نیچا ہو گیا، اتنا کہ گدائی اب ہینڈل سے فٹ بھر اونچی تھی، میرا تمام جسم آگے کو جھکا ہوا تھا، تمام بوجھ دونوں ہاتھوں پر تھا جو ہینڈل پر رکھے ہوئے برابر جھٹکے کھا رہے تھے۔ آپ میری حالت کو تصور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ میں دُور سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی عورت آٹا گوندھ رہی ہو، مجھے

اس مشابہت کا احساس بہت تیز تھا جس کی وجہ سے میرے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ میں دائیں بائیں لوگوں کو کنکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا، یوں تو ہر شخص میں بھر پہلے ہی سے مڑ کر دیکھنے لگتا تھا، لیکن ان میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کیلئے میری حالت ضیافت طبع کا باعث نہ ہو، ہینڈل تو نیچا ہو ہی گیا تھا، ایک لڑکے نے کہا: "دیکھو یہ آدمی کیا کر رہا ہے گویا اس بد تمیز کے نزدیک میں کوئی کرتب دکھا رہا تھا۔ میں نے اتر کر پھر ہینڈل اور گدائی کو اُدھنچا کیا۔"

لیکن تھوڑی دیر بعد ان میں سے ایک نے ایک پھر نیچا ہو جاتا ہے، وہ لمحے جن کے دوران میں میرے ہاتھ اور میرا جسم دونوں برابر ایک ہی بلندی پر واقع ہوں بہت ہی کم تھے، اور ان میں بھی یہی سوچا رہتا تھا کہ اب گدی پہلے بیٹھے گی یا ہینڈل، چنانچہ نڈر ہو کر نہ بیٹھتا بلکہ جسم کو گدی سے قدرے اوپر ہی رکھتا، لیکن اس سے ہینڈل پر اتنا بوجھ پڑ جاتا کہ وہ نیچا ہو جاتا۔

جب وہیل گدگتے اور بائیکل کی اسٹاک بیٹھک نے ایک مقررہ باقاعدگی اختیار کر لی تو فیصلہ کیا کہ کسی مستری سے پیچ کسٹا لینے چاہئیں، چنانچہ بائیکل کو ایک دوکان پر لے گیا۔ بائیکل کی کھرڑ کھرڑ سے جتنے لوگ کام کر رہے تھے سب کے سب سڑاٹھا کر میری طرف دیکھنے لگے، لیکن میں نے جی کڑا کر کے کہا: "ذرا اس کی فرقت کر دیجئے"۔

ایک مستری آگے بڑھا، لوہے کی ایک سلاخ اس کے ہاتھ میں تھی جس سے اس نے مختلف حصوں کو ٹھوک بجا کر دیکھا، معلوم ہوتا تھا، اس نے بڑی تیزی سے حالات کا جائزہ لگایا، لیکن پھر بھی مجھ سے پوچھنے لگا: "کس کس پڑزے کی فرقت کرائیے گا؟"

میں نے کہا: "بڑے گستاخ ہو تم، دیکھتے ہو کہ صرف ہینڈل اور گدی کو اونچا کروا کے کسواتا ہے، بس۔ اور کیا؟ ان کو مہربانی کر کے فوراً ٹھیک کرو، اور بتاؤ کتنے پیسے ہوتے؟"

مستری کہنے لگا: "مڈگارڈ بھی ٹھیک کروں؟"

میں نے کہا: "ہاں وہ بھی ٹھیک کرو۔"

کہنے لگا: "اگر باقی چیزیں بھی ٹھیک کرالو تو اچھا ہو۔"

میں نے کہا: "اچھا کرو۔"

بولے: "یوں تھوڑا ہی ہو سکتا ہے، دس پندرہ دن کا کام ہے، آپ اسے ہمارے پاس

پھوڑ جائیے۔"

اور پیسے کتنے ہوں گے؟

کہنے لگا: "بس بیس چالیس روپے لیں گے۔"

میں نے کہا: "بس ہو چکا، جو کام تم سے کہنا ہے وہ کرو، اور باقی ہمارے معاملات میں

دخل مت دو۔

تھوڑی دیر میں ہینڈل اور گڈی پھر اونچی کر کے کس دی گئی، میں چلنے لگا تو مستری نے کہا: "میں نے کس تو دیا ہے لیکن پیسے سب گھسے ہوئے ہیں، ابھی تھوڑی دیر میں سب ڈھیلے پڑ جائیں گے۔"

میں نے کہا، بد تمیز کہیں کا۔ ڈو آنے مہفت میں لے لے؟
 بولا: جناب آپ کو یہ بائیسکل بھی تو مہفت میں ملی ہوگی، یہ آپ کے دوست مرزا صاحب کی ہے نا؟ "للو یہ وہ سائیکل ہے جو کچھلے سال مرزا صاحب یہاں بیچنے کو لائے تھے، پہچانی تھنے؟ بھتی صدیاں گذر گئیں لیکن اس بائیسکل کی خطا معاف ہونے میں نہیں آتی۔"

میں نے کہا: واہ مرزا صاحب کے لڑکے اس پر کلج آیا جا یا کر لے سکتے، ان کو ابھی کلج چھوڑے ہوئے دو سال بھی نہیں ہوئے۔

مستری نے کہا: ہاں وہ تو ٹھیک ہے لیکن مرزا صاحب خود جب کلج میں بیٹھے تھے تو ان کے پاس بھی تو یہی سائیکل تھی۔

میری طبیعت یہ سن کر کچھ مڑھ سی ہو گئی۔ میں بائیسکل کو ساتھ لے آہتا آہتا پیسٹل چل پڑا، لیکن پیدل چلنا بھی مشکل تھا، اس بائیسکل کے چلانے میں ایسے ایسے سطوں پر زور پڑتا تھا جو عام بائیسکلوں کے چلانے میں استعمال نہیں ہوتے، اس لئے ٹانگوں کندھوں، کمر اور بازوؤں میں اس قدر درد ہو رہا تھا جو برداشت کے قابل نہ تھا۔ مرزا کا خیال رہ رہ کر آتا تھا، لیکن میں ہر بار کوشش کر کے اس کو دل سے ہٹا دیتا تھا، ورنہ میں پاگل ہو جاتا، اور جنون کی حالت میں پہلی حرکت مجھ سے یہ سرزد ہوتی کہ مرزا کے مکان کے سامنے بازار میں ایک جلسہ منعقد کرتا جس میں مرزا کی منگاری، بے ایمانی اور دغا بازی پر ایک طویل تقریر کرتا، کل بنی نوع انسان اور آئندہ آنے والی نسلوں کو مرزا کی ناپاک فطرت سے آگاہ کر دیتا۔ اور اس کے بعد چلتا جلا کر اس میں زندہ جل کر مواتا۔

میں نے بہتر ہی سمجھا کہ جس طرح ہو سکے اب اس بائیسکل کو اونے پونے بیچ کر جو

وصول ہوا اسی پر صبر و شکر کروں، بلا سے دس پندرہ روپے کا خسارہ ہی ہے۔ چالیس کے چالیس روپے تو ضائع نہ ہوں گے۔ راستے میں ہائیسکوں کی بلیک دوکان آئی وہاں ٹھہر گیا۔ دوکاندار بڑھ کر میرے پاس آیا، لیکن میری زبان کو جیسے قفل لگ گیا تھا۔ عمر بھر کسی چیز کے بیچنے کی نوبت نہ آئی تھی، مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ ایسے موقع پر کیا کہتے ہیں، آخر بڑے سوچ بچار کے بعد اور بڑے تامل کے بعد منہ سے صرف اتنا نکلا کہ ”یہ ہائیسکل ہے۔“

دوکاندار کہنے لگا: ”پھر؟“

میں نے کہا: ”لو گے؟“

کہنے لگا: ”کیا مطلب؟“

میں نے کہا: ”بیچتے ہیں ہم۔“

دوکاندار نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا کہ مجھے یہ محسوس ہوا جیسے مجھ پر چوری کا شبہ کر رہا ہے۔ پھر ہائیسکل کو دیکھا۔۔۔ پھر مجھے دیکھا۔۔۔ پھر ہائیسکل کو دیکھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فیصلہ نہیں کر سکتا۔ آدمی کونسا ہے، اور ہائیسکل کونسی ہے۔ آخر کار بولا۔

”کہا کریں گے آپ اس کو بیچ کر۔۔۔؟“

یہی سوالات کا جواب خدا جانے کیا ہوتا ہے۔ میں نے کہا: ”کیا تم یہ پوچھنا چاہتے

ہو کہ جو روپے مجھے وصول ہوں گے ان کا مصرف کیا ہوگا۔؟“

کہنے لگا: ”وہ تو ٹھیک ہے، مگر کوئی اس کو لے کر کیا کرے گا۔“

میں نے کہا اس پر چڑھے گا اور کیا کرے گا۔؟

کہنے لگا: ”اچھا چلے گیا پھر۔۔۔؟“

میں نے کہا: ”پھر کیا؟ پھر چلائے گا اور کیا۔؟“

دوکاندار بولا: ”اچھا، ہوں۔۔۔ خدا بخش ذرا یہاں آنا، یہ ہائیسکل بکنے

آتی ہے۔“

جن حضرت کا نام خدا بخش تھا، انہوں نے اللہ ہی سے دیکھا جیسے بوسوگم

رہے ہوں۔۔۔“

اس کے بعد دونوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ آخر میں وہ جن کا ہم خدا بخش نہیں تھا
 میرے پاس آئے اور کہنے لگے ”آپ سچ ہی رہے ہیں؟“
 میں نے کہا تو اور کیا محض آپ سے ہم کلام ہونے کا فخر حاصل کرے کے لئے میں گھر
 سے یہ بہانہ کر کے لایا تھا۔؟
 کہنے لگا۔ تو کیا لیں گے آ۔۔۔؟
 میں نے کہا: ہمیں بتاؤ؟“
 کہنے لگا: پچھ پچھ بتاؤں۔؟“
 میں نے کہا: ہاں۔۔
 پھر کہنے لگا: پچھ پچھ بتاؤں؟“
 میں نے کہا: اب بتاؤ گے بھی، یا توں ہی ترسائے رہو گے؟“
 کہنے لگا: تین روپے دوں گا اس کے؟“
 میرا غول کھول اٹھا، اور میرے ہاتھ پاؤں اور ہونٹ غصے کے مارے کانپنے لگے
 میں نے کہا۔

”او صنعت و حرفت سے پیٹ پائے والے نچلے طبقے کے انسان! مجھے اپنی توہین
 کی پروا نہیں، لیکن تو نے اپنی بیہودہ گفتاری سے اس بے زبان چیز کو جو صد مہ پہنچا یا
 تہ اس کے لئے میں تجھے قیامت تک معاف نہیں کر سکتا“ یہ کہہ کر میں بالٹیکل پر سوار ہو گیا
 اور اندھا دُھند پاؤں چلائے لگا۔

مشکل سے جس قدم لیا ہوں گا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں زمین پر جیسے زمین کے نیچے
 میں سے گذر گیا۔ اور ادھر ادھر کی عمارتوں نے ایک دوسرے کے ساتھ اپنی جگہ بدل لی ہے۔
 جب حواس بجا ہوں تو معلوم ہوا کہ میں زمین پر اس بے عقلی سے بیٹھا ہوں گویا بڑی مدت کو
 مجھے جس بات کا شوق تھا آج پورا ہو گیا، ارد گرد کچھ لوگ جمع تھے جن میں سے اکثر ہنس رہے
 تھے، سامنے وہ دوکان تھی جہاں ابھی ابھی میں نے اپنی ناکام گفت و شنید کا سلسلہ منقطع کیا تھا
 میں نے اپنے گرو پیش پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ یہ بی۔ بیسیل کا اگلا پتہ بالکل الگ ہو کر ٹھکتا

ہوا روک کے اُس پار جا پہنچا ہے اور باقی سائیکل میرے پاس پڑی رہی۔ میں نے فوراً اپنے آپ کو سنبھالا جو پہلے الٹا ہو گیا تھا اس کو ایک ہاتھ میں اٹھایا، دوسرے ہاتھ میں باقی ماندہ سائیکل کو اٹھانا اور چل کھڑا ہوا۔ یہ محض ایک اضطراری حرکت تھی، ورنہ خدشہ تھا وہ بائیسکل مجھ پر گزرتی عزیز نہ تھی کہ میں اس کو اس حالت میں ساتھ ساتھ لئے پھرتا۔

جب میں یہ سب کچھ اٹھا کر چل دیا تو میں نے اپنے آپ سے پوچھا کہ "یہ تم کیا کر رہے ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟ تمہارا ارادہ کیا ہے؟ یہ دو پہیے کا ہے کوئی جا رہے ہو۔"

سب سوالوں کا جواب یہی ملا کہ دیکھا جائے گا۔ فی الحال تم یہاں سے چل دو یہ سب لوگ تمہیں دیکھ رہے ہیں، سر اٹھا کر کھو اور چلتے جاؤ، جو منس رہے ہیں انہیں منسے دو۔ اس تمہارے بیوردہ لوگ ہر قوم اور ہر ملک میں پائے جاتے ہیں، آخر کیا ہوا؟ محض ایک عذر، بس دائیں بائیں مست دیکھو، چلتے جاؤ۔

لوگوں کے شائستہ کلمات بھی سُنانی سے رہے تھے، ایک آواز آئی "بس حضرت غفتمہ تھوک ڈالتے، ایک دوسرے صاحب بولے "بے جیا بائیسکل گھڑ پھینچ کر تجھے مزہ پھ دے گا" ایک بزرگوار اپنے بختِ جگر کی اٹھی پٹری سے جا رہے تھے میری طرف اشارہ کر کے کہنے لگے "دیکھو بیٹا یہ سکرپس کی بائیسکل ہے اس کے دونوں پہیے علیحدہ ہوتے ہیں۔ لیکن میں چلتا گیا۔ تھوڑی دیر بعد آدنی سے ڈونرکل گیا، اب میری رفتار میں ایک عزیمت پائی جاتی تھی۔ میرا دل جو کئی گھنٹوں سے ایک کشمکش میں مبتلا تھا، پچھو، تب کھا رہا تھا، اور اب بہت بھلا ہو گیا تھا، میں براہِ چپٹا لیا، جتنی کہ ایک دریا پر جا پہنچا، پل کے اوپر کھڑے ہو کر میں نے دونوں پہیوں کو ایک ایک کر کے اس بے پردانی کے ساتھ دریا میں اچھینک دیا جیسے کوئی لیسر جس میں خط ڈالتا ہے، اور واپس شہر کو روانہ ہو گیا۔ سب سے پہلے مرزا کے گھر گیا، دروازہ کھٹکیا، مرزا بولے "اندھا آ جاؤ۔"

میں نے کہا "آپ ذرا باہر تشریف لائیے، آپ جیسے خدارسینہ بزرگ کے گھر میں دُخو کئے بغیر کیسے داخل ہو سکتا ہوں؟"

مرزا صاحب۔۔۔ تشریف لائے تو میں نے وہ اوزار ان کی خدمت میں پیش کیا جو افسوس

نے پائیکل کے ساتھ ہی مفت مجھ کو عنایت فرمایا تھا اور کہا۔
 مرزا صاحب آپ ہی اس اوزار سے شوق فرمایا کیجئے، میں اب اس سے بے نیاز
 بن چکا ہوں۔

گھر پہنچ کر میں نے پھر علم کیمیا کی اس کتاب کا مطالعہ شروع کیا جو میں نے
 ایف اے کے کورس میں پڑھی تھی۔

لاہور کا جغرافیہ

تمہید ۱۔ تمہید کے طور پر صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ لاہور کو دریافت مچنا اس بہت بڑے گندہ چٹے ہے اس لئے دلائل و پیراہن سے اس کے وجود کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں یہ کہنے کی اب ضرورت نہیں کہ گڑے کو دائیں سے گھمائے حتیٰ کہ ہندوستان ہانگ آپ کے سامنے آکر ٹھہر جائے۔ چرفاں طول البلد عرض البلد کے مقام القناع پر رہا ہونا آواز کیجئے جہاں یہ نام گڑہ پر موقوف ہو وہی لاہور کا محل وقوع ہے۔ اس تحقیقات کو مختصر مگر جامع الفاظ میں برہگ یوں بیان کرتے ہیں کہ لاہور، لاہور ہی ہے۔ اگر اس پتہ سے آپ گولا ہوتیوں مل سکتا تو آپ کی تعلیم تبص اور آپ کی ذہانت قاتر ہے۔

محل وقوع ۱۔ ایک دو خطیاں البتہ ضرور رفع کرنا چاہتا ہوں، لاہور پنجاب میں واقع ہے لیکن چوباب اب پنج آب ہیں رہا۔ اس پانچ دیوؤں کی زمین میں اب صرف ساڑھے چار دیا جتے ہیں اور جو نصف دیا ہے وہ تو اب بہنے کے قابل نہیں رہا۔ اسی کو اسطرح میں راوی ضعیف کہتے ہیں۔

منہ ہا پتہ یہ ہے کہ شہر کے قریب دو پل بنے ہوئے ہیں ان کے نیچے ریت میں یہ دریا لیتا رہتا ہے بہنے کا شغل سے بنا ہے۔ یہ بتانا مشکل ہے اس لئے کہ شہر دیا کے کنارے پر واقع ہے یا بہت کنا سے پر واقع ہے۔

لاہور تک پہنچنے کے لئے کسی راستے میں لیکن ڈانڈوں سے بہت مشہور ہیں ایک پشور سے آتا ہے۔ دو۔ دہلی سے۔ وسطی ایشیا کے حملہ آور پشاور کے راستے اور یوپی کے حملہ آور صہبی کے راستے دار ہوتے ہیں۔ اول الذکر الہ سیف کہلاتے ہیں۔ اور غزنوی یا غوری تخلص کہتے ہیں

اور اس میں یہ طوطی رکھتے ہیں۔

حدود اربعہ۔۔ کہا جاتا ہے کسی زلزلے میں لاہور کا صد درجہ بھی ہوا کرتا تھا لیکن طنب کی سہولت کے لئے میسلیٹی نے اسے منسوخ کر لیا ہے۔ اب لاہور کے چاروں طرف لاہور میں لاہور واقع ہے اور ہندو برونز واقع تر ہور ہا ہے۔۔۔۔۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ دس برس سال کے اندازہ لاہور ایک صوبے کا نام ہوگا جس کا دارالخلافہ پنجاب ہوگا۔ یوں سمجھتے کہ لاہور ایک جسم ہے جس کے برہمن پیر و مہنودا ہور ہا ہے، لیکن ہر دم مواد فاسد سے بھرنا ہے۔ گو یہ وسیع ماریفہ ہے جو اس جسم کو لاحق ہے۔

آب و ہوا۔۔ لاہور کی آب و ہوا کے متعلق طح طرف کی روایات مشہور ہیں جو تھوڑے بڑے غلط ہیں حقیقت یہ ہے کہ لاہور کے باشندوں نے حال ہی میں یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اور شہر کی طرح آب و ہوا بھی آبی اور زرخیز جانیے میسلیٹی بڑی بہت توجہ سے اس کے بعد اس نتیجے پہنچیں کہ اس طرف کے فوری جبکہ دنیا میں کئی ممالک کو زوم رول مل رہا ہے اور لوگوں میں بیداری کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ اہل لاہور کی یہ خواہش ناجائز نہیں بلکہ محمدانہ غور و زور کی مستحق ہے۔

لیکن بدقسمتی سے کمیٹی کے پاس ہوا کی قلت تھی اس لئے لوگوں کو ہدایت کی گئی کہ معدوم کئے ہیں نظر اب شہر ہوا کی بجا استعمال نہ کریں بلکہ جہاں تک ہو سکے اغایات شعاری سنکا لیں چنانچہ لاہور میں ماہر ریات کے لئے ہوا کی بجائے گرد اور فاس خاص حالات میں دھواں استعمال کیا جاتا ہے کمیٹی نے جابجا دھوئیں اور گرد کے ٹھکانے کرنے کے لئے اگلیوں مرکز کھول دیئے ہیں جہاں یہ کویت مفت تقسیم کئے جاتے ہیں، امید کی جاتی ہے کہ اس سے نہایت تسلی بخش نتائج برآمد ہوں گے۔

بہم زمانی آب و ہوا کے لئے ایک اسکیم برص سے کمیٹی کے زیر غور ہے یہ اسکیم نظام سنی کے وقت سے پہلی آتی ہے لیکن مہیبت یہ ہے کہ نظام سنی کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے مسودات بعض تو تلف ہو چکے ہیں اور جو باقی ہیں ان کے پڑھنے میں بہت دقت پیش آتی ہے اس لئے ممکن ہے کہ تحقیق و تدقیق میں ابھی چند سال اور لگ جائیں۔ عارضی طور پر پانی کا استعمال کیا گیا ہے کئی احوال بارش کے پانی کو حتی الوسع شہر سے باہر نکلنے نہیں دیتے، اس میں کسی کو بہت کلیاں ہوتی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ کھوئے ہوئے عرصے میں سرٹھٹا کا پانی آئے۔ یا ہرگز اس میں رفت

رفہ پھیلیاں پیدا ہوں گی اور ہر پھلی کے بیٹ میں ایک انگوٹھی ہوگی جو اسے بندگی کے موقع پر ہر اسے دہندہ پہن کر آئے گا۔

نظام سقے کے سوراخ سے اس قدر ضرورتاً بت ہوا ہے کہ پانی پہنچنے کے لئے ایک نیا ہی دن لیسے ضرور مل کر پانی بن جائیں گی۔

چنانچہ بعض نلوں میں اب بھی چند قطرے روزانہ ٹپکتے ہیں۔ اہل شہر کو ہدایت کی گئی ہے کہ اپنے اپنے گھڑے نلوں کے نیچے رکھ دیں تاکہ عین وقت پر تاخیر کی وجہ سے کسی کی دل گلگنی نہ ہو۔ شہر کے لوگ اس پر بہت خوشیاں منا رہے ہیں۔

ذرائع آمد و رفت :- جو سیاح لاہور تشریف لائے کا ارادہ رکھتے ہیں ان کو یہاں کے معروف کسٹرز کے متعلق چند ضروری باتیں ذہن نشین کر لینی چاہئیں۔ اگر وہ یہاں کی سیاحت سے کما حقہ اثر پذیر ہو سکیں جو سڑک بل کھانی ہوئی لاہور کے بازاروں میں گنتی ہونے لگی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ یہ وہی سڑک ہے جو تیسرا شاہ سوری نے بنوائی تھی۔ یہ آثار قدیمہ میں شمار ہوتی ہے اور یہ جدا تہامہ کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے۔ چنانچہ اس میں کسی قسم کا ردوبدل گوارا نہیں دیا جاتا۔ وہ قدیم تاریخی گڑھے اور خندقیں جو ان کی توں موجود ہیں جنہوں نے کئی سلطنتوں کے تختے اٹ دئے تھے، اب اس میں بھی ان لوگوں کے تختے یہاں اٹتے ہیں اور عظمت رفتہ کی یاد دلا رہے ہیں۔ انسان کو عجب تہ سکاٹے ہیں۔

بعض لوگ زیادہ جوش پڑنے کے لئے ان تختوں کے نیچے نہیں کہیں دو ایک پتے لٹکتے ہیں اور اسے دو ٹکڑے لگا کر ایک گھوڑا ٹانگ دیتے ہیں۔ اصطلاح میں اس کو ٹانگ کہتے ہیں۔ شوہن لوگ اس پر موم جا مرنڈھ لیتے ہیں۔ سال پھسنے میں سہولت ہو اور بہت زیادہ غیرت پکڑی جاسکے۔

اسی اور خالص گھوڑے لاہور میں خوراک کے کام آتے ہیں۔ قلعابوں کی دوکانوں پر انہیں جاگوشت بکاتا ہے اور زمین کس کر رکھا جاتا ہے۔ ٹانگوں میں ان کے بجائے بنا سستی گھوڑے استعمال کئے جاتے ہیں۔ بنا سستی گھوڑے تھل زسورت میں دم دار ستائے سے ملتے ہیں۔ کیونکہ ان گھوڑوں کی راخت میں دم زیادہ اور گھوڑا کم پایا جاتا ہے۔ حکمت کے وقت اپنی دم کو دبا لیتا ہے۔

اور اس ضبطِ نفس سے اپنی رفتار میں ایک سنجیدہ اعتدال پیدا کرتا ہے تاکہ ایک کاہنہ باریکی گڈھا اور تانگے کا ہر جھکپور اپنے نقش پر ثبت کرتا جائے اور آپ کا ہر ایک مقام لطف اندوز ہو سکے۔

قابل دید مقامات ۱۔ لاہور میں قابل دید مقامات مشکل سے ملتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ لاہور کی سرعمارت کی بیرونی دیواریں دوسری بنائی جاتی ہیں، پہلے اینٹوں اور حوٹے سے دیواریں کھڑی کر دی جاتی ہیں، پھر اس پر اشتہاروں کا پلستر کرویا جاتا ہے جو دروازے میں رفتہ رفتہ بڑھ جاتا ہے۔ شروع شروع میں چھوٹے سائز کے میہم اور غیر معروف اشتہارات چکاتے جاتے ہیں، مثلاً

”اہل لاہور کو خردہ“ یا ”اچھا سنتا مال“ اس کے بعد اشتہاروں کی باری آتی ہے جن کے مخاطب اہل علم اور سخن فہم لوگ ہوتے ہیں مثلاً گریٹ ہڈی ہاؤس“ یا ”سٹوڈنٹس کے لئے نادر موقع“ یا ”کہتی ہے ہم کو خلق خدا غائبانہ کیا۔“ رفتہ رفتہ گھر کی چار دیواری تکمل ڈائریکٹری کی صورت اختیار کرتی ہے۔ دروازے کے اوپر بوٹ پالش کا اشتہار دائیں طرف تازہ مکھن ملنے کا پتہ درج ہے، بائیں طرف حافظ کی گویوں کا بیان ہے، اس کھڑکی کے اوپر ”انجمن خدام ہلت“ کے طے کا پروگرام ہے۔ اس کھڑکی پر شہور لیڈر کے خانگی حالات باوضاحت بیان کر دئے گئے ہیں۔ عین دیوار پر کرسی کے تمام جانوروں کی فہرست ہے اور اصل کے دروازے پر سرِ نعمت جان کی تصویر اور ان کے حالات گنوائے گئے ہیں۔ یہ اشتہارات بڑی سرعت سے بند لتے رہتے ہیں اور ہر نیا مشرہ اور ہر نئی دریافت یا ایجاد یا انقلاب نسیم کی ابتلا چشم زدن میں ہر سناکن چیز پر لیب دس جاتی ہے، اسی نے عمارتوں کی ظاہری صورت ہر لمحہ بدلتی رہتی ہے اور ان کو پہچاننے میں خود شہر کے لوگوں کو بڑی دقت پیش آتی ہے۔

لیکن جب سے لاہور میں دستور رائج ہوا ہے کہ بعض بعض اشتہاری کلمات پختہ سیاہی سے خود دیوار پر نقش کر دئے جاتے ہیں۔ یہ دقت بہت حد تک رفع ہو گئی ہے۔ ان دائمی اشتہاروں کی بدولت اب یہ خدشہ باقی نہیں رہا کہ کوئی شخص اپنا یا اپنے کسی دوست کا مکان صرف اس لئے بھول جائے کہ چھپی و تہ چار پائیموں کا اشتہار لگا تھا اور لوٹتے وقت تک وہاں اہالیان لاہور کو تازہ اور ستے جوتوں کا خردہ سُنا یا جا رہا ہے۔ چنانچہ اب وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ جہاں سب جلی ”نصرتی زنداں“ رہا ہے وہاں انقلاب کا دفتر ہے۔ جہاں جلی پانی بجھاپ کا بڑا ہسپتال لگھا ہے وہاں ڈاک اقبال رہتا ہے۔ غائب گھر کی بھائی ”امیاز علی تلج“ صاحب کا مکان ہے کہ کرشنا

۱۰ فی ڈیڑھ" شالامار باغ نوار کھانسی کا تجربہ نسخہ جہانگیر کے قہر کو جاتا ہے۔
صنعت و حرفت ۱۔ اشتهاروں کے علاوہ لاہور کی سب سے بڑی صنعت سالہ زری

ہے اور سب سے بڑی آگن سازی ہے۔ ہر سال لاکھوں خاص نمبر ہوتا ہے اور عام نمبر صرف
خاص خاص موقعوں پر شائع کئے جاتے ہیں۔ عام نمبروں میں سلوچیا اور سیس کچن کی تصاویر بھی دی
جاتی ہیں۔ اس سے آذرب کو بہت فروغ حاصل ہوتا ہے۔ اور نئی تنقید ترقی کرتا ہے۔

لاہور کے ہر مربع انچ میں ایک انجمن موجود ہے: پرنٹنگ، ٹیٹل، البتہ کھوڑے ہیں۔ اس لئے
فی اول صرف دو تین اصحاب ہیں، یہ اہم فرض ادا کرتے ہیں، چونکہ ان انجمنوں کے اغراض مقاصد
مختلف ہیں، اس لئے بسا اوقات ایک ہی صنف صنف کسی مذہبی کانفرنس کا اقتراح کرتا ہے۔ یہ پہلوں
سیما کی انجمن میں مسئلہ جانہ تعارف کراتا ہے اور شام کو کسی کرکٹ ٹیم کے ڈنر میں شامل ہوتا ہے
اس سے ان کا طبع نظر وسیع رہتا ہے۔ تقریباً طور پر ایسی ہوتی ہے جو تینوں موقعوں پر آگیا آسکتی
ہے۔ چنانچہ سامعین کو بہت سہولت رہتی ہے۔

پتیا اور ۱۔ لاہور کی سب سے مشہور سیادار یہاں کے طلباء ہیں جو بہت کثرت سے پائے
جاتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں دسلور کو بھیجے جاتے ہیں۔ فصل شروع سنا میں ہوتی جاتی ہے اور
عموماً ادھر بہا میں پک کر تیار ہوتی ہے۔

طلباء کی کئی قسمیں ہوتی ہیں جن میں چند مشہور قسمیں۔ ستم اول جمالی کہلاتی ہے۔ یہ طلباء
عام طور پر دہلیوں کے یہاں تیار ہوتے ہیں، بعد ازاں دھوبی اور پھرنالی کے پاس بھیجے جاتے
ہیں اور اس عمل کے بعد کسی ریستوران میں ان کی نمائندگی کی جاتی ہے۔ غروب آفتاب کے
بعد ہی سینا یا سینا کے گرد نواح میں۔

نُسخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں

ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر آتا ہے پروانہ

شمعیں کئی ہوتی ہیں، لیکن سب کی نفس ایک البم میں جمع کر کے اپنے پاس رکھ پھوڑے

ہیں اور تعطیلات میں ایک ایک کو خط لکھتے ہیں۔

دوسری قسم مدنی صبا کی ہے۔ ان کا شجرہ جلال الدین اکبر سے ملتا ہے اس سے

ہندوستان کا تخت و تاج ان کی ملکیت سمجھا جاتا ہے۔ شام کے وقت چند مصاحبوں کو ساتھ لئے کھلتے ہیں اور خود بخاک لٹھ لٹھاتے پھرتے ہیں۔

کلکتہ کی خوراک انھیں اس نہیں آتی، اس ہوسٹل میں فروش نہیں ہوتے۔

تیسری قسم خیالی طبیب کی ہے۔ یہ آٹھ روپے اخلاق اور آدھ گون اور بھوری تہ پہ باواز بند تبارہ خیالات کرتے پائے جاتے ہیں۔ اور آفریش اور نفسیاتی غیب کے متعلق نئے نئے نظریے پیش کرتے رہتے ہیں صحت جسمانی کو ارتقا۔ انسانی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں اس لئے طبی نصیحت پانچ چھ ڈنر پیتے ہیں اور سام آموہوشل کی چھت پر گہرے سانس لیتے ہیں کاتے ہیں نہیں سڑے ہوتے ہیں۔

چوتھی قسم خالی طبیب کی ہے۔ یہ طبیب کی خالص ترین قسم ہے۔ ان کا دامن کسی قسم کی آزمائش سے تر ہونے نہیں پاتا آتا ہے۔ امتحانات مطالعہ اور اسی قسم کے خدمت کبھی ان کی زندگی میں داخل نہیں ہوتے جس معصومیت کو لے کر وہ کالج پہنچتے ہیں اُسے آخر تک موٹ نہیں ہونے دیتے اور تعلیم اور نصاب اور درس کے ہنگاموں میں اسی طرح زندگی بسر کرتے ہیں جس طرح بتیش دانستوں میں زبان رہتی ہے۔

پچھلے چند سالوں سے طبیب کی ایک اور قسم بھی دکھائی دینے لگی ہے ایکس ان کو اچھی طرح دیکھنے کے لئے محارب شیشے کا استعمال ضروری ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ریل ٹکٹ نصف قیمت پر ملتا ہے، اور اگر چاہیں تو اپنی آٹا کے ساتھ زنانے ڈبے میں سفر بھی کر سکتے ہیں۔ اور ان کی وجہ سے اب یونیورسٹی لے کالجوں پر شرط عائد کی ہے۔ تہہ را آئندہ صرف وہی لوگ پروفیسر مقرر کئے جائیں جو فوڈ پلانے والے جانوروں میں سے ہوں۔

طبعی حالات ۱۔ لاہور کے لوگ بہت خوش طبع ہیں۔

سوالات

(۱) لاہور میں کیوں پسند ہے؟ غنیشل لکھو۔

(۲) لاہور کس نے دریافت کیا اور کیوں؟ اس کے لئے سزا بھی تجویز کرو۔
 ۳۱. میونسپل کونسل میں ایک قصیدہ مذہبی لکھو۔

ختم شدہ۔

تخلیقاتِ پطرس

ترتیب

بچے کا پہلا سال	سزہ گ، اشیاء کے مقناں چند عام اصول
دہبا ۰۰ میں برائے اسکا ڈرٹ	اختیار میں سزرت ہے
ولین صاحب اور میں	راز نگی جنابات
تدبیر یزان حکم ارران کے خیالات	ایک سات
انبال	رد کے ام
فنیہ تبسم رربا پوں سپراک نظر	بچے
انارکام مجلس صاحب اور ہم زیارمند	اب اور تب
ایک بنر مطبر عہ کتاب کاریا چہ	بیتہ برس رلا ہے
چھبے چور	تشرل
چپا اور دسرے انسلنے	آسان
جھوڑ	آینہ دل
ابران میں اجنبی	کاغذی روپیہ
نغمہ ناز	رنا رلانا
	نوع انسان رکبانی

مضحک اشیاء کے متعلق چند عام اصول

(پروفیسر سزری برگسان کا فلسفہ خندہ)

ہنس کے کیا معنی ہیں؟ کسی مضحک چیز میں ہنسانے والا عنصر کون سا ہے؟ ہم کبھی کسی کے منہ چڑانے پر کبھی کسی کے نظریات پر فخر سے پر اور کبھی کسی شخص کی ہیبت کڑائی پر ہنس دیتے ہیں۔ ان سب میں مشترک بات کونسی ہے؟ ہم کس طریقے سے ظرافت کی اس پرتی کو شیشے میں اتار سکتے ہیں جو ایک روح کی طرح مختلف شکلیں اختیار کر سکتی ہے اور سامانِ تضحک میں اس قدر تنوع پیدا کر دیتی ہے؟ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر ارسطو سے لے کر آج تک اکثر حکماء اپنا دماغ صرف کرتے رہے لیکن جو ہمیشہ ان کے ہاتھوں سے نکل کر پھر ان کے سامنے آکھتا ہوا انسان کی ہنسی اڑاتا رہا۔

جانِ خندہ یا روحِ ظرافت یا عنصرِ مضحک جو نام بھی آپ اس پر ہی کے لئے تجویز کریں اس نام کو منطقی کے اصولوں پر کسی تعریف کے بندھنوں میں جکڑ دینا فضول ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ روحِ خندہ ایک زندہ چیز ہے۔ اس لئے ہمیں اس کا ادب و احترام کرنا چاہیے اور ایک آدمی کو فخر سے ہمیں اس کی تمام ہستی کو لکھ ڈالنا اس کی توہین کرنا ہے۔ ہم صرف یہی کر سکتے ہیں کہ اس کا نظارہ کریں کہ وہ کس طرح پیدا ہوتی ہے اور کس طرح نشوونما پاتی ہے۔ دیکھیں کہ کس کس ڈھنگ سے طرح طرح کی شکلیں اختیار کرتی ہے۔ ممکن ہے ہم اس دیر پا آشنائی کی وجہ سے اس کو اچھی طرح جاننے لگیں اور ہمیں اس بات کی ضرورت ہی نہ رہے کہ کوئی ایک نوعیت کی حدود کے اندر اس کو بند کر کے ہمارے سامنے نہ لے آئے اور رکھ دے اور ممکن ہے یہ

ساکھ کے نام سے پکارتے ہیں اور اگر غور سے دیکھا جائے تو انسان نہ صرف "حیوان ضابط" بلکہ "حیوان مضطرب" بھی ہے۔ مگر کوئی اور حیوان یا کوئی بے جان چیز کبھی مہنسی کا باعث ہوتی ہے تو ہمیشہ دیکھا گیا ہے کہ عنقریب مضطرب یا کوئی انسانی مشابہت ہوتا ہے یا صنعتِ انسانی کا کوئی نقش اور یا پھر مضطرب وہ کام ہوتا ہے جو کوئی نشان اس چیز کے رہا ہو۔

دوسری بات جس کا بیان کر دینا ضروری ہے یہ ہے اکثر دفعہ مہنسی کے وقت جذبات مفقود ہوتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی مضطرب چیز اپنا اثر پیدا ہی نہیں کر سکتی۔ جب تک روح انسانی مکمل سکون و قرار کی حالت میں نہ ہو۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم ایک ایسے شخص کی مہنسی نہیں کر سکتے جس پر ہم تیس کھاتے ہوں یا جس سے ہمارے الفت و محبت کے تعلقات وابستہ ہوں۔ لیکن یہ بات ضرور ہے کہ ایسے شخص کی مہنسی کرنے کے موقع پر ہم اتنی دیر کے لئے رتا اور محبت کی زبان بند کر دیتے ہیں جتنا ایسے شخص کی جماعت میں جو حرفِ دماغ سے ماخوذ رکھتے ہیں اور جن بارگاہِ دل میں کہ وہ جذبات کا خزانہ ہوتا ہے، معدوم ہو۔ شاید کوئی شخص بھی کبھی روتا ہوا نہ پایا جائے۔ لیکن ہنسنے والے پھر بھی اس میں موجود ہوں گے اس کے مقابلے میں ایک جماعت حد درجہ کی حساس طبیعت رکھنے والے اشخاص کی ہے۔ جن کا دل زندگی کی اہمیت کے ساتھ پورے طور پر ہم آہنگ ہے یعنی وہ اشخاص جن کو اہل دل کہا جاتا ہے اور جن کی فطرت میں بریک واقعہ ایک بذاتی کیفیت پیدا کر دیتا ہے (جو ہمیشہ کمال کو پہنچتی رہتی ہے) ایسے اشخاص نہ تو مہنسی سے آشنا ہیں۔ اسے سمجھ سکتے ہیں جو آواز میں تب کے کانوں تک پہنچتی ہیں یا جو حرکات و افعال آپ کے سامنے ظہور پذیر ہوتے ہیں مگر تب ان کے ساتھ دل بستگی پیدا کر لیں۔ اگر آپ تصور و تخیل میں اوروں کے افعال میں ان ہی کی طرح شریک کار ہو جائیں اور انہیں کی طرح سب کچھ محسوس کرنے لگیں۔ مختصر یہ کہ اگر آپ اپنے جذبہ ہمدردی کو نوری طرح وسعت دے دیں تو حیرت سے حقیر چیز آپ کی طرف سے اس قدر متبع ہو جائیں گے کہ آپ کو یا کسی مسلم نے اس کی نیقت کو

آشنائی ہمارے لئے بہت ہی مفید ثابت ہو کیونکہ روح خندہ کی بھی ایک منقطع سہ۔ وہ بھی اپنا ایک مندرجہ طریق عمل رکھتی ہے۔ خواہ وہ کتنی ہی دور از کار رفتہ کیوں نہ ہو۔ کیونکہ کبھی مضحک باریں ایسی ہیں جن کو ایک زمانہ بانٹا ہے اور ان سے لطف اندوز ہوتا ہے جن پر ایک قوم کی قوم ہنس پڑتی ہے۔ جن پر ایک ملک کا ملک دہرا ہو جاتا ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اگر ہم روح خندہ سے اچھی طرح واقف ہو جائیں تو ساتھ ہی ہمیں عوام الناس کے تخیل کا بھی کچھ نہ کچھ علم حاصل نہ ہو جائے۔ ہنسی خود زندگی سے پیدا ہوتی ہے اور فن کی بہت ہی قدیم رشتہ دار ہے تو لیکن جسے یہ زندگی اور فن پہ بھی بہت سی روشنی ڈالے۔

منزج شذوذ میں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہنسی کے متعلق تین بنیادی اصول بیان کر دیئے جائیں اس میں ہر ایک سے خود مضحک اشیاء سے بہت تعلق نہیں لیکن ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے بعد ان تصحیح کی مدد قائم کی جاسکتی ہیں۔

فصل۔ دوران بحث میں سب سے پہلی بات جس کی طرف ہمیں اپنی توجہ مبذول کرنی چاہیے ہے کہ کوئی سامان تضحیک انسانی دائرہ سے باہر نہیں پایا جاتا۔ کسی دریا یا پہاڑی کا منظر ممکن ہے۔ مدد جب ووں کش ہو لیکن ہے کہ بالکل ہی حقیر و بد نما ہو لیکن مضحک ہو گیا نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہے کہ بعض اوقات ہمیں ایسا جانور کو دیکھ کر بے اختیار ہنسی آجائے۔ لیکن اس کی وجہ صرف ہی ہوتی ہے۔ ہمارے لہجہ کو اس جانور کی ہنسی میں کوئی انسانوں کا سا انداز یا انسانوں کی ہی نسبت محسوس ہو جاتی ہے جو سامان تضحیک بن جاتی ہے لیکن ہے کہ بعض اوقات آپ ایک ہونری تو اس کا غدی ٹوپی کو دیکھ کر کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اس میں جو چیز مضحک ہے وہ اس ٹوپی کا غدی نہیں۔ وجہ خندہ اس ٹوپی کی شکل ہے۔ وہ شکل جس کو یوں معرین نمونہ میں مانے گا بہت ہی انسانی ہے۔ یعنی مضحک انگیز ٹوپی کی قطع وضع ہے جو اس وجہ سے تضحیک کی بہت ہے۔ وہ کسی انسانی رخ کے ایک عجیب و مضحک خیال کی ترجمان ہے یہ تعجب کی بات ہے کہ یہاں اور ایسا بین نکتہ سہ کی تفسیر سے اس قدر مانع رہا ہے اکثر لوگ انسان کو جانور

بہ لخت ہوں یہ اس ہفتیچہ ہے جو ہر تمام محسوسات پر ایک ناریک تھامے کی جو آپ کو منہ سے ٹھونک دیتی ہے اور آپ شکستہات سے لگ ہنسا اور اپنے آپ کو بہل بہل بنا کر اس کا نظارہ کریں تو کئی باتیں بین کئے کے شہمک بن جائیں گی اگر کہیں وہیں سے مانتے ہاں مدد ہاں یہ بات ہو رہی ہے اس سے لطف نہ ورتتے ہیں میں اور آپ نے کہاں کو اس عورت بندہ میں کہ موٹی تھی کی اور آپ بالکل نہیں سکیں نوت نہ شخص مضحک ہو جائے اور شاید ہی کوئی اعلیٰ انسانی ایسا ہو جو اس طرح کی زماش میں پورے تر سے کتہہ ہم انجان و حیرت کو بدبخت کی ہر آہنگ موسیقی سے مستعدہ کر کے نہ پائے نہ نہیں نوان میں سے نہ البتہ ہوں گے جو فوراً امتحان سے کرے ہونے نظر آئیں گے تاہم یہ کہ کسی مضحک چیز سے پورے پورے پذیر ہو کر کئے کے ایک ماریخی نغمہ مینڈبات ضروری ہے بھٹیک کا اعلق عقل و فکر و معرفت و فہم کے ہے۔

لیکن ہنسی کے سے بات بھی ضروری ہے کہ ایک انسان ہر دماغ اور انسانوں کے دماغ سے دور فائدہ نہ ہو اور یہ تیسرا اہم ہے جو توجہ کا طالب ہے۔ اگر آپ اپنے آپ کو بالکل تنہا اور بے رفیق محسوس کریں تو آپ مضحک آتیوں سے متاثر نہیں ہو سکتے۔ ہنسی کے سے ہمیشہ ایک کوچی، ایک نڈانے ہر کشت یعنی شرکت و شرکت کا ہونا ضروری ہے آپ خود کسی کی آواز کو غور سے سنئے یہ صاف و صریح پہنچی اور نڈانے آواز نہیں خود میں آواز کی ذمیت میں گونجتے رہنے کی خواہش مضمر ہے۔ یہی ہے کہ ایک دھمک کی لڑائی یہ ایک پیسے زور سے پھٹ کر شروع ہوتی ہے اور ایک سلسلہ لڑائی کے ساتھ باہمی رہتی ہے۔ کوما چانوں میں بدل کر رہے ہیں لیکن باہمی تہ نہیں ہو سکتا کہ یہ کرج باغایت و انہما کو کھتی ہے اس کے انماح کا ملکہ نہیں قدم بھی وسیع ہو کر ملکہ ہے اور اس کے خود ہے ایسی ہر وہی ہنسی ہمیشہ یہ ہامت یا ایک ملکہ ہم محدود ہوتی ہے آپ کو میں کے سفر میں کبھی نہ دیکھنے کا اخاف ہو جو آسکے جس ہم یہی مسافر ہیں ہیں باہمی کر رہے ہیں۔

جو ان کے لئے یقیناً طرافت آمیز ہیں۔ کیونکہ وہ دل کھول کر ہنستے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ اگر آپ بھی ان کی صحبت میں شریک ہوتے تو آپ بھی یقیناً ہنستے لیکن چونکہ آپ ان سے علیحدہ ہیں آپ کو ہنسی نہیں آتی۔ ایک دفعہ ایک شہر کی جامع مسجد میں اس شہر کے بڑے مولوی و عظیم فرما رہے تھے۔ ان کی تقریر اس قدر موثر تھی کہ سب سامعین زار و قطار رو رہے تھے۔ سولے ایک کے جو بالکل ہی مطمئن بیٹھا تھا۔ جب اس شخص سے اس کے اس قدر غیر متاثر ہونے کی وجہ دریافت کی گئی تو اس نے جواب میں کہا: "میں اس شہر کا باشندہ نہیں۔ میں تو اجنبی ہوں؛ رونے کے متعلق اس شخص نے جس خیال کا اظہار کیا وہ ہنسنے کے متعلق اور بھی زیادہ صحیح ہے۔ ہنسی، ہمیں بے اختیاری کی ایک کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ ایک ہنسنے والے کو ہنسنے کے لئے اور ہنسنے والوں کے ساتھ (خواہ وہ حقیقت میں موجود ہوں یا محض تصور میں) سازش کرنی پڑتی ہے اور بعض اوقات تو وہ محض دوسروں کی مدد ہی سے ہنستا ہے آپ دیکھتے ہیں کہ ٹیڈٹر میں تماشا دیکھنے والوں کی تعداد میں قدر زیادہ ہوتی ہے اسی قدر ہجوم کی ہنسی بھی زیادہ بے قابو ہوتی ہے اور آپ دیکھتے ہیں کہ ایک زبان میں بہت سی طرافت کی باتیں ایسی ہوتی ہیں۔ جن کا ترجمہ اگر کسی دوسری زبان میں کیا جائے وہ طرافت سے خالی رہ جاتی ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی طرافت ایک خاص قوم کے رسم و رواج اور خیالات سے تعلق رکھتی ہے۔ جنہوں نے اس نکتے کو نظر انداز کیا ہے وہی لوگ ہیں جن کے نزدیک طرافت ایک نہایت ہی حقیر مشغلے سے زیادہ قابلِ غور حقیقت نہیں رکھتی اور جو ہنسی کو حیاتِ انسانی کی باقی ہنگ و دو سے بالکل ہی بے تعلق سی چیز خیال کرتے ہیں۔ اکثر لوگ طرافت کی یوں تو صیغہ کرتے ہیں کہ "طرافت ایک تقابلِ ذہنی کا نام ہے" یا "طرافت ایک محسوس بے ہودگی کا نام ہے۔" ممکن ہے یہ تعریفیں ٹھیک ہوں لیکن یہ اس سوال کا جواب دینے سے قلعی قاصر ہیں کہ آخر بعض چیزوں پر ہمیں ہنسی کیوں آتی ہے؟ کیا وجہ ہے کہ بعض محسوسات تو ایسے ہیں کہ ان کو دیکھتے یا سنتے ہی ہمارے پیٹ میں بل پڑ پڑ جلتے ہیں حالانکہ اور ہزاروں اشیاء بھی دنیا

میں موجود ہیں جن کا مطلقاً کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ہنسی کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے، ہمیں ہنسی کو ہنسی کے گھر میں اٹھ کر دیکھنا چاہیے اور یہ ظاہر ہے کہ ہنسی کا گھر انسانوں کی سوسائٹی ہے۔

مفصلہ بلا بحث سے تین باتیں واضح ہوتی ہیں۔

۱۔ سامانِ تضحیک انسانی دائرے سے باہر نہیں پایا جاتا۔

۲۔ ہنسنے وقت جذبات معطل ہوتے ہیں۔

۳۔ ہنسی کے لئے ایک سے زیادہ (حقیقی یا خیالی) ہنسنے والوں کا ہونا ضروری ہے۔ یعنی ہنسی اس وقت پیدا ہو سکتی ہے۔ جب انسانوں کی ایک جماعت اپنی توجہ اپنے ایک فرد کی طرف اس طرح منعطف کرتی ہے کہ اپنے جذبات کو معطل کر دیتی ہے اور صرف اپنے عقل و فہم سے کام لیتی ہے۔

فصل۔ ایک شخص بازار میں دوڑتا پھلا جا رہا ہے۔ یکایک وہ ٹھوکر کھا کر گر پڑتا ہے۔ لوگ ہنس دیتے ہیں۔ اب اگر لوگوں کو یہ معلوم ہوتا کہ وہ گرنا نہیں بلکہ جان بوجھ کر یوں زمین پر بیٹھ گیا ہے تو وہ اس پر نہ ہنستے۔ لوگ ہنستے اس لئے ہیں کہ اس شخص کا زمین پر یوں بیٹھ جانا اس کا ایک غیر ارادی فعل تھا۔ یعنی باعثِ خدہ اس شخص کے انداز کا یوں یکایک متغیر ہو جانا نہیں بلکہ اس تغیر میں مددِ ارادہ کے عنصر کا پایا جاتا ہے۔ اس شخص کو چاہیے تھا کہ جس پتھر سے اسے ٹھوکر لگی ہے اس سے ہٹ کر چلتا یا اپنی رفتار بدل دیتا۔ اس نے ایسا نہیں کیا اور چونکہ اس کے بدن میں یک لخت کترا جانے کی قابلیت نہ تھی یا شاید وہ کسی اور خیال میں غرق تھا (یعنی اس کا خیال غیر حاضر تھا) اور اس کے جسم میں اتنی لچک اور خمیدگی کی قابلیت نہ تھی کہ وہ خیال کے پھر حاضر ہو جانے پر اپنے بگڑے ہوئے توازن کو فوراً سینکھال لیتا۔ اس لئے اس کے اعصاب اپنے پہلے فعل یعنی آگے کو چلنے کی حرکت ہی میں معروف رہے۔ حالانکہ متغیر حالات کچھ اور چاہتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ وہ گر پڑا اور یہی وجہ تھی کہ لوگوں کو ہنسی بھی آئی۔

اب ایک ایسے شخص کی مثال لیجئے جس کا معمول نہایت ہی باقاعدہ اور چھانٹا ہے۔

اور جو چھوٹی سے چھوٹی بات میں بھی اپنے معمول سے سرواخراف نہیں کرتا۔ اس کی تمام اشیاء ایک مقررہ ترتیب سے رکھی رہتی ہیں اور وہ بہت ہی باقاعدگی سے ان کو استعمال کرتا ہے۔ اب فرض کیجئے کوئی مشین لڑکا اگر ان تمام چیزوں کی ترتیب کو بدل دیتا ہے اب وہ شخص میز پر سے قلم اٹھانے لگتا ہے تو اس کے ہاتھ میں چاقو آجاتا ہے جب وہ الماری میں سے طب کی کتاب نکالتا ہے تو اس کی جگہ دوا خزانہ کا نائل نعل آتا ہے جب وہ کرسی پر بیٹھنے لگتا ہے تو وہ ہم سے زمین پر جاگتا ہے۔ غرضیکہ اس سے کوئی کام ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ عادت اس کو عبور کرتی ہے کہ جب اسے کرسی پر بیٹھنے کی ضرورت ہو تو وہ ایک خاص جگہ پر پہنچ کر بیٹھ جائے اب اگر خلاف معمول کرسی وہاں موجود نہیں تو چاہئے تھا کہ وہ اپنی اس حرکت کو روک لیتا یا سفر کر دیتا لیکن اس نے ایسا نہ کیا بلکہ ایک مشین کی طرح یہ خطہ مستقیم چلتا رہا۔ تو گویا جو شخص اس قسم کی شرارت کا نشانہ بنایا جاتا ہے اس کی حالت بھی ایک طرح سے اسی شخص کی سی ہے جو دوڑنے میں ٹھوکنہ کھا کر گر پڑتا ہے۔ سامانِ تضحیک دونوں حالتوں میں ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ ان دونوں اشخاص میں ان خاص موقعوں پر بل کھانے یا لچک جانے کی قابلیت کافی مقدار میں نہیں ہوتی اور چونکہ ہم ایک انسان ہیں۔ اس بات کی توقع کرتے ہیں کہ وہ نہایت ہی بیداری سے حرکت کرے اور اس میں مراد نہ جانے کی قابلیت پائی جائے۔ اس لئے ہمیں ان پر ہنسی آتی ہے۔ ان دو اشخاص کی مضحک کیفیتوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ ایک حالت میں تو گرنے کا سامان سہرا اتفاق نے ہٹا لیا تھا اور دوسری حالت میں ایک لڑکے کی شرارت نے ان دو وجودات سے ان دو شخصیتوں میں فورا گرا جانے کی قابلیت کی کوتاہی ظہور میں آئی۔

لیکن ان دونوں میں یہ بات بھی مشترک ہے کہ جو مضحکہ نتیجہ دوتا ہوا۔ اس کی علت خارجی تھی۔ یعنی ان اشخاص کی اپنی ذات میں پیدا نہ ہوئی تھی۔ اب اگر اس لچک کی کوتاہی کے ظہور کے لئے سڑک میں کسی پتھر کے پڑے ہونے یا کسی شریر لڑکے کی شرارت کی ضرورت نہ ہو۔ بلکہ یہ کوتاہی قدرتی اور طبعی طریقے پر خدا اپنے خزانے میں سے اپنے تئوں کے لئے کئی مواقع نکال لے

تو سامانِ تضحیک کی ملت خارجی نہ رہے گی۔ بلکہ داخلی بن جائے گی۔ ایک ایسے شخص کی مثال لیجئے جس کا دماغ اپنے گزشتہ افعال کے متعلق مصروف رہتا ہے اور اس بات کی طرف کبھی توجہ نہیں کرتا کہ وہ فی الحال کیا کر رہا ہے۔ یعنی اس کے خیالات زمانہ حال سے ہمیشہ ایک قدم پیچھے رہتے ہیں۔ اگر آپ اس سے کوئی سوال پوچھتے ہیں تو وہ اس کا وہی جواب دیتا ہے جو صبح اس نے کسی اور شخص کو کسی اور بات کے متعلق دیا تھا۔ اگر اس کے سامنے ایک گاڑی آکر ٹھہر جاتی ہے تو وہ اس پر اسی طرح چڑھنا شروع کر دیتا ہے جس طرح وہ صبح اپنے مکان کی سیڑھیوں پر چڑھا تھا۔ یعنی پرہتا چلا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے حواس اور عقل دونوں میں ایک لچک اور خمیدگی کی ایسی کمی اور کوتاہی ہے کہ وہ زمانہ حال میں وہ آوازیں سنتا ہے جو کچھ عرصہ ہوا بند ہوئیں اور وہ کچھ دیکھتا ہے جو آنکھوں سے کب کا ادبھل ہو چکا۔ اس کے حواس اور اس کی عقل میں اتنی لچک نہیں کہ وہ ان پندور مثال کران کو گرد و پیش کے حالات کے ساتھ مطابقت دیتا رہتا۔ جب کہ اس پر واجب یہ ہے کہ اس کے افعال حقیقت حاضرہ کے موافق ہوں۔ ایسی حالت میں سامانِ تضحیک (اور اس کی ملت ظہور) عقل اس شخص کی ذات کے اندر بہت خوب۔ ایسا شخص بعض اوقات بہت ہی مضحکہ انگیز ہوتا ہے اور اگر آپ ذرا غور کریں تو آپ کو طبعاً ہی کی کئی ایسی باتیں یاد آجائیں گی جو اس خیال کی ترجمانی کریں گی۔

خیال کی غیر حاضری کا جو نتیجہ ظہور میں آتا ہے۔ اس کا مضحکہ ہونا بعض اوقات بہت زیادہ سے اور بھی زیادہ قوت پکڑتا ہے۔ مثلاً اگر آپ کو کسی شخص کے خیالات کے یوں یہ رعب حاضر رہنے کی ساری تاریخ سے واقفیت ہو اس کی تاریخ کی گویا آپ کی آنکھوں کے سامنے پیدا ہو اور آپ اس بات سے بھی واقف ہوں کہ وہ کیسے بڑھتی رہتی ہے اور کن وجوہ سے ترقی کرتی رہی ہے تو آپ کو اور بھی زیادہ ہنسی آئے گی۔ فرض کیجئے ایک شخص رات دن مجنوں اور فریاد کے نغمے پڑھتا رہتا ہے اور جو بیس گھنٹے اس کا دل و دماغ، حواس کی وحشت، محرک اور دی خود فراموشی بے خودی اور دیگر کیفیات میں مصروف رہتا ہے۔ حتیٰ کہ قیاس اور فہم دکا کیریکٹر

سے اتنا جاذب و دلکش معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کی تقلید کرنے لگ جاتا ہے اب وہ اپنے آپ کو بالکل قیس سمجھتا ہے اور اس کے خیالات اور ارادے اس کی طرف مائل ہوتے جاتے بالکل اسی کی طرح ہونگے ہیں۔ اگر چہ اس کی یہی حالت رہی تو ایک دن ایسا آئے گا کہ وہ اگر اور لوگوں کی صحبت میں شریک ہوگا تو اس طرح گویا ایک مسلسل خواب اس پر طاری ہے اور وہ اسی خواب میں ادھر ادھر مل پھر رہا ہے اس کی باتیں اس طرح کی ہوں گی جیسے کوئی نیند میں بتا رہا ہو۔ اب اس کی تمام حرکتیں کسی دوسری دنیا سے تعلق رکھتی ہیں ایسے شخص میں سلامتی تفحیک کس قدر موثر و عمیق ہوتا ہے۔ جب آپ اس سے وقت پوچھتے ہیں تو وہ ایک شعر پڑھ دیتا ہے اور کہتی وہ آپ کو اپنا محبوب فرض کر کے ایک قصیدہ مدیہ گلنے لگ جاتا ہے ایسے شخص کے خیال کی غیر حاضری میں یہ بات زائد ہے کہ اس کا خیال غیر حاضر تو ضرور ہے لیکن اس کے علاوہ کسی اور جگہ حاضر بھی ہے جہاں وہ موجودات سے بے خبر ہے وہاں تخیلات سے باخبر بھی ہے یعنی صرف یہی نہیں کہ وہ گرد و پیش میں بے کار ہے بلکہ وہ ایک اور دنیا میں معروف بھی ہے۔ ایسی ہستی اس شخص سے زیادہ مضحک ہے جس کے خیال کے متعلق آپ صرف یہی جانتے ہیں کہ غیر حاضر ہے۔ لیکن یہ نہیں معلوم کہ آخر وہ ہے کہاں؟ مگر جب آپ کو اس بات کا علم ہو جائے کہ واقعات موجودہ سے بے خبر اس کا دماغ کس بات میں مصروف ہے تو وہ زیادہ مضحک ہو جاتا ہے۔ ایسے اشخاص کو صرف عام میں جنونی اور پاگل کہتے ہیں۔ ان دیوانوں کو دیکھ کر جب ہمیں سنہی آتی ہے تو ہمارے ساز ہستی میں وہی تار لہزاں ہوتے ہیں جو کسی ایسے شخص کو دیکھ کر لہزاں ہونے لگتے۔ جو ایک شریر لڑکے کی شرارت کا تختہ مشق بنتا ہے یا جو بازار میں دوڑتا ہوا پھسل کر گر پڑتا ہے یہ دیوانے بھی ایک نصب العین کی طرف دھڑ رہتے تھے۔ اور اس تگ و دو میں کسی سخت و کمر خست حقیقت سے ٹوکر کھا کر گر پڑتے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ ایسے لوگوں سے اس بات میں بڑھے ہوتے ہیں کہ ان کی بے خبری یا قاصرہ منگوم و منضبط ہوتی ہے اور ایک خاص مرکز کے گرد چکر لگاتی رہتی ہے ان کے

ساخت اور ان کے حادثات علت و معلول کے ایک خاص سلسلے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ جہاں باہوش انسانوں کی منطوق سے کسی طرح کم نہیں۔ ان کی عقل میں لچک کی ایک ایسی کمی ہے جس سے ہوتے ہوئے وہ اپنے حواس کو اپنی دنیا سے موڑ کر اس دنیا کے حواس کے ساتھ مطابقت بنا دے سکتے۔

مذکورہ بالا شخص کے ایک خاص خیال میں اس قدر ہٹ اور منہ ہے کہ وہ دماغ میں سے باہر ہی نہیں نکلتا۔ اس لئے خیالات اس کے دماغ میں جگہ نہیں پاسکتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ شخص مضحک حرکتوں کا مرتکب ہوتا ہے اب خدا اس سے آگے چلے اور غور کیجئے کہ جو تعلق ایک خاص خیال کی ہٹ کو انسانی دماغ سے ہے۔ وہی تعلق بعض برائیوں کو انسان کی ہڈی سے ہے یہاں پر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ بد اخلاقیوں دو قسم کی ہیں بعض برائیاں ایسی ہیں کہ رنج انسانی اپنی تمام قوتوں اور طاقتوں کو ساتھ لئے ان میں کود پڑتی ہے اور اپنی طیبات سے ان برائیوں کو گویا زندگی بخش کر ان کو اپنے ساتھ ساتھ گھسیٹی چلی جاتی ہے اور اس طرح سے مختلف شکلوں میں انہیں ظاہر کرتی رہتی ہے۔ ایسی برائیاں در داگیر اور ملال آمیز ہوتی ہیں۔ بر خلاف اس کے مضحک برائی گویا ایک چوکھا سا ہوتا ہے جس میں انسان کو کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ ہم میں تلوں کر جائے وہ ہم پر سٹار ہو جاتی ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم اسے اپنے رنگ توخ میں رنگ دیں۔ وہ ہمیں اپنی یکسانیت کا جامہ پہنا دیتی ہے۔ ڈلے اور کامیڈی میں فرق صرف اسی سے ہے۔ ممکن ہے کہ ڈرامے میں چند ایسی برائیوں کا نقشہ کھینچا گیا ہو جو خاص اسما سے موسوم ہو سکتی ہیں۔ لیکن وہ کچھ اس طرح سے کیریکچر کا جزو بدن بن جاتی ہیں کہ ہم ان برائیوں کے نام بھول جاتے ہیں۔ ان کے خواص کو فراموش کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہمیں ان برائیوں کا خیال تک نہیں آتا۔ بجائے اس کے ہمارے پیش نظر صرف وہ کیریکچر ہوتا ہے جس کی ذات میں ان برائیوں کو بھر دیا جاتا ہے اسی لئے ایک ڈرامہ کا نام کوئی اسم معرفہ ہوتا ہے مثلاً تھیٹرو، جملٹ وغیرہ لیکن ایک مضحک برائی خواہ وہ ایک شخص سے نہایت ہی

چسپیدگی کے ساتھ وابستہ ہو پھر بھی اپنی میلحدہ نوعیت افسردہتی کو قائم رکھتی ہے وہ بہ ذاتِ خود ایک کیریکٹر بن جاتی ہے جس کے ارد گرد زندہ کیریکٹر گھومتے رہتے ہیں۔ اکثر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ مضحک برائیاں کیریکٹروں کو کھڑپیلیوں کی طرح بچاتی ہیں۔ اسی لئے ایک شخص جتنا زیادہ وہ اپنی ذات سے بے خبر ہوتا ہے اتنا زیادہ مضحک بھی ہوتا ہے ایک ڈرامے کے کیریکٹر کو اگر اس بات کا علم ہو جائے کہ وہ کیا ہے اس میں کوئی برائیاں ہیں اور ان برائیوں کو ہم کس نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں تو ممکن ہے کہ وہ اپنے آپ میں کوئی اصلاح یا تغیر نہ پیدا کرنا چاہے لیکن جہاں صاحبِ نقائص مضحکہ کو اپنے مضحک ہونے کا احساس ہوا۔ وہ اپنی ذات میں ترمیم شروع کر دیتا ہے یا کم از کم یہ اثر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کہ اب اس میں وہ بات نہیں رہی یا کچھ نہ کچھ تغیر ہو گئی ہے۔ لوگوں کی مہنسی مصلح اخلاق ہے۔ سو ہم دیکھتے ہیں کہ اس شخص میں جو دوڑتے ہوئے گم پڑتا ہے اور اس شخص میں جو کسی شرارت کا نشاۃ بنایا جاتا ہے اور اس شخص میں جو ایک خیالی دنیا میں رہتا ہے اور اس شخص میں جس کی سیرت کے نقائص مضحکہ انگیز ہوتے ہیں۔ ان سب میں لچک یا فوری تبدیلی کر سکنے کی کمی کے اثرات پائے جاتے ہیں اور یہی سامانِ تضحیک کی روحانی کا باعث ہوئی ہے۔ کش مکش جیات اور سوسائٹی کے تقاضے ہم سے ہمیشہ اس بات کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں کہ ہماری توجہ ہر وقت بیداری اور آگاہی کے ساتھ واقعاتِ حاضرہ کو پیش نظر رکھے اور ساتھ ہی ہمارے جسم اور دماغ میں وہ لچک پائی جائے جس کی بدولت ہم اپنے آپ کو موجودات کے ساتھ مطابقت دیتے ہیں۔ اگر ہمارے جسم میں اس کی کوتاہی ہو تو ہم مختلف عوارض و حادثات میں مبتلا رہتے ہیں۔ اگر یہ کوتاہی ہمارے دماغ میں پائی جائے تو ہر ایک قسم کی بے وقوفی اور ہر ایک قسم کا جنون ہماری زندگی میں خلل انداز ہوتا ہے۔ اگر یہ کوتاہی ہماری سیرت میں پائی جائے تو ہماری ہستی اپنے گرد و پیش کی سوسائٹی میں بے جوڑسی رہ جاتی ہے۔ طرح طرح کے مصائب ہم پر نازل ہوتے ہیں اور انواع و اقسام

کے جرائم ہم سے سرزد ہوتے ہیں۔ جنسی گویا سوسائٹی کی ایک انگشت نمائی ہے۔ جو وقتاً فوقتاً ہماری اصلاح کرتی رہتی ہے۔ اس کا تعلق محض لطافت قلبی سے نہیں۔ اگرچہ یہ کون نہیں جانتا کہ ہم جتنے وقت ہیں جب ہم تحفظ نفس کے تفکرات سے آزاد ہو کر ایک دوسرے کو صرف مخلوق فن اور دلچسپ صنعت کاریاں تصور کرنے لگ جاتے ہیں۔

”پطرس“

(مخزن۔۔ جنوری ۱۹۲۲ء)

اخبار میں ضرورت ہے

یہ ایک اشتہار ہے لیکن چونکہ عام اشتہار بازوں سے بہت زیادہ طویل ہے اس لئے شروع ہی میں یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوا ورنہ شاید آپ پہچاننے نہ پاتے۔

میں اشتہار دینے والا ایک روزانہ اخبار کا ایڈیٹر ہوں۔ چند دن سے ہمارا ایک چھوٹا سا اشتہار اس مضمون کا اخباروں میں نکل رہا ہے کہ ہمیں مترجم اور سب ایڈیٹر کی ضرورت ہے یہ غالباً آپ کی نظر سے بھی گزرا ہوگا اس کے جواب میں کئی امیدوار ہمارے پاس پہنچے اور بعض کو تنخواہ وغیرہ چکانے کے بعد ملازم بھی رکھ لیا گیا لیکن ان میں سے کوئی بھی ہفتے دو ہفتے سے زیادہ مہترنے نہ پایا آتے کے ساتھ ہی یہ غلط فہمیاں پیدا ہوئیں اشتہار کا مطلب وہ کچھ اور تھے۔ ہمارا مطلب کچھ اور تھا، غمخوار سے اشتہار میں سب باتیں وضاحت کے ساتھ بیان کرنا مشکل تھا جب رفتہ رفتہ ہمارا اصل مفہوم ان پر واضح ہوا یا ان کی غلط توقعات ہم پر روشن ہوئیں تو تعلقات کشیدہ ہوتے تلخ کلامی اور بعض اوقات دست درازی تک نوبت پہنچی۔ اس کے بعد یا تو وہ خود ہی ناشائستہ باتیں ہمارے منہ پر کہہ کر چلے والے کابل ادا کئے بغیر چل دیئے یا ہم نے ان کو دھکے مار کر باہر نکال دیا اور وہ باہر کھڑے نعرے لگایا کئے جس پر ہماری اہلیہ نے ہم کو احتیاطاً دوسرے دن دفتر جانے سے روک دیا اور اخبار بغیر لیڈ ہی کے شائع کرنا پڑا، چونکہ اس قسم کی غلط فہمیوں کا سلسلہ ابھی تک بند نہیں ہوا اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ ہم اپنے غمخوار و رنجمل اشتہار کے مفہوم کو وضاحت کے ساتھ بیان کریں کہ ہمیں کس قسم کے آدمی کی تلاش ہے اس کے بعد جس کا دل چاہے ہماری طرف رجوع کرے جس کا دل

نہ چاہے وہ بے شک کوئی پریس الاٹ کر کے ہمارے مقابلے میں اپنا اخبار نکال لے۔
 امیدوار کے لئے سب سے بڑھ کر ضروری یہ ہے کہ وہ کام چھوڑ نہ ہو، ایک نوجوان کو ہم نے
 شروع میں ترجمے کا کام دیا۔ چار دن کے بعد اس سے ایک نوٹ لکھنے کو کہا تو پھر کہہ بولے کہ میں
 مترجم ہوں سب ایڈیٹر نہیں ہوں۔ ایک دوسرے صاحب کو ترجمے کے لئے کہا تو بولے میں
 سب ایڈیٹر ہوں، مترجم نہیں ہوں ہم سمجھ گئے کہ یہ نا تجربیہ کار لوگ مترجم اور سب ایڈیٹر کو
 الگ الگ دو آدمی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے اخبار میں یہ قاعدہ نہیں، ہم سب سمجھنے لگے کہ آپ
 نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔ دوسرے صاحب کہنے لگے۔ آپ کے اشتہار میں عطف کا استعمال غلط
 ہے۔ ایک تیسرے صاحب نے ہمارے ایمان اور ہمارے صرف و نحو دونوں پر فحش حملے کئے
 اس لئے ہم واضح کئے دیتے ہیں کہ ان لوگوں کی ہم کو ہرگز ضرورت نہیں جو ایک سے دوسرا کام
 کرنے کو اپنی تنگ سمجھتے ہیں اور اس کے لئے صرف و نحو کی آڑ لیتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو ملازم
 ہوں گے انہیں تو وقتاً فوقتاً ساتھ کی دکان سے پان بھی لانے پڑیں گے اور اگر انہیں بحث
 ہی کرنے کی عادت ہے تو ہم ابھی سے کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے نزدیک سب ایڈیٹر کے
 معنی یہ ہیں ایڈیٹر کا اسم مخفف اخبار میں ایک عمدہ دار کا نام جو ایڈیٹر کو پان وغیرہ لا کر دیتا

یہ بھی واضح رہے کہ ہمارا اخبار زنا نہ اخبار نہیں لہذا کوئی خاتون ملازمت کی کوشش نہ
 فرمائیں پچھلے خیال تھا کہ اشتہار میں اس بات کو صاف کر دیا جائے اور لکھ دیا جائے کہ
 مترجم اور سب ایڈیٹر کی ضرورت ہے جو مرد ہوں لیکن پھر خیال آیا کہ لوگ مرد کے معنی شاید
 جو امرد سمجھیں اور اہل قلم کی بجائے طرح طرح کے پہلون نیشنل گارڈوں سے اور مجاہد پٹان ہمارے
 دفتر کا رخ کریں پھر یہ بھی خیال تھا کہ آخر عورتیں کیوں آئیں گی۔ مردوں کی ایسی بھی کیا قلت ہے
 لیکن ایک دن ایک خاتون آہی گئیں۔ پرزے پر نام لکھ کر بھیجا۔ ہمیں معلوم ہوتا کہ عورت ہے تو
 بھگے ہی کیوں؟ لیکن آج کل کم محنت نام سے تو پتہ ہی نہیں چلتا۔ فاطمہ، زبیدہ، عائشہ کچھ ایسا

نام ہوتا تو میں غسل خانے کے رستے باہر نکل جاتا لیکن وہاں تو ناز حجابا نخری یا احمد لیب گلستانی یا کچھ ایسا ہی فینسی نام تھا۔ آج کل لوگ نام بھی تو عجیب عجیب رکھ لیتے ہیں۔ غلام رسول احمدی، مولانا دادا علیہ لوگ تو ناپید ہی ہو گئے ہیں جسے دیکھتے تو غلامی گجری اور سعدی شیرازی بنا پھر تلہ ہے اب تو اس پر بھی شبہ ہونے لگا کہ حرارت عربی، نزلہ کھانسی، ثعلب مصری یا دیوبند ہی کے نام نہ ہوں عورت مرد کی تمیز تو کوئی کیا کرے گا۔ بہر حال ہم نے اندھا بلیا تو دیکھا کہ عورت ہے دیکھا کہ عورت معنی ہیں کمان کا برقعہ دیکھا کہ حسن ظن سے کام لے کر اندازہ لگا یا کہ اس کے اندر صحت ہے ہم نے بعد ادب و احترام کہا کہ ہم خواتین کو ملازم نہیں رکھتے انہوں نے وہ پوچھی ہم نے کہا پچھید گی انہیں لگیں آگے بولتے ہم نے کہا پید ہوتی ہیں۔ بھڑک کر بولیں کہ آپ بھی تو عورت کے پیٹ سے پیدا ہوتے تھے کیونکہ اس امر کا ہماری سوانح عمری میں کہیں ذکر نہیں اس لئے ہم ثابتاً یہ دیکھ کر نہ کر کے میری ولادت کو انہوں نے اپنا تکیہ کلام بنا لیا، بہتر کھلیا کہ جو ہونا تھا وہ ہو گیا اور بہر حال میری ولادت کو آپ کی ملازمت سے کیا تعلق؟ اور یہ تو آپ مجھ سے کہہ رہی ہیں اگر ہمارے پر وپلا سٹر سے کہیں تو وہ آپ کی اور میری ہم دونوں کی ولادت کے متعلق وہ وہ نظریے بیان کریں کہ آپ ہکا بکا رہ جائیں خدا خدا کر کے چھپا چھوٹا۔

ہمارے اخبار میں پر وپلا سٹر کا احترام سب سے مقدم ہے وہ شہر کے ایک معزز ٹیپو ہولڈر ہیں۔ اخبار انہوں نے محض خدمتِ تعلق اور رفاہ عام کے لئے جاری کیا ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ پبلک ان کی شخصیت اور مشاغل سے ہر وقت باخبر رہے چنانچہ ان کے پوتے کا غنہ، ان کے ماموں کا انتقال، ان کے صاحبزادے کی میٹرکولیشن میں حیرت انگیز کامیابی رحیرت انگیز اس معنوں میں کہ پہلے ہی بیٹے میں پاس ہو گئے، ایسے واقعات سے پبلک کو مطلع کرنا ہر سب ایڈیٹر کا فرض ہوگا نیز ہر اس پریس کانفرنس میں جہاں خورد و نوش کا انتظام بھی ہو ہمارے پر وپلا سٹر مع اپنے دو چھوٹے بچوں کے جن میں سے لڑکے کی عمر سات سال اور لڑکی کی پانچ سال ہے شریک ہونے کے اور بچے توڑ میں بھی شامل ہوں گے اور اس پر کسی سب ایڈیٹر کو زبردستی

کئے کی اجازت نہ ہوگی۔ یہ بچے بہت ہی ہونہار ہیں اور حالاتِ حاضرہ میں غیر معمولی دل چسپی لیتے ہیں۔ کشمیر کے متعلق پریس کانفرنس ہوتی تو چھوٹی بچی ہندوستانیوں کی ریشہ دہانیوں کا حال سن کر اتنے زور سے روئی کہ خود سر دالا براہیم اسگو د میں لئے لئے پھرے تو کہیں اس کی طبیعت سنبھلی۔

ہمارے اخبار کا نام "آسمان" ہے پیشانی پر یہ مصرعہ مندرج ہے کہ آسمان بادل کا پہلے فرقہ دیرینہ ہے اس فقرے کو ہٹانے کی کوئی سب ایڈیٹر کو شش نہ فرمائیں کیونکہ یہ خود ہمارے پروپرائیٹر صاحب کا انتخاب ہے ہم نے شروع شروع میں ان سے پوچھا بھی تھا کہ صاحب اس مصرعے کا اخبار سے کیا تعلق ہے کہنے لگے اخبار کا نام آسمان ہے اور اس مصرعے میں بھی آسمان آتا ہے، ہم نے کہا بجا لیکن خاص اس مصرعے میں کیا خوبی ہے کہنے لگے ملامہ اقبال کا مصرعہ ہے اور ملامہ اقبال سے بڑھ کر شاعر اور کون ہے اس پر ہم چیپ ہو گئے۔ پیشانی پر اردو کا سب سے کثیر الاشاعت اخبار بھی لکھا ہے یہ میرا تجویز کیا ہوا ہے اسے بھی یسنے کی کوشش نہ کی جائے کیونکہ عمر بھر کی عادت ہے ہم نے جہاں جہاں ایڈیٹری کی اپنے اخبار کی پیشانی پر ضرور لکھا۔

بعض امیدوار ایسے بھی آتے ہیں کہ آتے کے ساتھ ہی ہمیں سے سوالات پوچھنے لگتے ہیں ایک سوال بار بار دہرتے ہیں کہ آپ کے اخبار کی پالیسی کیا ہے۔ جیسے کوئی پوچھے کہ آپ کی ذات کیا ہے ہماری پالیسی میں چند باتیں تو مستقل طور پر شامل ہیں مثلاً ہم عربوں کے حامی ہیں اور امریکہ سے ہرگز نہیں ڈرتے چنانچہ ایک دن تو ہم نے پریزیڈنٹ ٹرومین کے نام اپنے اخبار میں ایک کھلی تھی بھی شائع کر دی لیکن عام طور پر ہم پالیسی میں محمود کے قائل ہیں اسی لئے سب ایڈیٹر کو مسلسل ہم سے ہدایات یعنی پڑیں گی۔ ہفتہ روزوں میں ہماری پالیسی یہ ہے کہ نیلی گھیسپ کے ہیڈ ماسٹر کو موسم سرما سے پہلے پہل یا ترقی دلوانی جائے یا ان کا تبادلہ لاہور کر لیا جائے اور ان کے لڑکے کی شادی ہمارے پروپرائیٹر کی لڑکی سے طے پا چکی ہے اور خیال ہے کہ موسم سرما میں شادی کر دی جائے

انٹلک کے متعلق ہمارا خاص طرز عمل ہے اور ہر سب ایڈیٹر اور مترجم کو اس کی مشق ہمہ پہنچانی پڑے گی۔ مثلاً پاکستان بنا نہیں معرض وجود میں آیا ہے۔ ہوائی جہاز اڑتا نہیں جو پرواز ہوتا ہے۔ مترجموں کو اس بات کا خاص طور پر خیال رکھنا پڑے گا۔ ایک مترجم نے لکھا کہ کل مال روڈ پر دو موٹروں کی ٹکڑ ہوئی اور تین آدمی مر گئے حالانکہ انہیں کتنا چاہیے تھا۔ کہ دو موٹروں کے تصادم کا حادثہ رونما ہوا جس کے نتیجے کے طور پر چند اشخاص جن کی تعداد تین بتائی جاتی ہے۔ ملک طور پر مجروح ہوئے۔

ہم ہمدردی اور پوریشن نے اعلان کیا کہ فلاں تاریخ سے ہر پلٹو کتے کے گلے میں پتیل کی ایک ٹکڑ لٹکانی ضروری ہے جس پر کمیٹی کا نمبر لکھا ہوگا ایک مترجم نے یہ ترجمہ یوں کیا کہ ہر کتے کے گلے میں بلا ہونا چاہیے حالانکہ کارپوریشن کا مطلب ہرگز نہ تھا کہ ایک جانور کے گلے میں ایک سو سا جانور لٹکا دیا جائے۔

چھٹے فری پاس سب ایڈیٹر کے مشاہرے میں شامل نہیں۔ یہ پاس ایڈیٹر کے نام لیتے ہیں، ہر وہی ان کو سنا مان کرنے کا بھانپتا ہے۔ فی الحال یہ پود پرائٹر اور ان کے ترجمہ کرنے میں ہوتے ہیں لیکن عنقریب اس بارے میں سینما والوں سے ایک نیا سمجھوتہ کرنے والا ہوتا ہے۔ سب ایڈیٹر اپنی تحریر کے زور سے کسی سینما والے سے پاس حاصل کرے تو وہ اس کا اپنا حق ہے لیکن اس بارے میں ایڈیٹر کے ساتھ کوئی مفاہمت کرنے کی جلتے تو بہتر ہوگا، علیٰ ہذا جاسٹیا ریویو کے لئے آتی ہیں مثلاً بالوں کا تیل، عطریات صابن، عطر، دوائیاں وغیرہ وغیرہ ان کے بارے میں بھی ایڈیٹر سے تصدیق کر لینا ہر سب ایڈیٹر کا اخلاقی فرض ہوگا۔

لیکن ہے ان شرائط کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد کوئی شخص بھی ہمارے ہاں ملازمت کرنے کو تیار نہ ہو اس کا امکان مزید موجود ہے لیکن ہمارے لئے یہ چندوں پریشانی کا باعث نہ ہوگا ہمارے پور پرائٹر آگے ہی دوسری مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ سٹاف بہت بڑھ رہا ہے بہت بڑھ رہا ہے

اور اسی وجہ سے انہوں نے ہماری ترقی ترقی بھی روک دی ہے مجھ نہیں کہ سبب ہم دفتر میں اکیلے
 جائیں تو وہ ہمیں ترقی دینے پر آمادہ ہو جائیں وہ اصول اسٹاف بڑھانے کے خلاف ہیں۔
 دانشمندانہ انداز میں کہتے ہیں کہ سٹاف زیادہ ہو تو بات باہر نکل جاتی ہے یہ معلوم کبھی نہیں ہوا
 کہ کیا بابت؟ کونسی بات؟ اپنے ڈپو پر بھی وہ اکیلے ہی کام کرتے ہیں اور اس کی وجہ بھی بتاتے
 ہیں کہ درنہ بات باہر نکل جاتی ہے۔

وارفتگی جذبات

بھائی... تم سے کیا کہوں ہم بیعت روز بروز حساس ہوتی جاتی ہے۔ دل میں ایک بے نام سارنج رہتا ہے جس کو تنہائی اور بھی بڑھا دیتی ہے۔ مختلف اسباب مل کر ایک عجیب بے دلی پیدا کر دیتے ہیں۔ میں فطرتاً ہوس ناک ہوں۔ ناکامیوں نے مجھے دل برداشتہ بنا دیا ہے اس لئے بعض اوقات ایک پیالی کا ٹوٹ جانا زلزلے کی طرح مجھے برہم کر دیتا ہے۔ اسے شاعری نہ سمجھنا۔ یہ حقیقت ہے۔ گھنٹوں مطالعہ میں مشغول رہتا ہوں۔ پھر خیال آتا ہے کہ یہ سب بے فائدہ ہے۔ پہروں سوچتا رہتا ہوں اور کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتا۔ رات کو لیٹ بجا دیتا ہوں کہ اب سو جاؤں اور پھر ملتا دیتا ہوں کہ نیند نہیں آئی۔ آدھی رات کے وقت گھر کے سب لوگ دن بھر کی کلفت اور رازگان کے بعد خواب راحت میں ہوتے ہیں۔ میں اپنے آپ میں اس وقت حیات کی ایک بیداری اور جذبات کی ایک بے قراری پاتا ہوں جو مجھے سونے نہیں دیتی۔

کہیں دُور چند عزیز پٹھان مزدور باب بجا رہے ہیں اور پشتو کے کسی دردناک گیت کی فراق زدہ نوا، سبب کی سادہ موسیقی، رات کی تنہائی اور خاموشی دل کے تاروں میں ایک دھیمے سے درد کا نغمہ پھیر دیتی ہے جس کو گھنٹوں تک بے حس و حرکت پڑا سنتا رہتا ہوں۔ مضطرب روح سرمدی کو ہتالوں کے درشت عشق و حس کی داستان سن کر اور مضطرب ہو جاتی ہے۔ بار بار یہی تصور آتا ہے کہ ایک جنگجو، خونراود تو مندا افغان نے اپنی بندوق کو کندھے سے اتار کر پتھروں پر دیا ہے اور ایک ٹیلے پر بیٹھے ہوئے تصنع سے مبرا فغروں میں

اپنے عشق کی کمائی کہہ رہا ہے۔ خیبر کی آغوشِ کوہ کی پروردہ حیلنہ کے خوب صورت اسٹول بانوؤں کو سوانیت نے ڈھیلا کر دیا ہے اور اس کی معصوم بنگا ہوں میں ایک مجو بیت آگئی ہے۔

یگانگ اس کے جوانی بھرے سینے کو غیرت نے اٹھا دیا ہے اور وہ اپنے چاہنے والے کو بزدلی کے بھوت کے خوف کے طعنے دے رہی ہے۔ رعبِ حن میں تہی ہوئی اسے اجنباب کی بنگا ہوں سے دیکھ رہی ہے۔ پھر غصتہ میں آکر اس نے اپنی گھاس کی گھٹری اور دراتی کو سر پر رکھ لیا ہے اور ندی کے بیچ میں سے گزر کر اس پار چلی گئی ہے۔ رباب کے تاروں میں ایک اضطراب، ایک شکستگی سنائی دیتی ہے۔ غیرت مند افغان نے اپنی بندوق کو اٹھا کر مضبوط گرفت میں پکڑ لیا ہے اور ایک پتھر پر کھرا ارد گرد کی چوٹیوں کو، پتھر پیلے ٹیلوں کو، بے رحم پہاڑیوں کو طیش کی نعروں سے دیکھ رہا ہے اس کی آنکھوں میں خون ہے اور آگ ہے اس نے بندوق میں ایک کار توں بھر لیا ہے اور اس بنجر اور ریتیلے کوستان میں اس کے گیت کی فنجور ٹسریں بولیں میں گوج گوج کر موت کو تلاش کر رہی ہیں ایک جنگ جو کی موت کو، ایک فاتح کی موت کو عشق اس میدان و کوہ میں آقا رہا، سرگرداں پھر رہا ہے۔ اس جستجو میں کہ کہیں ایک بے رحم عورت کی خاطر اپنی جان، مرانگی اور بہادری کے حوالے کر دے خیبر کے بنجر اور ڈراؤنے پہاڑ عبت کی اس وارفتگی کو دیکھ رہے ہیں اور موت کی طرح خاموش اور دہشت انگیز ہیں۔ اس موت کی طرح جو اتنی ظالم ہے کہ نہیں آتی۔ رباب کی ہوسیتی بے دردی بھے دل کے ٹکڑے کر رہی ہے۔

مجھے اس وقت ایک عجیب دور افتادگی، ایک غربت، ایک بے کسی کا احساس ہوتا ہے۔ گویا ایک درمندانہ اور راہ گم کردہ مسافر ہوں۔ نظر کو سوائے افق کی ناشکستہ لکیر کے اور کچھ معلوم نہیں ہوتا اور تکان نے منزل سے باہوس کر دیا ہے گویا میں صحرا کی دہشت اور آسمان کی پہنائی میں ہوں۔ ایک ذرہ ہوں اور ستاروں کی حدود از دنیا تک اپنی آواز پہنچاتا چاہتا ہوں۔ کیونکہ وہی سب سے نزدیک معلوم ہوتے ہیں۔ چاند بھور کے درختوں کے ایک بھنڈ میں سے چمک رہا ہے۔

اور کائنات میں یا چاندنی ہے جو چپ چاپ خاموشی سے برس رہی ہے یا تاریک سلسلے میں جہن
 میں رات نے اپنے پر اسرار اقتدار کی ہیبت کو بھپار رکھا ہے۔ فضا میں اس درد کے گیت نے ایک
 بے حد بے قراری پیدا کر دی ہے۔ میرے دل میں اس وقت ڈنڈ نہیں ہوتا۔ خوف نہیں ہوتا فقط ایک
 اضطراب ہوتا ہے ایک ناقابلِ بیان بے قرارگاہوتی ہے۔ اپنے آپ کو بستر پر سکون کی حالت میں مرد
 کی طرح دیکھ کر دل غصے میں بیچ و تاب کھاتا ہے کہ میں بے بس کیوں ہوں۔ بس یہ بے بسی کا احساس
 جذبات میں ایک ظلم پیدا کر دیتا ہے اور تنہائی ایک عشرستان، بیداری ایک ہنگامہ بن جاتی ہے۔
 رفتہ رفتہ رباب کی موسیقی بھی ہو جاتی ہے اور گیت کی سنے آہستہ آہستہ چاندنی میں تحلیل
 ہو کر خاموش ہو جاتی ہے۔ رات کا طلسم جذبات کی سردی پر سکون کی چادر ڈال دیتا ہے۔
 آنسو پلکوں پر سوکھ جاتے ہیں اور آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ قدرت کے دل میں رحم آ جلتے تو ہوا
 کے جھونکے تھپک تھپک کر سلا دیتے ہیں نیندا ہی جاتی ہے۔ مگر آہ! کس بیداری کے بعد!

(مخزن جولائی ۱۹۲۱ء)

ایک رات

رات کے بارہ بجنے والے ہیں۔ آدھ گھنٹہ ہوا میں مطالعو سے فارغ ہو چکا ہوں۔ اردگرد تمام کوٹھی میں مکمل خاموشی اور سکون ہے۔ کھلے ہوئے دروازے میں سے باہر کا تاریک منظر دکھائی دے رہا ہے۔ جس پر اس قدر سکوت طاری ہے کہ کبھی کبھی ہوا کا ایک جھونکا میرے چہرے پر دفعۃً ایک کم بھاسی خشکی پیدا کر دیتا ہے۔ تو میں کانپ اٹھتا ہوں۔ کہیں دو ایک کتا جھونک رہا ہے جس کی آواز محیط خاموشی میں ایک دھیمی سی ہیبت ہو کر مل گئی ہے۔ جب یہ آواز ایک لمحے کے لئے میرے کان تک نہ پہنچے تو اس چپ چاپ میں وحشت کی سی سرسراہٹ سنائی دینے لگتی ہے اور میرا دل ایک لمحے کے لئے زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ سکوت کی بے زبان اور ڈروانی آوازوں سے اپنے دل کو ہٹاتا ہوں تو لپ کی خاموش روشنی اور گھڑی کی ٹھٹھ کی اور بھی گھبرا دیتی ہے۔ بیز پردہ رکھی ہوئی تصویروں کا سکون اعلان کی بے حس و حرکت روجوں کو دکھ کر کسی جہنم کا بھیانک منظر تصور میں آکر ڈھاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کمرے کی تمام چیزیں اس وقت سجدہ ہی میں اور میں اس وقت سگریٹ پینا چاہتا ہوں لیکن میں اس آواز سے خوف کھاتا ہوں جو دیا سلائی جلاتے وقت اس سنان بھکے نیچے نغمہ کو اپنی درشتی سے پریشان کر دے گی۔ مجھے اس بل کھاتی ہوئی دھوئیں کی باریک دھار سے ڈگدگتا ہے جو ٹپکتے ہوئے سگریٹ سے ایک نازک اور پُراسرار ناگن کی طرح نکل کر میرے سامنے کہیں تاریکی میں غائب ہو جائے گی۔ میں صفا زسے میں سے چمن کی کالی کالی بھاڑیوں کو کچھ دیر دیکھتا رہتا ہوں۔ تو مجھے یہ احساس

ہونے لگتا ہے کہ باہر کی تاریکی ایک ہیپ خاموشی کے ساتھ آہستہ آہستہ کمرے میں داخل ہو رہی ہے اور میرے لمپ کی روشنی مدہم ہوتی جا رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آہستہ سے اٹھ کر دبے پاؤں دروازے تک جا کر اسے ہلکے سے بند کر دوں۔ لیکن میں ڈراؤنی کالی بات سے ڈرتا ہوں۔ میں ڈرتا ہوں کہیں میرے حواس اس کی ہوشربائی کے بے حد طلسم سے مسحور ہو کر رات کی تاریکی کے ساتھ نہ مل جائیں اور میں اس سکوت کے سمندر میں آہستہ سے ڈوب کر غائب نہ ہو جاؤں۔ مجھے صرف لمبے لمبے بکھرے ہوئے گئے سیاہ لہروں والے بال دکھائی دے رہے ہیں۔ اس حسین کے جس نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا ہو۔ ان کی ڈراؤنی سیاہی میری آنکھوں میں چھا رہی ہے۔ حسن میری آنکھوں سے اوجھل ہے اور خیال میں ایک کاہنتی ہوئی امید کی طرح ڈڈر کر بھجک رہا ہے۔ ہوا کے کمزور سے جھونکے میرے بدن میں خون کی سی ٹھنڈک پیدا کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھی میرے منہ کے لمبے بال گر کر میری آنکھوں کے سامنے آ جلتے ہیں تو مجھ پر ایک تھر تھرانے والا ڈر طاری ہو جاتا ہے آنکھیں ان کو دیکھ کر ہیبت زدہ ہو جاتی ہیں اور ہاتھ ان کو ہٹاتے ہوئے کانپتا ہے۔ فرش پر میرا سیاہ کبیل اس سکون سے پڑا ہے گویا رات نے اس پر اپنی لمبی لمبی انگلیاں پھیر کر ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ ہلکے سے اپنی خاموشی کا دھما سا طلسم پھونک دیا ہے میں اس کو ہاتھ لگاتے ہوئے سم جاتا ہوں گویا پڑا سر اچھ چپ چپ دنیا کا کوئی بھیانک سا منظر ایک لحنت مجھے اپنی وحشت دکھائے گا اور میں ہیبت ناک چیخ مارنے کی کوشش کروں گا۔ جو میرے منہ سے نہ نکلے گی۔ میرا لگا ان تصورات سے خشک ہو رہا ہے۔ میں اپنے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوں۔ لیکن وہ خشک ہو جاتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میں کسی چیز کو نہ دیکھوں اور رات کی خاموشی اور میرے سکون میں کوئی اضطراب پیدا ہو جائے لیکن میں اپنے آپ کو کسی جادو میں جکڑے ہوئے پاتا ہوں۔ جو میری آنکھوں کو زور سے کھولے ہوئے ہے۔ جو میرے سینے کو دبا رہا ہے اور جو مجھے سانس نہیں لینے دیتا۔ گھڑی کی سوئیاں جن میں نے کوئی حرکت نہیں دیکھی

اب کسی اور جگہ میں رات کے ساتھ ساتھ وہ بھی چپ چاپ آہستہ آہستہ سانپ کی طرح آگے چلتی رہی ہیں۔ کیا کرے کی دیواریں بھی اسی طرح قریب ہوتی جا رہی ہیں۔ کیا کائنات چاروں طرف سے آہستہ آہستہ آگے کو بڑھ کر ٹھے بیچنے کے لئے میری طرف آرہی ہے اور کیا خاموشی اور تاریکی کے جادو نے مجھے اس تنہا بھیانک موت کے لئے یہاں باندھ رکھا ہے۔

باہر سڑک پر ایک ٹانگہ گزر رہا ہے۔ یہ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز ہے۔ یہ پیوں کی۔ دو آدمی آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ شاید تھیٹر سے واپس آئے ہوں گے۔ آج تھیٹر میں خدا جانے کونسا کھیل تھا۔ سگریٹ میں نے کہاں رکھے ہیں؟ دیا سلائی کی ڈبیا تو اس جیب میں ہے۔ میں اب سگریٹ پی رہا ہوں۔ اور رات اب میرے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھی۔ ملے اس کے کہ میں اب سو جاؤں اور صبح پھر اٹھوں۔

(نیرنگ خیال)

دوست کے نام

از لاہور

اے میرے کراچی کے دوست!

چند دن ہوئے میں نے اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ کراچی میں فنونِ لطیفہ کی ایک انجمن قائم ہوئی ہے جو وقتاً فوقتاً تصویروں کی نمائشوں کا اہتمام کرے گی۔ واضح طور پر معلوم نہ ہو سکا کہ اس کے کمرتا دھر تا کون اہل جنون ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ کو ایسی باتوں کا بے انتہا شوق ہے اور مدت سے ہے اور آپ ادب اور آرٹ کا ذوق صحیح رکھتے ہیں۔ اس لئے مجھے یقین ہے کہ آپ اس میں ضرور شریک ہوں گے بلکہ عجیب نہیں کہ یہ انجمن آپ ہی کی مساعی کا نتیجہ ہو اور آپ ہی نے اپنی جاذبیت سے ایسے خوش مذاق لوگوں کو ایک نقطے پر جمع کر لیا ہو جنہیں شوق تو ہے لیکن آپ کا سگت نہیں۔ یہ سوچ کر بہت اطمینان ہوا کیونکہ اپنے ہم خیالوں کی ایک انجمن بنا کر آپ کو ضرور ایک گونہ تقویتِ قلب نصیب ہوگی۔ ورنہ تنہا کتابوں اور تصویروں سے ملازمت کی باتیں کرتے کرتے انسان نھک جاتا ہے۔ ذوقِ سلیم کی تازگی پر تنہائی کی وحشت اور تلخی غالب آنے لگتی ہے انسان دیوانہ نہیں تو عقلِ دماغ ضرور ہو جاتا ہے اور غالب کا ایک مصرعہ قافیہ بدل کر پڑھنے کو جی چاہتا ہے کہ "مقدور ہو تو ساتھ رکھوں ملازماں کو میں،"

لیکن اے دوست! کیا اس کام میں کسی نے آپ کی مزاحمت نہیں کی؟ کیا کسی معافی

اخبار کے جل کر نہیں مکھا کہ پاکستان پر ابتلا کا زما آ یا ہوا ہے اور آپ جیسے خوش فکروں کو منصوبی اور نقاشی کا شوق چرایا ہے؟ کسی نے جلتے ہوئے شہر دہا اور نیرو کی سارنگی کا فقرہ نہیں کسا؟ کسی "سنوں چشم بزد ہیں آپ دیں کے منے مسجد میں واعظ کرتے ہوئے آپ کے لہو و لعب اور تفریح کوشی پر نفرین نہیں کہی؟ اور آپ پر کفر اور شرک اور الحاد کا فتوے لگا کر لوگوں کو آپ کے خلاف نہیں اکسایا؟ اور کچھ نہیں تو کیا کسی گھاگس مصلحت بین افسر نے بمباردی اور تندیب کے رکھ رکھاؤ کے ساتھ آپ کو یہ ستورہ نہیں دیا کہ بر خور دار

بیانگ چنگ مخورے کہ محتب تیز است؟

اور بالفرض ان باتوں سے بچ نکلے تو کیا مینیا فت کے موقع پر کسی نیم تعلیم یافتہ بمعصر نے جو سخواہ میں آپ سے برتری کا دعویٰ دیا ہے آپ کی آنا دفنی کا مضحکہ نہیں اڑایا؟ اور جب آپ پٹے ہوئے نظر لائے تو آپ پر قہقہے بلند نہیں ہوتے؟

اگر آپ کو ایسی منزلیں پیش آئیں تو کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی جگہ ہوگی یا پھر ہیزی اور بدلی پک رہی ہوگی اور آپ کو ابھی دکھائی یا سنائی نہ دی ہوگی ورنہ جس حُسن مذاق پر آپ کو غرق ہے وہ تو آج کل ایک ہاجر یتیم کی طرف بھوکا اور ننگا کسی کھنڈر کے کونے میں سر بڑاؤ دینا بیٹھا ہے اور باہر پر اپڑ مینہ برس رہا ہے اور آندھیاں چل رہی ہیں۔ پچھلے سال قائد اعظم یہاں تشریف لائے۔ اور وہ باغ جس کو لارنس گارڈن کہا کرتے تھے اس میں جو قطعہ "روزگار ملن" کہلاتا تھا وہاں ایک عظیم الشان پارٹی ہوئی۔ اس دن جو پاکستانی ہور کا پہلا جشن کا دن تھا "روزگار ڈن" کا نام "گلستانِ فاطمہ" رکھا گیا اور یہ نام ایک بورڈ پر لکھ کر باغ میں جو پھوٹی سرخ اینٹوں کی خوب صورت محراب اسادہ ہے اس کی پیشانی پر نصب کیا گیا لیکن اس کی کتابت ایسی کمرہ بہ اور غفلانہ تھی۔ کہ مدبرہ کے لڑکوں کو بھی کسی الپکٹر کی تشریف آوری پر ایسا قطعہ لکھتے ہوئے شرم آتی: "گلستانِ فاطمہ" کی بے ذوق ترکیب سے قطع نظر کیجئے اور اس کے مصنوعی پن کو جانے دیجئے۔ جس کی بدولت

نہ وہ فریب ہی اس نام سے مانوس ہوں گے جو دوپہر کے وقت درختوں کے سلیسے میں اپنا گڑا لود جوتا سر کے نیچے رکھ کر اس باغ میں سو جاتے ہیں۔ نہ پتلون پوشہ ہی اس میں کوئی کشش پائیں گے۔ جو شام کے وقت موٹروں میں سوار ہو کر یہاں ٹینس کھیلنے آتے ہیں لیکن جب ان جلوے کی پیاسی گنگار آنکھوں نے اسے یوں ایک نمایاں جگہ پر منقوش دیکھا تو نظر اور دل دونوں مجروح ہوئے۔ کیونکہ ایسے شان دار موقع کھلے اس سے بد صورت کتابت کی نمائش ذہن میں نہ آسکتی تھی۔ مسلمانوں کی قوم، وہ قوم جو کئی پشتوں سے فن خوشنویسی کی علمبردار ہے جس نے قرآن پاک کے ہزاروں نسخے اس صناعتی اور ہنرمندی سے لکھے کہ کاتبِ قدرت نے بھی ان کو آفرین کہا ہوگا۔ پنجاب کا خطہ، وہ خطہ جسے نستعلیق کی ایک جدید اور جمیل طرز کے موجد ہونے کا فخر حاصل ہے لاہور کا شہر، وہ شہر جہاں ہر گلی میں ایک خوشنویس رہتا ہے اور جہاں حکیم فقیر محمد مرحوم جیسے استاد فن پیدا ہوئے۔ جن کے سامنے ہندوستان بھر کے جادو رقم زانوئے قلند نہ کرتے تھے اور اس پر یہ حال کہ اس تقریبِ سعید پر اس شہر میں، مسلم قوم کی طرف سے عقیدت اور محبت کے صرف دو لفظ لکھنے پڑیں اور ان کے بھی دائرے غلط ہوں اور نشست بے ڈھنگی ہو۔ آپ دیکھتے تو یقیناً آپ کو اس کی تہ میں بد مذاقی کا عروج نظر آتا اور آپ پڑ مردہ ہو جاتے اور ڈھونڈتے پھرتے کہ کس کے پاس جا کر شکایت کروں اور لوگ آپ کو دیوانہ سمجھتے اور بعض ایسے بھی ہوتے کہ ایسی مزہ گیری پر آپ کو بد تمیز کہتے یا آپ سے توقع رکھتے کہ آپ ہر قباحت کو حسن سمجھیں یا حسن کہیں۔ ورنہ آپ پر پاکستان میں کیڑے ڈالنے کا الزام لگتا اور آپ کی وفا شعاری پر حرف آتا۔

اب آپ اس الجھن کے چکر میں اپنے آپ کو کسی منبر پر پائیں اور آپ کے سامنے آپ کے ہم قوم جمع ہوں اور وہ آپ کو زبان کھولنے کی اجازت دیں تو آپ جو سینے میں درد مند دل رکھتے ہیں یہ کہنے سے کیونکر باز آئیں گے کہ اسے مسلمانو! تمہارے آبا و اجداد خطا دار تھے اور خم اور زاویے کا وہ فوق رکھتے تھے کہ دنیا میں اس کی مثال شکل سے ملتی ہے۔ کوئی اور

مغرب، نستعلیق اور نسخ، کس کس نسخ سے انہوں نے ابجد سے عشق کیا ہے۔ ان کے ایوانوں
 ہیں آویزاں وصلیوں کو دکھو، ان کے مطلقاً اور مذہب نسخوں کو دکھو، ان کے روضوں اور محفلوں
 ان کی مسجدوں اور خانقاہوں ان کے فرامین باوجود سکوت اور مہروں، ان کی قبروں اور ان کے کتبوں
 کو دکھو۔ مرگدرازیت کا کوئی مقام، سلطوت یا افلاس، مسرت یا ماتم، جشن یا یکسوئی، خلوت یا
 جلوت کا کوئی مقام ایسا ہے جہاں انہوں نے قلم اٹھایا ہو اور ان کے قلم نے حسین و جمیل حروف
 کے لافانی نقوش چوب و قرطاس و سنگ پر ثبت نہ کر دیئے ہوں۔ اب جب کہ خدا نے
 تمہیں اپنے پلجر کے احیا اور تحفظ کے لئے سب قوتیں تمہارے ہاتھ میں دے دی ہیں۔ تمہیں
 کمال کو اس ورتہ کو ہاتھ سے جانے نہ دو گے اور عمدہ کر لو کہ آج سے تمہاری دکالوں، تمہارے
 مکانوں، تمہارے دفینوں، تمہاری کتابوں اور اخباروں اور رسالوں، تمہاری مسجدوں اور ہمسار
 مزاروں، تمہارے سرناموں اور تمہارے نوٹس بورڈوں پر جہاں جہاں تمہارے ہاتھ ابجد کے
 خط کیمنہیں گئے اسلاف کا نام روشن کر دیں گے اور جو نواکتیں اور لطافتیں اور رعنائیاں انہوں
 نے صدیوں میں پیدا کی ہیں انہیں مسخ نہ ہونے دیں گے تاکہ جہاں کسی کو تمہاری تحریر نظر آئے
 وہ جان لے کہ یہ مسلمان کا لکھا ہوا ہے اس قوم کا لکھا ہوا ہے جس نے دنیا میں خوش خلقی کا مرتبہ
 بلند کیا اور جواب بھی اپنی حسن آفرینی پر ناز کرتی ہے

یہ کہنے سے آپ کیونکر بانٹیں گے؟ لیکن کیا آپ کی بات کوئی سنے گا؟ کیا کراچی میں
 ایسے لوگ؟ فنون لطیفہ کی انجمن تو آپ نے بنالی ہے۔

اور پھر خوش نویسی تک تو عافیت رہے گی لیکن کیا آگے بھی بڑھے گا؟ تصویروں کا ذکر بھی
 کیجئے گا؟ اخبار میں لکھا تھا کہ آپ تصویروں کی نمائش کا اہتمام کر رہے ہیں۔ یہ سچ ہے تو اسے
 دوست وقتاً فوقتاً مجھے اپنی خیریت سے مطلع کرتے رہئے گا۔ کیونکہ اگر کراچی سب سے
 اہم نخلک کوئی جگہ نہیں تو آپ کو بے انتہا جسارت سے کام لینا پڑے گا اور عجیب نہیں کہ
 لوگ آپ کا حال دیکھ کر عبرت پکڑا کریں۔

ہمارے ملک میں اس وقت کوئی بھی ادارہ ایسا نہیں ہے آپ صحیح معنوں میں آرٹ سکول کہہ سکیں۔ لاہور یونیورسٹی کے نصاب میں آرٹ بحیثیت ایک مضمون کے شامل تھا۔ لیکن یہ ایک مخلوط سا شغل تھا جس میں تھوڑی سی موسیقی، تھوڑی سی مصوری اور کچھ صنعت اور دستکاری سب چھکی چھکی بھر پھینک دی گئی تھیں اور اس بجون کو ایک زنانہ مشغلہ سمجھ کر صرف لڑکیوں کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ یہ مضمون اب بھی نصاب میں موجود ہے۔ لیکن کب تک؟ فی الحال تو ایک یورپین خاتون تیسریں جو یہ مضمون پڑھاتی ہیں وہ کہیں ادھر ادھر ہو گئیں اور کوئی عورت ان کی جگہ دستیاب نہ ہوئی تو یہ قصہ بھی پاک ہو جائے گا۔ کیونکہ لڑکیوں کو پڑھانے کا کام خدا نخواستہ کسی مرد کے سپرد ہوا تو زلزلے نہ آجائیں گے؟ اور پھر اس مضمون کا علیحدہ بھی سرعت کے ساتھ بدل رہا ہے۔ موسیقی تو تہ کر کے رکھ دی گئی ہے کیونکہ کس کی مجال کہ اس کی بیٹی اس کے دستخط سے یہ لکھوا بھیجے کہ میں گانے کا شوق ہے؟ باقی رہی تصویر کشی تو ایک ملنے والے اگلے دن سنا گئے کہ ایک کالج نے کہلوا بھیجا ہے کہ ہماری لڑکیاں جانداروں کی ٹسکیں نہ بنائیں گی۔ چنانچہ تجویز ہو رہی ہے کہ تصویر کشی کی مشق صرف میب، ناشپاتی، مرتبان یا پہاڑ دریا، جنگل پر کی جائے۔ اس پر ایک آدھ جگہ بحث ہوئی۔ شریعت کا قدم میدان میں آیا۔ ایک روشن خیال مولوی صاحب نے صرف اتنی ڈھیل دی کہ ہاتھ کی بنی ہوئی تصویر میں تو ہرگز جائز نہیں فوٹو البتہ جائز ہے و جب یہ بتائی کہ فوٹو میں انسان کی شبیہ ہو ہو ویسی ہی ہوتی ہے۔ ہاتھ سے تصویر بنائی جاتے تو اس میں بھوٹ ضرور سراپت کر جاتا ہے کسی نے کہا فوٹو بھی تو کئی حرفتوں سے لی جاتی ہے اور بعض فوٹو گرافر بھی تو بڑے فن کار ہوتے ہیں جو اب ملا کہ چابکدستی اور تکلف تنہ کام لیا جاتے تو فوٹو بھی جائز نہیں رہتا۔ غرضیکہ ان کے نزدیک اسی ایک فوٹو گرافر کا کام حق و راستی کا آئینہ دار ہے جو ہار کے چڑیا گھر کے باہر چار آنے میں تصویر کھینچتا ہے یہ حال تو جان دار اشیاء کا ہے باقی رہے جنگل، پہاڑ، دریا تو وہاں بھی ایک نہ ایک دن کوئی کو تو ال حق بین مضمون کے ”بھوٹ“ کو گروں سے

باد بوچھے گا۔ اور آپ چہیتے اور سکتے رہ جائیں گے کہ یہ تو دین گوگ ہے! یہ تو بہت بڑا آرٹسٹ ہے! اور آپ کے ہاتھوں سے تصویر نوچ کر پھاڑ دی جائے گی۔

ان حالات میں چغتائی کے جیسے کامکان بہت کم ہے کوئی بات پر سچ، بھی ہوتی ہے اس کی تصویروں میں؟ درخت تک تو مجنوں کی انگلیاں معلوم ہوتے ہیں اور پھر انسانوں کی تصویریں بنانے سے بھی تو وہ نہیں چوکتا اور صرف مرد ہی نہیں بلکہ عورتیں بھی۔ عزال چشم، سینہ چاک اور بعض اوقات عرم کے بند تک دکھائی دے جاتے ہیں۔ گویا تین سے کچھ کہنا مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ چغتائی کی تصویروں میں تسمے، ڈوریاں، پھندنے بہت ہوتے ہیں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ تسمہ یا ڈوری جیسے لباس کا حصہ ہے یا ناقہ کے ساز و سامان کا۔ لیکن چغتائی کی وجہ سے ایک سہولت ضرور نظر آتی ہے وہ یہ کہ لے دے کے یہی ایک ہمارا مصوّر ہے۔ اسے دفن کر دیا تو یہ ویا فوراً تم جائے گی اور ہماری مصوری ایک ہی عزم سے ہمیشہ کے لئے پاک ہو جائے گی۔ باقی رہی مغلوں کے قدیم نمونے جو چند لوگوں کے پاس بطور تبرک محفوظ ہیں یا جن کی اندیا آفس کے عجائب خانے کی تقسیم کے بعد پاکستان کو مل جانے کی امید ہے تو ان کو کسی اور ملک کے ہاتھ بیچ کر دام وصول کئے جاسکتے ہیں۔ کیا کراچی میں لوگوں کا یہ خیال نہیں؟ اگر نہیں تو کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی جگہ ہوگی۔

لیکن یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ کراچی کو نسا ایسا جزیرہ ہے اور کون سے گم شدہ براعظم میں واقع ہے کہ اردگرد کے سمندر کی کوئی لہر وہاں تک نہ پہنچ سکے گی؟ آپ کو تعمیر اور تخلیق کی سوجھ رہی ہے۔ لیکن یہاں تو تخریب کا درد دورہ ہے۔ ہاتھوں سے لٹھ چھین کھاس کی جگہ قلم اور مو قلم آپ کیونکر رکھ دیں گے؟ آپ کوئی سا ہیجان پیدا کیجئے۔ آپ کے دیکھتے دیکھتے وہ تخریب کی راہ اختیار کر لیتا ہے۔ لوگ جس پھیر کا نعرہ لگا کر اٹھتے ہیں۔ سب سے پہلے اسی چیز کا خون کر لیتے ہیں۔ آپ کہئے کہ رمضان کا احترام واجب ہے تو لوگ ٹولیاں بنا بنا کر بازاروں میں ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ کس کا منہ کالا کریں۔ آپ اسلام کی دعوت دیجئے تو

تلاشی شروع ہو جاتی ہے کہ کس کے دے لگا میں؟ کسے سنگسار کریں؟ آپ جیہا کی تلقین کیجئے تو لوگ مریزا ر عورتوں کے منہ پر تھوکنے لگتے ہیں اور بچوں پر اپنا ہیمانہ زور لگاتے ہیں۔

مجھ کو تو سکھادی ہے افرنگ نے زندہ یعنی

اس دور کے ملا ہیں کیوں تنگِ مسلمانی؟

ایسے غیظ و غضب کی فضا میں بھی آج تک کہیں آرٹ پینا ہے، آرٹ کے لئے تو ضبط اور نسق اور استحکام اور اخلاق اور فراغ لازم ہیں یا پھر کوئی ولولہ کوئی امنگ کوئی عشق جو دلوں کے دروازے کھول دے اور ان میں سے شعر و سخن، نغمہ و رنگ کے طوفان اچھل اچھل کر باہر نکل پڑیں۔ کیا کبھی آرٹ ایسے میں بھی پینتا ہے؟ کہ ہر ٹپے کو دولت اور اقتدار کی ہوس نے اندھا اور بہرہ کر رکھا ہو اور ہر چھوٹا اپنی بے بضاعتی نہ بدلہ ہر ہمسائے اور راگبر سے لینے پر تلا ہوا ہو، نہ کوئی ادبی نظام ایسا ہو کہ ہر چیز کی پوری قیمت اور ہر قیمت کی پوری چیز نصیب ہو اور لوگ فاقے کے ڈر سے نجات پا کر قناعت کی گود میں ذرا آنکھ چھپک لیں نہ کوئی اخلاقی نظام ایسا ہو کہ لوگوں کو اس دنیا یا اس دنیا میں کہیں بھی جزا و سزا کی امید یا خوف ہونہ مسرت کا کوئی ایسا جھونکا آئے کہ درختوں کی ٹہنیاں مست ہو کر بھوم میں اور پتوں کی سرسراہٹ سے آپ ہی آپ نغمے پیدا ہوں۔ نہ مافیت کا کوئی گومتہ ایسا ہو جہاں آپ کا فنکار معترف ہو کر بیٹھ جائے۔ اور آپ کے لئے تصویریں بناتا رہے، نہ آس پاس کوئی ایسی نرالی بستی ہو جہاں شاعر عزیز شہر بن کر گھومتا پھرے اور لوگ اسے دیوانہ اجنبی سمجھ کر اسے بک لینے دیں۔ فنونِ لطیفہ کی انجمن تو آپ نے بنالی ہے لیکن ڈرتا ہوں کہ کہیں پہلا کام اس انجمن کا یہ نہ ہو۔ کہ چند تصویروں کو مغربِ اخلاق اور عریاں کہہ کر جلادیا جائے۔ چند مصوروں پر اوباشی اور بے دینی کی تہمت لگا کر انہیں ذلیل کیا جائے۔ یا پھر ان پر ایسے لوگ مستط کر دیئے جائیں جو ان کے ہنر کو کھڑی کسوٹیوں پر پرکھیں اور ان پر واضح کر دیں کہ جس برتری کا انہیں دعوے تھا اس کا دراب

ہیں اہلِ غر و کسِ روشِ خاص پہ نازاں
پابستگی، رسمِ ورہِ عام بہت ہے

میں جانتا ہوں کہ آپ آرٹ کو عشرت نہیں سمجھتے اسے محض امارت کا دل بہلا دیا نہیں
سمجھتے آپ ایسے نہیں کہ آپ کو جاندار ہی کی تصویر پر اصرار ہو یا محض تصویر ہی پر اصرار ہو۔ حسن کو
اختیار ہے جہاں پہلے رہے جو شکل چاہے اختیار کرے صرف یہ ہے کہ زندہ رہے اور
امیر غریب، پھولے بڑے، ادنیٰ اعلیٰ سب پر اپنی بخششیں ارزانی فرماتے۔ ایک نماز تھا
کہ آرٹ اور صفت و معرفت کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ تھا۔ آپ تو اس عہدِ زہد میں کو واپس
لانا چاہتے ہوں گے۔ تاکہ آرٹ کا جلوہ بچوں کے کھلونوں میں، کسان کے تہمد میں۔ سیلانی کے
ہاتھ کی پھڑی میں، پنہاری کے مٹی کے گھڑوں میں، غرض زندگی کے ہر گوشے میں نورِ پاش ہو
لیکن جو نخی نخی شمعیں یہاں وہاں ٹٹمار ہی ہیں، انہیں ہی بجھا دیا گیا تو لاکھوں انسانوں کی
زندگیاں جو ابھی تک تاریک پڑی ہیں وہ کیسے جگمگائیں گی؟ کیا کراچی میں جو آپ کے ہم جلس
ہیں انہیں اس بات کا احساس ہے؟ اگر ہے تو انہیں بتا دیجئے کہ آرٹ کی ایک مسکراہٹ کے
لئے انہیں اس بیگانہ تبسم ماحول میں کئی صحرا چھانسنے پڑیں گے۔

فرخنیست کہ در پہلوئے آل مدغم نیست

روز و لود جہاں کم زشب ماتم نیست

اگر یہ محض میرا وہم ہے تو اسے دوست پھر کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی
جگہ ہوگی تو پھر اسے دوست ہم سب کو وہاں بلا لیجئے یا کراچی کو اتنا وسیع کیجئے کہ ہم سب
اس میں سما جائیں۔

کراچی میں آپ نے بہت کچھ رسوخ فرمید کر لیا ہو گا۔ آپ کے افلاص اور اصابت
راستے کے سب لوگ قائل ہوں گے۔ بڑے بڑے افسروں سے آپ کی ملاقات ہوگی۔

بڑے بڑے اربابِ عمل و عقد کا قرب نصیب ہوگا۔ ان سے کہتے کہ
 منزلِ راہرواں وعد بھی دشوار بھی ہے
 کوئی اس قافلہ میں قافلہ سلاہ بھی ہے

(نقوشِ جشنِ آزادی نمبر ۱۹۳۸ء)

بچے

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ بچوں کی کئی قسمیں ہیں مثلاً بلی کے بچے، فاحشہ کے بچے وغیرہ مگر
 بیسری مراد صرف انسان کے بچوں سے ہے۔ جن کی ظاہر تو کئی قسمیں ہیں۔ کوئی پیارا بچہ ہے
 اور کوئی ننھا بچہ ہے، کوئی پھول سا بچہ ہے اور کوئی چاند سا بچہ ہے لیکن یہ سب اس وقت
 تک کی باتیں ہیں۔ جب تک بر خور دار ٹنگوڑ سے میں سویا پڑا ہے۔ جہاں بیدار ہونے پر بچے
 کے پانچوں حواس کام کرنے لگے، بچے نے ان سب خطبات سے بے نیاز ہو کر ایک الارم کلاک
 کی شکل اختیار کر لی۔

یہ جو میں نے اوپر لکھا ہے کہ بیدار ہونے پر بچے کے پانچوں حواس کام کرنے لگ جاتے
 ہیں۔ یہ میں نے حکما کے تجربات کی بنا پر لکھا ہے ورنہ عا شا و کلا میں اس بات کا قائل نہیں۔
 کہتے ہیں بچہ سنتا بھی ہے اور دیکھتا بھی ہے لیکن مجھے آج تک سوائے اس کی قوت ناطقہ
 کے اور کسی قوت کا ثبوت نہیں ملا۔ کئی دفعہ ایسا اتفاق ہوا ہے کہ روتا ہوا بچہ میرے حوالے
 کر دیا گیا ہے کہ ذرا سے چپ کرانا، میں نے جناب اس بچے کے سامنے گانے گائے ہیں
 شعر پڑھے ہیں۔ ناچ ناچے ہیں، تالیاں بجاتی ہیں، گھٹنوں کے بل پر کمر گھوڑے کی
 نقلیں اتاری ہیں، بھیڑ بکری کی سی آوازیں نکالی ہیں، سر کے بل کھڑے ہو کر ہوا میں بانسیکل
 چلانے کے نمونے پیش کئے ہیں۔ لیکن کیا مجال جو اس بچے کی کیسوی میں خدا بھی فرق آیا ہو یا جس
 سُر پر اس مخلوق کیا تھا اس سے ذرا بھی نیچے اترا ہو اور خدا جلنے ایسا بچہ دیکھتا ہے۔

رہنا ہے تو کس وقت؟

بچے کی زندگی کا شاید ہی کوئی لمحہ ایسا گزرتا ہو جب اس کے لئے کسی نہ کسی قسم کا شور مرفردی نہ ہو۔ اکثر اوقات تو وہ خود ہی سامعہ نوازی کرتے رہتے ہیں۔ ورنہ یہ فرض ان کے لواحقین پر عائد ہوتا ہے۔ ان کو سلانا ہو تو لوری قبکھنے۔ مہنسا نا ہو تو نمل سے فقر سے بے معنی سے بے معنی منہ بنا کر بند سے بند آواز میں ان کے سامنے دہراہیے اور کچھ نہ ہو تو شغل بے کاری کے طو پر ان کے ہاتھ میں ایک بھنڈا دے دیتے۔ یہ بھنڈا بھی کم نخت کسی بے کار کی ایسی ایجاد ہے کہ کیا عرض کروں یعنی خدا سا آپ ہلا دیتے لڑھکا چلا جاتا ہے اور جب تک دم میں دم ہے اس میں سے ایک ایسی بے ٹری، کرخت آواز متواتر نکلتی رہتی ہے کہ دنیا میں شاید اس کی مثال محال ہے اور جو آپ نے مہنسا نا، باتپا، کے جوش میں اگر بر خور دار کو ایک عدد وہ ربرٹ کی گڑیا منگوا دی جس میں ایک بہت ہی تیز آواز کی سیٹی لگی ہوتی ہے تو بس پھر خدا حافظ۔ اس سے بڑھ کر میری صحت کے لئے مضر چیز دنیا میں اور کوئی نہیں سوائے شاید اس ربرٹ کے نیلے کے جس کے منہ پر ایک سیٹی دار نالی لگی ہوتی ہے اور جس میں منہ سے ہوا بھری جاتی ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو والدین کہلاتے ہیں، بد قسمت ہیں تو وہ بے چارے جو قدرت کی طرف سے اس ڈیوٹی پر مقرر ہوئے ہیں کہ جب کسی عزیز یا دوست کے بچے کو دیکھیں تو ایسے موقع پر ان کے ذاتی جذبات کچھ ہی کیوں نہ ہوں وہ یہ ضرور کہیں کہ کیا پیارا بچہ ہے۔

میرے ساتھ کے گھر ایک مرزا صاحب رہتے ہیں۔ خدا کے فضل سے چھ بچوں کے والد ہیں۔ بڑے بچے کی عمر نو سال ہے۔ بہت شریف آدمی ہیں۔ ان کے بچے بھی بے چارے بہت ہی بے زبان ہیں۔ جب ان میں سے ایک رونہا ہے تو باقی کے سب چکے بیٹھے سنتے رہتے ہیں۔ جب وہ رونے دتے تھک جاتا ہے تو ان کا دوسرا ربرٹ شروع ہو جاتا ہے وہ ہار جاتا ہے تو تیسرے کی باری آتی ہے۔ بات کی ڈیوٹی والے بچے الگ ہیں۔ ان کا مرفردا باریک ہے۔ آپ انگلیاں جھنڈا کر، سر کی کھال میں تیل جھسوا کر کانوں میں روٹی دے کر خلاف

میں سرلیٹ کر سوتے، ایک لمحے کے اندر آپ کو جگے کاٹھکے بٹانہ دیں تو میرا ذمہ۔
 انہی مرزا صاحب کے گھر پر صبح میں جانا ہوں تو ایک ایک بچے کو بلا کر پیار کرتا ہوں۔
 اب آپ ہی بتائیے میں کیا کروں۔ کئی دفعہ دل میں آیا مرزا صاحب سے کہوں حضرت! آپ کی
 ان نغمہ سرائیوں نے میری زندگی حرام کر دی ہے نہ دن کو کام کر سکتا ہوں، نہ رات کو سو سکتا ہوں۔
 لیکن یہ میں کہنے ہی کو ہوتا ہوں کہ ان کا ایک بچہ کرے میں آجاتا ہے اور مرزا صاحب ایک اللہ
 تبسم سے کہتے ہیں "اختر بیٹا! ان کو سلام کرو۔ سلام کرو بیٹا۔ اس کا نام اختر ہے صاحب بڑا اچھا
 بیٹا ہے کبھی ضد نہیں کرتا، کبھی نہیں روتا، کبھی ماں کو دق نہیں کرتا، میں اچھی طرح جانتا ہوں
 کہ یہ وہی نالائق ہے جو رات کے دو بجے گلاب پھاڑ پھاڑ کے روتا ہے۔ مرزا صاحب قبلہ تو شاید
 اپنے خراثوں کے زور شور میں کچھ نہیں سنتے، بذمختی ہماری ہوتی ہے لیکن کتنا یہی ہوں کہ یہاں
 آؤ بیٹا، گھٹنے پر بٹھا کر اس کا منہ بھی چوستا ہوں۔"

خدا جانے آج کل کے بچے کس قسم کے بچے ہیں۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ ہم بقر عید کو تھوڑا
 سا رو لیا کرتے تھے اور کبھی کبھار کوئی تھانہ آنکلا۔ تو منوں نے کے طور پر تھوڑی سی ضد کر لی!
 (کیونکہ ایسے موقع پر فنکار آمد ہوا کرتی تھی) لیکن یہ کہ جو بیس گھنٹے متواتر روتے ہیں، ایسی مشق ہم
 نے کبھی ہم نہ پہنچائی تھی۔

اب اور تب

جب مرض بہت پرانا ہو جائے اور صحت یابی کی کوئی امید باقی نہ رہے تو زندگی کی تمام مسرتیں محدود ہو کر بس یہیں تک رہ جاتی ہیں کہ چار پائی کے سر ہانے میز پر جو انگور کا خوشکار کھا ہے اس کے چند دانے کھائے مینے دو مینے کے بعد کوٹھے پر غسل کر لیا گا ہے گلے ناخن تر شوائے۔

مجھے کالج کا مرض لاحق ہوئے اب کئی برس ہو چکے ہیں شباب کا رنگین زمانہ امتحانوں میں جوابات لکھتے لکھتے گزر گیا۔ ادب زندگی کے جو دو چار دن باقی ہیں وہ سوالات مرتب کرتے کرتے گزر جائیں گے۔ ریم اسے کا امتحان گویا مرض کا بحران تھا یقین تھا اس کے بعد یا مرض نہ رہے گا یا ہم نہ رہیں گے۔ سو مرض تو بدستور باقی ہے اولہم — ہر چند کہیں کہ ہیں — نہیں ہیں۔ طالب علمی کا زمانہ بے فکری کا زمانہ تھا۔ نزم نزم گمرطوں پر گنہرا گویا بستر عیش پرندانہ تھا۔ اب تو صاحبِ فراش ہوں۔ اب عیش صرف اس قدر نصیب ہے کہ انگور کھالیا۔ غسل کر لیا۔ ناخن تر شوائے۔

تمام ننگ و دولا بزمیری کے ایک کمرے اور سٹاف کے ایک ڈبے تک محدود ہے اور دونوں کے درمیان کا ہر موڑ ایک کین گاہ معلوم ہوتا ہے —

کبھی راوی سے بہت دلچسپی تھی۔ بغدادی علی الصباح اس کی تلاوت کیا کرتا تھا۔ اب اس کے ایڈیٹر صاحب سے ملتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ کہیں نہ کہیں سلام مستانی کھینچ ماریں گے۔

دل میں سے گزرتا قیامت ہے۔ سوہم کا یہ حال ہے کہ ہر ستون کے پیچھے ایک ایڈیٹر چھپا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

کالج کے جلسوں میں اپنی دریدہ دہنی سے بہت ہنگامہ آرائیاں کیں۔ صدر جلسہ بننے سے ہمیشہ گھبرا کر تارہوں کہ یہ ”دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ“ والا معاملہ ہے اب جب کبھی جلسہ کا سن پاتا ہوں ایک خشک سا صنف بدن پر طبری ہو جاتا ہے جانتا ہوں کہ کرسی صدارت کی سولی پر پڑھنا ہوگا اور سولی بھی ایسی کہ انا الحق کا لعرہ نہیں لگا سکتا۔

قاضی صاحب قبلہ نے اگلے دن کالج میں ایک مشاعرہ کیا۔ مجھ سے بنگالی اتنی کہ مجھے اپنے عین مقابل ایک نمایاں اور بلند مقام پر بٹھا دیا اور میری حرکت پر نگاہ رکھی۔ میرے ارد گرد محفل گرم تھی اور میں اس میں کچن چنگا کی طرت اپنی بندی پر جا بیٹھا تھا۔

جس دن کالج میں تعطیل ہوا کرتی مجھ پر اسی سی چھا جاتی۔ جانتا کہ آج کے دن تہہ پوش، تویہ بردار، صاحب نواز ہستیاں دن کے بارہ ایک بجے تک نظر آتی رہیں گی۔ دن بھر لوگ گئے چوس چوس کر جا بجا پھوگ کے ڈھیر لگا دیں گے۔ جو رفتہ رفتہ آٹا رمنادید کا سا شیا لہنگ اختیار کر لیں گے۔ جہاں کسی کو ایک کہی اور سلول میسر آ گیا وہیں کسمنا منگو لے گا اور کھانا کھا چکنے پکڑیں اور چیلوں کی ایک بستی آباد کرتا بلے گا کہ دنیا میں نام برقرار رہے۔

اب یہ حال سہکے ہینوں سے چھٹی کی تاک میں رہتا ہوں۔ جانتا ہوں کہ اگر اس چھٹی سے دن بال نہ کٹو اسے تو پھر بات گرمی کی تعطیلات پر جا پڑے گی۔ مرزا صاحب سے اپنی کتاب واپس نہ آیا تو وہ بذاتکلف مہضم کہ جائیں گے۔ ٹھیلی کے تشار کو نہ گیا تو پھر عمر بھر زندہ پٹی دیکھنی نصیب نہ ہوگی۔

اب تو دلچسپی کے لئے صرف یہ باتیں رہ گئی ہیں کہ فود تھ ایر کی حاضری لگانے لگتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ اس دروازے کے پاس جو نوجوان سیاہ ٹوپی پہنے بیٹھے ہیں اور اس دروازے کے پاس جو نوجوان سفید پگڑی پہنے بیٹھے ہیں۔ حاضری ختم ہونے تک یہ دونوں جادو کی کرامات سے

غائب ہو جائیں گے اور پھر ان میں سے ایک صاحب تو ہل میں نمودار ہوں گے اور دوسرے بھگت کی دکان میں دودھ پیئے دکھائی دیں گے۔ آج کل کے زلزلے میں ایسی نظر بندی کا کھیل کم دیکھنے میں آتا ہے۔ یا صاحبِ کمال کے کہ نب کا تماشا کرتا ہوں جو عین لیکچر کے دوران میں کھانتا کھانتا یک لخت اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور بیماروں کی طرح دروازے تک چل کر وہاں سے پھر ایسا بھاگتا ہے کہ پھر مہقول سراغ نہیں ملتا۔ یا ان اہل فن کی داد دیتا ہوں جو روزانہ دیسے آتے ہیں۔ اور یہ کہہ کر اپنی معاصرین لگو لیتے ہیں کہ صاحبِ غریب خانہ بہت دوسرے جانتا ہوں کہ دولت خانہ ہو سٹل کی پہلی منزل پر ہے لیکن منہ سے کچھ نہیں کہتا۔ میری بات پر یقین انہیں بھلا کیسے آئے گا اور کبھی ایک دو منٹ کو فرصت نصیب ہو تو دل بہلانے کے لئے یہ سوال کافی ہے کہ ہل کی گھڑی مینار کی گھڑی سے تین منٹ پیچھے ہے۔ دفتر کی گھڑی ہل کی گھڑی سے سات منٹ آگے ہے۔ چپڑاسی نے صبح دوسری گھنٹی مینار کے گھڑیال سے پانچ منٹ پہلے بجائی اور تیسری گھنٹی ہل کی گھڑی سے نو منٹ پہلے تو مرکب سود کے قاعدے سے حساب لگا کر بتاؤ کہ کس کا سر بھوڑا جائے۔

وہی میں نے کہا نا کہ انگوڑ کھا لیا، غسل کر لیا، ناخن تر تھو لے سے

دل نے دنیا نئی بنا ڈھالی اور ہمیں آج تک خبر نہ ہوئی

”پطرس“

(راوی ۱۹۲۹ء)

میلنہ برس رہا ہے

میلنہ موسلا دھار برس رہا ہے۔ ندی نالے چڑھے ہوئے ہیں۔ ہر طرف شام کی سی تاریکی سجائی ہوئی ہے۔ درخت اور پودے ایک دُھلی ہوئی تصویر کی طرح اپنی سبزی میں زیادہ سبز اور اپنی پاکیزگی میں زیادہ صاف نظر آ رہے ہیں پھول اور پرندے۔ نغمہ اور نکلت۔ رنگ اور بو سب شاداں معلوم ہوتے ہیں۔ اسے میری آرزوؤں کی ملکہ میرا دل اداس ہے۔

بارش کی چلمن میں سے کائنات کی دنیائے مہوم دکھائی دیتی ہے جس کو دیکھ کر دل میں اُمنگیں اُٹھ سکتی ہیں۔ مگر جہاں خواہشوں کا پورا ہونا اسی دنیا کے باشندوں کے لئے مخصوص ہے درخت جھومتے ہیں۔ میں ان کو دیکھتا ہوں۔ اُن کے پتے بل بل کے لیٹتے اور جھک جھک کے چومتے ہیں۔ ان کی لرزش میں مجھے تیرا بستم نظر آتا ہے۔ سبزہ لہلہاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں تو اٹھکیلیاں کہ رہی ہے۔ پرندے کھتوں میں چپ چپ کے گاتے ہیں۔ میرے کانوں میں تیری آواز پڑتی ہے۔ میں یہ سب دیکھتا ہوں۔ سب کچھ سنتا ہوں اور ترستا ہوں یہ تو بارش کے اس پار کی دنیا ہے۔

بجلی چمکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں۔ اس دنیا سے کوئی پیغام آیا لیکن وہ تڑپ تڑپ کے ترساتی ہے اور میں ترس ترس کے ترس پتا ہوں۔ اس کو کہہ کہ اپنا ایک نقرتی تیر میرے سینے تک

پہنچا دے اور اس کو میری حسرتوں میں بھجا کر تجھ تک سے جلتے۔ لیکن اے میری حسرتوں کی
 امید! کیا تو اپنی دنیا میں جہاں ہوائیں چل رہی ہیں اور نلے ہمہ سہے ہیں۔ میری ضعیف التجائے
 درد کو سُن سکتی ہے؟

پرندے چہماتے ہیں۔ میں چپ بیٹھا ہوا اُستنا ہوں۔ میرے ملنے میں بھی ایک نغمہ ہے۔
 ان کو کہہ کر وہ غمے بھی اپنے ساتھ گانے دیں کہ میرے نغمے کی نکمت تیرے بالوں کی طرح کائنات
 کے دل میں بکھر جائے۔ میں اکیلا اس کی مستی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک شراب ہے کہ جس میں
 ساتی قدرت نے ایک آگینہ کے ٹکڑے سے پھینک دیئے تھے۔ میرے دل میں خراش ہو رہے ہیں۔
 اس بیل کو بھیج دے کہ آ کے سُن جائے اور تیرے پاس روتی ہوئی جائے۔

اے میری مقصود انتظار! تو بارش کے اس پار آ جا۔ جہاں میرا دل اور میری آنکھیں تیرے لئے
 خواہشوں اور آرزوؤں کی پاکیزگیاں لئے نیری راہ تک رہی ہیں اس پار آ جا۔ پیشتر اس کے
 کہ میں اپنے ساز کو توڑ دوں اور اپنی تمام آرزوؤں کو ایک درد انگیز چیخ کی صورت میں اپنے
 سینے سے نکال کر تیرے لئے ویسا ہی موہوم بن جاؤں جس طرح تو آج میرے لئے ہے۔

” پطرس “

(دکشاں۔ اپریل ۱۹۲۰ء)

تنزل

مجھے نہیں معلوم میرا انجام کیا ہوگا؟ جس تیز رفتاری سے میں تنزل کی طرف جا رہا ہوں۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ دل و دماغ کے لئے ہنک ثابت ہوتی ہے مجھے خود بھی اس بات کا یقین ہے۔ میں ہمیشہ سے اس کا قائل رہا ہوں۔ لیکن میں سراسے اس کے کیا کہہ سکتا ہوں کہ میں بے بس ہوں۔ میں مجبور ہوں۔ میں اپنے آپ کو نہیں روک سکتا۔ ایک زبردست کشش، ایک ہمہ گیر جاذبیت مجھے جاکت اور پستی کی طرف کھینچنے لگے جا رہی ہے۔

آہ! بہت تھوڑے عرصہ کا ذکر ہے کہ میں اپنے آپ کو ایک نہایت عالی مقام پاتا تھا۔ میرا مطمح نظر اور میرا دائرہ افق اس قدر وسیع تھا کہ اس پر نظر ڈالتے ہوئے میرا دماغ چمکھاتا تھا۔ مجھے صرف عالی نگاہ لوگ دیکھ سکتے تھے اور میں کوتاہ بینوں سے نامون تھا۔ اب میری یہ حالت ہے کہ کسی اور کو تو کیا۔ میں خود اپنے آپ کا مطالعہ نہیں کر سکتا۔

مجھے معلوم ہے کہ بہت عرصہ نہیں گزرنے نہیں پائے گا۔ جب میرے حیات فنا ہو جائیں گے۔ شاید میرے حواس مجھے جواب دے جائیں میں اپنے آپ کو زندہ کہتا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مردوں سے بدتر ہوں۔ کیونکہ جو شخص مر جاتا ہے وہ کہیں نہ کہیں ٹھکانے تو لگ جاتا ہے اور میرا حال یہ ہے کہ دنیا میں کوئی مہارا نہیں۔ آرام و سکون میرے لئے ناممکنات

میں سے ہیں۔ نہ مجھے اس وقت کوئی ناصح مفید ہو سکتا ہے اور نہ میں خود ہی اپنی رہنمائی کر سکتا ہوں۔
چلے گئے کوچھ پر رحم آ سکتا ہے اسے میرے نزدیک آنے کی ہمت نہیں پڑ سکتی۔

زندگی میں یہ ایک — صرف ایک لغزش کا نتیجہ ہے۔

آپ نہیں سمجھے؟ خوب! بات یہ ہے کہ میں جامع مسجد کے مینار سے گر رہا ہوں۔

(مخزن۔ اکتوبر ۱۹۲۱ء)

آئینہ دل

بچپن کے جذبات گویا ساحل دریا پر چھوٹی چھوٹی ہلکی ہلکی سی لہریں ہیں جہاں ننھے ننھے ننگے پاؤں سپیوں کی تلاش میں ریت کی باریک اور نفیس سلوٹوں کو ایک معصوم بے پروائی سے مس دیتے ہیں جہاں کا طوفان قہقہوں اور پانی کے پھینٹوں سے زیادہ نہیں ہوتا۔

گویا ایک خوش نما نازک بریل جس کو اب تک کسی انسانی ہاتھ نے نہیں پھوہا، اور جو ایک درخت کے سایے کے نیچے ننھا پڑا ہے۔ جس کا زیر و بم لا ابا لیا۔ تاروں اور پردوں میں کہیں بکھر پڑا ہے۔ ہوا کے جھوتکے اس کو کبھی کبھی گدگد دیتے ہیں اور اس میں سے ایک خندہ آنا دے ایک بے ترتیب سانفہ یوں بے اختیار ہو کر فضا میں سے نکل جاتا ہے جیسے کسی بادِ فنا پر پری کے پانزیب کی جھنکار۔

انٹنی جوانی کا عالم غصے یوں دکھائی دیتا ہے جیسے ایک دریا جس کی گہرائیوں کے طلاطم پر سطحی سکون بے خبر سا سکر رہا ہے جس کے اعماق کی تاریکیوں میں لہریں انٹنی ہیں اور سطح کو پھیر کر واپس ڈوب جاتی ہیں۔ جہاں ایک طلاطم پنہل ہے اور ایک عشر فرمائی۔

جیسے بریل ایک ہنرمند معنی کے ہاتھوں میں ہے۔ ہر ایک تار ایک شدید انتظار سے کسا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ نغمے اپنی ہنسی سے بھرتے منتظر کھڑے ہیں اور مضرب کو تا قہم نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

اس وقت کی حالت نہ پوچھو جب عشق کا بلاخیز طوفان رو سے دیا اور قہم دے یا کو ایک

کر دیتا ہے۔ جب عزقابی کی ہرکشتی اور ہر تیراک کو پستی سے بلندی اور بلندی سے پھر پستی تک یوں دھکیل کر لے جاتی ہے جیسے قہر خداوندی، جہاں ہر ایک بھنور طاقت و در سے طاقت ور انسان کو اپنی طرف یوں کھینچ لیتا ہے جیسے قسمت کی مجبوری۔

بربط ہستی کے تار تار میں تھر تھرا ہٹ کا ایک ہنگامہ ہوتا ہے۔ دل خراش نغمے بولوں کی طرح چکر کھاتے ہوئے اٹھتے ہیں اور اپنی سر چکرا دینے والی تیزی میں زیر و بم کو تنکوں کی طرح پیٹنے لے جاتے ہیں۔ ہوش و حواس سروں کے ہجوم میں کہیں فائب ہو جاتے ہیں اور ایک دل چیرنے والے سرود ایک نیشیلے شور کے سوا اور کچھ محسوس نہیں ہوتا۔

آہ! مگر جب دریا اپنے کناروں کی حدود کو توڑ کر اپنے جوش مستی میں آوارہ ہو جاتا ہے۔ جب اس کی لہریں ایک بے معنی تلاش میں کوسوں تک نکل کر ہلکی پڑ جاتی ہیں۔ تو اس کا دم ٹوٹ جاتا ہے۔ بے رحم زمین قطرہ قطرہ کر کے اس کو چوس لیتی ہے۔ اس کا طوفان بے بس ہو جاتا ہے۔ پھر اس کی سوانی لنگ رہ جاتی ہے اور آخر کا اس کا پانی سوکھ جاتا ہے پھر وہاں موج ریگ کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ بحر جب بحر نہیں رہتا تو بیاباں ہو جاتا ہے اور ایک ویران، سنسان، ایک بھیانک وحشت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

گیت کی دردناک سے جب تالوں میں ایک بے قراری ایک وجد کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے جب سُر اپنی جان سے بیزار ہو کر بے حجابانہ اور بے تابانہ ایک دوسرے سے سر ٹکراتے ہیں۔ جب بربط کی جانِ نانک اپنی بساط سے بڑھ کر چیخ اٹھتی ہے تو اس کے تار ٹوٹ جاتے ہیں۔ ٹکستگی نغموں کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ پھر وہ بربط، بربط نہیں رہتا بلکہ فنا کا ایک خاموش نوحہ مآتم ہو جاتا ہے ”یہ ہے عشق کی نامرادی“

کاغذی روپیہ

خواجہ علی احمد شہر کے بڑے سوداگر تھے۔ لاکھوں کا کاروبار چلتا تھا۔ لوگوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ بچپن سے ان کی دیانتداری سے واقف تھا اور ہر شخص جانتا تھا کہ خواجہ علی احمد قفل کے سچے اوباب تھے پتے ہیں۔

ایک دن انہوں نے اپنے ایک آدمی کو جوتے والے کی دکان سے جوتا خریدنے بھیجا۔ جوتے کی قیمت بیس روپے تھی لیکن بجائے اس کے کہ خواجہ علی احمد اپنے نوکر کو بیس روپے دے کر بھیجتے، انہوں نے نوکر کے ہاتھ کریم خاں جوتے والے کے نام یہ رقعہ لکھ بھیجا۔

”میاں کریم خاں! مہربانی کر کے ہمارے آدمی کو بیس روپے کا ایک جوتا دے دو، ہمارا یہ رقعہ اپنے پاس سنبھال کے رکھ چھوڑو۔ جب تمہارا دل چاہے یہ رقعہ آکے ہم کو یا ہمارے منشی کو دکھا دینا اور بیس روپے لے جانا۔ یہ رقعہ اگر تم کسی اور شخص کو دینا چاہو تو بے شک دے دو۔ جو ہمارے پاس لے گا۔ ہم اس کو بیس روپے دے دیں گے۔ راقم خواجہ علی احمد۔“

دکاندار نے جب رقعے کے نیچے خواجہ علی احمد کا دستخط دیکھا۔ تو اسے اطمینان ہوا۔ جانتا تھا کہ خواجہ صاحب مکر نے دلے آدمی نہیں اور پھر اکھوں کے آدمی ہیں۔ روپے نہیں بھیجے تو نہ سہی یہ رقعہ کیا روپوں سے کم ہے؟ جب چاہوں گا، رقعہ جا کر دے دوں گا اور روپیہ لے لوں گا۔ چنانچہ اس نے بغیر تامل کے جوتا بھیج دیا۔

تھوڑی دیر بعد کریم خاں دکاندار کے پاس عبداللہ علوانی آیا اور کہنے لگا: ”میاں کریم خاں!

میرے تمہاری طرف پچیس روپے نکلنے میں ادا کر دو تو تمہاری بہت ہرمانی ہوگی،
 کریم خاں نے کہا: ابھی تو۔ یہ پانچ تو نقد لے لو۔ باقی بیس روپے مجھے خواجہ علی احمد سے
 لینے ہیں یہ دیکھو، ان کا رقعہ ذرا مٹھڑ جاؤ، تو میں جا کے ان سے بیس روپے لے آؤں۔“
 عبداللہ بھی خواجہ علی احمد کو اچھی طرح جانتا تھا کیونکہ شہر بھر میں خواجہ صاحب کی ساکھ
 قائم تھی کہنے لگا: تم یہ رقعہ مجھے ہی کیوں نہ دے دو میں ان سے بیس روپے لے آؤں گا کیونکہ
 اس میں لکھا ہے کہ جو شخص یہ رقعہ لائے گا اس کو بیس روپے دے دیئے جائیں گے۔“
 کریم خاں نے کہا: یہ لو نہی سہی، چنانچہ عبداللہ علوانی نے بیس روپے کے بدلے وہ رقعہ
 قبول کر لیا۔

کئی دنوں تک یہ رقعہ یونہی ایک سے دوسرے کے ہاتھ میں پہنچ کر شہر بھر میں گھومتا رہا
 خواجہ علی احمد پر لوگوں کو اس قدر اعتبار تھا کہ ہر ایک اسی رقعے کو بیس روپے کی بجائے
 لے لینا قبول کر لیتا کیونکہ ہر ایک شخص جانتا تھا کہ جب چاہوں گا اسے خواجہ صاحب کے
 منشی کے پاس لے جاؤں گا اور وہاں سے بیس روپے وصول کر لوں گا۔
 ہوتے ہوتے یہ رقعہ ایک ایسے شخص کے پاس پہنچ گیا جس کا بھائی کسی دوسرے شہر میں
 رہتا تھا۔ یہ شخص اپنے بھائی کو منی آرڈر کے ذریعے بیس روپے بھیجنا چاہتا تھا۔ ڈاک خانے
 والوں نے اس رقعہ کو بیس روپے کے عوض میں لینا قبول نہ کیا۔ چنانچہ وہ شخص یہاں
 خواجہ علی احمد کی کوٹھی پر پہنچا۔ رقعہ منشی کو دیا۔ منشی نے بیس روپے کھن کھن گن دیئے۔
 اس نے روپے جا کر ڈاک خانے والوں کو دیکھے اور انہوں نے آگے اس کے بھائی کو بھیج دیئے۔
 اس مثال سے یہ ظاہر ہوا کہ محض ایک کاغذ کا پرزہ کتنی مدت تک روپے کا کام دیتا رہا۔ اس
 کیوں ہوا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کاغذ کے نیچے ایک ایسے شخص کے دستخط تھے جس کی
 دولت کا سب کو علم تھا۔ سب جانتے تھے کہ یہ شخص جب چاہے بیس روپے ادا کر سکتا
 ہے اور قول کا اتنا پتلا ہے کہ کبھی ادا کرنے سے انکار نہ کرے گا۔

اگر ایسے ہی ایک رقعے کے نیچے ہم یا تم دستخط کر دیتے تو کوئی بھی اسے روپے کے بدلے میں قبول نہ کرے گا۔ اول تو ہمیں جانتا ہی کون ہے اور جو جانتا بھی ہے وہ کہے گا۔ ان کا کیا پتہ آدمی نیک اور شریف اور دیانتدار سی، لیکن خدا جانے ان کے پاس بیس روپے ہیں بھی یا نہیں؟ کیا معلوم ہم مانگتے جائیں اور وہ ان کو ڈری بھی نہ ہو۔

خواجہ علی احمد کا رقعہ گویا ایک قسم کا نوٹ تھا۔ سرکاری نوٹ بھی بالکل یہی چیز ہوتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ ان کے نیچے سرکار کی طرف سے سرکاری خزانے کے ایک افسر کے دستخط ہوتے ہیں۔ اگر تم دس روپے کے نوٹ کو لے کر دیکھو تو اس پر اوپر حکومت پاکستان اور اس کے نیچے لکھا ہوتا ہے کہ ”میں اقرار کرتا ہوں کہ عندالمطالبہ حامل ہذا کو دس روپے سرکاری خزانہ کراچی سے ادا کروں گا۔“ اس عبارت کے نیچے سرکاری افسر کے دستخط ہوتے ہیں۔“

خواجہ احمد علی کو تو صرف ایک شہر کے لوگ جانتے تھے۔ حکومت پاکستان کو ملک کا ہر آدمی جانتا ہے بلکہ اور ملکوں میں بھی اس کی ساکھ قائم ہے اس لئے سرکاری نوٹ کو ہر شخص بلا تامل قبول کر لیتا ہے اور کوئی قبول کیوں نہ کرے۔ لوگ جانتے ہیں کہ جب چاہیں خزانے میں جا کر اس کے روپے بھنڈ سکے ہیں۔

خواجہ علی احمد کے رقعے اور سرکاری نوٹ میں ایک فرق اور بھی ہے۔ خواجہ علی احمد کا رقعہ تو دو اک ٹانے والوں نے قبول نہ کیا تھا لیکن سرکاری نوٹ انہیں ضرور ہی قبول کرنا پڑتا۔ سرکاری نوٹوں کو قانونی طور پر ملک کا سکہ قرار دیا گیا ہے اور کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ ان کو روپے کے بدلے لینے سے انکار کرے۔ اگر تمہیں کسی شخص نے دس چاندی کے روپے قرض دیئے تھے اور اب تم اس کو یہ قرضہ اتارنے کے لئے دس روپے کا نوٹ دیتے ہو تو وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں تو چاندی کے روپے ہی لوں گا۔ اسے دس کا نوٹ ضرور پڑے گا۔

روپیہ ایسا ہونا چاہیے کہ آسانی سے پاس رکھا جاسکے۔ چاندی کے سکوں میں یہ خواہ

ایک حد تک پائی جاتی ہے۔ تاہم چاندی کے سکے وزنی ہوتے ہیں۔ اسی روپے کا وزن سیر بھر ہو جاتا ہے تو جہاں پانچ چھ سو روپے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا ہوں، وہاں ابھی خاصی وقت پیش آتی ہے۔

نوٹوں سے یہ وقت رفع ہو جاتی ہے۔ ہزاروں روپے کے نوٹ ایک جیب میں آسانی سے ڈالے جاسکتے ہیں نوٹوں کے جاری کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔

ماوجودان سب باتوں کے جس شخص کے پاس بہت سا روپیہ ہو۔ اس کے لئے یہ مشکل ہے کہ بہت سے نوٹ، کچھ روپے، چونیاں، دونیاں، یہ سب کچھ اپنے پاس سنبھال رکھے۔ ایک تو سنبھالنے کی تکلیف، دوسرے چوری کا خطرہ، اس لئے بہتر یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنا سب روپیہ بنک میں رکھوادے۔

بنک میں روپیہ امانت کے طور پر رہتا ہے روپے کا مالک جب چاہے اس کو نکھوا سکتا ہے یا جس کو چاہے اپنے حقے کا روپیہ دلوا سکتا ہے کسی اور کو اپنے حقے کا روپیہ دلوانے کی ترکیب یہ ہے کہ اس کو چیک لکھ کر دے دیا جائے۔

ہم یہاں چیک کے معنوں کو واضح طور پر بیان کرنا چاہتے ہیں۔ فرض کرو۔ عبداللہ نے بہت سی بہت سا روپیہ جمع کر رکھا ہے۔ کریم خاں اس سے دس روپے مانگنے آتا ہے۔ عبداللہ سبائے اس کے کہ کریم خاں کو دس روپے نقد دے۔ وہ اسے دس روپے کا چیک لکھ دیتا ہے۔ چیک گویا ایک قسم کا رقعہ ہے جو عبداللہ کریم خاں کی معرفت اپنے بنک کو بھیج رہا ہے۔ چیک پر مفصل ذیل الفاظ لکھے ہوتے ہیں۔

بنام فلاں بنک

کریم خاں کو دس روپے دے دو

راقم عبداللہ

کریم خاں کی سبائے عبداللہ اگر کسی احد کا نام لکھ دے تو جس کا نام لکھے گا۔ اسی کو روپے

میں گئے۔ اب سوال یہ ہے کہ کریم خاں دس روپوں کی بجائے یہ دس روپے کا چیک کیوں قبول کر لیتا ہے؟ اس لئے کہ اسے عبداللہ پر اعتبار ہے۔ وہ جانتا ہے کہ بینک میں ضرور عبداللہ کا روپیہ جمع ہوگا۔ میں جب یہ چیک لے جاؤں گا بٹھے روپیہ مزد مل جائے گا۔

اب فرض کرو کہ کریم خاں وہ چیک لے کے عبداللہ کے بینک میں گیا اور کہا کہ بٹھے اس چیک کا روپیہ ادا کر دو۔ بینک والوں نے عبداللہ کا حساب دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہاں توکل تین روپے ہیں۔ ایسی حالت میں وہ چیک ادا نہیں کر سکتے۔ چنانچہ وہ انکار کر دیں گے اور کریم خاں کا عبداللہ پر اعتبار باقی نہ رہے گا۔ لیکن اگر ایسا بھی ہوتا ہے کہ بینک والے عبداللہ کو جانتے ہیں۔ مدت سے اس کا حساب کھلا ہوا ہے وہ کہتے ہیں۔ بینک میں تو عبداللہ کے تین روپے ہیں۔ مگر چلو فی الحال ہم باقی کے سات روپے اپنے پاس سے دے دیتے ہیں اور عبداللہ کی لاج رکھ لیتے ہیں۔ ہم یہ سات روپے پھر اس سے لے لیں گے۔ لیکن عام طور پر ایسا کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ لوگوں کا جتنا روپیہ بینک میں ہوتا ہے اس کے اندماند ہی چیک دیتے ہیں اور کم ہی ایسا موقع پیش آتا ہے، کہ بینک چیک ادا کرنے سے انکار کر دے۔

اگر کریم خاں نے خود بھی کسی بینک میں حساب کھول رکھا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ عبداللہ کا چیک لے کر وہ خود عبداللہ کے بینک میں جائے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس طرح وہ اپنا روپیہ بینک میں جمع ہونے کے لئے بھجوا دیتا ہے اسی طرح یہ چیک بھی بھجوا دے۔ اس کے بینک والے خود ہی عبداللہ کے بینک سے اس چیک کا روپیہ وصول کر لیں گے۔ یہ دس روپے کی رقم کریم خاں کے حساب میں جمع کر دی جائے گی اور عبداللہ کے حساب میں خرچ کی آمد میں چرہ حادی جائے گی۔

اس طرح سے یہ سہولت ہوتی کہ عبداللہ اور کریم خاں دونوں کا روپیہ اپنے اپنے بینک میں محفوظ پڑا ہے نہ تو عبداللہ کو روپیہ ادا کرنے کے وقت نہ کریم خاں کو وصول کرتے وقت بینک

جانا پڑا۔ وہ روپیہ ایک کے حساب میں سے نکل کر دوسرے کے حساب میں جمع بھی ہو گیا۔ یہ سب کچھ ایک چک کی بدولت ظہور میں آیا۔

یہاں ہم نے صرف ”کاغذی روپے“ کی دو قسموں کا ذکر کیا ہے، ایک سرکاری نوٹ اور دوسرے چک، ان کے علاوہ ادبھی کاغذات ایسے ہیں جن کے ذریعے سے بڑی بڑی رقمیں یہاں سے دور دراز ملکوں تک پہنچ جاتی ہیں۔

(خیابان اُردو)

(بچوں کے لئے)

رونار لانا

ایک امریکن ادبی نقاد ایک مقام پر لکھتا ہے کہ مرد ایک ہنسوڑا جانور ہے اور عورت ایک ایسا حیوان ہے جو اکثر مدنی شکل بنا لے رہتا ہے۔

مصنف کی خوش بوسی نے اس فقرے میں مبالغے اور تلخی کی آمیزش کر دی ہے اور چونکہ وہ خود مرد ہے اس لئے شاید عورتوں کو اس سے کئی اتفاق بھی نہ ہو۔ لیکن یہ حال موضوع ایسا ہے جس پر بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔

میرے ایک دوست کا مشاہدہ ہے کہ عورتوں کی باہمی گفتگو یا خط و کتابت میں موت یا بیماری کی خبروں کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ایسے واقعات کے بیان کرنے میں عورتیں غیر معمولی تفصیل اور رقت انگیزی سے کام لیتی ہیں۔ گویا ناگوار باتوں کو ناگوار ترین پیرائے میں بیان کرنا ان کا نہایت پسندیدہ شغل ہے۔ ان سے وہ کبھی سیر نہیں ہوتیں۔ ایک ہی موت کی خبر کے لئے اپنی شناساؤں میں سے زیادہ سے زیادہ سامعین کی تعداد ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتی ہیں۔ ایسی خبر جب بھی نئے سرے سے سننا شروع کرتی ہیں ایک نہ ایک تفصیل کا اضافہ کر دیتی ہیں اور ہر بار نئے سرے سے آسو بہاتی ہیں اور پھر یہ بھی فروری نہیں کہ موت یا بیماری کسی قوی عزمین کی ہو، کوئی پٹوسی ہو، ملازم ہو، ملازم کے نخیل یا ہسپتال کے سبسرال کا واقعہ ہو، گلی میں دھڑرہ آنے جانے والے کسی خواہ مخواہ لے کا بچہ بیمار ہو، کوئی اڑتی جڑ ہو، کوئی افواہ یا غرضیکہ اس ہمدردی کا حلقہ بہت وسیع ہے۔

• سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

نہ صرف یہ بلکہ رقت انگیز کہانیوں کے پڑھنے کا شوق عورتوں ہی کو بہت زیادہ ہوتا ہے اور اس زیادہ سے میں بھی اقوام کا ایک ہی سا حال ہے۔ غیر ممالک میں بھی رلانے والی کہانیاں، ہمیشہ نچلے طبقہ کی عورتوں میں بہت مقبول ہوتی ہیں۔ گھٹیا درجے کے غم نگار مصنفین کو اپنی کتابوں کی قیمت اکثر عورتوں کی جیب سے وصول ہوتی ہے۔ وہ بھی عورتوں کی حضرت کو سمجھتے ہیں۔ کہانی کیسی ہی ہو اگر اس کا ہر صفحہ غم و الم کی ایک تصویر ہے تو اس کی اشاعت یقینی ہے اور عورتوں کی آنکھوں سے آنسو نکلوانے کے لئے ایسے مصنفین طرح طرح کی ترکیبیں کرتے ہیں۔ کبھی ایک پھول سے بچے کو سات آٹھ سال کی عمر میں ہی مار دیتے ہیں اور بستر مرگ پر توتلی باتیں کر داتے ہیں۔ کبھی کسی یتیم کو رات کے بارہ بجے سردی کے موسم میں کسی چوک میں بھوکا اور نہنگا کھڑا کر دیتے ہیں اور بھی رقت دلائی ہو تو اس سے سید بنا دیتے ہیں۔ یہ بھی کافی نہ ہو تو اسے بھیک مانگتا ہوا دکھا دیتے ہیں کہ ”میری بوڑھی ماں مر رہی ہے۔ دوا کے لئے پیسے نہیں۔ خدا کے نام کا کچھ دیتے جاؤ۔“ کبھی کسی سنگم پر خوبصورت ٹیک ٹینٹ لڑکی کو ہڑیل سی ساس کے حوالے کر دیا یا کسی بدتماش خاوند کے سپرد کر دیا اور کچھ بس نہ چلا تو سوتیل ماں کی گود میں ڈال دیا اور وہاں دل کی بھر اس نکال لی۔ پڑھنے والی ہیں کہ نار و قطار دور رہی ہیں اور بار بار پڑھتی ہیں اور بار بار روتی ہیں۔

خود عورتوں کی تصنیفات اکثر، چمکیوں میں لپیٹی ہوئی اور آنسوؤں میں تھری ہوئی ہوتی ہیں۔ پاکستان میں جو کتابیں عورتوں نے لکھیں، اکثر میں نزع، بیماری، دق، سل، خودکشی، زہر، ظلم و تشدد ایک نہ ایک چیز کا سلسلہ باندھ دینا گویا فرض جانا۔ ہاں کوئی کر دیشیا کھانا پلانے کی کتاب ہو تو اور بات ہے۔

آخر یہ مصیبت کیا ہے؟ یہ بات بات پر صغیر ماتم بچے جانا کیا معنی؟ بار بار سوچتا ہوں کہ آخر اس امر کو نقدانے کیا غلط کہا، جل کے کہا سہی لیکن بڑی بات کیا کہی؟ کسی گھر میں ہوتے واقع ہو جائے تو زلزلے اور مردانے کا مقابلہ کیجئے۔ مردوں کا ماتم تو صاف

دکھائی دیتا ہے۔ بچہ چار سے گھر کے باہر بیٹھے ہیں۔ سر نیچا کئے چپ چاپ اسٹیکیں کچھ کُرخ ہیں کبھی کبھی آنسو بھی ٹپک پڑنے ہیں یا کسی نہ کسی انتظام میں مصروف ہیں۔ چہرے پر تھکن اور اداسی سی ہے اور قدم ڈو آہستہ آہستہ اٹھتے ہیں اور زانے کا ماتم تو دور دور سے موت کے گھر کا پتہ دیتا ہے اور جب کوئی نئی فلاں بی بی ٹولی سے اٹکرا ندر جاتی ہے تو ماتم کی بھینچنا ہٹ میں از سر نو ایک لہرا ٹھٹی ہے۔ جیسے یک لخت کوئی ہوائی جہاز پر سے گر پڑے۔ مرد تو دوسرے تیسرے دن کام میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ لیکن عورتوں کے ہاں ہیمنہ بھر کو ایک کلب قائم ہو جاتی ہے۔ گلوڈیوں پر گلوڈیاں دکھائی جاتی ہیں اور چیخوں پر چیخیں ماری جاتی ہیں۔

کہیں بیمار پرسی کو جاتی ہیں تو بیمار میں وہ وہ بیماریاں نکال کے آتی ہیں جو ڈاکٹر کے دہم و گمان میں نہ تھیں جتنی دیر سر ہاتے بیٹھی رہیں۔ بیمار کی ہر کروٹ پر ہاتھ ملتی ہیں۔ سب سے جا رہے ہیں گلا صاف کرنے کو بھی کھانے کو یہ سورہ لیسن تک پڑھ جاتی ہیں۔ رنگت کی زردی، بدن کی کمزوری، سانس کی بے قاعدگی، ہونٹوں کی خشکی ہر بات کی طرف توجہ دلاتی ہیں۔ حتیٰ کہ بیمار کو بھی اپنی یہ خطرناک حالت دیکھ کر چار دنا چار مسمیٰ آواز میں بولنا پڑتا ہے۔ جوں جوں بیمار پر بس عورتوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ موت فریب آتی جاتی ہے اور ٹھکے یقین ہے کہ بعض عورتوں کو مر لہن کے پنج جلنے پر صدمہ ہوتا ہوگا کہ اتنی تو بیمار پرسی کی اور نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔

عورتیں نہ صرف دوسروں کے غم میں مزے لے کے روتی ہیں۔ بلکہ دوسروں کی اشک باری کے لئے خود بھی سامان ہیا کرنے میں کوتاہی نہیں کرتیں ایک پڑنے زلمنے کے بزرگ اپنی اہلیہ کے متعلق فرمایا کرتے ہیں کہ ہماری گھر والی بھی اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ کہ کوئی پڑوسن آکے کہہ دے کہ اے بو! ماشا اللہ آج تو تمہارے چہرے پر رونتی برس رہی ہے۔ تو جھجکا کر بول اٹھتی ہیں کہ تیرے درد و درد میں خاک۔ میں تو مری جاتی ہوں اور میرا بڑا چلہنے والوں کو ابھی میں ہٹی کچی نظر آتی ہوں اور کوئی آکے کہہ دے کہ اے ہے بیٹی تجھے کیا ہو گیا تو تو دن بدن گھلتی جاتی ہے۔ نہ جانے کچھ کیا غم کھا گیا؟ تو ایسی پڑوسن کو فوراً خالہ کا لقب مل جاتا

تھا۔ بڑی خاطر تواضع ہوتی تھی۔ گھر کا کام کاج چھوڑ کر شام تک ان کو اپنے دکھڑے سانسے بنائے
تھے اور چلتے وقت وہ پانچ روپے قرض بھی لے جایا کرتی تھیں۔ جن کی ادائیگی کے لئے کبھی تقاضا نہ
کیا جاتا تھا۔

اپنے اوپر رحم دلانے کا مرض جس کسی میں بھی پایا جائے۔ بہت ذلیل مرض ہے۔ لیکن
عورتوں میں یہ اس قدر عام ہے کہ خوش حال گھرانے کی ہو بیٹیلیں بھی گفتگو میں چاشنی پیدا کرنے
کے لئے کوئی نہ کوئی دکھ و صبح کر لیتی ہیں اور موقع موقع پر سنا کر داد لیتی ہیں۔

اس تحریر سے میرا مطلب ان بہنوں کا مذاق اڑانا ہرگز نہیں جو فی الواقع غمیگن یا مصیبت زدہ
ہیں۔ ان کی منسی اڑانا پر لے درجے کی تنقاوت ہے۔ جو خدا بچھے نصیب نہ کرے کسی کا عمل ایسی
بات نہیں جو دوسرے کی خوش معی کا موضوع بنے۔ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ زندگی کا بہت سا
دکھ، ضبط، کھلم، اور خندہ پیشانی سے دودھ ہو سکتا ہے۔ کسی مصیبت زدہ شخص کے ساتھ
سب سے بڑی ہمدردی یہ ہے کہ اس کا غم غلط کر لیا جائے کسی بیمار کی سب سے بڑی تیمارداری
یہ ہے کہ اس کی طبیعت کو سنگفتہ کرنے کا سامان پیدا کیا جائے۔ غم کو برداشت کرنے کا بہترین طریقہ
یہ ہے کہ اس کو ضبط کرنے کی کوشش کی جائے۔ مہذب شخص کی یہی پہچان ہے اپنے دکھ کے قہقہے
کو بار بار دہرا کر کسی دوسرے شخص کو متاثر کرنے کی کوشش کرنا گویا اپنے آپ کو ذلیل کرنا ہے خود بھی
بہنسا اور اوروں کو بھی بہنسا و دنیا میں غم کافی سے زیادہ ہے اس کو کم کرنے کی کوشش کرو، بہنسا
اور خوش رہنا دماغ اور جسم کی صحت کی نشانی ہے۔ غم نگار مصنیفین کو میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں
کہ وہ شخص انمول ہے جو اپنی تحریر سے ہزار ہا لوگوں کو خوش کو دیتا ہے اور وہ شخص خدا کے سامنے
حجاب وہ ہو گا جو اپنے زودِ قلم سے ہزار ہا جوان، معصوم، خوش مزاج عورتوں اور مردوں کو رلاتا
ہے اور رلاتا بھی اس طرح ہے کہ نہ اس سے تڑکیہ نفس ہوتا ہے نہ کوئی دل میں امنگ پیدا ہوتی
ہے اور ہزار قابلِ افسوس ہے وہ شخص جو یہ سب کچھ کر کے بھی اپنی ناشاپردازی پر ناز کرتا ہے۔

(تہذیب نسواں)

نوع انسان کی کہانی

دنیا کی ابتدا

ہماری ہستی ایک بہت بڑا گورکھ د خدا ہے۔

ہم کون ہیں؟

ہم کہاں سے آئے ہیں؟

ہم کہاں جا رہے ہیں؟

ان سوالات کا جواب اتنی سے بھی پڑے کیسے دور ہمارا انتظار کر رہا ہے اور ہم بہت

ہی آہستہ آہستہ لیکن بڑے استقلال اور بہت کے ساتھ اس کے قریب پہنچ رہے ہیں۔

لیکن ابھی ہم نے کچھ بھی مسافت طے نہیں کی!

ابھی ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں۔

ابھی ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں۔ تاہم اتنا کچھ جان گئے ہیں کہ اپنے علم کی بدولت کئی اور

باتیں بہت حد تک بوجھنے کے قابل ہو گئے ہیں۔

اس باب میں ہمیں تمہیں یہ بتلاؤں گا کہ ظہور انسان سے پہلے جہاں تک ہمیں معلوم ہے

دنیا کا کیا حال تھا!

اگر ہم یہ اندازہ لگائیں کہ کمرہ زمین پر جان دار اشیاء کا وجود کتنے عرصے سے ممکن ہے

اور مدت کو اس لکیر سے ظاہر کریں کہ جو ننھی سی لکیر اس کے نیچے کھینچی گئی ہے وہ وہ ظاہر

کرتی ہے کہ انسان یا انسان کے طرح کی مخلوق یہاں کتنے عرصہ سے رہتی ہے۔
انسان سب سے آخر میں آیا لیکن عقل کے ذریعہ قدرت کی طاقتوں کو تسخیر سب سے
پہلے کیا۔ اسی لئے ہم بیتوں یا کتوں یا گھوڑوں یا دوسرے جانوروں کی بجائے انسان ہی کی تاریخ
کا مطالعہ کریں گے گواہی اپنی جگہ ہر ایک کی تاریخ بہت دلچسپ ہے۔

جہاں تک ہمیں معلوم ہے یہ کہہ زمین جس پر ہم آباد ہیں شروع شروع میں شعلہ باران سے
کا ایک بہت بڑا گولا تھا جو فضا کے ناپید انار سمندر میں دھوئیں کے ایک ننھے سے بادل کی
مانند اڑتا تھا۔ رفتہ رفتہ کئی سال بعد جب زمین کی سطح جل چکی تو اس پر چٹانوں کی ایک ہلکی
سی تہ نمودار ہوئی ان بنجر چٹانوں پر موسلا دھار مینہ برسنا سخت پتھر بارش کے پانی میں تحلیل ہو
گئے اور گلا پانی ان وادیوں میں بہہ نکلا جو گرم گرم زمین کی اوپھی اور پھی پہاڑیوں کے درمیان
پھسی ہوئی تھیں۔

آخر ایک ایسا زمانہ آیا جب سورج نے بادلوں میں سے اپنا چہرہ نکالا اور دیکھا کہ اس
ننھے سے کترے کی سطح پر پانی کے چند تالاب سے بن گئے ہیں۔ یہی تالاب بعد میں مشرقی
اور مغربی نصف کرہوں کے عظیم الشان سمندر بن گئے۔

پھر ایک دن ایک جیت انگیز معجزہ نمودار ہوا۔ اسے جاننے والوں نے جاندار چیزوں کو جنم دیا۔
پہلا جاندار ذرہ سمندر کی سطح پر نمودار ہوا۔

کئی سال تک یہ دتہ پانی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ بہتا رہا۔ اس عرصے میں رفتہ رفتہ زمین
کے ناموافق حالات سے مانوس ہوتا گیا اور بالآخر زندگی کی مشکلات پر قابو پایا۔ بعض ذرے
ایسے بھی تھے جو جھیلوں اور جوہڑوں کی تاریک گہرائیوں ہی میں خوش رہتے تھے۔ بہت
سی مٹی اور کچھ پتھر پہاڑیوں کی چوٹیوں سے بہہ کر نیچے آگئی تھی اس میں جڑیں پکڑ لیں اور پوٹے
بن گئے بعض نے کسی جگہ ٹھہرنا پسند نہ کیا یونہی بڑھتا ہوا ہر گھومنے رہے۔ ان کے جسم میں نئے پھوڑوں
کی سی عجیب و غریب جوڑ دار ٹانگیں نمودار ہوئیں اور وہ سمندر کی تہ میں پودوں اور ان بنری

، لہذا لوگوں کے درمیان جو جلی پھلیوں سے مشابہ تھے۔ رنگنے لگے بعض چمکوں والے
زندے ایسے بھی تھے جنہیں خوراک کی تلاش میں ادھر ادھر تیرنا پڑا۔ ان کی بدولت سمندر رفتہ
رفتہ کروڑوں پھلیوں سے آباد ہو گیا۔

اس عرصے میں پودوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ انہیں سہنے کے لئے نئی نئی جگہیں تلاش
کرنی پڑیں۔ طوعاً و کرہاً پانی کو اودار کھا اود پھاڑوں کے دامن میں کچھڑا اود دلدلوں کے اندر
سکونت اختیار کر لی۔ دن میں دو دفعہ جوار بھلے کی وجہ سے نمکین سمندر کی لہروں سے ہم
آغوش ہوتے لیکن تمام وقت بڑی بے چینی سے کھٹتے اور رقیق ہوا میں جو زمین کی
سطح کو لپیٹی ہوئی تھی۔ زندہ رہنے کی کوشش کرتے۔ کئی صدیوں کی تربیت کے بعد اس قابل
ہوئے کہ جس طرح پہلے پانی میں سہتے تھے ایسی آسانی کے ساتھ اب ہوا میں سہنے لگے۔
بڑے ہوتے تو جھاڑیاں اور درخت بنے اور آخر کار خوب صورت پھول پیدا کرنا سیکھا جب
پھول اُگے تو بھونرے آکھڑے چوستے لگے۔ پھر اندر دور دور تک بیج اٹا کر لے گئے۔
یہاں تک کہ سب زمین پر سبزے نے اپنی چادر بچھادی اور بڑے بڑے درختوں نے اپنے
ساتھ پھیلا دیئے۔

بعض پھلیوں نے بھی سمندر سے باہر قدم رکھا اور گلپھڑوں کی بجائے پھیمپھڑوں سے
سانس لینا سیکھا۔ ایسے جانوروں کو خاکا بنی کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خشکی اور تری
دونوں جگہ آسانی سے زندہ رہ سکتے ہیں۔ کسی مینڈک سے پوچھو تو وہ تمہیں بتائے گا کہ خاکا بنی
جانور کس مزے سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

جب ایک دفعہ پانی سے باہر نکل آئے تو یہ جانور رفتہ رفتہ خشکی ہی کے ہورہے۔
بعض نے رنگنا سیکھا اور سنان جگہوں میں کیرے مکوڑوں کے ساتھ رہنے لگے۔ نرم نرم
زمین پر تیزی سے چلنے کی خواہش پیدا ہوئی اور رفتہ رفتہ ٹانگیں بڑی ہو گئیں۔ ساتھ ہی حمایت
بھی بہت بڑھ گئی۔ چنانچہ دنیا بڑے جانوروں سے آباد ہو گئی۔ علم حیوانات کی کتابوں میں

اختیار سورس (JEHTHYOSAURUS) میگلا سورس (MEGALOSAURUS) اور برانتو سورس (BRANTOSAURUS) نامی جانوروں کا ذکر آتا ہے جو تیس تیس چالیس چالیس فٹ لمبے تھے اور ہاتھوں سے اس طرح کیل سکتے تھے جس طرح تلی اپنے بچوں سے کھلتی ہے۔ ان ریگنے والے جانوروں میں سے بعض جانور درختوں پر جا چڑھے اور وہیں رہنے لگے (درخت ان دنوں سوٹ سے زیادہ اونچے نہ تھے) چلنا پھرنا موقوف ہو گیا تو ٹانگوں کی بھی ضرورت نہ رہی۔ لیکن ایک شاخ سے دوسری شاخ تک پھرتی سے حرکت کرنے کے لئے اپنی جلد کی جھلی سی بناتی اور اسے اگلے پاؤں کی انگلیوں کے درمیان اس ٹانگ سے اس ٹانگ تک پتنگ کی طرح پھیلا لیا۔ پھر اس جھلی پر پرے اگتے۔ دم سے مڑنے تڑنے کا کام لیا۔ ڈال ڈال اڑنے لگے اور پچ پچ کے پرندے بن گئے۔

اس کے بعد ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ بڑے عظیم الجثہ ریگنے والے جانور سب کے سب مر گئے اس کا سبب آج تک معلوم نہیں ہو سکا۔ شاید آب و ہوا ایک سخت تبدیل ہو گئی۔ یا شاید بھوک کے مارے مر گئے کیونکہ بہت ممکن ہے وہ اتنے بڑے ہو گئے ہوں کہ نہ تیرنے کے قابل رہے ہوں نہ چلنے کے نہ ریگنے کے اور بڑے بڑے پودے اور درخت سامنے دکھائی دے رہے ہوں لیکن وہ ان تک پہنچ نہ سکتے ہوں۔ لیکن وہ ان تک پہنچ نہ سکتے ہوں بہر حال بڑے بڑے ریگنے والے جانور دس لاکھ سال تک اس دنیا پر مسلط رہے اور پھر یہاں سے چل بسے۔

ان کی جگہ بالکل ہی مختلف جانوروں نے لے لی۔ یہ اولاد تو انہی ریگنے والے جانوروں کی تھی لیکن ان میں بڑا فرق یہ تھا کہ اپنے بچوں کو چھاتیوں کا دودھ پلاتے تھے اس لئے انہیں دودھ پلانے والے جانور کہتے ہیں۔ پھلیوں کے سے پران کے جھڑھلے تھے۔ پرندوں کے سے پرے اختیار نہ کئے۔ ان کی بجائے بال اگ آئے۔ ان دودھ پلانے والے جانوروں نے بعض ایسی عادت سیکھ لیں جن کی بدولت ان کی نسل کو باقی تمام جانوروں پر فوقیت حاصل

ہوگئی۔ جب تک بچے پیدا نہ ہو جاتے۔ مادہ اپنے انڈے جسم کے اندر ہی اٹھائے اٹھائے پھرتی باقی سب جانور تو اپنے بچوں کو گرنی اور سردی کے رحم پر بھڑکتے ہیں لیکن دودھ پلانے والے جانور بہت مدت تک اپنے بچوں کو ساتھ رکھتے اور جب تک وہ طاقت ور ہو کر دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ ہو جائیں خود ان کی حفاظت کرتے اس طرح دودھ پلانے والے جانوروں کے بچے کئی باتیں اپنی ماں سے سیکھ لیتے اور زیادہ آسانی سے زندہ رہ سکتے۔ کسی بلی کو دیکھو کس طرح بچوں کو اپنی حفاظت کرنا اور منہ دھونا اور چوسے پکڑنا سکھاتی ہے۔

لیکن ان دودھ پلانے والے جانوروں کے حالات بہت تفصیل کے ساتھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ تم انہیں اچھی طرح جانتے ہو وہ تمہارے ارد گرد ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ بازار میں اور گھر پر وہ تمہارے ساتھ رہتے ہیں اور جواتے عام نہیں انہیں تم پر یا خانے میں جا کر دیکھ سکتے ہو۔ ان بے شمار بے زبان جانوروں میں سے ایک جانور نے باقی سب سے الگ اپنے لئے ایک رستہ نکالا۔ عقل و شعور سے کام لیا اور اس کی بدولت زندگی کی کشمکش میں اپنی نسل کی رہنمائی کی۔ یہ جانور "انسان" کہلایا۔

تھالوزہ بھی دودھ پلانے والا جانور لیکن خوراک ہیا کرنے اور جان بچانے میں سب سے ہوشیار تھا۔ پہلے اگلی ٹانگوں سے شکار پکڑنے کی عادت ڈالی۔ ہوتے ہوتے پنجے کی شکل ہاتھ کی سی بن گئی۔ پھر بے انتہا کوششوں کے بعد پھلی ٹانگوں پر کھڑا ہونا سیکھا یہ کہ تب اب بھی کچھ ایسا آسان نہیں۔ انسان دس لاکھ سال سے اس کا عادی ہے پھر بھی بچے کو یہ اندر نہ سیکھنا پڑتا ہے)

یہ جانور دیکھنے میں کچھ بندرا کچھ بن مانس سے ملتا جلتا تھا لیکن ذہانت میں دونوں سے بڑھ کر تھا۔ شکار میں کوئی اس کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ ہر قسم کی آب و ہوا میں رہ لیتا تھا ایک مقام سے دوسرے مقام تک جاتا تو حفاظت کی خاطر ہم جنسوں کی ایک ٹولی بنا کر سفر کرتا۔ بچوں کو خطرے سے آگاہ کرنے کے لئے عجیب و غریب آوازیں نکالتا۔ کئی لاکھ سال بعد

اسی آوازوں سے گفتگو کرنا سیکھا۔

تمہیں یقین تو مشکل سے آئے گا کہ ہم تم سب اسی جانور کی اولاد ہیں۔ لیکن حقیقت

یہی ہے۔

وہ سچ جو کبھی جھوٹ نہ ہوگا

میں انسانی زندگی کی الجھنوں پر جس قدر غور کرتا ہوں اتنا ہی مجھ پر روشن تر ہوتا جاتا ہے۔
کہ جس طرح قدیم مصر کے لوگ بخشش اور نجات کے لئے آئیس اور نیفینس کا دامن پکڑتے
تھے، اسی طرح ہمیں اپنی مشکلات کے حل کے لئے طنز اور رم کا دامن پکڑنا پڑتا ہے۔

طنز اور رم سے بڑھ کر کوئی چیز ہماری مشکل کشا نہیں ہو سکی۔ طنز سے زندگی کے ہونٹوں

پر مسکراہٹ پیدا ہوتی ہے اور رم اپنے آنسوؤں سے زندگی کو مقدس بناتا ہے۔

جس طنز کو میں اپنا دیوتا بنانا چاہتا ہوں وہ کوئی سنگدل دیوتا نہیں۔ وہ محبت اور

حسن کا مضحکہ نہیں اٹاتا وہ حلیم اور مہربان دیوتا ہے اس کا تبسم دشمنوں کو بھی دوست بنا لیتا

ہے اور وہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ احمقوں اور ظالموں پر ہنسنا۔ ان سے نفرت مت کرو۔ کیوں کہ

یہ کمزوری کی نشانی ہے۔

ایک مہت بڑے فرانسیسی کے ان دانش مندانہ الفاظ میں اس کتاب کو ختم کرتے ہیں

اور رخصت چاہتا ہوں۔ خدا حافظ

ماخذ کتاب "نوع انسان کی کہانی" مصنف ہنڈرک فان لون

مترجمہ پطرس

بچے کا پہلا سال

ایک زمانہ ایسا تھا کہ لوگ بچے کی عمر کے پہلے سال کو تعلیم کے دائرے سے خارج سمجھتے تھے۔ جب تک بچہ کم از کم بولنا شروع نہ کرتا۔ اسے صرف ماں یا دادیہ کی زیر نگرانی رکھا جاتا تھا۔ اور یہ فرض کر لیا جاتا تھا کہ وہ فطرتاً ہی بچے کے نیک و بد کو ایسی اچھی طرح سمجھتی ہیں کہ انہیں سکھانے کی ضرورت نہیں لیکن فی الحقیقت لوگوں کا یہ خیال غلط تھا۔ اکثر بچے سال بھر کے بھی نہ ہونے پائے کہ مر جاتے اور جو زندہ رہتے ان میں سے کئی ایک کی صحت ہمیشہ کے لئے خراب ہو جاتی۔ غلط تربیت کی وجہ سے خطرناک ذہنی عادات کی بنیاد پہلے ہی پڑ جاتی۔ یہ حقیقت حال ہی میں معلوم ہوئی ہے۔

دراصل بات یہ ہے کہ اکثر لوگ شیر خوار بچوں کی پرورش کے معاملے میں سائنس کا دخل پسند نہیں کرتے۔ کیونکہ اس سے ماں کی ممانا اور بچے کے لٹلے پن کا جو دلاویز تصور ان کے ذہن میں موجود ہے اسے صدمہ پہنچتا ہے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ اندھا دھند طبیعت اور لاڈلپن اور چیزیں ہیں۔ اصل محبت اور چیز ہے جن والدین کو اپنے بچوں سے سچی اور اصلی محبت ہے۔ وہ ان کی تربیت کے لئے سائنس کے اصولوں پر عمل کرنے سے نہیں گھبراتے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ضرر دہاں قسم کی محبت انہی لوگوں میں سب سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ جن کے کوئی اولاد نہیں ہوتی۔ یا جو (روسو کی مانند) اپنے بچوں کو کسی یتیم خانے کے حوالے کر دینا چاہتے ہیں اکثر تعلیم یافتہ والدین سائنس کی معلومات سے متفرغ ہونے کی بجائے استفادہ کرتے ہیں

نہ صرف یہ بلکہ ان پرٹھ لوگوں میں بھی سانس کا پھر چاروں روز بروز برطقتا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ بچوں کی اموات روز بروز کم ہوتی جاتی ہیں۔ اگر لوگ پوری امتیاط سے کام لیں تو نہ صرف اموات کی تعداد اور بھی کم ہو جائے گی بلکہ جو بچے زندہ رہیں گے ان کی دماغی اور جسمانی حالت بہت بہتر ہوگی۔

جسمانی صحت کے ماہر ڈاکٹر لوگ ہیں وہی ان مسائل کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہ مسائل اس کتاب کے دائرے سے خارج ہیں۔ لیکن ہم یہاں جسمانی صحت کے مسائل پر اسی حد تک بحث کریں گے۔ جس حد تک ان کا تعلق ذہنی یا نفسیاتی زندگی سے ہے اور ان پر اس وقت بحث کرنا یوں ضروری ہے کہ اول تو عمر کے پہلے سال میں جسمانی زندگی اور ذہنی زندگی میں تیز کرنا مشکل ہوتا ہے دوسرے اگر شروع میں بچے کے جسم کا کا حقہ خیال نہ رکھا جائے تو چند ایسے نقائص کے پیدا ہونے کا احتمال رہتا ہے جو بڑے ہو کر تعلیم کے رستے میں حارج ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ہر چند کہ جسمانی صحت پر بحث کرنا ڈاکٹروں ہی کا حصہ ہے تاہم اس موقع پر ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے متعلق کچھ عرض کریں۔

نوزائیدہ بچہ کسی چیز کا عادی نہیں ہوتا۔ اس کی تمام حرکات کسی عادت کی وجہ سے نہیں بلکہ اضطراراً سرزد ہوتی ہیں۔ اگر ماں کے پیٹ میں اس نے بعض عادتیں اختیار کر لی ہیں۔ تو وہ کم از کم ایسی نہیں کہ پیدا ہونے کے بعد بھی اس کے کام آسکیں۔ یہاں تک کہ۔ "تس لینا بھی اسے پیدائش کے بعد سیکنا پڑتا ہے اور بعض بچے تو مر ہی اسی لئے جلتے ہیں۔" تنفس کا عمل دیر میں سیکھتے ہیں۔ ایک زبردست خواہش بچہ فطرت کی طرف سے اپنے ساتھ لاتا ہے اور وہ چوسنے کی خواہش ہے جب تک بچہ اس عمل میں مصروف ہے بہت خوش رہتا ہے۔ باقی تمام وقت وہ ایک تھکر کے عالم میں گزارتا ہے جس سے یوں نجات حاصل ہوتی ہے کہ دن اور رات کا بیشتر حصہ نیند میں گزار جاتا ہے۔ پندرہ دن کے بعد یہ حالت بدل جاتی ہے اور بعض باتیں مثلاً دودھ پینا وغیرہ (تو اس کے ساتھ ٹھوس میں آنے لگتی ہیں اس لئے بچہ ان باتوں کا متوقع رہتا ہے۔

یعنی یوں کہنے کا اب وہ بعض چیزوں کا مادی ہو جاتا ہے اور جن باتوں کا مادی ہوا نہیں کو پسند کرتا ہے۔ گویا قدامت پسند بن جاتا ہے اور قدامت پسند بھی ایسا کہ اغلباً پھر عمر بھر ایسا نہیں ہوتا ہر نئی چیز اسے نا پسند ہوتی ہے اگرچہ بچہ اس عمر میں بولنے کے قابل ہوتا تو بڑے بوڑھوں کی طرح اپنی پسند یہ گی کا اظہار ان الفاظ میں کرتا کہ میاں جانے دو اس عمر میں اب ہم بچہ نئی نئی باتیں کیوں کر سیکھ سکتے ہیں۔ تاہم شیرخوار بچے نئی مادیوں بہت جلد اختیار کر لیتے ہیں۔ اس دوران میں اگر کوئی بری عادت سیکھ لیں تو وہ بعد میں اچھی تربیت کے رستے میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں۔ اس لئے شیرخوار کے زمانے کی عادات کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے۔ اگر شروع شروع کی عادات اچھی ہوں تو بہت سہولت ہوتی ہے علاوہ برائے شیر خوارگی کے زمانے کی عادت اتنی راسخ ہوتی ہے کہ بڑے ہو کر وہ بالکل جبلت معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے اعمال پر اس کا اثر بہت گہرا ہوتا ہے جو عادات بعد میں سیکھی جائیں ان میں وہ سختی کبھی نہیں ہوتی۔ اس لئے زمانہ طفلی کی عادات خاص طور پر توجہ کی مستحق ہیں۔

اس سلسلے میں دو باتیں پیش نظر رکھنی چاہئیں۔ اول اور سب سے مقدم صحت، دوم سیرت۔ ہم چاہتے ہیں کہ بچہ بڑا ہو کر ایک ایسا انسان ثابت ہو جس کے اوصاف پسندیدہ ہوں۔ اور جو اپنے گمراہی سے بوجہ احسن عمدہ بنا ہو سکے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ صحت اور سیرت دونوں کے مطالبات ایک ہیں۔ جو چیز ایک کے لئے مفید ہے وہی دوسرے کے لئے مفید ہے۔ یہاں سیرت سے ہے لیکن جو اصول ہم سیرت کی بہتری کے لئے وضع کریں گے۔ وہی صحت کے لئے بھی مفید ہیں گویا یہ نہیں ہو سکتا کہ بچہ تو مند تو ہو اس کے افلاق بڑے ہوں۔ یا نیک سیرت تو ہو لیکن اس کا جسم امراض کا شکار ہو۔

آج کل ہر تعلیم یافتہ جانتی ہے کہ بچے کو صرف مقررہ اوقات پر دودھ پلانا چاہئے اس سے بچے کا ہضم دست رہتا ہے۔ بچے کے خفا ایک نہایت معقول وجہ ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اخلاقی نقطہ نظر سے بھی یہ بہت مفید ہے۔ شیرخوار بچہ اتنا بے عقل نہیں ہوتا جتنا

ہم اسے سمجھتے ہیں اسے ایک دفعہ یقین ہو جائے کہ رونے سے مطلب نکل آتا ہے تو وہ مزور
 رہتا ہے لیکن جب بڑا ہو کر اسی عادت کے ذریعہ اثر وہ ہر وقت مدنی صورت بنا کر لوگوں سے
 گلے شکوے کرتا رہتا ہے تو لوگ اسے چکانے کی بجائے اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ لڑکوں
 کا یہ سلوک اسے از حد ناگوار گزرتا ہے اور وہ دنیا کو خود غرض اور ہمدردی کے جذبہ سے
 معرا سمجھ لیتا ہے اگر لڑکی ہو اور بڑی ہو کر خدا سے حسین بنا کے توبے یا توجہات اور بے جا
 خاطر مدارات کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور یہ نقص اور بھی مستحکم ہو جاتا ہے۔ یہی حال دولت مند
 لڑکوں کا ہوتا ہے کہ بچپن میں بگڑ جاتے ہیں تو پھر تمام عمر بگڑتے چلے جاتے ہیں جس شخص کی پیش
 شیر خوارگی کے زمانے میں غلط طریقے پر ہو وہ بڑا ہو کر اگر ذی اقتدار ہے تو مندی بعد مرہیں
 ہوتا ہے اور اگر بے بضاحت ہے تو لوگوں کی مفروضہ توجہی سے کہ ہتھارت ہتا ہے اس
 لئے اخلاقی تعلیم روز اول ہی سے شروع کر دینی چاہیے تاکہ نہ غلط توقعات پیدا ہوں۔ نہ بعد میں
 انہیں مجروح ہونا پڑے۔ اگر شروع میں اس کا تدارک نہ کیا جائے تو بعد میں بچے کی خواہشات
 کو ٹھکرانے سے اس کے دل میں غم اور رنج کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔

گویا بچے کی تربیت اس طرح کرنی چاہیے کہ نہ تو اسے لاڈ پیار اور چاؤ چو پنچلوں سے
 بگاڑا جائے نہ اس کی طرف سے بالکل ہی ہے توجہی برتی جائے مثلاً جو بہت صحت کے لئے
 ضروری ہے اس میں کوتاہی نہ کرنی چاہیے۔ بچے کو ہوا اور بارش سے تکلیف پہنچ رہی ہو تو
 اسے اٹھالینا چاہیے۔ تاکہ اسے سردی نہ لگے اور وہ بھیگ نہ جائے لیکن اگر بچہ بغیر کسی جسمانی
 تکلیف کے رونا شروع کرے تو اسے روٹنے دینا چاہیے ورنہ وہ بے جا خدمت کرانے
 کا عادی ہو جائے گا۔ جب اس کی دیکھ بھال کی جائے تو بہت زیادہ چاؤ اور ہتھام کرنا فصل
 بلکہ مضر ہے جو بات مناسب ہو وہ کر دینی چاہیے اور مزورت سے زیادہ پیار محبت اور ہمدردی
 کا اظہار نہ کرنا چاہیے۔ بچوں کی پرورش چاؤ چو پنچلوں سے نہیں بلکہ مسانت اور سنجیدگی سے
 کرنی چاہیے۔ گویا وہ بچہ نہیں بلکہ بڑی عمر کا انسان ہے۔

بچوں میں بڑوں کی سی عادتیں تو پیدا نہیں ہو سکتیں۔ لیکن ہمیں یہ خیال ضرور رکھنا چاہیے کہ کوئی ایسی بات نہ ہونے پڑے جو ان کی عادات کے مدتے میں رکاوٹ ثابت ہو۔ مدعا یہ کہ بچہ مزاج دار نہ بن جائے۔ ورنہ بعد میں اسے سخت مایوسی کا سامنا ہوگا اور یوں دیکھتے تو وہ خود بھی اس قابل نہیں کہ اس میں اس قدر اہمیت کا احساس پیدا کیا جائے۔

بچوں کی پرورش میں سب سے مشکل بات یہ ہے کہ والدین کو غفلت اور لاڈ کے بین بین رہنا پڑتا ہے بچے کی صحت کو درست رکھنے کے لئے ہر وقت اس کی نگہداشت کرنی پڑتی ہے اور اس کی خاطر بڑی بڑی مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں اس کے لئے ضروری ہے کہ والدین کو بچے سے بہت زیادہ الفت ہو لیکن مصیبت یہ ہے کہ جہاں والدین کو محبت زیادہ ہوتی ہے وہاں اکثر ان کی عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ جن والدین کو اپنے بچوں سے بہت محبت ہے ان کے نزدیک اولاد کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے اگر احتیاط نہ برتی جائے تو بچہ بھی اس بات کو محسوس کرتے لگتا ہے اور جتنا اہم اسے والدین سمجھتے ہیں اتنا ہی اہم وہ بھی اپنے آپ کو سمجھتا ہے جب اسے خود بینی کی عادت پڑ جاتی ہے اور بڑے ہو کر لوگ والدین کی طرح اس کی خوشامد و نام نہنیں کرتے تو اسے مایوس ہونا پڑتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ نہ صرف پہلے سال بلکہ بعد میں بھی جب کبھی بچہ بیمار ہو والدین خذہ پیشانی اور بگاہرے فکری کے ساتھ اس کا علاج کریں اور بات کا بتنگڑ نہ بنائیں۔

پرانے زمانے میں بچوں کو جکڑ کر بھی بہت رکھا جاتا تھا اور ان سے لاڈ بہت کیا جاتا تھا۔ ان کے اعضاء کو حرکت کرنے کا موقع نہ دیا جاتا تھا۔ کپڑے ضرورت سے زیادہ گرم ہوتے تھے۔ فطری حرکت پر پابندیاں عائد کی جاتی تھیں۔ لیکن ساتھ ہی ان کو ہر وقت گود میں اٹھائے اٹھاتے پھرتے تھے ان کے سامنے گانے گاتے پھرتے تھے اور انہیں چوبیس گھنٹے چوما پائی کا تھوڑا سا مشق بنانے رکھتے تھے۔ یہ بہت غلط طریقہ تھا۔ اس سے بچے جکڑ جاتے تھے اور ہر وقت ملل باپ کے گلے کا بار بن رہتے تھے۔ صحیح

اصول یہ ہے کہ نچکے کی فطری حرکات و خواہشات پر پابندیاں عائد کیجئے نہ اسے ان سے تجاوز کرنے دیجئے۔ نچکے کے لئے آپ جو تکلیف اٹھاتے ہیں اس سے نچکے کو بے خبر رہنا چاہئے خدمت کرانے کا چسکا اسے نہ پڑنے دیجئے جہاں تک ممکن ہو ایسی کامیابی کا لطف اسے ضرور اٹھانے دیجئے جو خود اس کی اپنی کوشش کا نتیجہ ہو۔ جدید تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے نچکے کو خارجی قواعد و منوالطہ کی ملامتی سے آزاد کیا جائے۔ لیکن اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ خود نچکے کے دل میں انضباط کا احساس پیدا کیا جائے اور اس احساس کا پیدا کرنا عمر کے پہلے سال میں نسبتاً آسان ہوتا ہے مثلاً جب نچکے کو سنانا ہو تو اسے گود میں نہ لینا چاہیے، بازوؤں میں تھام کر سو جا سو جا، نہ کرنا چاہیے بلکہ اس کے پاس تک نہ ٹھہرنا چاہیے۔ اگر آپ ایک مرتبہ یوں کریں گے۔ تو بچہ دوسری مرتبہ بھی یہی چاہے گا اور تھوڑے عرصہ میں بچہ کا سنانا ایک محیبت بن جائے گا نچکے کو اڑھا لپیٹا کر بستر میں سلا دینا چاہیے اور ایک دو باتیں کر کے اسے اکیلا چھوڑ دینا چاہیے۔ ممکن ہے وہ چند منٹ تک روتا رہے لیکن اگر وہ بیمار نہیں تو تھوڑی دیر میں خود بہ خود چپ ہو جائے گا۔ اس کے بعد جا کر نیکے تو مزے کی نیند سو رہا ہوگا۔ لاڈ پیار سے ایک تو اس کی سیرت بگڑ جائے گی۔ دوسرے وہ سوتے گا بھی کم۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ نوزائیدہ بچہ ماں کے پیٹ سے کوئی عادت ساتھ نہیں لاتا اس کی عادات فطری اور اضطراری ہوتی ہیں چنانچہ اسے اشیا رکا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ اشیا رکے احساس کے لئے یہ ضروری ہے کہ بچہ اشیا کو پہچانے اور اشیا کو پہچاننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اشیا کا بار بار تجربہ ہو۔ سو وہ رفتہ رفتہ ہی حاصل ہوتا ہے پیدائش کے تھوڑے عرصہ بعد بچہ پنگوڑے کے مس امل کی چھاتی یا دودھ کی بوتل کے مس اور خوشبو اور ماں یا انا کی آواز سے نوس ہو جاتا ہے۔ ماں یا پنگوڑے کو دیکھنے کی قابلیت بعد میں پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ نوزائیدہ نچکے کی آنکھیں ابھی اس قابل نہیں ہوتیں کہ وہ اشیا کی

شکلوں کو واضح طور پر دیکھ سکے۔ جب رفتہ رفتہ مختلف احساسات کے اختلاف سے بچے کے ذہن میں عادات وضع ہو جاتی ہیں تو مس اور بو اور نظر کی عادت ذہن میں اشیاء کے تصورات شکل پذیر ہونے لگتے ہیں۔ خاص خاص احساسات اس کے دل میں خاص خاص اشیاء کی توقعات پیدا کرتے ہیں۔ ردوبد کی بو آتی ہے تو چھاتی یا بوتل کے مس کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ ماں کی آواز آتی ہے تو ماں کی شکل دیکھے کا منظر ہو سکتا ہے وغیرہ وغیرہ) تاہم کچھ عرصے تک اشخاص اور اشیاء میں تیز نہیں کر سکتا جس بچے کو کبھی بوتل کا دھواور کبھی چھاتی کا دودھ پلایا جائے۔ اس کے نزدیک کچھ عرصے تک ماں اور بوتل ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں اس تمام عرصے کے بعد ان میں تغیر کا ذریعہ محض جسمانی ہونا چاہیے۔ بچے کی تمام سرسری (جو زیادہ تر گرمی اور خوراک تک محدود ہوتی ہیں) احساس کے تمام دکھ جسمانی ہوتے ہیں۔ اس کے افعال اور اس کی عادات یوں شکل پذیر ہوتی ہیں کہ جو چیز اس کے ذہن میں مسرت سے تعلق رکھتی ہے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے جو دکھ سے متعلق ہو اس سے گریز کرتا ہے۔

بچے کا رونانا ایک مدت تک تو ایک اضطرابی حرکت ہے جو دکھ کی وجہ سے ظہور میں آتی ہے اور ایک مدت تک ایک ارادی فعل ہے جو بچہ مسرت حاصل کرنے کے لئے اختیار کرتا ہے۔ شروع شروع میں وہ محض دکھ کی وجہ سے روتا ہے لیکن جب اس دکھ کو دور کیا جائے جیسا کہ کیا جاتا ہے) تو بچے کے دل میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ رونے کے نتائج خوشگوار ہوتے ہیں۔ چنانچہ رفتہ رفتہ بچے کو یہ عادت ہو جاتی ہے کہ نہ صرف دکھ دور کرنے کے لئے روتا ہے بلکہ مسرت حاصل کرنے کے لئے بھی اس حربے کو کام میں لاتا ہے یہ اس کی ذہانت کی پہلی فتح ہوتی ہے۔ لیکن باوجود بے انتہا کوشش کے جب تک اسے دکھ نہ پہنچ رہا ہو۔ وہ ویسا نہیں رو سکتا جیسا دکھ کے وقت روتا ہے۔ ہوقیاساً اس قسم کے لئے اور اس قسم کے لئے میں بخوبی تیز کر سکتی ہے۔ عقلمندی بھی ہے کہ جب بچہ کا رونانا دکھ کا رونا ہو تو اس پر بالکل توجہ نہ کی جائے۔ بچے کو لئے پھرنا اور اس سے کھلتے رہنا یا اس کے سامنے گانے گانا آسان بھی ہے اور پُر لطف بھی۔ لیکن بہت

جلد بچہ اس قسم کی تفریح کا عادی ہو جاتا ہے جو اس کی زندگی میں عمل نماز ہوتی ہے۔ شیر خوار بچے کا بیشتر وقت (سوائے دو چھینے کے اوقات کے) نیند میں گزرتا چاہیے۔ ممکن ہے کہ بعض والدین کو یہ باتیں صحت معلوم ہوں لیکن تجربے سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ بچے کی صحت اور خوشی کے لئے یہ باتیں بہت مفید ہیں۔

بچے کے لئے جو تفریحات والدین مہیا کرتے ہیں ان کو تو ایک خاص حد کے اندر رکھنا چاہئے لیکن جو تفریحات وہ خود اپنے لئے پیدا کر سکیں ان کو ترقی دینے کی کوشش کرنی چاہیے۔ شروع ہی سے اسے اس بات کا موقع دینا چاہیے کہ وہ آزادی سے ہاتھ پاؤں ہلا سکے اور اپنے اہماب کو کام میں لاسکے۔ پرانے زمانے سے لوگ بچوں کو باندھ کر رکھا کرتے تھے اس کی وجہ سستی کے سوا اور کچھ نہ تھی کیونکہ جن بچوں کو کھلا رکھا جائے۔ ان کی نگہداشت زیادہ کرنی پڑتی ہے۔ جیت ہے کہ ان لوگوں کی مامتا بھی ان کی سستی پر غالب نہ آسکتی تھی۔ جب بچے کی نظر ٹھیک ہو جاتی ہے۔ تو وہ متحرک چہروں کو خصوصاً جو ہوا سے ہل رہی ہوں دیکھ کر خوش ہوتا ہے لیکن پھر بھی جب تک وہ اشیاء کو پکڑنا نہ سیکھے اس کی دلچسپیوں کا دائرہ بہت محدود رہتا ہے جب پکڑنا سیکھے۔ تو یہ دائرہ یک سمت وسیع ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصے تک محض گرفت ہی کی مشق اتنی مسرت انگیز ہوتی ہے کہ وہ گھنٹوں اس میں مشغول رہتا ہے جسے کاشوق بھی اسی زمانے میں پیدا ہوتا ہے۔ بھجنے کے زمانے سے ذرا پہلے وہ اپنے ہاتھ پاؤں کی انگلیوں پر قابو حاصل کرتا ہے۔ شروع شروع میں پاؤں کی انگلیوں کی حرکات محض منظر آری ہوتی ہیں۔ بعد میں یہ دریافت کرتا ہے کہ میں انہیں اپنی مرضی سے بھی ہلا سکتا ہوں اس احساس سے وہ اتنا خوش ہوتا ہے گویا بہت بڑی شکت حاصل کر لی ہے کیونکہ انگلیاں اب اجنبی نہیں رہتیں۔ بلکہ جسم کا جزو بن جاتی ہیں۔ اس کے بعد اگر بہت سی چیزیں بچے کے پاس ایسی ہوں جنہیں وہ پکڑ سکے تو اسے دل بہلا دے گا بیترساہل ہوتا ہوتا ہے۔ بچے کو تفریح بھی ایسی ہی حرکات سے ہوتی ہے۔ جو تعلیم کے نقطہ نظر سے مفید ہیں البتہ کہ جانے یا چوٹ لگ جانے یا کسی تکلیف دہ چیز مثلاً پن یا سلاخی کے

ننگے سے اسے بچانا فریضہ ہے۔

پہلے تین مہینے کے عرصے میں بچہ دودھ پیتے وقت تو بہت خوش ہوتا ہے لیکن باقی تمام وقت اس کی طبیعت اکتائی رہتی ہے جب وہ مہرے میں ہو تو سو جاتا ہے جاگ رہا ہو تو کوئی نہ کوئی بے چینی اسے ضرور رہتی ہے انسان کی خوشی کا انحصار اس کی ذہنی قابلیت پر ہے لیکن تین مہینے سے کم عمر کے بچے کو نہ تو کسی چیز کا کافی تجربہ ہوتا ہے نہ وہ اپنے اعصاب پر قادر ہوتا ہے اس نئے مسرتوں سے محروم رہتا ہے۔ جانوروں کے بچے نسبتاً بہت جلد زندگی سے لطف اٹھانے کے قابل ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کی مستری فطری ہوتی ہیں مادہ تجربے پر منحصر نہیں ہوتیں۔ انسان کا بچہ اگر محض جبلت پر تکیہ کرے تو اس کی خوشیوں اور دلچسپیوں کا حلقہ تنگ رہتا ہے۔ بچہ اپنی عمر کے پہلے تین مہینے عام طور پر اکتایا رہتا ہے اس اکتائے رہنے میں بھی حکمت ہے۔ اس سے نیند پوری طرح آتی ہے۔ اگر بچے کو بہت زیادہ بہلایا جائے تو وہ سوتا کم ہے۔

جب بچہ دو تین مہینے کا ہو جاتا ہے تو مسکرا کر انا سیکھتا ہے اور اشخاص کے متعلق اس کے جذبات اشیاء سے میتر ہونے لگتے ہیں اس عمر کو پہنچ کر ماں اور بچے میں سوشل تعلقات کا امکان شروع ہو جاتا ہے۔ بچہ ماں کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کر سکتا ہے اور کرتا ہے اور نہ سردست جانوروں کی مانند جلد اور طرح سے متاثر ہوتا ہے۔ تھوڑے عرصے کے بعد تجھیں و تعریف کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ میرے اپنے بچے میں اس خواہش کے واضح آثار پانچ مہینے کی عمر میں ظہور ہوتے ہیں پریک و زنی گھنٹی پڑی تھی۔ بڑی مشکوں سے اس نے اسے اٹھایا اور اٹھا کر سجایا اور فخر یہ مسکرا کر سب کو ہر سی باری دیکھنے لگا۔ جب یہ خواہش پیدا ہو جائے تو گویا ایک زبردست حربہ معلم کے ہاتھ آ جاتا ہے۔ یہ حربہ تعریف اور ملامت کا حربہ ہے۔ بچوں کے تمام تر زلمے میں اس سے بڑا کام لیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس حربے کو از مدعا احتیاط کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے۔ عمر کے پہلے سال میں بچے کی مذمت بالکل نہ کرنی چاہیے۔ بعد میں بھی اس سے بہت حد تک احتراز واجب ہے۔ تعریف نسبتاً کم مضر ہوتی ہے لیکن تعریف نہ تو اس فراخ دلی سے کرنی

چاہیے کہ اس کی قدہ ہی جاتی رہے اور نہ اس نخل کے ساتھ کہ بچے کو اس کے حاصل کرنے کے لئے بہت زیادہ زور لگانا پڑے۔ جب بچہ پہلی دفعہ قدم اٹھائے یا پہلی دفعہ الفاظ منہ سے نکالے تو کسی معقول شخص کو اس کی کارگزاری کو سرانجام دینے میں تامل نہ کرنا چاہیے۔ جب کبھی بچہ بہت سی کوششوں کے بعد کسی مشکل کو حل کرے تو اس کی تعریف ضرور کرنی چاہیے۔ بچے کو یہ احساس دلانا چاہیے کہ ہمیں اس کی خواہش اکتساب کے ساتھ ہمراہی ہے۔

عام طور پر بچے میں خواہش اکتساب اتنی زبردست ہوتی ہے کہ اس کے لئے بعض مواقع مہیا کر دینا ہی کافی ہوتا ہے۔ باقی سب کچھ وہ خود ہی کر لیتا ہے۔ مثلاً بچے کو گھٹنوں چلنے یا پاؤں پاؤں چلنے یا اسی طرح کی دیگر حرکات سکھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ باتیں کرنا البتہ خود بول کر اسے سکھاتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ بالاولاد وہ الفاظ سکھانے کی کوشش کرنا غیر ضروری ہے۔ بچے اپنی ترقی کی رفتار خود ہی معین کرتے ہیں۔ اسے تیز تر بنانے کی کوشش کرنا غلطی ہے۔ مرتد دم تک انسان کا یہ حال ہوتا ہے کہ مشکلیں پیش آتی ہیں۔ ان پر قابو پاتا ہے۔ اور اس سے مزید کوشش کے لئے حوصلہ بڑھاتا ہے۔ اس سے بہتر طریقہ شوق کے بڑھانے کا اور کوئی نہیں۔ مشکلات نہ اتنی زیادہ ہونی چاہئیں کہ کام کرنے کا شوق ہی مر جائے اور نہ اتنی کہ طبیعت کو اکسانہ سکیں ہم کچھ سیکھے اسی بات سے ہیں جو ہم خود کرتے ہیں۔ بڑوں کو صرف یہ کرنا چاہیے کہ ایک دفعہ بھنجانا ہا دیں اور پھر بچے کو چھوڑ دیں کہ وہ خود اس کی نقل تارنے کی کوشش کرے۔ جو کام دوسرے لوگ سرانجام دیں۔ وہ سمند شوق پر نازیلے کا کام کر سکتے ہیں۔ لیکن جب تک بچہ وہ کام خود نہ کرے اسے تعلیم نہیں کہا جاسکتا۔

باقاعدگی اور وقت کی پابندی شروع بچپن اور خصوصاً پہلے سالوں میں بہت ضروری ہیں۔ نیند، خوراک اور فرح حاجت کے لئے شروع ہی سے باقاعدگی کی عادت ڈالنی چاہیے۔ گرد و پیش کے حالات و واقعات کا مانوس ہونا ذہنی نقطہ نظر سے بہت ضروری ہے۔ اگر ایک بات باقاعدگی سے پیش آتی رہے تو بچے کو اس کے پہچاننے میں آسانی ہوتی ہے۔

ذہن پر ضرورت سے زیادہ زور نہیں ڈالنا پڑتا اور کچھ غموس کرتا ہے کہ میں محفوظ ہوں۔ کچھ کمزور اہلے بس ہوتا ہے۔ اسے تسکین کی ضرورت ہے اگر اسے یہ احساس پیدا ہو جائے کہ ہر بات باقاعدگی کے ساتھ ہوتی ہے اور کوئی نئی بات ایک لحنت اس کی زندگی میں حل نہیں ڈال سکتی تو وہ خوش رہتا ہے۔ ذرا عمر بڑھی ہوتی ہے تو نئی نئی باتوں کا شوق پیدا ہوتا ہے لیکن زندگی کے پہلے سال میں ہر نئی بات میں بچے کو ڈر غموس ہوتا ہے جس سے اسے جہاں تک ممکن ہو محفوظ رکھنا چاہیے۔

اگر بچہ بیمار ہو اور آپ متفکر، تو اپنا فکر حتی الامکان اس پر ظاہر نہ ہونے دیجئے۔ ورنہ وہ بھی متفکر ہو جائے گا۔ کوئی ایسی بات نہ کرنی چاہیے جس سے بچے کی طبیعت میں ہیجان پیدا ہو اگر بچے کو ٹھیک نیند نہ آئے یا اس کا پیٹ خراب ہو تو بچے کے سامنے بے پروائی ظاہر کرنی چاہیے۔ اسے یہ احساس نہ ہونا چاہیے کہ اس کی طبیعت کچھ بڑھ گئی ہے۔ ورنہ وہ معمولی باتوں میں بھی آپ کی خوشامد اور ترغیب کا خواہش مند ہوگا۔ اس بات کا خیال نہ صرف عمر کے پہلے سال میں بلکہ بعد میں بھی رکھنا چاہیے۔ بچہ بڑھا ہو تو اس اصول پر پیش از پیش کار بند ہونا چاہیے۔ بچے کے دل میں یہ احساس کبھی نہ پیدا ہونے دینا چاہیے کہ اس کے معمولی افعال مثلاً کھانا پینا جو خود اس کے لئے مسرت کا موجب ہیں آپ کی ممنونیت کا باعث ہیں۔ اگر اس میں یہ احساس پیدا ہو جائے تو وہ خوشامد کا متوقع رہتا ہے۔ حالانکہ اسے ایسی باتیں خود بخود بغیر ترغیب کے کرنی چاہئیں۔

یہ کبھی خیال مت کیجئے کہ بچے میں اتنی عقل کہاں جو ان باتوں کو سمجھے بچے کے قوائے کمزور ہیں۔ اس کا علم محدود لیکن جہاں یہ کوتاہیوں اس کے رستے میں خارج نہ ہوں وہاں اس کی ذہانت بڑوں سے کم نہیں ہوتی۔ بچہ جو کچھ شروع کے ایک سال میں سیکھتا ہے۔ پھر عمر بھر ایک سال کے عرصہ میں اتنا نہیں سیکھ سکتا اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ بچے کی ذہانت بہت تیز ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ بچے کو یہ سمجھ کر پالو کہ ایک دن اسے پڑا ہوتا ہے اور دینکے کاروبار میں حصہ لینا ہے اس کی موجودہ سہولتوں پر یا اپنی خوشی پر اس کی آئندہ بہتری کو قربان مت کیجئے۔ اس سے اسے بہت نقصان پہنچتا ہے۔ ٹھیک تربیت دینے کے لئے محنت اور علم دونوں کا ہونا ضروری ہے۔

ماہیخانہ کتاب تعلیم خصوصاً اداکل طفلی میں
مصنف برٹنڈرسل — مترجمہ پطرس

دیہات میں بولتے سکاوٹ کا کام

کھیوں کا بادشاہ

ایک دن سقراط گاؤں کے اسکول میں آیا۔ سب لوگ اسے جانتے تو تھے ہی۔ جو نہی بچے بچیوں نے اس کی صورت دیکھی، ان کے چہرے خوشی سے چمک اٹھے۔ پڑھنا لکھنا بھول گئے اور سب کی نظریں دفنانے پر گر گئیں۔ جہاں بڑھے میاں کھڑے بڑے عور سے بچوں کی صورتیں دیکھ رہے تھے۔

سقراط نے کچھ کہے سنے بغیر کمرے کا ایک چکر لگایا پھر اپنے آپ سے منہ ہی منہ میں باتیں کرنے لگا۔ "کسی کے کانوں میں ٹرکیاں دیکھیں نہ ناک میں نتھ، نہ کسی کے چہرے پر میل، نہ کسی کی ناک بہ رہی ہے نہ ناخن بڑھے ہوئے ہیں (ایں یہ کیا؟ اس بچی کے ناخن تو بڑھے ہوئے ہیں۔ کیسے افسوس کی بات ہے! لیکن نہیں یہ کوئی نئی لڑکی ہوگی، اولد ہاں نہ کسی کا پیٹ بڑھا ہوا ہے نہ چہرے پر زردی ہے، نہ آنکھیں خراب ہیں۔ نہ کپڑے میلے ہیں۔ سہا کے چہروں پر خوشی اور مسکراہٹ ہے۔ معلوم ہوتا ہے، اصلاح اور ترقی کئے جو ہم نے کوشش کی تھی وہ بے نتیجہ ثابت نہیں ہوئی۔"

چوتھی جماعت کے ایک شوخ لڑکے نے کہا: "بڑے میاں یہ ہم پر ہنتر پڑھ پڑھ کر کیا

پھونک رہے ہو؟"

سقراط یوں چونک اٹھا گویا وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ بولا: "سلام اسے لوگو! ہاں میں

ایک خواب دیکھ رہا تھا،

• تو بڑے میاں! اس میں حیرانی کی بات ہی کیا ہے۔ ابا جان کہتے ہیں کہ تم خواب دیکھنے کے عادی ہو۔ لیکن ہم تو خواب نہیں دیکھ رہے ہم تو سب جاگ رہے ہیں۔

• تو پھر مزور میرے خوابوں میں سے ایک خواب سچا ثابت ہوا ہے۔

ایک ننھے سے لڑکے نے کہا واہ واہ سقراط میاں، میں ایک کہانی سنائیں گے۔
سقراط کے آنے سے ماسٹر صاحب کا چہرہ بھی اچھٹا گزدوں کی طرح خوشی سے دکھنے لگا تھا۔ انہوں نے پوچھا: کہنے آپ کا کونسا خواب سچا ثابت ہوا؟

• میں بچوں نے لڑکوں اور لڑکیوں کا ایک ایسا سکول دیکھ رہا ہوں۔ جس میں گندگی نام کو بھی نہیں۔ جہاں نہ کوئی بچہ بیمار ہے، نہ کسی نے سوتے چاندی کے زیور پہن رکھے ہیں۔ یہی خواب سچا ثابت ہوا ہے۔

ماسٹر صاحب نے کہا: یہ تو کچھ بھی بات نہیں۔ میٹروں سے ہمارے اسکول کی یہی حالت ہے۔ کبھی کبھی کوئی نیا بچہ اسکول میں داخل ہوتا ہے۔ تو ہمیں تھوڑی سی تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن ہم جلد ہی اسے بھی راہ پر لے آتے ہیں۔

یعنی اس موقع پر ایک عورت داخل ہوتی۔ وہ چپ چاپ اور شرمیلی ہوتی تھی لیکن تھی چست، چالاک اور اکثر یہاں آیا کرتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک کتاب اور کچھ کاغذ تھے۔ اسے دیکھ کر سب لڑکے اور لڑکیاں اٹھ کھڑے ہوئے اور جگہیں بدلنے لگے تھوڑی دیر میں سب لڑکے ایک طرف ہو گئے اور سب لڑکیاں دوسری طرف۔ تب اس عورت نے لڑکیوں کو سلامتی کا ایک سبق پڑھانا شروع کر دیا۔ سقراط نے کمرے سے نکل جانا چاہا۔ مگر لڑکے اسے کب چھوڑنے والے تھے سب کے سب چلا اٹھے۔ وہ ہیں، ہیں بڑے میاں کہاں چل دیئے عورت تو بھی نہیں جاسکتے۔ تم پروں بیٹھے بڑی عمر کے لوگوں سے ہاتھیں کرتے رہتے ہو کیا ہم نے کچھ قصود کیلئے؟

سقراط نے کہا۔ یہاں میری ضرورت بھی کیا ہے جو کچھ میں تمہیں بتا سکتا ہوں۔ تم اور تمہارے استاد اس سے بہت زیادہ جانتے ہیں۔ میں کسی ایسی جگہ ماؤں گا۔ جہاں میری ضرورت ہو۔“

استاد نے کہا۔ نہیں آپ نہیں جاسکتے۔ ہم نے سب کچھ آپ ہی سے سیکھا ہے۔ کچھ دیر۔ یہاں ٹھہریے اور کوئی نئی بات بتائیے۔“

سقراط نے کہا۔ میں کیا بتا سکتا ہوں؟ میں استاد تھوڑا ہی ہوں۔“

اسی ضو خ لڑکے نے پھر کہا۔ اچھا تو کوئی کہانی ہی سنا دو۔“

کہانی کا نام سننا تھا کہ سب لڑکے پلاٹھے۔ ٹھیک ہے کہانی بھی کہانی۔“

سقراط نے کہا۔ میں کہانیاں دہانیاں نہیں سنایا کرتا۔“

اس پر کئی لڑکے بول اٹھے۔ ہم نہیں مانتے۔ تم بچوں والے ہو۔ اپنے بچوں کو تو ضرور

کہانیاں سناتے ہو گے۔“

سقراط نے کہا۔ یہ کام میسر نہیں۔ ان کی ماں انہیں کہانیاں سنایا کرتی ہے لیکن تمہاری

ماؤں کو اُپے تھانپے ہی سے فرصت ہمیں ملتی۔“

اس پر ننھی لڑکیوں نے ایک زبان ہو کر کہا۔ ہر گز نہیں۔ تمہیں ہماری ماؤں پر الزام

لگاتے مشرم نہیں آتی۔ انہوں نے تو یہ کام برسوں سے چھوڑ رکھا ہے۔“

سقراط نے کہا۔ خوب خوب بچے بہت ہی افسوس ہے کہ میں نے تمہاری ماؤں پر

یہ جھوٹا الزام لگایا ہے مجھے امید ہے تم معاف کر دو گے۔“

۔ معاف تب کریں گے جب تم میں کوئی کہانی سناؤ گے۔“

۔ اچھا تو سنو، ایک تھا مگر بچہ بہت ہی بڑا۔“

۔ بسنے دو، ہم ایسی بے ہودہ کہانی نہیں سننا چاہتے۔ سنائی ہے تو کوئی کام کی

کہانی سناؤ۔“

” دیکھو میاں سقراط! عقل کے ماضی لو اور ہمیں ابھی کمانی سناؤ جس میں بادشاہ ہوں،
 شہزادوں شہزادیوں کا ذکر ہو، اگر تم چاہو تو ایسی کمانی سنا سکتے ہو۔“

” اچھا تو سنو، ایک تھا بادشاہ، ہمارا تمہارا خدا بادشاہ وہ ایک چھوٹی سی ریاست پر
 حکومت کرتا تھا۔ مایا اس سے بہت خوش تھی۔ جہاں بادشاہ کا پسینہ گرتا وہاں رعایا اپنا
 خون بہانے کو تیار ہو جاتی۔“

لڑکوں نے کہا: اب آتے نارہ پر، ہاں تو پھر کیا ہوا؟

” اس چھوٹی سی ریاست سے ملی ہوئی ایک بہت بڑی ریاست تھی جس پر ایک
 بہت عظیم بادشاہ حکمران تھا۔ اس بادشاہ کی بڑی آنسو تھی کہ کسی طرح اس چھوٹی ریاست
 پر قبضہ جالوں۔ اس چھوٹی ریاست کے بادشاہ کے ہاں کوئی بیٹا تو نہ تھا ہاں ایک بہت
 خوبصورت بیٹی تھی۔ بڑے بادشاہ نے اپنے دل میں سوچا کہ اگر میرے بیٹے کی شادی اس
 چھوٹے بادشاہ کی بیٹی سے ہو جائے تو بادشاہ کے مرنے کے بعد اس کی سلطنت پر میرا
 قبضہ ہو جائے گا۔“

لیکن چھوٹا بادشاہ اور اس کی رعایا اس کی نیت سے واقف تھے چنانچہ انہوں نے
 اس کے بیٹے کے ساتھ اپنی شہزادی کی شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر بڑا بادشاہ
 بہت ہی بھنبھلایا اور اپنے امیروں وزیروں کو بلا کر ان سے صلاح مشورہ کیا۔ وزیروں نے
 کہا۔ اس چھوٹے بادشاہ نے ہماری ہتک کی ہے، ہمیں اس پر چڑھانی کر کے اس کی
 ریاست پر قبضہ کر لینا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے چڑھانی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ جب
 چھوٹے بادشاہ کو اس کی خبر ہوئی تو وہ اپنے دل میں بہت ڈر گیا تو اس کی فوج بڑے
 بادشاہ کی فوج کے مقابلے میں ایک چڑھانی بھی نہ تھی۔

اس چھوٹے بادشاہ نے اپنے امیروں وزیروں کو بلا کر کہا کہ اگر تم لڑے تو یہ
 بادشاہ ہماری سلطنت پر قبضہ کرنے لگا اور اگر میں نے اپنی بیٹی اس کے بیٹے سے بیاہی

تب بھی وہ ہماری سلطنت پر قبضہ کرنے لگا۔ ہم کریں تو کیا کریں؟“
اس کی مدعا یا سزا جو اب دیا، ہم لڑیں گے اور اپنی جائیں حضور پر خدا کر
دیں گے“

بادشاہ نے کہا، لیکن اس کا کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ غنیم کے مقابلے میں ہماری فوج بہت
ہی ٹھوڑی ہے“

اس پر سب چپ ہو گئے لیکن اس ریاست کے تمام باشندے اپنے بادشاہ سے
بے حد محبت رکھتے تھے چنانچہ کیا دیہات میں اور کیا شہروں میں سب جگہ لوگوں کو یہی فکر
تھی کہ ہم اپنے بادشاہ اور اپنے ملک کو غنیم کے ہاتھ سے کس طرح بچائیں۔ یہاں تک کہ
یہاں لوگوں اور مدعوں کو بھی اپنے بادشاہ کی امداد کی فکر ہوئی۔

جب بادشاہ نے دوسری مرتبہ اپنے امیروں و وزیروں کو طلب کیا تو اس موقع پر
شیر بھی آئے اور کہنے لگے۔ ہم دشمن کے گھوڑوں اور مویشیوں کو چیر بھاڑ ڈالیں گے“
بھیڑتیے اور گینڈا آئے اور کہنے لگے۔ ہم دشمن کے خیموں کے ارد گرد گھومتے رہیں
گے اور جو کوئی اکیلا دیکھا باہر نکلے گا اسے کھا جائیں گے“

کوڑوں نے کہا۔ ہم ان کی ہڈیاں تک نہ چھوڑیں گے۔“

لیکن بادشاہ نے کہا یوں کام نہ چلے گا“

میں اس موقع پر ایک کھی بادشاہ کی ناک پر آکر بیٹھی۔ بادشاہ نے ہاتھ سے
اٹا دی۔ مگر کھی وہاں سے جانے کا نام نہ لیتی تھی۔ اس دفعہ وہ آکر بادشاہ کے کان پر
بیٹھ گئی۔ بادشاہ بھنبھلا اٹھا اور کہنے لگا۔ اس کھی نے تو ناک میں دم کر دیا۔ یہ مجھے کیوں
تنگ کرتی ہے؟ میں پہلے ہی پریشان ہو رہا ہوں“

بادشاہ کے کان میں بھنبھناہٹ کی آواز آئی جیسے کوئی کسلا ہو رہا ہو۔ میں حضور کی

مدد کرنا چاہتا ہوں“

بادشاہ چونکہ اٹھا اور کہا ”یہ کون بولا؟“
 وزیر نے عرض کیا ”حضور کوئی بھی تو نہیں بولا۔“
 بادشاہ کے کان میں پھر وہی باریک آواز آئی ”میں بولا تھا۔“
 اب تو بادشاہ اچھل پڑا اور آنکھیں مچاڑ پھاڑ کر اپنے ارد گرد دیکھنے لگا مگر اس کے
 آس پاس کوئی نہ تھا۔ تا چار پھر آکر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ مگر دل ہی دل میں سخت حیران ہوتا ہوا
 کہتا تھا کہ میری پریشانیوں اور اندیشوں نے کہیں مجھے دیوانہ تو نہیں بنا دیا۔“
 اتنے میں پھر وہی آواز سنائی دی کہ ”میں حضور کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔“
 امیر وزیر سب دم بخود کھڑے ہو گئے کسی کے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکلا۔ مگر اب
 بادشاہ سمجھ گیا کہ یہ ضرور کسی ایسی ہستی کی آواز ہے، جو نظر نہیں آتی۔

بادشاہ نے پوچھا ”تم کون ہو؟“

”میں کھیوں کا بادشاہ ہوں اور آپ کی مدد کے لئے حاضر ہوا ہوں۔“

بادشاہ نے کسی قدر ناامنی سے کہا ”جاؤ یو۔ فضول وقت ضائع نہ کرو۔ مجھ کو میری
 کیا مدد کر سکتے ہو؟ تم مجھے پریشانیوں میں مبتلا دیکھ کر مجھ سے ٹھٹھا کرنے آئے ہو۔“
 ”نہیں، میں اس خیال سے ہرگز نہیں آیا ہوں۔ میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں اور اگر آپ
 وعدہ کریں کہ میں جو کچھ مانگوں آپ دیں گے تو میں آپ کی مدد سے بدریغ نہ کروں گا۔“
 ”میں صرف اس قدر چاہتا ہوں کہ مجھے آپ کے دسترخوان پر بیٹھنے کی اجازت مل جائے
 اور جہاں چاہوں باڑ سکوں۔“

بادشاہ نے ہنس کر کہا ”جاؤ۔ تمہیں اجازت ہے میرے دشمن کو براہ کرنے میں
 اپنا سامان لادو لیکن مجھے یقین ہے کہ تم نہ تو میری کچھ مدد کر سکتے ہو، نہ میرے دشمن کو
 نقصان پہنچا سکتے ہو۔“

آس پاس جو لوگ بیٹھے تھے۔ جب انہوں نے بادشاہ کو آپس ہی آپ باتیں کرتے اور

ہنتے دیکھا تو انہیں بہت فکر ہوئی۔ دیکھتے تھے کہ پریشانیوں کی وجہ سے ہمارے بادشاہ کا سر پھر گیا ہے اور وہ دیوانوں کی طرح آپ ہی آپ ہنس رہا ہے۔ لیکن بادشاہ نے سالانہ قعرے ان سے بیان کر دیا۔ اس بات کا تو کسی کو بھی یقین نہ تھا کہ کھیاں ہماری کچھ امداد کر سکتی ہیں۔ البتہ اس خیال پر انہیں بہت ہنسی آئی کہ کھیاں ہماری سلطنت کی حفاظت کرنا چاہتی ہیں اس موقع پر ایک بڑھا جو سب سے پیچھے بیٹھا تھا اٹھ کھڑا ہوا اور کھئی کی شرطیں مان لینے کے خلاف دھاتی دینے لگا۔ اس نے چلا کر کہا ”بادشاہ سلامت! آپ نے اپنے مغر و نادار عالم ہلے سے بھی زیادہ خطرناک دشمن کے ہاتھ اپنی سلطنت بیچ ڈالی ہے“

اس پر چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں۔ ”چپ رہ بڑھے، کیا بکتا ہے؟“ اور بے جا بے بڑھے کو زبردستی خاموش کر کے اپنی جگہ پر بیٹھا دیا گیا اس کے تھوڑی دیر بعد مجلس ختم ہو گئی اور سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔ مگر اس عرصے میں بڑھا منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا رہا۔

ایک لڑکے نے کہا ”خدا بھوٹ نہ بلوائے تو وہ بڑھا ضرور سقراط ہی ہوگا۔“

سقراط نے کہا ”اگر تم یوں میری بات تو کو گے تو میں باقی کہانی تمہیں نہ سناؤں گا۔“

ایک نطفی سی لڑکی نے کہا ”یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں کہ اس خوب صورت شہزادی کا کیا حال ہوا؟“

سقراط نے چپکے سے اسکول سے باہر نکلتے ہوئے کہا ”یہ پھر کبھی بتاؤں گا۔ آج صبح میں نے پہلے ہی تمہارا بہت سا وقت ضائع کر دیا ہے۔“

کچھ دنوں کے بعد سقراط اپنی کہانی کا باقی حصہ سنانے پھر اسکول میں آیا۔ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے وہ اسکول کے احاطے میں ادھر ادھر اور پیچھے بڑھے خود سے کھتا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی کوئی چیز کھو گئی ہے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد وہ اسکول کے

کمرے میں داخل ہو گیا۔

لڑکوں نے پوچھا ”اٹھ اٹھ میں تمہاری جو چیز کھو گئی تھی وہ ملی یا نہیں؟“

سقراط نے جواب دیا ”نہیں“

ایک لڑکے نے کہا ”مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔ لیکن یہ تو بتاؤ تمہاری کیا چیز

گم ہوئی ہے؟“

”میری کوئی چیز گم نہیں ہوئی اور جو چیز میں تلاش کر رہا تھا وہ مجھے نہیں ملی اور مجھے

بڑی خوشی ہوئی کہ وہ نہیں ملی“

کئی لڑکوں نے زچ ہو کر پوچھا ”تمہاری کوئی چیز گم بھی نہیں ہوئی اور تم دیر تک اسے

ادھر ادھر تلاش بھی کرتے رہے اور جب وہ تمہیں نہیں ملی تو تمہیں خوشی بھی ہوئی۔ یہ

تو پھیلپی ہے پھیلپی۔“

”اچھا۔ اگر تم اسے پھیلپی کہتے ہو تو پھیلپی ہی سہی۔“

ماسٹر صاحب نے کہا ”مجھے معلوم ہے آپ کو کس چیز کی تلاش تھی۔ آپ کوڑا کرکٹ تلاش

کر رہے تھے لیکن وہ اب آپ کو یہاں نہیں مل سکتا۔“

سقراط نے کہا ”بیجا فرمایا آپ نے اور اس کے لئے میں آپ کو دلی مبارکباد دیتا ہوں

گرد کا ایک ذرہ بھی تو اعطایہ کے آس پاس کہیں نظر نہیں آیا۔ تمام گندگی اور کوڑا کرکٹ اسکول

کے گڑھے میں پھینکا جاتا ہے۔ یقیناً جانو مجھے یہ معلوم کر کے بہت خوشی حاصل

ہوئی۔“

اس کے بعد سقراط چھوٹے لڑکوں اور لڑکیوں کو مخاطب کر کے بولا ”مجھے امید ہے

کہ جب تم بڑھے ہو جاؤ گے اور اسکول بھوڑ دو گے تو اپنی ان تمام اچھی عادتوں کو

کبھی نہ بھولو گے۔“

استاد نے کہا ”اس کی طرف سے آپ بے فکر رہتے اب صفائی ان کی فطرت کا جزو

بن گئی ہے اور خلافت سے انہیں دلی نفرت ہے اور یہ نفرت ان کے دل سے کبھی نہیں نکل سکتی۔ سبق پڑھنے سے پہلے یہ ہر روز اپنے اسکول کی صفائی کرتے ہیں اور مجھے پورا یقین ہے کہ اگر یہ جگہ کوڑے کرکٹ سے آئی رہے تو اس کے خیال سے بھی انہیں یہاں بیٹھنا و بچھڑنا ہو جائے۔“

یہ سن کر سقراط کے منہ سے بے اختیار ”مرحبا“ نکل گیا۔

اب کئی لڑکوں نے پوچھا ”ہاں بڑے میاں! اب وہ کہانی بھی تو سناؤ، ہم جانتے ہیں کہ تم بات ٹالنے کی کوشش کر رہے ہو!“

سقراط نے کہا ”لو بھی سنائے دیتا ہوں۔“ اچھا تو کہاں پھوڑی تھی کہانی؟ ہاں یاد آگیا۔ خوبصورت شہزادی باخ میں بیٹھی جرتلب بن رہی تھی۔

”نہیں یہاں تو نہیں پھوڑی تھی۔“

تو پھر یہاں پھوڑی ہوگی۔“ بہادر نوجوان شہزادہ گھوڑے پر سوار ہو گیا اور نیام سے تلوار نکال لی۔“

”نہیں، یہاں بھی نہیں پھوڑی۔ سقراط تم جان بوجھ کر اسجان بنے جلتے ہو۔ خیر، تم تمہیں تباہ دیتے ہیں۔ تم نے کہانی وہاں پھوڑی تھی۔ جہاں کھیوں کے بادشاہ نے پھوڑی سلطنت کو بچانے کا وعدہ کیا تھا۔“

”ہاں ہاں۔ یہیں پھوڑی تھی۔ لو صاحب! یہاں سے رخصت ہو کر کھیوں کا بادشاہ بھن بھن کرتا ہوا سیدھا بڑے بادشاہ کی سلطنت کی طرف روانہ ہو گیا۔ جس وقت وہ وہاں پہنچا تو وہ بڑا بادشاہ پر مہائی کے لئے اپنی فوجوں کو تیار کر رہا تھا۔ اس نصل میں سوچا کہ اپنی راجدھانی میں ایک بہت شاندار جشن منانا چاہیے جس میں ہمارے تمام نوجوان شامل ہوں اور جنگل میں سب اپنے اپنے جوہر دکھائیں اور اس طرح ان میں سے تمام بہادروں اور سوراؤں کو چن کر اپنی ایک زبردست فوج تیار کر لوں جو میرے گتہ گتہ کو

تباہ و برباد کر ڈالے۔

چنانچہ بادشاہ کے حکم سے ایک شاندار جشن منایا گیا اور ملک کے کونے کونے سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ آکر اس میں شامل ہوئے۔ جس جگہ نظر پڑتی تھی لوگوں کے رخسے ہی رخسے دکھائی دیتے تھے۔ ان لوگوں کا جب جی چاہتا۔ بادشاہ کے خزانے سے کھاتے پیتے اور رنگ رلیاں مناتے انہوں نے بادشاہ کی راجدعائی کی تمام زمین اور پانی کو گندہ اور بکھس بنا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یکا یک دبا پھیل گئی اور دھڑا دھڑا موتیں ہونے لگیں۔ بہتر سے متن کئے گئے مگر مرنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی ہی جاتی تھی۔ ناچار بادشاہ نے سب کو حکم دیا کہ اپنے اپنے گھر وں کو چلے جاؤ۔ میرے اقتدار تم سب کے پاس خود آئیں گے اور تم میں سے ہماروں کو خون چن کر فوج میں بھرتی کر لیں گے۔ یہ سن کر سب لوگ اپنے اپنے دیہات اور شہروں کو لوٹ گئے اور اپنے ساتھ بیماری کو بھی لیتے گئے اور اس طرح بڑے بادشاہ کی تمام سلطنت میں دبا پھیل گئی اور چند ہی روز میں ہزاروں لوگ موت کے گھاٹ اتر گئے تب بادشاہ نے اپنی سلطنت کے بڑھوں، امیروں، وزیروں کو بلا یا انہوں نے کہا: "بادشاہ سلامت! ہمارے تمام نوجوان مر چکے ہیں ہمارے گھر ویران ہو گئے ہیں۔ ہم اب جنگ نہیں کر سکتے۔ آپ نے یہاں سوناؤں کی فوج تیار کرنے کے لئے جو جشن کیا تھا اس نے صرف اس فوج ہی کو برباد کر ڈالا بلکہ ہمارے ملک میں بھی تباہی پھیلا دی۔"

بادشاہ نے کہا: "افسوس! اب کئی سال تک ہم جنگ نہیں کر سکتے" اور سب بڑے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

اس خوفناک وبا کا حال چھوٹے بادشاہ کے کانوں تک بھی پہنچا اور اس کے امیر وزیر ایسے طاقت ور دشمن کے حملے سے بچ جانے پر اسے مبارکباد دینے آئے جس وقت وہ بادشاہ کے آس پاس بیٹھے تھے تو انہوں نے بادشاہ بھی بھن بھن کرنا ہوا ان کے

پاس آیا اور اپنی ننھی سی ترٹی بجاکراتنی اور پختی آواز میں جو سب کے کانوں تک پہنچ جاتے چلا کر کہنے لگا۔ بادشاہ سلامت! یہ میرا انعام! میں نے اپنا کام انجام دے دیا ہے۔“

اس کی یہ بات سن کر سب لوگ ہنسنے لگے۔ اسے کھینوں کے ننھے بادشاہ اذراہ میں بھی معلوم ہو تم نے کیا کام سر انجام دیا ہے؟ ہمارے دشمن اگر مرے میں تو وہ بات سے مرے ہیں اس میں تیری کوشش کو کیا دخل ہے؟ تو بھوٹا اور دغا باز ہے۔“

کھینوں کے بادشاہ نے کہا: میں ہرگز دغا باز نہیں۔“

بادشاہ نے کہا: ثابت کر۔“

کھینوں کے بادشاہ نے کہا: میں ثابت کر رہا ہوں سنئے۔ جب اس ملک کے دیہات اور شہروں سے نوجوان بادشاہ کی راہدہانی کی طرف روانہ ہوئے تو ہم بھی ان کی پیٹھوں، ان کے اسباب اور ان کے ٹٹوؤں اور ہیلوں پر بیٹھ کر ان کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے وہاں ہر جگہ اپنے ننھے گاڑ دیتے اور بڑی بے احتیاطی سے رہنے سہنے لگے۔ وہ اور ان کے بیل اور گھوڑے جہاں جی چاہتا پانہ اور لید کر دیتے اور کوئی شخص زمین صاف نہ کرتا۔ اتفاق سے ان میں ایک شخص ایسی جگہ سے آیا تھا۔ جہاں ہیضہ پھیلا ہوا تھا وہ اپنے ساتھ اس بیماری کے جراثیم بھی لیتا آیا تھا۔ ہم سب یعنی میں اور میرا لشکر پہلے تو گندگی اور کوڑے کرکٹ پر بیٹھے اس کے بعد ان لوگوں کے کھانوں اور مٹھائیوں اور ان کے ہونٹوں اور آنکھوں پر جا بیٹھے ہم گندی جگہوں پر بیٹھنے کے بعد نہ تو اپنے پاؤں صاف کرتے اور نہ جوتے اتارتے۔ پہلے تو ہم نے دستوں کی بیماری پھیلائی پھر جب ہم نے سنا کہ کوئی شخص اپنے ساتھ ہیضہ کے جراثیم یہاں لایا ہے تو ہم نے ہیضہ بھی پھیلا دیا۔ یہ کہہ کر کھینوں کے بادشاہ نے پھر اپنی ترٹی بجائی۔ اسے عادل اور انصاف مند بادشاہ! اب میں اپنا انعام مانگتا ہوں۔“

سن کر سب لوگ خوف سے تھرا تھے اور بادشاہ نے کہا: بے شک تم انعام کے قدر ہو۔ میں اپنے قول کے مطابق تمہیں انعام دوں گا اور تمہیں میری مٹھائیوں پر بیٹھنے اور

جہاں جی چاہے اڑنے کی اجازت ہوگی۔“

اب وہی بڑھا جس نے بادشاہ کے کبھی کی شرطیں مان لینے کی مخالفت کی تھی اپنی جگہ سے اٹھا بولا۔ ”بادشاہ سلامت! میری التجا ہے کہ آپ نے مکھیوں کے بادشاہ سے جو اقرار کیا ہے اس سے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھے۔“

بادشاہ نے پوچھا۔ ”بڑے میاں یہ کیوں؟“

اس کے جواب میں وہ بڑھا جو بلاشبہ سقراط ہی تھا اور اس دن تم لڑکوں نے ٹھیک بوجھ لیا تھا کہنے لگا۔ ”جب آپ نے مکھیوں کے بادشاہ کے ساتھ اتحاد کیا تھا تو آپ نے انسان کے سب سے خطرناک دشمن کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ بادشاہ سلامت آپ کو معلوم ہونا چاہیے ہمیں آئندہ جو طرح طرح کی بیماریاں گھیرے رہتی ہیں۔ ان میں سے زیادہ یہی مکھیاں پھیلاتی ہیں۔“

بادشاہ نے پوچھا۔ ”تو اب میں کیا کروں؟“

سقراط بولا۔ ”حضور! آپ نے یہ وعدہ کیا تھا کہ مکھیوں کو آپ کی مٹھائیوں پر بیٹھنے کی اجازت ہوگی اور وہ جہاں چاہیں گی اڑ سکیں گی۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”ہاں! اور اس قول کو نبھانا میرا فرض ہے۔“

سقراط بولا۔ ”تو اپنے قول کو نبھائیے، لیکن خبردار رہئے کہ مکھیوں کا بادشاہ کہیں آپ کے دشمن کی سلطنت کی طرح آپ کی سلطنت کو بھی تباہ نہ کر ڈالے۔ مکھیاں گندگی میں پرورش پاتی اور نپکے دہتی ہیں اور آپ نے یہ تو وعدہ نہیں کیا کہ آپ ان کے لئے گندگی بھی ہٹا کر تے رہیں گے۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”نہیں میں نے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا اور نہ یہ اجازت دی ہے کہ وہ

بادشاہ کے سوا کسی اور کے دسترخوان پر بھی بیٹھ سکیں۔“

یہ سن کر ایک چھوٹے قد کا شخص جو ڈر پوک تھا۔ بول اٹھا۔ ”بادشاہ سلامت! خدا کے

تھے اس ہلاکت و روثمن کو ناراض نہ کیجئے، لیکن بادشاہ نے اس کی بات کی کچھ پروا نہ کی اور کہا
 "ہمیں اپنی جانوں کی حفاظت کرنی چاہیے۔ ورنہ کھیوں نے جس طرح ہمد سے ہمسایہ بادشاہ
 کی فوج میں دبا پھیل کر اسے تباہ کر ڈالا ہے اسی طرح ہمیں بھی تباہ کر ڈالیں گی،"
 کھیوں کے بادشاہ نے اپنا ننھا سا پاؤں زمین پر مارا اور بڑی بے صبری سے پوچھا کہ
 بادشاہ اچھے انعام کب ملے گا؟

بادشاہ نے جواب دیا: اسی وقت لیکن میں نے تم سے جو وعدہ کیا تھا اس سے ذرا بھی
 تم قدم نہ بڑھا سکو گے۔"

یہ سنا کر کھیوں کا بادشاہ اڑ گیا اور تھوڑی دیر میں اپنا لڈو لشکر لے آیا۔ تمام کھیاں بادشاہ
 کی مٹھائیوں کے دسترخوان پر جا جا کر بیٹھیں اور جہاں چاہتی اڑتی پھرتیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ
 تھوڑے ہی دنوں میں بیمار پڑ کر مر گیا لیکن چونکہ اور کسی نے کھیوں کو اپنے کھانے پینے کی چیزوں کے
 قریب نہ پہنچنے دیا تھا اس لئے اور کسی کو کچھ ضرر نہ پہنچا۔ وہ اپنی کھانے پینے کی چیزیں یا تو باریک
 کپڑوں کے نیچے ڈھک کر یا الماریوں، برتنوں اور کبوسوں میں بند کر کے رکھتے اس طرح کھیوں کا
 کچھ بس نہ چلتا اور وہ دبا نہ پھیلا سکتیں اور چونکہ کھیاں گندگی میں ناٹے سے دیا کرتی ہیں۔ انہوں
 نے فلاطت اور کوڑے کرکٹ کے لئے الگ گٹھے کھود لئے۔ وہ ان میں تمام کوڑا کرکٹ پھینک
 دیتے اور کسی جگہ گندگی وغیرہ کا نام تک نہ رہنے دیتے۔ وہ اپنے گھروں اور درمہات کو ایسا
 صاف ستھرا رکھتے کہ کھیوں کو ناٹے سے دینے کے لئے کوئی جگہ ہی نہ ملتی۔ پہلے تو وہ لوگ
 جہاں جی چاہتا پانہ کر لیتے تھے لیکن اب انہوں نے خاص طور پر اس کام کے لئے گڑھے بنوائے
 تھے اور کسی جگہ دفع حاجت نہ کر پاتے۔ اور وہ اپنے اصطلوں اور مویشی خانوں کو بھی بہت
 صاف ستھرا رکھتے۔ لہذا اور گوبر وغیرہ گڑھوں میں پھینکوا دیتے وہ ان گڑھوں کو پانی سے
 تر کرتے رہتے تاکہ وہ گرم رہیں اور ان میں غیر اٹھتا ہے اور کھیاں وہاں بھی ناٹے نہ
 دینے پاتیں۔ جب گڑھے بھر جاتے اور تمام کوڑا کرکٹ اور گندگی مٹی میں گھل جاتی کہ نہایت

عہدہ کھاد بن جاتی۔ تو وہ اسے اپنے کھیتوں میں استعمال کرتے اب انہیں کمیوں کا کچھ اندیشہ نہ رہا۔ انہیں نہ صرف بیماریوں اور کمیوں ہی سے بچھٹکارا مل گیا۔ بلکہ ان کی کھیتیاں بھی پھلے سے زیادہ ہری بھری ہو گئیں اور ان کی جسمانی صحت بھی پہلے کی نسبت اچھی ہو گئی۔

اس طرح انہوں نے اپنی سلطنت کو نہ صرف اپنے ظالم ہمسایہ بادشاہ ہی سے بچا لیا بلکہ اس سے بھی زیادہ خطرناک دشمن یعنی کھی کے شر سے بھی محفوظ ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی چھوٹی سلطنت کی رعایا نے بڑی سلطنت کی رعایا سے دوستی بھی پیدا کر لی اور دونوں نے آپس میں عہد کر لیا کہ ہم بچائے ایک دوسرے سے لڑنے کے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر زندگی کھی اور وبا کے خلاف جنگ کرتے رہیں گے اور چھوٹی سلطنت کی شہزادی نے بڑی سلطنت کے شہزادے سے شادی کر لی اور وہ اور ان کی رعایا ہمیشہ ہنسبے خوشی زندگی بسر کرتے رہے۔“

سفر اٹنے نغی لڑائی سے کہا۔ کیوں نغی اب تو تم خوش ہو؟ اب تو تمہاری شہزادی پھر خوش رہنے سہنے لگی ہے۔“

پھر وہ بڑی عمر کے لڑکوں کو مخاطب کر کے بولا لڑکو! اب جب سالانہ جلسہ ہو تو تم اس کہانی کو جو میں نے تمہیں سنائی ہے ناٹک تیار کر کے دکھانا۔ اس میں شیر بھی لانا اور بھیڑیے وغیرہ بھی اور کمیوں کے بادشاہ کے لئے کوئی اچھا سا لباس تیار کرنا اور اس کے شانوں پر پتہ بھی لگانا۔ جب تمہارے والدین اور دوست اس ناٹک کو دیکھیں گے تو ان کی سمجھ میں آ جائے گا۔ کہ تم نہلنے دھونے اور صفائی کا اس قدر خیال کیوں رکھتے ہو اور تمہیں اپنے اسکول، اعلیٰ اور دیہات کو صاف ستھرا رکھنے کی اتنی فکر کیوں ہوتی ہے؟“

(دیہات میں بوائے سکاؤٹ کا کام)

الایفہ لزل برین، ایم۔ سی، آئی۔ سی ایس

مترجمہ: پطرس

ویلٹن صاحب اور میں

نتھیاگلی شمال مغربی سرحدی سو بے کا تابتانی دارالحکومت ہزار سے کی سرسبز پہاڑیوں میں ۸ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے اور کئی پہلوؤں سے ایک نہایت معمولی پہاڑی مقام ہے اور سب سے زیادہ یہی وجہ ہے کہ میں نتھیاگلی لاگرویدہ ہوں۔ وہاں کے گنے جھگل بہت حد تک تہذیب کے جنون تعمیر کی دست درازیوں سے محفوظ ہیں۔ قدرت کی شان و شوکت کے علمبردار آسماں بوس عظیم الشان درخت لاکھوں کی تعداد میں اپنی نہیب خاموشی میں کھڑے ہیں۔ ندی ندی اپنے قدرتی آبریزوں میں اُچھلتے کودتے بہ رہے ہیں۔ وہاں کی آبادی سو ڈیڑھ سو سے زیادہ نہیں۔ اس نئے کشمکش حیاتِ انسانی کے وہ روح فرسا مناظر جو بڑے بڑے شہروں میں بہت عام ہوتے ہیں۔ وہاں بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ شملہ کی فضا کو متلون فیشن کی رنگ آمیزیوں نے میرے سادگی پسند دماغ کے لئے کثیف اور میرے حساس دل کے لئے زہر ملا بنا رکھا ہے۔ مری جسامت کے لحاظ سے تو نہیں لیکن لوحاً بعینہ شملہ ہے۔ اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ میں اسے شملہ پر ترجیح دوں۔ ایسیٹ آباد میں میرے آشناؤں کی کثرت میری تنہائی پسند طبیعت کی خواہشات کے مانع ہے۔ لیکن گزشتہ گرمیوں کے موسم میں اس کے علاوہ ایک اور وجہ بھی تھی جس نے مجھے نتھیاگلی جانے پر مجبور کر دیا۔

میں نے مجبوراً لفظ استعمال کیا ہے۔ گو میں یہ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ جبر مجھے کسی طرح ناگوار نہ تھا۔ ویلٹن صاحب جن کو میں دوست کہتا تھوڑی سی لاف زنی اور دوست کے

ملا وہ کسی اور نام سے پکارنا غلط بیانی سمجھتا ہوں۔ گذشتہ موسم گراما میں ہانڈہ گلی مقیم تھے اور انہی کے قریب کی خواہش ٹیجے کشاں کشاں نتھیا گلی لے گئی۔ ہانڈہ گلی نتھیا گلی سے پانچ ساڑھے پانچ میل کے فاصلے پر ایک اور چھوٹا سا پہاڑی مقام ہے۔ جس میں ایک ہوٹل، تحصیل، خزانہ، کچھری اور ڈاک بنگلے کی موجودگی نے اسے تھوڑی سی اہمیت دے دی ہے۔ ویلین صاحب اسی ہوٹل میں رہتے تھے اور میں نتھیا گلی میں خواجہ محمد حسین کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ نتھیا گلی کا بازار مشکل پانچ چھ دکانوں پر مشتمل ہے جو ضروریات زندگی مہیا کر سکتی ہیں اور بس۔ یہ دکانیں ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی سڑک کے ایک موڑ پر کھڑکی طرف واقع تھیں اور ڈاکخانہ سے شاید اس کی عمارت سرکاریت سے مرعوب ہو کر ذرا فاصلے پر تھیں۔ سڑک کے دوسری طرف اسی موڑ پر ڈاکخانے اور دکانوں کے مقابل بازار بھی ہے ایک چھوٹی سی پگڈنڈی پر دس بارہ قدم چڑھنے کے بعد خواجہ محمد حسین کی کوٹھی تھی۔ جس کی سرخ چھت اور برآمدے کے خوشنما پتھر کے ستون اپنی بلندی پر سے کم مایہ دکانوں اور بیچارے ڈاکخانے کو حقارت کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ ہفتے کے دن دو بجے کے قریب میں برآمدے میں بیٹھا خواجہ صاحب کے دفتر سے واپس آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ صبح سات بجے سے بارش بہت زور شور کی ہو رہی تھی اور میں اس کی روح افزا کیفیت کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ لطیف سماں ہالے اور نیچے دائیں بائیں ٹنگ و تاز میں مصروف تھے۔ بارش کے چلن میں سے میں سامنے کی دکانوں کو دیکھ رہا تھا۔ جن کے مالک اس شدید بارش میں خریداروں سے مایوس بیٹھے تھے۔ بارش کے مسلسل شور سے میرے دماغ میں ایک عجیب نیند سی چھا گئی اور میں خواب بیدار میں ویلین صاحب اور اپنے باہمی تعلقات پر غور کرتا رہا۔ وہ عیسائی میں مسلمان۔ وہ انگریز میں ہندوستانی، ان کی زندگی آزاد اور خود مختار میں نئی نئی ڈگری حاصل کرنے کے بعد روزگار کا متنازعہ۔ ہمیں جاننے والی دنیا جیلن تھی اور میں خود بھی حیران تھا کہ باوجود اس قدر تفاوت کے ان کی میری کیونکر بنتی ہے۔ پانچ سال کی باہمی آشنائی نے ہمیں ایک دوسرے سے

بہت مانوس کر دیا تھا مجھے اپنی نسبت تو یقین ہے کہ انہوں نے مجھے کسی عجیب طریقے سے مسح کر رکھا ہے۔ اس قدر کہ بعض اوقات ان کے متعلق میرے جذبات میں صاف نسوانیت کی جھلک پائی جاتی ہے۔ ان کی نسبت میں یہ کہوں گا کہ میں اب تک فیصلہ نہیں کر سکتا کہ ان کا مجھے شرف بخشا میری کسی صفت کی بدولت ہے یا محض ان کی قیاض دلی کا نتیجہ ہے وہ مجھ سے عمر میں چند سال بڑے ہیں لیکن کبھی تو میں ان کے سامنے اس طرح سم جاتا ہوں جیسے شاگرد استاد کے سامنے اور کبھی اس قدر بے تکلف ہو جاتا ہوں جیسے شاگرد استاد کے سامنے۔ اور کبھی اس قدر بے تکلف ہو جاتا ہوں جیسے وہ اور میں بچپن میں برسوں اکٹھے کھینتے رہے ہوں۔

میرے خیالات یہاں تک پہنچے ہوں گے کہ ان کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور میں نے دیکھا کہ میرے ہاتھ میں سگریٹ بجھ گیا مجھے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز نے زیادہ بیدار کر دیا اور سگریٹ جلاتے جلاتے میں نے کنگھیوں سے بانڈہ گلی کی سڑک کی طرف دیکھا۔ پھر پلٹ کر سڑک پر ایک سوار بارانی ٹوپی اور بارانی کوٹ میں سچپا ہوا تیز دنگی پر نٹھیا گلی کی طرف آ رہا تھا۔ جب وہ قریب پہنچا تو اس کے سیاہ ننگے پاؤں مجھے رکابوں میں نظر آئے۔ معلوم ہوتا تھا کوئی سائیس ہے۔ بازار میں پہنچ کر وہ گھوڑے پر سے اترا اور باگ کو اس کی گردن پر سے اتار کر ہانڈہ میں ڈال لیا اور ہماری کوچی کی طرف چڑھنے لگا۔ میں پہلے سے زیادہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

قریب آگرائس نے مجھے ایک خط دیا جس کا بڑا نیلا لافا صاف کہ رہا تھا کہ بانڈہ گلی ہوٹل سے کوئی پیغام آیا ہے۔ خط بلاشبہ ولین صاحب کا تھا۔ میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور سگریٹ کو چھینک کر اسے جلدی جلدی کھولا۔ ولین صاحب انوکھے خط لکھا کرتے تھے۔ مگر یہ سب سے نزا تھا۔ یہ میرے پاس اب تک محفوظ ہے اور اس وقت میں اس کو سامنے رکھ کر اس کا ترجمہ کر رہا ہوں۔

پیارے اجداد

سواری کا لباس پہن کر فوراً یہاں آ جاؤ اور اپنے

ساتھ بھرا ہوا پستول، چھ فالٹو کارتوس، میرے کمرے کی چابی اور پانچ

چھ نوٹ پیپر لیتے آؤ۔

تمہارا مخلص

اپیچ۔ ڈبلیو۔ ویلٹن،

میں فوراً امدد گیا اور جلدی جلدی اپنا لباس تبدیل کیا۔ ٹرنک کھول کر اس میں سے
چھ کارتوس نکالے۔ تیکے کے نیچے سے اپنا بھرا ہوا پستول اٹھا کر برجس کی جیب میں
ڈال لیا۔ نوٹ پیپروں کے دستے سے چھ کاغذ پھاڑ کر تکتے۔ پاس ہی سے ویلٹن صاحب
کے کمرے کی چابی اٹھائی (ویلٹن صاحب نے اپنے کمرے کی ایک چابی مجھے اس لئے
دے رکھی تھی کہ میں بعض اوقات جب پہاڑیوں میں پھرتے پھرتے باندہ گلی کے
قریب جا نہ سکا اور تھک کر آرام کی ضرورت محسوس کرتا تو ان کی غیر حاضری میں ان کا کمرہ
کھول کر وہاں بیٹھ جا یا کرتا) سب چیزوں کو جیبوں میں ڈال کر احتیاطاً پھر پڑتال کی اور
بارانی کوٹ پہنتا پہنتا باہر نکلا تو کوہ خواجہ صاحب کے نام پر ایک رقعہ اس مضمون کا
لکھ کر دیا کہ خدا جلنے میں کس وقت آپس آؤں۔ آپ چائے اور کھانے پر میرا انتظار نہ کریں۔
یہ سب کچھ کر کے گھوڑے پر سوار ہو سرپٹ باندہ گلی کو روانہ ہو گیا۔

تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد اس چھوٹی سی سلعہ مرتفع پر پہنچ گیا۔ جہاں باندہ گلی کا ایک خوب
بازار ہوٹل، ڈاک بنگلہ وغیرہ ایک سلسلہ صنعت دارانہ بنائے کھڑے ہیں۔ باندہ گلی کا
بازار بالکل تھیا گلی کا سا ہے۔ دائیں بائیں تو ایک ددزی کی چھوٹی سی دکان، اس کے ساتھ

سیٹھ فیروز جی کا شراب، بتاکو، قلم، کاغذ پنسل وغیرہ کا سٹور، پھر اس کے ساتھ ایک کچھڑے اور پھر شاید ایک بننے کی دکان تھی۔ اسی قطار میں کچھ فلاصلے پر تحصیل، خزانہ، کچھری اور سلمے ٹاک بنگلے کی چھوٹی سی چوکور عمارت تھی۔

بائیں ہاتھ کو باندھ گلی ہوٹل بھوکے پیاسوں کے لئے اپنی آغوش شفقت کھولے بغیر کسی تکیتر اور غرور کے کھڑا تھا۔ باندھ گلی میں داخل ہوتے ہی میں نے ہوٹل کا رخ کیا گھوڑے کو اصطبل میں سپرد کر کے سیدھا ۳۵ نمبر کمرے کی طرف گیا۔ دروازے کو دھکیلا لیکن دروازے کا تالا بند تھا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ویٹن صاحب نے کیوں مجھے چابی ساتھ لانے کو کہا تھا۔ خیر دروازہ کھول کر میں اندر گیا۔ سب سے پہلے جس چیز پر میری نظر پڑی وہ ایک سفید رنگ کا کارڈ تھا۔ جو انگیٹھی کے اوپر طاق پر ایک پھولدان کے سہارے کھڑا تھا اور جس پر سرخ پنسل سے ویٹن صاحب کے ہاتھ کے دو فقرے لکھے تھے۔

”میرا پتہ یینجر سے پوچھ لو۔ یہ کارڈ صاحب لادو“

میں نے ان دو فقروں کو شاید چھ دفعہ پڑھا۔ جب سے دیا سلائی کا بکس نکال کر کارڈ جلا دیا۔ اور دروازے کا تالا پھر بند کر کے یینجر کے کمرے کی طرف آیا۔

میں نے جلدی سے یینجر کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ لیکن جس تیزی سے میں نے اسے کھولا، ہرگز اس تیزی سے اسے بند نہ کر سکا۔ جان ولیم باندھ گلی ہوٹل کا مالک اور یینجر اپنی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے دونوں بازو میز پر اور اس کا چہرہ اس کے بانوؤں میں چھپا ہوا تھا۔ میں جان ولیم کو دو تین سال سے جانتا تھا۔ کسی نامعلوم وجہ سے ویٹن صاحب کو اس سے خاص انس تھا۔ جس کی بدولت مجھے جان ولیم سے ہزار دفعہ ملنے کا اتفاق ہوا تھا میں اس سے جب ملا اُسے مسکراتا ہوا پایا۔ جب اُس نے مجھ سے بات کی مجھے ہنسنا ہی گیا۔ آج اس کو اس قدر معنوم دیکھ کر مجھے ترس سا آیا۔ میں نہایت آہستہ سے دروازہ بند کر کے آگے بڑھ کر کے بیچ میں ایک چھوٹی سی گول میز تھی۔ اس پر اپنی ٹوپی اور بارانی کوٹ

کو پھینک دیا اور نہایت نرم آواز میں پکالاد ولیم! ”
 ولیم نے میز پر سے اپنا سر اٹھایا اور اگر مجھے اس کے غمزدہ ہونے میں کوئی شک تھا۔
 تو وہ سب رفع ہو گیا۔ اس کا چہرہ غم سے بالکل نا آشنا معلوم ہوتا تھا اور اس کے ہونٹ
 ایک رحم طلب انداز میں ذرا نیچے کو جھکے ہوئے تھے ٹپے دیکھتے ہی وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا
 اور کہنے لگا۔

” ویلٹن صاحب! نمبر کمرے میں ہیں۔“

میں نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے اور پوچھا۔

” ولیم! تم آج اس قدر غمگین کیوں ہو؟“

” کچھ دیر تو وہ خاموش رہا۔ پھر ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔“

” کچھ نہیں اپنے کاروبار کے متعلق بیٹھا سوچ رہا تھا۔“

اور سر نیچا کر لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس نے مجھے ٹال دیا ہے۔ میں نے اس سے کہا۔

” ولیم! تمہیں غمزدہ دیکھ کر مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے کہ تم مجھے اس قابل نہیں سمجھتے

کہ اپنی تکلیف مجھ سے بیان کرو۔“

شاید میرے خلوص اور صداقت نے اس پر اثر کیا۔ ایک ادھ منٹ تک وہ کچھ نہ بولا۔

اور دائیں ہاتھ کے ساتھ اپنے کوٹ کے ایک بٹن سے غافلانہ کھیلتا رہا۔ پھر سر اٹھا

کر کہا۔

” آپ کسی سے کہئے نہیں۔“

” مجھ پر یقین رکھو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں کسی سے نہیں کہوں گا۔“

” ہوٹل میں ایک قتل ہوا ہے۔“

” قتل؟ کب؟ کس کا قتل؟“

میں حیران تھا کہ آج دو بجے سے جو بات ہو رہی ہے غیر معمولی، جو واقعہ پیش آتا

ہے۔ فوق العادت۔ پہلے ویٹن صاحب کا پراسرار خط پھر اس کا ڈپر وہ پراسرار تحریر اور اب یہ قتل کی خبر میں نے میز پر سے اپنی ٹوپی اٹھا کر دونوں ہاتھوں میں پکڑ لی۔ میرے دل میں پریشانی، میری انگلیوں کی مضطربانہ حرکات سے ظاہر تھی۔ ولیم کی آواز نے آفرکار مجھے اس طرف متوجہ کیا۔

”۱۲ نمبر میں براؤن نامی ایک شخص دو مہینے سے یہاں رہتا تھا۔ کل شام کو چائے کے ہوٹل میں چائے پینے کے بعد وہ میر کو نکلا اور کھانے کے وقت تک واپس نہ آیا۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ واپس کس وقت آیا۔ کیونکہ نہ تو اس نے آکر کھانا مانگا اور نہ رات کے دس بجے تک اس کے کمرے میں کسی نے بیپ ہی جلتے دیکھا۔ جیسا کہ عام دستور ہے۔ صبح سات بجے وہ چائے پیا کرتا تھا۔ آج صبح حسب معمول نوکر اس کے کمرے میں چائے لے کر گیا تو دیکھا کہ خواب گاہ اندر حدبہ نظمی اور بے ترتیبی کی حالت میں ہے۔ تمام چیزیں الٹ پلٹ پرٹی ہیں اور براؤن اپنے بستر پر بغیر کسی اور عینے کے ڈینگ گون پہنے بٹا ہر سویا پڑا ہے۔ وہ اسے جگنے کی غرض سے نزدیک گیا تو معلوم ہوا کہ اس کی دائیں کٹیٹی پر ایک بٹا سا مہیب زخم ہے۔ اس کا رنگ بالکل زرد اور اس کی آنکھیں کھلی اور پھرائی ہوئی ہیں۔ دفعۃً نوکر پر اس بلت کا انکشاف ہوا کہ اس کے سامنے ایک سویا ہوا آدمی نہیں بلکہ ایک آدمی پڑا ہے۔ نوکر بھاگا ہوا میرے پاس آیا اور ٹوٹے پھوٹے فقروں میں براؤن کی موت کی خبر سنائی۔ میں اس کے ساتھ بارہ نمبر کمرے میں گیا اور حالات کو بعینہً ویسے پایا۔ جیسا کہ اس نے مجھ سے بیان کیا تھا۔ مسٹر امجد! آپ خیال فرمائیے کہ اس ناگوار واقعہ سے میری اور میرے ہوٹل کی نیک نامی پر کس قدر برا اثر پڑے گا۔ اس وقت میرے ہوٹل میں سو کے قریب آدمی رہتے ہیں مگر اس واقعہ کے طشت از یام ہو جانے کے بعد آپ یقین رکھے کہ ایک شریف آدمی بھی یہاں قدم نہ رکھے گا وہ کیوں رہیں؟ اس ہوٹل میں جہاں لوگ بلا وجہ قتل کر دیئے جاتے ہیں؟ جہاں مال کا نہیں جان کا خطرہ ہوتا ہے؟ میں کچھ ہوں، ہی

بد قسمت اور مجھے نہیں معلوم میری بد قسمتی کا زمانہ کب تک رہے گا۔ آپ کو علم ہوگا۔ جب میں اور میرا بھائی ہندوستان آئے تو پہلے پہل ہم نے بریلی میں مشترکہ سرمایہ سے ایک ہوٹل کھولا۔ لیکن تھوڑے عرصے کے بعد میں اس بات پر مجبور ہو گیا کہ چارلس کو علیحدہ کر دوں۔ اس کی عادات مجھے پسند نہ تھیں، اس کی سرکشی اور فضول خرچی ہوٹل کے کاروبار کے لئے اذیت دہن دہاں تھی۔ بھائی کو اس طرح علیحدہ کر دینا مجھے سخت ناگوار تھا۔ مگر اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ بریلی کے ہوٹل کا کام بہت زیادہ تھا اور میں اکیلا اس کا تحمل نہ ہو سکا۔ اسے چھوڑ کر میں نے اس جگہ ہوٹل کھولا اور اب یہاں یہ قتل ہو گیا ہے۔ اب یہ ہوٹل بھی ٹوٹ جائے تو بتائیے میں جہنم میں جاؤں؟“

ولیم کی داستان درد سے یمن اذیتناک ہو کر باوجود اس کے یا شاید اس وجہ سے یمن اس کے پاس سے بہت جلد جانا چاہتا تھا۔ ہزاروں طرح کے سوالات میرے دل میں اٹھے مگر میں نے سب کو دبا کر کہا۔

ولیم! تم ناحق اس قدر فکر کر رہے ہو۔ امید ہے قاتل کا پتہ بہت جلد مل جائے گا۔ تم ذرا حوصلہ کرو۔ تم نے کیا کہا؟ ولیم صاحب ۱۲ نمبر میں ہیں؟“

”ہاں۔ مگر آپ ۱۲ نمبر کمرے میں غسل خانے کے دستے جا بیٹھے۔“

یمن ”کیوں؟“ کہنے کو تھا۔ مگر ”اجیسا“ کہہ کر یاہر نکل آیا۔ بارش محکم چکی تھی اور پھلتے ہوئے سفید بادلوں میں سے نیلا نیلا آسمان کہیں کہیں سے نظر آرہا تھا۔

غسل خانے کی طرف سے ۱۲ نمبر کمرے میں داخل ہوا تو پہلے سونے کے کمرے میں پہنچا۔ بستر پر براؤن کی لائٹ بلیک سفید چادر سے ڈھکی پڑی تھی۔ یہاں سے میں نظر بہت گھما میں عین اس وقت داخل ہوا جس وقت ولیم صاحب کونے میں میز کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھے سگریٹ کھینچنے سے سگریٹ نکال رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے سگریٹ کھینچنے سے روک لیا۔

میری طرف بڑھایا۔ سگرٹ کو ہونٹوں میں دباتے ہوئے میں دیا سلائی جلا رہا تھا کہ
 ویلین صاحب بولے :-

” اچھا۔ تو تم سارا قصہ ولیم سے سن آئے ہو؟“

” ہاں۔ مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا؟“

وہ سگرٹ بلا پکے تو دیا سلائی کو انگیٹھی میں پھینک کر کہا :-

” جس وقت تم تھیا گلی سے پلے تو بارش ہو رہی تھی نا؟“

” موسلا دھا،“

” تو تمہارا باران کوٹ کہاں ہے؟“

” وہ تو..... میں منجھر کے کمرے میں بھول آیا ہوں“

” اور تم وہاں ہرگز نہ بھول آتے۔ اگر تم منجھر سے فقط میرا پتہ پوچھ کر چل دیتے۔“

اچھا۔ یہ دیکھو۔ سیٹھ فیروز جی اپنے بل فارم کس قدر خوبصورت پھپھواتا ہے؟

یہ کہہ کر انہوں نے میرے ہاتھ میں فیروز جی کی دکان کا ایک بل دیا۔ بل اسی قسم کا تھا۔

جس قسم کے نقد چیزیں خریدنے والوں کو دیئے جاتے ہیں اور جو بطور ایک رسید کے ہوتے

ہیں۔ بل پر خریدار کا نام ندارد تھا۔ صرف اس قدر لکھا ہوا تھا :-

ایک ڈیہ پانامہ سگار

ایک چھوٹا دسکی

۲۵ ۶ ۰

فارم پر سیٹھ فیروز جی کا نام وغیرہ رنگدار روشتنایوں میں واقعی نہایت خوبصورت

پھپھا ہوا تھا۔

میں مسلمان مشرب، شراب نوشی کی اصطلاحات سے ناواقف۔ میں نے پوچھا۔

”اس پھوٹا و سکی کا کیا مطلب؟ معمولی درجہ کی؟“

”نہیں۔ ایک پھوٹا و سکی کے معنی و سکی کا ایک پھوٹا پیگ۔ اب یہ دیکھو۔ ہمارے

ہوٹل کے فارم اگرچہ سائز میں اس سے بڑے ہیں مگر چھپائی میں کس قدر خراب ہیں“

اس کے بارانہوں نے باندھ گلی ہوٹل کابل فارم میرے ہاتھ میں دیا۔ میں حیران تھا۔

کہ ویٹن صاحب نے مجھے نتیجہ گلی سے اس لئے بلا لیا ہے کما نہیں بل فارموں کی چھپائی

کے سے اہم مسئلہ پر میری رائے کی ضرورت تھی۔ خیر میں نے بل کو دیکھا۔ چھپائی واقعی

کچھ قابلِ تعریف نہ تھی۔ باقی تحریر عام بلوں کی سی تھی۔

بل بنام ٹی بلاؤن صاحب کمرہ نمبر ۱۲ بابت ماہ جولائی

پائی آئے روپیہ

خوراک وغیرہ ۱۱۰۔۔۔۔۔

کرایہ ۳۰۔۔۔۔۔

۱۴۰۔۔۔۔۔

سیٹھ فیروز جی کابل میرے دائیں ہاتھ میں تھا اور ہوٹل کابل بائیں ہاتھ میں۔ میں

دو بار دو دو نوں کو دیکھ رہا تھا کہ ویٹن صاحب بولے:-

”یہ دونوں بل مجھے براؤن کے اس کوٹ کی جیب سے ملے ہیں جو وہ کل شام کو پہن کر

باہر گیا تھا۔ پہلا سوال جو ان بلوں کو دیکھتے ہی میرے دل میں اٹھا وہ یہ تھا کہ میری خوراک

کا خرچ ایک سو پچاس روپے ماہوار ہوتا ہے۔ براؤن کا ایک سو دس روپے کیوں تھا بیچر سے

دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ براؤن شراب نہیں پیا کرتا تھا نہ کھانے پر نہ کسی اور وقت۔

اس لئے وہ شراب کے چالیس روپے جو ہوٹل والے ہم سے چارج کرتے ہیں اس سے نہیں

لئے جلتے تھے۔

(میں نے دل میں براؤن صاحب مرحوم کو آخر میں کہا کہ نیکی کا کام تو کرتا تھا) ولین صاحب نے سلسلہ کلام پھر شروع کیا۔

۔ اگر وہ مشراب نہیں پیا کرتا تھا جیسا کہ مصدق ہے تو دوسرا سوال یہ ہے کہ اس نے

کل کیوں سیٹھ فیروز جی کی دکان سے وسکی کا ایک پیگ پیا؟

(افسوس براؤن مرتے مرتے یہ گناہ کر ہی بیٹھا)

”اب تم دیکھو۔ یہ طاق پر پانچ چھ سگاروں کے ڈبے پڑے ہیں۔ ایک میں تو کچھ

سگار ہیں۔ باقی سب خالی ہیں۔ مگر سب ڈبوں پر سگاروں کا نام ”سلطانہ“ لکھا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ براؤن کو ”سلطانہ“ سگار پینے کی عادت تھی۔ باوجود اس کے

سیٹھ فیروز جی کابل کہہ رہا ہے کہ کل اس نے ”پانامہ“ سگاروں کا ایک ڈبہ خرید لیا۔ یہ کیا

تعجب کی بات نہیں کہ ایک شخص جس کی نسبت ہوٹل کے جو لوگ اسے جانتے ہیں، وہ

گواہی دیتے ہیں کہ اس کی زندگی نہایت بچھڑے دمتین اور اس کی عادات نہایت سادہ اور

باقاعدہ تھیں۔ اپنی موت کے دن اپنے مقرضہ معمول سے اس قدر انحراف کرے کہ مشراب نہ

پیتا ہو تو اس دن مشراب پی لے لے لے سگار جو وہ غالباً پرسوں سے پی رہا ہے۔ چھوڑ کر ایک

اور قسم کے نہایت قیمتی سگاروں کا ڈبہ خرید لے۔ پھر وہ ڈبہ بھی تو اس کمرے میں کہیں

نہیں ملتا۔ کیا اس نے وہ کسی دوسرے شخص کے لئے خرید لیا تھا؟ لیکن نہیں۔ انگریزی کے پاس

سے مجھے یہ دو جلیے ہوئے سگاروں کے باقی ماندہ جھٹے ملے ہیں۔ جن کا تمباکو ”سلطانہ“ سگار

کے تمباکو سے بہت مختلف اور اعلیٰ ہے۔ غالباً پانامہ سگار یہی ہیں۔ چونکہ میں خود سگار

نہیں پیتا۔ اس لئے میری حقیقت اس بارے میں محدود ہے) تو گویا اس کمرے میں

دو پانامہ سگار پٹے گئے لیکن باقی کا ڈبہ غائب ہے۔ اب چلو خواب گاہ کا معائنہ

کر۔

یہ کہہ کر ہم دونوں خواب ہماہ میں گئے۔ ویلیٹن صاحب نے براؤن کی لاش پر سے چادر اٹھائی۔ براؤن ستر بچتہ برس کی عمر کا ایک پتلا ذبلا قرینا چھ فٹ دو اپنچ قد کا آدمی تھا اس کے چہرے سے بے انتہا شرافت ٹپکتی تھی اور تعجب ہوتا تھا کہ ایسے آدمی کو کوئی کس طرح قتل کر سکتا ہے۔ اردگرد کی سب چیزیں درہم برہم تھیں جیسے کوئی دو شخص ایک دوسرے سے کشتی لڑتے رہے ہوں۔

کنپٹی کے زخم کے علاوہ براؤن کا دایاں بازو بھی ٹوٹا ہوا ہے اور یہ دونو ضربیں معلوم ہونے لگی ہیں۔ کسی کُندوزنی چیز سے آئی ہیں۔ اس قسم کی کُندوزنی چیز دونوں کمروں میں کوئی نہیں۔ لیکن قابلِ غور ایک اور بات ہے وہ سامنے کھونٹی پر براؤن کا وہ کوٹ لٹکا ہوا ہے۔ جسے وہ کل پہن کر سیر کرنے گیا تھا۔ یہ کوٹ ایک دو جگہ بالکل تازہ پٹھا ہوا تھا۔ اب اگر یہ کوٹ اس کشمکش میں پٹھا ہے جس کشمکش کا نتیجہ براؤن کے لئے موت تھا تو کیا براؤن میں یا وجود ایک مہلک زخم اور ایک ٹوٹے ہوئے بازو کے اس قدر مہبت تھی کہ وہ کوٹ اتار کر نہایت سلیقے سے کھونٹی پر لٹکا تا۔ پھر اس کی جگہ یہ ڈریسنگ گون پہنتا جس کی ڈوزی کی کاٹھ قم غور کر و نہایت احتیاط سے دی ہوئی ہے۔ عقل کہتی ہے کہ یہ سب کچھ براؤن کا کام نہیں۔ اس کے علاوہ براؤن کے شام کے وقت پہننے کی ٹوپی جو کل شام مزور اس کے سر پر تھی۔ یہاں کہیں نہیں بنتی۔

یہ کہہ کر ویلیٹن صاحب نے حکم دیا ہونے میری طرف دیکھا۔ میں بڑے انہماک سے ان کی باتیں سن رہا تھا اور ساتھ ہی بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا۔ فی الحقیقت اس قتل کے گرد ایک ایسی تاریکی غیظ تھی جس میں میرے مجتہد دماغ کو کوئی راہ دکھائی نہ دیتی تھی جب میں ولیم سے قتل کا ماجرا سن رہا تھا تو میلر دل قتل اور قاتل کی نسبت ولیم کی مصیبت کی طرف زیادہ متوجہ تھا اور اب قتل مجھے ایسا اہم واقعہ معلوم ہو رہا تھا کہ میں ولیم کی تکلیف کو بالکل بھول گیا۔

ولیم صاحب مجھے ساتھ لے کر غسل خانے کے دروازے سے باہر نکلے۔ میں نے ان سے پوچھا:

”ہم چوروں کی طرح غسل خانے کے دروازے سے کیوں آتے جاتے ہیں؟“
وہ بولے۔

”ولیم نے جب تمہیں سارا حال سنایا تو اس نے تم سے یہ وعدہ نہیں لیا کہ تم کسی کو نہ
کہو گے؟“

”لیا تھا!“

”ہوٹل میں تین پاراڈمیوں کے سوا اور کسی کو اس واقعے کا علم نہیں اور حتیٰ الوسع کوشش کی جا رہی ہے کہ جب تک تفتیش کسی خاص نتیجے پر نہ پہنچے اس کا ذکر نہ کیا جائے جو نوکر صبح براؤن کی پائے لے کر آیا تھا اور جس نے سب سے پہلے اس ہوٹل میں براؤن کو مرا ہوا دیکھا اس کو ولیم نے شاید کچھ روپے دے کر خپل دن تک اس معاملے پر زبان بند کھنے کی ہدایت کی ہے۔ سب انسپکٹر صاحب بھی شریف آدمی تھے۔ انہوں نے بھی وعدہ کیا ہے کہ جب تک انہیں کسی خاص شخص کے خبر نہ ہونے کا پورا یقین نہ ہو جائے وہ کسی سے ذکر نہ کریں گے۔“
”اچھا تو پولیس کو اطلاع دی گئی ہے؟“

”اوہو۔ ولیم نے تم سے نہیں کہا۔ سب انسپکٹر صاحب خانی کاغذوں، ایک دستہ اور قلم دوات لے کر یہاں آئے تھے۔ میز کے کمرے میں کھنڈ بھری بیٹھ کر بیانات قلمبند کرتے رہے پھر ایک نوٹ لے کر فٹار کر کے ساتھ لے گئے۔ مگر وہ بالکل بے گناہ ہے۔“
”تو انہوں نے اسے کیوں گرفتار کیا؟“

”پولیس کی تفتیش کے ڈھنگ نرالے ہیں۔ سب انسپکٹر صاحب نے پہلے تو براؤن کے کمرے کا سرسری معائنہ کیا۔ اس قدر سرسری کہ تم اب ان سے جا کر پوچھو تو انہیں اس کمرے کی شاید ایک چیز بھی یاد نہ ہوگی۔ پھر ولیم سے پوچھا کہ کل رات یہاں کون کون آدمی آیا تو آئے تھے۔“

وہ صرف ایک فیروز خاں بہرہ تھا جو کل مری سے ولیم کے بھائی چارلس کے ہمراہ یہاں آیا تھا۔ چارلس تو کل شام پانچ بجے ولیم کے کمرے میں ایک چٹ پھوڑ گیا کہ میں مری واپس جا رہا ہوں میرا نوکر فیروز خاں رات یہیں رہے گا۔ فیروز خاں اپنے آقا کی مرضی کے مطابق رات باندھ گلی ہوٹل میں رہا اور آج صبح گرفتار کر لیا گیا۔

”چارلس یہاں کیا کرنے آیا تھا؟ اس کی بھائی کے ساتھ ناچاتی سی ہے“

”ناچاتی سی تھی۔ جان ولیم شریف خصلت انسان ہے۔ چارلس مغرور اور عیاش ہے۔ مگر آخر جان کا بھائی ہے۔ جان کو اس پر ترس آیا اور ان میں پھر رابطہ محبت قائم ہو گیا۔ چارلس نے مری میں ایک ہوٹل کھولا ہوا ہے۔ کل یہاں میرے لئے آیا تھا۔“

یہاں میں یہ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مری باندھ گلی سے پندرہ میل کے فاصلے پر ہے اور گھوڑے پر تین گھنٹے کا راستہ۔

یہ باتیں ہم ہوٹل کے ٹینس کچھ جمن میں کھڑے ہوتے کر رہتے تھے۔ یہاں سے ہم بیچر کے کمرے کی طرف گئے۔ جان ولیم نے ویلیٹن صاحب کو دیکھا تو ولیم ورجن کے لہجے میں پوچھا۔

”آپ کسی نتیجے پر پہنچے ہیں؟“

”بھی تو نہیں۔ مگر بہت جلد پہنچنے والا ہوں..... ہم چائے ڈاک بنگلے میں بیٹھیں گے۔“

میں نے اپنا باران کوٹ بیچر کے کمرے سے اٹھایا اور ہم نے ڈاک بنگلے کی پہاڑی پر چرہ معترض کر دیا۔ میں نے اپنی کلائی کی گھڑی کو دیکھا تو چارلس بکنے میں ساست منٹ تھے۔

ویلیٹن صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ آج شام کو کمانا شاید نصیب نہ ہو۔ چائے کے

ساتھ ہی جو کچھ کھانا جو کھا لو مجھے دوست یوں بھی دسترخوان کا غاصب سمجھتے ہیں اور رات کو کھانا نہ ملنے کے ڈر سے تو خدا جانے میں نے کس قدر کھایا۔ جب میں رات کی فاقہ کشی کا خاطر خواہ انتظام کر چکا تو میں نے ٹانگیں پھیلا کر سونے کی خالی کرسی پسکھ دیں۔ ویلٹن صاحب میرے پاس برآمدے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہل رہے تھے۔ مجھے پیٹ کی قدر سے فراغت پلتے دیکھا تو میرے سامنے اکھڑے ہوئے۔

میں اکثر ان کے موزوں قد اور منہ کے تناسب کو دیکھ کر رشک کے مارے جلا کرتا تھا۔ لیکن اس وقت ساری کے لباس میں وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت معلوم ہوتے تھے انہوں نے برجس کی جیب میں سے پستول نکال کر اسے کھولا اور میری طرف ہاتھ بڑھا کر کارٹوس لنگے۔ میں یہ معمول ہی گیا تھا کہ میں چھ فالٹو کارٹوس بھی ساتھ لایا ہوں۔ اب جو انہوں نے مجھ سے ان کا ذکر کیا تو مجھے ٹوٹ پیپر بھی یاد آئے۔ میں کہنے کو تھا کہ وہ نوٹ پیپر بھی میرے پاس ہیں مگر کسی خیال سے چپ رہا اور جیب سے کارٹوس نکال کر ان کے ہاتھ میں رکھ دیئے انہوں نے ایک ایک کر کے سب کو پستول میں بھر دیا۔ پستول بند کر کے پھر جیب میں ڈال لیا اور مسکرا کر کہنے لگے:

”میرے کارٹوس ختم ہو گئے تھے۔ اس لئے میں نے تمہیں لانے کو کہا تھا۔ میں تمہارا پیچھ۔
کارٹوسوں کا قرضدار ہوں۔“

ان کا یہ بظاہر تکلف فی الحقیقت عین بے تکلفی تھا۔ لیکن مجھے کچھ عجیب گھبراہٹ سی ہوئی۔ میں اس کے جواب میں خدا جانے کیا کہتا۔ لیکن انہوں نے مجھے اس کی فرصت نہ دی اور دفعتاً پوچھا:

”تو تمہاری براؤن کے متعلق کیا رائے ہے؟“

”میں تو سب سے پہلے سیٹھ فیروز جی کے بل کا معاملہ کرنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے۔
میں سیٹھ کے پاس جا کر کسی ڈھنگ سے پوچھ آؤں کہ یہ پانامہ کارڈ ہے اور ایک چھوٹا و سکی کرہ نے

خریدا تھا۔

” بہت خوب بہت خوب۔ تم اب روز بروز عقلمند ہونے جاتے ہو اور چونکہ معلوم ہوتا ہے نہیں تفتیش جرائم میں خاص ملکہ حاصل ہے اس لئے ساتھ ہی تحصیل سے یہ بھی پوچھتے آنا کہ چارلس نے کل شام کے پانچ بجے مری جلتے کے لئے گھوڑا کرایہ پر لیا تھا؟“
بچے پھر کچھ گھبراہٹ سی ہوئی۔ لیکن پھر کچھ جواب بن نہ پڑا۔ کھسیانا ہو کر یہیں ڈاک ٹنگ سے باہر نکل آیا۔

پانچ منٹ کے بعد میں دودھ ہی سے مسکراتا ہوا ڈاک بنگلے کے برآمدے میں داخل ہوا۔ ویلن صاحب ٹہلتے ٹہلتے رُک گئے اور ایک منتظرانہ انداز میں کھڑے ہو گئے۔
میں نے نہایت بے تکلفی سے کہا: کل مورخہ ۳ اگست کو شام کے پانچ بجے چارلس ولیم صاحب مری ہوٹل کے مالک اور مینجر نے سیٹھ فیروز جی اینڈ برادر اس کی دکان سے ایک ڈبہ پانامہ سگار کا خریدنا اور ایک پیگ و سکی کا پیا۔ تحصیل سے کل بصر کے سات بجے سے لے کر شام کے آٹھ بجے تک انہوں نے کوئی گھوڑا کرایے پر نہیں لیا۔ پہلی بات بچے سیٹھ فیروز جی کی زبانی اور دوسری بات گھوڑوں کے ٹھیکیدار کی زبانی معلوم ہوئی۔ مگر اس ڈھنگ سے کہ انہیں شاید محسوس بھی نہیں ہوا کہ ان سے یہ باتیں کوئی پوچھ گیا ہے۔“
یہ کہہ کر میں نے اپنے ہاتھ پہلوؤں پر رکھ لئے اور نہایت بے پروائی سے دوہن قدم برآمدے کے پتھر کے فرش پر ٹھلا۔ پھر مڑ کر میں نے ویلن صاحب سے کہا۔
” وہ سگاروں کے جلمے ہوتے ٹکڑے جو آپ نے بھاؤن کے کمرے میں سے اٹھائے تھے۔ وہ تو ذرا دکھائیے۔“

انہوں نے فوراً میرے ارشاد کی تعمیل کی۔ میں نے ایک ٹکڑا لے کر اسے کھولا پھر ان تپہ پانامہ سگاروں میں سے جو میں سیٹھ کی دکان پر سے خرید کر لایا تھا۔ ایک سگار لے کر اس کے تمباکو کے پتے کو کھولا اور دونوں کا مقابلہ کیا۔ مرہیا نہ لہجے میں ویلن صاحب سے کہا۔

”آپ کا قیاس ٹھیک تھا۔ یہ جیلے ہوئے سگابے شک پانامہ سگار ہیں۔“

انہوں نے جھک کر کہا ”آپ کی عین فحاش۔“

”تو اب ہم مری چلیں گے نا؟“

”جس طرح حضور حکم کریں۔“

میں بے اختیار کھل کھا کر منہس پڑا۔ وہ بھی مسکرا دیتے۔ وہ پانامہ سگار سگابے ہم ڈاک بگلہ سے تھمیل کی طرف آئے۔ دو گھوڑے لے اپنے باران کوٹ وہاں باندھے جہاں بسنگیس نے ہرن کے بچے کو باندھا تھا اور اپنے پستولوں کو جیبوں میں ٹٹول کر گھوڑوں پر سوار ہو کر مری کی طرف روانہ ہو گئے۔

باندھ گلی سے آدھ میل نکل کر، ہم نے گھوڑوں کو دوڑکی پر چھوڑ دیا۔ چپ چاپ جنگلوں کی مہیب عظمت، چیز، تر، کھنڈ اور بن گھوڑ کے اونچے اونچے درخت ایک طرف پہاڑوں کی پُر شکوہ بلندی، دوسری طرف کھنڈ کی پراسرار گہرائیاں تنگ پیچیدہ سڑک، اس پر گھوڑوں کے سس کی مسلسل آواز، آبشاروں کا شور، کونوں کی دردناک گونگائی میں تو بے خود ہو گیا۔ درختوں کے نیچے سے غروب آفتاب کے بریلے بستے ہوئے تھامے کبھی چھپ کر کبھی ظاہر ہو کر ٹھیسے بے دائرہ رہتے۔ آبشاروں کا سفید پانی بڑے بڑے پتھروں پر ٹکر کر تحت الشری میں دوٹی پھینک رہا تھا۔ میرا دل بار بار کھنڈ میں کود پڑنے کو چاہا۔

میرے ہونے نے ایک غیر مانوس آواز سے رنجیدہ ہو کر مجھے چونکا دیا۔ ویلٹن نے جو مجھ سے دس گز آگے جا رہے تھے، اپنا گھوڑا روک لیا تھا اور گھوڑے کی پیٹھ پر ہاتھ رکھے مڑ کر مری کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے قریب جا کر ٹھہر گیا۔ وہ بولے :-

”مری بائیسکوپ کا تماشا کس وقت شروع ہوتا ہے؟“

”شاید پونے آٹھ بجے۔“

” اور اب سلا پھرنے میں اور مری یہاں سے پانچ میل سے تو گویا ہم بائیسکوپ کا تماشیکہ
سکتے ہیں۔ اب ذرا ہلکے ہلکے نہ چلیں؟“
” میں خود یہی کہنے والا تھا۔“

ہم نے گھوڑوں کو قدم قدم لے جانا شروع کیا۔ کچھ دیر تو ہم ناموشی سے ایک دوسرے کے
ساتھ چلتے رہے۔ پھر ایک دم ویٹن صاحب نے قمار بازی کی اقتصادی، روحانی و اخلاقی
قباحتوں پر ایک پونڈور پکچر دینا شروع کر دیا اس شدت سے کہ میں سمجھا اس فعل مذموم کے
اختراع کا مجرم وہ مجھے سمجھتے ہیں۔ دس منٹ تک لگاتار وہ اس موضوع پر ایک پڑمفز تقریر
کرتے رہے۔ میں ناموشی سے سنتا رہا۔ پھر انہوں نے دفعۃً باگیں کھینچ کر گھوڑے کو ٹھہرا لیا
اور میری طرف دیکھ کر کہنے لگے۔

” اور مجھے شرم کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ قبیح حادثہ اہل فرنگ میں کثرت سے
ہے۔ وہ لوگ جو ہند بگھرانوں کی اولاد اور سوسائٹی کے معزز افراد شمار ہوتے ہیں، بلا تکلف
شام کو کھانے کے بعد اپنی بیٹیوں، بہنوں اور بھائیوں کے ساتھ جوا کھیلتے ہیں شاید ہی
کوئی ہم صحبت دوست ایسے ہوں جو شام کو کلب میں تاش کھیلے بغیر رہ سکیں اور سارے
کلب میں تاش کی ایک بازی ایسی نہیں ہوتی جس کی ہارجیت کے ساتھ روپے کی ہارجیت
دالستہ نہ ہو اور اس کو یہ لوگ شغل سمجھتے ہیں۔ اس کو روحانی انبساط کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔
ساتھ ہی پھر یہ دعویٰ ہے کہ تہذیب جدید بنی نوع انسان کی ترقی کا باعث ہوئی ہے۔
غلام و سراسر غلط کہتے ہیں۔ تہذیب جدید نے کئی نئی خرابیاں ایجاد کی ہیں۔ مردہ جیوب
کو از سر نو زندہ کیا ہے اور کئی پرانی قباحتوں کو پہلے سے زیادہ بہر و لعزیز کر دیا ہے۔
” میں حیران تھا کہ اس شخص نے اپنا دماغ کس قدر قابو میں رکھا ہے۔ مجھے ہرگز اس پلٹ
کی توقع نہ ہو سکتی تھی کہ چار گھنٹے پیراؤن کی موت پر دقیق غور و خوض کرنے کے بعد وہ یکایک
اس طرح تعلق باتیں کرنے لگ جائیں گے۔ جیسے وہ اس سے محض بے خبر ہوں اور پھر

اس وقت جب کم از کم میرا دماغ خیالات کے عدم اظہار کی وجہ سے بیش از بیش اسی سوچ میں مصروف تھا۔ ویلین صاحب میں میں نے بڑی غاصیت دیکھی ہے۔ کہ وہ یک لخت اپنے خیالات کو بغیر کسی تکلیف کے ایک طرف سے دوسری طرف منتقل کر سکتے ہیں۔ وزیر اعظم انگلستان کے کیرکٹر پر بحث کو ختم کئے ابھی دو منٹ نہیں گزرتے کہ وہ چین کی ریشم کی تجارت کے متعلق باتیں کہنے لگ جاتے ہیں۔ ہزار آدمیوں کے ساتھ نہایت انہماک سے متواتر تین گھنٹے تک وہ اصلاحات ہند پر ملک کے ایک مشہور اسپیکر کی دھواں دھار تقریر سنتے رہتے ہیں۔ اور لکچر ہال سے باہر نکلتے ہی ہسپانیا کی آب و ہوا کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

ارد گرد عظیم الشان پہاڑ اور اونچے اونچے درخت اس شاندار انسان کو دیکھ کر خاموش تھے۔

ویلین صاحب ان سے بالکل فافل چپ چاپ گھوڑے پر چلے جا رہے تھے۔

مری بائیکوپ سے ہم دس بجے نکلے۔ ویلین صاحب برجس کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سگریٹ کے پیہم کش لگا رہے تھے۔ میں نے معمول کے مطابق اپنی گھڑی کو کوکنا شروع کیا۔ ویلین صاحب بولے:-

”یہ بھی گھڑی کو کئے کا وقت ہے؟“

”میں سونے سے پہلے گھڑی کو کوک دیا کرتا ہوں۔ دن کے وقت اور کاموں کی وجہ سے

یہ کام بھول جاتا ہوں۔ اب خلا کرے خواجہ محمد حسین و میں میرے ٹائم پیس کو کوک رکھیں۔“

”ٹوٹ ٹائم پیس اور کلائی کی گھڑی کو ایک ہی وقت کوک دیتے ہو؟“

”اُس میں کیا ہرج ہے؟ بلکہ یہ تو اچھی بات ہے۔“

”میرا بھی قاعدہ ہے اور۔۔۔ شاید۔۔۔ ہر ایک۔۔۔ عقلمند۔۔۔“

اگر میرے حواس نے مجھے دھوکا نہیں دیا تو میرا خیال ہے کہ ویلین صاحب نے اتنا کہہ کر اگلا قدم ذرا آہستہ اٹھایا اور ایک لمحے کے لئے ان کے روپے میں نمایاں تبدیلی ظاہر ہوئی۔ لیکن پھر وہ پہلے کی طرف اُبالیا نہ طریقے میں چلنے لگے۔ آدھ منٹ کے بعد ایک معمولی فخرے کی صورت میں انہوں نے مجھ پر ایک بم گرا دیا۔

”اگر تم ٹائم پیس اور کلائی کی گھڑی کو ایک ہی وقت کوک دیتے ہو۔ تو براؤن کل شام کے چارجنگ کر ۲۵ منٹ پر مرے۔“

مجھے برگزینہ آیا کہ میں نے ٹھیک سنا ہے۔ چونکہ میں نے پوچھا:-

”کیا کہا آپ نے؟“

”میں نے کہا ہے کہ اگر تم دونوں گھڑیوں کو ایک ہی وقت کوک دیا کرتے ہو تو براؤن کل شام کے چارجنگ کر ۲۵ منٹ پر مرے اور چونکہ چارجنگ کر ۲۵ منٹ پر وہ یقیناً ہوٹل کے باہر تھا۔ اس لئے اس کی موت اس کے کمرے میں نہیں بلکہ باہر کہیں واقع ہوئی ہے۔ اس کے بعد اگلے رات کے وقت اس کی لاش اٹھا کر اس کے کمرے میں لائی گئی۔ وہاں اس کا کوٹ اتار کر اسے ڈریننگ گون پہنایا گیا اور بستر پر لٹا دیا گیا۔ اور پھر اس کی خواب گاہ کی چیزوں کو وہ ہم برہم کر دیا گیا۔“

میں تعجباً استعجاب، استفہام اور اسی طرح کی بیس بیس چیزوں کا معجون مرتبہ ان کے چہرے کی طرف منہ کئے باؤد کر نے والی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور مجھے یقین تھا کہ ویلین صاحب بالکل پاگل ہو گئے ہیں۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائے، سگریٹ کو منہ سے نکال کر ہوا کی تار بگی میں کہیں اچھال دیا اور بولے:-

”جب میں نے براؤن کے کوٹ کی تلاشی لی تو اس میں سیٹھ فیروز جی کے بل اور ہوٹل کے علاوہ مجھے براؤن کی جیسی گھڑی بھی ملی تھی۔ جو مجھے یاد ہے کہ چارجنگ کر ۲۵ منٹ پر ٹھہری ہوئی تھی۔ میں نے کوتاہ بینی سے یہ خیال کیا کہ گھڑی اس لئے بٹھری گئی کہ اسے کوکنے والا مر

گیا ہے (مجھے اس وقت یہ نہ سوجھا کہ گھڑی کی چابی پھیر کر دیکھ لیتا) براؤن کی نشست گاہ میں میز پر اس کا ٹائم پیس بھی مٹھا ہوا تھا اور اس کے مٹھریلے کی وجہ سے بھی میں نے یہ خیال کیا لیکن اب مجھے یاد آیا ہے کہ ٹائم پیس کی سوئیاں پونے دس بجے پر ساکن تھیں۔ ٹائم پیس کے ساتھ تو کسی غیر معمولی واقعہ کے پیش آنے کا گمان نہیں ہو سکتا۔ اس لئے وہ تو اسی وقت مٹھا ہے جس وقت اس کی کوک ختم ہو گئی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ براؤن اپنے ٹائم پیس کو۔۔۔ اور اگر دونوں گھڑیوں کو ایک ہی وقت کوک دینا احسن ہے تو دونوں گھڑیوں کو قریباً نو بجے (اغلباً رات کے نو بجے) کو کام کرتا تھا۔ جیسی گھڑی جو چار بج کر ۲۵ منٹ پر مٹھری ہے تو اس کا مٹھا جانا اس جہانی کشمکش کا ایک نتیجہ ہے جو براؤن کو موت کے وقت اپنے قاتل کے ساتھ یقیناً کرنی پڑی۔ اگر تم اور میں جو شاید بہت باقاعدہ زندگی بسر کرنے کا دعوئے نہیں کر سکتے۔ اپنی دونوں گھڑیوں کو ایک ہی وقت کوک دیتے ہیں تو براؤن جس کی زندگی کی ہر ایک حرکت اپنی تلی اور ہر ایک عادت باقاعدہ اور مقرر کردہ تھی۔ کیا یہ اغلب بلکہ یقینی نہیں کہ وہ اپنی دونوں گھڑیوں کو ایک ہی وقت کوک دیا کرتا تھا؟

جوں جوں وہ یہ کہے گئے براؤن کی موت کی ہر ایک تفصیل مجھ پر آشکارا ہوتی گئی ایک دو باتوں کے متعلق پھر بھی میرے دل میں الجھن باقی رہی۔ وہی ویلٹن صاحب کے دماغ میں بھی پھر رہی تھیں۔ وہ کہنے لگے:-

”بیٹھ فیروز جی کابل اور دوپا تاہ سگاروں کے جلے ہوئے باقی ماندہ ٹکڑے صاف بتا رہے ہیں کہ چارلس ولیم نہ صرف براؤن کے کمرے میں داخل ہوا ہے بلکہ وہاں کم از کم تین چار گھنٹے مٹھا رہے (دو سگاروں کے پینے کے لئے کچھ وقت چلے گئے) سو یہ تو تم بغیر خوف و تردید فرض کر لو کہ براؤن کی لغزش کو باہر سے اٹھا کر لانے والا چارلس ولیم ہی تھا اور براؤن کی تندی لباس اور خواب گاہ کی بد نظمی کا ذمہ دار بھی وہی ہے۔ اب صرف دو چار حل طلب باتیں باقی ہیں:-

اول: یہ کہ کیا چارلس ولیم صرف براؤن کی نعش کو باہر سے اٹھا کر کمرے میں لایا یا کہ قتل بھی اسی نے کیا ہے؟

دوم: یہ کہ اگر اس نے قتل نہیں کیا، تو قاتل کون ہے؟
سوم: یہ کہ اس نے دیکھنے والوں کے دلوں میں یہ غلط خیال ڈالتے کی کوشش کیوں کی کہ یہ قتل براؤن کے کمرے میں ہوا ہے؟

چہلم: یہ کہ سیٹھ فیروز جی کی دکان کابل براؤن کی جیب میں کیسے چلا آیا؟
براؤن مارا کہاں گیا ہوگا؟ اقلباً ادھر ادھر کہیں جنگلوں میں؟
”شاید۔ لیکن جہاں کہیں بھی وہ مارا گیا ہو وہاں اس کی موت کی ایک یادگار باقی ہے۔ بشرطیکہ جنگلی جانوروں نے اسے وہاں رہنے دیا ہو۔“
”وہ کیا؟“

”اس کی شام کے وقت پہننے کی ٹوپی۔“

اس حیرت انگیز انکشاف نے مجھے اس قدر مغیر کر دیا کہ میں گرو نوچ کی سب چیزیں بھول گیا۔ ویٹن صاحب جدمر جدمر متے تھے ہیں بھی ان کے ساتھ ساتھ چلتا جاتا تھا۔ آخر کار وہ ایک ہوٹل کے سامنے جا ٹھہرے اور کہنے لگے:-
”یہ چارلس ولیم صاحب کا ہوٹل ہے۔ میرے خیال میں ان کی ملاقات ہمارے لئے فخر اور مسرت کا باعث ہوگی۔“

اس وقت شاید ساڑھے دس بجے ہوں گے۔ سڑک کے لیمپوں کی روشنی رات کی محیط تاریکی کے ساتھ ایک ناکامیاب ساٹا موٹو مقابلہ کر رہی تھی۔ ہوٹل کے کمروں کے باہر کہیں کہیں کوئی نوکر پھرتا ہوا نظر آتا تھا۔ ہم ہوٹل کی سیڑھیوں پر چڑھنے کے بعد ہوٹل کی ڈیوڈھی میں داخل ہوئے۔ دفتر کا معاذہ کھلا تھا اور میز کے سامنے دو باپو بیٹھے صاحب

کر رہے تھے۔ ہم نے ان سے میخبر کا پتہ پوچھا تو معلوم ہوا میخبر صاحب ساتھ کمرے میں
 ہیں۔ میخبر کے کمرے کا دروازہ کھول کر ہم اندر گئے۔ چارلس ولیم ایک آدام کمرے سی پریٹھا نہایت
 اطمینان سے سگار پی رہا تھا۔ اور سامنے ایک چھوٹی سی میز پر ایک خوش نما کنسٹر اور ایک
 گلاس اس کی میز پرست طبیعت کی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے پڑے تھے۔ ہمیں
 دیکھتے ہی چارلس اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے اس کی شکل اچھی طرح یاد ہے۔ اس کے خط و خال صاف
 بتا رہے تھے کہ وہ جان ولیم کا بھائی ہے۔ لیکن اس کے بسم اور جان ولیم کے بسم میں زمین
 آسمان کا فرق تھا۔ جان ولیم جب مسکراتا تھا۔ اس کے چہرے سے صاف کوئی اور نیک نیتی
 ٹپکتی تھی۔ بد خلاف اس کے چارلس کی مسکراہٹ میں انقباض اور جبر کے عنصر غالب تھے
 جو اس کے بسم کو صنومی اور ناقابل اعتبار بنا دیتے تھے۔

وہ رسمی لہجے میں کہنے لگا۔

”صاحبان! میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟“

ولین صاحب نے نہایت بے پروائی سے کہا۔

”ہم یہاں صرف رات گزارنا چاہتے ہیں۔ اگر تم ہمیں دوسو نوے کے کمرے سے سکو تو

تمہاری بہت مہربانی ہوگی۔“

”بہت خوشی سے“ یہ کہہ کر چارلس نے ایک نوکر کو بلا کر کہا۔ ”ان کو نمبر ۲۲ نمبر ۲۳ میں

لے جاؤ۔“ پھر ہم سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

”آپ کو کھانا تو نہیں چاہیے؟“

ولین صاحب بولے:

”نہیں صرف کافی کے دو پیالے بھیج دو۔“

ہم دونوں نمبر ۲۲ میں بیٹھے تھے کہ نوکر ایک طشت میں کافی کے دو پیالے لایا۔

ولین صاحب نے اس سے کہا۔

• میخیز کو یہاں بھیج دو، یہ کہہ کر ہم دونوں کافی پینے لگے۔ میں نے پوچھا:-

• آپ نے میخیز کو کیوں بلا یا ہے؟

خدا جلنے لھے خاطر خواہ جواب ملتا یا نہ کہہ اتنے میں دروازہ کھلا۔ چارلس ولیم اندر داخل ہوا۔ اور ہمارے سامنے آکر ایک خالی کرسی پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

ویلٹن صاحب نے مسکرا کر کہا:-

• مسٹر چارلس ولیم۔ میں تمہارے ہوٹل کی کافی کی تعریف کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کم از کم باندہ بگلی ہوٹل میں اور بھی بہت سی قباحتیں ہیں۔ وہاں کا انتظام کئی پہلوؤں سے ناقص ہے۔ کل ہی وہاں ایک آدمی کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ لیکن میں تو ہوٹل کی بد انتظامی کی نسبت قاتل کی شرافت سے زیادہ متاثر ہوا ہوں کہ ایک تو وہ قتل کرنے کی تکلیف اٹھانے پھر نعش کو اپنے کندھے پر ڈال کر محفوظ جگہ میں لاکر رکھے۔ پھر اس خیال سے کہ نعش کو رات بھر سردی نہ لگے۔ اسے ڈریسنگ گون پہناتے اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ سیٹھ فیروز جی کی دکان کا ایک بل مقول کی جیب میں چھوڑ جائے۔ تاکہ اس کا پتہ لگانے میں کوئی وقت نہ ہو۔ مسٹر چارلس ولیم! مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کی کافی کے علاوہ آپ کی شرافت کی داد دوں۔“

میرے کان ویلٹن صاحب کی باتوں پر اور میری نگاہ چارلس کے چہرے پر تھی۔ چارلس کا چہرہ اس طنز آمیز اور پڑ حقارت تقریر سے نمٹا اٹھا اس نے اپنے ماتھے پر ایک بیج دریچ توری ڈال لی۔ منہ کو زور سے بند کر کے کرسی کو اپنے ہاتھوں سے مضبوط پکڑ لیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ویلٹن صاحب کی طرف دیکھنے لگا۔

میں نے ایک لمحے کے لئے بھی اپنی نگاہ چارلس کے چہرے سے نہ اٹھائی غصے کے اندیکھ کر میں تے ہلکے سے پستول نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔

ویلٹن صاحب نے نہایت بے پروائی سے کافی کے پیالے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

دفعہ چارلس نے کرسی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور اگر میں ایک لمحہ بھی
توقف کرتا تو کرسی پورے زور میں ولین صاحب کے سر پر آپڑتی۔

چارلس نے میرے پستول کی سیاہ نالی کو اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے دیکھا اور بہتر
بھی سمجھا کہ اپنے ادادے کو کم از کم اتنی کمر دے۔

ولین صاحب کی آواز میرے کان میں پڑی۔

”مجھ چارلس صاحب کو اسی طرح رکھنا۔ میں ذرا کافی پی لوں،“ ولین صاحب باقی
کی کافی پی کر کرسی پر سے اٹھے اور دروازے کی طرف گئے۔ دروازے کے تالے میں چابی
پڑی تھی۔ اسے پھر اکرتا لانا بند کر دیا اور چابی نکال کر جیب میں ڈال لی۔

دروازہ بند کر کے وہ ہماری طرف واپس آئے اور میرے پستول کی طرف اشارہ
کر کے کہنے لگے۔

”اسے جیب میں ڈال لو۔ میں چارلس صاحب سے لڑنے تو نہیں آیا۔“

چارلس کی طرف مخاطب ہو کر بولے۔

”مسٹر چارلس ولیم! ہم نہ تو پولیس کے بھیجے ہوئے آدمی ہیں۔ نہ پولیس کو اطلاع دے
کر یہاں آئے ہیں۔ نہ اب تک۔ ہمارا ارادہ پولیس کو اطلاع دینے کا ہے (تم اس کرسی پر بیٹھ
جاؤ، تم قدرتی طور پر پوچھو گے کہ میرا اس قتل سے کیا تعلق ہے؟ میرا تعلق صرف اس قدر
ہے کہ جان ولیم باندہ گلی ہوٹل کا مالک۔ تمہارا بڑا بھائی میرا دوست ہے۔ تم اچھی طرح جانتے
ہو کہ اس کو اس سے پہلے زندگی میں کتنے صدے اٹھانے پڑے ہیں کس قدر مصیبتوں کا مقابلہ
کرنا پڑا ہے۔ تمہاری طرف اور اپنے کاروبار کی طرف سے کس قدر تکالیف اور رنج برداشت
کرنے پڑے ہیں۔ پہلے بریلی میں تمہارے اپنی برائیوں کی وجہ سے اس کو اس بات پر مجبور کیا۔
کہ وہ تمہیں علیحدہ کر دے۔ اکیلا رہ جانے کی وجہ سے وہ اپنے نوکروں کی بددیانتی کا تجربہ
بن گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ متواتر دو سال تک وہ ہوٹل سے نقصان اٹھاتا رہا اور اسی وجہ سے

اس نے بریلی کا ہوٹل چھوڑ کر باندھ گلی میں اپنے سرٹے سے یہ ہوٹل جاری کیا۔ پھر اس کو معلوم ہوا کہ تم لکھنؤ میں شرمناک طرح پر زندگی گزار رہے ہو۔ وہ تمہارا بڑا بھائی تھا۔ اسے رنج ہوا۔ اس لالہ تمہاری ذلیل زندگی کو دیکھ کر کڑھتا تھا۔ وہ لکھنؤ جا کر تمہیں وہاں سے لے آیا اور اپنے پاس سے روپیہ دے کر مری میں تم سے یہ ہوٹل کھلوا یا اور شکر کیا کہ بالآخر تم نے از سر نو شریفانہ رویہ اختیار کر لیا ہے اور اب اس قتل کی وجہ سے اس کے ہوٹل کی جو بدنامی ہوگی۔ اس کے ذمہ دار بھی تم ہو۔ اس کے علاوہ تمہارا لاکر فیروز خاں قتل کے الزام میں گرفتار ہے۔ گو تم میں شرافت اور صداقت اس درجہ مرچکی ہے کہ تم ایک بے گناہ کو اپنے سامنے پھانسی پر چڑھتے دیکھ لو گے۔“

چارلس کا چہرہ اس تقریر کے زیر اثر بدتر بیچ بدلتا گیا اور اس کے چہرے پر مختلف جذبات ظاہر ہوتے گئے۔ انتقام، غضب، استفہام، توجہ، نرم دلی، ندامت و اخوس سب باری باری اس کی آنکھوں میں سے جھانک جھانک کر چلے گئے۔ لیکن ولین صاحب نے اپنی تقریر اس وقت ختم کی جب انہیں چارلس کے ملے تھے پورا اس کے کندھوں کے نیچے ہٹنے میں ہمت اور مردانگی کے آنا نظر آئے۔

چارلس نے کھڑے ہو کر کہا۔

”فیروز خاں ہرگز نہ پھانسی نہ پائے گا۔ آپ اطمینان رکھتے جو کچھ میں نے کہا، بہت بڑا کیا اور میں از حد شرم و ندامت کے ساتھ اس وقت اپنی ذلیل حرکت کا اعتراف کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے قتل نہیں کیا اور شاید میں کبھی قتل نہیں کر سکتا۔“

”اٹا۔ تو میں نے اچھا کیا کہ میں تمہارے پاس آیا۔ اگر تم سارے حالات ہمیں سنا دو، تو میرے دوست ساتھ ساتھ لکھتے جائیں گے۔“

ولین صاحب نے میری طرف دیکھا میں نے جیب میں سے نوٹ پپر روپیہ جو میں

ختیا گلی سے ساتھ لایا تھا، نکال کر پھیلائے اور ملٹن صاحب سے ان کا قلم لے کر جو جو چارلس کتارہا، لکھتا گیا۔

وہ تحریر نہ تو اس وقت بچے لفظ بہ لفظ یاد ہے اور نہ اس کا یہاں ہو ہوا نقل کرنا ہی ضروری ہے۔ اس کا مطلب صرف اتنا تھا کہ چارلس جب جمعہ کے دن بانڈہ گلی گیا تو شام کو جاتے پینے کے بعد براؤن کی طرح وہ بھی سیر کرنے نکلا۔ پہاڑیوں میں وہ ایک چھوٹی پگڈنڈی پر جا رہا تھا کہ سلسلے سے اس نے ایک انگریز کو آتے دیکھا۔ اس کے دیکھتے دیکھتے اس انگریز کا پاؤں پھسلا اور وہ لڑھکتا لڑھکتا پگڈنڈی سے سات آٹھ گز نیچے جا پڑا۔ چارلس بھاگا بھاگا اس کے پاس گیا اور اسے زمین پر سے اٹھایا۔ لیکن اس کا سر ایک بڑے پتھر کے ساتھ ٹکراتے کی وجہ سے اس کی کینٹی کو ایک ہلکے ضرب آئی تھی۔ اس کو معلوم نہ تھا کہ یہ کون ہے اس کا نام و نشان معلوم کرنے کی غرض سے اس نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ ایک جیب میں سے بانڈہ گلی ہوٹل کا بل ملا جس سے چارلس کو معلوم ہوا کہ اس انگریز کا نام ٹی براؤن ہے اور یہ بانڈہ گلی کے ۱۲ نمبر کمرے میں رہتا ہے پہلے تو اسے خیال ہوا کہ بانڈہ گلی میں جا کر اس کی موت کی اطلاع دے۔ لیکن کچھ دیر سوچنے کے بعد اس کے دل میں ایک بڑا ذلیل خیال آیا اور اس نے اپنا پہلا ارادہ ترک کر دیا۔ بانڈہ گلی آکر اس نے پانامہ سگاریوں کا ایک ڈبہ خریدنا اور وہاں سے اسکی ایک پیگ کیا۔ اور پھر ہوٹل میں آکر بھائی کے نام چٹ چھوڑ گیا کہ میں مری واپس جا رہا ہوں۔ لیکن خود ادھر ادھر پہاڑیوں میں رات کی تاریکی کا انتظار کرتا رہا قریباً گیارہ بجے براؤن کی لغش کو اٹھا کر وہ ہوٹل کی طرف لایا اور موقع پا کر لغش سمیت براؤن کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہاں براؤن کا کوٹ اتار کر اسے ڈرینگ گون پہنایا اور خوب گاہ کی چیزیں الٹ پلٹ کر دیں۔ تاکہ معلوم ہو قتل اسی کمرے میں ہوا ہے اور یہ سب باتیں اس نے بھائی کے حمد کے مارے کیں۔ اس کا مدعا بانڈہ گلی ہوٹل کو بدنام کرنے کا تھا۔ پھر وہ لات بھر براؤن کے کمرے میں رہا۔ جہاں وہ سویا بالکل نہیں اور صبح پو پھٹتے ہی پیشتر

اس کے کہ بانڈہ گلی کا کوئی اُدنی جاگے وہ پیدل ہی مری کو چل دیا۔
 میں اس کا سانا بیان لکھ چکا تو ویلٹن صاحب نے کاغذ مجھ سے لے کر چارلس کے آگے
 رکھ دیئے اور کہا: ان پر دستخط کر دو۔ کچھ دیر تو چارلس ساکن رہا۔ پھر قلم اٹھا کر دستخط کر دیئے
 اس کے بعد ہوٹل کے دفتر کے ایک بالو کو بلا کر اسے تحریر کا مطلب بتائے بغیر اس کے دستخط
 بھی بطور گواہ کے کرائے گئے۔ پھر ویلٹن صاحب نے ان کاغذوں کو لفافے میں بند کر کے
 لفافے کے اوپر عجیب سے پتہ لکھوایا:-

سب انسپکٹریوں کو۔ بانڈہ گلی

معرفت پریٹنڈنٹ پولیس۔ ضلع ہزارہ۔ ایسٹ آباد

لفافے کو ہاتھ میں لے کر چارلس سے کہا:-

اس لفافے کو میں ابھی ٹاک میں ڈال دوں گا۔ یہاں سے ایسٹ آباد اور ایسٹ آباد
 سے بانڈہ گلی یہ تین دن میں پہنچے گا۔ تب تک تم اگر چاہو تو کہیں کے کہیں پہنچ سکتے ہو
 میں تمہیں پولیس کے حوالے نہیں کرنا چاہتا۔ تمہاری یہ تحریر فیروز خاں کی رہائی کے لئے
 کافی ہوگی۔

دوسرے دن صبح ہم بانڈہ گلی پہنچے۔ گیارہ بجے کے قریب ہوٹل کے ۳۵ نمبر کمرے
 میں، میں اور ویلٹن صاحب آرام کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ویلٹن صاحب اجندہ کا تازہ
 پرچہ دیکھ رہے تھے۔ میں سٹارٹ نے بیٹھا خاموشی سے سگریٹ پی رہا تھا اور دل میں کل کے
 واقعات کو ایک ایک کر کے دہرا رہا تھا۔

ویلٹن صاحب نے اخبار کو سامنے سے ہٹایا۔ تو میں نے پوچھا:

”وہ سیٹھ فیروز جی کابل براؤن کی جیب میں کس طرح آگیا؟“

”سیٹھ فیروز جی کابل؟ وہ تو معمولی بات ہے۔ جب چارلس نے براؤن کی جیب سے ہوٹل کا

بل نکالا تو اسے پڑھ کر پھر جیب میں ڈال لیا۔ اس جیب میں جہاں بعد میں اس نے فیروز جی کا بل رکھا۔ مری جانے سے پہلے اس نے ہوٹل کا بل اپنی جیب سے نکال کر پھر براؤن کی جیب میں ڈال دیا اور غلطی کے ساتھ فیروز جی کا بل بھی چلا گیا۔

” اور ہاں۔ آپ نے خاص فیلے نوٹ پیرلے کو کیوں کہا تھا؟“

” میرے اپنے پاس تو وہی نوٹ پیرلے ہیں جن پر ہوٹل کا نام چھپا ہوا ہے وہ میں نے اس لئے استعمال نہ کئے تھے کہ کوئی اگر چاہتا تو ان کے ذریعے سے سیرا پتہ لگا سکتا تھا اور میں نہیں چاہتا کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس صاحب میری اس حقیر سی خدمت کے لئے مجھ ناچیز کے شکریہ گزار ہوں۔ بازار سے نئے نوٹ پیر خریدنا قرین مصلحت نہ تھا۔ اس لئے میں نے تمہیں تکلیف دی۔“

” مگر وہ چارلس کا بیان تو نہ صرف میرے نوٹ پیروں پر بلکہ میرے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اگر سپرنٹنڈنٹ پولیس صاحب آپ کی بجائے میرے شکریہ گزار ہوں تو میں کیا کروں؟“

” سوجی میں آئے کرنا۔ لیکن خدا کے لئے میرا نام نہ لینا۔“

سپرنٹنڈنٹ صاحب پولیس یوں تو مجھے اچھی طرح جانتے ہیں لیکن مجھے یہ یقین نہ تھا کہ وہ میرے ہاتھ کی تحریر پہچان لیں گے۔ ایک ہفتے کے بعد ان کا ایک نیم سرکاری خط میرے نام آیا۔

ڈیر مسٹر امجد!

میرے پاس اس بات کے یقین کرنے کے لئے زبردست وجوہات ہیں کہ مسٹر ٹی براؤن ساکن باندہ گلی ہوٹل کی موت کے متعلق پولیس کو نا انصافی اور گمراہی سے پھیلنے میں اپنے بہت سادہ لیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ پولیس کو اس مقدمے میں جو کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ سب آپ ہی کی بدولت ہے۔ آپ مجھے اس بات کی اجازت دیں کہ میں تمام حکمہ کی طرف سے آپ کی بے غرضانہ مساجی کے لئے آپ کا شکریہ ادا کروں۔

مجھے یقین ہے کہ آپ کے طریقہ تفتیش کی تحصیل خالی از دلچسپی نہ ہوگی۔ اگر آپ ہمیں اس سے آگاہ بنی نکتہ تو سب حالات کو پولیس جنرل میں شائع کر دیا جائے۔ امید ہے آپ میری اس درخواست کو قبول فرما کر مجھے فخر بخشیں گے۔
آپ کا غلط

“.....”

میں نے اسی وقت اس کا جواب لکھ کر ٹاک میں ڈال دیا۔

جناب عالی۔

سٹر بلاؤن کی موت کے متعلق میں نے سوائے چارلس ولیم کا بیان لکھنے کے اور کچھ نہیں کیا۔ یہ سب انکشافات مجھ سے ایک بددجہا اعلیٰ دماغ کے عوز و خوض کا نتیجہ ہیں۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ کہنے کا حق حاصل نہیں۔
شاید پرنٹنگ صاحب اسے کس نفسی ہی سمجھیں مگر میں اور کیا لکھتا۔
• پطرسس

(دکشاں۔ اکتوبر۔ نومبر۔ دسمبر ۱۹۱۹ء)

قدیم یونانی حکماء اور ان کے خیالات

(۱)

مصنفین فلسفے کی تاریخ کو عام طور پر حکماء کے اُس گروہ سے شروع کرتے ہیں جو چھٹی صدی قبل مسیح میں ایشیائے کوچک کے کنارے یونانیوں کے بسائے ہوئے شہر مبلاتیس میں آباد تھا۔ یہ حکماء مسئلہ تغیر کے متعلق بہت کچھ سوچتے رہے وہ دیکھتے تھے کہ یہ دنیا عالم کون و فساد ہے اشیاء بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔ تعمیر کے ساتھ تخریب اور تخریب کے ساتھ تعمیر ہمیشہ کے لئے وابستہ ہے مگر باوجود اس کے کوئی چیز بھی عدم مطلق سے وجود میں نہیں آتی اور نہ وجود سے عدم مطلق ہی میں چلی جاتی ہے۔ دنیا کی کوئی چیز بالکل از سر نو شروع نہیں ہوتی اور نہ کبھی دائمی اختتام ہی پہنچتی ہے۔ ہر ایک چیز کھلتا ہی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ مگر آخر یہ تغیر کسی چیز کا ہے وہ ایک چیز کیا ہے جو مختلف ہینٹوں میں آکر مختلف اشیاء اور اجسام بن جاتی ہے؟ وہ کونسا ایک مادہ بنیادی ہے جو متغیر ہو کر مختلف شکلیں اختیار کر لیتا ہے؟ یہ ایک مسئلہ تھا جس کو حل کرنے پر قدیم یونانی حکماء نے اپنی کمر مہمت باندھی۔

سب سے پہلے تھالس نے پانی کو کائنات کا مادہ بنیادی قرار دیا۔ اس کے بعد این ایکسی نڈا آیا اور اس نے کہا کہ یہ مادہ بنیادی ایک غیر محدود مادہ ہے جس میں سے مختلف اجسام بنتے ہیں۔ این ایکسی مینیز نے اس کو بخارات سمجھا جو درحقیقت حالت میں حرارت پا کر آگ بن جاتے ہیں۔ یا مینجد حالت میں ٹھنڈے ہو کر پانی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

مسیح سے ۴۹۴ سال پہلے ایرینیوں نے حملہ آور ہو کر مبلاتیس کو تاراج کر دیا اور حکماء

کے اس گروہ کا اپنے مزو بلوم میں ہی خاتمہ ہو گیا۔ مگر انہی ایام میں میلاطیس سے کچھ فاصلے پر شہر افیس میں ایک فلاسفر ہر قلاطیس نامی موجود تھا جو میلاطیس کے فلسفیوں کا جانشین سمجھا جاتا تھا۔ ہر قلاطیس کو دنیا کی سب باتیں قابلِ تاملت و افسوس معلوم ہوتی تھیں۔ اس لئے بعد میں وہ ”حکیم باکی“ کے نام سے مشہور ہو گیا جس طرح سے کہ دی مقرر اٹیس کو لوگ ”حکیم ضامک“ کے نام سے پکارتے تھے۔ کیونکہ اس کے لئے زندگی کی سب باتیں ذریعہ فرحت و انبساط تھیں۔ ہر قلاطیس کے نزدیک کائنات کا مادہ بنیادی آگ ہے وہ تو یہ کہتا تھا کہ ہماری قوت فکر بھی اس ابدی آگ کا ایک حصہ ہے جس سے سرعت سے شعلہ متغیر ہوتا رہتا ہے۔ وہ کسی طرح بھی خیال کی سرعت سے کم نہیں۔ اور شعلے کا آخر لامرد حواں بن جانا خیال کی اس بے ترقیبی اور بے نظمی کو ظاہر کرتا ہے جو شہر اب کے نشے کی حالت میں واقع ہوتی ہے۔

مگر تاریخ فلسفہ میں ہر قلاطیس کی اہمیت اس وجہ سے نہیں کہ اس نے بھی اور حکما کی طرح کسی چیز کو کائنات کا مادہ بنیادی قرار دیا۔ جس مسئلہ پر اس نے بہت زور دیا ہے وہ خود مسئلہ تغیر ہے تمام دنیا ایک بہتی ہوئی ندی کی طرح ہے جو ہر وقت اپنے آبِ رواں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ متصل کرتی رہتی ہے وہ کہتا تھا کہ ہم ایک ہی دریا میں دو دفعہ داخل نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ جس پانی میں ہم نے ایک دفعہ پاؤں ڈالا۔ دوسری دفعہ پاؤں ڈالتے وقت وہ کہیں کا کہیں بہ جاتا ہے۔ اس مسئلے کو مان لینے کے بعد فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمارے تمام علوم بے سود ہیں؟ جب اشیاء کی حالت ہر لمحہ بدلتی رہتی ہے۔ تو جو بات ہم کسی چیز کے متعلق اس وقت بیان کرتے ہیں۔ وہ ہمارے منہ سے نکلنے ہی غلط ہو جاتی ہے کیونکہ وہ چیز بذاتِ خود اس وقت تک بدل کر کچھ اور ہو جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہر قلاطیس کے بعض معتقدوں نے اسی لئے کلام کرنا ترک کر دیا تھا۔ اس کے بجائے وہ اشاروں سے باتیں کرتے تھے۔ کیونکہ جتنے وقت میں ایک جملہ تکمیل کو پہنچتا ہے اتنے وقت میں اس جملے کا مقصود غلط ہو جاتا ہے۔ بعض معتقد تو یہاں تک کہتے تھے کہ ہر قلاطیس کا یہ کہنا کافی نہیں کہ ہم کسی دریا میں

وودفعہ پاؤں نہیں ڈال سکتے بلکہ یوں کنا چہیٹے کہ ہم کسی دریا میں ایک دفعہ بھی داخل نہیں ہو سکتے کیونکہ ایک لمحے کے لئے بھی کوئی دریا سکون کی حالت میں نہیں ہوتا اور ہمارے پاؤں ڈالتے ڈالتے وہ بظاہر ایک دریا برآں ایک نیا دریا بن کر ہمارے سامنے سے گزر جاتا ہے۔

ہر قلاطیس کے مسئلہ تغیر کے مندرجہ بالا نتائج کو قلاطیس نامی ایک فلاسفر سے منسوب کیا جاتا ہے۔ قلاطیس ہر قلاطیس سے سو سال بعد میں ہوا ہے اور افلاطون اپنے بچپن کے زمانے میں اسی قلاطیس کا شاگرد تھا۔ افلاطون کی پیدائش مسیح سے ۴۲۷ سال پیشتر ہوئی۔ اُس نے اطفال عمر میں جو کچھ اپنے استاد سے اس بدمگر تغیر کے متعلق سنا اُس نے اسے اس بات کی ترغیب دلائی کہ وہ ایسی چیز ڈھونڈے جو اس گردش سے بالاتر ہو۔ جواز میں جیسی تھی بے تک ویسی ہی رہے اور جس کی نسبت اگر انسان کوئی واقفیت حاصل کرے تو وہ واقفیت اور وہ علم بھی ہمیشہ کے لئے درست اور کارآمد ہو یہاں ہم کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ہر قلاطیس اور اُس کے پیر و مسئلہ تغیر کا اطلاق محض غسوسات پر کرتے تھے کیونکہ غسوسات کے علاوہ وہ اور کسی قسم کی حقیقت یا وجود کے قائل ہی نہ تھے اس لئے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ ان معنوں میں قائلین مادیات تھے جن معنوں میں کہ آج کل مادیات کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ انہوں نے غسوسات اور غیر غسوسات کے درمیان خط تفریق کبھی کھینچا ہی نہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ قوت خیال بھی اسی طرح جگہ گھیر سکتی ہے۔ جس طرح مادہ اور مادہ بھی اپنے اندر قوت خیال رکھتا ہے۔ افلاطون عرصے تک کسی غیر متغیر و غیر غسوس حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہا اور آخر میں اُس نے منزل پر پہنچنے کے لئے وہ راہ اختیار کی جو ایٹھنز کے نامور حکیم سقراط نے اُس کو بتائی۔

دنیا میں بہت سی شاندار ہستیاں ایسی ہوئی ہیں جنہوں نے مخالف کے لئے ورثے میں اپنی کوئی تحریر یا مکتوب یا تصنیف نہیں چھوڑی۔ اُن کا حال اُن کے ہم عصروں کی روایتوں سے ہی معلوم ہوتا ہے۔ سقراط بھی انہی ہستیوں میں سے ایک تھا۔ اُس کے حالات زیادہ تر یا

تو ارسطو فانیس نامی شاعر کے ایک ڈرامے سے ملتے ہیں جس میں سقراط کا مضحکہ اڑایا گیا ہے اور جب سقراط پچاس برس کی عمر کا تھا تو پہلی دفعہ وہ موریانا اسٹیج پر کھیلا گیا اور اس کے کچھ حالات نامور جرینل زینوفون کی اس تصنیف سے بھی کچھ ملتے ہیں۔ جو سقراط کی موت کے بعد لکھی گئی اور یا افلاطون کے مشہور و معروف "مکالمات" سے کچھ پتہ چلتا ہے۔ ارسطو فانیس۔ زینوفون اور سقراط کی طرح افلاطون بھی ایٹھنز کا باشندہ تھا۔ جوانی کی عمر ہی میں وہ سقراط کا شاگرد ہو گیا۔ بعد میں جب اُس نے وہ "مکالمات" لکھے جن کے اندر اُس کی شکل میں اسکے اپنے استاد سقراط اور سقراط کے معترضین کے مباحثے مندرج ہیں تو اُس نے سقراط کے ذاتی خیالات کے علاوہ وہ نتائج بھی اُسی کے نام کے ساتھ منسوب کر دیئے جن پر وہ سقراط کے بتائے ہوئے راستوں پر چل کر خود پہنچا تھا۔

ارسطو فانیس نے اپنے ڈرامے میں قدامت پسند اہل ایٹھنز کا نمائندہ بن کر سقراط کے نئے نئے عقیدوں کی تہمت لگائی ہے۔ اُس کا خیال تھا کہ نئے نئے خیالات اور یہ منطقی بحثیں مذہب اور اخلاق کے لئے اذہر صفت رساں ہیں۔ بر خلاف اس کے زینوفون سقراط کو ایک کامل رہنما۔ روحانی مددگار پیر میٹرگاری اور نفس کشی کا ایک سچا نمونہ اور اُن تمام لغو اور بے ہودہ خیالات کا جو قوم کی اور گھرانوں کی اصلاح کا باعث نہیں ہو سکتے دشمن بیان کرتا ہے۔ افلاطون نے اپنے استاد کی جو تصویر کھینچی ہے اُس کے مطالعے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کن کن مختلف زاویہ ہائے خیال سے ایک ہی شخصیت کو اُن دو طریقوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس دماغی ترقی کے زمانے میں اس زبردست ہستی کے اندر ایک ایسی روحانی تڑپ تھی جو اُس کے ہم صحبتوں کے دلوں میں بڑتی رہی اور اس کی طرح سرایت کر جاتی تھی۔ اس کی شکل و صورت اگرچہ حسین نہ تھی۔ لیکن اس میں وہ مقناطیسی کشش تھی جو شکل و صورت کی محتاج نہیں۔ وہ ایٹھنز کے نوجوانوں کے دلوں کو اس کی طرف کھینچ لے آتی تھی۔ جن کو اُس کی صحبت میں بیٹھنے کا موقع حاصل ہوا۔ وہ جانتے تھے کہ سقراط کی گفتگو محض منطقی ڈھکوسلے ہیں۔ سقراط منطقی یا وہ گونہ تھا۔ اس کے دل میں یہ خیال جاگزیں تھا کہ اُس کو الہام ہوتا ہے اور خدا نے اُس کو ہدایت بنی نوع انسان

کے اہم کام پر مقرر کیا ہے۔ یہ خیال اس کے دماغ کو ایک نئی قوت اور اس کی زبان کو ایک نوکھی بلاغت بخشتا تھا۔ اُس کی آنا د زندگی اُن تمام بندشوں سے رہا تھی جن کی وجہ سے ایک دنیا دار پایہ زنجیر ہو گیا ہے اُس کی روش میں مضیب کی سادگی اور اس کی عادات میں اعلیٰ درجے کا ضبط تھا۔ ارسطو فانیس جو سقراط اور اس کے عقائد کو ایتھنز کے نوجوانوں کے لئے خراب اخلاق سمجھتا تھا۔ اپنے ڈلے میں سقراط کی زندگی کا وہ دلخشاں پہلوئے حیات مہرگز نہیں بتا سکتا تھا جس پہلوئے حیات نے افلاطون اور افلاطون کی طرح اور سینکڑوں کو سقراط کا گرویدہ کر رکھا تھا۔ ۳۹۹ قبل مسیح میں جب سقراط کی عمر ۷۰ سال سے کچھ زیادہ تھی۔ اہل حکومت نے اس پر دو الزام لگائے اول یہ کہ وہ نوجوانوں کے اخلاق کو خراب کر دینے کا باعث ہوا ہے۔ دوسرے یہ کہ اُس نے اپنے ملک کے دیوتاؤں کو ماننے سے انکار کیا ہے۔ حکم دیا گیا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے زہر کا پیالہ پی کر ہمیشہ کے لئے اپنی غیر مفید ہستی کو مٹا دے۔ سقراط اگرچہ چاہتا تو جیسا کہ قانون اُس کو اجازت دیتا تھا۔ اپنے جرم کے کچھ حصے کا اعتراف کر کے اپنی سزا میں تخفیف کر سکتا تھا۔ اگرچہ خودنا دار تھا۔ مگر اُس کے پیروؤں میں سے اکثر اسے معمول تھے۔ جو اُس کے لئے بڑے بڑے اجر مانہ ادا کر سکتے تھے اور صرف یہی نہیں بلکہ اگر وہ چاہتا تو اُس کی ایک جہش ابرو کی تعمیل میں اُس کے بے شمار دوست اُس کو قید سے نکال لے جاتے اور وہ اپنی باقی ماندہ عمر اپنے وطن سے باہر آرام و آسائش میں کاٹتا۔ مگر مرتے دم تک اس کو اپنی بے گناہی کا یقین رہا۔

قانون کی خلاف ورزی کو وہ گناہ سمجھتا تھا اور قید سے بھاگ جانے کا اس کے دل میں کبھی خیال تک بھی نہ آیا۔ جو الزام اُس پر لگائے گئے۔ ان میں سچائی صرف اتنی ہے کہ سقراط کا بعض ایسے گروہوں سے میل جول تھا۔ جنہوں نے مذہب میں نئی نئی رسمیں اور بدعتیں پیدا کیں اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اُس نے بناتِ خود مذہب کی علانیہ مخالفت کی ہو۔ اگرچہ اُس کا کبھی کبھی الہام وغیرہ کے متعلق ذکر کرنا یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ اپنے زمانے کے عقیدوں

کاچنڈل قافلہ تھا۔ سقراط کی تعلیم کا نوجوانوں پر یہ اثر ہوا کہ ان میں راست روی اور ضبط نفس کا مادہ پیدا ہو گیا۔ مطلق العنان زندگی کی بد اخلاقیوں اور بد عنوانیوں سے کنارہ کش ہو کر وہ اپنے استاد کے نقش قدم پر چلنے لگے اور پاکیزگی اور نیکو کاری کو اپنی زندگی کا مقصد اعظم سمجھ کر اسے ہمیشہ اپنے مد نظر رکھتے لگے۔ تخریب اخلاق کا شبہ محض اس وجہ سے پیدا ہوا کہ ایام جوانی میں سقراط کی دوستی چند ایسے اشخاص سے تھی جو بعد میں اپنی باغیانہ حرکتوں کے لئے بدنام ہو گئے۔ سقراط اپنی حکومت کی کمزوریوں سے پوری طرح آگاہ تھا۔ پھر بھی مرتے دم تک قانون کا پابند رہا۔ اس کے مشہور جابند اعلان میں سے افلاطون تو سپارٹا کی حکومت کو ایتھنز پر ترجیح دیتا تھا اور زینوفون ایتھنز کو جھوڑ کر سپارٹا کی فوج میں داخل ہو گیا۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ ہر فلاطیس کے عقیدہ تغیر کی وجہ سے افلاطون کا دل تذبذب کی حالت میں تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ اگر ہر ایک چیز ہر لمحہ بدلتی رہتی ہے تو علم کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ اشیائے تغیر کی وجہ سے ان کا علم بھی ہر لمحہ متغیر ہونا چاہیے اور متغیر علم کا حاصل کرنا بے سود ہے۔ ان خیالات سے اس کے دل میں کسی ایسی چیز کی جستجو پیدا ہوتی جس کی حالت ابدی ہو اور جس کا علم ہمیشہ کے لئے درست ہو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کس طرح سے وہ سقراط کے بتائے ہوئے راستوں پر چل کر اس علم صحیح پر پہنچا۔

سقراط ایتھنز میں فرقہ سفسطائی کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا۔ ان دنوں میں "سفسطائی" محض دانا یا حکیم کے معنوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ دنیا سقراط کو "سفسطائی" سمجھتی تھی۔ مگر سقراط کے پیرو اس کو ان لوگوں کا دشمن خیال کرتے تھے جن کو سفسطائی، کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہ لوگ اپنی تعلیم سے اس بات کی اشاعت کرتے تھے کہ نیکی اور بدی میں تمیز قدرت کی مقرر کردہ اور ابدی نہیں ہے۔ اس تمیز کا انحصار محض رسم و رواج پر ہے جس فعل کو ایک حالت میں "نیکی" کہا جاتا ہے۔ وہی فعل بعض اور واقعات کے ماتحت "بدی" بن جاتا ہے جس پر خطر زلزلے میں ایسے بے ہودہ خیالات سے راست نوزندگیوں کے عقیدے مترنل

ہونے کو تھے ادا اخلاق انسانی ایسی کچھ بھنٹوں سے معرض خطر میں تھا۔ اُس وقت سقراط آگے بڑھا ادا اُس نے اپنی نیک نیتی اور صحیح الدماغی سے لوگوں کی رہنمائی کی۔ اُس نے کہا ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ایک کام جو ایک حالت میں ٹھیک ہوتا ہے۔ کسی اور حالت میں برا ہوا اور اس صورت میں ہم یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ وہ فعل "نیک" یا "بد" ہے مگر ہمارے ان فقروں سے کم از کم یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ نیک و بد کچھ معنی اور حقیقت ضرور رکھتے ہیں۔ مثلاً جب ہم کسی شخص کی دیانتداری بیان کرتے ہیں تو ممکن ہے کہ ہم کو اس کی نیت کا حال معلوم نہ ہو یا ہم حالات سے پوری طرح واقف نہ ہوں اور ہماری رائے اس کی دیانتداری کے متعلق غلط ہو۔ ہم کہیں گے۔ "میرا خیال تھا کہ وہ دیانتدار ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ میں غلطی پر ہوں" مگر ہم یہ بھی نہ کہیں گے "کہ ہم جاننے ہی نہ تھے کہ دیانتداری کیا چیز ہے" کیونکہ ہم اگر دیانتداری ہی سے ناواقف تھے تو غلط یا صحیح رائے کس طرح قائم کر سکتے۔ اس لئے سب سے مقدم یہ ہے کہ ان الفاظ سے جن کو منطق میں موضوعات کہا جاتا ہے۔ پوری طرح واقف ہوں۔ مثلاً سچا منصف بہادر وغیرہ اور ہر ایک کی تعریف کہہ کے اس کے معنوں کی توضیح کریں۔

سقراط کسان خیالات تھے کہ انصاف، بہادری وغیرہ وغیرہ حقائق ابدی ہیں اور ان کے معنوں کی تحلیل ان کی تعریفوں سے ہو سکتی ہے۔ افلاطون کو اندھیرے میں شمع ہدایت دکھائی۔ ہر قلاطیس کے عقیدوں نے علم صحیح کے رُوح تاباں کے آگے شک و گمان کی ایک دُھندلی سی نقاب ڈال رکھی تھی۔ جس کو سقراط نے اپنے انوارِ ادراک سے تار تار کر دیا۔ یہ حقائق عسوسات کے دُمرے سے باہر ہیں۔ جن اشیاء کا احساس ہمیں اپنے حواسِ خمسہ کے ذریعہ ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی موضوعات میں سے کسی نہ کسی کی نمود ہوتی ہے۔ مگر اس موضوع کو بذاتِ خود ادراک سے تعلق ہے۔ نہ کہ حواس سے۔ سقراط ان باتوں سے اس نتیجے پر پہنچا کہ عام عسوسات کے علاوہ جس میں اشیاء ہمیشہ انتقال و تغیر کی حالت میں رہتی ہیں اور جہاں کسی چیز کا علم کوئی حقیقت نہیں رکھتا ایک اور دنیا حقائق ابدی

کی بھی ہے اور ان حقائق کا علم بھی اُن ہی کی طرح ابدی ہے۔ عالم متغیر کی ہر ایک چیز کے ساتھ ایک حقیقتِ ابدی لھو ہے اور جو راستے ہم عام متغیر کی کسی چیز کی نسبت دیتے ہیں اُس میں اس حقیقتِ ابدی کا علم صحیح مضمر ہوتا ہے۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ ”فلاں شخص دیانتدار ہے۔“ تو اس فقرے میں اس بات کا اقل ہوتا ہے کہ ہمیں دیانتداری کی حقیقت کا علم ہے۔

سقراط نے اس بارے میں اپنے خیالات اخلاقیات کے زمرے تک ہی محدود تھے مگر افلاطون یہ آسانی اس سے بہت آگے چلا گیا اور اُس نے ان متغیر اور ابدی حقائق کا اطلاق ہر ایک چیز پر کیا۔ مثلاً یہ کہنا کہ خط و ب خط ج د کے مساوی ہے۔ مساوات کے علم کو تسلیم کرتا ہے تو مساوات گویا ایک ایسی حقیقتِ ابدی ہے۔ جس کا احساس حواسِ خمسہ سے نہیں بلکہ ادراک سے ہو سکتا ہے ”مساوات“ بذاتِ خود جوکل تھی وہ آج بھی ہے اور کل بھی رہے گی۔ جوکل ہمیں معلوم ہو جانے کو خط و ب اور خط ج د در حقیقت آپس میں برابر نہیں۔

یہ مسئلہ حقائقِ ابدی افلاطون کی تعمیرِ فلسفہ کا سنگِ بنیاد ہی ہے۔ افلاطون ان حقائق کو اپنی زبان میں IDEAS کہا کرتا تھا۔ یہ نقطہ اب تک انگریزی زبان میں موجود ہے مگر اس کے معنی اب ان معنوں سے بہت مختلف ہیں۔ جن معنوں میں افلاطون نے اس کو استعمال کیا۔

(۲)

لیکن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی مشعلِ حکمت ہر ایک شخص کی شمع سے روشن کر لیا کرتا تھا۔ افلاطون کی نسبت بھی یہ کہنا فلتنہ ہو گا کہ ہر فلاطیس اور سقراط کے علاوہ اور بھی بہت سے قدما کی تعلیم نے اس کے دل و دماغ کی خوابیدہ قوتوں کو بیداری اور گمراہ خیالات کو ہدایت بخشی۔ اس نے بہت سا اقباسِ فیثاغوریوں سے کیا۔ جن کے ساتھ اُس کے آقا کے دو تازہ تعلقات تھے۔ فیثاغورس سیح سے تقریباً ساڑھے پانچ سو سال پہلے جو میرہ ماہوں

میں پیدا ہوا۔ یہ جزیرہ ایشیائے کوچک کے ساحل کے ساتھ ہی واقع ہے۔ جہاں سب سے پہلے وہ یونانی حکماء کیسے کیا کرتے تھے۔ جو بعد میں ان یونانی نوآبادیوں میں جلیسے اور جن کی وجہ سے جنوبی اٹلی، یونان اعظم، کے نام سے مشہور ہے۔

فیثاخوردس نے ایک مذہبی جماعت کی بنیاد ڈالی۔ جس نے کچھ عرصے کے لئے قرطائلی حکومت پر فلیبہ پالیا۔ سیلاطیس حکم کے اپنے فلسفے کو مذہب کے ساتھ تعلق دینے کا خیال نہیں کیا۔ یونان سے ان کی مراد کوئی ذمی شعور لائق عبادت ہستی نہ تھی بلکہ اس نقطہ سے ان کا مطلب محض نظام مادی کا ایک بڑا عنصر تھا۔ فیثاخوردس مذہب نے اگرچہ ایک طرف ان وحشیانہ توہمات اور رسوم کو جن سے لوگوں کے اعمال اور خیالات کنارہ کش ہو چکے تھے۔ از سر نو رواج دے دیا۔ مگر دوسری طرف اپنے تبارخ اور عقیدہ دوام روح سے عظمت فردیہ اور انسانی زندگی کی ذمہ داریوں کے احساس کو لوگوں کے دلوں میں بڑھا دیا۔ اس نے یہ بات دنیا کے دل نشین کردی کہ انسانی ہستی قابلِ وقعت اور لائق حرمت ہے۔ اس کو سطح آب پر محض ایک حجاب نہ سمجھنا چاہیے۔ انسان ایک ایسی حقیقت رکھتا ہے۔ جس کے لئے حن آتش سوار یا چمک برق کی تمثیل کسی طرح سے شایاں نہیں ہو سکتی۔ سیلاطیسوں کی طرح فیثاخوردس ملاوہ حکیم ہونے کے عالم بھی تھا۔ اب تک اس کو ہند سے کابانی سمجھا جاتا ہے اور عالم موسیقی میں سپتک کا موجد بھی اسی کو بتایا جاتا ہے۔ افلاطون کے زمانے میں فیثاخوردسوں کی شہرت نہ صرف بحیثیت عالی دماغ حکما کے تھی۔ جو انسانی روح کے انتقالات پر حور و حومن کیا کرتے تھے بلکہ ساتھ ہی وہ جید ریاضی دان اور موسیقی کشا ہر بھی شمار کئے جاتے تھے۔

ریاضی اور مذہب دونوں میں فیثاخوردس عقائد تھے افلاطون پر بہت سا اثر ملا۔ افلاطون خود بھی بڑا ریاضی دان تھا۔ کہتے ہیں۔ اس کی درگاہ کے دروازے پر لکھا ہوا تھا کہ جو شخص ہندسہ نہ جانتا، وہ اس کو اندر آنے کی اجازت نہیں۔ علاوہ فانی مادی حقائق کے ابدی حقائق کے

موجود ہونے کا مسئلہ فیثا خود سی بھی اپنے عقیدے میں ظاہر کر چکے تھے کہ کائنات کی اصلی بنیاد اعداد میں پائی جاتی ہے پہلے پہل فیثا خود س کو اس بات کا خیال اس وقت آیا جب اس نے یہ دریافت کیا کہ موسیقی میں نغمے کا انحصار رٹوں کے تناسب پر ہے ساتھ ہی ساتھ جب بطبیعات کے دائرے کے وسیع ہو جانے سے بہتر سے مظاہر قدرت کو ریاضی کی پیمائشوں اور عرض و طول کے مسائل سے تطابق دیا گیا تو اس خیال کو اور بھی تقویت ملی گئی۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ افلاطون کے دریافت کردہ حقائق ابدی میں ملاوہ اعداد کے اور کئی باتیں شامل ہیں۔ مگر افلاطون اور افلاطون سے بڑھ کر کائنات کے سریر و راز کی یہ عادت تھی کہ وہ ان حقائق کا ذکر یہاں تک نہیں ہو سکتا تھا۔ فیثا خود سیوں کی طرح ریاضی کی اصطلاحات میں کیا کرتے تھے۔ جس طرح کا تعلق افلاطون کے عقیدہ حقائق ابدی اور فیثا خود س کے عقیدہ اعداد میں پایا جاتا ہے۔ اسی طرح کا تعلق ان دونوں حکیموں کے عقائد روح میں بھی ہے۔ افلاطون کے مطابق روح ایک ایسا رشتہ ہے جو حقائق ابدی کی غیر فانی دنیا جس میں کہ روح اپنی عقل اور ادراک سے سب چیزوں کو سمجھتی جا پہنچتی ہے اور فانی تغیر پذیر مادہ کے درمیان قائم ہے۔ عالم ادنیٰ یعنی موخر الذکر دنیا کے مختلفات۔ حرکت اور انتقال سب روح کی بدولت ہیں۔ روح ہی تمام حرکت کا منبع ہے۔ یہی ایک ایسی چیز ہے۔ جو بذات خود حرکت کر سکتی ہے۔ اجسام صرف اسی حالت میں حرکت کر سکتے ہیں۔ جب یا تو ان کو کوئی دوسری چیز حرکت دے یا جیسا کہ تمام جانداروں کی کیفیت ہے، خود ان کے اندر روح موجود ہو۔ جب روح کی سب سے بڑی کارپرداری جس کی وہ کیفیت نفسی ہے۔ جس کی بدولت وہ ہر ایک حقیقت ابدی کو سمجھتا ہے۔ تو افلاطون اس کے سوا اور کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا۔ کہ روح بھی ان حقائق کی طرح غیر فانی ہے۔ افراد کون و نسا لہ دائرے سے باہر نہیں جاسکتے اور ان کے لئے غیر فانی ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا جا

کتا۔ مگر زندگی اور موت کا یہ تسلسل اور روح جو اس انتقال لائنہا ہی کا سبب ہے دونوں ابدی ہیں۔ اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ اس ابدی روح سے افلاطون کی مراد روح کائنات تھی۔ نہ زید۔ عمر۔ بکر کی روح۔ کیونکہ کسی ایک فرد کی روح تو خود اس فرد کی طرح موت اور زندگی کے سلسلے میں بندھی ہوئی ہے اور نہ صرف حقائق ابدی کی فہم ہے۔ بلکہ ان اداہام اور خواہشات کا مصدر بھی ہے جو ہمارے فانی جسم کے ساتھ وابستہ ہیں تو پھر کسی ایک فرد کی روح کہاں سے آتی ہے اور کہاں چلی جاتی ہے؟ افلاطون کے دفتر خیالات میں سے اس سوال کا جواب دھونڈنے کے لئے ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ افلاطون کے نزدیک فلسفہ صرف ان نتائج کا نام ہے جو غیر ہستیوں کے متعلق غور و فکر کرنے کے بعد مرتب ہوتے ہیں اور اگر فلسفہ کسی سوال کا جواب طلب کیا جاسکتا ہے تو صرف ایسے سوال کا جس کا تعلق ان غیر متغیر ہستیوں سے ہو اور بس۔ یوں تو تغیر پذیر حقائق کی نسبت کوئی سوال اگر کئے جائیں تو ان کا جواب کہیں نہ کہیں سے ضرور مل سکتا ہے۔ مگر فلسفہ ان جوابات کے متعلق اپنے علم حقائق ابدی کے ساتھ مقابلہ کر کے صرف یہ بتا سکتا ہے کہ وہ ٹھیک ہیں یا غلط۔ اس لئے جہاں پر ہمیں کوئی ایسا مورخ یا پیشین گو نہ مل سکے جو ہمیں کسی چیز کے ماضی یا مستقبل کے حالات سے آگاہ کر سکے۔ تو ایسی حالت میں ہمیں اپنے ہم کے موافق ایک افسانہ گھڑ لینا چاہیے۔ جس کی کوئی بات علم حقائق ابدی کی مخالفت نہ کرتی ہو اور اس افسانے پر ہی اکتفا کر نی چاہیے۔ افلاطون کے مکالمات میں کئی ایسے افسانے ہیں جن میں مختلف سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کی گئی ہے مثلاً دنیا کہاں سے پیدا ہوئی؟ تمدن کا آغاز کس طرح ہوا۔ افراد کی ارواح کیا ہیں؟ وغیرہ وغیرہ یہ بات درجہ یقین تک پہنچ چکی ہے کہ افلاطون بحیثیت ایک معمولی انسان کے ایک فرد کی روح کو بھی کسی حد تک ابدی مانتا ہے۔

اگرچہ وہ اپنی اس ذاتی رائے کو فلسفے میں شامل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جب کسی ریاضی کے سوال کا صحیح حل کسی کے سامنے پہلی دفعہ پیش کیا جاتا ہے تو وہ اس حل کے صحیح ہونے کو

فوراً پہچان لیتا ہے اور کہہ دیتا ہے کہ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ افلاطون کا خیال تھا کہ اغلباً یہ بات اس شخص کو کسی پہلے جنم میں معلوم تھی۔ مگر وہ اُسے بھولا ہوا تھا۔ جب اُس کے سامنے وہ حل لایا گیا تو اُس کی یاد تازہ ہو گئی اور اُس نے فوراً صحت حل کو پہچان لیا۔ اس بات کے ممکن اور اعجاب ہونے میں افلاطون کو کوئی شک نہ تھا کہ ہر ایک روح جو بدلتی رہتی ہے۔ اور اس کے ہر ایک جنم کی نوعیت اُس کے پہلے جنم کے اعمال پر منحصر ہوتی ہے۔ اسی طرح کا ایک عقیدہ، بدھ مذہب کا بھی ایک رکن ہے۔ بدھ مذہب اپنے پیروؤں کو مختلف جنموں میں نیکیاں جمع کرنے کے بعد آفاگون سے رہائی اور اس زندگی کے سچ و کرم سے نجات کی امید دلاتا ہے۔ مگر افلاطون چونکہ بدھ کی طرح اس زندگی کو سراسر عذاب نہیں سمجھتا تھا۔ اس لئے اُس نے کبھی ایسی کئی کا خیال نہیں کیا۔

فیثاغورسیوں کے علاوہ افلاطون اپنے خیالات کے لئے ایک اور فرقے کا بھی نمونہ تھا۔ اس فرقے کو فرقہ اپلبائی کہا جاتا ہے اس کا بانی فرماینڈیس نامی ایک حکیم اٹلی کے جنوب میں شہر اپلبا کا باشندہ تھا۔ افلاطون نے اس حکیم کا ذکر اپنے ایک مکالمے میں کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سقراط کی جوانی کی عمر میں اُسے ملنے کے لئے ایتھنز آیا تھا۔ ہرقلیس کے مسئلہ تغیر کے متعلق فرماینڈیس کے خیالات ہرقلیس سے بالکل ہی متضاد جانب کو ہیں۔ ہرقلیس کو اس دنیا میں ہر جگہ تغیر و حرکت کے آثار نظر آتے تھے اور فرماینڈیس اس کو محض نظر کا دھوکا سمجھتا تھا۔ وہ سر سے حرکت و تغیر کے امکان کا قائل نہ تھا وہ کہتا تھا اگر ہم ذرا غور کرتے تو ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ جب کبھی کوئی چیز حرکت کرے تو یہ ضروری ہے کہ وہ اس مقام سے جہاں وہ پہلے تھی کسی ایسے مقام میں جائے جہاں پر اس کے جانے سے پہلے کچھ نہ تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مقام ثانی پر اگر کوئی چیز پہلے موجود ہو تو وہ اس کو دھکیل کر وہاں سے باہر نکال دے اور خود اس کی جگہ لے لے۔ مگر جب شروع سے کوئی نقطہ موجود نہ ہی نہیں تو حرکت کا آغاز ہی ناممکن ہے۔ فرماینڈیس کا یہ خیال تھا کہ کسی ایسے

غلطی ہو جو ذریعہ یعنی نیست کے عمل وقوع کی ہستی کا ذکر کرنا یہ کہنا ہے کہ نیست بھی ہست
 میں شامل ہے جو نتیجے کے سراسر خلاف ہے۔ نیست کا عمل وقوع تصور میں آنے سے انکار کرتا
 ہے اور جس چیز کو تصور سے گریز ہے۔ اس کی حقیقت فرمایندیس تسلیم نہیں کرتا۔ ان خیالات
 نے اس کو یہ سکنے کی جرات دکھائی کہ کسی قسم کی حرکت اشغال یا تغیر سب ہماری آنکھوں کا قریب
 ہے۔ دراصل جو کچھ اس دنیا میں ہے وہ ایک غیر متغیر غیر متحرک ناقابل اشغال حقیقت ہے۔
 جس کی نوعیت ہر سمت اور ہر حصے میں یکساں ہے اور جس کے وجود کی سالم ناشکستہ وحدت میں
 کہیں تقسیم حصص یا تفریق و تمیز ممکن نہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ دنیا کا جو متلون نقشہ ہمارے
 حواس ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ وہ اس دگرنگ مرقع سے بہت مختلف ہے۔ گزرتے
 حواس جیسا کہ سب کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اکثر ہمیں دھوکا دیتے ہیں۔ جو علم ہمیں ان کے
 ذریعہ حاصل ہوتا ہے اس کو ہمیشہ اپنے فہم و ادراک سے پرکھ لینا چاہیے اور فرمایندیس
 کے ادراک کا یہی فیصلہ تھا کہ حواس غلطی پر ہیں اور ہم فریب خوردہ ہیں۔
 افلاطون جس کی بلند پرواز طبیعت کی خواہشات کو یہ خیال کہ اس دنیا کو تغیر و گردش
 سے رہائی اور مکمل سکون و استقلال کبھی نصیب نہیں ہو سکتا۔ بیدردی سے پائمال کر
 دیتا تھا۔ قدرتی طور پر فرمایندیس کے ساتھ ہم خیالی پر رضامند تھا اور اس کے فلسفیانہ
 عقائد کی رو سے ہر ایک حقیقت ابدی کو ان بے شمار محسوسات سے جن میں وہ مخلوط ہے
 اور جن میں گویا اس کا تکرار پایا جاتا ہے۔ وہی نسبت ہے جو فرمایندیس کی واحد الوجود اور
 سالم الوجود حقیقت کو اس متلون اور سلا پلا فریب نظر دنیا سے ہے۔ جس کی حواس ہمیں تلیقین
 کہتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ فرمایندیس وحدت حقیقت کا مبلغ ہے اور افلاطون کثرت
 حقائق کا قائل۔ یعنی افلاطون کے خیال کے مطابق عالم حقائق ابدی اور عالم محسوسات ان دونوں
 میں سے ہر ایک میں کثرت و تفریق ضرور ہے علاوہ برآں افلاطون عام صوری کو بالکل ہی
 موہوم نہ سمجھتا تھا۔ اس کے نزدیک عالم صوری ہست و نیست کے درمیان ایک بڑخ ہے

کیونکہ اس کا وجود تو یقینی ہے مگر اس کی شکل وہ نہیں جو ہمیں محسوس ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے فرمایدیں اس کو بالکل خالی از حقیقت ماری بازو وجود اور نیستی محض خیال کرتا تھا۔ فرمایدیں کہ حرکت جیسے امر الواقع سے انکار اس کے ہم عمروں کو اس کی سمجھ کا پیر معلوم ہوتا تھا اور وہ مدد حرکت کو خلاف قیاس سمجھتے تھے۔

فرمایدیں کے ایک مشہور شاگرد زرتیون نے اپنے آقا کے اس بظاہر خلاف قیاس نظریہ کی حمایت یہ کہنی چاہی کہ جب ہم اس (بقول مترضین) ”اقلر من الشمس حقیقت الامر“ یعنی حرکت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ بھی (اگر زیادہ نہیں تو کم از کم فرمایدیں کے عقیدے جتنی) خلاف قیاس معلوم ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر غلامہ ٹرائے کا نامور جانا باز اقلیس جو اپنی سرعت رفتار کے لئے مشہور تھا ایک کچھوے کے ساتھ دوڑے تو یہ کہہ دینا بڑا ہی آسان معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھوے سے آگے بڑھ جائے گا۔ اب فرض کرو کہ اقلیس کی رفتار کچھوے سے دس گنا ہے اور کچھوے کو شروع سے سو گز کی رعایت دی گئی ہے۔ یعنی وہ پہلے ہی سے سو گز آگے کھڑا ہے۔ دونوں ایک ہی وقت دوڑنا شروع کرتے ہیں۔ جب اقلیس وہ سو گز کا فاصلہ جو اس کے اول کچھوے کے درمیان ہے طے کر چکے گا۔ تو کچھوے اتنے وقت میں دس گز آگے بڑھ جائے گا۔ اب اقلیس اول کچھوے کے درمیان دس گز کا فاصلہ ہے۔ پھر جب اقلیس وہ دس گز طے کرے گا تو کچھوے اقلیس سے ایک گز آگے ہوگا۔ جب اقلیس وہ ایک گز طے کرے گا تو کچھوے ایک گز آگے ہوگا۔ اسی بنا پر اقلیس کا فاصلہ کچھوے سے آگے ہی رہے گا۔ زرتیون کا ایک اور بھی اسی طرح کا منہ ہے جس کو معنائے ہر فائز تیر کہتے ہیں۔ جدید مغرک تصاویر کے اصول سے آشنا حضرات اس کو اچھی طرح سمجھ لیں گے۔ تیر کا جب کہ وہ حالت پر فائز میں ہو کسی خاص معین وقت پر فوٹو لیا جاسکتا ہے جس کا مطلب یہ کہ وہ اس نقطہ وقت پر جب کیمیرے کے روزن کو کھولا گیا۔ ساکن تھا اور چونکہ ہم جس وقت چاہیں اس کا فوٹو لے سکتے ہیں۔ اس سے تو یہاں ہر وقت ساکن ہوتا ہے۔

اھاگر وہ ہر وقت سائن ہوتا ہے تو ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کس وقت کرتا ہے۔ اس قسم کے معمول نے ہمیں یہ ثابت کر دیا کہ کانے میں بڑی مددی ہے کہ ساخت اور مدت دونوں کو مسلسل اور ناقابل تجزیہ تصور کرنا چاہیے یعنی جس طرح ایک عدد اکائیوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اس طرح یہ نقطوں کا مجموعہ نہیں ہوتے۔

بحث کا یہ طریقہ جس میں بحث کرنے والا یہ ثابت کرتا ہے کہ فریق مخالف کی بات کو مان لینے سے جو نتائج مرتب ہوتے ہیں وہ بعید از عقل ہیں۔ یونانیوں میں ڈائے لک ٹک (DIALECTIC) کے نام سے مشہور ہے۔ زینو اس کا موجد سمجھا جاتا تھا۔ سقراط بھی اس فن میں پولا ماہر تھا اور افلاطون تو اس کو اس قدر صحیح اور موزوں طریقہ تدلیل سمجھتا تھا کہ وہ بعض اوقات وہ ڈائے لک ٹک کے نقطہ کو فلسفے کے معنوں میں بھی استعمال کر لیا کرتا تھا۔

افلاطون کے قدما میں سے انقضا غورث کا ذکر بھی یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ حکیم میلاطیس حکما کی طرح ایشیائے کوچک کا باشندہ تھا۔ مگر کچھ عرصے تک ایتھنز میں نامور سیاسی مدبر فرقیس کے ساتھ بطور صلاح کار اور رفیق کے رہا۔ آخر کار جب وہ یہ کہنے کی جرأت کر بیٹھا کہ سورج اور چاند دیوتا نہیں بلکہ روحانیت سے بالکل برابر اسی مادے کے بنے ہوئے معمولی اجسام ہیں جس کی کہ ہماری پامال روندی ہوئی حقیر زمین کو رنڈک مزاج شاہاں تاب سخن ندارد، اس نے ایتھنز کی جمہوریت کا تھرو غضب نازل ہوتے ہوئے دیکھا اور وہ اس شہر کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اس نمانے میں داوسقراط کے وقت میں بھی جمہوریت حکومت بکنڈہی معاملات میں آزادی خیال کو گوارا نہ کر سکتی تھی۔ خصوصاً جب کہ انقضا غورث اور سقراط کی آزاد خیالی کا اثر اعلیٰ طبقتوں پر پڑتا تھا۔ جہاں سے لوگوں کی حساس طبیعتوں کو ہر وقت سیاسی خرابی کا ڈر تھا۔

جیسا کہ ہم اس تحریر کے شروع شروع میں بیان کر چکے ہیں، اولین میلاطیس حکما میں سے کئی ایک نے اپنے اپنے خیال کے مطابق کسی نہ کسی چیز کو کائنات کا مادہ بنیادی قرار دیا، مگر

ان کا یہ نظریہ اس عقیدے کے حل کرنے میں ناکام رہا کہ اشیاء کی کثرت اور ان کی نامتیا میں اس قدر تباہ کن کیوں ہے۔

انقضا عورت کا خیال تھا کہ پچھلے پہل سب اقسام کی اشیاء ایک ہی غیر متفرق جمعیت کی حالت میں ہوتی ہیں۔ جہاں سے بعد میں ہر ایک کو ہمارا نفس علیحدہ کر کے سب کو نظم و ترتیب دیتا ہے اور ہر ایک کو اس کی غرض جگہ پر متعین کر دیتا ہے۔ کہتے ہیں کہ انقضا عورت کے اس طرح فحش ہنسائی کو بطور ایک مرتب اور ناظم کے اہمیت دینے سے سقراط کے دل پر بڑا اثر ہوا۔ ترتیب نظام قدرت کو سمجھنے کا یہ طریقہ اس کو اور سب حکما کے طریقوں سے زیادہ امید دلانے والا معلوم ہوا اور اس کے متذبذب دل کو اس خیال سے بہت سا اطمینان مل گیا اس کو اس بات کی شکایت رہی کہ انقضا عورت نے اتنا کچھ کر کے یہ کیوں نہ بتایا کہ اس نظم و نسق کی تفریح کثرت ہمیشہ ہر ایک کے استعمالات کے کیونکر مقرر ہوتی ہیں اس لئے پر اس نے خود اپنا دماغ لٹایا اور وہ ان پہلے شخصوں میں تھا جو جانداروں کے اجسام کی ترکیب امدان کے اعضاء اور قوائے کی قابلیت کی ان کے ماحول کے ساتھ مطابقت کو اس بات کی دلیل سمجھتے تھے۔ کہ یہ دنیا کسی بڑے عقلمند اور رحیم صانع کا کام ہے اور یہ عالم عالم شہود ہے۔

(۳)

افلاطون کو اپنے آقا کے اس خیال کے ساتھ پورے طور پر اتفاق تھا کہ یہ دنیا عالم شہود ہے اور مختلف حقائق ابدی ایک ہی نظام کے عناصر ہیں جس میں ہر ایک حقیقت کا قیام ان فوائد پر مبنی ہے جو اس سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس کے مجتہد اور اراک کی تشفی صرف اسی خیال سے ہو سکتی تھی کہ تمام اشیاء ایک آسمانی ترکیب اور روحانی نظام کے ماتحت اپنا اپنا کام کرتی ہیں۔

یہ چونکہ کسی باقاعدہ سوسائٹی کے اعمال، افعال اور اس کے افراد کے فرائض کا مناسب عمل

جب ہی معلوم ہو سکتا ہے جب کہ ان کا مقرر کرنے والا اس نظامِ علم سے پوری طرزِ واقف ہو۔ اس لئے افلاطون کے خیال میں کسی قوم یا جماعت کے حکام ہمیشہ فلاسفر ہونے چاہئیں۔ اپنی عظیم الشان تصنیف ”جمہوریت“ میں اُس نے تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ سلطنت کے اُن ”سرپرستوں“ کو کس قسم کی تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔

افلاطون اپنی موت (۳۴۷ قبل مسیح) کے بعد ایتھنز میں اپنا بنا کر وہ ایک کالج چھوڑ گیا۔ جو بہت عرصے تک علوم اور فلسفے کا سب سے بڑا مرکز رہا۔ ۵۲۹ء میں جب شہنشاہِ چین نے اس کا فدویہ آمدنی ضبط کر لیا۔ تو اس کالج کا خاتمہ ہو گیا۔ اُن نوجوانوں میں سے جنہوں نے اس کالج میں خود اس کے بانی افلاطون سے تعلیم حاصل کی۔ ایک ارسطو طالیس بھی تھا۔ جس نے بعد میں وہ شہرت حاصل کی جو افلاطون کی شہرت سے کسی طرح کم نہ تھی۔

اکثر کہا جاتا ہے کہ ہر شخص جبلی طور پر یا تو افلاطونی نقطہ خیال کا ہوتا ہے یا ارسطو طالیس۔ ان یونانی حکماء کو بلحاظ اُن کے ادراک کے رجحان اور طریقہ فکر کی نوعیت کے قوت فکر کی دو تضاد اقسام کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ افلاطون کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے تخیل بلندی پر فازی کی وجہ سے حقائق حیات کو چشم و گوش کے معلومات سے بالاتر سمجھتا تھا۔ اس کا توجس قتل و قہم اس میدان میں جو اُنی کیا کرتا تھا۔ جو تجربے مشاہدے اور حواس کی حدود سے باہر ہے۔ ارسطو کی نسبت کہا جاتا ہے اُس کی طبیعت افلاطون کی طرح آنا درونہ تھی۔ وہ صہ حکمت میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا تھا اور منطق کی زبردست بندشوں اور حواس پر تجربے کی مدرسے ایسے نتائج پر پہنچتا تھا۔ جن کا اثبات مشاہدے کی بنا پر ممکن تھا۔ اکثر افسردہ دیکھا جائے تو دونوں فلسفیوں کی نسبت یہ رائے غلط ثابت ہوتی ہے۔ اکثر اوقات بچے کا طالب علم یہ طعوس کرتا ہے کہ افلاطون کا منطقی تھا اور ارسطو اس قدر مقید اور محتاط تھا۔ جس قدر اس کو سمجھا جاتا تھا۔

ارسطو پیدائش ۳۸۴ قبل مسیح۔ وفات ۳۲۲ برس قبل مسیح) افلاطون کے کالج کا ایک

میر تھا۔ مگر وہاں کا طرزِ تعلیم اُس کو پسند نہ آیا اور اُس نے اُس کا لُج کو چھوڑ کر خدا ایک نئے
 لُج کی بنیاد ڈالی۔ اگرچہ وہ اپنے ساتھیوں سے اس طرح کنارہ کش ہو گیا تھا مگر یہ بات
 یاد رکھنی چاہیے کہ وہ اپنی تصانیف میں فلسفیانہ بحث کو ہمیشہ ایک افلاطونی کیفیت سے
 شروع کرتا ہے اور آخر میں ان افلاطونی عقائد پر نکتہ چینی کرتا ہے۔ جن سے اُسے اتفاق نہ
 تھا۔ پڑھنے والے کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اسرارِ سطوا افلاطونی خیال کی ہمیشہ مخالفت کرتا
 رہتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اسرارِ بائون پر جس میں وہ اپنے استاد کا ہم خیال تھا۔ بہت
 کم زور دیتا ہے۔

اسرارِ افلاطون کی طرح اس بات کو تسلیم کرتا تھا کہ صحیح علم صرف حقائقِ ابدی کا علم ہے۔
 جن کی ہستی کی آگاہی ہمیں اپنے ادراک سے حاصل ہوتی ہے اور جن کو محسوس کرنے سے ہمارے
 حواسِ قاصر ہیں۔ مگر وہ افلاطونیوں کی طرح حقائقِ ابدی (اعراض) کو ان اشیاء (جو اہر) سے
 جن میں وہ منقسم، یا "منقول" ہوتے ہیں۔ علیحدہ نہیں سمجھتا۔ افلاطون کو بھی ایسا اچھا طریقہ بیان
 نہ سوجھا جس سے وہ جواہر کی کسی ایک نوع کا تعلق اس عرض سے ظاہر کرے جو اگرچہ اس نوع
 کی سب اشیاء میں پایا جاتا ہے۔ مگر پھر بھی بذاتِ خود اس نوع کے کسی ایک فرد سے علیحدہ
 سمجھا جاسکتا ہے۔ اس تعلق کو "شُرکت" کا تعلق کہا جاسکتا ہے مگر اس سے یہ مطلب
 نکلتا ہے کہ ایک حقیقت کے مکررے مکررے کر کے اس کو مختلف اشیاء میں منقسم کیا گیا
 ہے۔ بڑی چیزوں کو بڑا حصہ ملتا ہے اور چھوٹی چیزوں کو چھوٹا۔ جس طرح مختلف جسامت کے
 چند اشخاص ایک سائبان کے نیچے اکٹھے ہوں۔ تو ہر ایک کی جسامت کے مطابق
 سائبان کا ٹھونڈا یا بہت حصہ اُس کے اوپر ہوگا یا دوسرے پیرائے میں، ہم اس تعلق کو "تعلق"
 کہہ سکتے ہیں۔ مگر یہ فرض کرنا بھی مشکلات سے خالی نہیں۔ اگر ہم دو اشخاص کے ایک ہی
 نوع کے دو افراد ہونے کو اس طرح سے تعبیر کرتے ہیں۔ کہ وہ ایک ہی نمونے کی دو نطیوں
 ہیں تو ان دو افراد میں سے ہر ایک کی اس مفروضہ نمونے سے ہم نوع کی تعبیر کے لئے ایک اور

نوتہ فرض کرنا پڑے گا اور اس طرح یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ شاید یہ کہنا سب سے بہتر ہوگا۔ ہم اس تعلق سے اتنا ہی آگاہ ہیں جتنا کہ جڑ و کل یا اسل و نقل کے تعلق سے ہمارے اس تعلق کو بیان کرنے کی قابلیت یا ناقابلیت اس بات کی دلیل نہیں کہ ہم اس تعلق کو زیادہ یا کم سمجھتے ہیں۔

کئی لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ حقائق مشترکہ محض زائدہ خیال اور ہمارے وہم و گمان کی پیدائش ہیں مگر ارسطو کو اس بات سے انکار تھا۔ وہ ان کی ہستی کا بلا تعلق دماغ انسانی قابل تھا۔ وگرنہ علم طبیعی جن میں اشیاء کے چند خواص مشترکہ پر بحث کی جاتی ہے موشوم بالوں کے سوا کچھ نہیں رہتے۔ ارسطو نے غنصات کی دو قسمیں کی ہے۔ غنصات ذاتی (مثلاً انسانیت وغیرہ) اور غنصات صفاتی (مثلاً عظمت۔ سفیدی۔ عقلمندی وغیرہ) غنصات صفاتی غنصات ذاتی کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں اور غنصات ذاتی صرف کلام میں افراد مومنوع سے علیحدہ شمار کی جاسکتی ہیں۔ ہر ایک فرد کی ایک مخصوص ”شکل“ (FORM) ہوتی ہے انسان کی شکل کو دوسرے الفاظ میں ”روح“ کہا جاتا ہے۔ اس کا جسم جو تمام حرکات و افعال کے لئے روح کا محتاج ہے۔ روح سے بالکل متضاد ہے۔ اس کو ”مادہ“ کہتے ہیں۔ جب بہت سی اشیاء ایک ہی نوع یا قسم کی ہوں تو کوئی قضیہ جو اس نوع کے ایک فرد کی نسبت قائم کیا جاسکتا ہے اور جو مستقل وقعت رکھتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا جو اس نوع کے کسی اور فرد پر بھی صادق نہ آئے۔ ایسے قضایا کو ”کیلیات“ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

ارسطو کے مطابق صرف اس دنیا میں ہی بہت سی اشیاء ایک قسم کی ہوتی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کی اشیاء کی ترکیب عناصر اربعہ خاک آب آتش باد سے ہے (ان چار چیزوں کو سب سے پہلے امفرا قلیس نے جو چھٹی صدی میں سسلی کا ایک ذی اقتدار فلاسفر تھا۔ عناصر قرار دیا۔ لفاظیات کی رو سے اس فلاسفر نے اپنے آپ کو آتش فشلیہاڈ

اشنانے کے دہانے میں پھینک دیا تھا تاکہ اُس کے اس طرح ایک دم غائب ہو جانے سے وہ لگوں میں دبتا شمار کیا جائے، یہ عناصر رابعہ جو چار خواص بنیادی - حرارت - برودت - رطوبت - پیوست سے پیدا ہوئے ہیں۔ مختلف تناسب میں ترکیب پا کر مختلف اجسام ہی جاتے ہیں اور عناصر کے باہمی تضاد کی وجہ سے وہ اجسام ہمیشہ بنتے بگڑتے رہتے ہیں۔ یہی افراد کی تکثیر کی وجہ ہے اور تسلسل افراد سے ہی نوع (نہ کہ فرد) بقا حاصل کر سکتی ہے۔ کائنات کے بالائی طبقوں میں ہر ایک آسمانی جسم اس مرکب مادے کا نہیں۔ بلکہ ایک اعلیٰ عنصر خامس کا بنا ہوا ہے۔ اس لئے وہ کبھی فنا نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنی نوع کا ایک ہی فرد ہے اس لئے اس کی بقا کے لئے اس کی نوع کے افراد کا تسلسل ضروری نہیں۔

اس مختصر بحث سے یہ تو ظاہر ہو گیا ہو گا کہ ارسطو نے اس بارے میں اپنی توجہ کو زیادہ ترجیحات اور بناات تک ہی محدود رکھا اسی سے اُس نے افلاک کی ابدی گردش کا سبب دیباقت کرنے کی کوشش کی۔ غیر ذی روح اشیاء کی حرکت کسی اور متحرک شے کے تصادم کی وجہ سے ہوتی ہے، مگر ذی روح اجسام کی حرکت اس طرح کی نہیں۔ افلاطون نے ہمیشہ متحرک رہنے والی روح کو تمام حرکت کا منبع قرار دیا تھا۔ مگر ارسطو ذی روح اشیاء کی حرکت کو خود زانہ سمجھتا تھا۔ ذی روح اشیاء کی حرکت کی علت ہمیشہ علاوہ ازیں حرکت ہوتی ہے۔ یہ علت تصادم سے تو نہیں مگر ان اجسام کی خواہشات کو اُکسانے سے اُن کی حرکت کا باعث ہوتی ہے اور اس لئے ضروری نہیں کہ وہ خود متحرک ہو۔ کیونکہ خواہش ایسی چیز کی بھی ہو سکتی ہے جس میں خود کوئی خواہش نہ ہو یا جو اس خواہش سے محض بے خبر ہو۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ بالآخر تمام تیشا کی حرکت کا منبع ایک ایسا غیر متحرک محرک خدا ہے جو ذی روح اجسام کی خواہشات کو حرکت دے کر خود اُن کی حرکت کا باعث ہوتا ہے۔ کائنات کا یہ غیر متحرک محرک خدا ہے۔ وہ افضل خدا دنیا کو اس طرح گردش میں رکھتا ہے جس طرح کوئی محبوب اپنے عاشق کو۔ مگر جس طرح تمام اشیاء اس کی طرف کھینچ کر رہ جاتی ہیں وہ کسی

کی طرف کھنچ کر نہیں آتا۔ ایسی اکل۔ اعلیٰ اور بے نیاز ہستی کے ساتھ اگر کوئی شغل منسوب کیا جاسکتا ہے تو وہ شغل علم ہے اور ایسی چیز جس کا علم اس کی شان کے شایان ہو اس کی اپنی ذات ہے۔ ارسطو کے خیال میں خدا دنیا کا بنانے والا نہیں مدینا انلی اور ابدی ہے نہ ہی وہ، دنیا کی روح ہے وہ اکل ذات ہے جس کے ساتھ اپنے آپ کو مطابقت دینے کے لئے تمام دنیا کو شاں ہے۔

ان اشیاء کی حالت میں جو غیر بادی ہیں اور جو ایک غیر مکمل صورت ہے۔ ایک دوسری مکمل تر صورت میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ ارسطو ان کے ارتقا کے اول ترین مدارج کا پتہ اس انتہائی صورت سے لگاتا ہے جس کی طرف اس ارتقا کا رخ ہوتا ہے۔ حیوانات اور نباتات کی علت غائی بلحاظ اپنی جنس کے تکمیل حاصل کرتا ہے۔ نریہ کہ وہ انسان کے لئے مفید ترین ثابت ہوں۔ ارسطو نے علل کی چار قسمیں قرار دی ہیں۔ علت مادی، علت صورتی، علت فاعلی اور علت غائی۔ عینا اللغات مصنفہ محمد عینا ث الدین میں لکھا ہے "علت کہ آں را سبب نیز گویند بر چہار قسم است۔ سبب در سبب داخل بود یا خارج۔ اگر داخل بود بالقوة۔ آں را علت مادی گویند بہ تشدید حال چہ نسبت چوب با سریر۔ و اگر داخل بود بالفعل آں را علت صورتی گویند۔ چوں صورت سریر کہ مربع باشد یا سدس۔ و اگر خارج بود اگر آں سبب موجود است۔ آں را علت فاعلی گویند چوں بخار اگر ایجاد برائے آست آں را علت غائی گویند حوں بلوس بر سریر۔ پس علت غائی در ظہور موخر از ہمہ علت ہاست دور ذہن و تعقل از ہمہ مقدم علت غائی غایت و منتہائے جمیع عینتہائے اربعہ است و بدانکہ اطلاق علت غائی در افعال حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ رواندارد۔ چرا کہ حق تعالیٰ در خلقت اشیاء محتاج بغرضے نیست۔ اگر بنظر دقیق دیکھا جائے۔ تو سوائے علت مادی کے باقی مال ثلاثہ مائل بہ انطباق معلوم ہوتی ہیں۔ کیونکہ بخار اسی حد تک علت سریر شدہ کیا جا سکتا ہے جس حد تک کہ وہ تخت کو ایک مخصوص شکل دینے کا باعث ہو۔ اور اس کی صنعت کا استعمال

(علت غائی) بھی وہی ہے جو اس شکل کی ایک لکڑی کی بنی ہوئی چیز کا ہو سکتا تھا۔ گویا
علت فاعلی اور علت غائی علت صوری کے دو مشابہ پہلو ہیں۔

یہ نظام علل و بعہ پھر وہی ہمت ظاہر کرتا ہے کہ تمام غیر ابدی اشیا کے دو قبائلیں پہلو ہیں۔
اول مادہ جو ایک مخصوص شکل پا کر ایک مخصوص چیز بن جاتا ہے۔ دوم صورت جس کی بدولت
ہر ایک چیز اپنا جنسی یا نوعی نام پاتی ہے۔ لیکن ہے کہ بعض اشیا جو خود ایک خاص شکل و صورت
رکھتی ہیں مثلاً سنگ مرمر، کسی دوسری حالت میں کسی اور چیز کا مادہ، بن جائیں (مثلاً سنگ مرمر
کا بت) مادہ بغیر شکل و صورت کے نہیں مل سکتا ایسی حالت میں اس کی ہستی ہی نہیں ہو سکتی۔
برخلاف اس کے خدا ارسطو کے خیال کے مطابق شکل بغیر مادہ ہے جیسا کہ ہم اوپر بیان کر
چکے ہیں۔ ارسطو اکثر کسی شغل کو خدا کی شان کے شایاں سمجھتا تھا تو وہ ایک شغل علم ہے۔
اسی لئے وہ انسان کے لئے اس کو اعلیٰ ترین اشتغال جانتا تھا۔ وہ اپنی تصنیف "اخلاقیات"
میں لکھتا ہے کہ تحصیل علم سے ہی انسان اپنی سب سے اشراف قابلیت کا فائدہ اٹھا سکتا ہے
اسی بات میں اس کو دوسرے باشندگان زمین پر ترجیح دی جاسکتی ہے اور وہی اس کی سب
سے بڑھی مسرت قلبی کا باعث ہو سکتی ہے۔ چونکہ انسان ادراک محض نہیں بلکہ ادراک اور
جو انیت کا ایک مجموعہ مرکب ہے۔ اس لئے یہ مسرت قلبی تمدنی اور معاشرتی فرائض کی پابندی
سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ انسان فطرثاً ایک حیوان متمددن ہے۔ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی
مرح کی سوسائٹی میں پایا جاتا ہے۔ خواہ وہ سوسائٹی میاں بیوی اور بچوں کی ہی ہو۔ مگر
ارسطو جس کو سب سے ارفع زندگی سمجھتا تھا وہ صرف آندا و اشخاص کے منہب فرقوں
میں ہی پائی جاتی ہے اور اس کا اپنے علم اور یقین کی بنا پر یہ خیال تھا کہ صرف یونانیوں کی
نسل ہی آج تک ایسی مدنیت کے قابل ہوئی ہے۔

اپنی "سیاست" میں ارسطو نے اس قسم کی مدنیت کے آئین کا خاکہ کھینچا ہے۔ اگرچہ
اس کے اپنے ہی ایک شاگرد سکندر اعظم کی بادشاہت میں ایرانی مدنی حکومتوں کے

الحاق اور ایک وسیع سلطنت کے قیام سے یونانی دنیا کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ مگر ارسطو کو کبھی اس انقلاب کا خیال نہ آیا۔ اس کے دماغ میں ایک ہندب حکومت وہی ایک چھوٹی سی خود مختار دولت مشترکہ ہی ہو سکتی تھی۔ جس کی حدود ایک شہر اور اس کے مضافات کی حدود سے تجاوز نہ کریں۔ اور جو اتنی بڑی نہ ہو کہ اس کے تمام باشندے معاملات جمہور میں ذاتی حصہ نہ لے سکیں۔ باقی رہا یہ سوال کہ شہریوں کو اس بات کے لئے فرصت کہاں سے ملے۔ سو اس کے لئے ارسطو کہتا تھا کہ اپنا رول مرہ کا کام غلاموں کو سپرد کر کے حکومت کے لئے وقت نکالنا چاہیے۔ طریقہ غلامی کو ارسطو جائز اور قدرتی امر سمجھتا تھا۔ کیونکہ بعض انسان قدرتی طور پر حکومت خدا اختیاری کے ناقابل ہوتے ہیں۔ قوموں کی تو میں اپنی اس ناقابلیت کا اظہار بعض اوقات اس طرح سے کرتی ہیں کہ اگر ان کو اپنے آپ پر چھوڑ دیا جائے تو وہ اپنے لئے ایک خود مختار حکمران انتخاب کر لیتی ہیں۔ جس کی وہ غلاموں کی طرح خدمت کرتی ہیں۔ آزادوں و مشترکہ میں سیاسی مساوات حقیقی مساوات کی بنا پر ہونی چاہیے۔ اگر سوسائٹی کا کوئی ممبر اپنی ذاتی برتری کی وجہ سے باقی سب پر ممتاز ہو تو سب کو چاہیے کہ اس کو اپنا قدرتی حاکم مان لیں۔ علاوہ بریں تمول اور افلاس کی تمیز کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

افلاطون تو کہتا تھا کہ ہر ایک چیز تمام افراد جمہور کی ملکیت مشترکہ ہے اور سلطنت کے "سرپرست" (خواہ وہ مرد ہوں یا عورت) کسی چیز کو بھی اپنا نہیں کہہ سکتے۔ حتیٰ کہ وہ کسی شخص کو اپنا خاوند، اپنی بیوی، اپنا بچہ، اپنی ماں، اپنا باپ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ مگر ارسطو کو اس سے اتفاق نہ تھا وہ ہر چیز از یار ماست از ماست، "سے اصول کو ممکن العمل نہ سمجھتا تھا۔ دو قریبی دوست ایک دوسرے کی چیز کو اپنی چیز سمجھ کر استعمال کر سکتے ہیں۔ مگر جہاں ہر ایک شخص اپنی چیز پر اپنا حق دوسروں کے برابر سمجھتا ہو وہاں بد نظمی اور بے ترتیبی کا پیدا ہونا لازمی امر ہے اور نہ ہی اس طرح سب کو حقوق مساوی

دینے سے اتحاد و موافقت کے بڑھنے کی کوئی امید ہو سکتی ہے۔ اس لئے اگر سٹو ایک شخص کے دوسرے شخص سے دولت مند ہونے کو اپنے آئین کے ماتحت ممکن و جائز سمجھتا تھا۔ روپیہ مالداروں کو اس حد تک حق مزید دلاتا ہے کہ اس کی بدولت وہ بھوکے تنگوں کی دستبرد سے بچے رہتے ہیں مگر ان کو بالکل ہی لاچار اور بے بس نہیں بنا سکتے۔

” پطرس “

لکشاں۔ مارچ ۱۹۱۹ء

سُر محمد اقبال

وہ انسان جس نے اردو شاعری کو مردانہ پن بخشا

اقبال کی وفات سے ہندوستان ایک جلیل القدر شاعر سے کہیں زیادہ باعظمت ہستی سے محروم ہو گیا۔ وہ بطور ایک عالم متبحر اور تازہ ناسخ، فلسفہ اور مذہب کے سرگرم طالب علم کے بھی ان لوگوں کے لئے جو اپنی محدود قابلیت کے سبب اس کی بے گناہ شاعری تک رسائی سے قاصر تھے۔ منبع فیض و جود تھا۔ بطور شاعر اگرچہ اس کا مقام نہایت بلند تھا۔ لیکن ادبی اور عمرانی دنیا میں اثر و نفوذ کے لحاظ سے اس کا مقام اس سے بھی بلند تر تھا۔ اس کی وفات سے جہاں مسلمانوں سے ایک فصیح اللسان پیغامبر اور ان کی تہذیب کا ایک بہت بڑا اشارح چھین گیا ہے۔ وہاں اردو شاعری سے خدا معلوم کتنی دراز مدت کے لئے اہمیت اور منزل مقصود چھین گئی۔ کم و بیش پالیس سال گزرے جب اقبال کی شاعرانہ زندگی کا آغاز ہوا۔ اس وقت اردو شاعری اگرچہ لوگوں میں مقبول تھی اور ہر کس و ناکس اس سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ اس کا مقصد خود زندگی نہیں۔ بلکہ محض زندگی کے حاشیہ کی تزئین سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ مقبول عام فن تھا۔ مگر یہ فن محض فن کی خاطر اختیار کیا جاتا تھا۔ اس وقت شاعری کیا تھی؟ محض جذبات انگیز عیاشی، نزم و نازک، دل خوش کن، مزاجیہ یا جھوٹ، لیکن سراسر بے ربط۔ اسی لئے اس کے اختیار کرنے میں سنجیدگی اور متانت سے کام لینے کی ضرورت نہ سمجھی جاتی۔

لیکن مسلمانوں کے دلوں میں ایک نیا احساس کروٹیں لے رہا تھا اور لوگوں کی زبان پر تعیرتِ ملت اور ترقی کے الفاظ آنے شروع ہو گئے تھے۔ ان میں جو زیادہ ذکی الحس واقع ہوئے تھے۔ انہوں نے آرٹ کو پیر ڈھونڈنا لگا کہ یہ بھی انسان کے زیادہ اہم مشاغل میں سے ایک ہے اور اس کو اعلیٰ سعیدگی اور مقصد و مدعا سے معمور کرنے کی کوشش کی گئی چنانچہ عالی ایسا غزل گو محمد شیب کی ہوس کار یوں سے تائب ہو کر مشہور زمانہ مستدس کا مصنف بن گیا۔ جس نے خوابِ غفلت کے متوالے ہندوستان کے مسلمانوں کو اس طرح بھنجوڑ بھنجوڑ کر جگایا کہ کوئی ایک نظم نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد ایسا کہہ سکی۔ انہی حالات میں اقبال جس نے اسی فرسودہ ڈگر پر اپنی شاعری شروع کی تھی۔ محسوس کرنے لگا کہ اس کا دل مسلمانوں کے اچھا اور ان کی نئی زندگی کے خواب سے مضطرب اور بے قرار ہے۔

ہندوستان ہمارا

اقبال کی ابتدائی نظموں سے ہی جو اس رجحان کے ماتحت لکھی گئیں۔ اس ولولہ عمل سے بے تاب دل اور اپنے وطن کے لئے جذباتِ محبت کا پتہ لگتا ہے۔ اس کی نظم،

”سچ کہہ دوں اسے برہمن گھر تو بیڑا نہ مانے“

بات تک فرقہ دارانہ اتحاد کی سب سے زیادہ بڑا اثر اپیل ہے۔ جو کسی محب وطن کے علم سے نسلی ہوا اور اس کا شہرہ آفاق گیت ”ہندوستان ہمارا“ میرے خیال میں بہترین زنی گیت ہے۔ جس پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا اور جس سے جہتر گیت کی شاید ملت مدید سامنے کی اُمید نہیں ہو سکتی۔ لیکن مذہبِ اسلام کے فائز مطالعہ نے جو اقبال نے اپنی زندگی کے آخری ایام تک مسلسل جاری رکھا۔ اس کے افق خیال کو وسعت بخشی۔ وطن اور سبکی نسبت سے قوموں کا تقاضا اس کی نظرت کے خلاف تھا۔ اپنی شاعری اور اپنی گفتگو، وہ ہمیشہ یورپ کی مثال منہ کر انسانوں کو ملکوں اور وطنوں کے تنگ دائروں میں

تقسیم کرنے کی بجے ہودگی ثابت کیا کرتا وہ ایک ایسے تمدنی نصب العین کا قائل تھا جو انسانوں کو وطنوں اور قوموں کے اختلافات کی سطح سے بلند کر دے اور جو زندگی کو ایک مقصد و مدعا بنائے کیونکہ اس کے نزدیک آرٹ کا با مقصد ہونا محض زندگی کے اصول علت العلل کا جزو و لائن تک تھا۔ اسی قسم کی ہمہ گیری اور با مقصدیت انہیں لکھ آئی تو اسلام میں یا چند جرمن فلسفیوں کی تعلیمات میں جن سے وہ بے دریغ اپنی شاعری میں استفادہ کرتا رہا۔

حجازی خیالی دنیا

جس دور سے ہم ہندوستان میں گزر رہے ہیں۔ اگرچہ اس میں بڑے بڑے امکانات پوشیدہ ہیں تاہم اس میں ایک خاص غم ناک کیفیت موجود ہے۔ ہم میں شاید ہی کوئی فن کار ایسا ہو جس کے فنی میں گھر کے لئے اسی بطور مرض کے موجود ہو۔ ہم دور ہلا خیالی دنیاؤں کے آرزو مند ہیں اور خواہ وہ دنیا میں خیالی ہوں یا حقیقی ان کی زمانی یا مکانی دوری ہی ان کے اندھا یک بے پناہ دل کشی پیدا کر دیتی ہے۔ اقبال نے اسلام کے ابتدائی زمانے پر پریشوق نظر ثانی۔ اس کی آرزو تھی کہ وہ اس جہد کے مسلمانوں کی سادگی، بلند ہمتی، ایمان اور عزم و استقلال کو دوبارہ پیدا کر سکے۔ ایک عالمگیر تمدن کے لئے اس کی دلی خواہش انسان کی تقدیر میں اس کا زبردست ایمان، انسان کے ارتقا میں اس کا پختہ یقین کہ وہ مقصد کی بلند یوں کو منزل بہ منزل طے کرتا ہوا کمال کی چوٹیوں پر پہنچ سکتا ہے۔ ان فرائض کے مطابق جو مسلم گھرانے میں پیدائش کے سبب اور اسلامی تعلیمات اس کے ذہنی نشین ہو چکی تھیں۔ ان سب باتوں نے اس کی شاعری کو اسلامی رنگ دے دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں اس کے بعض قدماں اس سے چھو گئے۔

کسی شاعر کے کلام کی قدماں اس کے اعتقاد کے باہمی تعلق کی بحث پرانی چیز ہے۔ اور میں اس کے متعلق یہاں کچھ نہ کہوں گا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ کچھ نہ کچھ ایسے لوگ ضرور

ہوتے ہیں، جو صرف اس لئے کہ ملٹن کی شاعری سے لطف اندوز ہوں کہ وہ اس کے مذہبی عقائد سے متفق نہیں یا جو شیکسپیر کا کلام محض اس لئے پڑھنا گوارا نہ کریں کہ وہ اس کے شاہ پرست خیالات کو پسند نہیں کرتے۔ لیکن دوسرے لوگوں کے لئے جو کولریج کے نکتوں میں کسی شاہ کے بھوم کا مطالعہ کرتے وقت انکار کو عمداً معطل کر دیتے ہیں، اقبال رہتی دنیا تک مشرق کا سب سے زیادہ ولولہ خیز شاعر رہے گا۔

فارسی اور اردو

اس کے بعض ہم وطنوں کی بد قسمتی ہے کہ اقبال کے بہترین کلام کا زیادہ حصہ فارسی میں ہے اور اس کی صرف ایک طویل نظم اسرارِ خودی کا تو عمدہ جو پروفیسر نکلسن نے کیا ہے انگریزی زبان میں ملتا ہے تاہم اس کا ابتدائی کلام جو اردو میں ہے وہی اس کو ہندوستانی شاعروں میں ایک بلند مقام دینے کے لئے کافی ہے۔ لیکن خواہ اس نے اپنی نظیں اردو میں لکھیں، خواہ فارسی میں، اس کا اردو شاعری پر گہرا اور مسلسل اثر پڑا رہا۔ پیدائش کے لحاظ سے وہ پنجابی تھا، اصل میں اقبال کشمیری اور ذات کا سپرو تھا، اسی لئے اس کے لورپی کے نکتے ہیں اس کو ہمیشہ حقیقت ایسے نکتوں میں یاد دلاتے سہجہ جن میں مضامین کم اور لہجہ زیادہ ہوتی تھی اور اس کی شاعری کی زبان کو مکمل باہر ہونے کا عنصر دیتے رہے اور یہ باوجود اس حقیقت کے کہ وہ ناخ کا معنوی فرزند تھا جو اردو زبان کا مسلمہ بادشاہ ہوا ہے۔ لیکن اس کی غیر معمولی قابلیت نے اس کے نکتہ چینیوں کو جلدی خاموش کر دیا اور اس کی طرز شاعری کے بے شمار پہلو ملک کے طول و عرض میں پیدا ہو گئے اگر افراد کے وسیع اطراف کا تذکرہ کرنا اندیشناک نہ ہو تو اسی نزد میں تین ہستیوں کا نام لیا جاسکتا ہے۔ جنہوں نے اپنے اپنے رنگ میں اردو ادب کو نئی اور مختار صورت بخشی ہے۔ مولانا خضر علی خاں نے لاہندار کے ابتدائی ایام میں اس میں مضمون لکھ لکھ کے اردو صحافت کو ایک ایسی زور دار اور لچیلی زبان سے مالا مال کیا

جس سے وہ پہلے قطعاً ناواقف تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اردو نثر کو وہ شوکت، ذراوانی اور
 بیڑہنی بخشتی۔ جس کا راز انہوں نے عربی زبان کا مطالعہ کرتے وقت ہالیا تھا۔ لیکن چھپے مضامین یا
 پڑاؤ و غلطوں کی نسبت شاعری لوگوں کے دلوں میں زیادہ گہرے نقوش چھوڑ جاتی ہے۔ جدید اردو
 کے بنانے والوں میں اقبال (اور اسی طرح اس کا پیش رو غالب) ابھی تک سب سے نمایاں اور
 زبردست اہم ڈال رہا ہے، ہزاروں ترکیبیں اور الفاظ جو ان دونوں استادان فن نے گہرے
 یا اپنے فارسی کے پیشرو استادوں سے مستعار لئے، آج بھی اردو نثر پر اور تقریر میں ان کی گونج
 سنائی دے رہی ہے۔

(پطرس کے انگریزی مضمون کا ترجمہ از صوفی ریاض حسین)

غنچہ تبسم کے دیباچوں پر ایک نظر

نیاز مندانی لاہور

حال ہی میں تمکین کانہی صاحب کے مضامین کا مجموعہ موسومہ "غنچہ تبسم حیدرآباد دکن سے شائع ہوا ہے کتاب کے شروع میں پانچ دیباچے ہیں ایک دیباچہ کانہی صاحب کا اپنا لکھا ہوا ہے۔ باقی چار دیباچے چار دیگر مشاہیر لفظ گار کے قلم سے ہیں۔

کچھ حصہ سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ دیباچوں کا مرض ہندوستان میں بڑھ رہا ہے۔ مگر کتاب شائع کرتا ہے تو حاجی اس پر دیباچہ لکھتا ہے۔ حاجی قلم اٹھاتا ہے تو مگر اس کا تعارف کرتا ہے۔ مطلب اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ من ترا مگر تو مرا حاجی بگو۔ یہاں تک تو خیر کہا جا سکتا ہے کہ ملک میں ابھی تک جہلا کی کثرت ہے اور ہمارے اہل قلم اتنی دقیق باتیں لکھتے ہیں کہ جب تک ایک مصنف کے نکات اسی پائے کا دوسرا مصنف بھر دانت لگوں کے سامنے حل کر کے نہ رکھ دے بنی نوع انسان کی ایک بہت بڑی تعداد اس کے فہم سے محروم رہ جاتی ہے لیکن "غنچہ تبسم" کے ایک نئے نئے کے ہمراہ چار چار کلمائے زبان کا پرچہ ترکیب ارسال کرنا زیر سے کے منہ میں ادنٹ کے برابر ہے۔ تمکین کانہی صاحب کے نام اور ان کے ادبی کارناموں سے ہندوستان کا ہر بڑھا لکھا آدمی کم و بیش واقف ہے کیا ان کی اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ جب تک چار آدمی نہیں کندھانہ دیں وہ نقل و حرکت نہیں کر سکتے؟

اور پھر دیباچے بھی ایسے کہ ان سے نہ تو تمکین صاحب کی شانِ سخن طرازی میں کوئی اضافہ ہوتا ہے نہ دیباچہ نویسوں کی شانِ سخن فہمی ہی دو بالا ہوتی ہے البتہ فطرتِ انسانی کے

اس اہم اصول پر روشنی ضرور ہوتی ہے کہ تامل و سخن نگفتہ باشند عیب و ہنرش نہفتہ باشند۔ یہ شروع شروع میں شیخ سعدی کی اڑھم نے اس لئے کی کہ ہم بہر حال ناظرین و قارئین کے کثیر التعداد گروہ کے چند غیر معروف افراد ہیں اور دیباچہ نویس حضرات بہر حال اہل قلم، لہذا خدا کے بعض برگزیدہ بندوں میں سے ہیں و رہ جو بات اس شعر میں شیخ سعدی کہہ گئے ہیں۔ ہم اپنے الفاظ میں زیادہ تحقیق، زیادہ نعد اور زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کرنے والے ہیں۔ پہلا دیباچہ تمکین کاظمی صاحب نے قلم خود لکھا ہے لیکن اسے دیباچہ نہیں کہا۔ سر آغاز، کا لقب عطا فرمایا ہے دوسرے دیباچے کا نام "املام"، تیسرے کا نام "تائثر" چوتھے کا نام "تعلوف" اور پانچویں کا نام "تقریب" ہے (ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ چھٹا دیباچہ نہ لکھوانے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے لئے اس طرح کا مقوی نام نہ مل سکا ہوگا) یہ ثقالت الفاظ کتاب میں جابجا پائی جاتی ہے۔ نہرست مضامین کو "مندجات"، لکھا گیا ہے کتاب کا تفسیری عنوان "مجموعہ نگارشات فکاہی" ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جدت کئے چھپیوں ہی ہاتھ دھو کے پڑنا تھا تو صفحے کی بجائے "چہرہ قرطاس"، اور "ملنے کے پتے" کی بجائے "سبیل ہائے اصول" اور قیمت کی بجائے "نذر" یا "ہدیہ" کیوں نہ لکھ دیا۔ اگر محض الفاظ کی دہشت ناکی سے مرعوب کرنا مقصود ہو تو پھر قافوس کے بعد کسی اور کتاب کے لکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے البتہ اگر ان عنوانات میں یہ خوبی ہے کہ ہر ایک کے امداد سے کتاب کی تاریخ نکلتی ہے تو مجبوری ہے۔

ہاں تو ہم تمکین صاحب کے "سر آغاز" کا ذکر کر رہے تھے چار دیباچوں میں اپنی تعریف کر دالنے کے بعد بھی تمکین صاحب کی تسکین نخوت نہ ہوئی تو انہوں نے خور قلم اٹھایا شروع میں تو لکھ دیا کہ بنام خداوند بنحشائش گریہاں، لیکن اللہ کا نام لینے کے بعد سنبھالا لیا اور تین صفحوں تک انا الحق ہی کہتے چلے گئے۔ جابجا تائثر نچوں کا حوالہ ساتھ ساتھ دیا ہے تاکہ زمانہ آئندہ کے مورخ کو کوئی دقت پیش نہ آئے۔ ۱۹۲۷ء میں یمن نے یہ کیا۔ ۱۹۲۹ء میں یمن نے یہ کیا۔ ۱۹۳۰ء اور اول ۱۹۳۱ء میں معروف زیادہ مرہنا پٹا اور اوی اللہ مدیران رسائل نے مضامین کے لئے

مارے تقاضوں کے نام میں دم کر دیا، آگے چل کر فرماتے ہیں:-
 ”بعض مضامین کی زبان پر اکثر احباب کو اعتراض ہوگا کیونکہ اکثر جگہ میں نے عمدًا
 دکنی زبان اور محاورہ استعمال کرنے کی کوشش کی ہے اور خصوصاً ان مضامین
 میں زیادہ کوشش کی گئی ہے، جو حیدرآباد کے رسائل میں طبع ہوئے ہیں یا
 جن مضامین میں حیدرآباد کی تمدن و معاشرت کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی
 گئی ہے۔“

یہ جا بجا کوشش کے لفظ پر ہم نے خط اس لئے کھینچ دیئے ہیں کہ آپ کو معلوم ہو
 جائے کہ تمکین صاحب نے کتنی دفعہ اور کس خوبصورتی سے کوشش کی ہے۔ مساعی جلیلہ غالباً
 اسی کو کہتے ہیں۔ اگر تمکین صاحب اسی طرح کی پھسپھسی اردو لکھنے پر مصر ہیں تو ہم ان کو یہی
 مشورہ دیں گے کہ ”ترا ملک دکن تو دیکھیں بول“ لیکن تمکین صاحب کی امانیت اس حد تک
 پہنچ چکی ہے کہ وہ اس طرح کی نکل افشانی کے بعد بھی فرماتے ہیں:-
 ”میری مادری زبان اردو ہے، اور میں نے اردو کا گرامر مطالعہ کیا ہے۔“
 نہ صرف یہ بلکہ کہتے ہیں:

”میں چاہتا تو ٹیچر یوپی کے غاومات استعمال کر سکتا تھا۔“

اس تبحر علمی اور اس قادم الکلامی کے باوجود صرف ایک فقرے میں اتنی کوششیں بلکہ کاوشیں
 کرنے کی ضرورت پھر آخر کیوں پتیں آتی؟
 تمکین صاحب نے اپنی کتاب میں کئی دکنی الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ان کے متعلق دیباچے
 میں فرماتے ہیں:

”بعض احباب کا خیال تھا کہ آخر میں ایک فرہنگ لکائی جائے۔ مگر میں اس
 بدذوقی کا مخالف ہوں جنہیں ضرورت ہوگی وہ کسی حیدرآبادی سے پوچھ
 لیں گے یا مجھ سے دریافت کر لیں گے۔“

الحمد للہ شکم آپ کو بھی خوش مذاقی کا خیال کیا کیوں حضرت ایک کتاب کے چار چارویں پارچے بد مذاقی نہیں؟ ہر دیا چہ میں اپنی تعریف بلکہ بعض اوقات اپنی ڈائری کڑی تک چھپوا دینا بد مذاقی نہیں؟ ہر نوٹ میں بار بار اپنی طرف اشارہ کرتا بد مذاقی نہیں۔ لیکن جو الفاظ کسی لغت میں نہ پائے جاتے ہوں ان کے معنی بتا دینا بد مذاقی ہے۔ کیا آپ کو کوئی ایسا دوست نہ ملا جو یہ کام بھی کر دیتا جہاں اتنے گونا گوں و بوقلموں عنوان قائم کئے تھے وہاں دکنیات کا ایک اور عنوان بھی بڑھا دیتے باقی رہی آپ کی خوش مذاقی سواس کا ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو اپنے کاتب کے متعلق فرماتے ہیں کہ زوز نویس ہیں مگر:

” حد درجہ فلت نویس اور بے انتہا غیر پابند نہایت کم سواد ہیں۔ جنہوں نے ایلے کی غلطیوں کے علاوہ جملے کے جملے چھوڑ دیتے۔“

دل کی بھڑاس بھی نکالی تو بے چارے کاتب پر جسے عالم ہونے کا دعویٰ نہ فاضل ہونے کا اور خدا کے واسطے یہ تو بتائیے کہ یہ ایلے کی غلطیوں“ جو آپ نے لکھا ہے تو یہ کاتب نے فلت کتابت کی یا آپ نے دکنی انٹے کے اصولوں کے مطابق لکھا اور کاتب صاحب کی کم سوادگی کو آخر آپ کہاں کہاں پیش کرتے پھر بس گئے کیا انسٹ کے ترجمے میں ”ایلیمنٹس“ کو ہر جگہ ایلیگرنان“ لکھنا بھی انہی کے سر تھوپے گا؟ کم سوادگی کوئی ایسی خاص صفت نہیں کہ صرف کاتبوں ہی میں پائی جاتی ہو۔

مولانا نیاز فتح پوری کے ”اعلام“ کے متعلق ہم حیران ہیں کہ کیا کہیں اور کیا کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھیں۔ تین مختصر صفحوں کے اندر انہوں نے اپنی کم علمی یا پریشان خیالی اور فلت نگاری کی اتنی مثالیں جمع کر دی ہیں کہ اس سے بہتر جامعیت کی مثال بعد میں مشکل سے ملتی ہے۔ دیا چہ کا آغاز یوں ہوتا ہے۔

” غنچہ تبسم“ جناب تمکین کاظمی کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو نکات ہات کے سلسلے میں انہوں نے لکھے ہیں۔ چونکہ میں طنزیات اور مزاحیات دونوں کو نکات ہات

میں شامل کرتا ہوں۔ اس لئے میرا مقصود یہ ہے کہ دو نوزنگ کے مضامین اس

مجموعے میں نظر آتے ہیں۔“

یہ صاحب خود ہی بتائیں کہ ان مضامین کا مجموعہ ہے جو نکاحات کے سلسلے میں انہوں نے لکھے ہیں، کتنا بھونڈا فخر ہے۔ سلسلے، کالقط جس طرح سے انہوں نے استعمال کیا ہے۔ ہم اصلاح کے ذمہ دار نہیں لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ پہلے فقرے کو یوں لکھنا چاہئے تھا: ”غنیۃ تبسم“، جناب تمکین کاظمی کے نکاحی مضامین کا مجموعہ ہے۔“

اور یہ جو طنزیات اور مزاحیات کو نکاحات میں شامل کر کے اتنے بڑے بڑے جمادات سے ہم حیوانات کے سر چھوڑنے کی کوشش فرماتی ہے اس پر ہمیں ایک کہانی یاد آئی۔ علم ریاضی کے ایک پروفیسر اپنی ماں پر نالا جن ہوئے۔ دل غصے سے بھرا ہوا تھا چونکہ کبھی گالی دینے کی عادت نہ تھی اس لئے اظہار ناراضگی کے لئے موزوں الفاظ نہ ملے لیکن ماں کو ٹیٹنا بھی لازم تھا چنانچہ بھٹنا کر بولے ”تم بڑی شلت مساوی اصلاح ہو۔“ ماں بے چاری دیک کر رہ گئی۔ یہی حال نیاز صاحب کے اس فقرے کا ہے۔ جب انہوں نے نہایت زناٹے سے کہہ دیا کہ میں الف، بے کو جیم میں شامل کرتا ہوں، تو کسی کی اب کیا مجال کہ کچھ بولے۔ نیاز صاحب نے اپنے داغ پر آپسچ بھی نہ آنے دی اور یہاں علم و فضل کا رعب بھی پڑ گیا۔ خود ہی اصطلاحات گھڑیں۔ ان کے مفہوم کو بھی اپنے بطن کے اندر ہی رہنے دیا اور جس میں جس کو جی چاہا شامل کرتے رہے۔ اگلا فقرہ ملاحظہ ہو۔

”اس وقت یورپ کا کوئی شعبہ علم ایسا نہیں جس میں یہ مخصوص طرزِ تحریر (یعنی پھیر)

مقبول نہ ہو، خصوصیت کے ساتھ تنقید، کہ اس کی تکمیل ہی نہیں ہو سکتی۔ جب

تک اس میں طرافت کا گہرا رنگ شامل نہ ہو۔“

کیوں حضرت یہ یورپ کا ذکر بھی ماسی رعب ڈالنے کے سلسلے میں کر گئے؟ اگر علم کے لفظ کا استعمال نیاز صاحب نے غلط نہیں کیا تو یقیناً فلسفہ، ریاضی، علم حیوانات، علم نباتات، کیمیا، جغرافیہ

طبیعت، سبھی چیزیں شامل ہیں۔ خدا جانے نیاز صاحب کو ان علوم کی کونسی ایسی کتابیں دستیاب ہوئی ہیں جو لطیفوں اور حیکلوں سے بھری پڑی ہیں؟ باقی رہی تنقید۔ نیاز صاحب کا ارشاد ہے کہ ظرافت کے بغیر اس کی تکمیل ہی ناممکن ہے گویا اگر ایک بھی قابلِ قلم نفاذ ہم انہیں ایسا بتا دیں جو ظرافت سے عاری ہو تو ان کا یہ دعوے پورچ ثابت ہو جائے گا۔ چونکہ نیاز صاحب کا فقرہ اس وقت سے شروع ہوتا ہے اس لئے ہم صرف دو حاضرہ اور اختصار کی غرض سے صرف انگریزی کے نقادوں کو پیش نظر رکھیں گے ان میں سے ٹی ایس ایلیٹ، درجینا وولف، کیٹھرن مسفیلڈ، ڈلٹن مرے۔ پروفیسر گورڈ، ولسن نارٹ، وغیرہم کی تصانیف خاص طور پر مستند مانی جاتی ہیں۔ اگر نیاز صاحب ان ناموں سے آشنا ہیں تو وہ فرمائیں کہ ان میں سے کون مزاح نگار ہے؟ یہ فہرست ادبی نفاذ کی تھی لیکن نیاز صاحب کی مراد شاید سوشل نقادوں سے ہے۔ ایک جی وین نے موجودہ سوسائٹی کی تنقید میں بیسیوں کتابیں لکھ ڈالیں۔ معدودے چند کو چھوڑ کر باقی کسی میں ظرافت کا گہرا کیا ہوا سا رنگ بھی نہیں پایا جاتا۔ اہل برسرِ ٹڈسل جو دنیا کے مشہور فلاسفوں میں سے ہے اس نے موجودہ سوسائٹی پر کئی پہلوؤں سے نکتہ چینی کی ہے جو لے سے بھی کبھی مزاحیات میں قدم نہیں رکھا۔ نیاز صاحب نے جو اتنی بڑی بات منہ سے نکال دی اور یورپ اور یورپ کا ہر شعبہ علم اور تنقید اور تنقید کی تکمیل ہر بلت میں اپنی ٹانگ اڑا دی تو وہ کس جہاں کو اپنا مخاطب بنا ہے؟ ایسی باتیں تو دوستوں کی صحبت میں کر لینی چاہئیں۔ ان کو سپردِ قلم کر کے تمام سندوستان میں ان کی نشر و اشاعت کرنا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنا ہے۔

یہ تو نیاز صاحب کے مطالبے کا حال تھا۔ اب ان کی انشا پر داری کا کمال ملاحظہ ہو، لکھتے ہیں:-

”جناب میکین کاغذ نے حل ہی میں اس رنگ کو اختیار کیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اکتشاف ابھی ہوا ہے کہ وہ اس صنفِ ادب (یعنی ظرافت نگاری) پر بھی لکھنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔“

پر ”پر“ آپ نے خوب لگایا۔ مراد یہ تھی کہ تمکین صاحب ہیومر رکھتے ہیں یعنی فقرے سے بہ ظاہر ہوتا ہے کہ تمکین صاحب ہیومر پر رکھتے ہیں (یعنی ہیومر پر تنقید و تبصرہ کرتے ہیں) فقرہ بہر حال بھونڈا ہے یعنی اگر نیاز صاحب کے الفاظ میں کم سے کم تغیر و تبدل کر کے اصلاح دی جائے تو یوں ہونا چاہیے تھا

”وہ اس صنفِ ادب میں بھی لکھنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔“

مزید کہ وہ ”اس صنفِ ادب پر بھی لکھنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔“ اس صنفِ ادب ”پر“ لکھنے کی قابلیت تو خدا نے نیاز صاحب کو ہی عطا فرمائی ہے چنانچہ فرماتے ہیں :-

”فکاہی مضامین کی سب سے بڑی خوبی محاکات اور تجزیہ جذبات کہلاتی ہے۔“

سوان دونوں کی اچھی لہی مثالیں اس مجموعہ میں نظر آتی ہیں۔“

دوسرے فقرے میں ”دونو“ کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور پہلے فقرے میں واحد کا صیغہ بسوخت عقل زحیرت کہ اس چہ بواجبھی ست۔ نیاز صاحب کا قول ہے کہ ”جو محاورے یا اصطلاحات گوارے سے کانوں میں پڑے ہیں ان کے خلاف اگر کوئی آواز کان میں آجاتی ہے۔ تو ٹھوڑی دیر کے لئے سماعت مشوش ہو جاتی ہے“ ہم نیاز صاحب کی خدمت میں درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنی شیرخواری کے زلنے کو یاد کریں۔ پھر اس فقرے کو پڑھیں اور پھر ہمیں بتائیں کہ ان کی سماعت کو تشوش محسوس ہوتی ہے یا ہر طرح سے خیریت معلوم ہوتی ہے؟ کیا یہاں ”خوبی“ کی بجائے ”خوبیاں“ اور سہجہ کی بجائے ”ہیں“ نہ ہونا چاہیے؟

لیکن اس بات کو جاننے دیجئے۔ یہ زبان کا مسئلہ ہے اس میں ان اہل زبان ہی کو آپس میں بحثیں دیجئے جو صبح و شام اپنی زبان دانی کا ڈھول بجاتے سہتے ہیں۔ فقرے کے مفہوم پر غور کیجئے۔ نیاز صاحب نئیات کا ایک مسئلہ بیان کر گئے ہیں اور کمال یہ ہے کہ بغیر سوچے سمجھے بیان کر گئے ہیں کس بھول پن سے فرماتے ہیں کہ ”فکاہی مضامین کی بڑی خوبی محاکات اور تجزیہ کہلاتی ہے“ (یہ کہلاتی ہے) کی بھی ایک ہی کسی یہ نہ بتایا کہ کون کتنا ہے بس کہ دیا کہ کہلاتی ہے

خود بھی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے اور اس اجمال سے اثر بھی پیدا کر لیا کہ گویا ہم نے بڑے بڑے اہل اللہ کے خیالات کا پتھر پیش کر دیا ہے۔ اب ہم تم ان پڑھ لوگوں کے سامنے کس کس فلاسفر کا نام لیں تمہارے لئے اتنا کافی ہے کہ کہلاتی ہے، افسوس نیاز صاحب نے یہ نہ بتایا کہ فلاسفی مضامین کی بڑی بڑی خوبیوں کی تخصیص انہوں نے کیسے کر لی؟ نیز انہوں نے کوئی مثال پیش کی ہے نہ دلیل اور بات اس دھڑلے سے کی ہے گویا چلتے چلتے فن تنقید کی شاہراہ پر ایک سنگ میل ہی تو نصب کئے ہیں۔ ایسی بے سرو پا بات کی تردید کوئی کس طرح کرے؟ البتہ اگر نیاز صاحب کبھی اس موضوع پر کوئی علیحدہ مضمون لکھیں اور اس میں اس دعوے کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کریں تو انشاء اللہ بشرطِ فرحت اس کا جواب ضرور لکھا جائے گا۔

اتنا ہم ان سے کہہ دیتے ہیں کہ وہ اس قسم کا مضمون لکھنے سے پیشتر برگسوں کی کتاب "موسوم بخندہ" یا میرٹھ کا مضمون ضرور کسی سے پڑھ لیں۔ کہ ان سے بہتر اس موضوع پر کم لوگوں نے لکھا ہے۔

حیرت ہے کہ نیاز صاحب "یورپ کے ہر شعبہ علم" کو جانتے ہوئے بھی ان کتابوں سے ابھی تک واقف نہیں۔ یہ ہم نے اس لئے عرض کر لیا کہ اگر انہوں نے ان دو مضمونوں کا مطالعہ کیا ہوتا تو کم از کم ایسی سہکی سہکی باتیں نہ کرے۔ ہم اور ہم جیسے کئی نو مشق ابھی ملاحوں کی ابتدائی جماعتوں میں تعلیم پڑھتے تھے کہ نیاز صاحب کا آفتاب شہرت نصف النہار پر تھا۔ لیکن افسوس کہ اس کہنہ مشقی کے مقابلے میں انہیں اپنی ذمہ داری کا احساس بہت کم ہے۔ جن موضوع پر وہ قلم اٹھاتے ہیں۔ ان کا دائرہ مآثر اللہ بزرگ وسیع ہوتا جا رہا ہے مگر ان کے شوقِ انشا پر داری کے ساتھ ساتھ ان کا علم بھی وسیع ہوتا رہتا یا کم از کم اگر وہ اپنے شوق کی جولانیوں کو اپنے دائرہ علم تک ہی محدود رکھتے تو بہت بہتر ہوتا۔

”تاثر“ مولانا احسن ماوہر دی کے زور کلم کا نتیجہ ہے۔ اس دیباچے میں صرف ایک ہی خوبی ہے وہ یہ کہ مختصر ہے شروع میں علم الاصوات کے ایک نہایت ہی سہل اور پیش پا افتادہ مسئلے کو کہ لوجہ بدلے تو معنی بھی بدل جاتے ہیں، بڑے طمطراق کے ساتھ گلے کی رگیں پھلا پھلا

کر اور ایک دوسری چار نمبر سے کہ بیان کیا ہے اور سیدھی سادھی بات کو وہ الجھایا ہے کہ آشفہ بیانی کو ہمیشہ کے لئے احسن مار ہروی کا مرادف بنا دیا ہے اب بعد اس مسئلے سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ ہم انہیں کے الفاظ میں دہرائے دیتے ہیں (قاریؒ سے مدد خواست ہے کہ مندرجہ ذیل فقرے کو از حد غور سے پڑھیں)

» غرض یہ ہے کہ ہر زبان اپنے مراتب تربیت میں مختلف نوعیتیں رکھتی ہے اور اس کی تمدنی حالت عام تصنیف و تالیف، سیاسی لکچر، ہندی مواظف، اور روزمرہ بات چیت میں ایک دوسرے سے جداگانہ نظر آتی ہے۔ ان سب نوعیات کے بعد تقریر و تحریر کی مناسبت و عرافت ایک نوعیت خاص ظاہر کرتی ہے جو ہر ادبی زبان میں تغنن طبع کے لئے ضروری اور جزو لاینفک ہیں۔«

احسن صاحب علی گڑھ میں پروفیسر ادبیات ہیں۔ علی گڑھ میں نکتہ رس، قابل، ذہن اور زبان دان حضرات کی کمی نہیں۔ خدا کے لئے ان میں سے کوئی صاحب اس کا فانی زبان کا اردو میں ترجمہ کر کے ہیں اس کا مطلب سمجھادیں۔ ان دو فقروں میں صرف اور نحو کی کئی غلطیاں ہیں۔ کئی الفاظ کا استعمال معنوی اعتبار سے غلط ہے لیکن اس کو گولے سے کیا فائدہ؟ تمکین صاحب خود ہی فرماتے ہیں کہ کیلادہ اس فقرے کا مفہوم سمجھتے ہیں اور اگر سمجھتے ہیں تو کیا انہوں نے خود ہی سمجھ لیا تھا۔ یا کسی جوتشی سے اس کے معنی پوچھے ہیں۔ کیا سلامت، شگفتگی اور روانی اسی کا نام ہے؟ بہت ممکن ہے کہ ادبیات کے پروفیسر ایسی زبان سمجھتے ہوں۔ بہر حال احسن صاحب کی پروفیسریت کے سامنے اگر ہر فقرہ اس ذوق سے زانوئے ادب نہ کرتا ہے کہ مطلب تو پچک کر یا ہر نیکل جاتا ہے اور لفظوں میں گٹے پر مہلتے ہیں۔ اسی انداز کے ایک دو صفحے لکھ کر پروفیسر صاحب نے دیباچے کا خاتمہ ایک شعر پر کیا ہے۔

ہے غنچہ تبسم تمسکین کاظمی
ایسا مذاق جس میں مناسبت ہے لائمی

جس طرح احسن صاحب پر وینسرا دیات کے دیباچے میں صرف ایک ہی خوبی ہے کہ مختصر ہے۔
اسی طرح احسن صاحب تلمیذ حضرت داغ کے شعر میں صرف ایک ہی خوبی ہے کہ تقطیع سے
نہیں گزرتا اور نہ کیا دیا چھ اور کیا شعر، کہ شمع دامن دل کی کشد کہ جا اینجا ست۔ احسن صاحب سے
ہم اور تو کیا کہیں، صرف اتنا عرض کرتے ہیں کہ اگر لازمی کا لفظ آنا ایسا ہی لازمی تھا تو کاظمی
کو کاظمی تو لکھ لیا ہوتا کہ اس سے شعر کی حیثیت میں کوئی فرق نہ آتا۔

دیباچہ نمبر ۲ ملازموزی صاحب کا لکھا ہوا ہے۔ ملازموزی بھی تمکین صاحب کی طرح
اپنے نام کے ساتھ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن) مزور لکھتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ کوئی
علمی سند نہیں محض چنڈہ دیتے رہنے کی علامت ہے یعنی اگر ہندوستان میں افلاس نہ ہو تو پھیل
گوئی تک سب ایم۔ آر۔ اے۔ ایس ہو سکتے ہیں۔ اہل دانش کے نزدیک اس کی وقعت تو آر۔
ایس۔ وی۔ بی سے بھی کم ہے اور پھر یہ لوگ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس کے بعد خطوط و حدانی کے
اندلس اس التزام سے لکھتے ہیں گویا خاص جارج پنجم کے دست مبارک سے سند پائی ہے
ان سے ہماری درخواست ہے کہ ابلہ فریبی کا یہ شیوہ ترک کر دیں اور نئے سال سے اپنے
نام کے ساتھ بے معنی حروف لکھنا چھوڑ دیں۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن) لکھنے سے تو ”میرٹک
(شکار پوس)“ لکھنا زیادہ قدر افزائی کا موجب ہوگا۔

ملازموزی صاحب کا دیباچہ بھی اسی بے مددگی کا آئینہ ہے جس کا اظہار انہوں نے اپنی
لاہور والی تقریر میں کیا تھا نیا صاحب کی طرح ملازموزی صاحب نے بھی ظرافت نگاری
پر افکار عالیہ کا اظہار کیا ہے۔ غلطی ہے۔

ظریف تحریر وہ جو پڑھنے والے کو اس موقع پر ہنسا دے جہاں ہنسنے کے
لئے اس کا دل نہ چاہتا ہو۔ اور ظریف وہ جو صدمے سوا ہنسی پیدا کرنے
والی تحریر لکھتا چلا جائے اور یہ نہ سمجھے کہ میں ظریف تحریر لکھ رہا ہوں۔
امشاء اللہ کیا حقائق بیان کئے جناب نے! گویا ظریف تحریر وہ ہے جو پڑھنے والے کو ہنسا دے۔

یہ نکتہ ابتدائی آفرینش سے آج تک کتم عدم میں استوار کر رہا تھا کہ بیسویں صدی میں ایک ملازمی پیدا ہوں گے جو اسے معرض ظہور میں لائیں گے، ظریف وہ ہے جس کی تحریر پر ہنسی تو آئے لیکن وہ یہ نہ سمجھے کہ میں ہنس رہا ہوں اگر صحیح ہے تو ہر بڑے سے بڑا ہے وقت ہر نادان بچہ ہر غلط سطر اردو بولنے والا انگریز نظر لیتا ہے کیونکہ ان لوگوں کو اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ ہم ہنس رہے ہیں اور اگر ان کی باتیں بعینہ لکھ لی جائیں تو ہنسی کا سامان بھی فراہم ہو جاتا ہے۔ ملازمی دراصل کہنا کچھ چاہتے تھے منہ سے نکل کچھ گیا (بسیار نویسوں میں یہ نقص اکثر پایا جاتا ہے) مطلب ان کا یہ تھا کہ ظریف وہ ہے جس کی تحریر پر ہنسی تو آئے لیکن اس میں ہنسنے کی کوشش نمایاں طور پر ظاہر نہ ہو۔ یہ معیار ایک مددگار صحیح ہے لیکن افسوس کہ ملازمی خود اس معیار پر پورے نہیں اترے۔ دیکھا ہے کہ پہلا ہی فقرہ پڑھتے:

”اگر کنوئیں کے برابر گہری ادا تالاب کے برابر چوڑی نظر سے دیکھا جائے تو...“

اخلاق کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اس فقرے کو ظریفانہ نظر سے سمجھ کر ایک قہقہہ لگائیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ہمارے اخلاق کی بہت بڑی آزمائش ہے۔

ملازمی صاحب بہت لکھنے کو انشا پر دازی کا سیم سے بڑا کمال سمجھتے ہیں چنانچہ اسی

لئے اپنے اور تمکین صاحب اور سالک صاحب کے مباح ہیں فرماتے ہیں:-

”ہم تو مولوی تمکین کاظمی کی مضمون نگاری کے قائل ہوتے تو اسی لئے کہ انہیں

جب دیکھا یہی کہ بس لکھ رہے ہیں اور پھپھو رہے ہیں۔“

ملازمی صاحب نے خود بھی مدت سے یہی شیوہ اختیار کر لیا ہے کہ بس لکھ رہے ہیں۔

اور پھپھو رہے ہیں اس سے حضرت ضیاء الملک کی نظر انتخاب بہت کمزور ہو گئی ہے۔ جب

مضمون نگاری کا معراج یہی فرض کر لیا جائے کہ انسان روزانہ دو تین من مضمون لکھ ڈالے

تو دن پورا کرنے کے لئے ادھر ادھر کی بے ربط باتیں کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

ملازمی صاحب نے اس پر باپے میں کئی جگہ بدذوقی کا ثبوت دیا ہے لیکن چونکہ

انہوں نے دیکھا چہ نظر لیا زندگی میں لکھنے کی کوشش کی ہے اس لئے ہم ایسی باتوں کو مذاق سمجھ کر ان سے دگرگزر کرتے ہیں۔ البتہ ایک بد ذوقی ایسی ہے کہ عندِ ظرافت بھی اسے اپنے دامن میں پناہ نہیں دے سکتا انہوں نے سہا صاحب کا ذکر جن الفاظ میں کیا ہے۔ مدارجہ قابلِ تعریف ہے۔ کسی شخص کے جسمانی نقائص کی مہنسی اٹانا افسوس بھی ایک کتاب کے صفحے پر کسی مہذب طبقے میں جائز نہیں۔ یہی بات ہے تو کل کو آپ اندھوں اور کانوں اور لوہوں اور رنگڑوں کی بھی مہنسی اڑائیں گے اور اپنی ظرافت نگارسی پر فخر کریں گے۔ یہ ظرافت جہلا کی ظرافت ہے۔ شرف لکھنے اور بے شمار بائیں ہنسنے اور طنز کرنے کو موجود ہیں ان پر طبع آزمائی کیجئے۔ فاضل الہیات کو کم از کم اخلاقیات سے تواقف ہونا چاہیئے۔

چونکہ یہ دیباچہ رموزی صاحب نے ظرافت آمیز رنگ میں لکھا ہے اس لئے تمکین صاحب کو خیال ہوا کہ ہم جھلا کیوں پیچھے رہ جائیں، جہاں جہاں رموزی صاحب نے کوئی مذاق کی بات کی وہیں آپ بھی نیچے ایک نوٹ دے کر دنیا کو یاد دلانے چلے گئے کہ "اس مہنسی مذاق میں کہیں ہمیں نہ بھول جائیئے۔ مگر صاحب ظرافت نگار سہی، لیکن کتاب تو بہر حال ہماری ہے۔ مگر رموزی نے کہا ہے۔" ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں کہ تمکین صاحب کے اندر مہمان نوازی کی صلاحیت ہے یا نہیں۔ آپ نے اس پر نوٹ چڑھایا کہ "قطعاً صلاحیت نہیں ورنہ مگر وہ آپ کو جلد آباد بلاتا۔" (اے اے اے) "لوٹ لوٹ گئے۔" (اے اے اے) "مگر صاحب نے کہا۔" آپ شردانی کیوں پھنستے ہیں اور کوٹ سے کیوں نفرت ہے؟" آپ نے فوراً خفی قلم سے جواب دیا کہ "کبھی کبھی کوٹ پتلون بھی پھنستا ہوں" (اے اے اے) "مگر صاحب نے کہا۔" ان مضامین کو حاصل کرنے کے دوزخ کی آگ سے محفوظ ہو جائیئے۔" آپ نے نوٹ ایڑا دیا کہ "مسلمانوں جیت حاصل کرو،" (اے اے اے) "مگر صاحب نے کہا۔" اللہ انہیں منصب عار بنا دے" آپ نے جھٹ تصحیح کی کہ "آپ کی دعا سے منصب تو ہمیں اب بھی ہے۔" (خیر مرزا محال لوگ فوڈ امر خوب ہو گئے، سبحان اللہ کیا ابھی پلیر ہیاں ہیں۔) تقریب کے لکھنے والے مولوی عبدالمنعم صاحب سعیدی بھی تمکین صاحب اور ملا علی

کی طرح بیانگ مدہل ایم آر۔ اسے۔ امیں (لندن) ہیں ان میں ملاحظہ اتانیت باقی دو باچہ لوسوں کے مقابلے میں کم ہے لیکن کنا شیدا علمتے علم میں یہ بھی ویسے ہی بلند آہنگ ہیں۔ زورِ قلم خود نمائی کی بہ نسبت دوست نوازی میں زیادہ صرف کیسے تاہم ایک تمکین صاحب کی عظمت ثابت کرنے کے لئے دو کٹر ہیوگو، ہر برٹ امیں، میٹھیو آنڈرٹ گاران رسکن فلکن اور امیرسن کے اقوال نقل کر کے ان مشاہیر کو مفت میں رسوا کیا اور اپنے دوست کو نہایت نیک دہنتی کے ساتھ مسخکہ انگیز بنا دیا۔ اقلبات کے نقل کرنے میں سعیدی صاحب کو خاص ملکہ حاصل ہے۔ میٹھیو آنڈرٹ کا قول نقل کیا تو وہ غلط (اور اس کے معنی بھی غلط تھے) اور فلکن کا قول نقل کیا تو وہ غلط۔

احسن مارہروی صاحب کی طرح سعیدی صاحب کا مذاقِ شعر بھی قابلِ ذکر ہے۔ غالب کا ایک مصرعہ نقل کیا کہ ہر لہو اہوس نے سن پرستی شعاسکی، تو سن پرستی، کوہِ عشق پرستی، بنا دیا۔ اس کے علاوہ تین شعروں کو زینتِ کلام بنایا ہے پہلا شعر یہ ہے:-

تو شاہاش کیا کہتا ترقی اس کو کہتے ہیں

نہ ترشے تھے تو پھر تھے جو تھے تو خدا ٹھہرے

دوسرا مصرعہ تو غیر پھر بھی گنہگار سے کہ قابل ہے۔ لیکن پہلے مصرعے میں جیسے پہلچون سے بھرتی لگتی ہے دوسرا شعر ملاحظہ ہو:-

زمانہ ایک طرح پر کبھی نہیں رہتا

اسی کو اہل جہاں انقبہ کہتے ہیں

سعیدی صاحب کو اسی پاتے کے اشعار یاد کرنے اور ہر لہے کا شوق ہے تو مندرجہ ذیل شعر لافٹ کر لیں کسی اور دیباچے میں کام آئے گا۔

ابھی سینے تھے بال لہو ابھی بیاہ ہوتے

اسی کو لوگ عموماً خناب کہتے ہیں

ملاحظہ رہے! اچھا ہے اور اس کے اچھا ہونے کی وجہ سے سعیدی صاحب کچھ ایسے خناب میں

پڑھنے کا انہوں نے اس کے نیچے صحت تو سین میں اقبال کا نام لکھ دیا تاکہ پڑھنے والے سعیدی صاحب کو اس سے بری لگ نہ سمجھیں۔

اس دیباچے کے پہلے حصہ میں تمکین صاحب کے خاندانی حالات بالوضاحت بیان کئے گئے ہیں۔ ہم تمکین صاحب کے بزرگوں کو مددِ جہ قابلِ احترام سمجھتے ہیں امدان کی شان میں گستاخی کا ایک لفظ بھی منہ سے نکالنا پرے دسے کی ثقافت۔ لیکن انہی کے احترام کی وجہ سے یہ کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر یہ حصہ حذف کر دیا جاتا تو بہتر تھا۔ آخر اولاد کے گناہوں کی سزا آباؤ اجداد کیوں ٹھگتیں اور پھر اچھی بات بھی بے غل کی جلتے تو بری معلوم ہوتی ہے تمکین صاحب آخر کہاں کے اتنے بڑے مصنف ہیں امدان کی تحریرات ایسی بھی کیا خیال انگیز ہیں کہ پڑھنے والے ان کے خاندانی حالات بالوضاحت معلوم کرنے کے لئے سبقت لے کر جاویں۔

دوسرے حصہ میں سعیدی صاحب نے اردو کے مزاحیہ نگاروں پر فرذا فرذا تنقید کی ہے۔ با تنقید کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ سعیدی صاحب کے پاس خیالات کی قلت ہے اسی لئے بیچا ہے کسی کی تعریف کرتے وقت بدست دیا ہو جلتے ہیں۔ تنقید کے تین چار نمونے ملاحظہ ہوں۔

۱-۱- اس فن کو اردو میں نقل کرنا سب سے پہلے منشی سجاد حیدر نے اختیار کیا اور عمدگی سے لکھتے رہے۔

۲- پطرس نے لائٹ ہوم لکھا اور خوب لکھا۔

۳- فرحت اللہ بیگ نے بھی لائٹ ہوم لکھا شروع کیا اور خوب لکھا۔

۴- امتیاز علی تاج صاحب نے بھی یہ چھاپا چھپا، کا سلسلہ شروع کیا اور خوب لکھنے لگے۔

اس کے بعد ہم سوائے اس کے اور کیا کہیں کہ حضرت آپ نے بھی تنقید کا سلسلہ شروع کیا اور خوب لکھا لیکن بلوچ اس کم مانگی کے (یا شاید اسی کم مانگی کی وجہ سے) معمولی سی بات کو بھی ماملہ لکھتے ہیں۔

۵- اردو ادبیات کا مطالعہ گہری نظر سے کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس فن کو اردو میں مستقل

طو پر سب سے پہلے منشی سجاد حیدر نے اختیار کیا۔

اتنی ذرا سی بات کے معلوم کرنے کے لئے میں سے ہندوستان کا ہر پرچھا لکھا پچھ واقف ہے۔
 اردو ادبیت کا گہری نظر سے مطالعہ کرنا، گوہ کندن و گاہ برآوردن کے مصداق ہے۔ یہ شکل سعیدی صاحب ہی کو مبارک ہو، ایک اور جگہ حق دوستی یوں ادا کیا ہے:-

”بہر حال میں خوش ہوں کہ آج وہ چیز پیش کر رہا ہوں جو ہر حیثیت سے کامل ہے۔“

ذکر تمکین صاحب کے مجموعہ مضامین کا ہے لیکن فقرہ وہ استعمال کیا ہے جو اکثر پیغمبر بھی اپنے صحیفوں کے متعلق استعمال کرتے ہوئے متامل ہوں۔ سعیدی صاحب شاید کامل کے معنی نہیں جانتے انہوں نے اسے بھی ”خوب“ اور ”حمده“ کی قسم کا ایک معمولی لفظ سمجھ لیا ہے۔ آخر میں سعیدی صاحب نے تمکین صاحب کے ساتھ حسد اور بغض رکھنے والوں کے خلاف جن کی تعداد بہ قول ان کے ”بہت کافی ہو گئی ہے“ بہت کچھ زہرا گلا ہے چونکہ ہم ان ماسدوں کے نام تک سے واقف نہیں نہ ہماری سمجھ میں آتا ہے کہ کوئی تمکین صاحب کے ساتھ رشک اور حسد اور بغض رکھے تو کیوں اس لئے میں سعیدی صاحب کے زور دار فقروں میں بجز چھپڑ پن اور سوتے ہضم کے اور کچھ نظر نہیں آتا مگر میں سعیدی صاحب سے پورا پورا اتفاق ہے جو لوگ تمکین صاحب سے رشک کرتے ہیں ان کی راجی حالت واقعی قابل افسوس ہے۔

خلتے پر ہم نہایت واضح طو پر قارئین کے ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ میں ان باپنج حضرات سے معاذ اللہ کوئی ذاتی عناد نہیں۔ عناد کیا معنی ہیں تو افسوس ہے کہ میں طقات تک کا شرف حاصل نہیں۔ لیکن جب یہ پانچوں سوا ایک ساتھ میدانِ ادب میں اترتے ہیں۔ اور باوجود اپنی زنگ خوردہ کواروں اور اپنے فرسودہ ساز و سامان کے سمیع مراثی نعروں کے ساتھ روح ادب اور مذاقِ سلیم کو دعوتِ مبالغہ آمیز دیتے ہیں تو ہر مائل و بائع کافر غصہ ہے کہ اس دعوت کا جواب دے۔ ہماری اپنی رائے ان پانچ افشا پرمانوں کی تعینات کے متعلق یہ ہے کہ بڑا بھی لکھتے ہیں، اچھا بھی لکھتے ہیں جب ہندوستان میں ادب و دانش کی یہ حالت ہے

کہ ہر جیلے بروے کی کچت ہو سکتی ہے تو ہم ان پر کیوں معترض ہوں؟ لیکن جب یہ لوگ تنقید کرنے بیٹھے ہیں تو ایسی اوٹ پٹانگ باتیں اس وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ ان کی نخوت کے بلبلے میر پھید کرنا ان پر احسان اولاد و خزانوں کے ساتھ نیکی کرنا ہے۔ تمکین صاحب نے ایک کتاب لکھی تھی تو فاموشی، منانت اور شرافت کے ساتھ اسے بازار میں بیچ دیتے، صحیح آراء سے مستفید ہونے غلط آراء کو نظر انداز کر دیتے۔ یہ ممکن نہ تھا کہ کم از کم اخلاقاً ہی اکثر پڑھے لکھے لوگ کتاب کی تعریف نہ کرتے۔ انہوں نے کتاب کیا لکھی ہے کتاب کا بلوس نکالا ہے ایک صاحب خفق انشا پر ملاز کو اس قسم کی سوچیانہ حرکت سے گریز واجب ہے۔ دیباچہ نویسوں کی خدمت میں ہماری موڈ بانہ عرض ہے کہ شعلہ بمقدار علم رکھیں۔ چلو بھر پانی میں گنہ بھر نہ اچھل پڑیں۔ عالم دہی ہے جس کا انداز عمر بھر طالب علما نہ رہے بڑے بڑے دعوے کرنا اور ایک دفعہ قلم سے جو نیکل جلے اسے نظر ثانی تک کا محتاج نہ سمجھنا جہالت کی نشانیاں ہیں۔ لیکن کا قول ہے۔

”تم کچھ لوگوں کو ہمیشہ کے لئے اور سب لوگوں کو تھوڑے عرصے کے لئے دھوکہ

دے سکتے ہو، لیکن سب لوگوں کو ہمیشہ کے لئے بے وقوف نہیں

بناسکتے۔“

ہم جانتے ہیں کہ ہمارے اس مضمون سے فضحائے ذریعہ بحث کو تکلیف بھی ہوگی اور شرم بھی آئے گی۔ اگر شرم تکلیف پر غالب آگئی تو ہم ان کے جواب سے محروم رہ جائیں گے۔ اگر تکلیف شرم پر غالب آئی تو حیدرآباد، جو پال، علی گڑھ اور لکھنؤ میں ”لائو تو قلم دان“ کی آواز میں بلند ہوں گی گو ہمارا غلصانہ مشورہ یہی ہے کہ آئیں باتیں شائیں کرنے کی بجائے چپ رہنا بہتر ہے آگے آپ خود سوچ لیجئے۔ ہماری طرف سے خواہ آپ سب حضرات کسی مرکزی مقام پر سر جوڑ کر کوئی جواب مرتب کر لیجئے خواہ الگ الگ نیرد آزمائی کیجئے۔ ہم ہر طرح سے تیار ہیں۔ ہم تو بلکہ آپ سے ”بھاپلزم“ تک کے متوقع ہیں۔

باقی رہا غنچہ تبسم، یہ کتاب ایک قابلِ احترام بزرگ کی تصویر سے شروع ہوتی ہے اور ایک ایسے مضمون پر ختم ہوتی ہے جو بلذاری فواحشات سے پر ہے۔ اس مضمون میں تمکین صاحب نے جس کوک شاستری ذہنیت کا مظاہرہ کہا ہے اس کے آثار نہ صرف ان کے باقی مضامین میں بلکہ ہندوستان کے اکثر مزاجیہ نگاروں کی تحریروں میں پائے جاتے ہیں۔ ان پر تنقید لکھنا ان کے تعفن کو اور زیادہ پھیلاتا ہے۔

انارکلی مخلصِ صفا اور ہم نیاز مند

نیاز مند ان لاہور

دسمبر ۱۹۳۶ء کے رسالہ ساقی میں "انارکلی پر ایک نظر" کے عنوان سے "ایک غلص کے قلم سے" ایک مضمون چھپا ہے جو بوجہ بے حد دلچسپ ہے۔ مضمون کا رقبہ ساڑھے آٹھ صفحے ہے لیکن فی مربع میل کے حساب سے خیالات کی مقدار سائیریا کی آبادی سے زیادہ نہیں۔ جہاں تک بدگوئی کا تعلق ہے مضمون نگار صاحب ہر سطر میں گز گز بھرا چھلے پڑتے ہیں لیکن جہاں تک تنقید کا تعلق ہے وسعتِ ظرفِ پلو بھر سے بھی زیادہ نہیں اور پلو بھی ایسا جس میں وہ خود باد جو اپنی سبک خیالی کے ڈوب مرنے سے قاصر ہیں۔

تو پہلے بدگوئی کو لیجئے کیونکہ غلص صاحب نے اپنا اور قلم زیادہ تر اسی صنفِ ادب یعنی بے ادبی پر صرف کیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انارکلی پر طعنے کے ساتھ ہی غلص صاحب کو بد معنی کی شکایت لاحق ہو گئی۔ چنانچہ ان کی بے قرار رزح سے طرح طرح کی کوریہ آوازیں نکلتی ہیں کہتے ہیں انارکلی پڑھ کر بڑی مایوسی ہوئی۔ انارکلی کی موت سے زیادہ خود تاج صاحب کی حالت پر رونا آتا ہے وہ بھلے مبارک باد کے کسی اور بات کے مستحق ہیں۔ دل سے چاہتے ہیں۔ کہ تاج صاحب آئندہ اس سفاکی سے لڑ پھر کا خون نہ بہائیں تو بیٹا احسان ہو گا نہ بلکہ بہتر تو یہی ہے کہ وہ آئندہ ذمہ دار لڑ پھر سے کوئی واسطہ نہ رکھیں انارکلی کا ڈرامہ تو اتنا بھی ہماری بھرم نہیں جو پڑھے لکھے تو درکنار معمولی واقفیت کے آدمی کو یہی بھلے یا اس پر رعب ڈال سکے اور تلخ حباب کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ خود اسے دیا برد کر دیں۔

جب ہم نعرہ الفاظ پڑھے تو خیال آیا وہی کسی دوست کو تار بھجیں کہ کسی حکیم سے مشورہ کر کے غلص صاحب کو ایک ہلکا سا جلاب سے دیں تاکہ یہ قراقرظ فرج ہو جائے اور انہیں پریت کر میں کچھ آگے برس دو برس تک کے لئے اپنی ادبی فنڈز راہگی رکھیں مثلاً مولانا اسماعیل میرٹھی مرحوم کی نظیں یا مولانا حسن نظامی کا روزنامہ چوبیس ایسی ایسی چیزیں پڑھ لیا کریں کیونکہ ان کا معدہ اس سے زیادہ کا تحمل نہیں ہو سکتا۔ جب فنڈ بڑھے ہو جائیں گے اور کچھ ٹھوڑا بہت پڑھ لیں گے تو پھر بڑے بڑے اور بڑے بڑے کی تنقید سے بھی شوق فرمائیں۔ فی الحال انہیں مولانا راشد الحیرتی کے ناول ہی پڑھتے رہنا چاہیے۔ کیونکہ وہ ایسے ہی نحیف دماغ کے لئے کھئے گئے ہیں۔

لیکن پھر خیال آیا کہ اس سے ہونہار بچوں کی دل شکنی ہوگی اب تو ماشا اللہ اہل زبان بھی سکولوں کالجوں میں داخل ہونے لگے ہیں اور مذکورہ موش کے جھگڑوں کو چھوڑ کر نقد و تبصرہ کے میدان میں زور آزمائی کرنے لگے ہیں۔ فنڈ غصہ سے دیکھیں شاید کوئی کام کی بات کہنا سیکھ گئے ہوں۔ تو "اہل زبان" کی پت جھڑ شروع ہو کر ختم بھی ہونے کو آئی اور زبان کو ہانکتے ہانکتے ادب کی دم میں مندہ بھی باندھ گئے لیکن شاید پھر بھی کسی ہونہار مضمون نگار کی دم میں کہیں کوئی چکنا پات لگا ہو اس خیال سے مضمون کو دوبارہ پڑھا تو معلوم ہوا کہ جہاں غلص صاحب نے دس بارہ جگہ اپنی جہالت اور بد اخلاقی کا ثبوت دیا ہے وہاں بیس تیس جگہ اپنی عیبت بھی ضرور جتائی ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کا ساختر علم ان کی بے ساختہ جہالت سے کہیں زیادہ دلچسپ ہے۔ لیکن غلص صاحب کی ان خصوصیات کا پیش کرنا کچھ آسان کام نہیں ان کے مضمون میں خیالات کے موتی بکھرے پڑے ہیں (زور بکھرے) پر ہے موتی پر نہیں۔ دراصل موتی کی جگہ ایک اور لفظ سوچا تھا لیکن استعمال اس لئے نہیں کیا کہ "اہل زبان" کہیں گے محاورہ غلط ہو گیا ان موتیوں کو چن کر کھا کرنے کے لئے اس مضمون کی جھول جلیاں میں کئی دفعہ گھومنا پڑتا ہے۔ کیونکہ ڈولیدہ بیانی ایسے نقادوں کی خاص صفت ہے مثلاً فرستے یہاں!

”انارکلی... تین ایکٹ کا ایک موضوعی (سب جیکٹو) ڈرامہ ہے۔ جسے غیر اصطلاحی زبان میں یوں سمجھنا چاہیے کہ اس تصنیف میں تاج صاحب آنکھوں دیکھی نہیں بلکہ من مانی پہلاوت سنائیں گے“

اب اس فقرے کو کوئی کیا کرے۔ اتنی فرصت کہاں کہ دہلی جا کر مخلص صاحب کے دارالمطالعہ کے دروازے پر دستک دیں اور وہ مہر کے سے جو جھانگیں تو ہم اتنا پوچھیں کہ حضرت سب جیکٹو ڈرامہ دہلی کا ناورہ ہے یا لکھنؤ کا؟ کیونکہ الفاظ گو انگریزی ہیں۔ لیکن انگریزی فن تنقید اس اصطلاح سے محض ناواقف ہے اس اصطلاح کی جو تصریح غیر اصطلاحی زبان میں مخلص صاحب نے ہم باہلوں کے فائدے کے لئے کر رکھی ہے اس سے بھی نہ کھلا کہ یہ دریافت کیا ہے کب جوئی اور اس کا کو لبس کون ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مخلص صاحب نے شکارپور کے سفر کے دوران میں وہیر کے کبسال سے ڈرامہ پر کوئی کتاب لے کر پڑھ لی تھی۔ جس سے ان کی جمالت میں اس قدر خوشگوار اضافہ ہوا کہ وہ اسے علم سمجھنے لگ گئے۔

غالباً اسی کتاب مصنفہ لال بھکر سے مخلص صاحب پر یہ بھی انکشاف ہوا کہ:-
”انارکلی، ادب کی بنیادی تقسیم یعنی شاعری، فکشن اور ڈرامے کی آخری صنف کی حیثیت سے پیش ہوئی ہے بلکہ یہ کہتے کہ اس صنف میں بھی کتاب نسبتاً ایک ایسی اہم متن یعنی ریڈیو بچڑی کی مثل ہے جسے انسان کی دیکھائی زندگی کا نمونہ عبرت ہونا چاہیے۔“

مطلب صرف اتنا ہے کہ انارکلی ایک ریڈیو بچڑی ہے لیکن یہ ظاہر کرنا بھی مقصود تھا۔ کہ اس کے علاوہ بھی ہم بہت کچھ جانتے ہیں اور اس اظہارِ علم کے متوق میں بات ایسی فرسودہ اور بے معنی کہی کہ عطا گوید کی مزدورت ہی باقی نہ رہی۔ خود اسی مضمون میں مخلص صاحب نے بٹے مریانا نمازیں حضرت آزاد مروج کی ایک تحریر کا نمونہ پیش کیا ہے اور اسے

خوب سراہا ہے ہم علامہ مخلص صاحب سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر ادب کی بنیادی تقسیم وہی ہے جسے انہوں نے مندرجہ بالا اقتباس میں یوں بھگا کر پیش کیا ہے تو وہ خود ہی بتائیں کہ آزاد کی یہ تحریر کس صنف میں شامل ہے۔ خواجہ حسن نظامی کا ”سی پارہ دل، کس خانے میں ڈالے گا۔ غالب کے ”اردوئے معلیٰ“ کو کیا قرار دیجئے گا۔ آپ کی پڑھی ہوئی کتابوں میں سے یہی مثالیں کافی ہیں۔

آگے چل کر اعتراف کرتے ہیں کہ انارکلی کا قلعہ خود تاج صاحب کے قول کے مطابق ایک بے بنیاد چیز ہے لیکن اعتراض فرماتے ہیں کہ مصنف ڈرامہ نے سرفہرست ہی میں انارکلی کا یہ واقعہ ۱۵۹۹ء کا لکھا ہے جب کہ اکبر کی عمر چھپن سال تھی اور میٹر ہوتے ہیں کہ اکبر جس نے جوانی میں بیہوشی کو نہ مارا وہ چھپن برس کی عمر میں انارکلی کو کیونکر مروا سکتا ہے۔ اس استدلال سے اگر کچھ ثابت ہوتا ہے تو یہی کہ قصہ بے بنیاد ہے پھر نہ معلوم مخلص صاحب تاج صاحب کی تائید کر رہے ہیں یا تردید؟

برسبیل تذکرہ - ہندوستان کے تمام ججوں کو یہ بات ٹوٹ کر لینی چاہیے کہ اگر ان کے سامنے کوئی چھپن برس کا شخص قتل کے الزام میں گرفتار ہو کر پیش ہو تو اس سے پہلی بات یہ پوچھیں کہ ”کیوں بے تو نے جوانی میں بیہوشی کو مارا تھا؟“ اگر جواب نفی میں ہو تو اسے رہا کر دیں۔

ان مثالوں سے میں قارئین کو اس بات کا یقین دلانا چاہتا ہوں کہ مخلص صاحب کے مضمون کو سمجھنے کے لئے باقاعدہ افلاطون نامہ مرتب کر کے ساتھ دیکھنا پڑے۔ کئی فقروں کی بخوبی ترکیب کرنے پر ہی کئی پیرا گرافوں کو از سر نو ترتیب دینا پڑے۔ کئی فقروں کے معنی جوتیلوں سے پوچھنے پڑے اور اس دورِ دھوپ کے بعد مطلب یہ وصول ہوا کہ مخلص صاحب کو یہ قول ان کے ”غلتش“ میں چیزوں سے ہوتی ہے۔

فرماتے ہیں:

• اکبر کے متعلق میں نے پہلے بھی کہا ادب بھی کھلم کھلا کہتا ہوں (مضمون کا رقبہ اسی قسم کی تکرار کا ممنون احسان ہے) کہ انارکلی لکھ کر آپ نے اس کی با عظمت سیرت تباہ کی ہے۔“

اس سلسلے میں غلص صاحب نے پھر اپنی پریشان خیالی کے کئی ثبوت دیئے ہیں۔ ایک طرف یہ فرماتے ہیں کہ:

• اکبر بادشاہ کے نام کے ساتھ ہی جو تصویر ہندوستان کے پچھلے پچھلے کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے وہ آپ کے اکبر دلے کو داسے بالکل نہیں ملتی۔“

جس کا مطلب ہم یہ سمجھتے ہیں کہ غلص صاحب کے نزدیک ڈرلے کا اکبر تاریخ کے اکبر سے مختلف ہے (اس کا جواب مختصر آؤ جو سکتا تھا کہ ڈرامہ نویس یا کوئی بھی انشا پر دانا اس بات کا حق رکھتا ہے کہ کسی تاریخی شخصیت کو جس طرح چاہے پیش کرے اگر وہ تاریخ کے مطابق نہ ہو تو آپ اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ ایسے شخص کو مورخ کی حیثیت سے کوئی درجہ نہ ملنا چاہیے۔ اس کی انشا پر دازی پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ علم ادب کی تاریخ میں آپ کو کئی مثالیں اس بات کی ملیں گی کہ ایک ہی تاریخی شخص کو مختلف انشا پر دازوں نے تباہی اندازوں میں پیش کیا لیکن ان کی ادبی حیثیت کو تباہی سے کوئی صدمہ نہ پہنچا لیکن یہ اصول ذرا مطالعے کے بعد سمجھ میں آتا ہے)

پھر آپ فرماتے ہیں:-

• ڈرامہ نگار کی تعریف یہی ہے کہ وہ جیتی جاگتی ہستیاں پیدا کرے اور کبھی بھی

کوئی بات ان میں خلاف فطرت نہ ہو۔“

غلص صاحب یہ دوسری بات کہنے کے ساتھ ہی بھول بھی گئے۔ یہ فقرہ جو کہیں سے سن پایا تھا جوں کاتوں اپنے مضمون میں رکھ دیا لیکن اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اس معیار پر اکبر کے کیر پچر کو پرکھ کر دکھاتے اور ثابت کر دیتے کہ فلاں بات جو اکبر نے کہی یا کی وہ انسانی فطرت

کے منافی ہے۔ اور بجز جنات کی امداد کے ظہور میں نہیں آسکتی۔ جب یہاں غلص صاحب نے خود ہی ہتھیار ڈال دیئے تو ہم بھی ان کی جان بخشی کئے جیتے ہیں اور دنیا کو شاہد مٹھراتے ہیں کہ ہم باوجود نوجوان ہونے کے سیموں بطل پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔

یہ خلافِ فطرت والی بات غلص صاحب نے غص رعب گانٹنے کو کہی تھی اصل مطلب ان کا وہی ہے کہ تاریخ کا اکبر بہت شاندار ہے اور ڈولے کا اکبر ظالم اور سفاک سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ اس کے جواب میں ہم غلص صاحب کی خدمت میں یہی غلصانہ بشورہ پیش کرتے ہیں کہ وہ دس بارہ سال تک لوزانہ انارکلی کی تلامذت فرماتے رہیں۔ ممکن ہے اس کے بعد مولے مولے نکلت ان پر واضح ہو جائیں اگر اسے پڑھ کر ان کی آنکھوں کے سامنے اکبر کی یہ تصویر نہیں کھینچتی تو ایک عالی وقار علم دوست روشن دماغ شہنشاہ جو ہر وقت ہندوستان کی عظمت کے خواب دیکھتا رہتا ہے اور جوان خوابوں کی تعبیر کئے ہر وقت کوشاں رہتا ہے۔ ایک نوجوان میں جو اس شاندار سلطنت کا ولی عہد ہے کمزوری یا بے راہروی کے ذرا سے آثار بھی پا کر اس قدر بیقرار و پریشان ہو جاتا ہے اور جہاں بانی کی اہم ذمہ داریوں کو اس درجہ محسوس کرتا ہے کہ اپنے پیدائش جذبات کا خون کر لینے سے بھی نہیں بچکچا تا اگر غلص صاحب کی آنکھوں کے سامنے یہ تصویر نہیں کھینچتی تو چشمہ آفتاب در اچہ گناہ اگر اب بھی غلص صاحب کو ڈولے کا اکبر غلص ایک ظالم اور سفاک بادشاہ معلوم ہوتا ہے تو سوائے اس کے ان کا کیا علاج ہے کہ کوئی نیک دل انسان اپنی زندگی ان کی اصلاح کے لئے وقف کر دے خواہ مرتے وقت صرف یہ تسکین اپنے ساتھ لے جائے کہ انما الا اعمال بالنیات۔ اگر ادب کا ذوق نہ ہو، استفادے کی قوت نہ ہو، احساسات میں بیداری نہ ہو، دماغ میں روشنی نہ ہو تو ہاکیا ڈرامہ کے متعلق کسی سڑی بٹی کتاب میں چند فقرے پڑھ لینے سے تنقید کی قابلیت پیدا نہیں ہوتی۔

باقی اس قسم کے اعتراضات کہ غلص یا ندی کی زیانی مغل اعظم کو صلواتیں سنوائی ہیں۔

فلاں کینز کی زبانی سلیم کی مٹی پلید کرائی ہے۔ صرف دستخطی لکھنے کے لئے مسالہ میا کر سکتے ہیں تنقید سے ان کو کوئی سروکار نہیں۔ ایسے اعتراضات نہ صرف انتہا دلچسپ کی یاد دہانی کی مانتنا سی بلکہ انتہا دلچسپ کی کم فہمی کی دلیل ہیں۔ اکبر اور سلیم تو نہایت معمولی انسان ہیں اگر آپ بلا تشبیہ کسی پیغمبر کا قصہ بھی لکھیں تو اس میں بھی یہ ذکر ضرور آئے گا کہ فلاں شخص نے ان کو پتھر مار سے فلاں نے اس سے یہ بدسلوکی کی۔ حتیٰ کہ بعض نے انہیں سولی پر لٹکا دیا اور پھر بھی ان کا منہ کھلے اڑتے رہے پھر اگر آپ پر کوئی اعتراض کرے کہ آپ نے معاذ اللہ فلاں پیغمبر کی توہین کرائی تو بتائیے کہ آپ اس شخص کی ذہانت کے رُخ انور پر ایک پتھر رسید کرنے کے سوا اور کیا کریں گے۔ مخلص صاحب کی خدمت میں صرف یہ عرض کیا جا سکتا ہے۔ کہ حضرت آپ ایک آدھ کتاب ابھی اور پڑھیے پھر تنقید نگاری بھی کر لیجئے گا آپ کا ہاتھ کس لئے روکا ہے؟ لیکن اس تقادی میں بھی آپ کو کیا مزہ آئے گا کہ ہر معنون کے بعد آپ خود ہی موضوع تنقید بن جائیں۔ ایک بات پڑھ کر ہمیں ہنسی بھی آئی اور دونا بھی آیا۔ فرماتے ہیں:-

”میں اپنی تو یہ کہتا ہوں کہ انارکلی کا ظاہری حسن دیکھ کر بڑی امیدیں بندھی تھیں سوچتا تھا کہ واقعی یہ ڈرامہ مغلیٰ شان و تجمل کا ایک سہانا خواب ہو گا جس میں شاہانِ سلف کے سفر و حضر کے جین مناظر اس طرح دکھائے گئے ہوں گے کہ بسنت رُت ہے۔ اکبر بادشاہ میر و شکار میں ہیں سینکڑوں ہاتھی گھوڑے اور ہزاروں خلق خدا کا لاؤ لشکر رکاب میں ہے گویا جنگل میں منگل ہو رہا ہے۔ دو آئینا نہ منزل (جھروکہ) سے لگا لگا دیوان خانہ عام ہے جس کے صحن کے نیچوں و بیچ (۴۰) گز طولانی ستون پر آکاش دیار ات میں دو دروازے پھینچا ہوا ہے۔ اچھا یہ چیز تاج صاحب کی سمجھ میں نہ آتی تھی یا اس کا موقع نہ تھا تو اکبری سلطنت کا جین باز وہی نورتن سے ایسا سچ دیتے کہ سب دیکھتے دیکھتے رہ جاتے۔ اگر اس کا اہتمام بھی تاج صاحب کے بس کا نہ تھا تو جین نوروز

کے بیان میں کم سے کم مینا بازار کی پیاری تصویر کھینچ کے یہ رنگ تو دکھایا ہوتا
 کہ ملک تدبیر کے بادشاہ اکبر اعظم نے اپنی خدا داد طبیعت سے اس میں کیا
 ندرت پیدا کی۔ یعنی یہی کہ بادشاہ امرا کو سلطنت کا رکن رکین جانتا تھا اور
 انہیں اس طرح شیر و شکر دکھنا چاہتا تھا کہ ایک دوسرے کی نگیٹ سے
 مزہ بڑھے۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ خود دار امرا باہم کھٹک بھی جاتے۔
 جہاں یہ صورت پیش آئی اور بادشاہ نے رشتہ ناٹھ کر کے دونوں گھرانہ
 کو ایک کیا۔“

اب قارئین پر واضح ہو گیا ہو گا کہ مخلص صاحب ڈرامے کو سمجھنے سے اس حد تک اہل
 ہیں۔ تاج صاحب تو ڈرامہ انارکلی کا لکھ رہے ہیں نہ اس سیز کا حسرت ناک انجام کیوں کہ
 ہوا لیکن مخلص صاحب کو یہی افسوس رہا کہ تاج صاحب نے ان کو چالیس گز طولانی ستون
 کیوں نہیں دکھایا۔ مخلص صاحب کو خود بھی اس بات کی نامعقولیت سوچ گئی۔ چنانچہ دبی
 دبی زبان میں فرماتے ہیں:

”اچھا یہ چیز تاج صاحب کی سمجھ میں نہ آئی تھی یا اس کا موقع نہ تھا تو.....“

برخوردار بات یہی ہے کہ اس کا موقع نہ تھا۔ سمجھ میں تو آپ کی آگیا لیکن ہنٹ آپ کی ویسی
 ہی قائم ہے پھر بھی کہے جاتے ہیں کہ اچھا یہ نہیں تو نورتن ہی دکھا دیا ہوتا۔ اچھا یہ نہیں تو
 مینا بازار ہی دکھا دیا ہوتا۔ اب اس بچپنے کا کیا علاج۔ مطلب مخلص صاحب کا یہ ہے۔
 کہ تاج صاحب انارکلی کا قصہ تو عموماً دیر کو بند کر دیتے اور مخلص صاحب کو ایک ایسا
 سین دکھا دیتے جس میں اکبر امرا کے لڑکے لڑکیوں کے رشتے کرتے نظر آتے کوئی تاج صاحب
 سے پوچھتا کہ حضرت یہ کیا دخل در معقولات ہے تو تاج صاحب جواب میں کہتے کہ قصہ
 انارکلی کا سہی لیکن اکبر کی خوبیاں اس تفصیل سے دکھانا بہر حال ثواب کا کام ہے۔ اگر ڈرامہ
 اسی اصول پر لکھا جاتا ہے تو تاج صاحب کو چاہیے کہ اگلے ایڈیشن میں ایک آدھ سین غرناطہ

کا بھی دکھا دیں کیونکہ اس کی داستان بھی تو آخر اسلامی کلمہ کی طبع داد ہے اگر غرناطہ بہت دور ہے تو کم از کم تو تک یا برہی کا ذکر مزود ہونا چاہیے۔ کیونکہ یا برہی بہر مال اکبر کا رشتہ دار تھا اور بقول غلص صاحب وہ "بزرگ درخشاں" میں سے تھا۔ آخر میں ایک سین آل ہانڈیا منغل کانفرنس کا بھی دکھا دیا جائے جو حال ہی میں قائم ہوئی ہے تو اور بھی چار پلندگ جابیں گے غلص صاحب کو تار بجی کلمہ "کا درد تو بہت ہے۔ لیکن ان کا مذاق ایگرہیکلمہ سے آگے بڑھنے نہیں پاتا۔"

(۲) دوسرا اعتراض غلص صاحب کا یہ ہے کہ تاج صاحب کی قوت مشاہدہ بہت کمزور ہے۔ علامت کے طور پر آپ نے تاج صاحب کا ایک فقرہ نقل کیا ہے۔
"موسم بہار کی ایک دوپہر ظہر کی نماز ادا ہوئے ڈیڑھ گھنٹہ کے قریب
وقت ہو چکا ہے۔"

اور اعتراض فرماتے ہیں کہ اس فقرے میں بے ضرورت لفاظی ہے۔ فقرہ یوں ہونا چاہیے تھا:

"بہار کا موسم سہ پہر کا وقت ہے۔"

دوپہر کے لفظ سے جو دھوپ کا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور ظہر کی نماز کے ذکر سے جو ایک مسلمان گھر لسنکی معویات کی طرف ضمناً اشارہ ہے وہ آپ نے بالکل ہی نظر انداز کر دیا وہ چیز ہے انگریزی میں ATMOSPHERE کہتے ہیں (معنی کسی پڑھے لکھے سے پوچھئے۔ ڈکشنری میں دیکھے۔ اور شاید واضح طور پر سمجھ میں نہ آئیں) اس کی طرف سے تو غلص صاحب آپ نے دماغ کے دھماکے سے بالکل بند کر رکھے ہیں۔

مگر جس فقرے کو وہ بقول خود اجماع کے دکھانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے:

"ستونوں اور عمراؤں کے سلسلے طویل ہونے شروع ہو گئے۔"

فرماتے ہیں:

” یہ ایک کھلی بات ہے کہ زوال کے بعد سایہ ڈھلنے لگتا ہے اور ظہر کی نماز ایک حد تک سایہ طویل ہونے پر ہی ہوتی ہے لیکن آپ کا جدید مشاہدہ بتاتا ہے کہ نماز ظہر کے بعد ڈیڑھ گھنٹہ ہو جلتے تو سائے طویل ہونے شروع ہوتے ہیں۔“

سایہ ڈھلنے اور سائے کے طویل ہونے میں جو فرق ہے وہ آپ کی سمجھ میں نہیں آیا۔ جس ستون پر دھوپ پڑ رہی ہے جب اس کا سایہ ستون کی لمبائی سے بھی بڑھ جائے تو اس کو سائے کا طویل ہونا کہتے ہیں دھوپ کے متعلق جس قدر مشاہدہ آپ کا ثابت ہوتا ہے، وہ تو بجز ہمال سینڈ کرنے کے اور کسی کام نہ آئے گا۔

(۳) تیسرا اعتراض زبان کے متعلق ہے۔ اعتراض اول تو ایسے فقرے پر ہے کہ ”تم غیبل ہو شیخو؟“ تو مفسر لکھتا ہے ”حضور؟“ وغیرہ وغیرہ۔ جو شخص ”اہل زبان“ ہو کر بھی نہ سمجھے کہ مخاطب کے نام کو فقرے کے آخر میں رکھ دینے سے فقرے کا تصور کس حد تک بدل جاتا ہے۔ اس کو کوئی غیر اہل زبان۔ ہندو یا تحریک سوسیل کے فاصلے سے کیا سکھائے اور کس طرح سکھائے اور اہل زبان کو یہ کس طرح بتائے کہ اہل زبان ہونا اور بات ہے۔ زبان دان ہونا اور بات ہے۔ اسے کاش کوئی قادر الکلام شخص بلند آواز سے ان فقروں کو غلط صاحب کے سامنے پڑھے اور غلط صاحب کے چہرے کا مطالعہ کرتا جلتے اور جب آٹھ دس دفعہ پڑھنے کے بعد اسے غلط صاحب کے چہرے پر انشراح کی کوئی جھلک نظر آئے تو ہمیں فوراً اطلاع دے تاکہ ہم شکرانے کے دو نقل پڑھیں حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ پرانی وضع کے بندوستانی کھیلوں کے عادی ہو چکے ہیں۔ وہ ان کی مصنوعی زبان اور مصنوعی طرزِ تحریر سے اس قدر مانوس ہیں کہ اس قسم کی جیتی جاگتی زبان انہیں تکلیف دہ طوطی پرانہ لکھی معلوم ہوتی ہے۔ ٹیکسپیئر نے بھی جب اس طرح کی بدلتی جیتی جاگتی لکھی اس پر یونہی اعتراض نہیں کرتے تھے۔ ادھر ایک بہت بڑے نقاد نے اس کے متعلق یہ کہا تھا کہ چھری اور کھیل

جیسے الفاظ کو ڈرا ہے میں استعمال نہ کرتا چاہیے۔ اس لئے کہ لوگوں کو ”خبر اوسطاً“ اور اسی
صنف کے بلند آہنگ الفاظ کا چسکا پڑ گیا تھا اور جو مصنف اس تصنع سے گریز کرتا تھا وہ
بہت بڑے گناہ کا مرتکب سمجھا جاتا ہے۔ مخلص صاحب تاریخ ادب سے واقف ہوتے
تو عبرت پکڑتے لیکن نامن از کجا آرو کہ نامہ ندارد۔

”پختہ حُسن“ اور ”پھیکا آسمان“ وغیرہ کے متعلق مخلص صاحب نے صرف اتنا فرما دیا
کہ نئی ترکیبیں ہیں لیکن یہ نہ فرمایا کہ ان میں نقص کیا ہے کوئی اعتراض کرتے تو جواب کی
تکلیف بھی گوارا کر لی جاتی۔ فی الحال تو اتنا ہی عرض کیا جاسکتا ہے کہ بجائے حضور یہ نئی
ترکیبیں ہیں اور ان میں سے بعض مثلاً پختہ حن صرف بمتہ یوں کے لئے نئی ہیں۔

دو محاوروں کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ ان کا محل استعمال غلط ہے آخر مخلص صاحب
اپنی حرکتوں پر اتر آئے۔ ہم بھی متعجب تھے کہ ”اہل زبان کی لکھی ہوئی تنقید ہو اور اس
بہی کی گرہ یعنی ”محاورے“ کا تذکرہ نہ ہو جس کی بدولت یوپی کے کئی حضرات پنساری بن
بیٹھے ہیں۔ تاج صاحب کا فقرہ ہے ”دنیا کی تو انارکلی انارکلی کہتے نہ بیان خشک ہوئی جا رہی
ہے۔ اور تجھے اتنی توفیق نہیں کہ جوڑے منہ سے دو بول شکر لے لے ہی کے کہ دے۔“
مخلص صاحب کہتے ہیں: ”جھوٹے منہ“ کا یہ محل استعمال نہیں بہاں پھوٹے منہ“
چاہیے۔

اگر جناب مخلص صاحب نور اللغات کی ورق گردانی کی زحمت گوارا فرمائیں تو انہیں
معلوم ہوگا کہ جھوٹے منہ کے معنی ہیں۔ ظاہر داری سے اور نمائش سے۔ ڈرا سے کا جو فقرہ
اوپر نقل کیا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ دنیا تو تیری تعریفیں کر رہی ہے اور تجھے اتنی بھی
توفیق نہیں کہ ظاہر داری یا نمائش ہی کے طور پر دو بول شکر لے لے ہی کے کہ دے۔

”جھوٹے منہ“ کے معنی نور اللغات میں یوں لکھے ہیں ”تختیر سے“، خراب منہ سے
بڑے منہ بدولی کے ساتھ ”توسین میں جو ”تختیر سے“، لکھا ہے اس سے مراد ہے کہ یہ محاورہ

جس کو مخاطب کر کے کہا جاتا ہے اس کی تحقیر بھی مراد ہوتی ہے گو یا مخلص صاحب کا اعتراض یہ ہے کہ اتار کلی کی ماں اس موقع پر ایسا فقرہ کیوں نہیں کہتی جس سے اتار کلی کی تحقیر کا پہلو بھی نکلے! یہ اعتراض محاورے کا اعتراض نہیں۔

”دوسرا اعتراض سپنوں فار روزن“ پر ہے: ”سپنجہ“ کے معنی نور اللغات میں یہ لکھے ہیں۔ ”چھوٹی سیخ“، ”لوہے کی چھوٹی سلاخ“۔ ”سپنوں فار روزن“، لکھنے سے مصنف کی مراد یہی ہے۔ کہ ایسا روزن جس میں لوہے کی چھوٹی سلاخیں لگی ہیں اس نقطہ کے استعمال سے روزن کے متعلق بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس قدر بڑا تھا اگر کسی بہت ہی چھوٹے روزن مثلاً کسی گڑیا کے گھر کے روزن کا ذکر ہو تو ممکن ہے وہاں سپنجہ کی بجائے سلاخی کا لفظ استعمال کیا جائے اس وقت مخلص صاحب فرمائیں گے کہ سلاخی سے تو سر مرہ لگایا جاتا ہے۔ خدا کے لئے مخلص صاحب کے کوئی دوست انہیں سمجھائیں۔

باقی الفاظ کے متعلق اطلاقاً عرض ہے کہ آپ کو شاید معلوم نہ ہو وہاں کے ایک مصنف منشی فیض الدین گز سے ہیں جو لال قلعہ کی زبان لکھنے کے لئے مشہور تھے انہی کی ایک کتاب ہے ”بزم آخر“ پچھلے دنوں تو نایاب تھی اب چاندنی چوک کی کسی دکان سے فرودل جلتے گی۔ بھی شام کو ایڈورڈ پارک سے فراغت پا کر ادھر سے گزریے تو ایک نسخہ خریدتے جلیے اس میں آپ کو گنگا بل کپڑا اور گوش بیچ کی گوٹا اسی قسم کے کئی اور الفاظ مل جائیں گے جن پر آپ یوں جاہلانہ معترض ہوتے ہیں۔ جو الفاظ وہاں نہ ملیں ان کے متعلق ابوالفضل کے آئین کبریٰ کا مطالعہ فرمائیے وہاں مل جائیں گے جو مغلیہ ڈرامہ لکھنے بلجھتا ہے وہ ایسی مستند کتابوں ضرور دیکھ لیتا ہے۔ اسے کاش جو لوگ تنقید لکھنے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ بھی اتنی تکلف ادا کر لیا کرتے ہیں۔

اب آپ کے پاس صرف ایک ہی جواب دہ گیا ہے وہ یہ کہ ہم نور اللغات کو مستند مانتے ہیں۔ ”بزم آخر“ کو اگر یہ واقعہ ہے تو مخلص صاحب کو چاہیے پہلے اہل زبان آپس میں پیشانیوں

جب خدان کا ایمان درست ہو جائے تو پھر باقی صوبوں میں بھی تبلیغ شروع کریں۔

تو دونوں حدیچہ کر دی کہ بردنِ خانہ آئی

یہ تمام ہست و بود سچا ہی تنقید کی قارئین نے دیکھ لیا کہ اس تنقیدی مضمون میں اندر کی کماصل موضوع کو غلط صاحب نے جھوٹا تک نہیں محض ضمنی اور فروری باتوں ہی میں اُلجھے رہے خدا نارنگی کے کیریکچر کے متعلق کچھ نہ فرمایا جو ڈرامے کی جان ہے اور جس کے ارد گرد تمام واقعات و کوائف کی تنظیم کی گئی ہے۔ مناظر کی تقسیم کے متعلق کچھ نہ لکھا، واقعات کے تناسب کے متعلق کچھ نہ فرمایا ٹریجڈی کی مختلف کیفیات کے زیر و بم کے بارے میں خاموش رہے۔ اردو ڈرامہ کی تاریخ کو پیش نظر رکھ کر یہ نہ فرمایا کہ نارنگی کا ڈرامہ کہاں تک رسمی ڈرامے کا نمونہ ہے اور کہاں پر انی قیود کو توڑتا ہوا نظر آتا ہے اس بات پر بحث نہ کی۔ اگر یہ ڈرامہ سٹیج پر دکھایا جائے تو کیا دقتیں پیش آئیں گی۔ ہمیشہ وہ سٹیج اس کو کہاں تک قبول کر سکتی ہے اور کیوں؟ کسی اور ٹریجڈی سے مقابلہ نہ کیا۔ یہ نہ ارشاد کیا کہ اردو ڈرامے کی موجودہ حالت کیا ہے۔ اور اس میں نارنگی کس حد تک ترقی یافتہ یا تنزل کا موجب ہو گا کہا تو یہ کہا کہ اکبر ہست اچھا آدمی تھا۔ سلیکے دوپہر کے بعد ہی ڈھلنے لگ جاتے ہیں اور ہمارے ہاں سینچہ نہیں فلائینچہ ہوتا ہے اور اپنے زعم میں سمجھ رہے ہوں گے کہ اسٹو کے بعد اگر کسی نے ڈرامے کی تنقید لکھی ہے تو ہمیں نے لکھی ہے۔

اب صرف ایک بات کا ذکر باقی رہ گیا ہے اور چونکہ میں اس بات کو محض کٹا بیٹہ بیان کرنا چاہتا ہوں اس لئے قلم ہے کہ غلط صاحب کے پلے شاید نہ پڑے۔ تاج صاحب نے اتارنگی کو مس جماب اسمیل کے نام ڈیڑھ کیٹ کیا چغتائی صاحب نے اپنی فلم لاری سے اس ڈرامے کی طباعت کو روٹی سنٹی تاج صاحب اور مس جماب یا تاج صاحب اور چغتائی صاحب کے باہمی مراسم غلط صاحب کو معرضِ بحث میں نہ لانے چاہیے تھے۔ غلط صاحب اور غلط صاحب کی تماش کے نقادوں، کو ذہنی اعتبار سے ابھی، ہونو لوسی کے مدبھے

سے بالاتر ہونے کی توفیق نصیب نہ ہوئی اور ابھی انہیں یہ محسوس نہیں ہوا کہ اس طرح کا واسوختا نہ چرچہ چرچہ پن خود نفاذ کے سلسلہ پن کی دلیل ہوتا ہے۔ خصوصاً خواتین کا ذکر انہیں اس بے تکلفی سے نہ کرنا چاہیے جس سے شہرے پن کی بو آئے۔ یہ مس حجاب اسمعیل کی بدقسمتی ہے کہ وہ اپنی انشا پر دازی کی وجہ سے اس ذمہ سے میں شامل ہیں جس میں اصطلاحاً غلص صاحب بھی قدم رکھتے ہیں لیکن غلص صاحب کو اس پر فخر کرنا چاہیے اسے اپنے عدم تربیت کے اظہار کے لئے ایک بہانہ نہ بنالینا چاہیے۔

غلص صاحب کے مضمون کے ساتھ رسالہ ساقی کے ایڈیٹر نے ایک نوٹ لکھ کر چار ڈاگ عالم میں اس بات کا اعلان کر دیا ہے کہ مضمون نگار کی رائے سے ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے، اور یوں سمجھ لیا ہے کہ وہ تمام ذمہ داریوں سے بیکروشن ہو گئے۔ لیکن شاید جیسے تربیت یافتہ نوجوان کو اس امر کا احساس ہونا چاہیے کہ جس بد اخلاقی کی طرف ہم نے آخری پیرا گراف میں اشارہ کیا ہے۔ اس کی اشاعت ایک درد مان عالیہ کے سپوت کو نہ کرنی چاہیے تھی۔ غلص صاحب کی نقائینہ پد تیز پو لیسے ہم شاید صاحب کو بری الذمہ سمجھنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن غلص صاحب کا ذاتی نظیر، شاید صاحب کے حامن پر چند ایسے بد نما دہتے چھوڑ گیا ہے جو بے تعلق کا ایک نوٹ لکھ دینے سے نہیں دھل سکتے۔

ہم اس مضمون کے کسی کھیلنے سے جواب کے لئے چشم براہ ہیں خواہ وہ جو اب غلص صاحب لکھیں یا شاید صاحب۔ یا دونوں میں سے کسی ایک کے کوئی ایک یا ایک سے زیادہ گناہ یا نامدار، استاد، شاگرد یا ہمنوا۔

ایک غیر مطبوعہ کتاب کا دیباچہ

یہ کتاب ساٹھ مضامین کا مجموعہ ہے جو ۲۹ پاکستانی اور ۳۱ غیر پاکستانی (بیشتر امریکن) اکابر و مشاہیر کے خیالات و مشاہدات کے آئینہ دار ہیں۔ ہر حصے کے پہلے مضمونوں کو چھوڑ کر باقی مضامین کی ترتیب بلحاظ ابجد ہے۔ ورنہ حفظ مراتب میں نہ معلوم کیا لغز تیشیں سرزد ہوتیں۔ پاکستانی مضامین چند ایک اور دیگر مضامین تمام تر انگریزی سے ترجمہ کئے گئے ہیں۔ مترجمین کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ یہ کام انہوں نے خوش اسلوبی سے انجام دیا۔

جمیے کا خیال ایڈورڈ آر، مرد (EDWARD R. MURROW) کی ایک تالیف جس آئی بی بو (THIS I BELIEVE) سے پیدا ہوا۔ مرد صاحب امریکن ریڈیو اور ٹیلیویشن کے مشاہیر میں سے ہیں۔ گولڈبراد کا سٹنگ سسٹم کے وائس پریذیڈنٹ ہیں۔ ماہاتِ حاضرہ خصوصاً خارجی اور بین الاقوامی معاملات کے ماہرین میں ان کا رتبہ بلند سمجھا جاتا ہے اور تعلیمی مسائل سے بھی ان کو بہت دلچسپی ہے لاکھوں لوگ ان کے ترتیب دیئے ہوئے پروگرام کو غور سے سنتے اور دیکھتے ہیں اور ان سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔

مرد صاحب اس سے بے حد متاثر ہوئے کہ پچھلی جنگِ عظیم میں اہل انگلستان نے بہت ثابت قدمی دکھائی اور باوجود بے سروسامانی کے دشمن کا ڈبٹ کر مقابلہ کیا اور یہی نہیں کہ تیغ و تنگ کے جوہر دکھائے بلکہ اپنے قدیم اصولوں اور روایتوں کی پابندی میں بھی کہیں خم نہیں کھایا۔ چنانچہ غیب و وطن عدل و انصاف، جمہوریت، ملت کا خیال، جب بھی ان

کے امتحان کی نوبت آئی ہر انگریز نے بلا سوچے سمجھے اپنے قدیم اصولوں کی پیروی کی اور شدید خطرے کے زلزلے میں بھی جب کہ دل بھی چاہتا ہے کہ کسی بات میں بہت میں بیخ نہ نکالی جائے اپنی روایات کو پس پشت نہ ڈالا۔ اس سے مراد صاحب نے یہ نتیجہ نکالا کہ کسی قوم کا عمل دراصل اس کے عمیق عقائد پر مبنی ہوتا ہے اور وہی کسی بحران کے زلزلے میں برعکس کاروائی کرتے ہیں۔ یہاں سے انہیں تلاش ہوئی کہ امریکوں کے عقائد کیا ہیں؟ اور اس غرض کے لئے انہوں نے بڑے بڑے لوگوں کی طرف رجوع کیا اور ان سے کہا کہ آپ اپنے عقائد اور خیالات کا مختصر سا خاکہ کھینچ دیجئے۔ اس کے جواب میں جو مضامین وصول ہوئے انہیں چھلنے ایک اور پھر ایک دوسری کتاب میں شائع کیا۔ دونوں کتابیں غور سے پڑھی گئیں۔ چند مضامین ان میں تھے اس کتاب میں بھی شامل ہیں اور امید ہے دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

مکتبہ فرنیکلن نے ایسا ہی سوال میری وسالت سے پاکستان کے مشاہیر کے سامنے پیش کیا۔ جن ہر بالوں نے اس کے جواب میں مضمون عطا فرمایا میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔ پاکستانی اور امریکی مضامین یکجا شائع ہوں تو دل ان کا مقابلہ کرنے کو چاہتا ہے دونوں ملکوں کا آپس میں جو تفاوت ہے وہ ظاہر ہے ایک امیر ملک، ایک غریب ملک — ایک آزادی کا عادی، دوسرے کا تعارف آناؤزی سے بالکل ہی تباہ — ایک بیشتر مسیحوں کا ملک دوسرا مسلمانوں کا — ایک کی تاریخ یورپ سے وابستہ، دوسرے کا ماضی یورپ کی مخالفت سے لبریز — ایک یورپین ڈھانچے کا ملک، دوسرا ایشیائی ڈھانچے کا۔ اس لئے حیرت ہوتی ہے کہ دونوں ممالک کے مشاہیر کے خیالات میں جس قدر بھی ہم آہنگی ہے وہ کس قدر زیادہ ہے۔ دونوں قنوطیت سے دستبردار، دونوں ایمان کے قائل، جدوجہد کے قائل، عزم و خدمت کے قائل، دونوں کے نزدیک معاشری خدمت اہم ترین ضروریات بنی ہیں سے ہے۔ البتہ امریکہ میں ان خیالات کو بہت کچھ سہولتیں اور گنجائشیں عمل کی نصیب ہو چکی ہیں اور ہمارے ہاں ابھی بہت کچھ طبع مستقبل میں ہے۔ لیکن فخر و مسرت کا مقام ہے

کہ ہمارے ہاں جو لوگ برسرکار ہیں یا جن کا معاشرے میں حصہ لینا لا بد ہے یا جو ایسے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جو بہت عرصہ تک سربرآوردہ بنائیاں قوم بنیا کرتا رہا ہے گا۔ ان کے خیالات اولوالعزمہ ہوں ہیں وہ ہندی کے خواہاں ہیں ملت کا احساس رکھتے ہیں۔ معاشری خدمت کی اہمیت کو پہچانتے ہیں۔ ایمان کو پاکیزہ زندگی کا جزوِ عظیم سمجھتے ہیں اور منزل سے دور سی لیکن ترقی کی سمت انہیں باوجود اپنی پسماندگی کے ایسی ہی صاف دکھائی دے رہی ہے جیسے امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک کو۔

جب میں اس مجموعہ کو اس نظر سے دیکھتا ہوں تو اس کی قد بڑھ جاتی ہے اگر میری قوم فی الواقع مجموعی طور پر ان خیالات کی علم بردار ہے جو فرداً فرداً مشاہیر نے اپنے مضامین میں واضح کئے ہیں تو ہمارا مستقبل ایسا نہیں کہ ہم گھبرا جائیں آپ بھی اس کتاب کو اسی نظر سے پڑھئے۔ تو دلجمعی کا باعث ہوگی۔

(بشکر یہ مکتبہ فرنیکن)

چھپے چوری

ہاجرہ مسرور کی کتاب 'چھپے چوری' کا دیباچہ

جب بیسویں صدی پروان چڑھی اور ادیبوں کی فہرست میں کئی عورتوں کے نام چمکنے لگے تو بعض یورپین نقادوں کو جن میں خواتین بھی شامل تھیں اس سوال نے گدگدایا کہ کیا عورتوں کا ادب مردوں سے جدا ہوتا ہے؟

انسان ہمیشہ سے یہی پوچھنا چلا آیا ہے کہ عورت اور مرد میں کیا فرق ہے؟ جو فرق آنکھوں کو نظر آیا اس سے مطمئن نہ ہوا بلکہ اس سے تو الجھن اور بھی بڑھی کہ ظاہر کا یہ حال ہے تو باطن میں خدا جانے کتنے فاصلے ہوں گے۔

عورت مرد نہیں بن سکی۔ مرد عورت نہیں ہو سکا۔ آدمی دنیا آدمی دنیا سے اجنبی۔ اندھیرے میں ایک دوسرے کو چھوٹی اور ٹٹولتی چلی آئی ہے لیکن جب عورتیں بھی ادب کی دنیا میں مردوں کی ہمسایہ بن کر رہنے لگیں تو اندھیرا کچھ کم ہوا کیونکہ ادب سے بڑھ کر ادیب کی فطرت کا مجاز اور عمارت کوئی نہیں۔ یہ تو بچ جانے سے بھی زیادہ پردہ و دھبے پہلے پہل تو ادیب عورتوں نے مردوں کی نقل کی۔ گویا اپنے روپ میں سامنے نہ آئیں یا ادب کے کسی روایتی تہلک پر اوروں کے ساتھ ہو لیں۔ جہاں سب ہم سفروں کا مجلس ایک سا ہوتا ہے اور ایک سے دوسرا پہچانا نہیں جاتا لیکن صہب خود اعتمادی بڑھی اور سچی سچی باتیں کہنے لگیں تو مردوں سے الگ نظر آنے لگیں۔

ایک جدید انگریزی ناول کی بیرونی کہتی ہے "میں ایک عورت ہوں، میری زندگی کیلئے ہے ایک ایسی مضبوط سی رسی جو کئی شخصی اور ذاتی رشتوں کے دھاگوں سے بٹی ہوئی ہے۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں" عورتوں کے ادب کو خود سے دیکھئے تو یہ کلیتہً کچھ ایسا غلط معلوم نہیں ہوتا۔ ادیبوں کی فہرست میں کئی مرد آپ کو ایسے ملیں گے جن کی روح کائنات کے جنگل میں آسودگی ڈھونڈتی پھرتی ہے یا انسانی رشتوں کو توڑ کر مندرجہ گھوڑے کی طرح سب کچھ پھاند جانا چاہتی ہے لیکن عورتوں کی جذباتی دنیا شخصی اور ذاتی ماحول تک ہی محدود ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادیب عورتوں نے جو تباہ کن اور ناول میں حاصل کیا ہے۔ کسی اور صنف ادب میں نہیں کر سکیں۔ معلوم ہوتا ہے فطرت نسوانی شخصی اور ذاتی رشتوں کے جال ہی میں الجھتی رہتی ہے اور یہ جال سب سے زیادہ دلجمعی اور فراغت کے ساتھ ناول اور افسانے ہی میں بننا جاسکتا ہے۔

شخصی رشتوں کی دنیا محدود سی لیکن پایاب نہیں۔ اس کی گہرائیاں آفاق کی وسعتوں سے کم نہیں اس لئے یہ نہ سمجھئے کہ عورتوں کا ادب مردوں کے مقابلے میں ہمیشہ دبا دبا رہتا ہے یا فطرت نسوانی نے پنہائی اور وسعت کو اپنے اوپر حرام کر لیا ہو، محقق کو اپنے ادب پر حرام نہیں کر سکتی۔

خصوصیت یعنی شخصی رشتوں میں انہماک۔ آپ کو ہماری اکثر ادیب عورتوں میں ملے گی۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنی فطرت کو جھٹلاتی نہیں۔ بلکہ خلوص اور دیانتداری سے لکھتی ہے، سچ پوچھتے تو اس معاملے میں ان کا نامہ اعمال مردوں سے زیادہ روشن ہے۔ ہمارے ہاں ادیب عورتوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں۔ لیکن شخصی اور ذاتی رشتوں کی روئداد جس جرات اور بے ساختگی کے ساتھ انہوں نے پیش کی ہے اس سے ہمارے مردانہ ادب کو بھی ریاکاری کے گھونگٹ اٹھنے پڑے ہیں اور سب اردو ادب کو ان کی بدولت تازہ ہوا نصیب ہوئی ہے۔

ہاجرہ مسرور کا یہ مجموعہ تازہ ہوا کا ایک اور جھونکا ہے پہلے مجموعوں میں بھی انہوں نے اپنی نسوانی فطرت ہی کو نبھایا ہے۔ یہاں بھی وہ اپنی فطرت ہی کو نبھا رہی ہیں ان کی نظر پہلے سے کہیں زیادہ بلند اور گہری ہے لیکن شخصی اور ذاتی رشتوں کے جال وہ یہاں بھی بن رہی ہیں۔ انوکھے اور پڑا سر راجال۔

ان رشتوں کی دنیا بھی ایک حیرت انگیز دنیا ہے۔ ان میں انسان ایک دوسرے کے کو کھینچتے بھی ہیں اور دھکیلتے بھی ہیں اور یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک ہاتھ سے کھینچتے اور دوسرے سے دھکیلتے ہیں اور زندگی اس جال میں تنی تنی سی رہتی ہے۔ شوپن ہاؤر کا قول ہے کہ "انسانوں کی مثال ان خار پتوں کی سی ہے جنہیں سردی لگ رہی، ٹھٹھڑنے لگتے ہیں تو گرم ہونے کو ایک دوسرے کے قریب سرکاتے ہیں۔ کانٹے چھبے ہیں تو ایک دوسرے سے پرے ہٹ جاتے ہیں اور پھر ٹھٹھڑنے لگتے ہیں۔"

کیا آپ کو یہی نقشہ "آپ ہی کی دنیا کا ذکر ہے کہ...." میں نظر نہیں آتا؟ اس میں شوہر اور بیوی کے درمیان ایک تناؤ اور ایک قرب — ایک بے راہ اور ایک کشش ہے جسے ہاجرہ نے بہت نزاکت سے بیان کیا ہے۔ اس کہانی میں ہاجرہ چھوٹے چھوٹے بے وجہ جلاپوں کو اس بے تکلفی سے جمع کرتی چلی گئی ہیں کہ محوڑی دیر کے بعد منافرت کے اس رنگتے ہوئے سائے سے ڈر آنے لگتے ہیں جس قریب خوردگی کو وہ بیان کرنے چلی تھیں۔ وہ شاید کہانی کے آخر میں ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن کوئی پڑھنے والا اس کہانی کی اٹھان ہی کو دیکھ کر افسانہ نویس کے فن کا فائل بوبائے کہانی کا انجام خواہ کچھ ہی ہو تو ہاجرہ کو اس پر برہم نہ ہونا چاہیے جلد سے بھی قد دان ہی سمجھنا چاہیے۔

"کاروبار،" بھی ایک شوہر اور بیوی کی کہانی ہے یہاں بھی بیوی کے دل میں احتجاج اور نسیم، طے جیلے پائے جاتے ہیں اور اگر قریب خوردگی نہیں تو ایک بے بسی ضرور ہے۔ لیکن بیوی اسے ظاہر نہیں کر سکتی کیونکہ اسے ظاہر کرنا آتا بھی تو نہیں اس الجھاؤ کو میاں بیوی دونوں

میں سے کوئی بھی ٹھیک طرح نہیں سمجھ سکتا۔ شوہر کبھی چٹکیاں لے گا کبھی پوی کی خاموشی سے اکتا جائے گا۔ پوی کبھی مہنس دے گی۔ کبھی اس کے آنسو نکل آئیں گے اور ان دو ہم بستر جلیبوں کی عمر پوں ہی ایک دوسرے سے بے خبر گزرتی چلی جائے گی۔

”ایک بچی“ کو آپ محروم ماما کا افسانہ کہنا چاہیں تو نہ افسانہ کو اس سے انکار ہو گا نہ افسانہ نکار کو، لیکن یہاں بھی اس کے علاوہ تعلقات اور رشتوں اور ماحول کی کئی الجھنیں ہیں۔ جن کا حال نا بدہ (ہاجر سے پوچھے بغیر) ہمیں سناتی چلی جاتی ہے:

”بھٹے جلنے کیوں دبی دبی کیفیتوں سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ گلی کے اس مکان میں یہ کمرے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ میں بھی کہا بیوں والی شہزادی ہوں جسے اس کے باپ نے ناراض ہو کر جنگل کے قلعے میں قید کر دیا تھا۔ میرے اندر ہی اندر کوئی الجھ کر ٹھکنے لگا۔ بی بی۔ جوان جوان بہنیں اور بوڑھی ماں۔ جی میں آیا کہ سب کے پننگ گھسیٹ گھسیٹ کر گڈا کر دوں۔ گلی میں جیسے کوئی نشیہ میں ہکتا ہوا گزرا، مست اور بے پروا، اور مجھے ایک دم احساس ہوا کہ میری باہنیں بھی تھک گئی ہیں، پانی بھرتے بھرتے نہیں۔ سینے پر بے کار پٹے پٹنے، پہلو میں بے قدری سے رکھے رکھے اور سر پر ہالہ بناتے بناتے“

ایسے جال ہاجرہ بہت ہی پھرتی اور بے تکلفی سے بٹ لیتی ہیں تار تار کر کے دیکھنے تو معلوم ہوتا ہے، کتنی گتیاں تھیں اس جال میں نہ معلوم ہاجرہ نے بیٹے سے پہلے انہیں اپنے دماغ میں کیوں کر سلجھایا ہو گا۔ اور دھاگوں کے سب بیج کیوں کر یاد رہے ہوں گے۔ اس سینے کی ملی قدر کوئی مشاق افسانہ نگار ہی کر سکتا ہے وہی آپ کو بتائے گا کہ یہ کام کتنا مشکل ہے اور ہاجرہ نے اپنے تخلیقی جذبے کی بدولت اسے اپنے لئے کتنا سہل بنا لیا ہے۔

اس مجموعے میں کم از کم دو کہانیاں — ”سرگوشیاں“ اور ”لا علاج“ — ایسی ہیں کہ ہمارے جدید ادب کو ان پر فخر کرنا چاہیے۔ دونوں کا اسلوب ایک دوسرے سے جدا ہے۔

”سرگوشیاں“ ایک کردار کی مسلسل تقریر ہے جو اپنی تیز رو میں ماضی کی باتیں بہا بہا کرہ ہمارے سامنے لاتی چلی جاتی ہے۔ بخالکی سی تیز گفتاری نے کہانی میں ایک بے پناہ قوت، شدت اور حرارت پیدا کر دی ہے۔ جو ہر ہیرا گراف کے ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ کہانی کا خطیبانہ انداز شروع شروع میں کھلتا ہے۔ جیسے کوئی ”شیر آ یا شیر آ یا دوڑنا“ پکار کر ہمیں ڈر لانے کی کوشش کر رہا ہو لیکن جب کہتا کی گزشتہ زندگی کے اوراق ایک ایک کر کے اٹھنے لگتے ہیں۔ تو گہرائیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں اور رقت بسا اوقات دہشت کے کنارے تک جا پہنچتی ہے۔ یہ خطابت کا انداز خطرات سے بڑھتا ہے لیکن آہیں کہ باجرہ نے باوجود ڈرامائی طعنا کے کہانی میں کہیں بھی کھوٹ نہیں آنے دی۔ لا علاج میں ایک دادی ہے ایک پوتی۔ دونوں میں سے جسے چاہیں آپ کہانی کا محور سمجھ لیں۔ بعض قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ باجرہ نے یہ کہانی پوتی کو سامنے بٹھا کر لکھی ہے لیکن مجھے تو پوتی بھی دادی ہی کی طویل الجھی ہوئی زندگی میں ایک الجھن معلوم ہوتی ہے۔ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کے بھرے ہوئے زندگی کے ٹکڑوں کو باجرہ نے ایک مختصر افسانے کی حدود کے اندر اس خوبی اور حسن انتخاب سے سمیٹا ہے کہ اس کی مثال اردو میں مشکل ملے گی۔ اگر اردو میں کوئی کہانی اپنی تکمیل، اصیبت اور حساسی کے اعتبار سے اس سے کو پہنچتی ہے تو وہ کم از کم میری نظر سے اب تک نہیں گزری۔ اس افسانے میں بڑھیا کریمین کی بجائیں بجائیں کرتی تنہائی کو دیکھ کر مجھے ایک اور ناول نگار عورت کا ایک کردار یاد آیا جو کریمین ہی کی طرح عمر بھر انسانی رشتوں کا محتاج رہا اور یہی رشتے ایک ایک کر کے اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چلے گئے۔

”اس کی روح ایسی ویران اور جاڑھی تھی کہ اس ویرانی کے مقابلے میں پرونی ماحول کی کوئی حقیقت ہی معلوم نہ ہوتی تھی۔ تنہائی نے دل میں اپنے پنجے گاڑ دیئے اور ایسے معلوم ہوا جیسے سن و سال کی ایک منہ زور زندگی ہے کہ یہ چلے جاتی ہے اور یہ اس کی سطح پر جڑ سے اکھڑے ہوئے درخت

کی مانند مخلوق کریں کھا رہی ہے۔ جڑ اکھر چکی اور زندگی کو نہ جانے کس وقت کوئی پھونک مار کر بھاد سے کٹنے کو زندہ ہے، لیکن ایک طوفانی سطح پر بے اختیار بے چلی جاتی ہے اس پاس کوئی ایسی چیز نہیں جسے کمزور انگلیاں پکڑ سکیں۔ پیشتر اس کے کہ منہ پھاٹتی ہوئی ہر اسے نگل جائیں.....“

ہاجرہ ہمارے کئی افسانہ نگاروں سے زیادہ حساس اور نازک ہیں ان کی نظر دور تک پہنچتی ہے اور ان کے افسانوں میں اکثر گہرائیاں ایسی آجاتی ہیں جو اور افسانہ نگاروں میں نہیں ملتیں۔ ان کی یہ اجابھی حساسی سے خالی نہیں کہ ان کے کم از کم تین افسانے مال سے ماضی کی طرف چلتے ہیں۔ جب کوئی انسانی الجھاؤ انہیں اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ تو ان کا ذہن ٹوٹنا شروع ہوا۔ یہ تجسس حساسی کی ہی ایک انوٹ کا نام ہے۔ یہی انہیں ماضی کی طرف لے جاتا ہے کیونکہ الجھے ہوئے دھاگوں کے سر سے تو اکثر ماضی ہی میں ملتے ہیں ذاتی رشتوں میں جنس کا رشتہ سب سے زیادہ پچھا رہتا ہے۔ جنس کا پیرا ایک ایسا پیر ہے۔ جس میں لاکھوں قسم کے کڑوے، میٹھے، کٹھے پھل لگتے ہیں اور کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ جو سے بوئے گا وہ کیا کالے گا۔ اس کی جڑیں دل اور دماغ اور اعصاب اور گوشت میں نہ معلوم کہاں کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ جس نے جہاں تک چیر کر دیکھا۔ نئی سے نئی جڑ نظر آئی۔ ہاجرہ کے کڑاروں کا جنسی شعور جسمانی مظاہرے سے بہت آگے نکل جاتا ہے۔ اور ہاجرہ کے احساس میں سچی نزاکتیں اور پچیدگیاں ہیں۔ جن کی وجہ سے ان کے جنسی افسانے اوروں سے زیادہ دقیق اور عمیق معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے جنسی تعلقات میں تنوع اوروں سے زیادہ ہے اور ان تعلقات کی رنگیتیں بھی زیادہ لطیف اور نگاہ فریب ہیں۔

ہماری عورتیں اپنی خلوت شعاری کی وجہ سے روایتی اور مصنوعی "ادبی" زبان سے بہت حد تک مامون رہی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے جب لکھنا شروع کیا تو جیتے جاگتے الفاظ

کے سوا ان کے قلم سے کچھ نہ نکلا۔ ہاجرہ کی زبان بھی جیتی جاگتی زبان ہے جو سیدھی مطلب کی طرف لپکتی ہے، سترہ سترہ آکر اپنی طرف دیکھتی نہیں رہتی اور اس المٹرن کی وجہ سے بے تکان وہ باتیں کہہ جاتی ہے جو مصنوعی ادبی زبان کے مٹیا نہ گلے میں اکھ کر رہ جاتیں یا بڑے تکلف سے ادا ہوتیں۔

لیکن الفاظ کا ذخیرہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو کہنے کی باتیں بہر حال ان گنت ہوتی ہیں۔ اور لفظ اکثر بار بار کر بیٹھ جاتے ہیں اسی لئے ادبوں کو بار بار استعاروں اور تشبیہوں سے کام لینا پڑتا ہے اور بالخصوص ان کی طرف نگاہی کا پتہ ان کی تشبیہوں ہی سے ملتا ہے کہتے تو ہاجرہ کی تشبیہوں پر ایک نظر ڈالیں،

”کوئی ساتھ رونے والا ہو تو اپنے آنسو گالوں پر چنگاری بن کر نہیں لڑھکتے“
 ”لگاوٹ بھی کہیں پھپتی ہے؟ جامن چاہے کہیں بھی چھپا کر کھائی جائے۔
 کم سخت منہ کی اود داہٹ چغلی کھا دیتی ہے“
 ”آپا کی آنکھیں کیا تھیں۔ بس ڈگڈگی تھیں کہ سب بندر کی طرح اس کے
 گدنا چتے۔“

”سبھی نقطے مطلب کے نہیں ہوتے۔ قلم رو سستانی میں ڈبو کر لکھنے لکھو
 اور سخنہ نب پر زور دے کر کھینچو تو پوہتی کتفہ ہی بے معنی نقطے کا فذ
 پر پھیل جاتے ہیں۔“

”محبت مکرہ می کا ایک ایسا جال ہے جو اگر کونوں کھدوں میں گھتے پر جسم سے
 لپٹ جائے تو چھٹانے کے باوجود کہیں نہ کہیں ذرا بہت چپکا ہی رہ
 جاتا ہے۔“

”تم کہنا چاہتی تھی کہ تمہیں جو کچھ دیا گیا ہے یہ تو صرف اتنا ہے پیسے کسی کو
 تحفہ میں بغیر دستے کی کنار پکڑا دی جاتے۔“

” تو ایسی ٹھنڈی نظر آرہی ہو جیسے کسی ننگالی قحط زدہ کا چولہا۔“
 اس کے احسات پر جیسے سڑا ہوا آم بچر رہا تھا۔ گھناؤنا اور کڑوا سا ٹپ ٹپ
 گدھا تھا۔ وہ کوئی بڑا زہریلا جواب دینا چاہتی تھی۔ لیکن اس کے ذہن کے
 سیال زہر کا کھولاؤ ہر ڈھلتے ہوئے فنڈوں کو بھنور میں پڑی ہوئی سیپ
 کی طرح نچا ڈالتا...“

” یہ کتنے مزے کی بات ہے کہ جن لوگوں کے لئے فساد ہوتے ہیں۔ وہی چند
 روز بعد ایسی فنول ہو جاتی ہیں جیسے نالا ضلگی کا چھلکا...“
 کتنی مشکل سے تو انہیں بات کرنے کا ایک موضوع ملا تھا۔ لیکن انہوں نے
 ایک دوسرے پر تیزاب پھینکنے کی کوشش میں اسے بھی ختم کر دیا...“
 ” مگر وہ دونوں اس سے محفوظ ہونے کا خیال نہیں کر سکتے تھے۔ جیسے دونوں
 کی زندگی میں سوائے نیم کے کچھ پھولتا ہی نہ ہو...“

” وہ اس کی نظر سے دور ہوتے ہی اپنی ہستی کو ایسے بے بس اور دردناک محسوس
 کرنے لگی۔ جیسے بیٹھ بیاکھ میں ریت کے پہلوؤں میں دبی ہوئی گنگا...“
 ” شادی کے بعد ایک سال ایسا گزرا جیسے کوئی نھی چڑیا چمکتے چمکتے ایک
 درخت سے دوسرے پر جا بیٹھے۔“

” جتنی لمبی عمر ہو اتنی ہی لمبی الجھنیں۔ سوئی میں لمبا تاگھا ڈال کر سینے بیٹھو تو بار
 بار گتھیاں پڑ جاتی ہیں...“

مانا پڑے گا کہ ہجرہ کی تشبیہیں بیشتر انوکھی اور جلیبے یا خیال کے ساتھ ہی تکلف
 ان کے ذہن میں چلی آتی ہیں۔ جس ادیب کو اپنی سوچی ہوئی، اپنی دیکھی ہوئی، اپنی بیٹی ہوئی
 بات کہنی ہو اس کا کام گھڑی گھڑائی تشبیہوں سے کیوں کہ چل سکتا ہے اور جو گھڑی گھڑائی
 تشبیہیں استعمال کرتے ہیں اپنے دل کی بات کیونکہ کہ پاتے ہوں گے۔

اس مجموعے میں ایک آدھ مضمون ایسا بھی ہے جسے شاید افسانہ نہ کہہ سکیں۔ میرا بس چلتا تو اس کی جگہ بھی باجرہ کو افسانہ ہی لکھنے پر مجبور کرنا لیکن مجھے یقین ہے کہ ایسے چیز کی ضرورت آئندہ کبھی پیش نہ آئے گی ان کی طبیعت کا اصلی جوہر جو ان کے تین مجموعوں میں چمکا ہے، انہیں خود افسانہ لکھنے پر مجبور کرے گا اور انہیں افسانہ لکھے بغیر چلین نہ آئے گا۔
جب تک ان کا چوتھا مجموعہ نہ چھپے، ہمیں بھی چلین نہ آئے گا۔

”پطرس“

چمپا اور دوسکرافسانے

دیباچہ

(مولانا حمید المجد خاں) سالک (ٹالوی) کے ہاتھ آج ہتھکڑی میں بند ہیں اور صفحہ قرطاس اس کی سحر نگاری سے محروم۔ لیکن چہرہ فطرت کے جو خال اس کی قلمطرازی کے ممنون احسان ہیں وہ ہمیشہ چٹم امتیاز کی پٹی بنے رہیں گے۔

یہ انتخاب بہت عجلت سے مرتب کیا گیا ہے کہ جب تک زندان کی چار دیواری سالک کو اہل نظر سے پوشیدہ رکھے۔ سالک کے شیدا ائی اس کے روشن دل کی صنیا پاشی سے محروم نہ رہیں۔ اگر وہ "گننام" گمنامی کا شیدا۔ وہ عزت نشین محشر۔ وہ ابجمن خلوت، اس وقت حراست و بند سے آنا دہوتا۔ تو یقین نہیں کہ وہ اپنی "گننامی" کے نقاب کو یوں چاک چاک دیکھنا گوارا کر سکتا۔ کیونکہ اس کی نقادانہ نظر اور نگاہ انتخاب کج بین اور ککتہ چلیں ثابت ہوتی۔ ایک وقت اور صرف ایک وقت۔ جب وہ اپنی بیش بہا تصنیفات کو کھول کر اپنے سامنے میز پر رکھ لیتا۔

وہ شخص جو ادب لطیف کے خیاباں سے منہ موڑ کر صحافت کی سنگلاخ زمین اور سیاسیات کے خارزار میں گامزن ہوا۔ جذبہ وفا کو ہمیشہ اپنے سینے میں لئے پھرا۔ گلزار و گل گشت میں ہی رنگ و بو تھا۔ بادیہ دشت میں آج بھی اس کی آبلہ پائی ہے اس سے اہل مذاق برسوں مٹاؤں ہوتے رہے اور اس سے اہل درد آج اشک نریز و غمزدہ ہیں۔

چھوڑ دیا۔ جہاں مرد صرف مردانہ عورت صرف عورت ہوتی ہے جہاں کے طوفان سخت بلا خیز ہیں اور دوسرے سخت خوشخوار۔

لیکن سالک کا دل حیات کی نزاکتوں اور جذبات کی لطافتوں سے نا آشنا نہیں۔ اس کے سینے میں بے شمار کچے کچے درد اور ٹکی ٹکی ٹیسیں اعلیٰ ہیں۔ مگر غضب یہ ہے کہ وہ آفات و مصائب کو دیرانہ برداشت کرنے والا جو امر داس شعریت کو اپنی فطرت کی کمزوری سمجھتا ہے "ہلال عید"، جو اس کے قلم کی بے ساختگی اور بے تکلفی اور اس کی طبیعت کی نازکی کا بہترین نمونہ ہے۔ ایک سرگوشی ہے جو کبھی بلند آہنگ نہیں ہوتی۔

میں یہ کہہ دیتا کہ سالک بارہا ایک لفظ سے وہ کام لیتا ہے جس کے سر انجام دینے میں ہندوستان کے اکثر انشا پر دانوں کے بیسے بیسے فقرے ناکام رہے ہیں۔ الفاظ میں وہ موسیقی اور شیرینی بھر دیتا ہے جو صورت کو معنی سے زیادہ دلاویز بنا دیتی ہے لیکن مجھے اس کے لئے سالک کی "پھر"، کا ذکر کرنا پڑے گا اور وہ اس ادیب سحر پرداز اس شاعر شیریں مقال، اس آئینہ دار نیگود کے ذوق سخن کا ایک دوسرا پہلو ہے۔

میری یہ نہ بیان تحریری سالک کی کافر ماجرائی کے ہر کاہ ہے۔ اس لئے میں غسوس کرتا ہوں کہ حیات ابدی، کادامین میرے ہمتوں میں ہے مجھے اس کی کبھی جرات نہ ہوتی اگر مجھے یہ غزماصل نہ ہوتا کہ میرے نیازِ مخلصانہ نے قسم جو صلا افزا کو اکثر سالک کے لبوں پر کھلتے ہوئے دیکھا ہے۔

آج وہ حراست میں ہے اور شاید اب بھی مسکرا رہا ہے نیاز مند آنکھیں پھر اس مسکراہٹ کو دیکھیں۔

جھوٹے

صوفی غلام مصطفیٰ آیتسم کی کتاب کلاباچہ

ایسی ہلکی پھلکی کتاب پر جو چھوٹے بچوں کے لئے لکھی گئی ہے دیا چہ کا بوجھ نہ پڑنا چاہیے تھا۔ لیکن بچوں کے ساتھ قدرت نے والدین کی اور انسان نے استاد کی بیخ بھی رگڑ رکھی ہے۔ صوفی تبسم کو جو مصنف کتاب ہونے کے علاوہ "والدین" بھی ہیں اور "استاد" بھی، یہ گواہا نہ ہوا کہ بچوں کو تو بہلا جائے اور والدین اور استادوں کی پروا نہ کی جائے اس لئے قرار پایا کہ وہ بچوں کو نظیہ سنائیں اور میں والدین وغیرہ کو باتوں میں لٹکائے رکھوں۔

بچوں کا بہلانا سہل ہے۔ بڑوں کا بہلانا سہل نہیں۔ بچوں نے تو یہ پڑھا کہ "چھچھو چھچھو چلپا گھڑی پہ چوہا ناچا" اور خوش ہوئے۔ بڑے کہیں گے: "چھچھو ہم نے تو کسی لغت میں دیکھا نہیں۔ اور اگر چلپے سے مراد چلپے ہے تو یہ تالیف لوگوں کی زبان نہیں اور یہ جو گھڑی پہ چوہا ناچا تو آذکیوں؟ اور بہر حال اس تک ہندی کا نتیجہ کیا؟ اس سے بچوں کو کون سا سبق حاصل ہوا؟

یہ سب سوال نہایت ہی ذمہ دارانہ سوال ہیں۔ بالفاظ دیگر ان لوگوں کے سوال ہیں جو اپنا بچپن بھلا بیٹھے ہیں۔ یا جو یہ تہیہ کئے بیٹھے ہیں کہ جن باتوں سے ان کا بچپن رنگین ہوا تھا۔ وہ اس دنیا میں اب نہ دہرائی جائیں گی۔ تک بندی ملانا بے فائدہ بات ہے بوجھوں ماننا چاہیے۔ خدا کا شکر ہے، صوفی تبسم کو ایک ایسی دانائی عطا ہوئی ہے کہ نادانی کی لذت سے ابھی محروم نہیں ہوئے وہ جانتے ہیں کہ بچوں کا ذہن وہ عجیب و غریب دنیا ہے جن میں بڑوں

پر ناگ ناچتے ہیں اور طبقات سے رکھاتی ہیں اور بڑے بڑے، چمچمچم ٹم ٹم میں آہنگ ادا لے کی وہ تمام لذتیں سما جاتی ہیں جو بڑے ہو کر تان سین کی کراہت سے بھی حاصل نہیں ہوتیں یہ وہ دنیا ہے۔ جس میں گڑیاں اور بالور اور پرندے اور انسان سب ایک دوسرے کے دوست ہیں اور ایک دوسرے کے ڈکھ لکھ میں شریک ہوتے ہیں۔ گویا سب مخلوق ایک ہی خدا کی مخلوق ہوتی ہے بڑے ہو کر ذہن انسانی ہزار فلسفہ کش کش اور خیال آفرینی کے بعد بھی مشکل سے اس سطح پر پہنچتا ہے۔

اس لئے قابل رشک ہیں صوفی تبسم کہ بلا تکلف اس رنگین دنیا میں چھمار ہے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ صوفی تبسم ایک خوش ذوق سخن سنج اور سخن گو ہیں۔ اور فارسی غزل استادانہ کہتے ہیں۔ اور جذبے ادا کی باریکیوں کو خوب سمجھتے ہیں یہ مجموعہ ان کی شاعری میں اتوار کا دن ہے اور بول اتوار منانے میں انہوں نے بڑے بڑے اساتذہ تتبع کیا ہے لیکن یہ نہ سمجھتے کہ اس دن وہ بالکل ہی خالی الذہن ہو کر بیٹھتے ہیں اور جو منہ میں آئے کہ ٹالتے ہیں۔ خود سے دیکھتے تو معلوم ہو گا کہ یہ تمام قافیے اور وزن اور آہنگ اور الفاظ کی تراکوتوں پر قاعدہ ہوئے بغیر ممکن نہ تھا۔ اس لئے صوفی تبسم کی بختہ کاری اور طباعی کے شواہد اس میں جا بجا آپ کو نظر آئیں گے۔ ایسے کلام کا درجہ ہمل ممتنع کا درجہ ہے۔ جیسے ہمل ممتنع ہل نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہمل ممتنع بھی ہمل نہیں ہوتا۔ دعا ہے کہ صوفی تبسم کا یہ بچپن ہمیشہ قائم رہے اور ان کے قدر دان ہمیشہ انہیں یہ کہنے کے قابل ہوں کہ

چہل سال عمر عزیزت گذشت
مزاج تو از حال مغلّی نہ گشت

” پطرس “

دہلی ۵ جون ۱۹۴۶ء

ایران میں اجنبی

ن - م - راشد کی نظموں کے دوسرے مجموعہ کی تمہید

راشد صاحب! یہ مجموعہ جب پھپ جلتے گا تو آپ ایک نسخہ مجھے مفت بھیجیں گے بلکہ اس پر میرا نام بھی اپنے قلم سے لکھ دیں گے اور میں فخر سے لوگوں کو دکھاتا پھروں گا اور اسے بلاوجہ اپنا ہی کمال سمجھوں گا۔ کہ میرا ایک شاگرد والدو کے دورِ حاضر کا بہت بڑا شاعر ہوا اور میری اس کمزوری پر کہ خواہ مخواہ آپ کی شاعری پر اپنا حق جتا رہا ہوں، نہیں گئے بھی والد سے صنف المدین سمجھ کر معاف بھی کر دیں گے لیکن یہ تو آپ نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا کہ قبل از وقت اس کتاب کے پروف مجھے پڑھنے کو دیئے آپ کو معلوم ہے کہ میں انہیں کس شوق کے ساتھ پڑھتا ہوں۔ این کی ملامت گہشتوں میں اٹھائے اٹھائے پھرا ہوں کہ عہ کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو پھپائے نہ بنے

اور ان کو بیچ میں لاکر ذریعہ ادقات میں آپ سے کیسی مزے مزے کی بھتیں پو۔ این کے کینے پڑا میں ہوئی ہیں اور ہم آپ نے آپ کی شاعری کو سمجھانے بگھنے کے بہانے سے اردو سے کتنی عشق بازی کی ہے۔ اجازت ہو تو آپ کے نام ایک مکتوب بھی اس عاشقی میں لکھ ڈالوں اور آپ سے مجھے جو نصیحت ہے اس کا عیب پوش رنگین پردہ اپنی بیسے سووندقادی پر ڈال لوں تاکہ کوئی بات میرے پاس کہنے کے قابل نہ ہو اسے لوگ سننے کے قابل مزوہ سمجھیں۔

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو

ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

راشد صاحب! وہ دن آپ کو یاد ہے جب آپ کی نظم اتفاقات، شائع ہوئی تھی۔
اور میں آپ کے گھر پر قلعہ گوجر سنگھ میں والہانہ آپ کو مبارک باد دینے آیا تھا۔ ان دنوں ابھی
جدید شعرا پر لعن طعن برابر چل رہی تھی امدان کی تاقیہ آزادی اور عرض کی بے راہ روی پر
چھتیاں کسی جاتی تھیں۔ لیکن آج یہ کیفیت ہے کہ لوگ پرانی وضع کی شاعری سے اکتاتے جا
سے ہیں۔ حتیٰ کہ مزل بھی جب تک نئے شباب، نئی نظر ادب سے اسلوب کی حامل نہ ہو ہزم میں
توقیر نہیں پاتی۔

اس انقلاب میں کئی قوتوں کا ہاتھ ہے جسے مورخ اپنے مقام پر بیان کرے گا۔ لیکن جن
لوگوں کو آپ کے ہم عصر ہونے کا فخر حاصل ہے وہ جانتے ہیں کہ دورِ جدید کے اکثر شعرا نے
آپ اور فیض امدان ہی جیسے معدودے چند باغیوں سے ہدایت پائی ہے۔ ورنہ نہ معلوم
ہماری شاعری کی کشتی اور کتنا عرصہ دلدل میں پھنسی رہتی۔ جیسا کہ آپ نے اپنے دیباچے
میں لکھا ہے آپ لوگوں کی تربیت میں نئے نئے علوم کو دخل تھا۔ جس سے متقدمین بے بہرہ
تھے اور اس سے برہمہ کر یہ کہ دورِ جدید کے ذہنی اور معاشرتی طوفانوں اور زلزلوں کی بدولت
آپ کو ایک نئی بنیاد نصیب ہوئی اور آپ لوگوں نے وہ افق دیکھے جو اس سے قبل نفروں
سے اوجھل تھے۔ تاہم تمہارا آپ کی شاعری ایک نیا انداز فکر اور نئی زبان بلکہ نیا لہجہ (بول
آپ کے نئی ہیئت) اپنے ساتھ نہ لاتی۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کی طفیل کتنے نوجوان شاعروں
کی ہمت بڑھی بلکہ راشد کے اسلوب بیان میں تو کچھ ایسا نشہ ہے کہ ان کے بعض متقدمین کچھ
زیادہ بھیڑی گئے۔ یہ جاہلیت بلکہ جاہلیت میں بھی ہے لیکن فیض کی کئی ادا میں فضائے نظم
میں سمول کر جاتی ہیں۔ ہر پتے اور ہر سمول میں نظر نہیں آتیں۔ اس کے مقابلے میں آپ کا چرنا چولان
شاعر کو بہت جلد پر جاتا ہے اس سے ثابت ثابت نہیں ہوتا کہ ہزم میں شمع پہلے کس کے سامنے

رکھی جلتے۔ اس قسم کا سابقہ ہی مقصود تھا۔ اس سے تو غصہ یہ واضح کرنا تھا کہ آپ سے جدید شعراء جو اثر پذیر ہوئے تو ان کے اودا آپ کے تعریف نظر کے مابین کیا علاقہ تھا۔

ایران میں اجنبی کا عنوان ایک دلچسپ فریب ہے جس کے آپ خود بھی شکار ہوئے ہیں۔ عنوان کے تحت میں جو تیرہ قطعے آپ نے یکجا کر دیئے ہیں۔ ان میں اس جذبے کا مہرغ کہیں نہیں ملتا جسے عربیہ لکھنوی نے ایک مطلع میں یوں بیان کیا ہے کہ

دیکھ کہ ہر درو دیوار کا حیراں ہونا

وہ مل پہلے پہل داخل زنداں ہونا

(داخل ایران ہونا؟) ہر چند کہ ایران آپ کا جغرافیائی وطن نہیں اور تہران اور لاہور کا فرق و بعد ظاہر ہے تاہم جس ذہنی اور جذباتی دنیا میں آپ کی شاعری باغ لگاتی ہے اودا ایران سے دور نہیں بلکہ وہ تو ہندوستان سے دور تر ہوگی۔ سعدی اودا حافظ اودا خیام اودا رومی اور نظیری کی دنیا میں آپ اجنبی کیوں کہہ جوتے؟ ایران تو ہمارے شعراء کا رضاعی وطن ہے۔ ہندوستان میں جو پردیسوں کی سی اداسی ذہن پر چھائی رہتی ہے وہ اسے ایران (اودا عربستان) کی ذہنی یا جسمانی سیاحت سے دور کرتے تھے۔ آپ کے قطعات اس بات کے گواہ ہیں کہ آپ کو ایران میں بیگانگی کا نہیں بلکہ ایک نئی یگانگت کا احساس ہوا۔

”من وسلوئے“ میں تو آپ ایران سے مد پر وہ یہی کہہ رہے ہیں کہ میں اجنبی نظر آتا ہوں اجنبی ہوں نہیں کہ

بس ایک ہی عنکبوت کا جال ہے کہ جس میں

ہم ایشیائی امیر ہو کر تڑپ رہے ہیں

اور پھر زبان بھی آپ کے رضاعی بھائی کی زبان ہے اجنبی کی نہیں۔

خدا نے برتر

یہ دارپوش بزدگ کی سوز میں

یہ نوشیروان عادل کی داد گاہیں
تغوت و حکمت و ادب کے نگار خانے

آپ کے قلم نے تو آپ کے لئے ایران میں اجنبی کا لقب انتخاب کیا لیکن آپ کا دل بکار پکار
کر یہی کہہ رہا ہے کہ میں ایک بھی ہوں اور "بلن عم" سے ملنے آیا ہوں۔
یہ ایک عجیب واقعہ ہے کہ جب آپ انگریزوں کی وردی پہن کر ایران پہنچے تو مہول نے
کچھ اس طرح آپ کا نام من کھینچا اور ماضی کی یادوں نے آپ کے دل پر کچھ ایسی دستک
دی کہ آپ ہندوستان اور انگریزوں کو بھول گئے اور آپ کے "سیاہ قام" جسم میں ایشیائی
روح بیدار ہوئی۔ وہ احساسِ مظلومیت جس سے کم ہی کوئی ہندی نا آشنا تھا اس میں ایک
نئی کسک پیدا ہوئی اور وہ غیر کے بے پناہ بچرے ہوئے ستم نے ایک نئے انداز سے آپ
کو بھرا دیا۔ ایشیائیوں کو آپ نے دیکھا کہ

قدیم خواجہ سلوؤں کی اک نژادِ کاہل ہیں
اولادِ اپنی اہل کی راہوں پر تیز گامی سے جا رہے ہیں

تو آپ بے قرار ہو کر لٹک رہے —

ان اُونچے دوشندہ شہروں کی

کوئی فصیلوں کو مضبوط کر لو!

ہر اک برج و بارو پر اپنے نگہبان چڑھا دو!

گھروں میں ہوا کے سوا

سب صداؤں کی شمعیں بجھا دو!

کہ باہر فصیلوں کے نیچے

کئی دن سے ہزن ہیں خیمہ نگیں

ایسے چونکلا دینے والے اشعار آپ کے مجموعہ میں کتنی جگہ ملتے ہیں۔ ہمارے ہاں وطنی

شاعر بھی ہوتے ہیں اور قومی شاعر بھی، اخلاقی بھی، اور اشتراکی بھی لیکن جہاں تک میری نگاہ پہنچتی ہے ایشیائی شاعر آپس کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔

کیا یہ احساس ایک قسم کا سیاسی احساس ہے؟ کیا یہ کہنا کافی ہے کہ اس دور میں مانند نے سیاسیات کا رُخ کیا؟ کیا آپ کی اس نوع کی نظمیں سیاسی کہلائیں گی ہیں سمجھتا ہوں کہ ایسا تسمیہ تو اہل مکتب کے سوا کسی کو پسند نہ آئے گا۔ آپ کا شمار سیاسی شاعروں میں کرنا کورڈوٹی معلوم ہوتی ہے کسی نازک مزاج کی اس سے تشبیہ ہرگز نہ ہوگی۔ کیونکہ اکثر مقام ایسے ہیں جہاں ہر خید کہ آپ سیاست کے نزدیک پر کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن آپ کی نظر اور بلند یوں پر پڑ ہی ہے اور روح کی بعض گہرائیاں آپ کو ایسی نظر آتی ہیں۔ جو محض سیاسیات کی تہ سے عمیق تر ہیں۔ مثال کے طور پر ”کیا گھر“ کو سمجھتے جو بظاہر ایرانی سیاست کے ایک دور کا مرقع ہے۔ شروع شروع میں تو اس نظم کا منظر واضح اور سطحی معلوم ہوتا ہے لیکن پارہ یہ پارہ نظم کی حرارت بڑھتی جاتی ہے۔ بات امریت اور آمر سے شروع ہوتی تھی لیکن ذیل کے اشعار ایسی خود بینی کا المیہ ہیں جو اپنی سزا اپنے ساتھ لاتی ہے اور جس کی گرفت جنوں کی سی گرفت ہے۔

گروہ تیری مد سے گزری ہوئی رازداری

کہ جس نے تجھے

اپنے افکار کے قید خانے میں

محصور سا کر دیا تھا

وہ زنداں جہاں گھوم پھر کرنگا ہیں

فقط اپنا چہرہ دکھائی نہیں مجھ کو

جہاں ہر عقیدے کو تو

اپنے المام کے نشیستہ کور میں دیکھتا ہے۔

جہاں ایک چھوٹا سا وزن بھی ایسا تھا
 جس میں ملت کے افکار کی انکھ کھرن کا گزر ہو
 اسی کا نتیجہ کہ اک روز
 کہنے کو باتیں بہت تھیں
 مگر سننے والے کہیں بھی نہ تھے
 اور تھے بھی لوگ جو گئے تھے

اس نظم کو سیاسی کہہ کے ٹال دینا محض کسل مذاق ہے یہ تو ایک مرثیہ ہے جو آپ نے
 خود پسند انسانوں پر لکھا ہے جو خود ہی اپنے زندانی ہو جاتے ہیں۔ اس ہوں کا نقشہ جو
 انتہائی نخوت کی انتہائی سزا ہے۔

آپ کے نیا زہند پہلے بھی اس بات سے بے خبر نہ تھے اور اب تو اس مجموعے نے دوبارہ اس
 کی تصدیق کر دی کہ آپ کا مزاج شاعری بہت حد تک شوکت و شدت سے رنگ پکڑتا ہے
 ایک کو الفاظ پر غول سمجھے دوسری کو جذبات پر۔ گو لفظ و جذبات کی یہ تیسرے محض بغرض سہولت
 ہے اس پر بہت بوجھ ڈالنا چاہیے پہلے شوکت کو لیجئے۔ ان اساتذہ کو چھوڑ کر جو ٹھٹھ زبان
 کے ماہر بھی تھے اور شعر میں اس سے گریز بھی نہ کرتے تھے (جیسا فسوس کہ بعض اوقات
 اس کو شاعری کے لئے کافی سمجھتے تھے) ہمارے بیشتر شعراء خصوصاً پنجاب کے اردو شعراء
 کے ہاں سلین اور گھریو الفاظ ملتے ہیں۔ وہ شعر کہتے نہیں سجاتے ہیں اور اس مقصد کے
 لئے اکثر اپنے لغت کو ایران اور عربستان کا جبرہ دوستانہ پہنا دیتے ہیں۔ سرنگوں بات بھی
 ہو تو اسے "سرنگوں" کہہ کر اس میں کروفر پیدا کر لیتے ہیں۔ سالہا سال میں یہ شعر جھوم
 جھوم کے پڑھتا رہا ہے

کبھی قبلہ رو جو کھڑا ہوا تو حرم سے آنے لگی صرا
 رتا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

مگر ڈھونڈنا رہا کہ اس میں عجز و ندامت کہاں ہے رفتہ رفتہ احساس ہوا کہ عجز جتنا بھی تھا اس سے لغت کا طنز کہیں بڑھ کر ہے الفاظ ایسے دل کش ہیں کہ معنی تک نہیں پہنچنے دیتے۔ ہمارے جدید شعراء اس بارے میں اکثر قدامت پسند ہیں۔ لغت میں کوئی جدت دکھاتے بھی ہیں تو بس اتنی کہ ولایتِ ایران سے چند اور الفاظ بطور سوغات کے لے آتے ہیں یا اگلے سال کے فارسی الفاظ کو نئی ترکیب سے شعر میں جڑ دیتے ہیں۔ الفاظ کے بارے میں وہ ابھی تک ذات پات کے قائل ہیں کہ جو شور ہو وہ کبھی برہمن کی برابری نہیں کر سکتا اور جس لفظ کی قسمت میں نثر کی خدمت لکھا ہے اس کی رسائی آستانِ شعر تک کبھی نہ ہوگی اس سے ہماری شاعری پر کئی راہیں مسدود ہو گئی ہیں۔ جنہیں کھولنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ نہ معلوم فارسی اور عربی کتب کب تک ہماری شاعری کو اپنے کندھے پر اٹھائے پھر میں گی اور وہ دن کب آئے گا۔ جب ہمارے شعراء اپنی زبان کو نوازیں گے اور قیامِ پاکستان کے بعد کہ وہ لوگ جن کی ملائی زبان اردو ہے اگر پاکستان میں ہیں تو اقلیت میں ہیں اور اگر ہندوستان میں ہیں تو ان سے رشتہ ٹوٹ چکا۔ نہ معلوم ہماری اپنی زبان، ”آئندہ کیا شکل اختیار کرے گی۔ خیر میں ایک آپ ہی کو ہدف کیوں بنالوں اس جام میں ہم سہمی ننگے ہیں۔ عظمت بلکہ شکر ہے کہ آپ پڑھنے والوں کو غصہ بوجھوں تو نہیں مارتے بلکہ جساں بے اعتدالی بھی کرتے ہیں۔ دہاں بھی خون کو گرہ ماہی دیتے ہیں۔ چنانچہ مجھے آپ کے ”وارپوش“ اور ”دلک“ اور لباسِ کبودی“ اور ”ہستان“ اور ”کوروا دی“ والڈ سب گوارا ہیں بلکہ میں آپ کی قوت کی داد دیتا ہوں کہ آپ نے بڑے کوہ کا فی الفاظ کو بھی ایسا مطیع کر لیا ہے کہ خانہ زاد معلوم ہوتے ہیں آپ جب بھی انہیں بلائیں حاضر ہو جاتے ہیں اور ہر خدمت بجا لاتے ہیں۔

شکر اور قہو سے کے مخلوفِ ارناں

جورانہ میں انتہائی گراں تھے۔

اس لئے گوالہ ہے کہ اسنی بلند آہنگوں کی بدولت آپ یہ بھی عطا کر سکتے ہیں —

منوکے آئیں کا ظلم سہتے ہوئے ہر بجن

کہ جن کا سایہ بھی برہمن کے لئے

ہے دزدِ شبِ زمستان

و سوچتے ہیں

کہیں یہ نکلن ہے

بیچ ڈالے گا

ہم کو بردہ فروشِ افرننگ

اب اسی برہمن کے ہاتھوں

کہ جس کے صدیوں پرانے سیسے سے

آج بھی کو رو کر ہیں ہم سب

جو اب بھی پاس ہے

تو روک لے ہم سے نورِ عرفاں

ایسے شعروں سے غروم رہ جاتا کہے منظور ہوگا۔

باقی رہی شدت تو اس کی رمت آپ میں آفاذ ہی سے پائی جاتی ہے اس کے لئے

ہماری تنقیدی زبان میں کوئی مناسب لفظ نہیں ملتا۔ سیاق و سباق کے اعتبار سے

کبھی اسے جوش کہہ لیتے ہیں کبھی جذبہ۔ لیکن غصے تلاش ایسے لفظ کی ہے جس میں جوش اور

جذبے کے علاوہ کچھ درشتی بھی پائی جاتے جیسے کوئی کسی سے انتقام لے رہا ہو۔ جب

شدت اس حد تک پہنچے تو مزاکچہ تلخ ہو جاتا ہے۔ شاعری اپنی ہی کیاریوں کو روزِ ڈالتا ہے

جیسے بچہ مندر میں آکر چیرنیں توڑ ڈالے۔ شروع شروع میں یہ منہ زوری غالباً آپ کے

شباب کا تقاضا تھی اور چونکہ ہمارے بیشتر جدید شعراء جہاں ہیں یا جوانی کے دنوں میں

انہوں نے نام پیدا کیا اور علاوہ برآں آنادی (سیاسی یا معاشی یا فنی) کی پیاس سے ہمیشہ ان پر ایک اضطراب طاری رہتا ہے اس لئے اس معاملے میں آپ تنہا نہیں مگر آپ کی محبوب نظیں وہی ہیں جن میں اس شدت پر شامی غالب آئی اولاً سے اپنے پیمانے سے بڑھنے نہ دیا۔ مثلاً میں سمجھتا ہوں کہ نہمت میں آپ اس شدت پر وہ قابو نہ پاسکے جن کا "درویش" اور "تیل کے سوداگر" میں قائل ہونا پڑتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی شاعری پختگی کے اس درجہ تک جا پہنچی ہے جہاں درشتی سے آپ کا قلم نا آشنا ہوا جاتا ہے "درویش" اور سوداگر جیسی نظیں دیر تک دلوں میں گونجتی رہیں گی کیونکہ کناہ جو شاعری کی جان ہے ان نظموں میں باوجود جوش اور جذبے کے شدت کے ہاتھوں کند ہونے نہیں پایا۔

مرے ہاتھ میں ہاتھ دے دو

مرے ہاتھ میں ہاتھ دے دو

کہ دیکھی ہیں میں نے ہمالہ والوند کی چوٹیوں پر شعاعیں

میں معنی کی دو تین تھیں ہیں جنہیں شاعر نے جیسے بے ساختگی کے ساتھ دو تین معرعوں

میں پیٹ کے لکھ دیا ہے اور "درویش" کا یہ پارہ بھی آپ کو یاد ہوگا —

یہ درویش

جن کے اب وجد

وہ سحر کے ہیرا کی ریت پر

تھک کے مرجانے والے

اسی کی طرح تھے

تھی دست اور خاک تیرہ میں غلام

جو تسلیم کو بے نیازی بنا کر

ہیضہ کی غرد میوں ہی کو اپنے لئے
 بال و پز جانتے تھے
 جنہیں مہتی فروغ گدائی کی خاطر
 جلال شہی کی بقا بھی گوارا
 جو لاشوں میں چلتے تھے
 کتے سے لاشوں سے
 سوتے رہو

صبح فرما کہیں بھی نہیں ہے“
 وہ جن کے لئے حریت کی نہایت یہی مہتی
 کہ شاہوں کا اظہارِ شاہنشاہی حد سے بڑھنے نہ پاتے
 جیلا حد کی کس کو خبر ہے؟

” لاشوں“ کا ذکر آیا تو میں نے سمجھا کہ آپ پھر پھرنے لگے۔ نہ معلوم کیا درشت کلامی
 کریں گے لیکن ضبط ہاتھ سے نہ چھوٹا اور آخری جملے نے اپنی طمعت سے وہ اثر پیدا کیا
 جو شدت سے نہ ہو سکتا۔ اس مجرمے میں مردو لیش کیا بہ اعتبار لغت اور کیا بہ اعتبار
 طہارت قلب اور مزاج شاعری کے حاصل کلام ہے۔

آپ نے بجا فرمایا کہ
 ” بعض قطعے بعض منظم مختصر افسانہ ہیں جن میں زیادہ زور کسی تصویر کشی پر
 ہے یا کسی واقعے کو بیان کرنا ہے تاکہ اس سے وہ تاثر پیدا ہو سکے جو
 شاعر کے دل پر سما تھا۔ بعض نظموں کی حیثیت ایک کیچ یا انکوارے کی سی
 ہے بعض خود کلامی سے زیادہ نہیں“

یہ ہمہ گیری بھی جدید شاعری کا ایک اہم کلانا مہ ہے۔ آپ نے اس نئے اسلوب کو جن

کے آپ بانیوں میں سے ہیں ہر طرح آزمایا ہے جس کی مثالیں اس مجموعہ میں جا بجا پائی جاتی ہیں۔ آپ نے مکالمے کو جس بے تکلفی سے اپنی نظموں میں نبھایا ہے وہ یقیناً پڑھنے والوں کی نظر سے چھپی نہ رہے گی۔ ہماری شاعری میں داستان گوئی نئی چیز نہیں اور جہاں داستان یا افسانہ ہو وہاں مکالمے سے مفر نہیں۔ لیکن قدام کے مکالمے الف بے الف بے کی ترتیب سے سیدھی سڑک پر لڑھکتے چلے جاتے تھے۔

ایک ٹرک کی گھماری تھی حال

دال کرتی تھی عرض یوں لحوال

وقس طے ہوا۔ لیکن جدید شاعری میں مکالمہ ایک پھلدار معاملہ ہے جہاں متکلم کے جذبات کے ساتھ بھے کانٹیب و فراز، شاعر کے خیالات، کرداروں کی آپس میں الجھن سب کو ایک ساتھ بننا پڑتا ہے۔ یہ ہم آپ کو اس مجموعے میں جا بجا پیش آئی اور آپ نے اسے جا بجا چا پکوستی سے سر کیا ہے۔ آپ وسعت مضامین میں قدرتی مناظر کا ذکر کرتا بھول گئے۔ حالانکہ یہ خوبی آپ کی نظموں میں بہت نمایاں ہے۔

زمستان کے دن تھے

لگاتار ہوتی رہی تھی سرشاہ سے برف ہاری

دھپچھے کے باہر سپیدے کے انبار سے لگے گئے تھے۔

مگر برف کا رقص یہیں تھا جاری

.....

مگر رات ہوتے ہی چاروں طرف بے کراں فانشی چھا گئی۔

خیاباں کے دورویہ سرو و ضویر کی شاخوں پہ

سرخ کے گلوے پر مڑے سے بن کر ٹھکنے لگے تھے

زمیں ان کے بکھرے ہوئے بال و پیر سے

کف آلود ساحل سائبنتی چلی جا رہی تھی

ہماری شاعری —

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی

بن گیا روئے آب پر کاتی!

سے کتنی دور نکل گئی ہے۔

آپ نے یاد دہا یا کہ آپ کی نظمیں قسم قسم کے نقوش کا مجموعہ ہیں تو لا محالہ براؤننگ یاد آیا۔ اس کی نظموں میں بھی افسانے، اے کیج، خود کلامی، مکالمے کہانیاں طر فنیکہ ایک فرافانی پائی جاتی ہے اسے بھی وہی مشکلات پیش آئی تھیں جو غالباً آپ کو بھی پیش آئی ہوں گی اس کے کلام کو بھی بعض اوقات ایسا اختصار اختیار کرنا پڑتا تھا کہ معنی کا سمجھنا قدرے مشکل ہو جاتا ہے لیکن اس کی فوتِ تخلیق بھی ایسی تھی کہ ابلتے چشمے کے پانی کی طرح ہر چھوٹے پتھر کو دراز دھکیلتی چلی جاتی تھی۔

نیو باک

۲۵ اکتوبر ۱۹۵۵ء

”پتھر س“

نغمہ زار

ابوالاثر حفیظ جالندھری کی کتاب کا دیباچہ

جالندھر کے نغمہ پرورد شہر نے حفیظ نامی ایک ساحر پیدا کیا ہے جو کچھ عرصہ سے لاہور کے مشاعروں اور ہندوستان کے ادبی حلقوں کو مبہوت کر رہا ہے جس کے قلم کی ایک بے پروا جنبش سے موسیقی کی روح کانپ کر بیدار ہو جاتی ہے۔ قدرت کی رنگینیاں ہتھویریں بن بن کر آنکھوں کے سامنے آتی ہیں اور غائب ہو جاتی ہیں اور لطافت اور نزاکت شاعری کا جھلانا ہوا لباس پہن کر رقص کرنے لگ جاتی ہیں۔

ساون رُت، گنگھور گھاؤں میں کھلتی ہوئی بجلی، موزوں کی جھنکار، پٹیوں کی جھنکار، پٹیوں کی پیکار، برسات کی ٹھنڈی ہوا، ہوا میں اڑتے ہوئے آنچل، آنکھوں میں تمنائے دید اور فراق کے آنسو، دل کو انتظار کی دھڑکن، یہ ایک مست کیف شاعر کی وہ دنیا ہے جس میں حفیظ لگا پھرتا ہے۔ جب اس کا دل بھرتا ہے۔ تو وہ آنسو بہا دیتا ہے، جب اس کے دل میں ایک ہموک اٹھتی ہے تو وہ اپنے سروں میں الپتا ہے اور سننے والوں کا دلچسپ دیتا ہے۔ یہ اس کے کلام کا مجموعہ ہے۔ چند ورق ہیں۔ خشک طبیعتوں کو جا بجا اس میں "فی" کے نقائص اور بے عنانیاں نظر آئیں گی۔ اہل ذوق دیکھیں گے اور جانیں گے کہ ایک ہارفتہ عاشق مزاج عشق کے اتاہ مندر میں خود بھی کس طرح ڈمگاتا ہے اور دوسروں کے دل بھی کس طرح ہلاتا ہے۔ حفیظ ایک ایسا شاعر ہے جس کے قدم ہمال رستے سے ادرمزادھر جا پڑتے

ہیں۔ لیکن یہ ایک راہ گم گزردہ کی آوارگی نہیں۔ ایک مست کی لغزشیں ہیں۔ نشتے میں چور، کیف میں سرشار جوہر تیار ہے اور پلا تا بھی ہے۔ چہا لے میں بھی بھر کر دیتا ہے اور یوں بھی لٹھا جاتا ہے۔ ایک آواز جو گاتا ہے اور الفاظ اس کی زبان پر نہ چلتے ہیں۔

ہمارے شاعر برسوں سے ترک شیرازی بر مست ہیں۔ ایک ایسی شہزاد طہور سے بے خود ہونے کا بہانہ کر رہے ہیں جو نہ خود چنی سکتے ہیں نہ اوروں کو پلا سکتے ہیں۔ شاعری ایک فریب ہے لیکن اس تصنع کا کیا نام ہے جو کسی کو دھوکہ نہ دے سکے؟

حنیظہ کی نظر ہندوستان کی دامن پر ہے اور وہ اس جھلک پر فدا ہے جو باریک آنچل میں سے دکھائی دیتی ہے۔ لیکن ابھی وہ ترک شیرازی کی فلامی سے بالکل آزاد نہیں ہوا اور اس کو کنکھیوں سے کبھی کبھی دیکھ لیتا ہے۔ بیبے دفائی آخر کب تک؟ عاشق کہ نظر باز؟

۱۹۲۵ء

”پطرس“

افسانے، ڈرامے، ناول

تزیب

مارخائیم
گونگی جویدو
میدو صیلا
عشق کی خود کشی
تائیں
سبب کا درخت

ماہنامہ

آر۔ ایل۔ اسٹیوٹن
(تسجیو)
پطرس

دوکاندار بولا۔ حضرت باری کائی کا کیا پوچھتے ہو۔ طرح طرح کے ڈھنگ
ہیں۔ کوئی جابل ٹکاپک آجانے تو میں اپنے علم و فراست سے فائدہ اٹھاتا ہوں۔ کوئی
پہنکا آجانے (اور یہ بکنے کے ساتھ ہی اس نے شیخ کو اتنا اور پر اٹھایا کہ روشنی اچھی
طرح اجنبی کے چہرے پر پڑنے لگی) تو اپنی نیکی اور دیانت سے فائدہ اٹھاتا ہوں۔
ماہنامہ اچھی اچھی دکان میں داخل ہوا تھا۔ باہر کھلے بازاروں میں سڑک کی
روشنی اچھی خاصی تھی اور دکان کے اندر کی تاریکی سے جس میں چمکتی ہوئی چیزوں کی
روشنی ملی ہوئی تھی انہیں اچھی مانوس نہ ہوتی تھیں۔ کچھ ان پر معنی انگنا کو سن کر اور
کچھ شیخ کی نوک کو اس قدر اپنے قریب پا کر اس انداز میں آنکھیں جھپکنے لگا۔ جیسے درد ہو
رہا ہو اور نگاہیں ایک طرف کو پھیر لیں۔

دکاندار نہیں دیا اور بکھنے لگا۔ تم آج کرمس کے دن میرے پاس آئے ہو۔
یہ جانتے ہوئے کہ میں کیسا ہوں۔ شٹر چڑھا رکھے ہیں اور کاروبار قطعی بند
کر رکھا ہے۔ تو حضرت کس کی آپ کو قیمت لگا کر بنا ہوگی۔ میں اس وقت
پہا حساب کتاب دُست کر رہا تھا۔ میرے وقت کا جو حرج ہوا۔ اس کی قیمت

ادا کرنی پڑے گی اور پھر اس خاص رویتے کی بھی قیمت ادا کرنی پڑے گی جو
 میں آج نمایاں طور پر آپ میں پاتا ہوں۔ رازداروں کا راز دار ہوں اور کبھی کسی
 سے آڑے ٹیڑھے سوال نہیں کرتا۔ لیکن جب کسی گاہک کا انداز اس قدر عجیبانہ
 ہو کہ مجھ سے نظریں چار نہ کر سکے تو پھر اسے اس کی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ کلادار
 دوبارہ ہنس دیا اور پھر صبر بھول اپنے کاروباری بے سے (جس میں پھر بھی کچھ
 کچھ طنز پایا جاتا تھا) کہنے لگا۔ تو تم اب کے پھر اس بات کا اطمینان کرو گئے
 کہ یہ چیز تمہارے قبضے میں کہاں سے آئی؟ پھر وہی اپنے چچا کی الماری میں
 سے؟ حضرت یہ آپ کے چچا جان نے ہی دنیا جہان کے عجائبات جمع کر رکھے
 ہیں گے!

دکاندار کوتاہ قد، زرد رو، خمیدہ پشت پنجل کے بل کھڑا ہو گیا۔ ٹینک کے
 سنہری فریم کے اوپر سے نظریں ڈالنے لگا۔ اور سر کو یوں ہلانے لگا کہ صاف
 ظاہر ہوتا تھا۔ مہنگا ٹیم کو مشتبہ سمجھتا ہے۔ مہنگا ٹیم نے دکاندار کی آنکھوں سے آنکھ
 ملائی تو نظروں سے انتہا درجے کا نام اور خوشی سی ہیبت ٹپک رہی تھی۔

بھلا۔ اب کے تم غلطی پر ہو۔ میں بیچنے نہیں کچھ خریدنے آیا ہوں۔ میرے
 پاس اب کوئی عجائبات نہیں۔ جن کے دام وصول کروں۔ چچا کی الماری دیوار
 تک خالی ہو چکی ہے اور نہ ہوتی جب بھی میں سٹہ بازی میں اس قدر روپیہ
 کا چکا ہوں کہ اس الماری میں تنہا کی بجائے کچھ اضافہ ہی کر سکتا ہوں۔
 آج میں کام کو آیا ہوں وہ تو ہیبت مملی سا کام ہے۔ بچے ایک خاتون کے پتے
 کرسس کا قلم مطلوب ہے اس تقریر کے دوران میں جو وہ پہلے ہی تیار کر کے
 لیا تھا۔ اس کے نعروں کی مدد سے بڑھتی چلی گئی، اور میں جانتا ہوں کہ جتنی سنی
 بات کہیں میں نے تمہارا جو حزن کیا۔ اس کے بچے بچے ہر طرح کی مضرت
 کرنی چاہیے۔ بہت یہ ہے کہ میں اپنی غفلت کی وجہ سے کل یہ کام کرنا بھول
 گیا۔ آج ہی کہا نے کہ دنٹ مجھے یہ اپنا حقیرا قلم پیش کرنا ہے۔ اور
 تم خود جانتے ہو جس شادی سے بہت سہاوہ پہننے کی امید ہو اسے پتہ

کرنے میں خلعت نہیں کرنی چاہیے۔

اس کے بعد کچھ دیر تک دونوں خاکوش رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دکاندار اس وقت میں اجنبی کی بات کو قیل ربا ہے لیکن اُسے کچھ یقین نہیں آتا۔ اس خاموشی کے دوران میں دکان کے عجیب و غریب سلمان میں جو بہت سی گھڑیاں پڑی تھیں۔ اُن کے ٹک ٹک کرنے کی آواز اورد ساتھ ہی بازار میں جو گاڑیاں چل رہی تھیں۔ اُن کے پتوں کے دم شور کے علاوہ اور کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔

دکاندار بولا۔ اچھا حضرت پونہی سی۔ آخر تم پرانے گلابک جو اگر تمہیں ایک اہمی جگہ شادی کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ تو جلا میں اس میں کیوں سڈا اٹکلن پے بوتھیں عورتوں کی پسند کی چیز دینے دیتے ہیں۔ یہ دستی آئینہ پندرہویں صدی کا جھوٹا جو تو میرا زور۔ اور یہ ٹا بھی، میں ایک ایسے گھر سے جہاں بڑے بڑے کمال کے عمارتات جمع تھے۔ نام تمہیں اس شخص کا نہ بتاؤں گا۔ اپنے گلابک کی مانند ہی صاحب ہے اور حضرت وہ ہی تمہاری ہی طرح ایک ایسے شخص کا بیٹا اور واحد وارث تھا۔ جسے عمارتات جمع کرنے کا بے حد شوق تھا۔

دکاندار کراخت اور تیز آواز میں باتیں کرتے کرتے جب آئینے کو اپنی جگہ سے اٹھانے کے لیے نیچے جھکا تو مارخانیم کے جسم میں بجلی کی ایک لہری گزر گئی۔ ہاتھ پاؤں یک منت تھرا اٹھے اور ہزاروں طوفانی جذبہت دفعتاً پک کر چہرے پر چھا گئے۔ یہ سب کچھ اچانک ہی ہوا۔ اور پھر تھوڑی ہی دیر میں مارخانیم سنبھل بھی گیا۔ اور ان جذبات کا کوئی اثر باقی نہ رہا۔ بجز اس کے کہ جب آئینہ ہاتھ میں لیا تو ہاتھ ذرا کانپ رہا تھا۔

بیشی جوئی آواز میں بولا آئینہ؟ کچھ دیر خاکوش رہا۔ اور پھر صاف آواز

میں دوبارہ بولا۔

آئینہ؟ کس کے لیے؟ یہ جھاکو نکرو سکتا ہے؟ دوکاندار بولا۔

”جو کیوں نہیں سکتا؟ آئیے میں کیا عرض ہے؟“

مدغایم اس کی طرف بیک ایسے انداز سے دیکھ رہا تھا۔ جس کا بیان کرنا نامکن ہے۔ بولا: ”تم مجھ سے پوچھتے ہو اس میں عرض کیا ہے؟ یہ دیکھو! اپنا چہرہ دیکھو! تمہیں دیکھنا گوارا ہے؟ ہرگز نہیں! تمہیں۔ مجھے۔ کس آدمی کو گوارا نہیں؟“
مدغایم نے جب یوں دھڑکتے آئینے کے سامنے کر دیا۔ تو دکھنا ایک لذت پیچھے کو ہٹ گیا تھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ کوئی خطرے کی بات نہیں تو ہنس دیا اور کہنے لگا: ”تو جناب آپ کی ہونے والی اہلیہ محترمہ بہت ہی کم مدبوں گی۔“

مدغایم بولا: ”میں نے تم سے کس کے لیے تمنا مانگا۔ اور تم مجھے یہ لاکر دے رہے ہو۔ یہ مکروہ و ملعون چیز ہے۔ جو ہر وقت بڑھاپے کی آمداد گناہوں اور عادتوں کی یاد دلاتی رہتی ہے۔ یہ دستی حمیر! کیا تمہارا ہاتھی یہ مطلب تھا کہ میں یہ خرید لوں؟ تم نے کچھ سوچا بھی تھا؟ مجھے بتاؤ۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے۔ کہ تم مجھے بتا دو۔ و آؤ مجھے اپنا حلال سناؤ میرا اندازہ ہے کہ تم پوشیدہ طور پر بہت ہی خیرات کرتے ہو؟“
دکاندار نے اسے بہت عجز سے دیکھا۔ عجیب بات ہے کہ مدغایم ہنستا ہوا معلوم نہیں ہوتا۔ چہرے میں خواہش اور امید کی جھلک تو ضرور نظر آتی ہے لیکن ہنس کا نام و نشان تک نہیں۔

مدغایم معلوم ہلے میں بولا: ”نیک نہیں دیا پتہ نہیں۔ نہ کسی سے جنت رکھتے ہو۔ نہ کسی کے جہنم جو۔ ایک اٹھتے جس سے روپیہ وصول کرتے ہو۔ ایک تجوری ہے جس میں سنبھال کر رکھتے ہو۔ بس تمہاری بہت دبو دی ہے؟ خدایا! اسے بس یہی کہہ ہے۔“

دکاندار کچھ ٹوائٹ کے بولا: ”میں تمہیں بتاتا ہوں۔ اور پھر نہیں دیا اور کچھ لگا۔ میں سمجھا۔ تمہاری یہ شادی معاشرے کی شادی ہے اور تم اسی مخالفان کی صحت کے جام پیتے رہے ہو۔“

مادر غانیم کو ایک عجیب قسم کی دلچسپی ہو گئی۔ بولا۔ اناہ! تم بھی مشتق کر چکے ہو! مجھے اس کا حال سناؤ۔

دکاندار بولا۔ میں اود مشتق! مجھے کسی اتنی فرصت نہیں ملی۔ اود نہ آج ہی مجھے اتنی فرصت ہے کہ میں اس بے معنی گنگو میں یوں اپنا وقت گنواؤں۔ آئینہ خریدتے ہو یا نہیں؟

مادر غانیم نے کہا۔ اتنی جلدی کیا ہے! یہاں کھڑے باتیں کرنے میں بھی مزہ ہے۔ اود زندگی اتنی مختصر اور ناپائیدار ہے کہ میں تو کبھی کسی لطف سے منہ موڑنے میں جلدی نہ کروں۔ خواہ وہ اس لطف کی طرح معمولی سا ہی کیوں نہ ہو۔ جو تھوڑا بہت نصیب ہو۔ اس کے ساتھ چمٹ جانا چاہیئے۔ جیسے کوئی گستاہوا آدمی پہاڑ کی چٹان سے چمٹ جاتا ہے۔ غور سے دیکھو تو زندگی ہر ایک لمحہ ایک چٹان ہے۔ میل بھر ادنی چٹان اتنی ادنی کدھل سے چھوٹ کر گریں تو زمین سے ٹکرا کر انسانیت کا تمام حلیہ سخ ہو جائے اسی لیے مزے مزے کی باتیں کرتے رہنا ہی بہتر ہے۔ چوہ تم مجھے حال سناؤ۔ میں تمہیں اپنا حال سنا ہوں۔ حجاب ہم میں کیوں حائل رہے۔ آؤ راز کی باتیں کریں۔ کیا معلوم ہم ایک دوسرے کے دوست ہی بن جائیں؟

دکاندار بولا۔ مجھے تم سے صرف ایک بات کہنی ہے۔ سودا خریدنا ہے تو خریدو ورنہ دکان سے باہر نکل جاؤ!

مادر غانیم نے کہا۔ پتہ ہے پتہ ہے۔ کافی دل لگی ہو چکی۔ اب کام کی بات کرنی چاہیئے۔ اچھا کوئی اور چیز دکھاؤ؟

آئینے کو پھلے طاق پر رکھنے کے لیے دکاندار پھر نیچے جھکا تو اس کے تھوڑے سے سنہری رنگ کے بال اس کی آنکھوں پر آگرے۔ مادر غانیم ذرا اور بھی قریب کوسک آیا۔ ایک اچھا لودھکٹ کی جیب میں تھا۔ تن کے کھڑا ہو گیا لودھک لباس کھینچ کر چاتی پیٹنی۔ چہرے پر کئی مختلف جذبات ایک ساتھ جھک رہے تھے۔ ڈر ہی تھا۔ ریت بھی تھی۔ کچھ تیز بھی کر چکا ہے

مسی می ہے اور کچھ متفریحی۔ بلائی ہونٹ پیسے تو انائی کے انداز میں اوپر کو اٹھا
ہوا اور دست پیسے باہر جھانک رہے تھے۔

دکاندار بولا: یہ شاید پسند آجائے: یہ کہہ کر سر اوپر اٹھانے لگا کہ مارغائم
پیچھے سے اس پر جا پڑا۔ سینچ کی فیکل کا ایک مہاسا نخر مچکا اور چہرے نیچے کو اڑا۔ کلند
مرغابیل کی طرف تڑپا۔ کپٹی طاق پر جا لگی اور وہ ڈھیر ہو کر فرش پر جا گرا۔
دکان میں رقت کی کئی چھوٹی چھوٹی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ بعض
اپنی عمر کے شاید شان آہستہ آہستہ اور وقار کے ساتھ بول رہی تھیں۔ بعض
جلدی جلدی گڑبڑا رہی تھیں یہ سب ایک دوسرے کے ساتھ چیخ در چیخ
ہلی ہوئی آوازیں ٹک ٹک کر کے ٹانٹنے لگی رہی تھیں۔ اہر سڑک کے فرش پر
کوئی لڑکا کٹ کٹ مٹھتا ہوا گھبرا۔ جس کے پاؤں کی آہٹ نے ان چھوٹی
چھوٹی آوازوں کے تسلسل کو برہم کر دیا۔ مارغائم چونکا اور اسے یک طرفت اپنے
گرد و پیش کا احساس ہوا۔ ہیبت خوردہ نظروں سے ادا ہوا دھردیکھنے لگا۔
شیخ دکھ کے تھنے پر ہل رہی تھی۔ اور شلہ ہوا سے ہلکے ہلکے جھوم رہا تھا۔
شلہ کی اس خفیف حرکت سے ایک بے آواز سا ہنگامہ بپا تھا۔ اندکمرہ
سندر کی مانند لہریں مار رہا تھا۔ بے بسے سائے اوپر نیچے ہو رہے تھے۔
تاریکی کے سیب دجے پھینتے تھے۔ اندکمرہ جاتے تھے۔ جیسے سانپ
رہے ہوں۔ تصویروں کے چہرے اور چینی کے بت پانی کے عکس کی مانند
لڑن اور متغیر تھے۔ اندکمرہ کا دروازہ کھلا تھا اور اس میں سے روشنی کی ایک
بکیر ساہوں کی اس دنیا میں یوں جھانک رہی تھی۔ جیسے کوئی انگلی اشارہ کر
رہی ہو۔

اس کی بھی ہوئی نظریں ان چیزوں سے گزرنے کے بعد پھر ہاش پر جا
کر روک گئیں۔ جو فرش پر کچھ کبڑی کچھ چت پٹی تھیں۔ بہت ہی چھوٹی اور زندگی
میں جس قدر حقیر مغسوں اور مسکوں کا باکس اور چہر نہایت بد نما انداز معلوم ہوتا
تھا۔ ٹکڑی کے بڑا دسے کا ڈھیر پٹا ہے مارغائم کا خیال تھا۔ میں اس کے دیکھنے

سے بہت کھا جائے گا۔ مگر وہ تو کچھ ہی نہ نکلی۔ یہی چہرہ ہی اس کے دیکھتے دیکھتے اس پڑاٹے کپڑوں کے ڈھیر اور اس خون کے تالاب میں جمیب مٹی پید ہونے شروع ہوئے تو یہ ہیں پڑاٹے گا اور جب کسی کو معلوم ہو جائے گا! اہاں تو چہرہ؟ تو چہرہ مردہ ہم ایک چیمارے گا۔ جو انگلستان بھر میں نمراٹے گی اور تمام دنیا کو تقاب کی گونہوں سے بھر دے گی۔ مگر چہرے پڑاٹے گا۔ اس نے سوچا ایک وقت ایسا ہی تھا۔ جب انسان کا جیسا پاش پاش ہو جاتا تھا تو، پہلے ہی الفاٹاٹے اُسے چوکتا کر دیا۔ وقت! اب کے تمام کام ہو چکا۔ وقت جو مردہ شخص کے لیے ہمیشہ کو ختم ہو گیا وہ قاتل کے لیے دفنہ اہم بن گیا ہے جو کچھ کرنا ہوا بھی اور اسی وقت.....

یہ خیال ابھی اس کے دل میں تھا کہ گھڑیوں نے یکے بعد دیگرے ہر رفتار اور ہر قسم کی آواز کے ساتھ۔ کوئی مینار کلیسا کے گھنٹے کی طرح گھمیرا کوئی باریک آواز میں وانز کے ابتدائی سر بجاتے ہوئے سر پہرے تین بجانے شروع کر دیئے۔ اس خاموش دنیا میں ایک غنت اتنی زبانوں کے جہل اٹھنے سے مار خایم دکھڑا گیا۔ اور اپنی جگہ سے حرکت کر کے شیخ ہاتھ میں نئے آگے پیچھے پھرنے لگا۔ متحرک سائے اُسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ اتفاقاً کہیں روشنی کا عکس دکھائی دے جاتا تو روح ٹک کانپ اٹھتی۔ اُسے اپنا چہرہ طرح طرح کے مٹیں ہوا۔ بعض ولایتی بعض دہلی یا اسٹریٹم کے بنے ہوئے آئینوں میں عکس دیکھ کر دکھائی دیا۔ جیسے جاسوسوں کی فوج اُسے دیکھ رہی ہو۔ اس کی نظریں اپنی ہی نظروں سے چار ہوتیں۔ اور اس کے جڑم کو پائیتیں۔ اس کے قدموں کی آہٹ گواہی کے منسوبے کو ہزار ہا خامیاں اُسے بار بار سمجھائیں یہاں تک کہ وہ اس تکرار سے تنگ آ گیا۔ تمہیں یہ کام کسی اور وقت کرنا تھا۔ جبکہ کسی کے سُن پانے یا آجانے کی بالکل توقع نہ ہوتی۔ اس بات کا انتظام کر رکھنا تھا کہ مزدورت پڑے تو ثابت کیا جا سکے میں اس وقت یہاں نہیں کسی اور مقام پر تھا۔ تمہیں بہت قنات ہونا چاہیے تھا۔

دکاندار کی صرف شکیں کس بیٹے اور منہ بند کر دیتے جان سے نہ مارتے
 نہیں اور بھی جرات کر کے خدمتگار کا کام بھی تمام کر دینا چاہیے تھا۔ یہ سب
 کچھ کسی اور طرح کرنا تھا۔ طرح طرح کے معنوں اس کے دل کو مجروح کئے دیتے
 تھے۔ ذہنی مسلسل اس تھا کہ دینے والی کشمکش میں معروف تھا کہ ان باتوں کو کس
 طرح بدل ڈالے۔ جن کا بہ لانا اب ناممکن تھا وہ تجویزیں سوچ رہا تھا جن کا سوچنا
 اب بالکل بیکار تھا۔ گویا نہ ٹٹنے والے ماضی کو نئے سرے سے تعمیر کرنا چاہتا تھا
 اس دماغ میں اور اس تمام ذہنی مصروفیت کی تہہ میں قسم قسم کے جوانی خون
 اس کے ماضی کے بنی خاندان میں کبھی چار بے تھے۔ جیسے کسی دیران اور
 تنگ و تاریک کوٹھڑی میں چوبے دھڑ بے ہوں۔ سپاہی کا ہاتھ زور سے
 کندھے پر پڑے گا تو تمام اعضاء یوں جھٹکا کھائیں گے۔ جیسے پھلی کانٹے میں
 لگ کر جھٹکا کھاتی ہے۔ حالت کا کٹہرہ اور قید خانہ اور چانس کی تھمہ اور سیاہ رنگ
 کا آہوت۔ سب ایک نظر میں ایک دوسرے کے چپے سر پٹ جا گتے ہوتے اس
 کی آنکھوں کے سامنے سے گزر گئے۔

راگنیر میں کا خون اس کے دل کے سامنے ہمارے فوج کی طرح جم کے بیٹھ گیا۔
 اس نے سوچا کہ اس کشمکش کی کوئی نہ کوئی آواز ضرور ان کے کانوں تک پہنچی ہو گی۔ اور
 وہ مزہ معلوم کرنا چاہتے ہوں گے کہ معاملہ کیا ہے۔ اب وہ پڑوس کے گھروں
 میں کان لگائے بے حس و حرکت بیٹھے ہوں گے۔ تہنا زندگی بسر کرنے والے
 لوگ جن کی قسمت میں سچی کھا ہے کہ کس کس کے دن اکیلے بیٹھے زمانہ ماضی کی خوشگوار
 یاد کو دہراتے رہیں۔ ان کے شفقت آمیز خیالات یک لخت برہم ہو گئے ہوں گے
 جو لوگ گھروں میں اپنے بال بچوں کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ وہ میز کے گرد باتیں
 کرتے کرتے یک لخت ٹک گئے ہوں گے۔ اور ماں اپنی انگلی اٹھا کر دم بخود
 ہو گئی ہو گی۔ ہر عمارت برہمیت کے لوگ اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے۔ گوش
 باندھتے ہوں گے۔ گویا چانس کا رسہ تیار کر رہے ہوں گے۔ بعض اوقات
 اُسے ایسا معلوم ہوتا کہ میرے حرکت کرنے سے جو بھی آواز پیدا ہوتی ہے وہ

ضرورت سے زیادہ بلند ہے۔ یوپیہا کے بے بے جام اہلیں میں یوں ٹھکانے
 جیسے گھڑیاں جتنا ہے اور ہنگ ہنگ کے شور سے وہ اس قدر گھبرا یا کہ دل
 چاہتا تھا کہ سب گھڑیاں بند کر دوں۔ طرح طرح کے خوف پیانے میں سرحدت
 کے ساتھ رنگ بدل رہے تھے کہ بعض اوقات سکوت بھی خطر سے کا جو جب
 معلوم ہوتا تھا۔ گویا خاموشی بھی ریگری کو زور سے جا کر لگے گی اور وہ یک لخت ہم
 جائے گا۔ یہ سوچتا تو قدم ہلکے اٹھانے کا خیال کر دیتا اسباب کے بیچ میں بڈر
 جتنا پھرتا اور ارادہ تھوٹ تھوٹ کی جسارت کے ساتھ اس طرح اٹھتا بیٹھا جیسے گھر
 کا مالک ہو اور اپنے کسی کام میں لگا ہو۔

لیکن ان مختلف خطرات نے اس کا اتنا برا حال کر دیا کہ اس کے دماغ کا
 ایک حصہ اب بھی چونکا اور ہوشیار تھا۔ لیکن دوسرا حصہ دیوانگی کے کنارے
 پر کانپ رہا تھا۔ خصوصاً ایک وہم نے تو اس کے دل پر بڑی طرح تسلط جما لیا۔
 کوئی سہا ہوا پڑوسی جو اپنی کھڑکی کے پاس کان لگائے سن رہا ہو۔ کوئی مہر و
 جو چلتے چلتے کچھ شبہ کر کے یک لخت رُک جائے۔ اس طرح کے لوگ زیادہ
 سے زیادہ شک ہی کر سکتے ہیں۔ انہیں کسی بات کا علم اور یقین تو ہو نہیں سکتا۔ اینٹوں
 کی دیوار اور بند کھڑکیوں میں سے تو صرف آواز ہی باہر جا سکتی ہیں۔ لیکن خود
 گھر کے اندر — کیا میں اکیلا ہوں؟ اس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا
 تھا کہ گھر کی خادمہ اپنے بہترین کپڑے (بڑے جملے جیسے بھی تھے) پہن کر
 کسی چاہنے والے سے باہر ملنے گئی ہے۔ اور اس کے پاس کے برہنہ
 اور اس کے چہرے کی ہر مسکراہٹ سے مترشح تھا کہ دن بھر کے یسے
 باہر گئی ہے — تو پھر میں اکیلا ہی ہوں۔ لیکن پھر بھی اُسے یقین تھا کہ
 بلائی منزل سے جو بالکل ہی خالی پڑی تھی۔ قدموں کی ہلکی ہلکی آہٹ سنائی
 دے رہی ہے نہ معلوم کیوں؟ لیکن کسی بہتی کے موجود ہونے کا احساس بہت
 نہ ہوت تھا جس کے قلاب میں اس کا تخیل مکان کے کمرے کمرے اور
 کونے کونے میں پھر گیا۔ کسی نہ معلوم ہوتا تھا کہ اس وہم بہنی کا چہرہ ہی نہیں

پھر بھی دیکھنے کو انگلیں موجود ہیں۔ کبھی اسے خود اپنی ہی پرچائیں معلوم ہوتی ہیں
کبھی مرے ہونے کا اندازہ شکل دکھائی دیتی۔ جسے عکاسی اور نفرت کی روح
نے چہرہ زندہ کر دیا جو۔

بہن صفات دل کو کڑا کر کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف دیکھتا تو
نظریں اس سے متنفر ہلپس آتیں۔ مکان کی چھت ادنیٰ تھی۔ روشنی ان چہرہ ماسا
اور میلا تھا۔ موسم کا یہ حال تھا کہ کپڑے کی وجہ سے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جو روشنی
میں چھین کر پہلی منزل تک پہنچا وہ بہت ہی کم تھی۔ اور مکان کی دہلیز پر موسم
سی دکھائی دیتی تھی۔ لیکن پھر بھی اُسے یہ شبہ ہوتا تھا کہ اس خفیف سی روشنی کے
ٹھوسے میں کوئی سیدھتی دلنڈل ہے۔

دنہ ہا ہر بازو سے کسی خوش طبع آدمی نے اپنی چھڑی کے ساتھ مکان کے
دوڑنے کو کھٹکھٹا ہٹا دیا۔ ساتھ ہی کتے بھی مارا جاتا تھا۔ اور بلند آواز
سے بہن بہن کر کئی ایسی مذاق کی باتیں کرتا جاتا تھا جس میں کئی دنہ اس نے دکاندار
کا نام لے کر بھی پکارا۔ ماضی کا خون جم گیا اور اس نے مرد سے کی طرف دیکھا
لیکن نہیں۔ وہ بالکل بے حس و حرکت پڑا تھا۔ وہ اب وہاں پہنچ چکا ہے۔
جہاں آواز دل کی رسائی نہیں۔ وہ سکوت کے سمندر میں ڈوب چکا ہے۔
اور اس کا نام جیسے کبھی وہ طوفان کے شور میں بھی سن لیتا۔ اب ایک بے معنی
سی آواز ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس خوش طبع آدمی نے دروازہ کھٹکھٹانا بند کر دیا
اور وہاں سے چل دیا۔

یہ گویا اس بات کا اشارہ تھا کہ جو کچھ کرنا باقی ہے بہت جلد کرنا چاہیے
اس مذکورہ علاقہ سے باہر نکل کر لندن کے اڈرام کے مہلاب میں گود پڑنا
چاہیے اور دن وصل پکنے پر عکسی اور بظاہر معصومیت کی جائے پناہ یعنی اپنے بستر
پر پہنچ جانا چاہیے۔ ابھی لیک طے والا آیا تھا۔ ابھی کوئی دوسرا آجائے اور وہ شاید
اس آسانی سے نہ ملے۔ اڑتھاب جرم کے بعد جو کچھ وصول ہونا تھا۔ اُس سے محروم
رہ جانا یہ ایسی ناگہانی ہے کہ طبیعت اسے قبول نہیں کرتی۔ اب اسے فکر تھی تو روپے

کی اور تلاش تھی تو چابیوں کی جن کے ذریعے روپیہ حاصل کیا جاسکتا تھا۔

سر پھر کر کھلے ہوئے دروازہ کی طرف دیکھا جہاں وہ سایہ رہ رہ کر کانپ رہا تھا۔ مقتول کے قریب آیا۔ کسی ذہنی کراہیت کا احساس نہ تھا۔ پھر بھی مدد سے کی نسلوں میں جھٹکا سا لگا۔ لاش کی انسانی وضع مفقود ہو چکی تھی۔ ہاتھ پاؤں بکھرے پڑے تھے اور دھڑ دھڑا ہوا ہو گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے کپڑوں کے اندر انسانی جسم نہیں۔ تھوڑا سا بھروسہ بھرا ہے۔ لیکن پھر بھی طبیعت اس سے متنفر تھی۔ دیکھنے کو تھیرا اور بے حیثیت تھی لیکن ڈرتا تھا کہ ہاتھ سے چھوؤں تو شاید اتنی حقیر معلوم نہ ہو۔ لاش کے کندھے سے پکڑ کر اٹھایا اور چپٹ ٹا دیا۔ کچھ عجیب ہلکی ہلکی اور ڈھیلی ڈھیلی سی تھی۔ بازوؤں اور ٹانگوں کی عجیب عجیب ہتھیلیاں بن جاتیں۔ جیسے ٹوٹے ہوئے ہوں۔ چہرے پر جذبات کی کوئی کیفیت باقی نہ رہی تھی اور وہ موسم کی طرح بے رنگ تھا۔ ایک کپٹی خون آلود تھی جس کے دیکھنے سے رو گھٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ مارخانیم کو بھی یہی ایک بات ناگوار معلوم ہوتی تھی۔ یہ دیکھ کر اسے فوراً ہی ایک خاص سیلے کا دن یاد آ جاتا۔ جو اس نے پھیروں کے ایک گاؤں میں گزارا تھا۔ بازاروں میں لوگوں کا ہجوم تھا۔ پتیل کے باجوں کی بلند آواز اور ڈھول کی ڈنڈن سنائی دے رہی تھی۔ ایک داستان گویا ناک میں گارہا تھا۔ ایک ٹکڑا جسے کچھ ڈر بھی تھا۔ کچھ شوق بھی تھا۔ ادھر ادھر پھر رہا تھا۔ آخر کار سب سے زیادہ رافق کے مقام پر پہنچ گیا جہاں ایک چوترا سا بنا ہوا تھا۔ اور ایک بے پونڈے پردے پر تصویریں لٹکی ہوئی تھیں۔ ایک تصویر براؤں رنگ اور اس کے شاگرد کی تھی سلیک سٹرا اور سنزینگ اور ان کے مقتول جہان کی تھی۔ ایک تصویر میں ڈمیر اپنے قاتل تھریل کے خونی پنے میں گرفتار نظر آ رہا تھا۔ اس کے علاوہ اور بیسیوں جرائم کی تصاویر پیش نظر تھیں۔ یہ تمام نظارہ اُسے اس وضاحت کے ساتھ یاد آ رہا تھا۔ جیسے کسی شہدہ باز نے ماضی کو چہرہ زندہ کر دیا ہو۔ اپنے آپ کو پھر از مہر فردوسی رکھنے لگا۔ اُسے معلوم ہوا کہ میں پھر وہی تماشا دیکھ رہا ہوں۔ ان مکروہ تصاویر کو دیکھ کر پھر میرا دل کراہیت سے بھر گیا ہے۔

اور اس ڈھول کی آواز سے میں پھر جیسے سُن سا ہو گیا ہوں۔ اس موسیقی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اُسے یاد آ گیا۔ اور اس کی وجہ سے پہلی دفعہ اس کی طبیعت گہرا نہ لگی۔ اسے تسلی سی ہوئی، جوڑوں میں ایک لنت ایک صنعت سامعوس ہونے لگا جس پر قابو پانا ضروری تھا۔

مغزندی اسی میں سمجھی کہ ان خیالات سے چھپا چھڑانے کی بجائے اُن کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ لاش کے چہرے کو اور بھی غور سے دیکھنے لگا۔ اور اپنی طبیعت پر زور ڈال کر اپنے جرم کی ماہیت اور سفاکی کو پوری طرح محسوس کرنے لگا۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی۔ یہی چہرہ مختلف جذبات کے زیر اثر تیار بدلتا رہتا تھا۔ یہ ہونٹ بول رہے تھے۔ اس جسم میں فرمان پذیر قوتوں کی آگ بھری تھی۔ اور اب میرے ایک ہی فعل سے کارخانہ مہیات کا پُرزہ ایک لنت تمم گیا۔ جیسے ساڑا اپنی خمیدہ انگلی سے کسی گھڑی کو روک دیتا ہے۔ وہ اپنے دل کو ہزارا سمجھاتا رہا لیکن بے سود کسی تانتف کا احساس نہ ہوتا تھا۔ نہ ہی دل جو جرم کی نقلی تصویروں کے سامنے کانپ اٹھتا ہے۔ اب تو حقیقت کو دیکھ کر بھی نہ پسپتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ اُسے دکاندار پر تھوڑا سا رحم آتا کہ اُسے بھی خدا نے وہ تمام قوتیں عطا کی تھیں۔ جن سے دُنیا کو ایک عجیب و غریب طلسماتی بہشت بنایا جا سکتا ہے لیکن اُن سے اس نے کچھ فائدہ نہ اٹھایا۔ اب وہ مر چکا ہے لیکن حقیقی معنوں میں وہ کبھی زندہ ہی نہ تھا۔ بس اس بات پر اُسے کچھ ترس آتا تھا۔ لیکن تانتف یا ندامت کا شاہدہ تک اس کے دل میں موجود نہ تھا۔

چنانچہ اس نے ان خیالات کو دماغ سے نکال دیا اور چاہیاں تلاش کر کے دکان کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا۔ باہر زور کی بارش شروع ہو گئی تھی۔ لہر مینہ کی پڑاؤ سے خاموشی منقود ہو چکی تھی۔ کس رستے ہوئے خار کی مانند مکان کے کمروں میں طرح طرح کی گونجوں سے جو لہجہ بھر کو بھی نہ سمجھتی تھیں۔ اور جو گھڑیوں کی ٹپک ٹپک کے ساتھ ل کر کانوں میں ایک شور سا پیدا کر رہی تھیں ایک ہیبت سی چھا گئی تھی اور جب مدغایم دروازہ کے قریب پہنچا تو اسے ایسا

معلوم ہوا جیسے اُس کے ہلکے ہلکے قدموں کی آہٹ پا کر کوئی شخص دبے پاؤں
میٹریموں پر واپس چلا گیا ہے۔ وہ سایہ ابھی تک دبیز پرکانہ پر رہا تھا۔ اُس نے
طبیعت کو کڑا کر کے مدھن سے کو اپنی طرف کھینچ کر کھول دیا۔

کئی مہینے ہوئے تھے ابھی کہ دم سے روٹنی اس زرد بکتر پر جو میٹریموں کے موڑ پر
ہاتھ میں نیرہ مٹھے ساتھ تھی۔ اندر ترشی ہوئی سیاہ چوٹی دیوار پر ٹکی ہوئی تصویروں
اور چوکھٹوں پر بھی پڑ رہی تھی۔ مینہ کا شور تمام گھر میں اس زور سے سنائی دیتا تھا
کہ درغایم کو اس میں کئی صفت تم کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ پاؤں کی آہٹ اور
آہیں اور کہیں فوج مار تاج کرتی ہوئی پیشوں کے قدموں کی کٹاکٹ اور روپہ گنگنے
کی جھکار اور مدھنوں کے ہلکے ہلکے احتیاط کے ساتھ کھلنے کی جھین جھین۔ یہ سب آوازیں
گہند پر مینہ کی پڑا پڑ اور پر ناوں میں اب باروں کے شور کے ساتھ ہی ہوئی معلوم ہوتی
تھیں۔ یہ سب اس کو میں کھینچ نہیں اس قدر تیز ہوتا گیا کہ دیوانگی کی حد تک پہنچ گیا۔ اُسے
کچھ جنون سا ہو گیا کہ پراسرار ہنسیاں مجھے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں
بلکہ اُدھر سے کھروں میں چلتی چھرتی معلوم ہو رہی ہیں۔ بڑی شکل سے میٹریموں پر
چڑھنا شروع کیا تو یہ معلوم ہوا جیسے اوپر کوئی دبے پاؤں پیچے کو جاگ گیا ہے
اور کوئی ہلکے ہلکے ہس کے پیچھے چڑھ رہا ہے۔ سوچا اگر میں بہرا ہوتا تو اس وقت
روح کو کتنا اطمینان ہوتا۔ لیکن پھر یہ سوچا کہ یہ بیدار خواہش ہی تو ہیں۔ جو اس وقت
میری زندگی کی حفاظت کے لیے پہرہ دے رہے ہیں۔ اس خیال سے اُسے
کچھ اطمینان ہوا۔ اور پہلے سے بھی زیادہ توجہ کے ساتھ کان لگائے رہا۔ سر کو
بار بار پیچھے موڑتا۔ اس کی آنکھیں ابلی بڑاتی تھیں اور ہر طرف کا جائزہ لے رہی
تھیں۔ لیکن ہر طرف کا سیلاب ہوتے ہوتے رہ جاتیں۔ کیونکہ جہد جہد کھینچتیں اور
ہی کسی نامعلوم جاگتی ہوئی چیز کا پھلا مستغائب ہوتا نظر آتا۔ پہلی صفت تک چوہیں
میٹریموں تھیں اور ہر ایک میٹریموں ایک تیامت معلوم ہوتی تھی۔

اوپر کی صفت پر تینوں مدھنوں کے کپڑے تھے۔ اور تینوں میں کوئی معلوم ہونے
تھے ان کو دیکھ کر درغایم پید کا پنا۔ جیسے توہوں کے دانے نظر آکر ہے ہوں

اُسے بیاموس ہو کر اب گیا لوگوں کی تیز نظروں سے پوری طرح کبھی نہ چکا سکوں
 گھاپی دل چاہا کہ کسی طرح اپنے گھر کے اندر پہنچ جاؤں۔ جہاں چاندوں طرف
 دیو دیں کھڑی ہوں گی۔ اپنے بستر میں جا کر چھپ جاؤں گا۔ اور سوائے خدا کے
 اور کسی کی آنکھیں بھید دیکھ سکیں گی۔ اس خیال پر اُسے کچھ توجہ نہ رہا۔ اسے اور
 قاتلوں کے نقشے یاد آئے جو کہا جاتا ہے۔ انتقام خداوندی سے خون کھاتے
 تھے۔ کم از کم مدغائیم کے دل میں اس بات کا خوف نہ تھا۔ خدا سے تو نہیں۔ البتہ
 قوانین قدرت سے ضرور ڈرتا تھا کہ ممکن ہے میری موجودگی کے بغیر ایسے آثار
 باقی رہ جائیں جو اثباتِ جرم میں مدد دیں۔ ان آثار کو تو قوانین قدرت کی بے رحم
 اور اٹل کار فرمائی کبھی موند کرے گی۔ اس سے بھی دس گنا زیادہ دعا اس بات سے ظہور
 کھاتا تھا۔ وہم پرست ضیف الامتداد لوگوں کا خوف کہ کیا معلوم کوئی ایسی بات ظہور
 پاتا جائے جو آج تک کسی نے دیکھی ہو نہ سنی ہو۔ کیا معلوم قدرت خود اپنے
 قوانین کی خلاف ورزی کرنے لگے۔ میں ایک بیاکسیل کیل رہا ہوں۔ جس میں
 ذہن اور فراست کی ضرورت ہے۔ جس میں کامیابی خاص تو اصول و ضوابط پر مبنی
 ہے جس میں تولید کی طرح خاص اسباب و علل سے خاص نتائج ظہور پزیر
 ہوتے ہیں۔ اگر اس جابر و مطلق انسان بادشاہ کی طرح جو کھیتے کھیتے شطرنج کی بساط
 اٹھ دیتا ہے ایک منت و ملت و معلول کا یہ سلسلہ برہم کر دے تو کیا ہوگا؟ موزن
 بکتے ہیں۔ جب موسم سناپنی آسکا وقت بدل ڈالاتا تو پنہین کا یہی حال ہوا تھا
 کیا معلوم ما مدغائیم کا یہی حال ہو؟ کیا معلوم ان ٹھوس دیواروں میں شیشے کی سی
 خاصیت پیدا ہو جائے اور میری تمام حرکات باہر سے صاف صاف نظر آنے لگیں۔
 جیسے کسی شیشے کے کبس میں ہند کی مکینوں کی حرکات نظر آتی ہیں فرش کے یہ
 مضبوط قلعے سمندر کی دیت کی طرح نیچے پٹیے جائیں اور دلدل کی طرح مجھے اپنی
 گرفت میں چنالیں؟ یہ تو دور کی باتیں ہیں۔ کیا معلوم یہ مکان ہی گھر پڑے اور
 میں اس کاش کے ساتھ ہیں جو کس ہو جاؤں۔ یا ساتھ کے گھر میں آگ لگ جائے
 آگ بجانے والے آگ سب طرف سے اندھا گھسیں؟ ان چیزوں سے وہ

مزدخون کتا تھا۔ ان کو چاہو تو گناہ کا خداوندی انتقام سمجھو۔ لیکن خود خدا کی ذمت سے وہ بالکل نہ گھبراتا تھا۔ دل سے کہتا میرا یہ فعل تجاوز ہے۔ لیکن اس کی وجہ بھی تو خاص ہیں اور خدا کائن کا پرہیزگار و احکم ہے۔ یہی نہیں بلکہ انصاف کا یقین بھی خدا ہی پر تھا۔ انسانوں پر نہ تھا۔

جب صبح سلامت نماز ٹینگ روم میں پہنچ گیا اور وہ دروازہ بند کر لیا تو اُسے صوس ہوا۔ سب کوئی خطرہ نہیں۔ کمرہ بالکل بے آرائش تھا۔ فرش پر قالین لٹک نہ تھا۔ باجما خالی بکس اور نکل بے جوڑ سا فرنیچر پڑا تھا۔ کئی لمبے لمبے آئینے تھے جن میں حلقہ زاویوں سے اُسے اپنا عکس نظر آ رہا تھا۔ جیسے کوئی ہیکل ایسٹج پر ہے۔ کئی نقابہ برصین چوکھٹوں میں لگی ہوئی بعض بنیر چوکھٹوں کے۔ دیدار کے ساتھ اُنٹی کلڑی تھیں۔ اس کے علاوہ کھانے کے کمرے کی۔ ٹیبلٹن اللاری، ٹیک اور اللاری جس میں کلڑی کی پہلی کاری کی ہوئی تھی۔ اور ایک بہت بڑا پرانی وضع کا ہنگ تھا۔ جس پر دبیز قسمتی کپڑے کے پردے لگے تھے۔ کھڑکیوں کی جو کھٹ تک پہنچی تھی۔ لیکن خوش مستی سے ان کا پلاعتہ تھا۔ اس لیے پڑوس کے گھوں کی نظر نہ پڑ سکتی تھی۔ رہنمائی نے ایک کبھی کو اللاری کے سامنے کھینچ لیا اور کنبھوں کے چمکے میں سے ایسی کبھی تلاش کرنے لگا۔ جس سے اللاری کا فضل کمال کے۔ کنبھیاں بے شمار تھیں۔ اس لیے یہ کام لیا تھا۔ اور طبیعت گھبرانے لگتی تھی۔ اس خیال سے اور بھی گھبراہٹ ہوتی تھی۔ مگر کبھی بے اللاری میں کچھ بھی نہ نکلے اور وقت کراڑا چلا جا رہا تھا۔ لیکن اس پر شہید، مہر و نیت سے اس کے اس پھر دست جو گئے۔

دروازہ کو کنبھوں سے بلکہ بعض اوقات نظر بھر کر بھی دیکھ لیتا جیسے کوئی مہر و پر سالہ اپنی مخالفت کے انتظامات کو مستحکم پکڑ خوش ہوتا ہے۔ لیکن در حقیقت وہ بالکل مطمئن تھا۔ ہر بلڈر میں جینہ برس رہا تھا۔ اور بدوش کا شور طبی اور خوشگوار معلوم ہوتا تھا۔ ٹھنڈے موسم کے بعد دوسری طرف سے محدود مناجات کے گیت کے ساتھ پانچ بیٹے کی آواز آئی شروع ہوئی۔ بہت سے

ہے مل کر گیت گارہے تھے۔ گیت کی موسیقی خوش آئند تھی اور اس کے سروں سے ایک خاص وقار ٹپکتا تھا۔ بچوں کی خواہشیں پوری اور جلی معلوم ہوتی تھیں اور مارغائم مسکراتا ہوا سن رہا تھا۔ اور ساتھ ہی کہنیاں گھاگھا کر دیکھتا بھی جاتا تھا۔ دل میں اسی قسم کے تصورات اور خیالات کا ایک ہجوم تھا۔ کبھی گرجا جاتے ہوئے بچوں اور لوگوں کے بچنے کا خیال آتا۔ کبھی کھیلے کودنے بچوں کا تصور بندھ جاتا کہ مٹی کے کنارے نہلنے کو جمع ہیں۔ یا کھلے میدان میں گھوم رہے ہیں۔ یا جب آسمان پر بجا ہادلوں سے اٹھکیاں کر رہی ہے۔ تو پتنگ اڑا رہے ہیں۔ سر کے کسی اور تار چڑھاؤ کے ساتھ چہرہ گرجے کا خیال آ جاتا حرمیوں کا موسم ہے۔ اتوار کا خواب اور دن۔ پادری جہد آواز اور شائستہ ہلبے میں وندا کر رہا ہے (اس پر ذرا مسکرا دینا) روشنی جیکو بین ہجرے اور کلیسا کے مشرقی حصے میں مدغم سے صندوق میں لکھے ہوئے دس احکام کھولنے کے سامنے پھر جاتے۔

ایسی باتیں بیٹھا سوچ رہا تھا ایک لذت چونک کر کھڑا ہو گیا۔ دفعتہ برف کی سی خشکی خون کا اُبتا ہوا فواہ۔ آگ کا ایک شعلہ اس کے جسم میں دوڑ گیا پاؤں وہیں کے وہیں جم گئے ہود جسم غرق حرقا اپنے لگا کسی شخص کے سیریزوں پر چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ تھوڑی دیر بعد کسی اتھنے دروازے کے دستے کو گھمایا۔ قفل سرکتا ہوا سنائی دیا اور دروازہ کھلا۔

خوف نے ٹپکنے میں جکڑ رکھا تھا۔ کچھ نہ بھوکتا تھا کہ اب کیا ظہور میں آئے گا خود متول ہی اپنے پاؤں چل گیا گیا سے یا عدالت کا کئی کا اندہ ہے یا اتفاقاً یہ جی کوئی شخص یہاں آگیا ہے جس کی شہادت اسے پھانسی کے تختے پر شکار دے گی۔ لیکن جب دروازہ کھلا تو ایک شخص کا چہرہ دکھائی دیا جس نے ادھر ادھر نگاہ ڈالی۔ مارغائم کو دیکھا، سر ہلکا کر مسکرایا (جیسے کسی دوست کو دیکھ کر پہچان یا ہوا) اور چہرے پہ ہٹ کر دروازہ بند کر دیا۔ مارغائم کو خوف کے مارے اپنے آپ پر قابو نہ رہا۔ منہ سے بے اختیار ایک ہلکی سی چیخ نکلی جسے سن کر اجنبی پھر

واپس آگیا۔ خندہ پیشانی سے پوچھنے لگا۔

”تم نے مجھے بلایا تھا؟ یہ کہنے کے ساتھ ہی اندر آگیا اور دروازہ

بھڑکیا۔

مدغائیم کھڑا تھا اور جبرہ چشم بن کر اسے دیکھ رہا تھا۔ شاید آنکھوں پر پردہ پڑا تھا کیونکہ اجنبی کا قد و قامت اور شکل و صورت متغیر و مرزاں نظر آتی تھی جیسے شمع کی کانپتی ہوئی روشنی میں سپنی کے بُت متغیر و مرزاں نظر آتے تھے۔ کبھی کبھی اسے خیال آتا کہ کوئی شہساز ہے۔ پھر خیال آتا ہے کہ شکل مٹی ہے۔ دل پر انتہا در بے کی ہیبت چھائی ہوئی تھی اور کم از کم اس بات کا یقین تھا کہ یہ شخص اس دنیا کا ممکن نہیں یہ خدا کی مخلوق میں سے ہے۔

لیکن عجیب بات تھی کہ پھر بھی یہ اجنبی جو کھڑا مارغائیم کو مسکرا کر دیکھ رہا تھا معمولی سا انسان معلوم ہوتا تھا اور جب اس نے یہ پوچھا کہ روپے کی تلاش میں ہو؟ تو ایسے ہی وہی سلیقہ تھا جو روزمرہ کی عام گفتگو میں پایا جاتا ہے۔ مارغائیم نے کہے جواب نہ دیا۔

اجنبی بولا: ”میں تمہیں متنبہ کیے دیتا ہوں کہ ملا آج اپنے چاہنے والے سے جلدی رغصت ہو گئی ہے اور اب یہاں پہنچا ہی چاہتی ہے۔ اگر مسٹر مارغائیم اس گھر میں پکڑے جائیں تو تیرے جو بچے گا وہ تم جانتے ہی ہو۔“
قال نے پوچھا: ”تم مجھے جانتے ہو؟“

اجنبی مسکرا دیا اور بولا: ”تمہارے میرے منظور نظر ہو۔ حرم سے تمہیں دیکھ رہا ہوں اور بارہا میں نے چاہا ہے کہ تمہاری مدد کروں۔“

مدغائیم بولا: ”تم کون ہو؟ کیا تم شیطان ہو؟“

اجنبی نے جواب دیا: ”میں تمہاری خدمت کرنا چاہتا ہوں اس پر اس بات کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا کہ میں کون ہوں۔“

مدغائیم پہلا: ”مذہب پڑ سکتا ہے! میں تم سے مدد چاہوں؟ تم سے؟ یہ ہرگز نہ ہوگا۔ تمہاری مجھ سے واقف نہیں۔ خدا کا شکر ہے تم ابھی مجھ سے واقف نہیں۔“

ابنی نے ہیک مشتاقہ درشتی بلکہ محکم کے ساتھ جواب دیا: میں تمہیں جانتا ہوں
میں تمہاری روح تک سے واقف ہوں:

مغایم پولا: مجھے جانتے ہو! مجھے کون جان سکتا ہے! میری زندگی خود
میرا ہی بگڑا ہوا نقشہ اور خود بھی پر ایک ہمت ہے۔ میں نے عمر بھر اپنی نفرت
کو جھٹلایا ہے۔ ہر انسان کا یہی حال ہے۔ ہر انسان اس طرح سے بدرجہا بہتر ہوتا
ہے جو وہ اپنے اُوپر پڑھاتا رہتا ہے اور جس کے اندر اس کا دم گھٹا جاتا ہے۔ ہر
انسان کشاں کشاں بدھ زندگی لے جائے اُوپر ہی کھینچا چلا جاتا ہے، جیسے
ذہن کسی کو پڑ کر اس پر کبل ڈال دیتے ہیں۔ اگر ان میں سے کسی کو اپنے اوپر اختیار
ہو، اگر کسی وہ اپنے اصل روپ میں دکھائی دے جائیں تو تم انہیں اس سے کہیں
مختلف پاؤ گے اللہ ان کے چہروں پر نامور بہادروں اور فدا رسیدہ بزرگوں
کا سا نور چمکتا نظر آئے گا۔ میں بہت سوں سے بڑا ہوں۔ مجھ پر جھوٹ کی بہت
موٹی تہ بھی ہے اور میرا عذر مجھے اور میرے خدا کو معلوم ہے لیکن اگر مجھے بہت ہو
تو میں اپنی اصل حقیقت آشکار کر سکتا ہوں۔

ابنی نے پوچھا: مجھ پر؟

قال نے جواب دیا: سب سے پہلے تم ہو میں تمہیں معتقد سمجھتا تھا۔ میرا خیال
تھا کہ اب تم آبی گئے ہو تو کم از کم میرے دل کا حال بخوبی جان لو گے لیکن انہوں
چہرے تم میری نیکی بدی کا اندازہ میرے افعال سے لگانا چاہتے ہو! ذرا سوچو تو!
میرے افعال سے! دیوؤں کے ملک میں پیدا ہوا اور میں نے دیوؤں کے ملک
میں زندگی بسر کی۔ جب سے میں نے جنم لیا ہے، حالات و واقعات کے دیو مجھے
کالیوں سے پکڑ کر گھیسٹے چہرے ہیں اور تم میری نیکی بدی کا اندازہ میرے افعال سے
لگانا چاہتے ہو! تمہیں میرا باطن نظر نہیں آتا؛ تم یہ نہیں سمجھتے کہ مجھے بدی سے نفرت
ہے؛ تمہیں میرے سینے کے اندر ضمیر کے احکام صاف صاف کھے ہوئے نظر نہیں
آتے؛ میں نے اکثر ان کی تمیل سے محریز کیا ہے لیکن دیدہ و دہشتہ کبھی ان کی
غلط تاویل نہیں کی۔ اپنی مرضی کے خلاف گناہ کرنے والوں کی شاہیں تو لاکھوں کی

تعداد میں موجود ہوں گی۔ کیا میں قبیلے ویسا ہی انسان معلوم نہیں ہوتا؟
 جواب ملا: تم نے اپنے خیالات کا اظہار بڑے جذبے کے ساتھ کیا ہے
 لیکن اس سے مجھ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مجھے اس بات سے کوئی واسطہ نہیں کہ بدی
 سے نفرت کرنے کے باوجود بھی انسان لاسکالٹر تک ہو سکتا ہے۔ مجھے اس سے
 بحث نہیں کہ تمہیں کون سے واقعات کس طرف قدم اٹھانے پر مجبور کرتے ہیں
 غرض تو اس سے ہے کہ میں رستے پر چلو وہ رستہ ٹیک ہو لیکن وقت نکلا جا رہا
 ہے۔ بھڑکانا کرنا کرتے کرتے بعد اشتباہوں کی تصویریں دیکھتے مانا کو دیر ہو گئی ہے
 تاہم وہ آ رہی ہے جیسے چھانسی کا تختہ۔ بازووں میں کرسی کا بھوگو دوڑتا ہوا
 تمہاری طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ کہو تو میں تمہاری مدد کروں۔ میں جو سب کچھ جانتا
 ہوں تمہیں بتاؤں۔ روپیہ کہاں دکھا ہے؟

مدفائیم نے پوچھا: مجھے قیمت کیا ادا کرنی پڑے گی؟
 اجنبی نے جواب دیا: میں یہ خدمت کرسی کے تنے کے طور پر کرنے کو
 تیار ہوں۔

مدفائیم سے نہ ہا گیا۔ ایک تلخ سے لہکاسن نغیر کے ساتھ مسکرایا اور بولا: نہیں
 میں تمہارا احسان کبھی نہ لوں گا۔ اگر پیاس کے سارے میری جان نکل رہی ہو اور پانی
 کا پیالہ تمہارے ہاتھ میں ہو جب بھی لہجہ میں اتنی جہت ضرور ہوگی کہ میں انکار کر دوں
 یہ میری سلعہ لوی ہی لیکن میں اپنے آپ کو بدی کے ہاتھ بیچنا نہیں چاہتا۔

اجنبی نے کہا: مرتے وقت توبہ کر لینا۔ مجھے کوئی غم نہیں۔
 مدفائیم نے زور سے جواب دیا: تمہیں اسی لیے عذر نہیں کہ تم جاننے ہو
 مرتے وقت توبہ کرنا بے سود ہے۔

اجنبی نے جواب دیا: میرا یہ خیال نہیں لیکن بات یہ ہے کہ میں ان باتوں
 کو اور ہی نقطہ نظر سے دیکھتا ہوں۔ جب دندگی ختم ہو جائے تو پھر مجھے کوئی
 دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ ایک انسان عمر بھر میرے حکم کی تعمیل کرتا رہتا ہے۔ دینداری
 کے جس میں یہ کاری چیلانا رہتا ہے یا اپنی کمزوری کے ہاتھوں مجھ پر گزند

کے کیمت میں حائل بننا ہے۔ جب اس کی غلغلی کا وقت فریب آتا ہے تو میں اس سے صوف ایک اور خدمت چاہتا ہوں۔ وہ یہ گناہوں سے توبہ کرے اور اس جہان سے مسکراتا ہوا رخصت ہو۔ یعنی میرے باقی ماندہ پیروؤں میں سے جو لوگ فداکم جو سدا میں انہیں عبت دلائے، انہیں آس گئی رہے کہ صوف خذ اذدی مرتے وقت ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ میں کہہ گیا جابر آقا تو نہیں۔ مجھے آزماؤ۔ میری مدد قبول کر دو۔ اسٹیک تم نے جو دل چاہا کیا، اب بھی جو دل چاہے کرو جگہ پہلے سے بھی زیادہ میں اور دلیندن کی زندگی بسر کرو اور جب ملت پڑنے لگے اسکو کہیں کے پر سے کینچ دیے جائیں اس وقت میں تہدی تسل کے لیے تم سے کہے دیتا ہوں۔ اس وقت صیر کے ساتھ میل کر لینا اور خدا کی آخری شفقت میں جگہ پانا کچھ بھی مشکل نہ ہوگا۔ میں اب جہاں سے آیا ہوں وہاں اسی طرح کا ایک تائب انسان بتر مرگ پر پڑا تھا۔ کمرہ ماتم داروں سے بھرا ہوا تھا جو اس کے آخری الفاظ کو بڑی توجہ سے سن رہے تھے ذہن کی میں کچھ نہ لیا۔ عالم تھا کہ مستغنا کی جھلک تک اس کے چہرے پر کبھی دانی تھی لیکن مرتے وقت اسی چہرہ پر امید کا تبسم و خشاں نظر آتا تھا۔

مد خاتم نے پوچھا: تو تم مجھے بھی اسی قسم کا مژدہ انسان بگتے ہو! تم بگتے ہو میری تنہا کی پر چارلس ہی سے کہ عمر بھر سیدہ، ری میں کزاردوں اور آخری وقت خدا کو صراحت دے کہ چھری پچھے جنت میں داخل ہو بیادوں۔ سیرا دل سو پتہ ہوئے گھبراتا ہے۔ کیا تم نے بنی نوح انسان کو ایسا ہی پایا ہے؟ یا تمہیں میرے ہاتھ خون آلودہ دیکھ کر جو پر اسس و نائٹ کا گمان ہوا ہے؟ کیا قتل کا گناہ اتنا ناپاک ہے کہ نیکی کا اس میں بالکل ہی مریجاتا ہے۔

اجنبی نے جواب دیا: قتل کو میں کسی خاص قسم کا گناہ نہیں سمجھتا۔ جس طرح تمام زندگی ایک جنگ ہے اسی طرح ہر گناہ ایک قتل ہے۔ میرے نزدیک تو تمام بنی نوح انسان کی قتل ان ملاحوں کی سی ہے جو اپنے ڈوبے ہوئے جہاز کے کتھنوں پر تیر رہے ہوں۔ کمانے کو ان کے پاس کچھ نہ ہو، فائقے کے ہاتھ سے نوالے چھین چھین کر کھا رہے ہوں۔ یہاں تک کہ مردم خودی پناہ تر آئے

ہوں۔ میری نگاہ عین اس لمحے سے کہیں پرے نکل جاتی ہے جس میں جرم کا ارتکاب ہوتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ ہر ایک کا انجام موت ہے۔ میری آنکھوں کو وہ عین بڑکی جو نافع پر جانے کے لیے ہزار داؤں سے اپنی ماں کو بے بس کر دیتی ہے اور تم جیسا قاتل دونوں یکساں خون میں تھڑے ہوئے نظر آتے ہیں میں نے ابھی ابھی کہا تھا کہ میں بدی کے نتائج کو سوچتا ہوں: یہی نہیں بلکہ میں نیکی کے مسئلے پر بھی غور کرتا رہا۔ مجھے دونوں میں سرخوفظ نظر نہیں آتا۔ مگر دونوں کی دونوں دریافتیں ہیں جن سے صحت کا فرشتہ فعل کاٹ کر لے جاتا ہے جس بدی کے لیے میری زندگی وقف ہے وہ افعال کی بدنی نہیں سیرت کی بدنی ہے۔ مجھے گناہگار انسان محبوب ہے۔ گناہ کے فعل سے محبت نہیں بڑے کاموں کا ثمرہ شاید بڑی بڑی نیکیوں کے پھل سے بھی زیادہ شیریں نکلے۔ لیکن محبت کس میں ہے کہ قروں اور صدیوں کے دشمناتے ہوئے آبنار کی تہہ تک پہنچ کر بدی کے نتائج کا مطالعہ کر سکے۔ میں جواب تمہاری دستگیری پر آمادہ ہوں تو وہ اس لیے نہیں کہ تم نے ایک کا نذر کو قبل کر ڈالا ہے بلکہ اس لیے کہ تم مہر خاتم ہو۔“

مہر خاتم نے جواب دیا: ”میں تم سے اپنے دل کا حال صاف صاف بیان کرتا ہوں۔ یہ جرم میرا آخری جرم ہے اور پشیمانی اس کے کہ یہ مجھ سے سرزد ہوا مجھے کئی سبق ملی گئے یہ خود ایک سبق تھا، بہت بڑا سبق، اب تک جو کچھ میں نے کیا وہ میری مرضی کے خلاف تھا لیکن سرکشی نے مجھ سے سب کچھ سما دیا

میں انٹراس کا مظلوم اور مجبور نظام تھا۔ بعض اوقات انسان کسی نیک کام کے لیے، دپے کا لاپٹ کر تا ہے۔ مجھے صرف پیش پندی کی بوس تھی لیکن آج مجھے اس جرم سے دولت اور عبرت دونوں چیزیں حاصل ہوئیں گیا پھر اپنے اصلی روپ میں خود کر آنے کے لیے ارادہ اور ایمان دونوں بہیا ہو گئے ہیں۔ اب میں اپنے افعال کا پورا پورا مختار ہوں اب میں بالکل بدل جانے لگا ان باتوں سے نیکی کروں گا اور اس دل کو اطمینان نصیب ہو گا۔ میری گزشتہ زندگی کے بعض جذبات پھر میری طبیعت میں بھانپ پیدا کر رہے ہیں۔ تواریک شام کو جب مگر جا کا آرگن بج رہا ہوتا یا جب کسی

مدرس کتب کی تلاوت سے سیرنی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے یا بب میں حسرت کے زمانے میں اپنی ماں سے ہاتھ کیا کرتا تھا تو اس وقت اپنی آئندہ زندگی کا جو تصور میرے سامنے تھا وہ اب چھ جو کے رہے گا۔ میں چند سال جھکتا پھرا ہوں لیکن اب مجھے منزلِ مقصود پھر نظر آرہی ہے۔

اجنبی نے پوچھا: یہ روپیہ تم سٹ بازی میں لگاؤ گے؟ جہاں میں سمجھتا ہوں تم پہلے بھی کئی ہزار مار چکے ہو۔

مار خائیم نے کہا: ہاں لیکن اب کے میرا جینا یعنی ہے۔

اجنبی بولا: اب کے تم پھر مارو گے؟

مار خائیم نے کہا: ہاں! مگر آغا روپیہ میں اپنے پاس رکھوں گا۔

اجنبی بولا: وہ بھی مار دو گے۔

مار خائیم کے ماتھے پر پسینہ چھوٹ نکلا۔ اچھا! کیا معنی ہے! فرمز کرو

میں سب روپیہ مار دوں اور فرمز کرو میں پھر منٹس اور تلاش جو جاؤں تو کیا میرا

نفس ایک حد اور بھی اٹھل، ایلوں ہی آخر تک اسٹل رہے گا اور رفتہ رفتہ نیکی کی قوت

کو سب کر دے گا؟ نیکی اور بدی دونوں زبردست ہیں اور اپنی اپنی طرف بلا رہی ہیں

مجھے دونوں سے محبت ہے۔ میں بڑے بڑے کانٹے سوزا سکتا ہوں، اپنے نفس

کو مار سکتا ہوں، نیکی کے رستے میں جان تک قربان کر سکتا ہوں اور گو میں اتنا

ذلیل ہوں کہ قتل تک سے دریغ نہ کیا لیکن مہم سے بالکل نا آشنا نہیں۔ میں

غریبوں پر رحم کھاتا ہوں (مجھ سے زیادہ ان لوگوں کی مصیبتوں کو کون جانتا ہے؟)

میں محبت کی قدر کرتا ہوں۔ میں وہ نہیں اور خوش دلی چاہتا ہوں جو ایلیناں قلب

کا تیرہ ہوئی ہے۔ دنیا کی کوئی تیرہ ہی یا کوئی اچھی بات ایسی نہیں جس سے مجھے دلی محبت

نہ ہو، تو کیا صرف بدیاں ہی میری رہنمائی کریں گی؟ اور کیا میری خوبیاں کوڑے

کرکٹہ کی طرح بے کار پڑی رہیں گی؟ ہرگز نہیں۔ نیکی بھی افعال کی رہبر ہوتی ہے۔

لیکن اجنبی نے اپنی انگلی لوہر کو اٹھائی اور پولا: تمہیں اس دنیا میں آئے۔

چھتیس سال ہو گئے۔ اس دوران میں تمہاری تمہت نے کئی دفعہ پلٹا کھایا اور تمہاری

عسیت تے کئی رنگ بدے لیکن میں چھتیس سال سے دیکھ رہا ہوں کہ تم برابر
تہذیب کی طرف جا رہے ہو۔ آج سے پندرہ سال پیشتر تم چوری کے خیال سے بھی
کانپ اٹھتے۔ آج سے تین سال پیشتر قاتل کا نام سن کر تہارا رنگ حق ہو جاتا۔ لیکن
اب کیا کوئی بھی جرم، کوئی بھی سفاکی، کوئی بھی دلت ایسی ہے جس سے تمہاری طبیعت
متغیر ہو اور پانچ سال میں تم ان سب کے ترکیب ہو چکے ہو گے۔ تم دن بدن ہستی
کی طرف جا رہے ہو اور کائنات کے اور کوئی چیز تمہیں نہیں روک سکتی۔

مارخائیم نے تہرائی ہوئی آواز میں کہا: یہ سچ ہے میں نے ایک حد تک
بدی کے احکام کی تعمیل کی ہے لیکن سب کا یہی حال ہے۔ معنی اس جہان میں
بسر کرنے کی وجہ سے پاکیزہ ترین انسان بھی دنیا کی آلائشوں سے اپنا دامن نہ
بچا سکے۔

جواب: میں تم سے ایک سیدھا سا سوال پوچھتا ہوں۔ جواب پانے
پر میں تمہاری آئندہ اخلاقی زندگی کا حال تمہیں بتاؤں گا۔ بہت سی باتوں میں تم
نیک و بد کی چنداں پروا نہیں کرتے اور لیکن ہے تم ایسا کرنے میں حق بجانب بھی ہو
بہر حال ہر انسان کا یہی حال ہے لیکن کوئی فدا سی بات بھی ایسی ہے جس میں تم اپنے
افعال کی پوری پوری تہجداشت کرتے ہو؟ یا ہر بات میں بے معافی سے کام
لیتے ہو؟

مارخائیم کو جیسے جواب سوچنے میں بے حد تکلیف ہو رہی ہو؟ بولا: "کوئی ذرا سی
بات ایسی ہے۔ نہیں کوئی نہیں۔ میں ہر طرح ذلیل ہوں۔"
اجنبی بولا: تو پھر اسی پر مطمئن رہو۔ کیونکہ تمہارا بدنانا لکھن ہے۔ دنیا کے ایسے
پر جو پاسٹ تمہیں ادا کرنا ہے اس کے الفاظ مقرر ہیں اور ان میں رد و بدل کا کوئی
امکان نہیں۔

مارخائیم بہت دیر تک چپ کھڑا رہا بلکہ دوبارہ بھی پھر اجنبی نے بولنا شروع
کیا: تو پھر تمہیں بتاؤں کہ روپیہ کہاں رکھا ہے۔؟
مارخائیم نے پوچھا: اور غور خداوندی؟

بولتا تھا: وہ تم آزما چکے ہو۔ دو تین سال ہوئے تم ہی تو تھے جسے میں نے مذہبی جلسوں کے پلیٹ فارم پر سب سے بلند آواز میں حمد و مناجات کے گیت گاتے سنا تھا۔

دارخائیم بولا: یہ سچ ہے۔ مجھے اپنا فرین ملانے کا نظر آرہا ہے۔ میں اس سبق کے لیے دل و جان سے تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ تم نے میری آنکھیں کھول دی ہیں اور میری حقیقت مجھ پر آشکارا ہو چکی ہے۔

میں اس وقت دروازے کی گھنٹی کے بجنے کی تیز آواز تمام گھر میں سنائی دی۔ اس کا رویہ بدلا جیسے گھنٹی کا بجنا پہلے ہی سے مقرر ہو چکا تھا اور وہ بس اس کے انتظار میں تھا۔

بولا: وہ ماما آگئی۔ میں نے تم سے کہا تھا تاکہ وہ واپس آجائے گی۔ اب تمہارے لیے فقط ایک مشکل کام انجام دینا باقی رہ گیا ہے اس سے کہنا تمہارا آقا بچا رہے۔ خود باکے دروازہ کھولنا۔ تمہارے چہرے سے گھبراہٹ نہیں بلکہ سنجیدگی مترشح ہونی چاہیے۔ مسکرا نا مت۔ بہت زیادہ اطمینان کا اظہار بھی نہ کرنا۔ میرے ہکے پر عمل کرو گے تو یقین مانو تمہارا راز کبھی فاش نہ ہو گا۔ بس لڑکی اندر آجائے اور دروازہ بند ہو جائے تو جس ہوشیاری سے تم نے آقا کو ٹھکانے لگایا ہے اسی طرح اس آخری کانٹے کو بھی اپنے رستے سے ہٹا سکتے ہو۔ پھر تو ساری شام اور اگر ضرورت ہو تو ساری رات پڑی ہے۔ گھر کے سب مال و اسباب کی اچھی طرح تلاشی لے لینا اور پھر مزے سے نکل جانا۔ ماما کے آجانے میں بھی ایک عجیب حکمت ہے۔ اٹھو! میرے دوست اٹھو! تمہاری زندگی اس وقت ایک نئے دھارے سے بندھی ہے۔ اٹھو! کچھ کرو!

دارخائیم اپنے صلاح کار کو خور سے دیکھتا رہا اور بولا: اگر میری قسمت میں یہ لکھا ہے کہ میری ہر حرکت بدی اور گناہ ہی کے لیے وقف ہے تو نجات کا ایک دروازہ تو اب بھی کھلا ہے۔ میں لمبے پاؤں ہلانا ہی کیوں نہ بند کر دوں؟ اگر میری زندگی ناپاک ہے تو میں اس زندگی سے دلکش ہی نہ ہو جاؤں؟ تم

ہج کہتے ہو ہیں ہر چھوٹی سے چھوٹی خواہش کا غلام ہوں لیکن لب بھی میں ایک ہی فیصلہ کن جنبش کے ساتھ ان سب خواہشات سے آزاد ہو سکتا ہوں۔ میری تقدیر میں یہی لکھا ہے کہ نیکی کی تنا کبھی پوری نہ ہو تو اچھا پونہی بھی لیکن بدی سے نفرت تو اب بھی باقی ہے اور تمہیں یہ دیکھ کر بہت ہی مایوسی ہوگی کہ میں اسی نفرت سے طاقت اور جرأت دونوں چیزیں حاصل کر سکتا ہوں۔“

اجنبی کا چہرہ بدلتا شروع ہوا۔ اس کے مذد وخال حسین و جمیل ہوتے گئے اور ایک شفقت آمیز احساسِ تسخیر کے ساتھ چمکنے لگے اور پھر فوراً ہی مدہم ہو کر غائب ہوئے لیکن مار غائم اس تغیر کو دیکھنے یا سمجھنے کے لیے ذرا بھی متوجہ نہ ہوا۔ اس نے دروازہ کھولا اور کچھ سوچتا ہوا آہستہ آہستہ بیڑیاں اتر کر نیچے آگیا۔ اس کی گذشتہ زندگی کا صاف اور صیح نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر گیا۔ خواب کی طرح بدلتا اور تکلیف دہ بے ترتیب اور بے جوڑ۔ گویا ٹکست کا ایک منظر مچھلا ہوا ہے۔ جب اپنی زندگی یوں نظر آئی تو بیسے کی بوسے باقی نہ رہی لیکن زندگی اس کے پار اسے اپنی کشتی کا ساحل دکھائی دے رہا تھا۔ دکان کے دروازے کے پاس پہنچا۔ توڑک گیا۔ دروازے میں سے جھانکا۔ شمع ابھی تک لاش کے پاس جل رہی تھی اور ایک عجیب خاموشی طاری تھی نظریں مبہوت تھیں اور دل میں دکاندار کے متعلق خیالات کا ایک بوم برپا تھا۔ گھنٹی بجے بے سببری کے ساتھ دوبارہ بجی۔

دہلیز کے پاس ماما کے رُو برو کھڑا ہوا تو چہرے پر مسکراہٹ سی تھی۔

بولا: ”پولیس کو بلا لو تو نہیں ہو۔ میں نے تمہارے آقا کو قتل کر دیا۔“

(دلی گڑھ میگزین)

گوئی جو رو

یہ ترجمہ بھی ہے اور خلاصہ بھی۔ اس دو جگہ دستبرد سے اصل کامیڈی کی سب لطافتیں فنا ہو گئی ہیں صرف کہانی باقی رہ گئی ہے لیکن صرف کہانی ہی کا متقل کن مقصود بھی تھا۔ ناطول فرانس نے اس قصے کو شہسزادہ فرانسس مصنفہا پہلے سے اخذ کیا ہے۔ راجپوت نے وہاں تھیٹر سے مستعار لیا تھا۔ گو یا کہانی دراصل بہت پرانی ہے۔ ناطول فرانس نے اسے نیا رنگ دے کر کامیڈی کی شکل میں پیش کیا۔

جو خاکہ اب آپ کے سامنے ہے اس میں خوبیاں اساتذہ کی ہیں نمایاں
میری ہیں۔ (پطرس)

پہلا ایکٹ

ہنگ نامہ پیرس کے ایک عجیب کا کمرہ

(ماسٹر آدم ایک بیروٹس سے غصے کے لیے آیا ہے۔)

آدم۔ (دھچک کر داب بجالاتا ہے) مذہبے قسمت کہ آپ سے پھر طانعات ہوئی۔
بوتال۔ واہ خوش قسمتی تو اسے میری کہیے۔ مزایا پیرس میں کس طرح آتا ہوا!
آدم۔ (دکری پر بیٹھ کر) شارتر سے آیا ہوں۔ ایک سفارش کرنے کے لیے۔
ایک نوجوان خاتون کی۔ جس کے سر پر سے ماں باپ کا سایہ اٹھ گیا ہے اس

پر بڑا ظلم ہوا ہے۔ اس کا سر پرست اس کی سب جا بڑا دہم کر گیا ہے بس اس
مقصد پر ہی اس کی تمت کا دار و مدار ہے۔ اگر جیت گئی تو کچھ ہو سکا آپ
کی فکر سے گی ورنہ.....

بوتال: اچھا اچھا ہم خود کریں گے۔

آدم: اب کچھ اپنی کہیے۔ تہائی میں دن مشکل سے گزرتے ہوں گے۔ شادی
کا ارادہ نہیں کیا؟

بوتال: تم نے نہیں سنا؟ پچھلے ہی بیٹے تو میں نے شادی کی ہے۔ ایک مہیڑیٹ کی
بیٹی سے۔ کیتھرین نام ہے لیکن میبیت یہ ہے کدو گونٹی ہے۔

آدم: تو شادی سے پہلے تمہیں اس کا علم نہ تھا؟

بوتال: معلوم تو تھا۔ بھلا یہ بات بھی کب تک چھپی رہ سکتی ہے۔ لیکن اس وقت
مجھے اس کی پرواہ نہ تھی۔ ایک تو خوب صورت دوسرے بہت سا جینرز۔ میں
نے سوچا۔ چلو ہوا کیا۔ طبیعت بھی پہلے گی روپیہ بھی لاکھ آئے گا۔ پر اب
پچھتا رہا ہوں۔ کچھ بات چیت کر سکتی تو مقدمے والوں کی خاطر مددت کرتی وہ
بھی ہماری تو افیغ کرتے، کوئی مرغیاں لاتا۔ کوئی شراب کا پیہ سے جاتا۔
لیکن اب تو حالت یہ ہے کہ گزارہ شکل سے ہوتا ہے اور میں خود بھی پڑھ رہا
اور لوہاں رہتا ہوں۔ بیوی کیا ہے۔ ایک مشین ہے۔

آدم: بہری تو نہیں۔

بوتال: نہ۔ خیر سنتی تو تم ہم سے بھی نیا دہ ہے۔

آدم: تو پھر کچھ شکل نہیں۔ اگر کوئی گونگا شخص ساتھ ہی بہرہ نہ ہو تو اس کا علاج بہل
ہے۔ آپ کے گھر کے پاس ہی ایک ڈاکٹر رہتا ہے۔ اس کا آپریشن اس بارے
میں ہمیشہ کامیاب رہتا ہے۔

بوتال: میں ابھی اس کو بلاتا ہوں۔

آدم: تمہاری مرضی۔ لیکن اس کو بلانے سے پہلے ایک دفعہ سوچ لو گونگی بورو کے جہاں
کئی نقصان ہیں۔ وہاں کوئی فائدہ سے بھی ہیں۔ (آدم چلا جاتا ہے۔) بیچ اپنے ملزم

کو ڈاکٹر کے گھر بیٹا ہے اس کے بعد سچ کی بڑی کھنکھن داخل ہوتی ہے۔
 بتالہ، کام کرنا کتنا ڈک جاتا ہے، آہ! میری جان۔ تم گھنٹیں۔ مجھے تمہاری آہٹ
 تک سنائی نہیں دی۔ تم پرپوں کی طرح خاموشی کے ساتھ گزر جاتی ہو۔ تم ایک
 خوشگوار خواب کی مانند ہو۔ تم قدرت کا ایک مجزہ ہو۔ تم میں سوائے ایک گویائی
 کے باقی تمام صفات موجود ہیں۔ اگر تمہیں گویائی کی تورت بھی عطا ہو جائے تو
 کیا تم خوش نہ ہوگی! جو جذبات اب مجھے تمہاری آنکھوں میں جھپکتے نظر آتے ہیں
 وہ تمہارے جوٹوں سے لہا ہوں گے۔ تمہاری روح بے نقاب ہو جائے گی
 تم اپنے منہ سے محبت کا اظہار کرو گی۔ اپنے شوہر کو اپنی زبان سے پکارو گی۔
 میری جان میں بتیں ایک خوش خبری سناتا ہوں۔ ایک ڈاکٹر بھی آکر تمہاری
 زبان کھول دے گا۔ تھوڑی دیر میں تم چھپانے لگ جاؤ گی۔

دکٹیریشن شامل سے بے انتہا مسرت کا اظہار کرتی ہے اس کے بعد ڈاکٹر
 آتا ہے۔ اور سب کے سب آپریشن کی تیاری کے لیے ساتھ کے کمرے میں
 چلے جاتے ہیں۔

دوسرا ایکٹ

(صبح کا کمرہ۔ شام کا وقت)

آدم، آپ نے میرے ٹوکل کے مقدمے پر غور کیا؟
 بتالہ: ایسی نہیں۔ تم جو کاخات چھوڑ گئے تھے۔ انہیں چھوڑنے تک کی فرصت نہ
 ملی۔ میں نے ڈاکٹر کو بلایا تھا۔ تمہارے شور سے پر عمل کیا۔ اب جان خدا اب
 ہے۔ ڈاکٹر نے آپریشن کیا اور میری بڑی بولنے لگی۔

آدم: خدا کا شکر ہے۔ کہا کیا اس نے؟

بتالہ: کہنے لگی۔ ذرا آئینہ دکھانا مجھے اور میری طرف متوجہ ہو کر بولی۔ میری جان! میری
 ساگرہ کے حجابے سائن کا ایک گون لادو گے نا؟۔ سائن کا گون اور ایک
 ٹوپا جس کے اندر قل کا اسٹر لگا ہو۔

آدم، اس کے بعد اس کی زبان بند تو نہیں ہوئی؛
 ہوتال: نہیں بلکہ وہ متواتر لگاتار۔ بغیر رکنے کے، بغیر کسی دستے کے بولتی رہی۔
 آدم: شروع شروع میں تو یہ نہیں ہو گا۔ برسوں کی رُک کی ہوئی باتیں سب ایک وقت
 نکلیں گی۔ بعد میں جلد فنا کم ہو جائے گا۔ میرے مقصدے کا خیال رکھیے۔
 اس خاتون کا نام بیڈی آرسلین ہے۔ خدا حافظ!

(آدم چلا جاتا ہے۔)

ہوتال: رکازات پڑھنے لگ جاتا ہے، دھوئے منہاں بیڈی آرسلین....
 کیتھرین داخل ہوتی ہے۔

کیتھرین: کیا کر رہے ہو میری جان؟ تم مصروف معلوم ہوتے ہو! تم ہینڈ مروف رہتے
 ہو۔ تم بہت کام کرتے ہو۔ دشمنوں کو کچھ جوڑنا ہے۔ میں کہتی ہوں کسی آدم
 بھی تو کیا کرو، اور بھلا یہ تو بتاؤ کہ تم کر کیا کر رہے ہو؟

ہوتال: میری جان.....

کیتھرین: کیا کوئی شذ کی بات ہے جس کے پوچھنے کا مجھے حق نہیں؟

ہوتال: میری جان.....

کیتھرین: کوئی راز کی بات ہے تو میں نہیں پوچھتی۔

ہوتال: مجھے بات تو کرنے دو۔ میں ایک مسئلے کا فیصلہ کرنے لگا ہوں۔

کیتھرین: تو بڑا ضروری کام ہونا؟

ہوتال: بہت ضروری!

کیتھرین: تو میری جان تم اپنا فیصلہ کھ میں کہہ دوں گی۔

ہوتال: مقصدے کے مقاصد یہ ہیں.... بیڈی آرسلین....

کیتھرین: میری جان تمہاری باتوں میں مجھے دلچسپی کا گناہ کیا ہے۔ یہ اتنا مشکل ہے؟

ہوتال: جے کیا معلوم۔ مجھے تو....

کیتھرین: میرا خیال ہے میری عمر کی حسرت کو ہاتھ اچھا لگے گی۔ بشرطیکہ بچہ نہ

کی بولہ اس پر چھٹے چھٹے چول ہیں۔

بتال: ممکن ہے۔ مگر.....

کتھن: اور دیکھو میری جان! تمہارے خیال میں گون کا گھیر سبت ہی زیادہ رکنا
نہی بات نہیں۔ گھیر جونا تو زیادہ چاہئے ورنہ سلام ہی نہیں ہوتا کہ کوئی کپڑا
پہن رکھا ہے لیکن اتنا زیادہ بھی فضول ہے۔ تم دیکھنا یہ فیشن بھی اڑ جائے
گا ٹیک ہے نا؟

بتال: بے شک مگر.....

کتھن: اور جوتے کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ عورت کا اندازہ ہی اس کا پاؤں
دیکھ کر لگایا جاتا ہے۔ وضعا عورتیں جوتوں کا خیال سب سے زیادہ رکھتی
ہیں۔ ٹیک ہے نا!

بتال: ٹیک ہے مگر.....

کتھن: اچھا تم اپنا فیصلہ لکھو۔ میں نہ بولوں گی۔

بتال: بہت اچھا رکازات اٹھا کر پڑھنے لگتا ہے؟ مذکورہ بالا خانوں کے سرپرست
نے خیانت جرمانہ کا مرتکب ہو کر.....

کتھن: کل ہی مجھ سے ٹیک سہلی کہہ رہی تھی کہ دنیا کا حال دن بہ دن بدتر ہوتا
جا رہا ہے۔ ہر طرف بے ایمانی پڑھتی جاتی ہے۔ لوگوں میں دیانتداری
اور شرافت نام کو نہیں۔ کیا یہ سچ ہے یا میری سہلی یوں ہی مبالغہ کرتی تھی!
یو میری جان!

بتال: مہربانی کر کے یا تو تھوڑی دیر چپ ہو جاؤ یا کہیں اور جا کر بولتی رہو۔ میرے کام
میں مہرج ہوتا ہے۔

کتھن: میری جان! تم دلینان رکھو میں بالکل کچھ نہ کہوں گی۔

بتال: اچھی بات دیکھنے لگتا ہے، "مذکورہ بالا سرپرست نے اس خانوں سے
بہت سارے پیسے....."

کتھن: میں کبھی کسی سوچتی ہوں چیزیں ہنگی کتنی ہونگی ہیں۔ پھر بھی تو ہم لوگ
کفایت شمار ہی نہیں کرتے۔ دسترخوان پر جب تک دس دس کمانے نہ ہوں

چین نہیں آتا۔ میں تو بھتی ہوں تھوڑی سی سینٹی، تھوڑا سا گوشت، اور ایک
 مینٹی چیزیں یہ کافی ہونا چاہیے۔ لیکن لوگ پٹو بھی تو بہت ہوتے جاتے ہیں۔
 میری جان! تم کو ایسے لوگوں سے نفرت نہیں ہوتی؟ اور یوں کھانے کو کس
 کا ہی نہیں پاہتا۔ کھانے کے بغیر گزارہ کس طرح ہو؟ لیکن ذرا سوچو تو۔ لوگ
 کیسی کیسی بد مزہ اور خلیط چیزیں کھاتے ہیں۔

ہتال: میں بالکل پاگل ہو جاؤں گا۔ میں پاگل ہو جاؤں گا۔
 کیتھرین، میری جان! میں اب اور کچھ نہ کہوں گی۔ مکن ہے تمہارا مزاج ہوتا ہو۔ میں
 زبان تک نہ بلاؤں گی۔
 ہتال: تمہاری مہربانی۔

(وقفہ)

کیتھرین: دیکھا میری جان! میں اب کچھ کہتی ہوں؟ بالکل سب بیٹھی ہوں۔
 ہتال: ٹھیک۔
 (وقفہ)

کیتھرین: اب تو تمہارا مزاج نہیں ہوتا؟
 ہتال: بالکل نہیں۔
 (وقفہ)

کیتھرین: اب اطمینان سے اپنا فیصلہ لکھو۔ کیا ختم نہیں ہوا ابھی؟
 ہتال: اگر تم نے ہونا بند نہ کیا تو کبھی ختم نہ ہو گا (لکھنے میں مصروف ہو جاتا ہے)
 کیتھرین: (یک طرفت کھڑی ہو جاتی ہے) سوز! معلوم ہوتا ہے کہیں آگ لگی ہے لوگوں
 کا شوق سنائی دے رہا ہے (ہتال کھڑا ہو جاتا ہے) نہیں نہیں۔ میں فطلی پر
 ہوں۔ خلا کا شکر ہے آگ نہیں لگی۔ توبہ توبہ جب کہیں آگ لگتی ہے تو کیسی
 مہیبت ہوتی ہے۔ گھروں میں کہرام مچ جاتا ہے۔ لوگ اپنا اسباب دیا میں
 چینگ دیتے ہیں اور کھڑکیوں میں سے کود کر باہر نکل آتے ہیں۔ خوف
 اور ڈر کے مادے لوگ دیوانے ہی ہو جاتے ہیں۔

ہوتال: بس اب اس سے زیادہ برداشت کتنا ممکن ہے اگر یہی حالت رہی تو مجھ سے کوئی شدید جرم سرزد ہو جائے گا۔ (نوکر کو آواز دیتا ہے) دیکھو جا کر ڈاکٹر صاحب کو ابھی بلا لاؤ۔ کہو کہ بہت ضروری کام ہے۔ فوراً آجائے۔

کیتھرن: کیا ہے میری جان! تم کچھ پریشان معلوم ہوتے ہو۔ موسم کی خرابی ہے یا کھانے میں کچھ نقص تھا؟

ہوتال: اسے کاشش! میں نے تمہاری زبان نہ کھلوائی ہوتی۔ لیکن گھبراؤ نہیں ابھی ڈاکٹر آکر اپنی سیمائی سے تمہاری زبان چھریا کر دے گا۔ (کاغذ اٹھا کر کیتھرن کے منہ پر مانتا ہے۔ کیتھرن چھینیں مارتی ہوئی کمرے سے باہر نکل جاتی ہے۔ ڈاکٹر داخل ہوتا ہے)

ہوتال: ڈاکٹر صاحب! مجھے آپ کی سخت ضرورت ہے۔ میں نے آپ کو اپنی بیوی کے علاج کے لیے بلا ہے۔

ڈاکٹر: کیا انہیں کوئی تکلیف ہے؟

ہوتال: اسے؟ اسے کیا تکلیف ہوتی۔ بہت تمہرے سیدھے مظلوم تھیں ہوں۔

ڈاکٹر: تکلیف آپ کو ہے علاج آپ اپنی بیوی کا کرانا چاہتے ہیں!

ہوتال: ڈاکٹر صاحب اسے گریانی کی حالت آپ نے بخشی تھی تو اس قدر فیاضی سے کیوں کام دیا تھا۔ کیا اس کی زبان کسی طرح بند ہو سکتی ہے؟

ڈاکٹر: بالکل نامکن! بولتے ہوئے آدمی کو گزنگا بنانا میری قدرت سے باہر ہے۔

ہوتال: آپ نے میرا دل توڑ دیا ہے میں اجڑ گیا اب تو میں صرف یہی کر سکتا ہوں کہ اپنے گلے میں ایک بھاری سا پتھر باندھ کر دریا میں کود پڑوں۔

ڈاکٹر: تمہاری بیوی کا تو کوئی علاج نہیں البتہ تمہارا علاج ہو سکتا ہے۔

ہوتال: وہ کیسے؟

ڈاکٹر: بہت بولنے والی بیوی کا دماغ تو صرف یہی ہے کہ شوہر کو بہرا بنا دیا جائے

میرے پاس ایک سفید سفوف ہے جسے کان میں ڈالتے ہی انسان ہمیشہ کے

یہ بہرہ ہر جاتا ہے۔

- ہتھال، جیشہ کے لیے !

ڈاکٹر: جیشہ کے لیے !

ہتھال: نہیں مجھے یہ ہرگز منظور نہیں۔ میں ہیرا ہننا نہیں چاہتا۔
(ڈاکٹر میں داخل ہوتی ہے)

ڈاکٹر میں: ایلو! یہاں تو ڈاکٹر صاحب آئے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر: بیگم آپ کو اب بولنے میں تکلیف تو نہیں ہوتی؟

ڈاکٹر میں: ڈاکٹر صاحب! میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ شروع شروع میں تو صرف چند فقرے ہی بل سکتی تھی۔ لیکن اب روانی کے ساتھ گفتگو کر سکتی ہوں۔ تاہم میں ضرورت سے زیادہ نہیں بولتی۔ ابھی ابھی میرا شوہر کام کر رہا تھا۔ میں ٹپ ٹپ پاس بیٹھی تھی لیکن پھر میرے شوہر کو شکایت ہے کہ تمہارے بولنے سے میرے کام میں جربح ہوتا ہے (شوہر سے مخاطب ہو کر) میری کجگیاں نہیں آتا کہ تم ناراض کس بات پر؟ آخر وہ جو کیا ہے؟ کوئی بات تو ایسی ضرور ہے جو تم مجھے نہیں بتاتے! اللہ مجھے کہہ تو بتاؤ۔ میرا فرض ہے کہ میں تمہاری آسائش کا خیال رکھوں۔ اگر مجھ سے کوئی خدلی ہو گئی ہے تو میں آئندہ کے لیے احتیاط کروں گی۔ میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم رنجیدہ نہ ہو۔ اماں جان کو خدا بہشت نصیب کرے کہا کرتی تھیں کہ میاں بیوی کو ایک دوسرے سے کوئی بات نہ چھپانی چاہیے۔ بے چاری سچ کہتی تھیں۔ دل میں کبھی کوئی بات نہ ڈھکنی چاہیے۔ جو جو صاف صاف کہہ دینا چاہیے۔ میرا خا جانتا ہے میں نے کوئی قصور نہیں کیا اگر پھر بھی تمہارا یہ خیال ہے کہ میں گھٹکار ہوں تو بے شک ڈاکٹر کے سامنے سب حال بیان کر دو۔

ہتھال: (بے بسی ہو کر) ڈاکٹر صاحب! خدا کے واسطے وہ سفید صوف میرے کان میں ڈال دیئے۔ (ڈاکٹر ہتھال کے کان میں سفوف ڈال دیتا ہے)

ڈاکٹر میں: میری جان۔ میرے سرتاج! آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ کیا میں ایسا ہی بے رحم ہوں کہ میں تمہیں ستاؤں! میں نے تم سے کبھی کوئی دغا کیا

ہے؛ کبھی نہیں دھکا دیا ہے؛
 بوتال: (دونوں پر تاڑھے کر) آہ! زندگی کس قدر شیریں ہو گئی ہے! مجھے اب
 ایک لفظ بھی سنائی نہیں دیتا۔
 کیتھرین: بوتال! میری بات سنو! میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ میں تمہیں اپنے
 دل کا حال سناتی ہوں۔ میرا دل بچپن ہی سے دم تھا۔ جب میں سات سال
 کی تھی۔ تو میرے پاس ایک چوٹا سا کتا تھا..... سن رہے ہو؟ میری جان!
 میری روح! میرے شوہر! (بوتال کو بھنبھوڑتی ہے)
 بوتال: زندگی اب ایک جہت ہے۔

(تاریانہ)



صید و صیقا

۳۔ دسمبر ۱۸۸۲ء کو رات کے وقت پیرس کا ایک نوجوان دیانے سین کے قدیمی
 پل پر چلا جا رہا تھا۔ اس نے اس جہانِ فانی سے ہمیشہ کے لیے اپنا تعلق منقطع کرنے کی
 ٹھان رکھی تھی۔ اس کے قدم نہایت آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے اور جوں جوں وہ
 اپنی منزل کے قریب پہنچتا جاتا، اس کے دل میں اطمینان اور سکون بڑھتا جاتا تھا۔
 یہ نوجوان (جس کا نام ایڈمنڈ سیوین تھا) جب پل کے عین وسط میں پہنچ گیا تو
 جھگے پر اتر کے دریا کے سیاہ پانی کو کھوئی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس کا جسم
 ذرا کانپا۔ اس کے دل کی دھڑکن ایک لمبے کے لیے تیز ہوئی لیکن پھر وہ سنبھل گیا اور
 خافلانہ انداز میں اپنا اور کوٹ اتارنے لگا۔

اور کوٹ کو ہتھ کر کے اس نے زمین پر رکھ دیا۔ تھوڑے سے تامل کے بعد
 اس نے جھگے کو مضبوط پکڑ لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ دریا میں کود پڑنے ہی کو
 تھا کہ کسی نے اسے کندھے سے پکڑ لیا اور اس کے کانوں میں آواز آئی " ذرا
 ٹھہر جائیے حضرت !"

اس صوت کے تمتائی نے اسے اپنی کے ہاتھ کو ایک جھکا دے کر بٹا دیا اور
 پھر چھلانگ مارنے لگا لیکن لب کے بار اس کے کندھے کو دو ہاتھوں نے زور
 سے کبچ لیا اور پھر وہی آواز آئی " حضرت ! ذرا ٹھہر جائیے، صرف ایک گھنٹے کے
 لیے ٹھہر جائیے کیا اتنا بھی آپ کو بیت معلوم ہے؟"

سیوین نے مڑ کر دیکھا جس نے وہی انہی کے کندھے کو ایک دہلا پتلا سا آہمی تھا۔ چہرے کے
 نقش ہیک جن پر نیکی یا بدی کسی صفت کی کوئی تحریر نہ تھی صرف ایک قفلے سا تھا۔ آواز

اس آدک وقت میں بھی نہایت مطمئن معلوم ہوتی تھی۔
لیکن بوسیدہ سیوین کو غصہ سا لگیا اس نے اپنے دل کو جس عنت سے خودکشی پر
آگاہ کیا تھا، اس کا یوں رائیگاں جانا اسے ہنگام معلوم ہوا۔
وہ جھٹا کر بولا: آپ جوتے کون ہیں؟

اجنبی نے کہا: "حضرت یہی تو میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔ میرا ایک کام ہے
جو پیرس بھر میں سوائے آپ کے کوئی نہیں کر سکتا ورنہ میں کاہے کو عمل ہوتا
جلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ اگرچہ آپ کا خودکشی کا طریقہ نہایت سبباً سببے لیکن میں
کیوں دخل دیتا۔ لیکن بات یہ ہے کہ اس وقت ایک خاتون کو آپ کی امداد کی بہت
مضرت ہے مگر یہ بہت: ہوتی تو آپ یقین جانیئے میں کبھی ہوں آپ کو تکلیف
نہ دیتا۔"

سیوین بڑی درشتی سے ہنس کر کہنے لگا: "قوم نے میرے پاس آنے میں غلطی
کی ہے۔ ایک عورت ہی کی خاطر تو میں یہ (اس نے دریا کی طرف اشارہ چلا دیا) عورت
کی جنس کو میں یہاں جان کا خزانہ ادا کرنے آیا ہوں۔ اس سے نیا وہ میں
کیا کر سکتا ہوں؟"

اجنبی بولا: "تصور ایک عورت کا اور آپ سب عورتوں کو الزام دے رہے
ہیں۔ آپ انکار نہ کیجئے میں آپ کے منہ سے "نہ" نہیں سن سکتا۔ دوبارہ میں
آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ بیک خاتون کی پہل کے مدد کیجئے۔ ایک نوجوان
خاتون کی۔ ایک حسین خاتون کی۔ آپ اپنے سفر کو بیک گنڈہ تک طوسی کر دیجئے۔ بعض
ایک گنڈہ تک، کیا یہ بہت نیا وہ ہے؟ اس وقت اسے لے کر اب تک جتنا بھی نمانہ
ہے آپ اس کے مالک و مختار ہیں۔ کیا آپ اس میں سے بیک گنڈہ بھی کسی کو
نہیں نہیں سکتے؟"

سیوین باوجود دلانہن ہونے کے اجنبی کی باتوں کو خور سے سننے لگا تھا پر چچا
"تم مجھ سے کیا پاتے ہو؟"

اجنبی نے کہا: "یہ دیکھئے میں ابھی آپ سے کہتا ہوں۔ یہاں سووی ہے آپ

اتنی مہربانی کیجئے کہ اپنا اور کوٹ پہن بیٹھے۔ اور میرے ساتھ اس شراب خانے تک پہنچا بیٹھے۔ وہ جہاں سُرخ رگشتی نظر آ رہی ہے جو کچھ بگے بنا ہے کاپ وہاں پہنچ کر سن بیٹھے۔ اگر اس سے آپ کی نشانی نہ ہوئی تو آپ عدت تک وہاں آہا بیٹھے اس میں ہے ہی کیا؟

سیوین نے صیحا کو ایک نظر دیکھا اور اجلی کی بات مان لینے کو تیار ہو گیا۔ اپنا کوٹ پہنا اور ساتھ چل دیا۔

اجنبی نے کہا: ”شک ہے کہ آخر کاساپ بچے مل گئے ورنہ خدا جانے میں کہاں ماما ملا پھرتا۔ آج رات بچے آپ سے پہلے دعاوی آپ ہی کی طرح کھڑے تھے لیکن وہ کسی کام کے نہ تھے۔ بد قبیل کہیں کے میری سنی ہی نہیں میں کرتا کیا۔ اس وقت وہ دونوں دوسری دنیا میں ہیں۔ اور شاید تمنا کر رہے ہیں کہ کسی طرح وہاں پر پہنچ جائیں۔ لیکن آپ بالکل میرے مطلب کے آوی ہیں۔ یہ بیٹے ہم پہنچ گئے یہ شراب خد ہے تو پھر ٹاسا لیکن کیا معائنہ ہے... پتلے آپ صاحب“

دونوں کمرے میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے اور ایک دوسرے کو غور سے دیکھنے لگے۔ اجنبی کی شکل پہلے کی بہ نسبت زیادہ عقاب سے مشابہ اور دیا و تھکر مہم ہوتی تھی۔ لیکن یوں دیکھنے میں بڑا نہ تھا۔ مویسیویون کپڑوں کی عمر کا نوجوان تھا۔ چہرے کے نقش نفیس ترشے ہوئے، لباس پیرس کے دیباہوں کا، رنگ ذرا زرد۔

بولتا: ”تو تمہارا مقصد کیا ہے؟“

اجنبی نے کہا: ”مجھے اپنا مقصد تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ چل کے ”شیر نکاری“ کیلئے ”شیر نکاری“ کے کیل سے تو آپ واقف ہوں گے؟“

”نہیں؟“

”انوس! انسان اپنی شہرت پر کیا جھروسہ کر سکتا ہے۔ تو حضرت آپ نے میرا نام تو یقیناً سنا ہوگا؟ مجھے یوں کہتے ہیں:“

سیوین نے کہا: ”جتنے جاؤ۔ میں نے تمہارا نام کبھی نہیں سنا۔“

یول، ایوسی کے بچے میں بولا: بب تو مجھے بہت ہی افسوس ہے۔ تو جناب
سنئے۔ جو عظمت اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا چاہیں ان کے لیے میں نے ایک ایسا
طریقہ ایجاد کر رکھا ہے۔ جس پر انہیں کسی طرح ملامت نہ ہو سکے۔ مگر آپ کو
اس بات کا علم ہونا تو آپ دیا نئے سین کے پاس جانے کی بجائے یقیناً میرے
پاس آئے۔ اگر اشتہار دینے میں مجھ سے کئی دقیقہ فرو گذاشت ہو گیا ہے تو یہ میرا
قصور نہیں۔ میں مجبور ہوں۔ میرا کام ہی ایسا ہے لیکن میرا خیال تھا کہ آپ نے معزز
طبقات میں میرا ذکر ضرور سنا ہو گا۔“

سہوین نے کہا: ”جو کچھ تمہیں کہنا ہے جلد ہی کہو۔ آدھ گھنٹہ سے زیادہ گزر چکا ہے
اور مجھے ابھی تک کچھ پتہ نہیں چلا۔“

یول نے کہا: ”میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ دیکھئے نا۔ آخر ایک موجود بھی سینے
میں دل رکھتا ہے اس کے بھی حیات کو مدد پہنچ سکتا ہے تو صاحب بات یہ بت
کہ آپ جانتے ہیں انسان ایک حیوان سمون ہے۔ تمدن حقوق و فرائض کے باہمی
تعلقات کا نام ہے پسند فرائض ایسے بھی ہیں جن کو زندگی کے آخری لمحوں میں بھی
پورا کرنا ضروری ہے۔ سوسائٹی کا اقتضا یہی ہے کہ آپ کو دنیا سے یوں اکیلے جانا
مناسب معلوم ہوتا ہے جب کہ کئی لوگ ایسے موجود ہیں جو آپ کو تشریف لے جانے
میں مدد دینے کے لیے تیار ہیں۔ تیار کیا؟ خواہش مند ہیں۔ جن کی مدد سے آپ کے
دورانِ آخری کو نہ صرف زیادہ پر لطف بلکہ زیادہ خوبصورت بنایا جاسکتا ہے۔ اس
سن آفرینی کے لیے میں نے ایک معمولی سا کیل ایجاد کیا ہے جس میں دو کھلاڑی اعلیٰ
درجہ کا لطف حاصل کر سکتے ہیں اور ان میں سے ایک کا انجام قطعی یقینی ہوتا ہے
زندگی سے تنگ آئے ہوئے دو آدمی آپس میں قرعہ اندازی سے فیصلہ کر لیتے ہیں
کہ کون شیر ہے اور کون شکاری۔ اس کے بعد شیر اپنے گلے میں ایک فخری
گھنٹی باندھ لیتا ہے اور شکاری ہاتھ میں ایک ہاتھ میں ایک بھرا ہوا پستول لے
لیتا ہے۔ کمرے کے تمام چراغ گل کر دیئے جاتے ہیں اور صید و صیاد کو تہنائی
میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ پھر شیر کی مرضی کے مطابق موسیقی سے اس کی سامنے نوازی

کی جاتی ہے پھر کوستی بند ہو جاتی ہے شیر کی حرکت سے اس کے گلے میں لگی ہوئی گھنٹی بجتی ہے۔ شکاری اندھیرے میں فائر کرتا ہے ایک دفنہ اور پھر ایک دفنہ اور۔ پھر پراخ روکشن کر دیتے جاتے ہیں اگر شیر زخمی ہو گیا تو وہ یقیناً مر جاتا ہے کیونکہ سب گولیاں زبر آلود ہوتی ہیں۔ اگر وہ پرح جائے تو گھنٹی اس کے گلے سے اتار کر شکاری کے گلے میں باندھ دی جاتی ہے اور یہ کھیل پھر سے شروع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کھیل جاری رہتا ہے حتیٰ کہ ان میں سے ایک رخصت ہو جاتا ہے۔ پہلے پہل صرف مردوں میں اس کھیل کا رواج تھا۔ لیکن جب اس کی شہرت بہت بڑھ گئی۔ تو ایک خاتون نے بھی اس میں شرکت کی درخواست کی۔ یہ بدعت کسی قدر پسند کی گئی۔ اب جہاں تک ممکن ہو سکے۔ ایک مرد کو ایک عورت کا شریک بنایا جاتا ہے۔ عام طور پر وہ دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوتے ہیں۔ تو صاحب اس کھیل کو بہت پسندیدگی نصیب ہوئی ہے۔

میں نے اس میں ایک دو بدعتیں بھی کی ہیں۔ مثلاً میں کبھی کبھی ایک خالی کار توں بھی بھر دیتا ہوں۔ سوائے میرے اور کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ کون سا کار توں خالی ہے۔ اس سے ذرا لطف اور بھی بڑھ جاتا ہے معزز معززات اور معزز خواتین کو اب اس بات کی ضرورت نہیں کہ وہ دریائے سین میں پڑنے سے چائیں۔ وہ اب اس پر لطف موت کو ترجیح دیتے ہیں :-

سیوین نے پوچھا :- لیکن تمہاری اس ہرزہ سرائی کو مجھ سے کیا تعلق ؟ اگر

مجھے اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا منظور ہے تو یہ میرا اپنا ذاتی معاملہ ہے۔ تم اس میں کیوں دخل دیتے ہو ؟ میں سمجھتا ہوں تمہیں اس فیج فعل کے لیے کسی کسین کی توقع ہے تو وہ پھر تم کو مجھ سے دخل میں واپس پل پر جارہا ہوں اور نہیں سمجھتا کہ کیسے ہی تمہارا ممنون ہوں :-

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اپنی ٹوپی کے لیے ہاتھ بٹھایا۔

یول نے نوجوان کا کوٹ پکڑ کر کہا "خدا کے لیے پانچ منٹ یہاں اور بیٹھ جائیے۔ میں آپ سے کوئی نہیں مانگتا۔ آج رات ایک ڈیوٹ اور ایک خاتون

کہا آپس میں یہ کھیل کھینا تھا۔ خاتون تو پتہ گئی ہیں لیکن ڈیوگ صاحب اب تک تشریف نہیں لائے ان کے بغیر کھیل کیسے کیسا جاسکتا ہے اس طرح کا واقعہ کبھی پہلے پیش نہیں آیا۔ اس میں میری سمیت جنہاں ہے۔ دربار میں یہ خبر پہنچی تو میری ناموری میں خلل آجانے لگا۔ آپ چل کر ڈیوگ کی جگہ لے بیٹھے اور مجھے اور اس خاتون کو اپنا شرمندہ احسان بنائے اگر خدا نخواستہ آپ اس کے نشانے سے بچ گئے تو آپ اس پر احسان کر کے وہیں تشریف لے آئیے :

سیدہ نے گبرا کے پوچھا : تم چاہتے ہو میں اس کی جان لوں ؟
یوں نے کہا : یہ کیا مزہدی ہے۔ ممکن ہے آپ اس کا نشانہ بن جائیں۔ آپ یہ بتائیے کہ آپ کو دونوں میں سے کون سی بات پسند ہے۔ چٹم زون میں ایک عین خاتون کے ماتحتوں مر جانا یا ایک دریا میں پڑے مڑتے رہنا۔ جہاں اس بات کا خطرہ بھی ساتھ لگا ہے کہ کوئی خدائی فوجدار آکے آپ کو نہ بچائے۔ کس قدر شرم کی بات ہے۔ میرے دل آپ کی قتل کو کم از کم یہ خیال تو ہو گا کہ آپ کی موت دل پسند صحبت میں واقع ہوئی ہے۔

سیدہ نے کہا : ممکن ہے میں جانبر ہونے کو ایک عین عورت کے قتل پر ترجیح دوں۔ تمہیں تمہاری ایجاد مبارک ہو، جس کی بدولت تم نے خدا جانے کتنے انسانوں کو پیشین اندخت مار دیا ہے :

موجودہ جلا حضرت آپ بہت کچھ لگا ہی سے کام لے رہے ہیں آپ کے الفاظ سے مجھے مدد پہنچا ہے لہذا آپ خود تو فرمائیے۔ میں نے کس کو جا کر کہا کہ تم قبل از وقت مر جاؤ۔ میرے پاس تو وہی لوگ تشریف لاتے ہیں۔ جنہوں نے مر جانے کا معصوم ارادہ کر لیا ہوتا ہے۔ اس کا فائدہ کیا ؟ یہ سننے دجیب سے ایک پکٹ بک نکال کر یہ میرے ہی کاتے کا صاب سنئے۔ آج تک کل بیاسی فرمائشیں ہو چکی ہیں جن میں سے ۷۲ مردوں کی تھیں۔ اور تیس عورتوں کی۔ کل بیاسی باذیاں کھلی جا چکی ہیں ! بیاسیس اموات۔ اب حضرت ! اگر میرے مرتے اپنا طریقہ و مرگ خود سوچتے تو اموات کی تعداد اس سے قریباً گنی ہوتی ہے نہیں ! جناب عالی ! میں توسلح بنی

نوع انسان ہوں تو جانیں پہانتا ہوں :-

سیون نے کہا :- اور تجھے اس بات کا خیال نہیں کہ جو لوگ تمہاری بازی کے بعد زندہ بچ جاتے ہیں۔ وہ پھر کسی اور طرح خودکشی کر لیتے ہیں :-

” حضور مجھے معاف کیجئے۔ آپ پھر غلطی پر ہیں۔ پہلی اکتالیس بازیوں میں سے جو زندہ بچ گئے مکن تھا کہ وہ سب آپس میں پھر یہ کھیل کھینے حتیٰ کہ ان میں سے صرف ایک باقی رہ جاتا۔ لیکن ہوا یوں کہ زندہ بچ جانے والوں میں سے صرف ایک نے دوبارہ مرنے کی خواہش کی۔ اس ایک کے ماسوا باقی سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور جاتے ہوئے میرا شکریہ ادا کرتے گئے۔ اندھیرے میں گول کے چلنے کا ڈر ایک مختصر، مگر شدید انتظار مرگ۔ مجرد نش کا گھناؤنا نظارہ۔ یہ ایسی ہیبت ناک باتیں ہیں کہ جو لوگ زندہ رہ جاتے ہیں وہ پھر فیصلہ کر لیتے ہیں کہ مرنا ہے تو گھر میں جا کر جمعی موت ہی مریں گے۔“

حضور! اگر آپ چل کر اس خاتون کے سر پر تھوڑا سا احسان کر دیں اور خوش قسمتی یا بد قسمتی سے آپ اس کی گولیوں سے بچ جائیں تو مجھے یقین ہے کہ آپ خدا تعالیٰ کا شکر یہ ادا کریں گے کہ آپ زندہ بچ گئے :-

سیون نے کہا :- خیر یہ بات تو غلط ہے لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ قبائلی باتیں بہت دلچسپ ہیں مختصر یہ کہ میں یہ کھیل کھیلنے کو تیار ہوں بقول تمہارے زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ میری موت چند گھنٹے دیر میں آئے اور کیا؟

یوں بے انتہا سورد ہوا اور بڑے لمبے دار فقروں میں شکر یہ ادا کرنے لگا۔

سیون نے اس کی بات کو کاٹ کر کہا :- بل ادا کرو اور چلو چلیں۔ بہت وقت

صالح ہو چکا ہے :-

شراب خانے سے نکلے تو یوں آگے آگے چلنے لگا۔ چلتے چلتے وہ تنگ و تاریک گلیوں میں پہنچ گئے۔ جہاں کہیں کہیں ایک آویزاں لمپ کی ناکام روکشنی رات کی سیاہی کو اور بھی تاریک کر دیتی تھی۔ یوں نہایت کمائی سے باتیں کرتا جاتا تھا شاید اس ڈر سے کہ کہیں اس کا سامنی خاموشی سے گھبرا کر واپس چھو جانے کا ارادہ نہ

کمرے - دن بھر کی تازہ خبروں پر تبصرہ کرتا رہا۔ کبھی حد پار نہ تھی کے معاملات پر اور کبھی تازہ ترین ڈرامے کے متعلق کہ فلاں ایجنٹس نے بہت بڑی طرح ایکٹ کیا۔ اور گاتے وقت بے سری ہو گئی۔ اور جب اس طرح کی باتیں ختم ہو چکیں تو اس نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور چاند ستاروں کے متعلق ایک تعریف شروع کر دی۔ سیوین بالکل خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔

کوئی بیس منٹ چلنے کے بعد وہ ایک کشادہ بازار میں پہنچے اور ایک کسی قدر بڑے گھر کے دروازے کے سامنے آکر ٹھہر گئے۔ یول نے ایک گھنٹی کی رسی کو پکڑا کر کھینچا۔ توڑی دیر کے بعد دروازے کی ایک کھڑکی میں سے کسی نے باہر جھانکا اور آواز آئی "کون ہے؟"

یول نے کہا "میں ہوں دروازہ کھولو"

دروازہ کھلا اور یہ دونوں اندر داخل ہوئے۔ یول نے پوچھا "وہ خاتون ابھی یہیں ہیں؟" جواب ملا "ہاں صاحب"۔ ڈیوک آئی ہیں؟" جواب ملا۔ "نہیں صاحب"

یول نے اپنے ساتھی کی آستین پکڑ کر کہا "آئیے"

دونوں ایک کمرے میں داخل ہوئے جہاں ایک بربط دیوار کے ساتھ لگا کھڑا تھامیز پر ایک رُباب رکھا تھا۔ اور کرسی پر ایک عودت سونی پڑی تھی۔ شکل حسین ز تھی۔

سیوین نے پوچھا "کیا یہی وہ خاتون ہیں؟"

یول نے کہا "نہیں صاحب! یہ تو بربط بجانے والی عورت ہے۔ انتظار کرتے کرتے تھک کر سو گئی ہے۔ وہ خاتون تو ہاتھ کے کمرے میں ہیں۔ آپ اپنی ٹوپی اور بادہ اتار کر یہاں لٹکا دیجئے اور یہ ایک معمولی سی رسم ہے اسے بھی پورا کر دیجئے مگر یہ نیم نقاب بن بیٹے۔ گنہامی میرے یہاں کاسب سے مقدم معمول ہے ٹیک۔ ادا کر کو تشریف لائیے"

ساتھ لاکر پہلے کمرے سے بڑا تھا۔ فرنیچر توڑا۔ مگر جس قدر بھی تھا اچھا

تھا۔ ایک دیوار تصویروں سے بالکل عاری تھی۔ انگلیٹھی میں لکڑیاں جل رہی تھیں اور آگ کے سامنے ایک تختہ تباہی نیمی بکس پہنے بیٹھی تھی۔ ددو ترہ کھلا تو وہ چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی اور کہنے لگی: اب آجھی چکو۔ اتنی دیر کر دی تم نے۔ اگر میرا دل مضبوط نہ ہوتا تو میں کب کی واپس چلی گئی ہوتی۔“

پول نے کہا۔ بیگم صاحبہ میں تہ دل سے معافی کا خواستگار ہوں۔ مجھے کوششکلات پیش آگئی تھیں جن کی وجہ سے میں رُک گیا۔ یہ میرے ساتھ جو صاحب ہیں۔ یہ لہن بے وفا حضرت کی قائم مقامی کریں گے جو آنے کا وعدہ کر کے نہیں آئے۔ اب قاعدے کی رو سے آپ کو آدھ گھنٹہ دیا جاتا ہے۔ آپ اس میں ایک دوسرے سے واقفیت پیدا کریجئے یا دُنیا کے لیے کوئی پیغام چھوڑنا ہو تو وہ لکھ ڈالیئے۔“

مسست نے اٹھ کر کہا: نہیں میں ضرورت سے زیادہ انتظار کر چکی ہوں۔ یہ ابھی اور انتظار کیا معنی؟ اجنبی صاحب اگر ہم قاعدے کی خلاف ورزی کر کے یہ آدھ گھنٹہ استعمال میں نہ لائیں تو آپ کو اس میں کیا اعتراض ہے؟

سیون نے کہا: سچ بات یہ ہے کہ تھوڑی دیر میں فوراً اس دُنیا سے رخصت ہو جانا چاہتا تھا لیکن کچھ پول کی باتوں کا اور کچھ آپ کی ملاقات کا مجھ پر یہ اثر ہوا کہ مجھے تعبیل کا کوئی فائدہ معلوم نہیں ہوتا۔ آپ یہ آدھ گھنٹہ ٹھہر جائیئے مجھے آپ سے یہ درخواست کرنے کا حق ہے۔ کیونکہ آپ ہی نے میرے اصل ارادے کو ردیم برجم کر دیا ہے۔ آپ نہ ہوتیں تو میں بس وقت دیکھتی تہ میں پڑا ہوتا یا بہ کر سیور سے تک پہنچ گیا ہوتا۔“

خاتون نے کہا: جس طرح آپ کی مرضی ہو صاحب! لیکن انہوں نے کہ میں اس وقت اپنی رفاقت میں کوئی دل پذیری پیدا نہیں کر سکتی۔“

چند منٹ تک کمرے میں بالکل خاموشی رہی۔ جس میں سیون اس حسینہ کے چہرے کا مطالعہ کرتا رہا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ نقاب نے چہرے کے بالائی حصے کو مستور کر رکھا تھا۔ لیکن چہرہ کی ٹھوڑی کی گولائی، بونٹوں کی کان، چھوٹے چھوٹے کاؤں کی خوبورتی جو گنگرہ بیلے جال میں سے جھانک رہی تھی۔ اس بات کے لیے

کافی تھیں کہ سیوین نقاب پوش حصے کے متعلق حذر کرنے لگ جائے شاید خاتون بھی اسی طرح اس کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ پھر حال ان کی آنکھیں کبھی کبھی چارہ ہو ہی جاتی تھیں۔

اتنے میں خاتون بولی: "جناب! اُم میں اپنی زندگی کے آخری اگٹھے ہی گزارنے ہیں تو بس کیل کے ہی گزاروں۔ دو گٹھے خاموش بیٹھی رہی ہوں۔ خدا میرے دل کو بچنے دینے۔ خدا کے لیے بات ہی کیجئے۔"

سیوین نے کہا: "بیگم! بسرو چشم کیا بات کہیں۔ اچھا استعارے میں بات کرنا ہوں۔ جب میں ادھر کو آ رہا تھا تو راستے میں پول سٹندوں کے متعلق باتیں کرتا رہا تھا۔ ایک طرف کو زہرہ دکھائی دے رہی تھی۔ پول نے مجھ سے پوچھا تھا: "یہ زہرہ یہاں کیسے آگئی؟" اسی قسم کا ایک سوال اس وقت میرے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ زہرہ یہاں کیسے آگئی۔ کیا دنیا میں کوئی ایسا دل باقی نہیں رہا جسے توڑا جا سکے۔ کوئی ایسا انسان موجود نہیں جو من کا فریب کھا سکے۔ دلوں کے توڑنے کا مشغلہ اسی قدر دل چسپ ہے جس قدر یہ کیل جو ہم کینے والے ہیں۔ اس کی طرح اس میں بھی صرف ایک ہی آدمی مجروح ہوتا ہے۔ میں پھر پوچھوں گا کہ زہرہ یہاں کیسے آگئی؟"

خاتون نے جواب دیا: "جناب معلوم ہوتا ہے آپ کو تشبیہوں کا بہت شوق ہے۔ یہ سوال آپ کسی اور وقت پوچھتے تو میں اس کو آپ کی دیدہ دلیری سمجھتی اور خاموشی کے سوا دوسرا جواب دینا گوارا نہ کرتی۔ لیکن اب چونکہ ہم میں سے ایک کو صرف آدھ گھنٹہ اور زندہ رہنا ہے میں سمجھتی ہوں کہ صاف گوئی سے کام لیا جائے تو بہتر ہو گا۔ تو جناب زہرہ کے یہاں موجود ہونے کی وجہ عطار دہے۔ جس کی ظاہر شکل و صورت تو ایک اچھے بھلے انسان کی تھی۔ لیکن دل دغا سے بھرا ہوا تھا۔"

سیوین نے کہا: "اس کے امدادات سے مجھے آگاہ کیجئے؟"

خاتون نے حقدت آمیز لہجے میں کہا: "میں اس سے زیادہ کیوں بتلاؤں۔ میں راز کے بدلے راز کا افہام کر سکتی ہوں۔ گنم صاحب! آپ بتائیے۔ آپ یہاں کیوں

تشریف لائے ہیں؟ (معاف کیجئے میں آپ کو کسی آسمانی نام سے نہیں پکارتی ہے)
 ”بیگم صاحبہ! میرے یہاں آنے کا معنی حسن و خوبی کا ایک درخشندہ ستارہ ہوا ہے
 جو میرے ساتھ قرآن میں آیا ہے اور کچھ عرصہ تک سیری جبراسی میں گردش کرتا رہا۔
 لیکن یہ ستارہ آخر میں آپ کے حصار کی طرح کچھ رفتار نکلا۔ اب وہ ایک سپاہی کی آغوش
 میں چمک رہا ہے۔ یہ دنیا اس کے بغیر تاریک ہے اس لیے میں کسی دوسری دنیا میں جانا
 چاہتا ہوں۔“

”تو آپ سے ایسا سوک پہلے کبھی نہیں ہوا؟“
 ”کبھی نہیں۔ اسی لیے میں نے قسم کھالی ہے کہ پھر اس طرح کا واقعہ کبھی پیش
 نہ آئے گا۔“

”آپ کے خیال میں وہ اس قابل ہے کہ اس کے لیے جان یوں قربان
 کر دی جائے؟“

”کیا آپ کا محبوب اس قابل ہے؟“
 خاتون نے جوش میں پھر کہا: ”ہرگز نہیں۔ قطعاً نہیں۔ آپ یہ نہ سمجھئے کہ میں موت
 کو دلہن شکتہ کا مرہم جان کر اس کی طلب گزار ہوں آپ کا شاید یہ خیال ہو لیکن میں
 تو مرنے اس لیے مرنا چاہتی ہوں کہ مبادا اور بادشاہی کے لوگ سیری ہنسی اڑائیں۔ زندگی
 میں پہلے ہی ایک دفعہ مجھ سے بول دغا کی گئی ہے میں نہیں چاہتی کہ تیسری دفعہ
 پھر یوں ہو! مردھوٹے اور بے وفا ہیں۔“

”بیگم صاحبہ! ایک آپ کو چھوڑ کر عورتیں بھی کچھ کم نہیں؟“
 بات کو بیاں پنچا کر دونوں نازدہ نظروں سے آگ کو دیکھتے رہے۔ تھوڑی
 دیر کی خاموشی کے سیمون نے کہا۔

بیگم صاحبہ! زندگی کی چند گھنٹیاں باقی ہیں آپ میری اتنی بات مان بیٹھے کہ
 اپنا نقاب اتار کر مجھے اپنا چہرہ دکھا دیجئے۔“

خاتون نے نہایت بے پروائی سے کہا: ”کیوں؟“

”میرے لیے۔“

دنیا میں بیچ دے گی یا مجھ سے چند منٹ پہلے وہاں جا پہنچے گی :-
 جب لا :- فنونِ تمنا ہے آپ کچا پیسے کو اس وقت آپ اپنے دل کو اعلیٰ و
 ارفع خیالات میں مصروف رکھیں :-

عیسویوں نے کہا :- بیگم صاحبہ! یہ نہ کیجئے۔ ابھی ابھی مجھ سے یوں نے کہا تھا
 کہ انسان ایک جیون سمٹن ہے۔ ہم ایک طویل سفر کی تیاری کر رہے ہیں۔ اور
 اگر میں اپنے ہسٹر کی شکل چاہوں۔ تو یہ کون سی نمب کی بات ہے۔ جان کیجئے۔ آپ
 کو بلا ٹرسٹہ، احسان ہونا چاہیے آپ نہ ہوتیں تو میری تکلیف کا اب تک خاتمہ ہو
 گیا ہوتا اور پھر آپ کی گولی کا نشا نہ بنایا آپ کو اپنا نشا نہ بنانا کوئی معمولی سی بات :-
 مجھ اپنی شکل دکھا دیجئے :-

کچھ دیر تک وہ تامل میں رہی۔ پھر کہنے لگی :- جناب فی الحقیقت، بقول آپ کے
 میں آپ کی احسان مند ہوں۔ آپ کا حکم ماننے کے بغیر چارہ نہیں۔ آپ بھی اپنا نقاب
 اتار دیجئے۔

دونوں نے اپنے نقاب اتار دیئے۔ اور دونوں نوز سے ایک دوسرے
 کو دیکھنے لگے۔ سیون خوش شکل خائین بے نقابی نے خاتون کے چہرے کے
 جس من کو آشکا مک دیا تھا سیون کی توقع سے بلا تھا بار یک نفیس آبرو، جیسے
 کسی خوش مذاق معرک کی قلم ازلی، نیلی نیلی خوب صورت آنکھیں، ایسی ایسی خوب گلہیں
 آنکھوں کی نیگوں گہرائیں سیون کو دل دھڑکنے لگا۔

خاتون نے کہا :- کیا میرے چہرے میں کوئی ایسی قباحت نظر آتی ہے جس کی وجہ
 سے دوسرے مجھ سے یوں بن چیر لیں :-

سیون نے کہا :- جو کچھ میری آنکھوں کو نظر آ رہا ہے اس سے تو ایک تیسرا
 شخص بھی سوچ جو سکتا ہے۔ اگر ان دونوں نے آپ سے بے وفائی کی تو اس کی وجہ
 اس کو چند صحت میں بنے کہیں دکھانی نہیں دیتی۔ کیا انہوں نے کوئی اور وجہ
 نہیں بتائی ؟

”نک سے وہ کہہ افسوس ناگوار تھا کہ مہر سے والہ کے ساتھ بنی مرا

تمول بھی رخصت ہو گیا اور ناداری نے مجھے آن گھیرا۔ تو میرا چہ بلیا ایک دن مجھے
 ملنے آیا۔ مشق و محبت کی داستان نرگس کے اور تم تم تم کے مجھ سے کہتا رہا۔ آواز میں
 عجز تھا۔ انداز میں انکسار تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی بکہ گیا کہ میں نفس اپنی آمدنی پر گھربار کے اثرات
 کا کیل نہیں ہو سکتا۔ شادی کیسے ہو سکتی ہے۔ حضرت میرے جہیز کی جوکس میں
 منہ کھوٹے بیٹھے تھے۔ دورانہ لیش واقع ہونے لگے۔

سیون سے بیسے ایک درد منوں کر کے کہا: "اوصدا ایسی شکل کو دیکھا اور پھر دورانہ لیش
 رہنا۔ اور آپ کے مشق کا دوسرا شعلہ۔ آپ کا مطارد۔ وہ بھی دورانہ لیش تھا؟"
 "نہیں اب میں دولت مند ہوں۔ چچا کے مرجانے کے بعد مجھے بہت کچھ درشے
 میں ملا۔ میرے سورا کا دل اور شہ شہ چھو بیٹے تک میری قدم ہوسی کرتے رہتے۔
 لیکن آہ میں کیا کہوں۔ جو افراد سپاہی ایسے نہیں ہوا کرتے۔ یکا یک ابوں نے
 حسن کا معیار بدل لیا۔ ذرا آپ کا عذر ملاحظہ فرمائیے۔ میری درد مندی کا بھی نیال کہئے
 نچہ کو آپ لکھتے ہیں "رنگ کے بارے میں میرے خیالات کچھ بدل گئے ہیں۔ اب تک
 وہ ادعا تھا ایک نی نوبی نے اسے بھارت بخشی۔ اب اسے نیل آنکھوں کی بجائے
 سموری آنکھیں اچھی لگتی ہیں۔"

سیون نے کہا: "یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے لیکن نہیں بیگم صاحبہ یوں ہو سکتا ہے
 اس سے پیشتر مجھے جو رنگ نظر کیے تمام رنگوں سے پیارا معلوم ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر ہوئی
 میں نے اپنا مذہب بدل ڈالا۔ اب میں نیلے رنگ کی قسم کھا یا کروں گا۔"
 "حضرت آپ ہی جو رنگ کا ذکر کر رہے ہیں جس کی خاطر آپ ایک
 گنڈا پیلے جان دینے کو تیار تھے؟"

"بیگم صاحبہ میں شاعر ہوں۔ جس بے علم صورت کی خاطر میں آج جان دینے
 والا تھا اس کی صورت میں مجھے تمام محاسن سب کی سب خوبیاں نظر آتی تھیں۔
 میں نے اس کی قلوب میں قصیدے کو کو کو کے گائے تھے۔ لیکن اب مجھے یہ معلوم ہو
 رہا ہے کہ یہ میری عیالت کا نتیجہ تھا۔ میں گلوں کا بسندہ ہوں اور مجھے شہرت
 نفرت تھی اب مجھے اپنی حماقت کا احساس ہونے لگا ہے میں اسے تمام عورتوں سے

بڑھ کر حسین جانتا تھا۔ اس لیے کہ میں نے بھی آپ کو دیکھا نہ تھا۔
 نفرت ہمیں جواب ملا کہ "شاعر صاحب کیا کہنے! آپ بھی اور مردوں کی طرح
 برآمدہ بننے والے ہیں۔ آپ بھروسے رنگ کی پستش کرتے ہیں۔ اس کے لیے
 جان دینے کو تیار ہوتے ہیں اور ہر شکل ایک گھنہ گزرنے پاتا ہے کہ آپ کو نیلا
 رنگ موہ لیتا ہے۔ شاید آپ نیلے رنگ کے لیے بھی جان دینے کو تیار ہو جائیں؟"
 سیون نے کہا "میں نیلے رنگ کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہوں یہ نیلی آنکھیں
 مجھے التفات کی نظر دیکھیں تو یہی زندگی جنت ہو سکتی ہے۔"
 خاتون طنزاً ہنس دی اور کہنے لگی۔

"جناب آپ یقین مانتے کہ نیلا رنگ کبھی مہربان نہیں ہو سکتا۔ آپ شاعر
 لوگ سمندر کو نیلا کہتے ہیں لیکن اس کی لہریں غرق و فنا کر سکتی ہیں۔ آسمان نیلوں ہے
 لیکن اس کی بھیاں تاراج کر سکتی ہیں۔ اور ابھی میں آپ کو دکھا دوں گی کہ نیلی
 آنکھیں پستول کا نشانہ بھی لگا سکتی ہیں۔"

سیون نے آہستہ سے کہا "آپ کو شاید یاد نہیں کہ پستول اندھیرے میں
 چلانا ہو گا۔"

خاتون نے جوش میں آکر کہا "میں بہت ہی خوش ہوں کہ آپ تشریف لے
 آئے آپ کو دل دینے سے مجھے بہت ہی مسرت حاصل ہو گی۔"

شاعر نے کہا "اب میری سوجھ میں آیا ہے کہ دور اندیش صاحب نے اور عطار د
 نے کیوں آپ سے پہچانائی کی۔ بیگم صاحبہ! یہ برہم مزاجی نیلی آنکھوں کو نہیں سمجھتی آپ
 بہت بہت بے علم ہیں۔ لیکن آپ کے عطار و کا دل معلوم ہوتا ہے غمخیز سے۔
 بالکل متبراقا آپ کا عتاب میں بگڑنا آپ میں جو حسن پیدا کر دیتا ہے وہ اسے دیکھ
 نہ سکتا تھا۔ ان نیلی آنکھوں میں جب غمخیز چمک آتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔
 گویا آسمان کی نیلوں گہرائیوں کے ایک تلامذہ میں کہیں سورج نظر آ رہا ہے۔ پھر
 اسی پربادل گھر آتے ہیں پھر کس ناز سے بھیلیں چمکتی ہیں پھر شاید چند بوندیں
 بھی ٹپک پڑتی ہیں۔ اور پھر سورج اپنا رخ پھالنے لگتا ہے نقاب کر دیتا ہے جس

نے اس روح افزا نظارے کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں وہ حسن کی کس قدر قدر کر سکتا ہے۔ لیکن بیگم صاحبہ اگر میں آج رات زندہ پنج جاؤں تو ذکر اس پر ہی دوش کا اور پھر بیاں اپنا جو آپ کے ساتھ بے وفائی کر گئے ہیں۔ کف افسوس ملیں۔ آپ کو فردوس کی پُر فضا گلگشتوں میں مسرت ہو کر اسے کاش میں اس بے چارے شاعر کی پرستش قبول کر لیتی اور زندہ رہتی۔ اس وقت شہرہ آفاق ہوتی :-

اس تقریر کے دوران میں خاتون اس کے چہرے کا نہایت غور سے مطالعہ کرتی رہی۔ آخر بولی۔

”سہماں اللہ! کیا فصاحت ہے۔ کیا شاعر اعمق ہوتے ہیں۔ کیوں صاحب! کوئی شمس آپ کی نظموں کو چھاپنا ہی گوارا کرتا ہے؟“
شاعر نے فخر و غرور سے کہا: ”بیگم صاحبہ میرا نام ایڈمنڈ سیون ہے۔“
”کون سیون؟ مان کا ماٹو کارہنے والا؟“

”شاعر نے کہا: میں وہی ہوں۔ آپ کو میری نظموں میں سے کون سی پسند ہے حسن شیریں، عشق میلے؟“

”نظیں؟ میں نے نظیں کبھی نہیں پڑھیں! شاعر سیون کا نام میں نے آج سے پیشتر کبھی نہیں سنا۔ کیا آپ کی محبوبہ اس جوڑی آنکھوں والی کا نام ڈوبائے ہے؟“
”ہاں، ہاں۔ مگر آپ اسے کیونکر جانتی ہیں؟“

”میرا کپتان، میرا سونا، میرا عطار دمان کاٹو میں اسے اپنا دل دے چکا ہے۔ مجھے اس شے خط میں لکھا تھا کہ وہ پہلے سیون نامی ایک عجزوں شاعر کی ولدہ تھی۔ اب وہ ایک جنگ جو، بہادر سپاہی کو ترجیح دیتی ہے۔ میرا عطار د مشہور خطوط بار سے خط بہت مفصل لکھا کرتا تھا۔“

خفتے سے سیون کا چہرہ تہمتا اٹھا اور وہ بیتاب ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔
آخر کار بولا۔

”سو بیگم صاحبہ آپ ہی ہیں۔ جنہوں نے بے دردی کے ساتھ میری خوشی اور

میری راحت مجھ سے چھوڑا دی ہے اگر آپ اس سوچ کو اپنے پاس سنبھال کر رکھتیں تو میں اپنی زندگی مسرت اور اطمینان سے گزارتا۔ میں شہر ایک مزدوری کام کے لیے آیا تھا مجھے کیا معلوم کہ میری عدم موجودگی میں میری دولت کو یوں ایک ٹیڑھا کر لٹے جائے گا۔

اس نے اتنا کہا اور ٹہل کر کمرہ کی ایک دیوار سے دوسری دیوار تک چلا گیا۔ وہاں سے مڑ کر اس نے اپنی نظریں اس خاتون کے چہرے پر گاڑ دیں۔ گہری تقریر سے خاتون کے چہرے پر ایک سُرخ جھلک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک نور چمک رہا تھا اس کے حسن کا طلسم پیلے سے بھی زیادہ ہوش رُباتھا۔

عجب صن اور اس پر شاعر کی نگاہ، سیوین کی پیکوں کو انکسار نے جھکا دیا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ وہ ایک پیکر التجا ہو کر بولا۔

”بیگم کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ اپنے سورا کو جلا دیں اور میں اپنی بے دغا محبوبہ کو بھول جاؤں اور۔“
”اور کیا؟“

”اور ہم دونوں ایک دوسرے کے ہو جائیں؟“

خاتون نے ایک ہتھکڑی لگایا اور دیر تک ہنسی رہی۔ اتنی دیر تک کہ سیوین اپنی توہین محسوس کرنے لگا۔ کہنے لگی۔

”شاعر صاحب! مجھے آپ کی عشق پائیڈاری کو تو نہیں سراہا جاسکتا۔ البتہ میں آپ کی جدتِ بلع کی داد دینے بغیر نہیں رہ سکتی۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی اس دانش مندانہ تجویز کو قبول نہیں کر سکتی۔ میں نے سچے عشق کی پہچان الفاظ سے کرنی چھوڑ دی ہے جو مجھ سے شادی کرنا چاہے اسے کچھ کر کے بتانا پڑے۔ گا۔ میں ہنسا دل کسی ایسے آدمی کو نہیں دے سکتی۔ جو آج تو خلی آنکھوں پر مرتا ہے اور پھر قوس قزح کے سفوں رنگ باری باری سے اپنی طرف مائل کر لیتے ہیں جو سے ایسی طاقت نہیں ہو سکتی۔ اور چونکہ ایسے شخص کا ملنا نامکن ہے۔ اس لیے۔“
اتنے میں دوازہ گھلا اور یوں اندھا نل ہوا۔ دونوں کو بے نقاب دیکھ کر

چونکہ اور کسی قدر مدہشتی سے کہنے لگا: یہ سخت بے قاعدگی ہے۔ آپ اندازہ فہم ازش اپنا اپنا نقاب پہن لیجئے۔“

خاتون نے کہا: اب کیا ہے؟ اب تو ہم نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا ہے یوں؛ تمہیں جو کچھ کہنا ہے جلدی کرو۔ یہ صاحب تو ایسے خشک گفتار ہیں جیسے کوئی واعظ ہوں۔ آپ شاعر ہیں۔ مجھے شاعروں سے نفرت ہے۔ میں شاعروں کو گولی سے بھی مار سکتی ہوں۔“

یوں نے ایک تھیل آگے بڑھا کے کہا: اس میں کپڑے کی بہت سی چھوٹی بڑی کزنیں ہیں۔ آپ ایک ایک کزن نکال لیجئے۔ جس کے جتنے میں چھوٹی کزن آئے گی اسے غیر منہا پڑے گا۔“

خاتون نے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر کپڑے کا ایک ٹکڑا نکال لیا۔ سیون نے بھی اپنی قسمت نکالی۔ کزنوں کو ایک ساتھ رکھ کر کہا گیا۔
خاتون پکھلا مٹی: میں شکاری ہوں۔“

سیون نے کہا: اور میں شیر ہوں۔ بیگم صاحبہ، گولی بالکل سپیدھی چلائیے۔ یہ جھگڑا جلد پاک ہو جائے گا۔“

یوں نے کہا: یہ دیکھئے۔ یہ گھنٹی ہے اسے اپنے گلے میں ڈال لیجئے اور ہلا کر دیکھئے۔ ٹیک بھتی ہت یا نہیں۔ ٹیک۔ بیگم صاحبہ یہ پستول۔ اس میں کسی طرح کا نقص نہیں۔ صاحب اس دیوار کے سامنے ہی رہئے اور جب وقت موسیقی بند ہو جائے تو آپ دو قدم چلئے اور گھنٹہ کو بجنے دیجئے اور بیگم صاحبہ آپ جس وقت گھنٹی کی آواز سنیں فوراً پستول چلا دیں۔ لیجئے آداب عزمی ہے میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ خدا کے سے آپ کا سفر جلدی سے طے ہو جائے اور آپ کی منزل خوشگوار و دل پذیر ہو۔ صاحب آپ کو کس طرح کی موسیقی چاہئے؟“

سیون نے کہا: کوئی درد ناک ماسٹر بجاؤ۔ جس میں اسیدوں کا خشک ہیں مل جانا جو۔ جس میں نیلی ہانکوں کی سفاکی ہو جس میں ایک درد مبر سے دل کا نالہ ہو۔ ایک بے رحم شکاری کے شکار کی آہ و زاری ہو۔ بیگم صاحبہ: لیجئے جو انتہام آپ کو مردوں کی جنس سے

مینا ہے، وہ مجھ اکیلے کی ذات سے لے لیجئے۔
 یول نے طاق پر رکھی ہوئی شمشیں بچا دیں۔ انگٹھی کی آگ کے سامنے لبے کا
 ایک تختہ رکھ دیا۔ چہرہ منیر کا لپ اٹھا کر باہر چلا گیا۔ جب صحنہ بند ہو گیا تو کمرے
 میں بالکل اندھیرا تھا ساتھ کمرے سے بیڑا اور باب کی در دھک مومسیتی نے فنا
 میں نیک بے تابی پیدا کر دی تین منٹ تک یہی حالت رہی۔ اس کے بعد مومسیتی
 بند ہو گئی۔

صیغہ تادیبی اور خاموشی میں گھنٹی کی نقرئی آواز بالکل صاف سنائی دی۔ پستول کی
 ایک گولی پل گئی۔ دوبارہ گھنٹی بجی۔ ایک نورگولی چھائی گئی۔ یول لپ لپتے میں اٹھائے
 اندر داخل ہوا۔ پستول خاتون کے ہاتھ میں تھا۔ نالی میں سے دوہول ابھی نکل رہا
 تھا۔ سیون ویسے کا دیا کھڑا تھا۔

یول نے دیوار پر نظر ڈال کر کہا: گولیوں کے نشان کہاں ہیں؟ وہ ہیں وہ
 وہ سوراخ۔ بیگ صاحبہ۔ آپ کا نشانہ بہت ہی غلط تھا۔ اب صاحب آپ گھنٹی بیگ صاحبہ
 کو دے دیجئے اور میں پستول ابھی آپ کو بھر کے لا دیتا ہوں۔

یول کونے میں میز کے پاس کھڑا ہو کر پستول بھرنے لگا۔ شاعر نے کہا
 ”بیگ صاحبہ! آپ نے پستول بہت اونچا چلا دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آپ
 نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے۔ میرے دل میں اتنا رحم نہیں۔ میری ایک نہ ایک
 گولی ضرور مہلک ہوگی۔“

خاتون نے کہا: ”شاعر صاحبہ! تو میری تمنا ہے۔“
 یول نے پستول بھر کر سیون کو دے دیا۔ خاتون سے پوچھا: آپ کو کس
 طرح کی مومسیتی پائیے؟

جواب ملا: کوئی بے پردہ اسی چیز بہا دو۔ دردناک سُر مجھے نہیں جانتے۔
 دروازہ بند ہو گیا۔ اور ایک لمحے کے بعد اس تاریکی میں ایک ہنستا کھینتا
 سُر سنائی دیا۔ آخر وہ بھی بند ہو گیا۔
 ایک گھنٹی کی آواز آئی۔

ایک گولی چلی۔

مید نے آواز دی: "شاعر صاحب، پستول ذرا نیچے کو کے چلائیے۔"

میا نے کہا: "نیلے نیلا والی۔ خدا حافظ۔"

اندھیرے میں ایک ہنستی ہوئی آواز نے جواب دیا: "بے دانا شاعر۔"

خدا حافظ اور پید گھنٹی بجی۔ ایک فائر ہوا۔ ایک چیخ سنائی دی کوئی زمین پر

بیٹے گرا۔

بول روکسی نے کراہ کر آگیا۔ خاتون اپنی بگ پر کھڑی تھی۔ سیون کے ہاتھ

میں پستول تھا۔ نو دفترش پر پڑا تھا۔

خاتون نے ایک چیخ ماری اور گرتی پڑتی سیون کے پاس پہنچ کر زمین پر بیٹھ

گئی۔ چلا چلا کر کہتی رہی۔

"میرت شاعر، میرے پیارے شاعر، تو نے اپنے آپ کو کیوں مار ڈالا۔

ہاں کس انداز سے تو نے خدا حافظ کہا تھا اور میں نے یونہی تیرا مسکھارا دیا۔

میرے خوب سورت شاعر تو کیوں مر گیا؟"

بول نے کتبہ کی نظروں سے دیوار کو دیکھ کر کہا: "میکن دد کیسے مر سکتا

ہے؟ کارٹوس تو خالی کارٹوس ہے۔"

"کیا کہا تم نے؟"

"میرا خیال ہے میں نے آپ سے ذکر بھی کیا تھا کہ میں کبھی کبھی ایک

سالی کارٹوس بھر دیا کرتا ہوں۔ پچھلے کارٹوس جو چلا گیا اس کا نشان تو دیوار پر موجود

ہے۔ اس لیے دوسرا کارٹوس بھی خالی ہو گا۔ ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ کارٹوس خالی

ہے۔ یہ مر کیسے سکتے ہیں؟ سرف بے ہوش ہو گئے ہیں! وہ بھی نہیں۔ دیکھیے۔ ان کی

آنکھیں کھل رہی ہیں؟"

سیوین نے آنکھیں کھول دیں کہ حسن عشق کے انداز میں نیاز مند ہے

اے کاہتہ بگڑا رکھنے نہ تو کیا میں بنت میں پہنچ گیا ہوں۔ تم بھی یہاں ہو۔

اوغدا میں کیا دیکھ رہا ہوں؟"

خاتون نے آہستہ سے اپنا ماتھ بٹایا اور اٹھ کھڑی ہوئی بکنے لگی۔ نہیں میرے صاحب! ہم ابھی پیرس میں ہیں۔

پیرس میں؟ کیا کہا تم نے؟ پیرس میں؟ کیا خوبات ہے؟ سیون اٹھ کر بیٹھ گھیا۔ میری جگہ میں کچھ نہیں آتا۔ میں نے اپنے دل پر پستول چلایا تھا۔ یہ دیکھو بارود کا نغان اس بات کا شاہد ہے۔

یہ بولا۔ وہ خالی کاتوس تھا آپ کو نئے سرے سے کھیل شروع کرنا پڑے گا۔ بیگم صاحبہ! اب آپ کتنی باری بننے کی باری ہے۔

خاتون نے کہا۔ اب مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ میں تنگ آگئی ہوں۔ برائے سہر بانی مجھے ایک گاڑی منگوا دیجئے۔ مجھے آج ہی وکسیلز پینا ہے۔

یوں نے کہا۔ بیگم صاحبہ یہ نہیں ہو سکتا۔ ابھی تو کھیل شروع ہی ہوا ہے۔ دیکھئے ایک دو گھنٹے سے آپ کا خون ابھی پھر گرم ہو جائے گا۔ پی بیجئے۔

صاحب! آپ مجھے فوراً گاڑی منگوا دیجئے۔ آپ سنتے ہیں؟

یوں باؤکس جو کر کرے سے باہر چلا گیا۔ سیون آہستہ آہستہ فرش پر سے اٹھا۔

خاتون نے پوچھا۔ میرے اچھے صاحب! مجھے ایک بات بتا دیجئے۔ آپ نے مجھ پر گولی کیوں نہ چلائی؟

تم میرے عشق کی سچائی کا ثبوت مانگتی تھیں۔ میں یہی کر سکتا تھا کہ تمہارے لئے اپنی جان دے دوں! انوس وہ بھی نہ ہوا۔

خاتون نے ہڑی طاقت سے کہا۔ یہ آپ کیا جانتی ہیں؟ اور پھر خاموش ہو گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد بولی۔ میرا نام دن سنیز ہے۔ میں مکہ کی دیباہیوں میں سے ہوں۔ کیا آپ اتنی تکلیف گوارا کر سکتے ہیں کہ کل دوپہر کے بعد وکسیلز میں آکر مجھ سے ملیں۔ میں آپ کے شعر آپ کے منہ سے سنوں گی۔ اور پھر۔

اور پھر کیا؟

اور پھر میرے شاعر! ہم ستاروں ہی ستاروں کی باتیں کریں گے۔

شاعر نے پوچھا: ان دو نیلے ستاروں کی جماس وقت مجھ پر چمک رہے ہیں؟
خاتون نے زوہبان کے ہاتھ میں لہتے کر کہا: یونہی ہیں۔

*

عشق کی نوکشی

مفصل ذیل تحریر کے پُرزے جیل خانے کی اکس کوٹھری میں
پانے گئے جہاں میرا دوست قاسم چانسی پانے سے پہلے عبوس تھا
اور مجھے سعادت ملی خانا دارونہ جیل کی نہرانی سے دستیاب ہوئے تھے
قاسم جس کی زندگی شوق اور کیف کے سرچکھڑا دینے والے جذبات سے معمور
تھی آج دوسری دُنیا میں بنے جہاں خود جانے سے پیشتر وہ اپنی
نبوب بیوی رونا کو بیچ چکا تھا خدا ان دونوں کی روحوں کو عافیت عطا
فرمائے۔

۱۔ شاید مجھے دارونہ جیل کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس کی اجازت سے میں یہ چند
سطریں تحریر کر رہا ہوں لیکن میرا دل اس وقت جذبات سے بالکل خالی ہے۔
میرے دل کی اس وقت وہی حالت ہے جو کس مغل کی صبح کے وقت ہوتی ہے
جب سحر کی چمکی روشنی اور تکان کا خواب آلود سکون مشاغل شبانہ کی ہونکیوں
اور مشرتوں کو بے رنگ اور جیا نک کر دیتا ہے۔ میرا دل ایک کھنڈر ہے۔
جس میں زندگی نہیں آتا رہی۔ جہاں حال بیدار نہیں، ماضی نختہ ہے۔ جہاں نہ حال
ہے نہ نذرہ فقط ایک ویران سی گونج ہے جس کے میرے نزدیک کوئی معنی نہیں جو
نوائے زندگی اور غفلت حیات نہیں۔ ایک خدوہ بے سمت، ایک فریاد بے درد ہے۔
کل مجھے قانون کی انتہائی سزا دی جائے گی۔ میں اس کے لئے تیار ہوں۔ برٹھنس
اصل کے طے تیار ہوتا ہے۔ موت کے لئے کسی تیاری کی ضرورت نہیں۔ موت

اسی لیے موت بنے کہ ناگہانی ہوتی ہے۔ ہر ایک موت ناگہانی ہوتی ہے۔ موت کا وقت معین ہے اور اس طرز معین کیا گیا ہے کہ بے موقع آئے اگر میں اپنی موت کا وقت معلوم ہو تو ہماری تمام زندگی اس موت ہی کی تیاری میں صرف ہو جائے زندگی اس قیام کی مانند ہو جو ریل کے اسٹیشن پر گاڑی کے انتظام میں کیا جاتا ہے۔

۴۔ انسان کی جتنی فوری ضروریات اور فوری انتظامات کا ایک اجتماع ہو جس میں مشق کی ناپائیداری حسن کی بے وفائی کی طرح ہو جہاں تعمیر ایک غلطی ہو جہاں اعتماد ایک حماقت ہو۔

مجھے اپنی موت کا وقت بتا دیا گیا ہے اس لیے میں نے جو کچھ تہیہ کیا تھا اسے منہدم کر چکا ہوں۔ مجھے اس تخریب میں بہت کم تہیہ ہوئی ہے۔ میں نے کبھی کن عمارت کی بنیاد اتوار نہیں رکھی، میری آرزوں کے عمل، میری توقعات کے قسر، میرے ارادے کے سبب بند اور شان دار تھے۔ لیکن مجھے انہم کے وقت معلوم ہوا کہ سب گنبدیں بنا دیں نہایت کمزور تھیں۔

شروع میں سب میں نے مجرم ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ تو اکثر لوگ مجھے سچا جانتے تھے۔ ان کو یقین تھا کہ میں اپنی بیوی کا قاتل نہیں ہو سکتا۔ ارشد بھی مجھے بے گناہ سمجھتا تھا۔ حالانکہ وہ مجھے کتنی محنت سے بانٹتا تھا۔ ایسے لوگ مجھ پر دمک کھاتے تھے اور مجھ سے جھڑکی کرتے تھے۔

چند ایسے بھی تھے جو مجھے جھوٹا سمجھتے تھے ان کا گمان تھا کہ رضیہ کی موت میرے ہی ہاتھوں ہوئی ہے وہ بھی مجھ پر دمک کھاتے تھے لیکن مجھے معذور جاننے تھے۔

یہ دو وزنی غلطی پر تھے۔ مجھے اعتراف مجرم کی دیوانگی سمجھنے والے سن لیں کہ میں نے واقعی رضیہ کو قتل کیا ہے اسی مائیں ہاتھ جو اس وقت خامہ فرسائی کر رہا ہے۔ رضیہ کے نازک کھلے کو اپنی لمبی لمبی انگلیوں میں دبا کر اس کے سانس کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا ہے میرے انکار مجرم کو میری بزدلی اور دروغ گوئی سمجھنے والے سن لیں کہ جب میں نے عدالت میں کھڑے ہو کر بلا تامل کہہ دیا تھا کہ میں رضیہ کا قاتل نہیں تو

میرے دل اور زبان میں وہی سچائی تھی جس نے مجھ میں اعتراف کرایا، میں ایک نہیں، دو بھی۔ شاید میں دس بیس ہوں۔ مجھے اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں احساس ہوا ہے کہ میری ایک تہناستی میں کس قدر کثرت تھی۔ رضیہ کو پانے والا یہی انسان تھا جو اب اس کے قتل کی سزا میں پھانسی پانے والا ہے۔ میں کیسے مانوں؟ اگر میں ایک ہوں تو میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں — کہ میں نے رضیہ کو اس لئے قتل کیا کہ مجھے اس سے محبت تھی۔ یہ کتنی غریب معلوم ہوتی ہے لیکن نہیں یہ ٹھیک ہے۔ سب کچھ ٹھیک ہے کوئی بات غلط نہیں ہو سکتی میں سب کچھ ہوں۔ مجھے نہیں معلوم میں کیا ہوں۔ شاید میں نے غلطی کی ہے۔ میں ایک کمزور ہوں سب انسان کمزور ہوتے ہیں۔

۳۔ دو سال جوئے میں اور رضیہ بیاہے گئے۔ اس کے کچھ سال والدین نے اسے معاف نہیں کیا میرے محلے کے لوگ اب تک میری شادی کو اوباشی سمجھتے ہیں کیونکہ وہ رضیہ کے والدین کی مرضی کے خلاف ہوئی۔ اگر ہمارے محلے میں کسی اس قدر کیاب نہ ہوتا تو شاید حیدر والدین بھی اس وقت اپنی بیٹیوں سے ناراض ہوتے۔ لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ماہوں رہنے کی وجہ سے ان کی اولاد کی عصمت شکاری ہے کیا شاعرانہ خیال ہے۔ وہ اپنی دکھوں کی نیک غصالی پر فخر کرتے ہیں اس صفت پر فخر کرتے ہیں۔ جو مردوں کے وہم و خیال نے عورت کو بخش دی ہے۔ ان سے کہہ دو جو مجھ سے بچ گئے ہیں کہ اصل وجہ ان کی دکھوں کی پاکبازی نہیں میری مالی زنگاہی تھی جو ان میں سے کسی کو بحیثیت بیوی کے گوارا نہ کر سکتی تھی یہ نقادانہ اخلاق سمجھتے ہیں کہ میں نے رضیہ کو اس کی بد چلنی کی وجہ سے مار ڈالا۔ اور خدایا جب مجھے پھانسی ہی پانا ہے تو بعض ایک قتل کے بدلے کیوں؟ میں رضیہ کا قاتل کیوں ہوں؟

رضیہ کو کس نے مارا؟ شاید میں نے! یہ نہ کہو۔ تم رضیہ سے جا کر پوچھ لو۔ وہ کبھی میرا نام نہ لے گی۔ وہ کبھی یقین نہیں کر سکتی کہ میں نے اسے قتل کیا ہے اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں تمام دنیا سے بڑھ کر اس سے محبت کرتا تھا۔ تم یقین مانو

کہ وہ اس محبت کی قدر کرتی تھی۔ محض میری خاطر اس نے تمام جہاں کے الزامات اپنے سر لئے۔ دنیا بھر کے مصائب اس نے میرے ساتھ مل کر برداشت کئے۔ ٹھیک وقت پر میرے لئے کھانا تیار کرنا اور بڑے اہتمام سے میرے لبتز کو بچانا وہ اپنی زندگی کے اعلیٰ فرائض میں سے سمجھتی تھی۔ گرمی کے دنوں میں ساری ساری دوپہر وہ مجھے پنکھا بھلتی رہتی۔ رات کو بڑی دیر تک میرے انتظار میں جاگتی رہتی۔ ہائے یہ نہ کہو کہ میں نے اسے مارا ہے۔ یہ جوڑ ہے۔ تم اس سے پوچھ لو۔ جاہلیان اختیار ہے پوچھ لو۔

عورت اگر پابن تو مرد کی زندگی کو تباہ کر سکتی ہے۔ فطرت نے دلوں کو توڑنے کے جس قدر بھی ڈھنگ ہیں وہ تمام عورت کو سکھا رکھے ہیں۔ قدرت نے مردوں کے دل محض اس لیے بنائے ہیں کہ عورتیں ان کو بے پروائی سے توڑ ڈالا کریں۔ ہماری آنکھیں اس لیے ہیں کہ یا ہم کو دیکھیں یا ہم ان کے لیے روئیں۔ عورت کو خراج نگاہ پابن یا خراج اشک۔ اس دولت سے وہ کٹور دل پر حکمرانی کرتی ہے ان کا عہد ایک دور ظلم ہوتا ہے اور ایک عہد ستم۔ جہاں بغاوت کے بغیر چارہ نہیں۔

میں نے رضیت سے بغاوت نہیں کی۔ میں نے صرف یہ چاہا کہ وہ مجھ سے محبت کرے۔ وہ برف تھی۔ میں نے چاہا اسے آگ بنا دوں وہ برودت تھی۔ میں پابن تھا حرارت ہو۔ وہ چپ چاپ پانی کی طرح بہتی تھی اور میں اسے شعلوں کی طرح مہڑکانا چاہتا تھا۔ اس کی ناشی میں بار بار گھنٹوں تک متواتر اس کے مقول کو اپنے ہاتھوں میں لئے لئے ہے در و بعد نے فغروں میں اس سے اپنے عشق کی داستان کہتا۔ اتنے دیکھتی سمجھ کر بجاویں کی طرح اس کی پوجا کرتا۔ وہ بیت کی طرح بیٹھی۔ کرتی۔ میں اس سے کہتا "انے میرے دل پر حکومت کرنے والی ملکہ! میں تیرا ایک ادا نے غلام ہوں۔ تیری خدمت کرنا میرے لیے جنت میں زندگی گزارنا ہے۔ کیا تجھے مجھ سے محبت ہے؟ وہ کچھ نہ بولتی۔ میں اس کی باہیں مروڑتا۔ جب بھی وہ کچھ نہ بولتی۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار ظاہر ہوتے۔ مجھے خوشی حاصل ہوتی کیونکہ

اس پر بھی وہ کچھ نہ بولتی۔ تم کہو مجھے خرم کی وجہ سے! تم کیا جانو؟ تم نے صرف عورتوں کو دیکھا ہے نہیں۔ انسانیت کا کچھ علم نہیں۔ تم صرف مردو ہو، تم میں مردانگی نہیں۔ تمہاری منت آؤں میں بندی کی قابلیت نہیں۔ تم کو چھوٹی چھوٹی باتیں خوش کر سکتی ہیں اور کم ظرف انسانو! تم مجھے کچھ نہ کہو۔

ہ۔ کئی دفعہ میں بات کو دیر میں گھرا آیا۔ اس نے کسی اس کا گلہ نہیں کیا۔ جہاں محبت ہوتی ہے۔ وہاں طلب ہوتی ہے۔ طلب کے ساتھ شکایت ہوتی ہے۔ میں کیا جانوں وہ میرا انتظار کرتی تھی۔ میں نے کئی دفعہ اس سے پوچھا: رضیہ! میرا دیر سے آنا تمہیں ناگوار تو نہیں معلوم ہوتا؟ وہ کہتی: آپ کی کوئی بات مجھے ناگوار معلوم نہیں ہوتی۔ تمہیں تمہاری بیوی یوں کہے تو تمہارے سے اطمینان کا باعث ہو چکا ہے۔ میں یہ خیال بھی نہ آئے کہ جسے تمہاری کوئی بات نا پسند نہیں اسے تمہاری کوئی بات پسند بھی نہیں۔ شاید تم یہ کہیں نہ سوجھو، نہیں عورتوں کا تجربہ نہیں۔ تم میں غیرت نہیں۔

ایکے دن میں نے اس سے کہا رضیہ جب تم میری ہو، تو پھر کیا ہے کہ تم میرے ہوتے ہوئے بھی اس قدر وقت پڑھنے اور سینے پر دہن میں صرف کر دیتی ہو؟ تم مجھ سے باتیں کیا کرو؟ وہ پھر بھی پڑھنے سے باز نہ آئی۔ میں نے اس کی سبکتا میں چھاڑ ڈالیں میں نے اس کے کپڑے جلا دیئے وہ روٹی رہی ہو رکھنا پکاتی رہی ان کتابوں اور کپڑوں کے لیے روٹی ہی۔ جن کو وہ مجھ پر ترجیح دیتی تھی میرے دل میں اس دن ایک ارادہ آیا لیکن جلد غائب ہو گیا اور میں مٹیوں کو بند کر کے رہ گیا۔ دو دن میں اس سے روٹھا رہا۔ اس نے مجھے نہ منایا۔ تم کہو گے، ڈرتی تھی، پھر تغافل کسے کہتے ہیں؟ کل میری زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ میں خوش ہوں۔ رضیہ کو مار ڈالنے کے بعد میرا زندہ رہنا فضول ہے۔ جس پروانے کو شمع کے جھلنے ہوئے مر جانا چاہیے تھا وہ شمع کے بجھ جانے کے بعد بھی زندہ رہے تو یہ عشق کی غامی ہے۔ رضیہ! تم مجھے معاف کر دینا۔ دنیا کی معافی کی مجھے پروا نہیں دنیا میں، میں نے اگر کسی عورت کے ساتھ وفا نہیں کی تو اس کا الزام مجھ پر نہیں عائد ہوتا۔ وہ اسی قابل تھیں کہ ایک

رات کے لیے بد رنیر سوئیں اور بس ان چند لمحوں کے مشتعل سے زیادہ کچھ بھی سمجھنا
خانی سلیم کا خون کرنا ہے اس پر اگر اہل دنیا مجھے قصور وار سمجھتے ہیں تو مجھے اس کی پروا
نہیں۔ وہ مجھے کل مار ڈالیں گے اس سے زیادہ کسی کو کیا سزا دے سکتے ہیں اس سے
زیادہ کیا انتقام لے سکتے ہیں۔

افسوس! اگر مجھ کو معلوم ہوتا کہ مجھ سے یوں بدلہ لیا جائے گا تو اب ناکردہ گناہوں
کی حسرت دل میں نہ ہوتی۔ کسی سے کوئی ایسا چھان نہ باندھتا جس کو توڑتے ہوئے
میرے دل کو ذرا بھی رنج ہوتا۔ میں رمنیہ سے شادی کرتا؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟
جس کی زبان نے مجھے کبھی پیار سے نہیں بلایا جس نے پُپ کے سوا کبھی دوسرا
جواب نہیں دیا۔ جس نے دل کا حال ہمیشہ بھرتے چُپایا۔ جسے میرے مشتعل جذبات
کھدوچ سوز شعلے کبھی نہ بھڑکا سکے۔ جسے میرے عشق کے فنا انجام نہ لے کبھی نہ
ہلا سکے۔ اس سے شادی کرتا! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟

چودھویں کی چاندنی میں وہ سفید باکس پہنے تنک کر لیٹی ہوئی تھی۔ اور میں
اس کے پاس بیٹھا ہوا اپن دل کی بے قراری کو کانپتے ہوئے ہونٹوں سے لہرتے
ہوئے نعروں میں بیان کر رہا ہے: رمنیہ تم نے مجھ پر کیا جادو چھونک دیا ہے
کہ میرے جسم میں کوئی ندی ہے تو وہ تم ہو۔ میری آنکھوں میں کوئی نور ہے میرے
دل میں کوئی سرور ہے تو وہ تم ہو۔ میری زندگی، میری راحت، اب یہ ناممکن ہو
گیا ہے کہ میں تمہارے بغیر اس دنیا میں کہیں خوشی پاؤں۔ رمنیہ صرف تمہارے
ہوتے ہوئے میرے سینے میں ہزاروں امنگیں اُٹتی ہیں۔ آرزوؤں کا ایک
عالم بنا ہوتا ہے۔ تناؤں کا ایک کھرام بچ جاتا ہے۔

تجربے ایک دفعہ دیکھ لینا سازبستی کے تمام تاروں کو یوں چھیڑ دیتا ہے جیسے ہوا
کا کوئی لطیف جھونکا ان پر سے گزر گیا میرے دل میں نئے نئے گونجتے ہیں کہ ان کو
سنے۔ کیا تو سنتی ہے؟ وہ کچھ نہ بولی۔

میں نے کہا: "رمنیہ سنتی ہے۔" کہنے لگی: "سنتی ہوں۔" میں نے کہا: "کیا تمہارے
دل میں موسیقی نہیں؟ کیا تم مجھے وہ نہیں سنانا چاہتیں؟" وہ کچھ نہ بولی۔ میں نسات

کنڈھوں سے پکڑ لیا۔ اور بہت انکسارت سے کہا: رضیہ کچھ تو کہہ۔ اس نے کچھ نہ کہا یا شاید یہ کہا کہ میں کیا کہوں۔ میں اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کا تغافل مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میرے ہاتھ اس کے گلے کے قریب آتے گئے میری انگلیوں کو ایک ذرہ دست خواہش نے فولاد بنا دیا۔ میرا نچلا ہونٹ میرے دانتوں سے کٹ گیا۔ میرے دائیں ہاتھ کا پنجہ سکڑتا گیا اس نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے اس کی نظروں میں وحشت نظر آئی لیکن وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ میں اور وحشی ہو گیا۔ میرے پٹے کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔ اس نے کچھ کہا۔ لیکن اس کے کہنے میں الفاظ نہ تھے۔ میں اس کا گلا بھینچتا گیا جتنی کہ میرا ہاتھ تھک گیا یہاں تک کہ اس کا اور دنیا کا تعلق منقطع ہو گیا مجھے پانچ ایک لکھائی دینے لگا۔ میری نگاہ میں ایک سیاہ سُرخ چہرہ گئی۔ میرا گلا خشک ہو گیا۔ میں نے ایک چیخ ماری اور اس سے پٹ گیا۔ پتہ چلے کر پوچھتا رہا کہ رضیہ! میری جان!! تم کیوں چپ ہو؟ تم کو کس نے مار ڈالا ہے! رضیہ میری پیاری رضیہ! تمہارا قاتل کون ہے؟ وہ کچھ نہ بولی۔

۶۔ وہ بے چاری مر گئی۔ میرے ہاتھوں سے مر گئی۔ میں نے اسے مارا میں کل مردھاؤں لگا۔ اس نے میرا دل دکھایا۔ میں اس کے لیے مرنے لگا۔ وہ میری بہت خدمت کرتی تھی۔ خدائی قوانین کی گرفت مضبوط ہے اور ان سے رہائی مشکل۔ مرد عورت کا مسخا لو کرتے ہیں اس خیال سے کہ اس کی خواہشات کی تکمیل بطریق احسن ہو، وہ اس کی مرضی ڈھونڈتے رہتے ہیں کہ اسے پورا کریں۔ عورت دیکھائی کا ٹکڑا جانتی ہے راحت کی نیند سلا نا نہیں جانتی انہا کو دیتی ہے اپنے قریب آنے کا راستہ نہیں بتاتی۔ اس نے تمام دنیا کو ناراض کیا کہ مجھے خوش کرے۔ میں نے اسے مار ڈالا کہ وہ مجھے خوش نہ کر سکی۔ کائنات ایک مجھ بے قاعدگی ہے۔ عورت کی محبت ایک انسان ہے روح جسم کا دوسرا نام ہے۔ جنبات کی کوئی حقیقت نہیں ایک ہستی کئی ہستیوں سے مرکب ہوتی ہے۔ آج تم کچھ ہو۔ کل خدا جانے کیا ہو گے؟

نام "پیکس"
(مغزک جون ۱۹۲۱ء)

مائیس

زُمان ازاناطول فرانس

ادپیرازموکیوگیلے

اناطول فرانس کی "مائیس" بہت مشہور کتاب ہے۔ سب جانتے ہیں کہ وہ ناول کی صورت میں لکھی گئی ہے۔ جس میں میتیس اور کنڈریا کے زعمانی مناظر اور رابیب پینوٹوس کے کعبہ واضطراب کی تفصیل بیان کی گئی ہیں نیز نظر "مائیس" مویوگیلے کے اوپر کا ترجمہ ہے جہاں اناطول فرانس کے ناول سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے لیکن اس میں ڈرامہ کی خصوصیتوں کی وجہ سے واقعات اور مناظر محدود کر دیئے گئے ہیں اور چند کرداروں کے نام بھی بدل دیئے گئے ہیں۔

ادپیرازموکیوگیلے کی ایک ایسی قسم ہے جس میں ڈرامائی واقعات تو موسیقی کے ذریعے سے اور مناظر و جذبات الفاظ کے علاوہ ایٹیم کی آرائش اور لوکاری سے ظاہر کئے جاتے ہیں۔ پڑھنے والے کے خیال ایٹیم اور خیالی اداکار وضع کرنے پڑتے ہیں اس کے بغیر ادپیرازموکیوگیلے محفوظ ہونا ممکن نہیں۔

پطرس صغ کے ترجمے کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے پڑھنے والے کا کام ہلکا کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ اسے تھیلی گزرت میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ الفاظ کی پُر وقار موسیقی، نظروں کے اندر چلے جاؤ مکالموں کی ڈرامائی مترنم حرکت سے نہ

صرف کرداروں میں جالی آگئی ہے بلکہ تھیس اور سکندر یا کی دھندلی اور دُور
 دراز فنادات کے کسی دلخیز خواب کا جز معلوم ہونے لگتی ہے اسلوب یکساں،
 ہموار اور ہم آہنگ ہے اور ترجمہ کے بعض حصوں میں نثر کے ڈانڈے نظم بلکہ نغمہ سے
 جاملتے ہیں۔

افراد

تائیس	_____	سکندر یہ کی حسین رقصہ
آناٹیل	_____	ایک راجہ
پالمیوں	_____	ایک بوڑھا راجہ
نسیس	_____	سکندر یہ کا ریس
مرتال	_____	نسیس کی حواصلیں
کر دہلی	_____	
ابین	_____	راجہ عورتوں کی سرور

چننا اور راجہ

بابِ اوّل

پہلا منظر

دھرائے تھیں۔ دریاٹے نیل کے کنارے سینو مہیت
 راجوں کی جھونپڑیاں۔

ابھی آفتاب غروب نہیں ہوا۔

بارہ راجہ ایک لمبی میز کے گرد بیٹھے ہیں۔ ان کے پیچ
 میں بوڑھا پالمیوں اس میز پر طہام کی مہارت کے فرائض
 انجام دے رہا ہے جو میز پر چننا ہے۔

ایک جگہ خالی ہے جہاں آناٹیل کو بیٹھنا ہے،

ایک رہیب۔ یہ روٹی رکھی ہے۔

دکھرا۔ اور یہ نمک ہے۔

تمیرا۔ اور یہ پودینہ ہے۔

چوتھا۔ اور یہ ٹھہر ہے۔

پانچواں۔ اور یہ پانی ہے۔

پالمیوں۔ دکھڑا ہو کر بڑے جوش کے ساتھ (آسمان سے ہر صبح شبنم کی طرح میرے باپھے پر برکات کا ندول ہوتا ہے۔ آؤ اس خدا کی ستائش کریں جو ہمیں نعمتیں بخشتا ہے۔ آؤ اس کے حضور ڈرنا مانگیں کہ وہ ہمیں اپنی رحمت کے سایے میں رکھے۔

راہب۔ (بیت نرم آواز سے) اے خدا! جہنم کے شیاطین ہمارے

راستے سے دور ہو جائیں۔

(راہب پیٹ پکھانا کھاتے ہیں)

ایک راہب۔ (مہر سکوت توڑ کر) اے خداوند! ہمارے بھائی اتانیل پر

اپنے بازوؤں سے قوت پھیلانے لگے۔

بہت سے راہب۔ (انسنگ بے بی میں) اتانیل!

چند اور راہب۔ (اسی بے بی میں) کتنا عرصہ گزر چکا اور وہ ابھی وہاں نہیں لوٹا!

دوسرے راہب۔ مگر وہ کب واپس آئے گا؟

پالمیوں۔ (جیسے کسی ناز کو چھپا رہا ہو) اس کی واپسی کا وقت قریب آ رہا

ہے۔ میں نے کل رات اسے خواب میں دیکھا۔ اس کے قدم

تیز تیز اٹھ رہے تھے اور وہ ہماری طرف آ رہا تھا۔

راہب۔ (جوش کے ساتھ) اتانیل خدا کے برگزیدہ بندوں میں سے ہے۔

(تھکس کے بے بی میں) وہ خواب میں جلوہ نما ہوتا ہے۔

(اتانیل داخل ہوتا ہے اور بہت آہستہ آہستہ قریب آتا ہے جیسے

اور تھکن سے چور چور ہے)

لابیب۔ (لاب کے ساتھ) دہا گیا، وہ ا گیا!

دانیل۔ (درمیان میں کھڑا ہو کر، غموم آواز میں) تم پر سلام ہو!
 پامیوں سے اور لابیب۔ جانی تم پر سلام ہو! (سب اس کے گرد جمع ہو
 جاتے ہیں) تم بہت مازہ ہو، تمہارا چہرہ عمار آلود ہے،
 اہام کرو۔ اپنی جگہ پر بیٹھ جاؤ۔ کچھ کھاؤ۔ کچھ پی لو۔
 دانیل غم زدہ انداز میں بیٹھ جاتا ہے اور آہستہ سے کھانے کو اپنے
 سامنے سے ہٹا دیتا ہے)

دانیل۔ نہیں میرا دل ناکامی سے لبریز ہے۔ میں الم زدہ اور دل ٹھکنے
 ہوں۔ قام شہر معیت کے چنگل میں ہے۔ ایک عودت تائیس
 نے سیاہ کاری اور عیا سوزی کا ہال چیلار کھا ہے اور اس کے
 ہاتھ سے عینم بنی نوع انسان پر حکومت کر رہا ہے۔

لابیب۔ (معصومیت اور سادگی کے انداز میں) یہ تائیس کون ہے؟

دانیل۔ (دھڑکی دیر کے لیے جیسے خواب سے بیدار ہوتا ہے اور
 پھر ڈوب جاتا ہے) معبود میں کی ایک آبرو باختہ پجارن!
 رجز کے بےجے میں اور نرم آواز سے جیسے کسی گئے گزرے زمانے
 کے واقعات دہرا رہا ہو، افسوس اس وقت جب میں کم عمر تھا۔
 اس سے پیشتر کہ میری روح پر رحمت خداوندی کا نزول ہوا۔ میں
 اسے جانتا تھا رگبرائٹ کے عالم میں، ایک دن... اور میں
 اعتراف کرتا ہوں اور نام ہوں... میں اس کے لعنتی وعازے
 کے آگے ٹھہر گیا لیکن خدا نے مجھے اس قبر سے بچا لیا۔ اور صومرا میں
 مجھے الینان حلب عطا فرمایا۔ جہاں میں نے اس گناہ سے کنارہ کشی اختیار کر

مرا ناول میں اس کی کٹر کانام پینوٹوس ہے اور پانولیس نے پینوٹوس کے نام
 کو جتا جو کرا سے بل دیا۔

جو شاید مجھ سے سرزد ہو جاتا۔ آہ! میری روح میں ایک تلام ہے۔ تائیس
کی جیاسوڈی اور تباہ کاری سے میرا دل خون سے تنہا ہے کہ میں اس عورت
کی روح کو خدا کے نام پر مغتوح کر دوں۔

پالمیوس۔ (نری کے ساتھ دانشمندانہ انداز میں) میرے بیٹے! ہم راہوں کلاس دُنیا
کے لوگوں سے احتراز واجب ہے۔ شیطان کے مکر سے خبردار ہو۔ عقل ابری
نے ہمیں یہی سبق سکھایا ہے — رات سو رہی ہے۔ آؤ دعائیں
مانگیں اور سو جائیں۔

درہب پراسرار بیہیت اور تقدس کے انداز میں دست لبتہ
سر جھکائے ہوئے ایک ایک کر کے دُعا مانگتے ہوئے اپنی
اپنی جھونپڑیوں کو چلے جاتے ہیں،

پالمیوس۔ اے خدا! جہنم کے سیاہ کشیا طین ہمارے رستے سے دُدر ہٹ
جائیں! اے خدا! ہمارے رذق اور پانی کو برکت دے۔ اے خدا! ہمارے
بازنچوں کے چپوں پر اپنی رحمت نازل کر جس وہ نیند نصیب کر جسے بد خوابی
برجم نہ کرے اور وہ آرام عطا فرما جس میں کوئی کشکانہ ہو۔

راندھیری رات میں سکون اور خاموشی کے ایک لمحے کے بھتاریگی
کے درمیان ایک لکشی نوزوار ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ بڑھتی
جاتی ہے۔ روشنی کی اس دھند میں سکندریہ کے تصیٹر کا اندوہنی حشر
دکھائی دیتا ہے۔ بچوں پر ہزار ہا لوگ بیٹھے ہیں۔ سانے ایک
ایٹھ ہے جس پر تائیس نیم برہند لیکن نقاب پوش افرودانٹی کے
عشقیہ جذبات کو حکمتِ رقص سے ادا کر رہی ہے۔
تماشائی بلنما ہنگی کے ساتھ دیر تک داد دیتے رہتے ہیں
لیکن یہ تمام آوازیں یوں کسنائی دیتی ہیں جیسے بہت دُور سے
آ رہی ہوں۔ تائیس کا نام اس ہجوم میں ہر شخص کی زبان پر ہے
لیکن کافی تک بہت مدہم ہو کر بیچتا ہے۔ غور و بنگار بڑھتا

جاتا ہے اور تائیس کی حکمت اور بھی پُر معنی ہوتی جاتی ہیں پھر یہ
تمام منظر و فضا غائب ہو جاتا ہے۔۔۔ دن نکل آتا ہے)

تائیل سے۔ (آہستہ آہستہ خواب سے بیدار ہو کر یکسخت اٹھ کھڑا ہوتا ہے اس کی
آواز غنٹے اور رنج سے بھری ہے) شرم! شرم! قبر! ابدی تاریکی! خداوند
میری مدد کر! (سجدے میں گر جاتا ہے) اے خداوند! اے خدائے فد الجلال!
جس نے ہماری روح اور ہمارے دل میں رحم ڈالا، تعریف تجھی کو ہے، میں اس
خواب کا اشارہ سمجھتا ہوں۔ میں ابھی یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ (جوش
سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے) میں اس صورت کو گناہ سے نجات دلاؤں گا، میں
اسے نفس کے بندھنوں سے آزاد کرواؤں گا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آسمان کے
مقام زندہ فرشتے اس کی طرف جھک رہے ہیں۔ اے خدا کیا وہ تیرے ہی
بارک دامن کا ایک سانس نہیں؟ اس کا گناہ جس قدر تاریک ہو، اتنا ہی تم
کا سزاوار ہے لیکن میں اسے بچاؤں گا۔ اسے میرے محلے کر دے اور اسے
خداوند پھر میں اسے تیری نذر کروں گا۔ تاکہ اسے حیاتِ ابدی نصیب
ہو لہذا بھول کو بھاتا ہے جو اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں، اے بھائیو!
سب کے سب اٹھ کھڑے ہو۔ آؤ۔ مجھے غیب کی طرف سے اشارہ ہوا ہے
مجھے پھر اس مہلک شہر کی طرف لوٹنا ہے خدا کرے کہ گناہ کے سمندر میں
اوردھی ڈوب جائے۔ خدانے مجھے منتخب کیا ہے کہ میں تائیس کو اس کے
پاس لے آؤں۔

(تائیل پالمیوں کے سامنے سر جھکاتا ہے)

پالمیوں سے۔ دنیایت پکھولن بچے میں نرمی کے ساتھ طاقت کرتے ہوئے میرے
بیٹے! ہم ریسوں کو اس دنیا سے احتراز واجب ہے۔۔۔ عقلِ ابدی
نے ہمیں یہ سبق دیا ہے)

رولپ، تائیل کے ساتھ ساتھ شکر تک جاتے ہیں
اور پھر گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر تائیل کی دعاؤں کو

دہراتے ہیں جس کی آواز میرے تئیں کی تہنائیوں میں
آہستہ آہستہ غائب ہو جاتی ہے،

آٹائیل کی آواز۔ دُور سے، اندر اور دُور کی مقدس دُور۔ میرے دل کو تقویت دے۔
راہ ہے۔ اس کے دل کو تقویت دے۔

آٹائیل کے آواز۔ رہت دُور سے، اور مجھے سلم الملکوت کی سی طاقت دے تاکہ
میں بدی کی پاؤں کا مقابلہ کروں۔
(مکمل خاموشی۔ پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

دوسرا منظر

اسکندریہ۔

نہیں کے گھر کے باہر کا چبوترہ۔ آس پاس بڑے بڑے سایہ دار
درخت ہیں۔

چبوترے پر سے شہزادہ مند کا منظر دکھائی دے رہا ہے۔ دائیں طرف بجاری
بجاری پر دے ٹنگ رہے ہیں۔ ان کے پیچھے نیک عالیشان ایلان ہے
جو سیانٹ کے لیے آراستہ ہے۔

آٹائیل آہستہ آہستہ داخل ہوتا ہے اور پیچھے کو ٹھہر جاتا ہے۔

ایک غلام اُسے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اس کی طرف بڑھتا ہے۔

غلام۔ اے فقیر! یہاں سے دُور ہو جا اور کہیں اور جا کر جیک مانگ۔ میرا
آقا تم جیسے کتوں کو پکس نہیں آنے دیتا۔

آٹائیل۔ (دُور کے ساتھ) میرے بیٹے اگر تیری نالاہنگی کا موجب نہ ہو تو میرا
کہاں۔ میں تیرے آقا کا دست ہوں اور اس سے اسی وقت لٹا چاہتا ہوں۔

غلام۔ بھاری یہاں سے دُور ہو جا اور آٹائیل پر اپنا عمل ٹھاتا ہے،

آٹائیل۔ رزم بجز میں مگر عجب کے ساتھ ہمارا ہو تو مار لو لیکن اپنے آقا کو میرے

کننے کی اطلاع کر دو۔ جاؤ۔

• ٹائٹل کی پڑوقار نگاہ کی تاب نہ لاکر فلام پیچھے پھٹ
جاتا ہے۔ ججک کر سلام کرتا ہے اور پھر گھر میں نائب
ہو جاتا ہے، ٹائٹل تہنائی میں غور ڈی دیر کے یے
چوڑے پر سے سامنے پھیلے ہوئے منظر کو غور سے
دیکھتا رہتا ہے۔

ٹائٹل۔ بگاڑ شہر! خدا کی پناہ! سکندریہ! جہاں میں گناہ پیدا ہوا۔ وہ رنگیل فضا
جہاں میں نے عشرت کی بے پناہ خوشبو میں سانس لیا۔ جوس انگیز سمندر
جہاں میں نے زدی چشم بھری نازمین کا ترنم سنا۔ ماں ہی میرے سفلی نفس
کا گہوارہ تھا! سکندریہ میرا گہوارہ! میرا وطن! سکندریہ۔ میں نے تیرے عشق
سے اپنے آپ کو آزاد کر لیا ہے۔ مجھے تیرے زرد دولت سے، تیرے
علم و فن سے، تیرے حسن سے نفرت ہے۔ میں تجھ سے نفرت کرتا ہوں۔
اور تجھ پر لعنت بھیجتا ہوں۔ تجھے میں اس عبادت گاہ کی طرح ملعون سمجھتا
ہوں جہاں ناپاک اطاع نے اپنا بسیرا بنا لیا جو۔ آسمانی ہوا کے جھونکو،
جنت کے فرشتہ آؤ اور اپنے پیروں کی جنبش سے اس زبر آؤد فضا کو
جو مجھے چاروں طرف سے گھیرے گی معطر بنا دو!

د آوازیں اور قہقہے سنائی دیتے ہیں۔ غور ڈی دیر بعد نیس
کرویل اور مزال دوسین لونڈیوں کے کندھوں پر ہاتھ رکے
داخل ہوتا ہے۔ ٹائٹل کو دیکھ کر جاتا ہے، اور لونڈیوں
کو چھوڑ کر اپنے دو فوبازو پھیلائے تپاک کے ساتھ ٹائٹل
کی طرف بڑھتا ہے۔

نیس۔ ڈگر خوشی کے ساتھ، ٹائٹل ہاتھ جو؟ میرے کتبہ کے نیتق۔ میرے
دوست، میرے بھائی۔ ماں میں تمہیں پہچانتا ہوں۔ گو تمہاری صورت اب
انسانوں کی بہ نسبت حیوانوں سے زیادہ مشابہ ہے۔ آؤ۔ آؤ۔ مجھ سے بٹگیے

ہو جاؤ۔ تم صحرانورد کو خیر باد کہہ آٹے ہو؟ تم پھر جہم میں شامل ہونے آرہے ہو؟
 اناٹیل سے۔ نہیں تم اس رقاصہ تائیس کو جانتے ہو؟
 نہیں۔ (ہنس کر) یقیناً میں اسے جانتا ہوں۔ صرف جانتا نہیں۔ بلکہ میری
 بے صرف ایک اور ایک دن کے لیے۔ میں نے اپنے تانستان اس کی خاطر
 پنج ڈالے۔ اپنے تانستان اور اپنی زمینیں اور اپنی چکیاں اور اس کی خاطر
 میں نے قلعیدوں کے تین دیوان مرتب کئے لیکن یہ سب کچھ بے سود تھا۔ اس
 کی بکس کو پورا کرنے کے لیے میری اہتالی کوششیں بھی لاعامل ہیں۔ اس کا عشق
 خواب کی مانند نازک اور جلد غائب ہو جانے والا ہے۔ اناٹیل! تم کو اس سے
 کیا کام ہے؟

اناٹیل۔ میں اس کے قدم خدا کے رستے پر ڈالنے آیا ہوں۔
 نہیں۔ اکمل کھلا کر ہنس پڑتا ہے میرے سادہ لوح دوست! وہ دنس کی چارن
 ہے۔ دنس کے تہر کو مت جگاؤ۔

اناٹیل۔ میں اس کے قدم خدا کے رستے پر ڈالنے آیا ہوں۔ جانسیں! میں تائیس کو
 اس ناپاک محبت سے چھڑا کرے جاؤں گا۔ میں اسے یسوع مسیح کی دہن بناؤں
 گا اور اپنی زندگی راہب خانے میں بسر کرے گی۔ تائیس آج میرے ساتھ
 جائے گی۔

نہیں۔ اناٹیل کے کان میں ہن کر، دنس کے تہر کو مت جگاؤ، وہاں مقام لے گی۔

اناٹیل۔ خلاصہ زبان ہوگا (ایک لمحے کے بعد) اس عورت سے میں کہاں
 مل سکتا ہوں؟

نہیں۔ میں پر۔ آج وہ میرے دسترخوان کی زینت ہوگی۔ آج آخری دفعہ۔ وہ
 اس نشاط پرست محل کی رونق ہوگی۔ آج رات وہ تھیٹر میں رقص کر رہی ہے
 اور وہاں سے کسی جیہاں آئے گی۔

اناٹیل۔ اسے دوست بے مینائی باس پہننے کو دو تاکہ میں اس مینائی کے
 نمایان نظروں۔

نہیں۔ اسے نازینو! کرویل اور مرٹال، جلدی کرانا ٹیل کو باس پہنا دو۔
 رنیں اور انا ٹیل رنیتازہ گنگو میں مشغول ہو جاتے ہیں
 مرٹال تالی بجاتی ہے ایک خدمتگار حاضر ہوتا ہے
 اور مرٹال کا حکم پا کر چل جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد
 غلام ایک صندوق اٹھائے داخل ہوتے ہیں جس میں
 سے کرویل اور مرٹال انا ٹیل کے لیے سنگھار کا سامان
 نکالتی ہیں ایک چکڑا رنقری آئینہ انا ٹیل کو دکھاتی ہیں اور
 ہنس دیتی ہیں۔ انا ٹیل اسی طرح بیٹھا نہیں سے باتیں کرتا
 رہتا ہے۔ ونڈیاں اس کے بالوں کو خوشبو ڈالتی لگاتی
 ہیں اور اس کے سر اور داڑھی کو کنگھی کرتی ہیں۔ نہیں
 مکرانا ہوا ان کو دیکھتا رہتا ہے۔

نہیں۔ اب میں ایک بار چہرہ نہیں دیکھوں گا جیسے کہی پہلے دیکھا
 کرنا تھا۔

انا ٹیل۔ اہا میں جنم کا مقابلہ کرنے کے لیے جنم ہی کے ہتھیاروں سے
 سبوں گا۔

نہیں۔ معرود فلسفی، اسان کا دل کمزور ہے۔

انا ٹیل۔ جب خداوند میرا رہبر ہے تو میں مزدور سے خوف نہیں کھاتا۔

کرویل (مرٹال سے) جوان ہے!

مرٹال۔ (کرویل سے) خوب صورت ہے!

کرویل۔ اس کی داڑھی کے بال لمبے ہوئے ہیں!

مرٹال۔ اس کی آنکھوں میں آگ بھری ہے۔

کرویل۔ اس کے سر کے گرد یہ پٹی بہت جلی معلوم ہوتی ہے۔

مرٹال۔ یہ انگشتری پہن لو۔

کرویل۔ اپنے بازو کو آگے پھیلاؤ۔

مرزا۔ اور اپنی اکلیمیاں۔

مرزا سے اور کر دہلی سے۔ جوان ہے اور خوب صورت ہے اور اس کی آنکھوں میں
آگ بھری ہے۔

مرزا۔ دستنگار کو جا رہی رکھتے ہوئے، اب لباس پہن لو۔

کر دہلی سے۔ (خوشامد سے) یہ سیاہ پشم کا کرتہ اتار ڈالو۔

اتانیل سے۔ (ان سے جاگنے کی کوشش کرتا ہے، ہٹ جاؤ۔ یہ مجھ سے کبھی نہ ہوگا۔

کر دہلی اور مرزا کے پہلے تو اتانیل کے ورثت انکار سے

ڈر کر پیچھے ہٹ جاتی ہیں۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ اس کے قریب

آتی ہیں،

کر دہلی اور مرزا۔ (سیاہ پشم کے کڑتے پر لباس فاخرہ پہنا کر، یہ ہوا اپنے زہد و تقویٰ

کو اس نرم و نفیس لباس سے ڈھانپ لو۔

نہیں۔ (اتانیل سے، ان کی ہنسی مذاق سے رنجیدہ نہ ہو اور ان کے سامنے اپنی نظروں

کو بچانے کو رو بکھڑا آنکھیں اٹھا کر ان کے حسن کی داد دو۔

اتانیل۔ (اپنے آپ سے) اسے نور کی روح! اور میرے دل کو اس جنگ کے یہ

مضبوط بنادے کہ مجھے بہتی کی قوتوں سے مرنا ہے۔

کر دہلی۔ (اس کا حسن کسی نوجوان دیوتا کا سا ہے اگر فیسی اسے دیکھ پائے تو اس جنگ

زادہ کے سینے میں پھر انسانوں کا سادل دہڑکنے لگ جائے۔

مرزا۔ (اتانیل سے) آؤ ہم تمہیں کفش زریں پہنا دیں۔

کر دہلی۔ (اتانیل سے) آؤ ہم تمہارے رخساروں پر عطر موہک دیں۔

کر دہلی اور مرزا سے۔ (ایک دوسری سے) اس کا حسن کسی نوجوان دیوتا کا سا ہے۔

(بہت دُور سے تمہیں کے نفروں کی آواز سنائی دیتی ہے

نہیں چوتھے پر جا کر شہر کی طرف دیکھتا ہے پھر واپس

آکر سکوٹا ہوا اتانیل سے مخاطب ہوتا ہے۔)

نہیں۔ اپنے آپ کو سنبھال لو۔ غنیمت بڑھا چلا آرہا ہے۔

رتناسوں اور ایکڑوں کے گردہ جن کے ساتھ نیس کے فلسفی
دست بھی شامل ہیں۔ تائیس کے آگے آگے جو ترے پر

داخل ہوتے ہیں۔

ایکڑ اور فلسفی۔ دنائیس کے گرد جمع ہو کر اور اس کے سامنے جبک گر، تائیس! خواہر
گریز! سکندر یہ کاپٹول! تائیس! محبوب ترین دولت! تائیس! تائیس!
تائیس!

دنیس اپنے بہانوں سے مراسم ملاقات ادا کرنے کے بعد
ایوان صیانت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ غلام پر دسے
اتحاد دیتے ہیں۔

نیس۔ تائیس! پیاری تائیس! بہرا دورے! دستو بیوسے! ڈورین! کیلی کریٹی!
میرے بہانوں! میرے دوستو! مقدس دیوتا تمہارے ساتھ رہیں۔
دسب ایوان میں داخل ہوتے ہیں۔ تائیس بھی اور
بہانوں کے پیچھے پیچھے ایوان میں داخل ہونے کو ہے
لیکن نیس اسے ٹھہراتا ہے اور اس کے پاس ہی ایک
نشست پر بیٹھ جاتا ہے وہ کھڑی رہتی ہے ہونٹوں
پر ایک طنز آمیز قہقہہ ہے نیس اس کو محبت بھری حسرت
آلود لگا ہوں سے دیکھتا ہے۔

تائیس۔ ہاں یہ تائیس ہے وہ نازک منم جو آج آخری مرتبہ تیکہ مچوں سے
آراستہ دسترخوان کی زینت بننے کو آئی ہے۔ کل صرف میرا نام باقی رہ
جائے گا۔

نیس۔ ہم نے کھات دن تک ایک دوسرے سے عشق کیا، اگلے سات دن
تک بے وفائی نہ کرنا بہت بڑی وفا ہے۔ میں شکوہ نہیں کرتا۔ اب تم
میرے باندوں کو خالی چھوڑ کر بالکل آزاد ہو جاؤ گی۔

تائیس۔ نیس! آج کی رات خوش ہو۔ مسرت کے لمحوں کو نشاط کی دولت بھیرنے

دو اور اس آخری رات سے بجز ایک منتشر گمانہ مشیت اور خود فراموشی کے اور
کچھ نہاتو۔ کل۔ کل صرف میرا نام باقی رہ جائے گا۔

دکٹن فلسفی جن میں اناٹیل جی شامل ہے مباحثہ علمی میں

مشغول ایوان کی طرف سے داخل ہوتے ہیں اور آہستہ

آہستہ چیز سے تک پہنچ کر ٹھہراتے ہیں۔ اناٹیل باقی

لوگوں سے علیحدہ ہو کر جس و حرکت کھڑا رہتا ہے اور

تائیس کو منقہ کی نظروں سے دیکھتا رہتا ہے۔

تائیس۔ (تائیس سے) یہ اجنبی کون ہے جو مجھے تہرا آؤنگا ہوں سے گھور رہا

ہے میں نے اسے کبھی دریافت میں نہیں دیکھا۔ کہاں سے آیا ہے؟ یہ

کون ہے؟

تائیس۔ (جیسے نہایت معمولی سی بات پر) ایک سیدھا سادا فلسفی، مھکار بنے والا راسب

دھنڑ کے ساتھ، تم سے ملنے آیا ہے۔ خبردار سو جاؤ!

تائیس۔ ساتھ کیا لایا ہے؟ عشق؟

تائیس۔ کوئی انسانی کمزوری اس کے دل کو نہیں جا سکتی۔ وہ نہیں اپنے مقدس عقیدے

پرانا چاہتا ہے۔

تائیس۔ اس کا عقیدہ کیا ہے؟

اناٹیل (اٹھنے بڑھ کر) اپنے جسم سے نفرت، دکھ اور رنج سے محبت کرو۔ نفس کو کپل ڈالو

اور گناہوں کی تلافی کرو۔

تائیس۔ (خوڑی دیر تک اس کو پُپ چاپ دیکھی رہتی ہے) جاؤ میرے سامنے

سے بٹ جاؤ، میں صرف عشق پایمان لائی ہوں، کوئی اور طاقت مجھ پر قابو

نہیں پاسکتی۔

اناٹیل۔ (دھنڑے کی حالت میں اس کے کلام کو ستا رہتا ہے اور اٹھنے بڑھ کر درشتی کے

ساتھ مخاطب ہوتا ہے) کفر مت بک!

ران الفاظ کو سن کر طسفی اپنی باتیں چھوڑنا نہیں کے قریب
آتے ہیں۔ خدام سب مہانوں کو اس واسطے کی اطلاع پہنچا
دیتے ہیں۔ مہمان ایوانِ ضیافت سے باہر نکل آتے ہیں
اور آہستہ آہستہ استیجاب اور حیرت کے عالم میں تائیس اور
نئیس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں،

تائیس۔ (تائیل سے ایسے بچے سے جس میں طنز اور خوشامد دونوں کی آمیزش ہے)
تم کس لیے اس قدر غصے سے جبرے ہو؟ اور تہاری آنکھوں سے جو روشنی چمک
رہی ہے اسے کیوں جھٹلا رہے ہو؟ — — — وہ کون سی سوجس طاقت
ہے جو تہاری تقدیر کے رستے میں مائل ہے؟ — — — انسان عشق کے
لیے بنا ہے اور تم دھوکا کھا رہے ہو۔ — — — انسان علم و فن کے لیے بنا ہے
تہاری آنکھیں کھلیں اندھی ہو رہی ہیں؟ — — — تہارے ہونٹ زندگی
سے آتش ہیں — — — تم عشق کا پختہ کاری کو نہیں جانتے آؤ
ہمارے ساتھ بیٹھ جاؤ اور چھوڑوں کا تانا پن لو — — — عشق کے سوا باقی سب
جھوٹ ہے۔ — — — اپنے بازو عشق کے آگے پھیلا دو۔

تائیل۔ (ہیت بکس کے ساتھ) کبھی نہیں! میں تہاری بے حقیقت کاریوں
سے نفرت کرتا ہوں۔ — — — کبھی نہیں! میں اب ہونٹوں پر خاموشی کی مہر
لگاؤں گا۔ لیکن اسے سیاہ کار محبت! میں تیرے عمل میں آکر تجھے نجات دلاؤں
گا۔ — — — اور تجھ پر فحش پاکر جہنم پر فحش پائوں گا۔

تائیس، نئیس اور بانی لوگ۔ چھوڑوں کا تانا پن لو۔ — — — عشق کے سوا سب جھوٹ
ہے اپنے بازو عشق کے آگے پھیلا دو۔

تائیل۔ (پچھے کو بٹ جاتا ہے اور حضرت ہوتے ہوئے رعب و دھار سے مخاطب
ہوتا ہے) میں تیرے عمل میں آکر تجھ کو نجات دلاؤں گا۔

نئیس اور بانی لوگ۔ (تائیل کو فتنہ دلا کر) دئیس سے سرکشی کرنے والے! ہمت

تائیس۔ (افرڈاٹھی کے مشیقہ جذبات رقص سے انا کرٹ کے لیے اپنا آپ بنھاتے
 ہوئے اور آٹھیل کو غنہ دلاکس وینس سے سرکشی کرنے واسے ہمت ہو تو
 آجاتا۔

دغلام تائیس کا لباس اتارنا شروع کر دیتے ہیں۔ —
 تائیل انتہائی غنہ سے بیچ و تاب کھا کر وہاں سے
 جاگ جاتا ہے۔)

باب دوم

پہلا منظر

تائیس سے کا علی

سودج کی روشنی صحن اور تلاب کے اس پار سے ایوان تک پہنچ رہی
 ہے۔ اس لیے توں قزح کے ایوان مختلفہ سے رنگین ہے اور انکھوں کو
 تکیں بخشتی ہے!

سامنے وینس کا بت استادہ ہے اور اس کے پائے کے بالمقابل ایک
 اونٹنی بھر میں سے خوشبو دارہ حواں اٹھ رہا ہے۔ فرش پر بیٹھ بہا
 قالین اور ان پر کاہار گدیلے اور صرائے یبیا کے شیروں کی کھائیں
 بچی ہیں۔ جا بجا پھولان میں سوتم ہمارے پھول سجے ہیں۔
 تائیس منینوں اور رقاصہ رزکیوں کو ساتھ سے داخل ہوتی ہے۔

(تھوڑی دیر بعد ان سب کو ایک اشارے سے چلے کا حکم ہوتا ہے،
 تائیس۔ رہنا۔ ایسی اور رنج کے بچے میں، آہ! تمکن اور اوسا سے میری زندگی
 بھاری ہو رہی ہے۔ — مرد سب کے سب بے پروا اور بوسن کار
 ہیں۔ عورتیں تاسد اور خواہ ہیں۔ — اور نہ گرا، گھڑاں، تھوڑے، عورتیں،

ہیں — نئے آرام کہاں نصیب ہو گا اور سرت کہاں حاصل ہوگی؟ —
 (سوچ میں ڈوبی ہوئی آئینہ اٹھالیتی ہے) اے میرے وفا کار آئیے۔ مجھے
 ڈھارس دے — مجھ سے کہہ کہ میں اب بھی حسین ہوں۔ مجھ سے کہہ کہ
 میرا حسن لازوال ہے۔ جیہ گلاب کے سے ہونٹ کبھی خشک نہ ہوں گے۔ اور
 میرے باؤں کی سنہری چمک کبھی دم نہ ہوگی — مجھ سے کہہ کہ میں حسین ہوں
 اور میرا حسن لازوال ہے — (سنبھل کر اور عجز سے کان لگا کر سنتی ہے گویا کس
 غیر معلوم مقام سے کوئی آواز کہہ رہی ہے، آہ! اے بے رحم آواز خاموشی
 ہو جا۔ وہ آواز جو مجھ سے کہہ رہی ہے "تائیس تہا حسن ڈھل جائے گا۔"
 تو پھر ایک دن ایسا بھی آئے گا۔ جب تائیس تائیس نہ رہے گی؛ نہیں؛ نہیں!
 مجھے یقین نہیں آتا۔ اگر کوئی معنی ترکیب، کوئی سحر کا فن ایسا نہیں جو من کو
 بقترار رکھ سکے۔ تو اسے دہنیں، تو ہی مجھے اس کے ابدی ہونے کا یقین دلا۔
 (دہنیں کے بت سے مخاطب ہو کر زیر لب دُعا مانگتے ہوئے، دہنیں! —
 جو آنکھوں سے اُدھل ہے اور پھر بھی موجود ہے۔ دہنیں! مجھے جواب
 دے، مجھ سے کہہ کہ میں حسین ہوں اور میرا حسن لازوال ہے۔ میرے گلاب
 سے ہونٹ کبھی خشک نہ ہوں گے۔ اور میرے باؤں کی سنہری چمک دم نہ
 ہوگی — مجھ سے کہہ کہ میں حسین ہوں اور میرا حسن لازوال ہے ہمیشہ کے لیے!
 ہمیشہ کے لیے! ہمیشہ کے لیے!

(اس کی نظر آٹائیل پر پڑتی ہے جو چپ چاپ اندھا کر

دہلیز کے پاس ٹھہر گیا ہے۔)

تائیس (اخلاق کے ساتھ) اجنبی تم اپنے کہنے کے مطابق آہی گئے۔

آٹائیل۔ (زیر لب دُعا مانگتے ہوئے) اے خداوند! اس عورت کا درخشاں

چہرہ میری آنکھوں کو خیرہ نہ کرے۔ اس کی دلاؤ بڑی کا جادو میرے

استقلال کے سامنے بے کار رہ جائے۔

تائیس۔ (مسکاکر) کبوکیا کہا ہے؟

انائیل۔ لوگ کہتے ہیں تم بے مثال ہو۔ اس لیے میں تم سے ملنے کا آرزو مند تھا اور اب جبکہ میں نے تم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ تم پر قابو پانا میرے لیے کس قدر فخر کا باعث ہو گا۔

تائیس (مسکرا کر) تمہارا عجز طبع مرتبہ ہے تمہارا عجز اس سے بھی زیادہ سرکش ہے خود سراجنبی! بہت سیار ہو، کہیں مجھ سے محبت نہ کرنے لگ جاؤ۔

انائیل سے دھڑبے کے ساتھ، تائیس میں تم سے محبت کرتا ہوں اور اس کا اعتراف کرنے کے لیے بے قرار ہو رہا ہوں۔ لیکن ایسی محبت نہیں جیسی تم سمجھتی ہو۔ میں مقدس روح کے نام پر رخصتی اور راستی کے نام پر تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں تمہیں جس عیش کا وعدہ دلاتا ہوں وہ تمہاری سچوں سے آراستہ مشرت کاریوں اور ایک مختصر شبِ دسمال کے خواب سے کہیں بڑھ کر ہے۔ جو رحمت میں آج تمہارے پاس لے کر آیا ہوں اس کا کوئی انجام نہیں۔

تائیس۔ (دطنز آمیز لہجے میں) اتچھا تو مجھے اس ٹیب وغریب محبت کے کرشمے دکھاؤ۔ نچا مشق تو صرف بسوں کی زبان سے بولتا ہے۔

انائیل۔ تائیس! میری سہنی منت اڑاؤ۔ جو مشق میں تمہیں سکھانے آیا ہوں اس سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔

تائیس۔ (بے پروائی سے) دوست! تم بہت دیر میں آئے۔ میں ہریزوت سے واقف ہوں۔

انائیل۔ جس مشق سے تم واقف ہو۔ وہ شرم اور حیا سوزی سے ہم کنار ہے۔ جو میں تمہیں سکھانے آیا ہوں صرف وہی ایک مشق بلند پایہ ہے۔

تائیس۔ احمق ہو کر جس کے ہاں بہان ہو، اس کی توہین کرتے ہو:

انائیل۔ توہین! — میں تو صرف تمہیں راہ حق پر لانا چاہتا ہوں اس کا جوش بڑھتا

جاتا ہے، آہ کون ہے کہ جو میرے الفاظ کو شعلوں کی طہرت

بھڑکا دے تاکہ میرے ایک سانس سے اسے رقاصہ تیرا دل موم کی طرح

پگھل جائے۔ کون ہے جو تجھے میرے حوالے کر دے۔ کون ہے جو میری

گفتار میں سندر کا ماطوفان پیدا کر دے کہ اس کی چڑھتی ہوئی لہریں تیری
مدح کو حیات ابدی کے لیے پکیزہ بنا دیں۔
تائیس۔ (کچھ بے قراری بر کر تائیل کو سہمی ہوئی نظروں سے دیکھتی ہے) حیات ابدی
کے لیے؛

تائیل۔ ہاں حیات ابدی کے لیے!
تائیس۔ اپنے دل سے فیصلہ کر چکی ہے لیکن باجی اظہار میں تامل باقی ہے، مجھے سب
حال بتاؤ۔ اس پراسرار عشق کا حال! — میں سب کچھ مانوں گی۔ میں
سن رہی ہوں۔

تائیس ایک سونے کے چمچے سے خوشبو دار مسالہ
ہنگ میں ڈالتی ہے۔
تائیل۔ (دگھبرا کر اپنے آپ سے) خوف کے طوفان میرے خیالات کو برہم کر
رہے ہیں۔ اے خداوند! کس عورت کا درخشندہ چہرہ میری آنکھوں
کو خیرہ نہ کرے۔

ردھوئیں کا بادل تائیس اور وئیس کے بت دونوں
کے ارد گرد چھا جاتا ہے۔ تائیل تائیس پر نظریں
جائے رہتا ہے اور تائیس مسکراتی ہوئی پراسرار
الفاظ دہرائتی ہے۔

تائیس۔ اے وئیس۔ جو آنکھوں سے اوچھلے در پھر بھی موجود ہے!
تائیل۔ اے خدا! اس کی دلاویزی کا بارو میرے استقلال کے سامنے بیکار
رہ جائے۔

تائیس۔ اے وئیس اپنی بلندی سے نیچے اتر آ۔ اور حکومت کر! وئیس جو آسمان
کا درخشانی اور برف کی سفیدی ہے! مجھ درخشندگی ہے راست ہے اور
شرعی ہے۔

تائیل۔ اپنے دل کو کڑا کر کے اپنا باکس فاخرہ جو سیاہ پشم کے کرتے کے اوپر پہنے

ہو کے پھاڑ کر تار ڈالتا ہے) میں اینٹوں کے کاراسب اتانیل ہوں۔
میں مقدس صحرا سے آیا ہوں اور میں نفس لکڑہ پر لعنت بھیجتا ہوں اور اس
موت پر لعنت بھیجتا ہوں جس کے بچنے میں تو گرفتار ہے، اور اسے عورت!
میں تیرے سامنے اس طرح کھڑا ہوں گویا کسی قبر کے سامنے کھڑا ہوں اور
تجھ سے کہہ رہا ہوں کہ تائیس! خدا کے حکم سے زندہ ہو جا!

(تائیس کا ننگ خون کے مارے فتی ہے۔)

وہ ہاتھ بڑے روتی اور سکیاں مہرتی ہوئی اتانیل

کے قتل میں گر پڑتی ہے۔)

تائیس۔ مجھے سزا مت دو، بکو تم مجھ سے کیا پاتے ہو؟ میں جانتی ہوں کہ مہرائے
مقدس کے لوگ ان ہستیوں سے نفرت کرتے ہیں جو عشرت کا مکھونا بن
جاتی ہیں۔ لیکن مجھ سے نفرت مت کرو۔ مجھے ذلقت پر پند نفرت پر اختیار
نہا اور میرا کیا قصہ کہیں حسین ہوں۔ مجھے جان سے مٹا مارو آہ میں موت
سے خوف کھاتی ہوں۔

اتانیل (جوش کے ساتھ) نہیں تم ابد تک زندہ ہوگی اور ہمیشہ کے لیے یوحنا یوحنا
کی محبوبہ اور دہن بنی رہو گی۔ وہ یوحنا یوحنا جس کی تم دشمن تھیں۔

تائیس (دجوش مسرت کے ساتھ) میری رونا مسرت اور تازگی سے مہر رہی ہے
میں تھر تھرا رہی ہوں۔ یہ مجھ پر کیا جادو کر رہا ہے؟

دشمن کی آواز دور سنائی دیتی ہے، اور آہستہ

آہستہ قریب تر ہوتی جاتی ہے،

دشمن کی آواز۔ اے تائیس! نازک اندام حسینہ! میں آخری مرتبہ تیرے ٹھول
سے ہونٹوں کا عشق تجھ سے طلب کرتا ہوں۔

تائیس۔ (اس آواز کو نفرت سے سنتی ہوں) آہ تائیس! (گھبراہٹ کے عالم میں

اپنے آپ سے) میری رونا اب میرے بس میں نہیں۔ مجھ سے محبت کرو۔

(دیکھ کر نفرت کے ساتھ) میں نے کبھی کسی کو نہیں چاہا۔ اسے صرف عشق سے

مشت ہے۔

تائیل۔ تم اس کی آواز سن رہی ہو؟

تائیس (تائیل سے) ہاں جاؤ! اس سے کچھ دو کہ میں اس سے نفرت کرتی ہوں۔

تائیل۔ (حکم کے بہتے ہیں) تمہاری دلہیز پر طلوع آفتاب تک میں تمہارا انتظار کروں گا۔

تائیس (سکشی کی آخری گمشدگی کرتے ہوئے) نہیں میں رفاقتہائیس ہوں اور رفاقتہ تائیس ہی رہوں گی۔ مجھے کسی چیز پر یقین نہیں۔ اور مجھے کسی چیز کی تمنا نہیں نہ اس کی نہ تمہاری نہ تمہارے خدا کی۔

(دیوانہ وار سنتی ہے اور پھر سکھیاں بھرنے لگتی ہے اور گھٹیوں پر منہ کے بل گر کر رونے لگتی ہے تائیل نقدیں اور اعتماد کی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا ہے اور پھر رخصت ہو جاتا ہے۔

پر وہ آہستہ آہستہ گرتا ہے۔ کوسنی اگلے سین کے آغاز تک باہر رہتی ہے۔

دوسترا منظر

صبح کازب

تائیس کے محل کے سامنے کاجوک۔

محل کی ڈیورٹی کے پاس ایپرکس کا ایک چھوٹا سا بت ایستا وہ ہے اور اس کے سامنے ایک چراغ روشن ہے۔ ابھی چاند کی

روشنی چمکی نہیں پڑی۔

ڈیورٹی کی میزوں کے سامنے تائیل فرش کے پتھروں پر

سر رکھے سو رہا ہے۔

دور دائیں طرف کو ایک مکان ہے جس میں نسیم اور اس کے ہمراہی عجب ہیں۔ مکان کی کھڑکیوں میں سے رکشنی دکھائی دے رہی ہے۔ اور محفلِ نشاط کی کوشقی مدغم ہی سنائی دے رہی ہے۔

(تھوڑی دیر کے بعد تائیس کے نعل کا دروازہ کھلتا ہے اور تائیس باہر آتی ہے۔ چراغ کو سر سے اوپر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھتی ہے اور چھ بٹریوں سے نپتے اترتی ہے۔ جب اس کی نظر آٹائیل پر پڑتی ہے تو چراغ کو اپنی جگہ پر رکھ کر اور پھر آٹائیل کی طرف واپس آتی ہے۔)

تائیس (آٹائیل کی طرف جھک کر، نرم لہجے میں اور ادب کے ساتھ، اسے مقدس باپ! میں خدا کا پیغام تیری زبان سے سنا۔ میں حاضر ہوں آٹائیل (اٹھ کر نرم لہجے میں اور ادب کے ساتھ) تائیس! خدا تمہاری راہ تک رہا تھا۔

تائیس (اور بھی نرم لہجے میں اور عجز کے ساتھ) تمہارے الفاظ میرے دُکھے ہوئے دل کا مرہم تھے۔ میں دُعا مانگتی رہی ہوں میں اسنو بہاؤتی رہی ہوں میری رُوح کے اندر نور کے چشے اُبل رہے ہیں۔ میں نے سوس اور نساہت کی بند مایکی کو دیکھ لیا ہے۔ تم نے آنے کا حکم دیا تھا۔ میں ہنسی ہوں۔

آٹائیل۔ اتنے میری بہن! بہت کو کہ مسرت کی خبر ہو رہی ہے۔

تائیس۔ (عجز کے ساتھ) مجھے کیا حکم ہے؟

آٹائیل۔ یہاں سے قریب مغرب کی طرف ایک راہب نما ہے۔ جہاں برگزیدہ عورتیں فرشتوں کی مانند دو سال دائمی میں زندگی بسر کر رہی ہیں۔ وہ نساہت ہیں تاکہ سیوٹ میتھ ان سے محبت کرے۔ حیا دار ہیں تاکہ سیوٹ میتھ ان کی طرف نظر اٹھانے۔ باسعیت ہیں تاکہ وہ انہیں اپنا آغوش میں لے لیں۔ میں تمہیں وہاں لے جاؤں گا اور تجھے مادر مقدس البین کے توالے کر دوں گا۔

تائیس - ابین - دو وہاب سیرز کی دسترا

اتائیل (سادگی سے) اور یونا کی پکیزہ ترین لونڈی۔ دن پراسرار بچے میں، وہاں میں تمہیں
ایک تنگ کوٹھری میں بند کر دوں گا۔ اور پھر ایک دن یوحنا مسیح آکر تمہیں
نبات دلائے گا (اس کا کبوش بڑھ رہا ہے) جو پرعتین رکھو اور خوف مت کا ڈ
وہ خود آئے گا اور تمہاری روح کی گہرائیاں تھر تھرا اٹھیں گی۔ جب وہ اپنی زور
کی انگلیوں سے تمہارے آنسو پونجھنے کے لیے تمہاری آنکھوں کو چھوئے گا۔

تائیس - (سرت سے) آہ مقدس باپ مجھے ابین کے گھر لے چل۔

اتائیل - ہاں۔ مگر پہلے ان سپینڈیل کو فنا کر دو جو ناپاک تائیس کی ملکیت تھیں۔ اپنے
محل کو اپنی زور دولت کو، اس مال و منال کو جو تمہاری سیاہ کاری کا شاہد ہے سب
کو چھونک دو سب کو فنا کر دو۔

تائیس (وفا بے کتاب نہلا کر) مقدس باپ ایسا ہی ہو گا دگر کی طرف جاتی ہے لیکن
مسکراتی ہوئی ایروس کے بڑے کے سامنے بیٹھ جاتی ہے، میں اپنے ساتھ

اپنی گزشتہ زندگی کی کوئی یادگار نہیں لے جانا چاہتی۔ بجز اس کے دُبت کو اٹھا لیتی

ہے اور اتائیل کے پاس جا کر اسے دکھاتی ہے، بجز اس کا تھی رانت

کے بت کے جو قدیم نلنے کی ہنرمندی اور دستکاری کی تخلیق ہے۔ یہ

ایروس کا بت۔ ایروس جو عشق کا دیوتا ہے دزم لہجے اور پاکیزہ گفتاری سے

اسے مقدس کا باپ؛ ہم اس پر بے رحمی کیے کر سکتے ہیں۔ عشق ایک نادر دولت

ہے میری ترمانی عشق نہیں۔ عشق کی خلاف بندی کا نتیجہ ہے۔ آہ مجھے اس بات

کا انوس نہیں کہ میں سے عشق کو اپنا آقا تسلیم کیا بلکہ صدمہ اس بات کا ہے کہ میں نے

اس کے احکام کو غلط سمجھا۔ عشق کا حکم ہے کہ جو "مرد میرا نام لئے بغیر اپنی آغوش

پہیلانے اس کی آغوش سے کناہ کر دے" اس قانون کی وجہ سے اس کا احترام

واجب ہے۔ اسے نے کہ کسی راہب خانے میں رکھ دینا کہ جن کی نظر اس۔

پر پڑے وہ پھر خدا کی طرف رجوع کریں۔ کیونکہ عشق ہی زردبان حقیقت

راہب لئے بد، جب نہیں مجھے چاہتا تھا تو کس نے مجھے یہ بت نہتے

طہر پر دیا تھا۔

ٹائیل۔ (غصے سے بے تاب ہو کر) نہیں! آہ ان مزدوروں پر لعنت ہو، جن سے یہ تحفہ مجھے ملا۔ اس کا نشان بھی باقی مت رہنے دو۔ بٹ کو پھین کر زور سے فرش پر پھینک دیتا ہے۔ جس سے وہ چور چور ہو جاتا ہے۔ ٹائیل اس کے ٹکڑوں کو ٹھوکروں سے بکھیر دیتا ہے، اور اپنا سب کچھ شعلوں کے سپرد کر دو۔ یا کسی گہری غار میں دھکیل دو! اپنی گزشتہ زندگی کو پھر خاک میں ملا دو۔ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کی یاد دل سے محو کر دو۔

ٹائیس۔ (سر جھٹکے کانپ رہی ہوتی) سب کچھ خاک میں مل جائے گا۔ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محو ہو جائے گا۔ آؤ! ٹائیل۔ چلو۔

(ٹائیل اور ٹائیس کے چلے جانے کے بعد ٹائیس اور سین نمبر ۳ کے نام اشخاص داخل ہوتے ہیں۔ شور مچاتے ہوئے اور بننے کھینے آگے بڑھتے ہیں۔ ٹائیس سب سے پیش پیش سرخوشی کے عالم میں ذرا اڑکھڑاتا ہوا چل رہا ہے۔)

ٹائیس اور اس کے ہمراہی۔ دوکسترا میرے ساتھ ساتھ رہو۔ ابھی صبح نہیں ہوئی۔ قسمت نے ٹائیس کی قسمت سے تیس گنی مسرت میرے دامن میں بھر دی ہے اس لئے ایک بار نہیں سو بار خوشی مناؤ۔

مشرق کی رقاصہ راکھیوں کو بلاؤ۔ رقاصہ راکھیوں کو سپیروں کو اور معجزوں کو اور قس کا ہنگامہ صبح تک نہ چھنے دو۔

میانوں کے دروازے کشکشاؤ۔ مشعلیں روشن کر دو۔ سورج کو شرمادو۔ رات میں مچی ہوئی شراب نڈھا دو۔ نرم نرم قالین ہیں پر۔ پچھا دو اور کروہیل

اور مڑتال تم بھی میری آغوش میں آ جاؤ

زندگی کے سوا باقی سب جھوٹ ہے۔ دیوانگی کے سوا باقی سب حماقت ہے۔
 (نہیں کے ہمراہی بڑی مستعدی کے ساتھ اس کا حکام
 بجا لاتے ہیں وہ خود پیش پرست انداز میں گدیوں پر گر پڑتا
 ہے اس کے ارد گرد کروہیل، مثال، بہت سی لڑکیاں اور
 رقاصہ لڑکیاں جھجھکتی ہیں۔)

(ہنکاڑہ رقص)

رقص ہو چکنے کے بعد سارہ، داخل ہوتی ہے،
 نہیں۔ آہ ذہنیہ سب سے زیادہ آگئی — کدیل اپنا باب اٹھا اور
 دونوں مل کر حسن کا گیت گاؤ۔

و کروہیل اور مڑتال دونوں ساز بجاتی ہیں اور گاتی ہیں
 'سارہ، ہلکے ہلکے قدم اٹھاتی ہوئی اور آہستہ آہستہ اپنے
 جسم کو پکاتی ہوئی رقص کرتی ہے اور نرم آواز میں کدیل
 اور مڑتال کے ساتھ مل کر گاتی ہے،

کروہیل اور مڑتال - ۱، وہ حسینہ آگئی جس کا حسن مکہ صبا سے بھی زیادہ دلآویز ہے
 جو آئینوں پر رقص کرتی تھی!
 ۲، اور اس کے نقاب کے اندر سے اس کی سُریلی آواز آگ کے تیروں کی
 طرح نکل رہی ہے۔

ہاں اس کا رنگ کبریا کی مانند بکا سنہری ہے اس کے بوزٹ لہو کی مانند سُرخ
 ہیں۔ اسکی آنکھیں رات کی مانند کالی ہیں۔

وہ اس کی حرکات سرسبز کی جنبش کی مانند نازک اور سی پند سے کی پرواز
 کی مانند لطیف ہیں۔

دہ، اس کی نظروں کے دام میں کئی دل گرفتار ہیں۔ اس کی نگاہیں

بے پناہ ہیں!

دہ، وہ دل چپین لیتی ہے اور وصل کی لذت لٹاتی ہے اس کے سفاک حسن کا
کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔

دی وہ سنگ دل صنم کی مانند ہے جسے علم نہیں کہ وہ جب چاہے تباہ کر سکتی ہے۔
(رقص کچھ دیر جاری رہ کر ختم ہو جاتا ہے۔)
(عین اس وقت آناٹیل ایک روشن مثل بلاتھ میں اٹھائے
جلدی جلدی عمل سے باہر نکلتا ہے۔)

نہیں (طنز آمیز لہجے میں) ارے یہ تو وہ ہے۔ یہ تو آناٹیل ہے۔

سہراہی۔ آناٹیل! دانش مندوں کے دانش مند! تم پر سلام ہو! تائیس نے تمہاری
عقل کو اندھا کر دیا؟ (ہنس کر) وہ دیکھو وہ دیکھو۔ اس رباب کے درختوں چہرے
کی طرف دیکھو!

آناٹیل (مشعل کو زمین پر پھینک دیتا ہے جس سے وہ بجھ جاتی ہے) اپنی زبان رک
ہو تائیس خداوند کی دلہن ہے۔ اب وہ تم لوگوں کی ملکیت نہیں رہی۔ ناپاک تائیس
ہمیشہ کے لیے مر چکی۔ اور اب ایک دوسری تائیس — — — وہ دیکھو

آ رہی ہے!

د تائیس داخل ہوتی ہے۔

اس کے بال کھلے ہیں۔ اور اس نے مٹھا اونی لباس پہن
رکھا ہے۔ نوڈیاں حسرت زدہ اس کے چہرے پہ آتی ہیں۔
اور بار بار مڑ کر عمل کی طرف دیکھتی ہیں۔

عمل سے بکا بکا دھواں اٹھ رہا ہے۔ تھوڑی دیر میں آگ
کے شعلے نکلنے لگیں گے اور آگ سین کے اختتام تک بڑھتی
جائے گی۔

شور و غوغا اور قہقہوں کی آواز سن کر آہستہ آہستہ چوک میں

ہجوم جمع ہونا شروع ہو گیا ہے۔
 تائیل سے۔ (تائیس سے) مقدس بن! آؤ اس شہر سے ہیشہ کے لیے جاگ جائیں۔
 لوگوں کا ایک گروہ۔ نہیں۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ کبھی نہیں۔
 ہجوم اور تیس سے کے ہمراہی۔ (عائل ہو کر) کیا یہ اسے اپنے ساتھ لے جا رہا ہے؟
 یہ کیا کر رہا ہے؟

تائیس۔ ہاں یہ سچ کہتا ہے۔
 تیس۔ تائیس! تم ہم سے جلی جاؤ گی کیا یہ ممکن ہے؟ (تائیس کو بازو سے پکڑ
 لیتا ہے)

تائیل۔ (تائیس کو چھڑا کر) ناپاک شخص! امدت لگایا تو جان سے مار دیا جائے گا۔ اس
 کاہم مقدس ہے! یہ خدا کی ملکیت ہے۔ (تائیس کو اپنے قریب لاکر چپ جانے
 کی کوشش کرتا ہے) آگے سے ہٹ جاؤ۔

ہجوم۔ (برافروختہ ہو کر) نہیں نہیں۔ یہ شخص کیا چاہتا ہے؟ یہ صحرا کو واپس کیوں نہیں
 چلا جاتا؟

ایک گروہ۔ (تائیل کو دھمکا کر) بن مانس! یہاں سے دُور ہو جاؤ!
 ہجوم۔ یہ تائیس کو ہم سے لے جائے گا اچھا! میرے طبوسات! میرے ہار!
 میرے گھوڑے! میرے جواہرات! ہمیں ان کی قیمت کون ادا کرے گا؟
 کیا کوئی قانون ہماری مدد نہیں کر سکتا؟ یہ تائیس کو ہم سے چھین رہا ہے۔
 خوفزدہ عورتیں۔ (جلتے ہوئے مکان کی طرف اشارہ کر کے) شعلے، آگ، عمل
 جل رہا ہے۔

ہجوم۔ (ظہور مچاتے ہوئے) تائیس یہیں رہے گی۔ اس شخص کو جان سے مار دو،
 اسے کسی گڑھے میں دھکیں دو، اسے چانسی پر لٹکا دو، اسے چیلوں کے آگے
 ڈال دو۔

ہجوم میں سے ایک شخص۔ (ایک پتھر اٹھا کر تائیل کے ماتا ہے جس سے اس کا چہرہ
 زخمی ہو جاتا ہے، مردود! یہ لے!

تائیل اور تائیس۔ (ایک دوسرے کے بالکل پکس کھڑے بنیر کسی خوف و اضطراب کے هجوم کو دیکھ رہے ہیں تھلے بند تر ہوتے جاتے ہیں، آہ! اگر موت کی گھڑی سر پر آگئی ہے تو آؤ جان خدا کے سپرد کر دیں اور اپنے خون کی قیمت سے ایک لمحے کے اندر ابدی مسرت خرید لیں۔

ہجوم۔ (ایک دوسرے پر گرتے ہوئے اشرفیاں اٹھانے لگ جاتے ہیں، اشرفیاں سونا!

نسیں۔ (تائیل اور تائیس سے، جاؤ! خدا حافظ! تائیس تم مجھے بھلا دو گی! لیکن اس سے کیا حاصل؟ تمہاری یاد سے میری روح ہمیشہ خوشبو میں بسی رہے گی۔
نسیں اور بھی سونا بکھرتا ہے۔ ہجوم چہر شور مچاتا ہے
تائیل اور تائیس جاگ جاتے ہیں۔

مل جل رہا ہے۔)

باب سوئم پہلا منظر

خیابان —

کھجور کے درختوں کے سایے میں ایک کواں۔

دو درختوں میں راہگیروں کے آرام کے لیے ایک مجوز پٹری ہے۔ اس سے بھی پرے ریگستان کے کنارے البین کا سفید گھر دھوپ میں چمک رہا ہے۔ ٹوڈر بہت بند ہے۔ کھجور کے درختوں کے نیچے بہت سی عورتیں چپ چاپ کوزئیں مچاتی ہیں۔ اور پھر اوپر آکر چلی جاتی ہیں۔ ٹوڈری دیر کے بعد تائیل اور تائیس داخل ہوتے ہیں۔ تائیس تکان کے مارے کھڑی بھی شکل سے ہو سکتی ہے۔)

تائیس۔ میں گرمی کی شدت سے بڑھ چلا ہوں۔ آہ میں سختیوں سے مری جاتی ہوں۔ ذرا دم لینے کو ٹھہر جائیں

تائیل۔ نہیں آگے بڑھی چلو۔ اپنے جسم کو کپل ڈالو۔ اپنے نفس کو ذلیل و خوار کر دو۔
تائیس۔ (عجز کے ساتھ) مقدس باپ! تم سچ کہتے ہو میں اپنا ڈکھ شیخ خداوندی کی
نظر کرتی ہوں۔

تائیل۔ صرف تو بہ ہی سے گناہ دُصلتے ہیں اور روح پاکیزہ جوتی ہے۔ بڑھی چلو!
یہ لغزب جسم ہے تو نے کافروں، مشرکوں (جو شس سے) نیس کے حوالے
کیا تھا۔ آہ! یہ پھر بھی خدا کا بنتا ہوا جسم ہے۔ خدا نے اسے اپنے مقدس نام
کی عبادت گاہ بنایا تھا اور اب کہ تمہیں حقیقت کی ایک جھلک دکھائی دے
گئی ہے جب کبھی تمہارا ہونٹ سے ہونٹ یا ماتھ سے ماتھ ملے گا۔ تمہارا
دل نفرت اور گھمن سے بھر جائے گا۔

تائیس۔ مقدس باپ تم سچ کہتے ہو۔

تائیل آگے بڑھو۔ گنہگاروں کا کفارہ دافا کرو۔

تائیس۔ (دُخلف زدہ) کیا ہم ابھی خانہ خدا سے دُور ہیں؟

تائیل (دُشستہ سے) یہ پوچھنا بے سُوو ہے آگے بڑھو!

تائیس۔ (راکھڑاتی ہوئی) میں نہیں چلی سکتی! — محترم باپ! مجھے صاف کر دو۔

(غش کا گرگرنے کو ہے کہ تائیل اسے اپنے بازوؤں میں

جنجال لیتا ہے اور سایے میں بٹھا دیتا ہے۔ کچھ دیر

چُپ چاپ کس کو دیکھا رہتا ہے اور پھر یک لمٹ

اس کے چہرے سے رقم چکنے لگتا ہے)

تائیل۔ آہ تمہارے سفید سفید لمبوں سے خون کے قطرے نکل رہے ہیں۔

میرا دل ترس کھا رہا ہے۔ بد نصیب مردے، سیاہ بخت دختر! اسے

مقدس تائیس اسے میری بہن! میں نے اس آنائش کو حد سے زیادہ سخت

بنا دیا۔ مجھے صاف کر دو (سر بسجود ہو کر روتا ہے اور احترام کے جذبات کے

ساتھ تائیس کے خون آلودہ پاؤں چُمتا ہے) مقدس تائیس! محترم تائیس!

تائیس۔ دور تک اس کے چہرے کو دیکھتی رہتی ہے، تمہارے الفاظ میں صبح کی

سی تازگی بت۔ چلو اب آگے چلیں۔

آٹائیل۔ (دنی کے ساتھ بکری) ابھی نہیں! تازہ پانی اور چلوں سے تمہارے جسم میں طاقت آجائے گی۔ تم یہیں ٹھہرو۔ میں اس مسافر خانے کے پاس کنویں تک جا کر پانی لے آؤں۔ وہ پر سے جو سفید جھونپڑیاں دکھائی دیتی ہیں۔ وہ البین کا راہب خانہ ہے منزل قریب ہے بہت نہ مارو اور خدا سے دعا مانگو۔
(آہستہ آہستہ چلا جاتا ہے۔ درختوں کے پاس جھونپڑی کے اندر داخل ہوتا ہے وہاں سے ٹوکری میں کچھ چھل لے کر باہر آتا ہے اور پھر کڑی کا ایک پیالہ لئے کنویں کی طرف جاتا ہے۔)

تائیس (تہا) اے خدا کے پیامبر! جس کی سختی بھی نیکی ہے۔ تجھ پر خدا کی رحمت ہو کہ تو نے آسمان کے دروازے مجھ پر کھول دیئے۔ میرے جسم سے خون بہ رہا ہے اور میری روح مسرت سے بھر رہی ہے۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے میرے پتے بوئے ماتھے کو ٹھنڈا کر رہے ہیں۔ تمہارا شیریں اور رقت افزا تصور چہنچہ کے پانی سے بھی تازہ اور شہد سے بھی میٹھا ہے میری روح علائق سفلی سے آزاد ہو کر ایک لامتناہی فضا میں پرواز کر رہی ہے
میرے باپ: تم پر خدا کی رحمت ہو!

(آٹائیل پانی اور چھل لے کر واپس آتا ہے۔)

آٹائیل اپنے ہاتھ دھو لو۔ اپنے ہونٹ تھک کر رو، یہ چھل کھا لو۔ اور اس تپش کو ٹھنڈا کر لو جس سے تمہاری آنکھیں چمک رہی ہیں۔ تمہاری زندگی اب میری بے بہا دولت ہے یہ میری ہے۔ خدا نے اسے میرے سپرد کیا ہے۔

تائیس کے ہاتھ پر پانی ڈالتا ہے اور اپنے ہاتھوں سے اسے پانی پلاتا ہے تائیس خود پی کر مسکراتی ہوئی پیالہ اسکی طرف بڑھاتی ہے۔

تائیس۔ اب تم چلو:

انائیل - نہیں! تمہیں تازہ دم دیکھ کر سیری پھاس بھگ گئی بت۔ تمہارے دکھ کو فور
کرنا ہی سب سے بڑی خوشی ہے۔ تائیس! اے جان کی راحت!
تائیس۔ اے نیکی کے فرشتے۔

و اسے پھل کھانے کے لیے دیتا ہے اور خود پھر کنویں
سے پانی بھر لاتا ہے اس کے بعد مکمل خاموشی چھا جاتی ہے۔
دور سے حمد کے گیتوں کی آواز مدہم سی سنائی دیتی ہے
اور آہستہ آہستہ چلتی جاتی ہے اور البین اور راہب لڑکیوں
کا گروہ داخل ہوتا ہے۔

آوازیں۔ (دور سے) اے باپ جو آسمان پر حکومت کرتا ہے۔ ہمیں آج کے
کے دن رزق مٹاؤ!

تائیس۔ کون آ رہا ہے؟

انائیل۔ محترم البین اور اس کی بہنیں راہب خانے کی کالی روٹی لارہی ہیں۔ وہ ہماری
طرف آ رہی ہیں اور خدا کی حمد گا رہی ہیں۔

آوازیں۔ (بہت ہی قریب) خداوند ہمیں آزمائش میں نہ ڈال اور ہمیں بدی سے بچائے
رکھ!

(البین اور دوسری عورتیں داخل ہوتی ہے۔)

انائیل۔ آمین!

انائیل کو دیکھ کر البین اور دیگر راہب عورتیں ٹھہر جاتی
ہیں اور بہت ادب اور احترام کے انداز میں کھڑی ہو
جاتی ہیں۔ تائیس بھی اٹھ کر انائیل کے پاس کھڑی
ہو جاتی ہے۔

انائیل۔ (البین سے) محترم البین! تم پر خدا کی برکت نازل ہو۔ میں تمہارے آسمانی چہرے
میں ایک ایسی تبد کی مکھی لایا ہوں۔ جسے میں نے قبل خداوندی کی مدد سے ایک
بے برگ و گل رستے پر بٹکتا پایا۔ میں نے اس کو زور و خفیت جان کو اپنے ہاتھ

میں لے لیا۔ اپنے سانس سے اس میں جان ڈالی اور اب میں اسے خدا کی نذر
 کرنے کے لیے تمہارے سپرد کرتا ہوں۔
 اے ابن۔ میری بیٹی میرے قریب آؤ۔

(تائیس کو مادرانہ شفقت کے ساتھ گلے لگا لیتی ہے۔)
 اناٹیل۔ میں اس سے آگے نہ جاؤں گا۔ بیٹا فرمن پورا ہو چکا۔ پیاری تائیس! خدا حافظ!
 اب تم تنگ کوشٹری میں تہنا زندگی بسر کرو اپنے گناہوں سے توبہ کرو اور ہر وقت
 میرے لیے دعا مانگتی رہو!

تائیس (اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر) میں تمہارے دستگیر ہاتھوں کو
 بوسہ دیتی ہوں۔ تم نے مجھے خدا کے دروازے تک پہنچا دیا۔ تم سے جدا ہوتے
 ہوئے مجھے ڈر لگتا ہے۔

اناٹیل۔ رت انگریز الفاظ۔ قابل پرستش آنسو! وہ عاصی خوش قسمت ہے جسے عشق بادی
 نے اپنا لیا ہو (جوش کے ساتھ) اس کا چہرہ کس قدر دل فریب ہے اس کی آنکھوں
 میں مسرت کا نور چمک رہا ہے۔

تائیس۔ خدا حافظ عزم باپ خدا حافظ!... ہمیشہ کے لیے!
 اناٹیل۔ (جیسے اس پر بھلی گری) ہمیشہ کے لیے!
 تائیس۔ دوبارہ ملاقات آسمان پر ہوگی!
 ابن نے اور رہا ہے عورتیں۔ آئین!

و عورتیں تائیس کو ساتھ لے کر رخصت ہو جاتی ہیں! اناٹیل

ان کو اس طرح دیکھتا ہے جیسے خواب کے عالم میں ہو

اناٹیل۔ (تہنا، اس کے قدم آہستہ اٹھ رہے ہیں۔ دھخت اپنی شانیں جھکا دینے میں
 گویا اس کے ماتھے کو خشکی پہنچانا چاہتے ہیں۔ اور کئی دن اور پھر کئی سال گزر
 جائیں گے اور مجھے اس کا چہرہ کبھی نظر نہ آئے گا۔

دعا کا سہارا نے بہت کھڑا اسی طرف دیکھ رہا ہے

پدہ گنا ہے۔)

دوسرا منظر

دمحرائے قیاس —

دیائے نیل کے کنارے سینو بیت راہوں کی جھونپڑیاں۔ مغرب کی
طرف آسمان کا رنگ سُرخ ہے اور معلوم ہوتا ہے۔ آندھی آنے
والی ہے۔

راہب اپنا شام کا کھانا کھا چکے ہیں اور آسمان کو خوفزدہ نظروں سے دیکھ
رہے ہیں۔

دور بادِ موم چلنے لگتی ہے۔

صواری گھرائیوں میں سے گیدڑوں کی آوازیں اور شہزادوں کی دھاڑ سنائی
دیتی ہے۔

راہب ہے۔ آسمان تاریک ہو رہا ہے۔ جان دار اور بے جان اشیاء پر بے ہوش
سی طاری ہو رہی ہے۔ دُور سے گیدڑوں کی چیخیں سنائی دے
رہی ہیں۔ تھوڑی دیر میں ہوائیں، بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک کے ساتھ
تہر کے دروازے کھول دیں گی۔

پالہوں — اپنی اپنی جھونپڑیوں کو واپس چلے جاؤ! اور اپنا غلہ اور محل سنبھال لو ورنہ
آندھی ان کو صحرایں دور تک کھیر دے گی (راہب اس حکم کی تعمیل کرتے ہیں،
ایک راہب۔) (چلتے ہوئے، انا ٹیل! — کیا کسی نے اس کو دیکھا؟

پالہوں۔ اسے واپس وٹے میں دن ہو چکے ہیں لیکن اسے جائیو! جس دن سے وہ
واپس آیا ہے اس نے کچھ کھایا ہے نہ پایا ہے۔ اسے جہنم پر بوجھ نصیب ہوئی
ہے اس نے اس کے جسم و روح کو چور چور کر دیا ہے۔

(انا ٹیل جھونپڑی سے باہر نکلتا ہے۔ جسم غمیدہ ہے چہرہ

تینا ہوا ہے نظریں تپوت ہیں۔)

راہب راہب کے ساتھ، وہ آگیا!

رانا ٹیل ان کے بیچ میں سے ان کو دیکھے بغیر گزر
جاتا ہے۔)

چندا اور رابہ سے۔ اس کا دھیان کہیں اور لگا ہے۔
چندا اور رابہ سے۔ وہ خدا میں محو ہے۔

رابہ سے (چیتے ہوئے) اس کی خاموشی کا احترام کر دہا اور اسے مت چھیرو۔
رانا ٹیل۔ (پالمیوں سے عاجزی کے ساتھ، محترم باپ: مجھے کچھ کہنا ہے۔ مجھے تم سے
اپنے درد و کرب کا اعتراف کرنا ہے۔ اے پالمیوں! تم جانتے ہو کہ میں نے سید کا
ٹائیس کی روح پر نچ پائی۔ اس فتح پر مجھے فخر تھا اور پھر میں اس پر سکون صحرا میں
واپس آیا۔ لیکن اب اطمینان قلب مجھ سے کوسوں دور ہے میں نے اپنے نفس کو
بے رحمی سے کھلایا لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔ میں نے اپنے جسم کو زخموں سے چور چور کیا۔
لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ میں کسی شیطانی جذبے کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوں۔ اس
عورت کے عین کا تصور مجھے دیوانہ بنا رہا ہے۔ مجھے سوائے ٹائیس کے اور کچھ نظر
نہیں آتا۔ او ایس ایک سستی میں مجھے جسم کی بر لذت اور دنیا مئے حمن کا ہر سبب دکھائی
دیتا ہے۔

(شرم کے ماسے پانی پانی جو کچھ پالمیوں کے ذہنوں میں
گھڑ پڑتا ہے۔)

پالمیوں۔ (ٹھی کے ساتھ) میں نے تم سے نہ کہا تھا۔ میرے بیٹے ہم راہوں کو اس
دنیا کے لوگوں سے احترام واجب ہے۔ شیطان کے نکرے خبردار رہو۔
تو پھر تم کیوں جانے پر تلے ہوئے تھے؟ آسمانی باپ تمہارا حامی و ناصر ہو۔
خدا حافظ!

رانا ٹیل کھڑا ہو جاتا ہے پالمیوں اسے گلے لگا کر چلا جاتا
ہے۔ رانا ٹیل تنہا گھٹنوں کے بل چٹائی پر گر کر اپنے بازو
پھیلا دیتا ہے اور خاموشی کے ساتھ خدا سے دعا مانگتا
ہے۔ پھر ہاتھ باندھے بیٹھ کر سو جاتا ہے۔

(تموڑی دیر کے بعد اندھیرے میں تائیس کا تصور چمکتا

جواد کھائی دیتا ہے۔)

تائیس تائیس سے دلفریب اور زنبق شکن انداز میں (تم کس لئے اس قدر غصے سے
بھرتے ہو؟ اور تمہاری آنکھوں میں جو روشنی چمک رہی ہے اسے کیوں
بھٹا رہتے ہو؟

تائیل۔ (عالم خواب میں، تائیس.....)

تائیس۔ (وہ کون سی سوس گامت بنتے جو تمہاری نقدیر کے رستے میں حائل ہے۔ انسان
مشق کے یہ بنا ہے اور تم دیکھو کھار رہے ہو!)
تائیل (گھبر کر جاگ اٹھتا ہے، ملعون کشتیاں! میرے سامنے سے بھٹ جا.....
آہ! میرا جسم چمک رہا ہے۔)

تائیس (غصہ دلا کر، دیش سے سرکشی کرنے والے بہت بڑے تو آجانا!

تائیل۔ (سراسیمہ) میرا دم نکل رہا ہے! تائیس میرے پاس آؤ!

تائیس کا قبضہ سناٹی دیتا ہے اور اس کی شکل دفعۂ غائب
ہو جاتی ہے،

(پھر ایک اور خواب مہوت پذیر ہوتا ہے۔ آسمان ٹکڑا ہوا
ہے اور سامنے ابین کا گھر نظر آ رہا ہے ایک انجیر کے
درخت کے سایے میں تائیس بے حس و حرکت پڑی ہے
اس کا درگزر بائیں عورتیں گھٹنوں کے بل کھڑی ہیں،

تائیل (اس خواب کو دیکھ کر دہشت کے مارے چین مارتا ہے، آہ!

آوازیں۔ ایک مقدس سستی اس دنیا سے رخصت ہونے والی ہے۔ سکندریہ کی تائیس
مرنے کو ہے! تائیس مرنے کو ہے!

تائیل۔ (دیوانہ وار، تائیس مرنے کو ہے! تائیس مرنے کو ہے!) (غصے سے بے تاب

ہو کر، تو پھر یہ آسمان گر کیوں نہیں پڑتا؟ سینوں میں دم کیوں ہے۔ روشنی میں چمک
کیوں ہے۔ کون دیکھتا ہے فنا کیوں نہیں ہو جاتے؟ تائیس مرنے کو ہے۔ آہ ایک

دفعہ پھر اس کو دیکھ لوں۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں۔ اسے گلے سے لگا
لوں۔ اسے اپنے پاس رکھ لوں۔ میں اس کو چاہتا ہوں۔ میری عقل اندھی
تھی جو اس سے پہلے میری سمجھ میں نہ آیا کہ وہی میرا سب کچھ ہے۔ اس کا ایک بوسہ
جنت سے بھی زیادہ عزیز ہے میں اس کے سب چاہنے والوں کو ایک ایک
کر کے قتل کر دیتا۔ نہیں۔ تائیس ابھی زمرہ۔ نہیں۔ نہیں، میں تمہیں سینے
سے لگا لوں گا۔ میری سو جاؤ۔ میری سو جاؤ!

(جاگ اٹھتا ہے اور رات کی تاریکی میں غائب ہو
جاتا ہے۔)

اندھیرا سیاہ بادل، بجلی اور گرج، موسیقی اگلے سین
تک جاری رہتی ہے۔)

تیکہ امنظر

(ابین کے گھر کا باغیچہ۔)

ایک درخت کے سایے میں تائیس بے حس و حرکت پڑی ہے گویا
مردہ ہے۔

(باسب عورتیں اور ابین اس کے گرد جمع ہیں۔)

(باسب عورتیں۔) (ہاتھ باندھے گھٹنوں کے بل کھڑی ہیں اور زیر لب دُعا مانگ
رہی ہیں،) اے خداوند! مجھ پر رحم کر، اے خداوند! اپنی محبت کے صدقے اپنی
رحمانیت کے طفیل میرے گنہوں کو دھو ڈال۔

ابین (تائیس کو دیکھ کر، خدا بجا رہا ہے اور آج رات یہ پاکیزہ چہرہ کفن کی سفیدی
میں چھپ جائے گا۔ تین مہینے تک یہ راتوں کو جاگ جاگ کر ڈھائیس مانگتی رہی
ہے اور آرزو ہاتی رہی ہے اس کا جسم نحیف و زار ہے لیکن اس کے گناہ سب
وُصل چکے ہیں۔)

راہب عورتیں۔ اسے خدا مجھ پر رحم کر۔ اسے خدا اپنی محبت کے سوتے۔
 راناٹیل نندرو اور از حد مخوم باغ میں داخل ہوتا ہے البین
 کو دیکھ کر سنبھل جاتا ہے، اور عاجزی کے انداز میں ٹھہر
 جاتا ہے البین آگے بڑھتی ہے اور راہب عورتیں راناٹیل
 اور تائیس کے درمیان حائل ہو جاتی ہیں۔
 البین۔ راناٹیل سے، محترم باپ! تمہارا آنا مبارک ہو، یقیناً تم اس مقدس ستی کو
 برکت دینے کے لیے آئے ہو!
 راناٹیل۔ (اپنی بدحواسی پر مشکل سے قابو پا کر) ہاں... تائیس!
 البین۔ تمہارے احکام کی پوری تعمیل کرنے کے بعد اب وہ خدا کے دیدار سے
 مشرف ہونے والی ہے۔

راہب عورتیں پیچھے ہٹ جاتی ہیں اور راناٹیل کی
 نظر تائیس پر پڑتی ہے۔
 راناٹیل (بیسے دود سے بے قرار ہو کر) تائیس! تائیس!
 (بے تاب ہو کر منہ کے بل گر پڑتا ہے۔ البین اور
 راہب عورتیں پر سے ہٹ جاتی ہیں اور ڈعا میں
 مشغول ہو جاتی ہیں راناٹیل بعد خشک گھٹنوں کے بل
 کھڑا ہو کر اپنے بازو تائیس کی طرف پھیلاتا ہے۔)
 راناٹیل۔ (بہت ہی ہلکی آواز میں) تائیس! —

تائیس۔ (آنکھیں کھول دیتی ہے اور حسرت زدہ نظروں سے راناٹیل کے چہرے
 کو دیکھتی ہے) محترم باپ! تم ہو! راناٹیل کا جواب اسے بالکل سناٹی
 نہیں دیتا، تمہیں وہ شاندار سزا دی ہے جسے تم بچے یہاں لے کر آئے
 تھے! —

راناٹیل۔ میں تمہارے نسوانی حسن کے سوا باقی سب کچھ بھلا چکا ہوں۔
 تائیس۔ تمہیں وہ راحت اور آرام کی گھڑیاں یاد ہیں۔ اس خیابان کی

ٹھنڈی ہوائیں ؟

اتاٹیل۔ (والہاند) مجھے صرف وہ پیاس یا دہے جو تمہارے سما اور کوئی نہیں
بھا سکتا۔

تائیس۔ اور پھر تمہیں وہ مقدس الفاظ یاد ہیں وہ جب تمہاری زبان سے میں نے
سچے عشق کی حقیقت کو پہچانا۔

اتاٹیل۔ (بے قرار ہو کر) میں تمہیں دھوکہ دے رہا تھا!

تائیس۔ اور وہ دیکھو صبح ہونے والی ہے۔ مشرق کے شہابی رنگ کو دیکھو!
اتاٹیل۔ نہیں۔ نہیں۔ آسمان بے حقیقت ہے سب کچھ بے سچ ہے زندگی اور انسانی
محبت کے سوا باقی سب جھوٹ ہے۔ میں تم پر مرچکا ہوں۔

تائیس۔ جنت کے دروازے کھل رہے ہیں۔ وہ دیکھو خدا کے فرشتے اور رسیل
آپنیے، وہ مسکراتے ہوئے ہاتھوں میں چھول اٹھائے آرہے ہیں۔

اتاٹیل۔ میری راحت، میری زندگی، میری بات سنا!

تائیس۔ اٹھ کر کھڑی ہو گئی ہے اور کانپ رہی ہے، دو سینڈ سینڈ پر دل والے
فرشتے آسمان میں اڑ رہے ہیں اور جیسا کہ تم نے کہا تھا۔ شیخ خداوندی
اپنی نذر کی انگلیوں سے میرے آنسو ہمیشہ کے لیے پونچھ رہا ہے۔

اتاٹیل۔ کہو میں زندہ رہوں گی، کہو میں ابھی نہ مروں گی!

تائیس۔ سنہری ساز کا ترنم مجھے مسخو کر رہا ہے معطر ہوائیں مجھے ست کر رہی ہیں۔

میرنی میٹوں پر آسمانی برسات کا نامل ہو رہا ہے۔ آہ۔ خداوند آہ مجھے خدا

نظر آ رہا ہے۔ (مر جاتی ہے)

اتاٹیل۔ چپ کر گھنٹوں کے بل گر پڑتا ہے)

سیب کا درخت جان گال سرودی

اپنی شادی کی بھیسوں سالگرہ کے دن ایشرسٹ اور اس کی بیوی جنگل کے کنارے موٹر میں سیر کر رہے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ دن بھر سیر کرنے کے بعد رات اس تقریب کی خوشی میں ٹور کی کے مقام پر گئے اور یہاں ان دونوں کی سب سے پہلے ملاقات ہوئی تھی۔ یہ تجویز سیٹلا ایشرسٹ کی تھی جس کی فطرت میں جذبہ پرستی کی ایک جھلک بھی پائی جاتی ہے۔ سیٹلا میں اب وہ پہلے کا ساؤن توہ تھا۔ وہ نیل آنکھیں نہ وہ چولہا کی لطافت نہ وہ چہرہ ادا اعضاء کا پائیزگی سے دیکھ کر آنکھوں کو تسکین ہوتی تھی۔ نہ وہ سیب کے ٹگنے کی سی زنگت جس نے آج سے تھیس سال پہلے ایشرسٹ کے دل کو ایک بن جھلک میں سوہا یا تھا لیکن پنڈیس برس کی عمر بونٹ پر بھی اپنے شہر کی فنا دار رنق تھی۔ چہرہ اب بھی حسین تھا۔ گالوں پر ہلکے ہلکے دان پڑ گئے تھے اور آنکھوں میں ایک لبریری سی آگئی تھی۔

سیٹلا ہی نے موٹر کو ایسے مقام پر ٹھہرایا۔ جہاں بائیں ہاتھ کو مرغزار کی ادنیٰ چڑھائی تھی۔ اور جنگل کا ایک تنگ سا خط، جس میں زیادہ تر بیج اور لڑات اور بھیس بھیس چھڑکے درخت اگے ہوئے تھے اس داوی کی طرف بڑھا ہوا تھا جو سڑک سے کھربے جنگل کی پہلی ادنیٰ پہاڑی تک پھیل ہوئی تھی اسے اپنی جگہ کی تلاش تھی۔ جہاں دونوں بیٹھ کر پٹنٹ لیا نہیں۔ ایشرسٹ کو تو کبھی کسی چیز کی تلاش

نہ تھی، اداہر اداہر چاروں طرف مرز کے سنہری پُپول اُگ رہے تھے۔ لالچ کے برسے بھرے ہلکے پھلے پیروں پاپا فز اپریل کی دُھوپ پڑ رہی تھی۔ اور ان میں سے لمبوؤں کی خوشبو آ رہی تھی۔ سامنے گہری داری کا منظر جنگل کے لمبے لمبے ٹیلوں تک پھیلے ہوا تھا۔ سیٹلا کو آبی رنگوں سے تصویر کھینچنے کا شوق تھا۔ ہر اداہر ان کی نظر اس کے دل کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔ اس پر طبیعت ایسی کہ جھٹ بھرات کافیلہ کر لیتی۔ چنانچہ یہی مقام اسے موزوں معلوم ہوا۔ رنگوں کا ڈبہ ہاتھ میں لیا اور موٹر سے نیچے اُتری۔

”کیوں فرینک؟ یہ جگہ ٹھیک ہے؟“

ایشیئر سٹ کی شکل کچھ کچھ شیلڈ سے ملتی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس کی داڑھی تھی شیلڈ کی داڑھی نہ تھی۔ گالوں پر کے بال سفید تھے۔ لمبا قد۔ لمبی لمبی ٹانگیں۔ بڑی بڑی بھورے رنگ کی کھوٹی کھوٹی آنکھیں جو نہ پر معنی ہوتیں تو چہرہ پر ایک حسن سا آجاتا۔ ناک ذرا ایک طرف کو۔ داڑھی اور مونچھوں کے بیچ میں ہونٹ ذرا کھلے ہوئے اڑتالیں برس کی عمر۔ چُپ چاپ کھانے کی نوکری اٹھائے موٹر سے نیچے اُترا۔

”دیکھو فرینک! قبر!“

مرزار کی اونچان سے ایک گڈنڈی نیچے کو اترتی تھی جو جنگل کے تنگ خطے کے ساتھ ہو کر ایک پھاٹک میں سے نکل جاتی تھی۔ جہاں یہ گڈنڈی سڑک کو عموداً کاٹتی تھی۔ وہاں سڑک کے کنارے سے ٹی کی ایک ڈھیری بن تھی۔ چھ فٹ بس فٹ بھر چوڑی۔ اوپر گھاس اُگی ہوئی تھی۔ مغرب کو ایک تھمر کھڑا تھا۔ جس پر کوئی اللہ کا بندہ بیٹھا تھا۔ تھمر کی ایک ٹہنی اور کچھ نیلے پُپول ڈال گیا تھا۔ ایشیئر سٹ نے قبر کو دیکھا تو سارا دل اٹھ آیا۔ سوچا چوراہے پر تو اس شخص کی قبر بناتے ہیں جس نے خود کشی کی ہو اللہ فانی انسان بھی کیسے کیسے تو ہات پر تکیہ کرتا تھا! لیکن جو ہمیں یہاں دفن ہے سکو کی سینہ سوراہے۔ قبر کے سر بنے ایک ناہوار سا پتھر ہے۔ سر پر کھلے آسمان کا ساتبان ہے اور راہ چلتے لوگ ناتھ پڑھ جاتے ہیں۔ طبیعت موت مرتا تو کسی

قبرستان میں سیلاب سے بھرا ہوتا۔ اور چاروں طرف بد وضع قبریں۔ جن پر طرح طرح کے نام نامل کلمات کندہ ہوتے۔ منہ سے کچھ نہ بولا۔ جانتا تھا گھر کے لوگوں میں فلسفہ بگھانا بلکہ سود ہے۔ چپ چاپ مرنزار کی جانب چل دیا۔ ایک دیوار کے نیچے کھانے کی ٹوکری رکھی۔ بیوی کے بیٹھے کو کھیل بچایا رکھو نہ جب اُسے جھوک نکلی تو تصویر کشی چھوڑ کر یہیں آئے گی، اور جیب سے مرے کا پالٹس کا ترجمہ نکالا۔ تھوڑی دیر میں سپریمین اور اس کے انتقام کی داستان پڑھ چکا تو آسمان کی طرف دیکھنے لگا: نیکیوں آسمان پر بکلاتے بادلوں کو دیکھ کر ایشیئر سٹ کا دل آج اپنی تادی کی پھیپوں سانگرہ کے دن نہ معلوم کس چیز کے لیے تڑپنے لگا۔ سچ ہے۔ زندگی اور فطرت انسانی کا آپس میں جوڑ نہیں؛ انسان کی زندگی کتنی ہی پاک اور نچ بو۔ پھر بھی اندر ہی ایک بوس ایک مستور گل رستی ہے اور زندگی خالی خالی معلوم ہوتی ہے۔ کیا عورتوں کے دل کا بھی یہی حال ہے؛ یہ کون جانے؛ انسان میں ایک مدت پسندی ہے جس کی وجہ سے وہ نئے نئے عشق کی تلاش میں رہتا ہے اور ستانہ دار نئے بھگڑوں میں پڑنا چاہتا ہے لیکن اگر اس کی تسکین ہو جاتے تو جہاں پہلے طبیعت میں ایک نشگی تھی۔ وہاں اب ایک میری آجاتی ہے طبیعت اکتا جاتی ہے۔ اطمینان مفقود ہو جاتا ہے۔ غرضیکہ یہ مرض لاعلاج ہے زندگی اور تہذیب یافتہ انسان کا آپس میں جوڑ نہیں۔ انسان کو یہ قدرت تو حاصل ہے کہ حسن کو نہن کے کسی نمونہ میں قید کر کے ہمیشہ کے لیے ایک جگہ جکڑ رکھے۔ اور جب اسے دیکھے یا پڑھے ہمیشہ اسی قابل قدر علو اسی تسکین بخش نئے کا احساس ہو۔ لیکن اسے یہ قدرت نہیں کہ اسی طرح اپنی زندگی کے اندر بھی اپنی مرضی کا ایک گلزار بنائے۔ جس میں بقول اس خوش گفتار یونانی کوس کے "سب کا درخت ہو موسیقی ہو اور سنہری پھول ہوں" جس انسان کے اندر احساس حسن موجود ہے اسے زندگی میں جنت نہیں مل سکتی۔ دائمی مسرت اس کے قبضے سے باہر ہے۔ بعض بعض لمبے البتہ اس قسم کی دلفریبی سے مزور ہو جاتے ہیں جن میں ایک سرخ بے خودی آپ ہی آپ انسان پر طاری ہو جاتی ہے لیکن جتنی دیر میں ایک بادل سورج کے

سامنے سے گزر جاتا ہے اتنی دیر میں یہ لمبے بھی گزر جاتے ہیں جس طرح فی من
 کو قید کر لیتا ہے۔ اسی طرح ان لمحوں کو قید کر رکھنا ممکن نہیں۔ یہ ان لمحوں کی طرح
 مگر بیز پا ہیں جس میں انسان کو اس رو بہ فطرت کے درخشاں یا بھلاتے، سوئے
 جلوے کی ایک جھلک دکھائی دے جاتی ہے جو انسانوں سے دُور اپنی سوچ
 میں مستغرق بیٹھی ہے۔ اس مقام پر اور اس لمحے کے اندر جبکہ دُورِ پُرس کے چہرے
 پر پڑ رہی ہے۔ تارن کے درخت پر کچھ بول رہا ہے۔ گورس کی خوشبو سے
 ہوا میں شہد کی سی پکشنی ہے۔ چاروں طرف بیک تھارن اور نوخاستہ فرن
 کے چھوٹے چھوٹے پتوں کی ہر یاد ہے اور سفید براق بادل پاڑیوں اور چکر کیف
 دادیوں کے اوپر آسمان پر ہلکے ہلکے اڑ رہے ہیں۔ ایئر سٹ کی آنکھوں کے سامنے
 قدرت کا جلوہ پنہاں ہے نقاب ہے۔ لیکن چشمِ نھان میں یہ جلوہ غائب ہو جائے
 گا جیسے پتوں کا چہرہ جو ایک چٹان کے کونے پر سے دکھائی دے رہا ہو۔ انسان
 کی نگہ سے خوفزدہ ہو کر غائب ہو جاتا ہے۔ ایئر سٹ ایک طنت اٹھ بیٹھا۔
 اسے بیکٹ اس بات کا احساس ہوا کہ گھاس کا یہ تختہ۔ یتنگ سی سرک۔ پیچھے
 یہ پڑانی دیوار۔ یہ سب منظر کچھ مانوس سا معلوم ہوتا ہے۔ جب وہ موٹر میں سوار
 تھے تو اس نے حسبِ عادت اس طرف توجہ ہی نہ کی تھی۔ لیکن اب تو وہ آنکھیں
 مچاڑ مچاڑ کر دیکھ رہا تھا اس مقام سے کوئی آدھ میل کے فاصلے پر ایک فارم
 ہاؤس واقع تھا۔ جہاں وہ چھبیس سال ہوئے ایک دن اسی موسم میں ٹور کی روانہ
 ہوا تھا اور یوں سمجھئے کہ وہ پھر کبھی واپس نہ آیا تھا۔ دل میں ایک ٹیس اٹھی گزشتہ
 زندگی کا ایک ایسا لمحہ یاد آ گیا۔ جس کی دلخیزی اور بے خودی میں ہر نکل گئی
 تھی۔ ایک ایسا لمحہ جو پھڑ پھڑاتا جو کسی نامعلوم دنیا کو اڑ گیا تھا۔ دفعتاً ایک ایسے
 زمانہ کی یاد پھر تازہ ہو گئی جو شہرینی اور شباب سے لبریز تھا۔ لیکن ایک طنت
 مستطیح ہو گیا تھا۔ ہاتھوں کو ٹھوڑی کے نیچے رکھے اور مدھے منہ زمین پر بیٹھ
 گیا اور نوخاستہ ہنرے کو جس کے بیچ میں جگ دھٹ کے ننھے ننھے پھول اگل
 رہے تھے۔ کھوئی ہوئی نظروں سے تکتا رہا..... اور جو کچھ اُسے یاد آیا وہ یہ تھا۔

دا

فرنیکیے ایشرسٹ اور اس کا دوست رابرٹ گارٹن ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے۔ زمانہ تعلیم کا آخری سال گزار چکنے کے بعد کیم سٹی کو دونوں سیاحت کی غرض سے پا پیادہ سفر کر رہے تھے۔ برمنٹھ سے پیدل چلے تھے اور ارادہ تھا کہ چیرگ فورڈ پہنچ کر دم بس گئے۔ لیکن ایشرسٹ کے گھٹنے میں ایک دمورنٹ بال کھینچے ہوئے چوٹ لگی تھی۔ چلتے چلتے گھٹنے میں درد ہونے لگا یہاں تک کہ قدم اٹھانا مشکل ہو گیا۔ نقشہ کو دیکھا تو ابھی سات میل باقی تھے۔ ایک چوراہے کے پاس جہاں ایک پگڈنڈی جنگل کے ساتھ ساتھ ہوتی ہوئی سڑک کو کھٹ کر نکل جاتی تھی۔ دونوں دوست سڑک کے کنارے گھاس پر بیٹھے کستار بے تھے اور جیسا کہ نوجوانوں کا قاعدہ ہے کائنات کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ دونوں کا دل چھوٹے سے ادنیٰ تھا اور جسم بھریا۔ ایشرسٹ کانگ ذرا پیلا تھا۔ تخیل پسند طبیعت۔ ہمیشہ کھویا کھویا رہتا تھا گارٹن نے زالی طبیعت پائی تھی۔ جس کا اندازہ پوری طرح لگانا مشکل تھا۔ کچھ کرخت تھا۔ کچھ ٹیڑھا بینکا جیسے زمانہ قدیم کا کوئی جوان جو۔ دونوں کو ادب سے بہت دلچسپی تھی۔ دونوں سر سے ننگے تھے۔ ایشرسٹ کے بال ہلکے رنگ کے۔ ملائم اور لہروں والے تھے اور کنپٹیوں پر سے یوں ادھر ادھر اٹھتے تھے جیسے کوئی ہمیشہ انہیں پیچھے کو جھٹک رہا ہو۔ گارٹن کے بال سیاہ رنگ کے تھے اور انہیں مدبے ترتیب دونوں دوست چیتے چیتے میلوں نکل گئے تھے۔ لیکن راستہ میں اپنے سوا کوئی اور روبرو نظر نہ آیا تھا۔

گارٹن کہہ رہا تھا۔ تم میری بات مانو۔ رحم صرف شوہر نفس لانتیو ہے۔ یہ ایک ایسا مرض ہے جو آج سے پانچ ہزار سال پہلے مفقود تھا جب رحم نہ تھا تو دنیا کے لوگ زیادہ مزے میں تھے۔

ایشرسٹ نے جو بادلوں کی حرکت کا تماشا دیکھ رہا تھا جواب دیا۔ بہر حال میرا یہ عقیدہ ہے کہ دنیا میں رحم کا ادبی رتبہ ہے جو صدف کے اندر ہوتی کابت۔

گارٹن بولا۔ بر فور دار موجودہ زمانہ کی تمام بے اطمینانی رعم ہی کا نتیجہ ہے جانوروں کو دیکھو۔ امریکہ کے اصلی باشندوں کو دیکھو انہیں صرف اپنے اپنے ڈکھ کا احساس ہے۔ اور اس کا موقع بھی کبھی کبھی پیش آتا ہے لیکن ہمیں دیکھو کہ کسی دوسرے کی داڑھ میں جی درد جو تو ہم بے قرار ہو جاتے ہیں۔ آخر اوروں پر ترس کھانسنے سے کیا حاصل؟ میں تو کہتا ہوں کہ وحشیوں کی طرح دوسروں کے غم سے نجات حاصل کرو اور اطمینان سے رہو۔

ایشیٹ نے کہا کہ میں شہر لگانا ہوں کہ تم اس پر کبھی عمل نہ کر دو گے۔
گارٹن غور و فکر کے آغاز میں اپنے بے ترتیب بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔
"رکھ رکھاؤ کی زندگی میں انسان پوری طرح نشوونما نہیں پاسکتا۔ جذبات کو اپنے اوپر حرام کر لینا غلطی ہے۔ ہر جذبہ مفید ہوتا ہے کیونکہ اس سے زندگی کو سیرابی حاصل ہوتی ہے۔"

"اور اگر کوئی جذبہ تو قیرنسواں کے اصول کے سنائی ہو۔ تو پھر؟"

"تم نے بالکل انگریز دل کی سی بات کی ہے۔ انگریزوں کے سامنے جذبہ کا ذکر کر دو وہ سمجھتے ہیں۔ اس سے مراد جہان لذت ہے۔ اور وہ جذبہ کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں۔ لیکن شہوت سے نہیں گھبراتے۔ بشرطیکہ کسی اور کو معلوم نہ ہو جائے۔"

ایشیٹ نے کچھ جواب نہ دیا۔ وہ ایک ننھے سے نیلے رنگ کے پھول کو آسمان کے سامنے رکھ کر گھما رہا تھا۔ تھارن کے ایک درخت پر کھونے پوننا شروع کیا۔ خوش رنگ آسمان کے نیچے جہاں پھول اُگ رہے ہوں اور پرندے چہچہا رہے ہوں۔ رابرٹ کی باتیں کتنی بے معنی معلوم ہوتی تھیں۔
ایشیٹ بولا۔

"چھاب چلیں کسی فارم میں جگہ مل جائے تو رات وہیں گزاریں؟
جب یہ الفاظ کہے تو وہ دیکھ رہا تھا کہ سامنے ایک بڑی ٹوکری اٹھائے مرغزار کی اونچان سے نیچے اتر رہی ہے۔ آسمان کے بالمقابل دو ایشیٹ کو بڑکی کے

خمیہ بازو میں سے دکھائی دے رہا تھا، اس کے جسم کا خاکہ واضح نظر آ رہا تھا۔
 انیٹرسٹ نے جسن کا نظارہ کیا کرتا تھا بغیر یہ سوچے کہ اس سے کیا خاتمہ پہنچتا ہے۔
 دل میں کہا "بہت خوب! بڑی کی نے کپڑے رنگ کے موٹے کپڑے کا سا یہ
 پہن رکھا تھا۔ ہوا کے زور سے سایہ اس کی ٹانگوں سے چمٹ رہا تھا اور اس کی
 چھٹی پڑانی طاؤسی رنگ کی ٹوپی ادھر اٹھ گئی تھی مجھ سے رنگ کا بلاؤز پڑانا
 اور گھسا ہوا تھا۔ جوتے پھٹے ہوئے تھے۔ اس کے چوٹے چوٹے ہاتھ سرخ اور
 کھردرے تھے۔ گردن کا رنگ ساؤلا پڑ گیا تھا۔ اس کے پریشانی بال اس کے

فرخ ماتھے پر بہا رہے تھے۔ چہرہ لہا نہ تھا۔ لوہا کا ہوٹ چھوٹا سا تھا۔ اور
 دانت چمک رہے تھے۔ جویں کالی اور سیدھی تھی۔ پکیں سیاہ اور لمبی لمبی۔ ناک
 ستواں اور اس کی مجھری آنکھیں تو غضب ہی ڈھا رہی تھیں۔ ان میں شبنم کی سی
 تازگی اور طراوت تھی۔ گویا ابھی ابھی دابوٹی ہیں۔ اس نے انیٹرسٹ کی طرف دیکھا
 شاید اسے منکڑاتا ہوا آدی دوسرے رنگا بال پیچے کو بھٹکے ہوئے، جو اپنی بڑی بڑی
 آنکھوں سے اسے تک رہا تھا۔ عجیب معلوم ہوا۔ انیٹرسٹ کے سر پر ٹوپی تو تھی نہیں
 ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا اور بولا۔

"ہاں پاس ہی کوئی سیافارم نہیں جہاں ہم رات گزار سکیں۔ میں چل نہیں سکتا۔
 میری ٹانگ دکھتی ہے۔"

رڈ کی بغیر خرابے نرم نازک اور پیاری آواز میں بولی۔

"جناب یہاں قریب تو ہمارا ہی فارم ہے۔"
 "کہاں؟"

"اس طرف نیچے کو۔"

"ہم وہاں رات گزار سکتے ہیں؟"

"میرا خیال تو ہے۔"

"تو ہمیں راستہ بتا دو۔"

"آئیے۔"

ایشرسٹ منگواتا منگواتا ساتھ چل پڑا۔ جب وہ پیپ بوا نوگارٹن نے
جرح شروع کر دی۔

”تم ڈیون سٹارکی رہنے والی ہو؟“

”نہیں جناب!“

”تو پھر؟“

”میرا وطن ویلز میں ہے۔“

”ٹیکب میں بھی کہتا تھا کہ شکل سے تم کیٹ معلوم ہوتی ہو۔ تو یہ

فارم تمہارا نہیں؟“

”نہیں۔ میری خالہ کا ہے۔“

”اور تمہارا خالو؟“

”وہ زندہ نہیں۔“

”تو فارم کا کام کون چلاتا ہے؟“

”میری خالہ اور خالہ کے تین لڑکے۔“

”تمہارا خالو تو ڈیون سٹارکے رہنے والا تھا؟“

”جی ہاں۔“

”تمہیں یہاں آئے ہوئے بہت عرصہ ہو چکا ہے؟“

”سات سال۔“

”ویلز کے بعد یہ جگہ تمہیں کچھ پسند بھی آئی؟“

”معلوم نہیں جناب۔“

”شاید ویلز تمہیں باب یاد دہرا ہو؟“

”اچھی طرح یاد ہے وہ جگہ تو کچھ اور ہی تھی۔“

”مجھے بھی تم سے اتفاق ہے۔“

ایشرسٹ یک طنت بولا۔

”تمہاری عمر کیا ہے؟“

”جناب سترو سال“

”اور تمہارا نام کیا ہے؟“

”میگن ڈیوڈ“

”ان کا نام رابٹ گارٹن ہے۔ میرا نام فرنیٹ الیٹرسٹ ہے۔ ہمارا ارادہ تو تھا کہ جیک فورڈ پیپے سے پہلے دم نہیں لیکن“

”مجھے افسوس ہے کہ آپ کی ٹانگ ڈکھ رہی ہے“

الیٹرسٹ مسکرایا۔ اور جب وہ مسکراتا تھا تو اس کے چہرے پر ایک حسن سا آجاتا تھا۔

ادسپان سے نیچے اتر کر جنگل کے برابر سے نکلے تو سامنے فارم دکھائی دیا۔ پتھر کی ایک عمارت تھی۔ لمبی اور نیچی نیچی کھڑکیوں میں پٹ لگے تھے۔ ارد گرد ایک احاطہ تھا جس میں سوڑا اور مرغیاں اور ایک بوڑھی گھوڑی ادھر ادھر بھرتی تھی۔ پرے کو گھاس سے ڈھکی ہوئی ایک پہاڑی تھی۔ جس پر اسکاچ نر کے چند دانت اگ رہے تھے۔ سامنے سید کے درختوں کا ایک پُرانا باغ تھا۔ جن کے شگوفے چوٹ رہے تھے۔ باٹا کے کنارے کنارے ایک ندی بہ رہی تھی۔ اور ندی کے پار ایک لمبا عزاز پھیلا ہوا تھا۔ سیاہ اور تر تھی آنکھوں والا ایک چوٹا سا رٹا کا ایک سوڑا رکھوالی کر رہا تھا۔ گھر کے دروازے کے پاس ایک عورت کھڑی تھی جو انہیں دیکھ کر آگے بڑھی رٹا کی نے کہا۔

”یہ میری خالہ مسز نیرو کومب ہیں“

خالہ مسز نیرو کومب کی آنکھ بچوں والی جنگلی بیلج کی مانند سیاہ اور نیر تھی۔ گردن جی میں سانپ کی سی اٹھان تھی۔

الیٹرسٹ نے کہا ”ہمیں آپ کی سبانی رستے میں مل گئی۔ یہ کہتی ہے یہاں رات بسر کرنے کا انتظام ہو جائے گا“

”ہو تو جائے گا لیکن آپ دونوں کو ایک ہی کمرے میں سونا پڑے گا۔“

مجھیں سبھی جاؤ وہ خالی کمرہ ان کے لیے صاف کر دو۔ کریم کا ایک پیالہ بھی لیتی آنا۔ پائے تو آپ نہیں گئے؟

ٹوکے دو درختوں اور چند پھولدار جھاڑیوں سے ایک محراب سی بنی ہوئی تھی۔ راکھی اس میں سے گزر کر گھر کے اندر غائب ہو گئی۔ گلابی رنگ کے پھولوں اور پوکے سبز پتوں کے سامنے اس کی ٹوپی کا طاؤسی رنگ بھلا معلوم ہوتا تھا۔

”آپ کی ٹانگ میں تکلیف ہو رہی ہوگی۔ چل کر پارلر کے اندر آرام کیجئے۔ آپ کا رخ میں پڑتے ہیں؟“

”پڑتے تھے اب تو فارغ ہو چکے۔“

سنزیرہ کو سب نے دانشمندانہ انداز میں سر ہلایا

پارلر کا فرش اینٹوں کا تھا اور اس پر چمکتی صاف کرسیاں اور سوفا پڑا ہوا

تھا۔ جس کے گدیلوں میں گھوڑے کے بال بھرے ہوئے تھے۔ ایک میز تھی۔ مگر اس پر میز پوش نہ تھا۔ کمرہ اس قدر صاف تھا کہ معلوم ہوتا تھا کبھی استعمال ہی نہیں ہوا۔ الیٹریسٹ فوراً صوفے پر جا بیٹھا اور وہ کہتے ہوئے گھٹنے کو ماتھوں سے تمام لیا۔ سنزیرہ کو سب اسے بغور دیکھتی رہی۔ الیٹریسٹ اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کا باپ کیمیا کا ایک سابق پروفیسر تھا۔ تاہم لوگوں کو اس رٹ کے میں میرانہ ٹیکر نظر آتا تھا گو الیٹریسٹ کو اپنی عالی نگاہی کی وجہ سے اکثر ان کی موجودگی تک کا احساس نہ ہوتا۔

”یہاں کوئی ندی ہے جہاں ہم نہا سکیں؟“

”باغیچے کے ساتھ ٹیک ندی ہے۔ لیکن اس میں تو بیٹھ کر بھی سڑک پانی

نہیں نہیوتا۔“

”کتنی گہری ہے؟“

”یہی کوئی ڈیڑھ فٹ۔“

”لوہ تو بہت ٹیک ہے۔ جسے کس طرف کو؟“

ہجک ڈنڈی کے ساتھ چلے جائیے۔ دائیں ہاتھ کو جو دوسرا چانگ آئے
گھاس میں گزر کر سامنے ایک بڑا سایب کا درخت ہے سب سے الگ
اس کے پاس ہی تالاب ہے۔ مچھلیاں پکڑنے کا شوق ہو تو تالاب میں مچھلیاں
جی ہیں :-

”سنزیر کو سب مسکرا دی اور بولی :- جب آپ واپس آئیں گے تو چائے
تیار ہوگی۔“

ڈنڈی میں ایک جگہ ایک چٹان کا بندھ لگا ہوا تھا جس سے پانی ٹرک گیا تھا اور
ایک تالاب سا بن گیا تھا۔ جس کی تہ نیلی تھی۔ وہ بڑا سایب کا درخت سب
درختوں سے بچا تھا۔ اتنا نیچا۔ کہ اس کی شاخیں ندی کے پانی پر چکی پڑتی
تھیں۔ گونبلیں چوٹ آئی ہیں بشگو نے کھٹنے کھٹے اور قرمزی کھلیاں چٹک رہی
تھیں۔ اس چوٹے سے تالاب میں ایک ہی آدمی بنا سکتا تھا۔ چنانچہ انیسویں صدی کے
پرستار کھڑا اپنے کھٹنے کو ملتا رہا اور اس مرغزار کا نظارہ کرتا رہا جس میں چٹانوں
کے درمیان تھان کے درخت اور جنگلی پھول لگ رہے تھے۔ پر سے ایک
ادرنے سگڑ ہوا ریشیلے پر بیچ کے درختوں کا جھنڈا تھا۔ ہر شاخ ہوا میں تھم رہی
تھی۔ بہار کا ہر پتہ چہچہا رہا تھا۔ اور سوزج کی ترچھی شاخوں سے گھاس پر
دھوپ چھاؤں کی سنطرنج سی بھی تھی۔ اسے کئی چیزیں یاد آئیں کہ معلوم ہوتا
تھا کہ بات کا خیال نہیں۔ اور وہ بغیر کسی وجہ کے خوش تھا۔

(۲)

چائے دیر سے پی گئی۔ لیکن تھی پر تکلف۔ کھانے کو ساتھ انڈے سے۔
کریم۔ مرہ اور پتلے پتلے تازہ کیک تھے جن پر زعفران کے چھینٹے دیئے
ہوئے تھے۔ چائے کے دوران میں گلارٹن کیڈٹ قوم کے متعلق ایک طویل
تقریر کرتا رہا۔ ان دنوں ہر جگہ کیڈٹوں کا چرچا تھا۔ گلارٹن خود بھی کیڈٹ تھا
اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اس کنبے میں بھی اسی قوم کا خون موجود ہے تو اس

قدر دلپسی پیدا ہوئی کہ آپسے سے باہر ہو گیا۔ وہ ایک کرسی پر دراز تھا جس کے گدیوں میں گھوڑے کے بال جبرے تھے۔ ہاتھ کا بنا یا ہوا بھگڑیٹ اس کے خم دار ہونٹوں کے کینج میں جیسے ٹک رہا تھا۔ اور اپنی چھوٹی چھوٹی سرد مہر آنکھوں کو ایشرسٹ کی آنکھوں میں ڈالے ہل دلیز کی شائستگی کو سرا سنا رہا۔ دلیز کو چھوڑ کر انگلستان میں آ جانا ایسا ہی ہے جیسے انسان چینی کے بتوں کو چھوڑ کر مٹی کے برتن استعمال کرنے لگے!۔ فرنیٹ آخز چہر انگریزیت اسے کیا معلوم اس دلیز کی رہنے والی رزکی میں کس قدر شائستگی اور اس کی نظرت میں جذبات کی کس قدر گنجائش ہے! اپنے جیلے سیاہ بالوں کو بکے بکے اپنی انگلیوں سے پریشان کرتا رہا اور وضاحت یہ ثابت کیا کہ یہ رزکی عین ان نظروں کے مطابق ہے جو دلیز کے کسی داستان گو شاعر نے بارہویں صدی میں لکھی تھیں۔

ایشرسٹ چہت ایٹا گہرے ننگ کا ایک پائپ پی رہا تھا۔ تھا قد اور اس بے ٹانگیں موٹ سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ اس نے گارن کی باتوں کو توجہ سے نہ سنا۔ جب رزکی دوبارہ ایک لے کر اندر آئی تھی اس وقت سے اس کی شکل رجبے دیکھ لینا بچوں یا قدرت کے کسی اور حسین منظر کی دید سے کم نہ تھا۔ آنکھوں میں سمائی ہوئی تھی۔ رزکی نے جیب انداز کے ساتھ ایک بھر جبری لے کر اپنی آنکھیں نیچے ڈال لی تھیں۔ اور پپ پاپ کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

گارن نے کہا۔ چلو باورچی خانے میں چل کر اسے ایک نظر اور دیکھ لیں۔

باورچی خانہ کی دیواروں پر سفیدی بھری ہوئی تھی۔ چہت میں بڑے بڑے شہتیر لگے تھے جن میں جینی ہوئی سوڑ کی مانیں لٹک رہی تھیں۔ کھڑکی میں بچوں کے گلے پڑے تھے۔ دیوار پر بند تھیں۔ چینی اور جبت کے جیب و جیب آبخورے اور ہلکے دکوڑیا کھانسی کیوں سے آویزاں تھیں بیچ میں موٹی ٹکڑی کی ایک بے تنگ سی مینر بچی تھی جس پر پیالہ اور چمچے رکھے تھے۔ اوپر چہت سے پیاز کی گھسیلوں کی ایک لڑن لٹک رہی تھی۔ آتش دان نکلنا گہرا تھا۔ جس کے ایک طرف دو چھوٹے لاکے بڑی تیز کے ساتھ نیلے بیٹھے تھے۔ اور دوسری طرف

ایک مہوڑی آنکھوں اور سرخ چہرے والا موٹا سا جوان آدمی بیٹھاسن کے چوڑوں سے بندوق کی نالی صاف کر رہا تھا۔ اس کی پلکوں اور سر کے بالوں کی رنگت بالکل ان چوڑوں جیسی تھی۔ دونوں کے درمیان ایک بڑے ویگے میں اسٹوپک رہا تھا۔ جو خوشبو سے بہت خوش ذائقہ معلوم ہوتا تھا اور سامنے منتر نیرو کو سب کسی سوچ میں بیٹھی مچھوٹا رہی تھی۔ دو اور نوجوان جن کی آنکھیں ترچی اور بال سیاہ تھے اور جو چہروں سے ان دو چوڑے لڑکوں کی طرح عیا معلوم ہوتے تھے۔

دیوار کے ساتھ سہارا لگائے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک پست قد اور حیرت انگیز آدمی۔ دائرہ مونسچہ منڈھی ہوئی کارڈوالی کی برعین پینے کھڑکی میں ایک پیمانہ سا اخبار پڑھ رہا تھا۔ صرف یگن ہی کلام کالج میں لگی ہوئی تھی اور پیسے میں سے سب کی شراب کے بنگ بھر بھر کہ میز پر بچتی جا رہی تھی۔

ظاہر تھا کہ یہ لوگ کھانے پر بیٹھے دالے ہیں چنانچہ گارٹن بولا۔

”اگر آپ لوگوں کو کوئی اعتراض نہ ہو تو ہم کھانے کے بعد آجائیں۔“

اور جواب کا انتظار کے بغیر دونوں پھر پارہ میں آ بیٹھے۔ لیکن باورچی خانہ کا اس رونق۔ اس گرماہٹ ان خوشبوؤں اور ان چہروں کے بعد یہ چمک دار کمرہ پہلے سے بھی زیادہ کچھ اجازت معلوم ہونے لگا۔ دونوں دوست پڑھو ہو کر پھر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔

”وہ کے شکل سے بالکل جیسی معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں صرف ایک لڑکا

سیکن تھا۔ وہ جو بیٹھنا بیٹھنا کر رہا تھا۔ وہ لڑکی تو نفسیاتی نقطہ نظر سے دقیق مطالعہ کی چیز ہے۔“

ایئر سٹ کے ہونٹ پھٹک اٹھے گاڑن لے اسوقت بالکل گدھا معلوم ہوتا تھا دقیق مطالعہ کی چیز کیا جو اس ہے۔ وہ لڑکی تو جنگل کا ایک بچول ہے۔ جسے دیکھنے سے دل کو ٹھنڈک سی ہوتی ہے۔ مطالعہ!

گارٹن بولا۔

”جب باقی لحاظ سے وہ لڑکی ایک حیرت انگیز چیز ہے۔ صرف اس کے بیدار

ہونے کی کسر ہے :-

• تو کیا جناب اسے بیدار کیجئے گا؟

گاڑی اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ اس کا غم دار جسم کہہ رہا تھا: کیا بد مذاقی کی بات ہے! بالکل انگریزوں کی سی؟

ایشرسٹ پاپ کے کش لگانا رہا۔ بیدار ہونے کی کسر ہے! اس بے وقوف گاڑی کو تو دیکھو۔ اپنے آپ کو کیا سمجھے بیٹھا ہے۔! ایشرسٹ نے کھڑکی کھول دی اور جسم باہر کو جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ باہر اندھیرا ہو گیا تھا۔ گاڑی خانہ اور فارم کی عمارتیں دھندلی اور نیلی نیلی:۔۔۔ سیب کے درختوں کا باغیچہ غیر واضح نظر آ رہا تھا۔ ہوا میں ان کھڑکیوں کے دھوپ کی بو بھی جواہری نمانے میں جل رہی تھیں۔ ایک پرنڈہ جواہری جاگ رہا تھا۔ بے دلی سے چھپایا گیا اسے اندھیرے پر تعجب ہو رہا ہے۔ اسٹبل سے ایک گھوڑے کی جو کھڑا دانہ کھا رہا تھا۔ شہر وی اور چھوٹے کی آواز آئی۔ سامنے جنگل تھا جو تاریکی میں آدود وقت تک چھپا ہوا معلوم ہوتا تھا اور اس سے پرے خوب ستارے تھے جابھی پوری طرح عیاں نہ ہوتے تھے اور جن کی سفید شاموں نے گہرے نیلے آسمان کو چھنی کر دیا تھا۔

ایک آواز کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ایشرسٹ نے ایک لمبا سانس لیا۔ ایسی لنت میں باہر آنا دھیرا کتنا پُر لطف ہو گا! تھوڑی دیر کے بعد سڑک پر کھلے سموں کے ٹاپوں کی آواز آئی۔ اندھین ٹوائس اندھیرے میں دھندلے سیاہ سلسلے سے گزرتے ہوئے دکھائی دیئے۔ جن کی کالہ دیال مدگردنیں چھانک کے اوپر سے نظر آ رہی تھیں جب اس نے پاپ کو ٹھونک کر خالی کیا اور اس میں سے شرابوں کی ایک پھلجھری سی نکل۔ تو جانور جگ کر جاگ نکلے۔ ایک چمکا ڈر پھر پھرتی ہوئی نکل گئی۔ اس کی ہلکی ہلکی چپ چپ کی آواز شکل سے سنائی دیتی تھی۔ ایشرسٹ نے اپنا بازو پھیلا دیا، ہتھیلی پر لوہے پٹی ہوئی ٹھوس بوری تھی۔ ایک لنت اسے اوپر کی منزل میں بچوں کی آوازیں سنائی دیں۔ ان کے چھوٹے چھوٹے جوتے خوب خوب فرش پر گرے۔ اور پھر ایک نرم اور نازک آواز سنائی دی۔

رڈ کی آواز۔۔۔ جو بچوں کو بستر میں سلا رہی تھی۔۔۔ تو الفاظ سامان اور واضح
 حد پر کان میں پڑے؟ نہیں ہوگے میں بی ساتھ نہ سنانے دوں گی۔ پھر ننھے بچوں
 کے قبضوں کی آواز آئی کسی نے بلکے سے ان کے ایک تھپڑ مارا۔ اور پھر کوئی بلی آواز میں
 ایسی پیاری بنی ہنسا کہ ایشرسٹ کانپ سا گیا پھر ایسی آواز آئی جیسے کسی نے پھونک
 ماری ہو۔ موم جی بس کی روشنی تاریکی پر انگلیاں پھیر رہی تھی بچہ گئی اور خاموشی چھا
 گئی۔ ایشرسٹ کھڑکی سے ہٹ آیا اور کمرے میں آکر بیٹھ گیا۔ اس کا گھٹنا ڈکھڑا
 تھا اور اس کی روح طول تھی۔

گڈرٹن نے کہا: ہمیں باورچی خانہ میں جانا ہو تو جاؤ۔ میں سونے چلا ہوں۔

(۳)

ایشرسٹ ہمیشہ غفلت کی خیر سندھ سوتا تھا۔ لیکن جب گڈرٹن سونے کے کمرے میں آیا
 تو گڈرٹن بظاہر گہری نیند میں تھا لیکن درحقیقت بالکل جاگ رہا تھا۔ کمرے کی
 چھت نیچی تھی۔ گڈرٹن بستر میں پت ایشانا تاریکی کے طلسم پر ناک بھوں چڑھا کر دنیا و مافیہا
 سے بے خبر پڑا تھا لیکن ایشرسٹ کو اٹوڑوں کے بولنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔
 اس کا گھٹنا ڈکھڑا تھا۔ اس کے علاوہ اسے اور کوئی تکلیف نہ تھی۔ دنیا کے
 تفکرات بات کے وقت ایشرسٹ کے آرام میں کبھی خلل انداز نہ ہوتے تھے اور
 سچ پوچھو تو اسے ذمہ گی میں کوئی فکر ہی نہ تھا۔ بیسٹروں کی فہرست میں نام درج ہو چکا
 تھا۔ تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔ دنیا اس کے سامنے کھلی پڑی تھی۔ والدین کی وفات
 کے بعد گھر کے علائق سے بھی پاک ہو چکا تھا۔ خانی آمدنی چار سو پونڈ سالانہ تھی۔ اب اس کی آزادی
 میں جلا کیا حاصل تھا؛ جہاں چاہتے جاتے جو چاہتے کرے۔ جب چاہتے کرے۔ اس
 کا بستر سخت تھا۔ اس لیے اُسے بخار نہ ہونے پایا۔ سرٹنے کے پاس ایک کھڑکی کھلی
 تھی جس میں سے رات کی خوشبو کمرہ میں چیل رہی تھی۔ اور ایشرسٹ بستر میں لیٹا
 اس خوشبو کو سونگے سا تھا گڈرٹن سے کجا ہوا تھا۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔
 تین دن پیدل سفر میں جس شخص کا ساتھ رہا ہو اس سے کھج جانا قدرتی امر ہے۔

لیکن اس کے علاوہ اس کے باقی تمام خیالات شفقت آمیز تھے۔ بعض تعصبات سے تو اس کے دل میں ہوکس اٹھ رہی تھیں۔ بعض سے طبیعت میں ایک سببان سا پیدا ہوتا تھا۔ اسے اس نوجوان کا چہرہ یاد آیا جو باورچی خانہ میں بیٹھا بدوق صاف کر رہا تھا۔ جب دونوں دوست باورچی خانہ میں داخل ہوئے تھے تو اس نے یک لخت آنکھیں اٹھا کر پہلے ان دونوں کو اور پھر فوراً ہی اس لڑکی کو جو اس وقت سیب کی شراب کا جگ اٹھائے جا رہی تھی ایک نظر دیکھا تھا اس کی نظر میں نہ ذہانت پائی جاتی تھی نہ بے دلی۔ تاہم وہ ایسے آدمی کی نظر ضرور تھی جو دفعتاً چونک اٹھا ہو۔ اس وقت الیٹریسٹ نے اس بات کا دھیان بھی نہ کیا تھا لیکن حیرت ہے کہ اس کا تصور نہایت واضح طور پر اس کے ذہن میں محفوظ تھا جس طرح اس لڑکی کا تروتازہ چہرہ اسے نہ بھولتا تھا۔ ویسے ہی اس نوجوان کا سرخ چہرہ، نیلی آنکھیں، سبکے رنگ کی بلیکس اور سن کے سے بال بھی اس کی یاد سے محو نہ ہوتے تھے۔ کھڑکی کے سہنے پر وہ نہ تھا۔ اس کی بجائے تاریکی کی ایک مستطیل سی دکھائی دے رہی تھی۔ رفتہ رفتہ اس تاریکی میں سحر کی روشنی نمودار ہوئی۔ اور ایک نیم خوابیدہ کوسے کی بیٹھی ہوئی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد پھر گھبری خاموشی چھا گئی۔ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد ایک بیک بڑونے جس کی آنکھیں ابھی پوری طرح کھلی نہ تھیں۔ اپنی خوش الحانی سے خاموشی کے طلسم کو بہیم کر دیا۔ کھڑکی کے چوکھٹے میں بڑھتی ہوئی مکشنی کی مستطیل کو دیکھتے دیکھتے الیٹریسٹ کی آنکھ لگ گئی۔

دوسرے دن اس کا گھٹنا بہت سوجا ہوا تھا۔ اس لیے پیدل سفر کا ارادہ ترک کرنا پڑا۔ گارٹن نے لگے دن لندن پہنچا تھا وہ دوپہر کے وقت وہاں سے روانہ ہو گیا۔ چلتے وقت اس کے ہونٹوں پر طنز آمیز تبسم دیکھ کر الیٹریسٹ بہت چڑا۔ لیکن جب وہ دوڑتا دوڑتا ڈھلوان سڑک کے موڑ تک پہنچ کر نظر سے اوجھل ہو گیا تو الیٹریسٹ کا غصہ فوراً اتر گیا۔ یو کے درختوں کی عراب کے پاس گاس کا ایک قطعہ تھا۔ الیٹریسٹ وہیں دن بھر ایک سبز رنگ کی چوکی پر بیٹھا رہا۔ سوزج کی شام میں کوشبو دار پھولوں کا مطر کینچ رہی تھیں۔ اور پھر لہار جھاڑیوں سے جبینی جبینی خوشبو آرہی تھی۔ الیٹریسٹ ایک سروہ کے عالم میں بیٹھا کبھی پائپ سگالیتا کبھی منظر کا لطف

اٹھاتا اور کبھی کسی سون میں مصروف ہو جاتا۔

ایک فادرم کے اندر ریمارک کے موسم میں بے شمار بستیاں عالم و جہد میں آتی ہیں۔ ننھی ننھی جانیں اٹھوں اور کالیوں سے جنم لیتی ہیں۔ فادرم کے لوگ اس عمل کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور فدا نینہ بستوں کی دیکھ بھال اور پرورش میں لگ جاتے ہیں۔ ایئر سٹ اس قدر چپ چاپ بیٹھا تھا کہ ایک مادہ بنس اپنے چہ بچوں کو حین کی گردن میں زرد اور پٹوے جوڑے رنگ کی تھی۔ ساتھ لئے ملکتی مشکاتی قریب آ پہنچی اور بے ایئر سٹ کے پردوں کے پاس گھاس کے پتوں پر اپنی ننھی ننھی چو پھیں تیز کرنے لگی۔ کبھی کبھی مسز نیرو کو سب یا سیگن آن کر پوچھ بانی کہ کیوں صاحب آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ ایئر سٹ مسکرا کر جواب دیتا۔ نہیں تھیک یو ابلے کسی چیز کی ضرورت نہیں یہاں بٹے مزے میں بول چال کے وقت وہ دونوں سیاہ رنگ کی ایک لمبی سی پلٹس ایک پالے میں ڈالے اپنے ساتھ لے کرائیں۔ سو بے سوئے گھٹنے کو دیر تک غور سے دیکھتی رہیں اور پلٹس اس پر بانہ گھٹیں۔ جب وہ چلی گئیں تو ایئر سٹ کو لڑکی کا وہ سچی آواز میں "اوی" کہنا وہ بھر دی کی نظروں سے دیکھنا۔ وہ ماتھے پر ہلکی سی تیوری ڈالنا یاد آیا۔ اور جب اسے خیال آیا کہ گارٹن اس رٹ کی کے متعلق کتنی نسلوں باتیں رہا تھا تو ایک بار پھر گارٹن سے چڑھ گئی اس نے ذرا سوچا کہ کیا اس میں ڈیسے کی کیا بات ہے جب رٹ کی چائے لائی۔ تو ایئر سٹ نے

پوچھا۔

"سینک۔ تو کہو۔ یہ اداوست بھی نہیں پسند آیا؟"

نینک نے نہ سیکڑا لیا۔ گویا ڈرتی تھی کہ کہیں مسکرا دوں تو بدتمیزی نہ سمجھی جائے۔

جہ۔ بڑی۔

"بڑے ہنسٹوٹھے۔ وہ سب کو سناتے ہیں۔ وہ بہت لائن معلوم ہوتے

نے۔"

یہی ایسی بات کہی ہنزل نے جو تم سب کو ہنسنا دیا؟

"وہ مجھ سے کہنے تھے۔ تم بار ڈون کی بیٹی ہو۔ بار ڈو کیا ہوتے ہیں؟"

”بارٹھان شاعروں کو کہتے ہیں جو آج سے کئی سو سال پہلے دہلی میں رہتے تھے!“
 ”تو جہاں ان کی بیٹی کیونکر ہوئی؟“
 ”میرے دوست کا مطلب یہ تھا کہ وہ تم جیسی ہی لڑکیوں کے متعلق گیت گایا
 کرتے تھے۔“

میگن نے اپنی جنویں سیکر کر کہا: ”انہیں مذاق ٹھوہا جو گا کیا میں ویسی لڑکی
 ہوں؟“

”میری بات پر یقین کرو گی؟“

”کیوں نہیں؟“

”میرے خیال میں وہ کچھ کہتا تھا۔“

لڑکی مسکلا دی۔

ایئر سٹ نے دل میں کہا: ”واقعی تم خوبصورت ہو۔“
 ”وہ یہ بھی کہتے تھے کہ جو شکل و صورت سے کیسے معلوم ہوتا ہے اس کا کیا مطلب
 تھا؟“

”جو کون ہے؟ وہ جس کی نیلی نیلی آنکھیں اور لال لال چہرہ ہے؟“

”ہاں وہ میرے خالو کا بھتیجہ ہے؟“

”اچھا؟ تمہاری خالہ کا لڑکا نہیں؟“

”نہ۔“

”ان کا مطلب یہ تھا کہ جو کی شکل ان لوگوں سے ملتی جلتی ہے جو تقریباً چودہ سو
 سال پہلے انگلستان پر آکر قابض ہو گئے تھے۔“
 ”اچھا ان کا حال تو میں جانتی ہوں۔ کیا جو واقعی سیکن ہے؟“
 ”گارلن کو ایسی باتوں کا جنون ہے لیکن جو کا چہرہ قدیم زمانے کے سیکسوں سے کچھ
 کچھ ملتا ضرور ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“

میگن کے اس ہنسی جملے سے ایئر سٹ کے دل میں گونگی ہوئی۔ مختصر سا جملہ تھا

لیکن اس میں کتنی سادگی اور خوش کسوٹی پائی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ بات اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ پھر بھی اس نے کس سلیقہ اور شناسائی کے ساتھ ہاں میں ہاں ملا دی تھی۔
 ”وہ کہتے تھے کہ باقی لڑکے تو سب نرے جیسی ہیں۔ یہ جھلا کیوں کہا؟ خالہ ہنس
 تو دیں لیکن یہ بات انہیں ناگوار ضرور گزری اور میری خالہ کے سینوں کو تو بہت غصہ آیا
 خالو ترکسان تھے۔ کہیں کسان بھی مہسی ہوتے ہیں؟ یوں لوگوں کا دل دکھانا بُری
 بات ہے۔“

ایشرسٹ کے دل میں آیا کہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر جھیپے۔ لیکن منہ سے
 صرف اتنا کہا۔ میگن تم سچ کہتی ہو۔ اور ہاں کل رات تم ہی بچوں کو بہتر میں سٹلا رہی
 تھیں نا؟ مجھے پہلی منزل میں آواز آرہی تھی۔“

میگن کے چہرے پر یگی سی سُرنی دوڑ گئی۔ ”آپ چائے پیچھے ٹھنڈی سو رہی ہے
 کہیں تو میں اور چائے لا دوں۔“
 ”ہتیں کبھی اپنے کسی کام کو بھی فرصت ملتی ہے۔“
 ”واہ ملتی کیوں نہیں؟“

”آزمیری بھی آنکھیں ہیں۔ میں نے تو ہتیں فارغ کبھی نہیں دیکھا۔“
 میگن نے ماتھے پر پوری ڈال لی۔ جیسے دماغ میں کوئی بات ہے۔ جسے سمجھنا نہیں
 سکتی۔ چہرہ اور سبھی لال ہو گیا۔ جب وہ چلی گئی تو ایشرسٹ نے سوچا۔ کیا وہ سمجھتی تھی کہ
 میں اس سے دل لگی کر رہا ہوں۔ میں تو ایسے مذاق پر محنت کو ترجیح دیتا ہوں۔
 ایشرسٹ کی وہ عمر تھی جس میں بعض لوگ جن کو ایک بچوں سمجھتے ہیں اور اس نظارے
 سے ان کے دل میں عورت کی تو قیر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ ایشرسٹ اپنے گرد و پیش سے
 اکثر غافل رہتا تھا۔ چنانچہ اسے یہ عکاس دیر کے بعد سہا کہ وہ نوجوان جس کے متعلق گارٹن نے
 کہا تھا کہ شکل سے سیکن معلوم ہوتا ہے اسطبل کے دروازے کے باہر کھڑا ہے بالکل لنگ
 کی سیلی ہی برہمیں کیوڑ سے جبرے جوئے گیر اور نیلے لنگ کی قمیض میں وہ ایک رونق کی
 چیز معلوم ہوتا تھا۔ چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ نہ بشرے پر ذہانت کے آثار۔ کبھی
 ڈیل جانور کی طرح بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ چہرہ اور بازو سُرنے تھے۔ سر پر دھوپ

پڑ رہی تھی جس کی وجہ سے اس کے بال کاتی ہوئی اور ان کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ جب اس نے دیکھا کہ ایئر سٹ میری طرف دیکھ رہا ہے تو احاطہ میں سے گزر کر باورچی خانہ کے دروازہ کی طرف چل دیا اور مکان کے کھنہ پر سے مڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ چال سے ظاہر ہوتا تھا کہ نوجوان دیہاتی۔ وہ تقانوں کی طرح آہستہ آہستہ بار بار جباری قدم نہ اٹھا سکنے کی وجہ سے شرماتا ہے۔ ایئر سٹ پر اس سے پڑ گئی۔ اکھڑوگ! طبیعت پر کتنا ہی زور ڈالیئے۔ ایسے لوگوں سے نباہ جلا کیسے ممکن ہے؟ لیکن اس لڑکی کو دیکھو۔ بڑے پٹے بونے کھردے ہاتھ۔ پھر بھی اس میں کتنی رعنائی ہے؟ شاید گارٹن ہی کا کہنا ٹھیک ہو۔ اور یہ سب کیلٹ خون کا اثر ہو۔ بہت مکی ہلے اس کی تعلیم اس سے زیادہ نہ ہو کہ متوڑا بہت لکھ پڑھ لیتی ہو۔ لیکن وہ تو ہیرے کی مانند ہے اسے تو قدرت نے خبیث واصل پیدا کیا ہے۔

وہ وارڈھی سوچو منڈا ادھیڑ آدمی جسے کل رات باورچی خانہ میں دیکھا تھا۔ ایک کتے کو ساتھ لے کر احاطے میں داخل ہوا۔ گایوں کو دودھ دینے لے جا رہا تھا۔ ایئر سٹ کو اب معلوم ہوا کہ ایک ٹانگ سے ننگا ہے۔

”اچھے اچھے باؤرٹے جا رہے ہو“

ننگے آدمی کا چہرہ چمک اٹھا اس کی نظریں اوپر کو اٹھی رہتی تھیں (مدنوں ڈکھ پسنے سے آنکھ میں اکثر یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔)

”ہاں بہت خوبصورت ہیں۔ دودھ بھی بہت دیتی ہیں“

”ان کی شکل سے ہی معلوم ہو رہا ہے“

”آپ کی ٹانگ تو پیلے سے بہتر ہے؟“

”تھینک یو۔ رفتہ رفتہ اچھی ہو رہی ہے“

ننگے آدمی نے اپنی ٹانگ کو ہاتھ لگا کر کہا: ”اس ڈکھ کو میں خوب جانتا

ہوں۔ صاحب گھٹنے کی تکلیف بہت بڑی تکلیف ہے۔ میرا گھٹنا دس سال سے

خراب ہے“

ایئر سٹ نے آواز سے جھڑکی کا اظہار کیا (ایسی جھڑکی دانہ آواز نکالنا فرقہ الحال

لوگوں کے یہ بہت بہل بات ہے،

سکڑا آدمی پھر سکرادیا۔

”پھر بھی خدا کا شکر ہے ورنہ وہ تو ٹانگ ہی کاٹنے لگتے تھے۔“

”اچھا؟“

”جی ہاں۔ اور پہلے تو بہت ہی بجا حال تھا۔ میں تو اسے بہت ہی غنیمت سمجھتا

ہوں۔“

”میرے گھٹنے پر تو دو وا بانڈ لگئی ہیں جس سے بہت فائدہ ہے۔“

”ایک بوٹی تھی جو رٹا کی کہیں سے توڑ لائی تھی (پھولوں سے بہت اچھی طرح واقف

ہے۔ رٹا کی بعض لوگ صاحب بوٹیوں کی خامتیں خوب سمجھتے ہیں۔ میری ماں تو اس

بات میں اپنا جواب نہ رکھتی تھی۔ اچھا صاحب خدا کرے آپ جلد اچھے ہو جائیں۔

گوان۔“

ایشرسٹ سکرادیا: ”پھولوں سے واقف ہے اور وہ خود پھول سے کیا

کم ہے؟“

شام کے کھانے پر بلخ کا ٹنڈا گوشت۔ جنکٹ اور سبب کی شراب تھی۔ کھانا

کھا چکا تو رٹا کی کرے میں آئی۔

”خالد پوچھتی ہیں آپ ہمارے سے ٹے ڈے کیک کا ایک ٹکڑا کھائیں گے؟“

”ہاں مگر بادرچی خانہ میں بیٹھ کر۔“

”دشوق سے۔۔۔ آپ کے دوست تو چلے گئے۔ اکیلے آپ کا دل تو گھبراتا

ہو رہا۔؟“

”ارے نہیں۔۔۔ لیکن یہ کہو میرا بادرچی خانہ میں آنا کسی کو برا تو نہ

لگے گا؟“

”واہ برا کیوں لگے گا جس تو بلکہ بہت خوشی ہوگی۔“

ایشرسٹ کو اپنے گھٹنے کا خیال نہ رہا۔ یک لمٹت جواٹھا تو رٹا کھڑا کر بیٹھ گیا۔

رٹا کی نے ایک سسکی بھری اور اپنے باورسا نے پھیلا دینے۔ ایشرسٹ ان چھوٹے

مچوٹے، کھوڑے، اسانوں، لہنتوں کو پھوٹ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ جی میں آیا ان امتوں کو ہونٹوں سے لگائے لیکن اپنے آپ کو روکا۔ لڑکی نے قریب آ کر کندھا آگے کر دیا۔ ٹیڑھیں اس کے سہارے چل کر دروازہ تک پہنچا۔ اس کے شانے پر ہاتھ رکھنے سے جو لطف حاصل ہوا۔ عمر بھر کسی چیز کے سس سے نصیب نہ ہوا تھا اتنی مقلدی مزدور کی کر چلتے چلتے اسٹینڈ میں سے اپنی چھڑی نکال لی اور باورچی خانے پہنچنے سے پہلے ہاتھ لڑکی کے کندھے سے ہٹا لیا۔

اس رات وہ ایسا غافل ہوا کہ تن بدن کا سبب نہ رہا۔ صبح اٹھا۔ تو گھٹنے کا درم بہت بلکا ہو گیا تھا۔ دوپہر تک اسی عین میں بیٹھا شعر موزوں کرتا رہا۔ سپر کے دست ان وہ چھوٹے لڑکوں کو جن کا نام بنگ اور بنگ تھا ساتھ لے کر ادھر ادھر گھومتا رہا۔ بہتے کا دن تھا۔ اس لیے وہ سکول سے جلدی لوٹ آئے تھے۔ ایک سات سال کا تھا۔ ایک چھ سال کا شریلیے محرزہ میں۔ بنگ بہت گورا نہ تھا۔ اور بالوں کی رنگت بھی سیاہ تھی۔ ٹیڑھیں سے بچے بہت جلد بوس ہو جاتے تھے چنانچہ ٹوڑی ویر میں دونوں پڑ پڑ باتیں کرنے لگے۔ سوائے مچلیوں کے باقی جانوروں کے مارنے کے جتنے طریقے انہیں یاد تھے۔ چار بجے تک ایک ایک کر کے ٹیڑھیں کو سکھا دیئے پھر پانچ گھنٹوں تک چڑھا کر پیٹھ کے بل نندی کے کنارے مچلیوں کی تاک میں بیٹھ گئے۔ گویا اس فن میں بھی کچھ نہ کچھ مہارت انہیں ضرور حاصل ہے لیکن بہتے اس قدر تھے اور فل اس قدر چماتے تھے کہ ایک مچلی بھی قریب نہ چٹکی۔ ٹیڑھیں بیچ کے درختوں کے جھنڈ کے پاس ایک چٹان پر بیٹھا پندوں کے گیت پر کان لگائے انہیں دیکھتا رہا۔ آخر کار بنگ

کہتا کہ اس کے پاس آگھڑا بوالہ بولا۔

”بہت سی تو اس چھڑ پر بیٹھا ہے۔“

”وہ کیا بولتا ہے؟“

”معلوم نہیں۔ کبھی اسے دیکھا نہیں مگر سگین کہتی ہے کہ وہ وہیں بیٹھا ہے۔ بڑے

جسم کو ایک دفعہ پھر نظر آیا تھا۔ جس دن آبا کے سر میں ٹوٹنے لگت ماری ماس سے

پہلے رات کے وقت ہوا یاں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ یاں بیٹھ کر سارنگی بجاتا ہے :-
 "کون ساراگ بجاتا ہے وہ :-" معلوم نہیں :-

"اس کی شکل کیسی ہے ؟"

"کالے رنگ کی، بڑھا جم کہتا ہے اس کے جسم پر بال ہی بال ہیں۔ بڑا سنت
 ہوا ہے۔ کبھی کبھی دن کو بھی آجاتا ہے :-" پھر اپنی ترچھی سیاہ آنکھوں کے
 ڈیلے چہرہ کر کہا :- مجھے تو اٹھا کر نہیں لے جائے گا۔ لیکن اس سے بہت ڈرتی
 ہے :-

"لیکن کو کبھی نظر آیا ہے ؟"

"کبھی نہیں۔ لیکن لیکن آپ سے نہیں ڈرتی :-"

"وہ مجھ سے جلا کیوں ڈرتی ؟"

"وہ آپ کے لیے دُعا مانگتی ہے :-"

"چل بد معاش۔ جلا تجھے کیسے معلوم ہے ؟"

"جب میں سویا ہوا تھا۔ تو وہ کہہ رہی تھی۔ خدایا ہم سب پر اپنا فضل کر اور سٹرا شیرٹ
 پر بھی بڑی دھیمی آواز میں دُعا مانگ رہی تھی۔ میں نے خود اسے سُننا ہے :-"
 "تم بڑے بد معاش ہو۔ جو باتیں تمہیں خود بھی نہ سننی چاہئیں تمہیں وہ تمہیں
 کونسا ہے جو :-"

"وہ کا چپکا ہو گیا اور چہرہ بڑے غمزے سے بولا۔"

"میں خرگوش کی کھال اتار لیتا ہوں۔ لیکن تو کھال اتارتی ہوئی دیکھ بھی نہیں سکتی۔"

"مجھے لہو اچھا لگتا ہے :-"

"اچھا جناب کو لہو اچھا لگتا ہے ؟ جن کہیں کا ؟"

"جن کیا ہوتا ہے ؟"

"میں اسے کہتے ہیں جو دوسروں کو دکھ پہنچا کر خوش ہو :-"

"چھوٹے لڑکے نے ماتھے پر نیوہی ڈال کر کہا :-"جو خرگوش ہم کھاتے ہیں وہ تو

مرے ہوتے ہیں۔“

”ٹیک بے بنک۔ میں سمانی مانگتا ہوں۔“

”میں بینک کی کھال بھی اتار لیتا ہوں۔“

لیکن ایئر سٹ کسی سوچ میں پڑ گیا تھا: ”خدا یا ہم سب پر فضل کر اور سٹرا ایئر سٹ

پر بھی۔“

بنک نے دیکھا کہ ابھی تو اچھی خاصی باتیں کر رہا تھا۔ اور اب جیسے کچھ سن ہی نہیں رہا۔ بہت حیران ہوا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو دوڑتا ہوا اسپرندہ پر جا پہنچا جہاں پھر دونوں نے مل کر ہنسنا اور غل بچانا شروع کر دیا۔

جب ہیگن چائے لے کر آئی تو ایئر سٹ نے پوچھا۔

”ہیگن۔ سبھی سب کیا چیز ہے؟“

ہیگن نے چونک کر سر اٹھایا۔

”اس کا قدم بہت منوس ہے۔“

”تم مجھوت پریت کو مانتی ہو۔؟“

”اور کسی بس کی شکل نہ دکھائے۔“

”نظر کو ہٹائے گا۔ کچھ ہو تو نظر آئے۔ بڑے بلم نے یونہی کسی ٹوکو کو دیکھ لیا

ہو گا۔“

”نہیں ان بٹانوں میں مجھوتوں کا ڈیرا ہے۔ یہاں ان لوگوں کے مجھوت

رہتے ہیں جو بہت عرصہ پہلے یہاں آباد تھے۔“

”تو یہ اصل جیسی تو نہ ہونے نا! یہاں کے قدیم باشندے تو پھپھول کے آنے سے

بیت عرصہ پہلے مرکب گئے تھے۔“

ہیگن نے صرف اتنا کہا۔ سب منوس ہیں۔“

”پر کیوں؟ اور اگر یہاں مجھوت ہیں بھی تو خرگوشوں کی طرح، جنگل میں رہتے

ہیں۔ اب جنگل میں جو پھول اگتے ہیں۔ وہ منوس ہوتے ہیں۔ یہ تھان کے درخت

بھی تو سب خود رو ہیں۔ یہ تو منوس نہیں اور مجھوت منوس ہو گئے! میں رات کو

جنگل میں جا کر اپنی آنکھوں سے انہیں دیکھ کر آؤں گا۔ بلکہ ان سے دو چار باتیں بھی
کر آؤں گا۔

”اسے نہیں! نہیں!“

”میں ضرور جاؤں گا اور جا کر کس چٹان پر بیٹھوں گا جہاں ہوا بیٹھا ہے۔“
رٹکی نے اپنا ہاتھ جوڑ کر کہا: ”خدا کسے یسے؟“

”پر کیوں؟ اگر مجھے کچھ ہو بھی گیا تو کیا مضائقہ ہے؟“

رٹکی نے کچھ جواب نہ دیا۔ ایٹریسٹ پیار کے انداز میں بولا۔

”خیر میں جانوں نہ جانا ہی بہتر ہے۔ آخرا ب یہاں سے بھی توجہ کو ج

کرنا پڑے گا۔“

”جلد؟“

”تمہاری خالہ آخر کب تک مجھے رہنے دیں گی؟“

”ہم تو گرمیوں کے موسم میں ہمیشہ کمرے کو ایہ پر دیریتے ہیں۔“

ایٹریسٹ نے رٹکی کے چہرے پر نظریں گاڑ کر پوچھا۔

”تم چاہتی ہو میں ٹھہر جاؤں؟“

”ہاں۔“

”تو آج رات میں تمہارے لیے دُعا کروں گا۔“

ایٹریسٹ نے تمہارے کے لفظ پر خاص زور دیا۔ میگن کا چہرہ تمتمتا اٹھا۔ پسین

بہیں کمرے سے باہر نکل گئی۔ ایٹریسٹ نے چائے کو ابھی ہاتھ نہ لگایا تھا۔ پتیاں

ابھی اچھی طرح بھیگی نہ تھی۔ اپنے آپ کو بڑا مجاہد کہا۔ یہ کیا منہ سے نکل گیا؟ یہ میں

نے کیا کیا؟ خوشنما چھوڑوں کو اپنے جوتے کی ٹھوکہ سے کھل ڈالا۔ میں بھی رابرٹ

گارٹن کی طرح گر جا ہوں۔ شہر کا رہنے والا۔ کالج کا طالب علم۔ اس رٹکی کو

سمجھنے سے بالکل قاصر!

(۴)

اگلے ہفتے ایئر سٹ کو یقین ہو گیا کہ اب گھٹنے کی تکلیف جانی رہی کیونکہ اس نے اردگرد کے علاقہ کی خوب سیر کی۔ ایئر سٹ پر اب کے سال موسم بہار کی وہ کیفیتیں آشکارا ہوئیں کہ آنکھیں کھل گئیں۔ کبھی کسی بیچ کے سرخ و سفید شگوفوں کے جو گہرے نیلے آسمان کے بالمقابل دُھوپ میں کھلے ہوتے یا کبھی سکادھ فرسے تنوں اور ٹہنوں کو جو تیز روشنی میں طیالے معلوم ہوتے تھے۔ ایک نشہ کے عالم میں بیٹھا دیکھتا رہتا یا پھر جنگل میں لاریج کے درختوں کا نظارہ کرتا جو ہوا کے زور سے سلائی ہو گئے تھے پتلے پتلے کالے کالے تھے اور پر کی ٹہنیوں میں کونپلیں چڑھتی رہی تھیں جو ہوا کے جھونکوں سے چپکرائی تھیں تو صفت میں ایک زندگی سی آجاتی کبھی شکر کے کنارے گھاس پر لیٹ جانا اور ہفتے کے چٹوں۔ گپوں کو دیکھتا رہتا یا سوکھے پونے بریکین میں کھڑا ڈوب رہی کی گلابی گلابی ٹہنیوں کو جن کے آر پار ڈھکنی دیتا تھا انگلیوں سے تپتی رہتا کبھی گنگو چبانے جتے کبھی سبز بہ بہ ٹہنیوں سے کبھی آسمان کی بلندی سے کوئی لاکھ اپنے گیت کے موتیوں کو قطروں کی طرح ایک ایک کر کے زمین پر ٹپکاتا۔ بہاریں کئی دیکھی تھیں لیکن ان میں یہ بات نہ تھی۔ وہ بہاریں سبز و گل کی بہاریں تھیں۔ یہ بہار دل کی بہار تھی۔ دن کے وقت گھر کے درگاہوں سے ملنا کم ہوتا جب میگن کھانا لے کر آتی اسے یا تو گھر کا کوئی کام کسوتا ہوتا، حائل میں ننھے ننھے جانوروں کی دیکھ جال کرتی ہوتی اس لیے ایک دو بانوں سے زیادہ نہ ٹھہرتی۔ لیکن شام کے وقت ایئر سٹ باورچی خانہ کی کھڑکی کے پاس بیٹھ جاتا۔ پائپ سڈکا لینا۔ لنگڑے جسم یا مندرنیر و کو مہبت باتیں کرتا رہتا۔ لڑکی سینا پر ونا لے بیٹھی یا کھانے کے برتن سنبھالتی پھرتی، بعض دفعہ اسے یہ احساس ہوتا کہ میگن اپنی پھلکتی ہوئی مجوسی مجوزی آنکھوں سے ٹپکتی لگا سئے۔ بیٹھی بیٹھی نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ اس سے عجیب ثنوت آمیز مسرت ہوتی۔ دل کی وہ کیفیت ہوتی جو ایک بلی کی ہوتی ہوگی جب وہ میاؤں میاؤں کرتی ہے۔

ایک ہفتہ اور گزر گیا۔ اتوار کے دن شام کے وقت ایشرسٹ با پیچھے میں بیٹا بیک برڈ کی آواز پر کان لگائے ایک عشقیہ نظم موزوں کر رہا تھا کہ اتنے میں پھانک کے بند ہونے کی آواز آئی اور درختوں میں بیچ میں آگے آگے لڑکی اور اس کے پیچھے پیچھے وہ لال لال کلوں والا دہقان سہانے نظر آئے۔ ایشرسٹ سے میں گز کے فاسد پہا کر لڑکی ٹھہر گئی۔ تو جی آپنچا۔ دونوں آمنے سامنے کھڑے ہو گئے ایشرسٹ گھاس پر بیٹا ہوا تھا۔ اس پر کسی کی نظر نہ پڑی۔ لڑکا آگے بڑھتا گیا۔ لڑکی اسے پیچھے بٹاتی رہی۔ لڑکی کے چہرہ پر پلش اور پریشانی تھی اور لڑکے کا چہرہ ؟ کسی کو کیا معلوم تھا کہ اس دہقان کے لال چہرے پر بھی اتنا اضطراب ظاہر ہو سکتا ہے۔ ایشرسٹ کو یہ منظر دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ وہ یک طنت اٹھ کھڑا ہوا دونوں نسا سے دیکھا۔ بیگن نے اپنے ماتھے ڈھیلے جمبوڑ دیئے اور بیٹنی بیٹنی ایک رزیت کے تنے کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ لڑکا گھبرا کر کنارے کی طرف بھاگ نکلا اور چھلانگ مار کر غائب ہو گیا۔

ایشرسٹ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا لڑکی کے پاس آیا۔ وہ حُسن کی مورت ہونٹ کو دانتوں میں دباٹے بالکل بُت بنی کھڑی تھی۔ نظریں زمین دوز تھیں۔ ملائم سیاہ بال چہرے پر پریشان تھے۔

ایشرسٹ نے کہا: میں معافی مانگتا ہوں۔

لڑکی نے سر نیچا ڈالے پکپک اٹھا کر پٹی پٹی آنکھوں سے ایشرسٹ کو ایک نظر دیکھا۔ ایک سسکی بھری اور مڑ کر چل دی۔ ایشرسٹ اس کے پیچھے گیا۔

”بیگن“

لیکن وہ نہ لڑکی۔ آخر ایشرسٹ نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ اور آہستہ سے اسے اپنی طرف موڑ کر کہا۔

”ٹھہر جاؤ۔ مجھ سے بات تو کرو۔“

”آپ مجھ سے کیوں معافی مانگتے ہیں ؟ مجھ سے معافی مانگنے کی کیا ضرورت ہے ؟“

” اچھا تو میں تجھ سے معافی مانگ لیتا ہوں۔“
 ” اسے میرے پیچھے آنے کی جرات کیسے ہوئی؟“
 ” تم پر عاشق ہو گا اور کیا؟“

لڑکی نے زور سے پاؤں زمین پر مارا۔
 ایشرسٹ ہنس دیا: ” کہو میں اسے ڈانٹ دوں۔“
 لڑکی ایک طنت جذبہ سے بے قرار ہو کر رونے لگی۔

” آپ مجھ سے دل لگی کر رہے ہیں۔ آپ ہم لوگوں کی ہنسی اڑاتے ہیں۔“
 ایشرسٹ نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ لیکن وہ پیچھے ہٹ گئی تھی کہ
 اس کا چہرہ تمٹمایا ہوا چھوٹا سا چہرہ اس کے پریشان بال ایک سبب کے درخت کے
 گلابی شگوفوں میں جا لگے۔ ایشرسٹ نے اس کا ایک ہاتھ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا
 لیا دل میں سوچا کہ میں عورت کی کتنی قدر کرتا ہوں۔ وہ اکھڑتے ہوئے میرے مقابلہ میں
 کتنا حقیر ہے اور یہ احساس محض اتنی بات سے پیدا ہوا کہ اس کھردرے ہاتھ کو ہونٹوں
 سے چھو لیا تھا۔ لیکن اس وقت تک اپنا جسم چڑائے کھڑی تھی۔ لیکن اب ایک طنت
 تھر تھر کانپتی ہوئی ایشرسٹ کی طرف بڑھی۔ میٹھی میٹھی سی حرارت ایشرسٹ کے بدن
 میں سر سے پاؤں تک پھیل گئی۔ سمجھ گیا کہ اس نازک بدن بھول بھالی دو تینہ کو
 میرے ہونٹوں کے مس سے خوشی ہوئی ہے۔ ایک طنت بے تاب ہو کر بانہیں اس کے
 گرد ڈال دیں اور سینے سے لٹکا کر اس کا منہ چوم لیا۔ پھر کچھ سہم گیا۔ لیکن کانگ زرد
 تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ لمبی لمبی سیاہ پلکوں ہے رنگ رخساروں پر صاف باندھ رکھی
 تھی۔ بے جان بازو پہلوؤں کے ساتھ لگے تھے۔ اس کے سینے کے مس سے ایشرسٹ
 کے بدن میں کپکپی سی دوڑ گئی۔ ایک آہ بھر کر کہا: ” لیکن“ اولے اپنی گرفت
 سے آنا دکھایا۔ اس گہری خاموشی میں ایک بلیک بڑ چھپا یا۔ پھر لڑکی نے ایشرسٹ
 کا ہاتھ زور سے پکڑ لیا۔ پہلے رخسار چھو ہونٹوں سے لگایا اور اسے دیوانہ وار چوما
 اور پھر جاگ کر سب کے دانتوں کے کائی دانتوں میں غائب ہو گئی۔
 ایشرسٹ ایک پڑنے مڑے مڑے درخت پر جس کی شاخیں زمین کے

ساتھ ساتھ چیلی ہوئی تھیں بیٹھ گئی۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا اور حواس پریشانی تھی ان گلابی گلابی کلیوں کو جن میں سے ایک کلی کھل کر سفید ستارہ بن گئی تھی ان شکوفوں کو جنہوں نے میگن کے بالوں کے ارد گرد پھولوں کا ایک آماج گوندہ دیا تھا۔ کھوئی کھوئی نظروں سے نکلتا رہا۔ صحن کے لاتھوں ٹکست کھائی تھی، ماخدا جانے بہار کا ہا دو چل گیا تھا۔ بہر حال دل مسوتا اور احساس فتح مندی سے بریزتا تھا۔ مانگیں اور بازو چھڑکی سب تھے کچھ بہا ہوا بھی تھا۔ یہ آغاز سے مگر کا ہے کا آغاز؟ جگے اسے کاٹ بہت تھے۔ پھر اڑاڑ کر اس کے مزہ میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ گواہ بیک بڑھ چھا رہے تھے۔ بیٹل ہنس رہے تھے۔ مودت کی شامیں زمین کے تمازی پڑ رہی تھیں۔ سیب کے شکوفے کھلے ہوئے تھے اس کے پھولوں کی کھلیاں میں پلے سے زیادہ زندگی آگئی تھی۔ درخت کے تنے سے اٹھا اور باغیچے سے باہر نکل گیا۔ اسے کسی کھل جگہ اور کھلے آسمان کی ضرورت تھی جہاں چل کر اپنے جذبات سے مفاہمت کر لے۔ اس نے جنگل کا رخ کیا۔ جاڑی جلیں سے لپک لپک ہانی نے امیش کے درخت پر سے اڑ کر جنگل والوں کا اس کے آنے کی خبر کر دی۔

جس شخص کی عمر پانچ سال سے زیادہ ہو۔ اس کے متعلق کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اسے کبھی عشق نہیں ہوا؟ جب رقص کی تعلیم لے رہا تھا تو جن کے ساتھ ناچتا تھا ان پر عاشق تھا۔ سکول کی چٹیوں میں کئی رکھیوں پر عاشق ہوا۔ عشق کا نشہ جب ایک دفعہ چڑھنا شروع ہوا تو پھر شاید ہی کبھی اترا۔ ہمیشہ دکھ و بیش دور سے کسی کسی کی پریشانی کرنا رہا۔ لیکن یہ عشق سب سے زیادہ بڑھلا تھا یہاں دوری کا سوال ہی نہ تھا۔ یہاں تو بات ہی کچھ اور تھی۔ یہاں تو روح مسرت سے لبریز تھی۔ اور دل میں مروتی کے کھیل پانے کا احساس تھا۔ ایسے جنگلی پھول کو لاتھوں میں تھامے رہنا۔ جب دل چاہے اسے بوٹوں سے گٹا لینا اور اسے خوشی کے مارے کا پتے ہوئے عروس کرنا۔ اس میں کتنا سرور ہے۔ ہاں مگر اس سرور کے ساتھ ساتھ ایک المیہ بھی ہے اس پھول کو آخر کسے کیا؟ دوبارہ اس رنگی سے کس طرح ملے؟ پتہ پتہ تو کچھ ٹھنڈے دل

سے کچھ ترس کھا کر کیا تھا؟ لیکن لب تو ایسا کرنا ممکن نہیں۔ اب تو جانتا ہے کہ اسے بھی جو سے عشق ہے کس جذبہ کے ساتھ اس نے میرے ہاتھ کو چوما تھا۔ کس زور کے ساتھ اسے سینے سے لگایا تھا بعض لوگ ایسے ہیں کہ جب انہیں خراج عشق ادا کیا جائے تو ان کی فطرت میں ایک کڑھکی آجاتی ہے لیکن ان لوگوں میں سے تھا جو محبوب بن کر جھک جاتے ہیں۔ کسی کو گریہ دیکھ کر خود سحر ہو جاتے ہیں۔ ان کے جذبہ بہت میں گری اور طبیعت میں گواہ پیدا ہو جاتا ہے وہ عشق کو ایک معجزہ سمجھتے ہیں۔ جس سے ان کی فطرت میں ایک علو پیدا ہو جاتا ہے۔

اخیر سٹ جنگل کے ٹیلوں کے پاس بیٹھا عجیب کشمکش میں محو قرار تھا۔ دل کے اندر

جو بیمار کھل گئی تھی۔ اس کے مزے لوٹنے کو بے قرار تھا۔ لیکن ڈرتا بھی تھا۔ یہ نہ معلوم تھا کہ کس چیز سے لیکن لگتا مزور تھا دل سے کہتا ایسی خوبصورت بڑکی بولا بولا چہرہ چمکتی ہوئی نکلیں۔ اس کے دل پر فتح حاصل کر لینا۔ یہ کیا کچھ کم فکر کی بات ہے اب خدشہ کا ہے۔ لیکن پھر ایک مصنوعی سفیدگی کے ساتھ سوچتا یہ سب کچھ یہی۔ لیکن تم انجام سے پوری طرح واقف نہیں ہو مجھ سے کام لو۔

اپنے خیالات میں محو تھا کہ شام ہو گئی۔ چٹانوں کے ترشے ہوئے شاہی دیش کے ڈھیروں پر تاریکی چھا گئی۔ اہمیت کی آواز نے کہا یہ تمہارے لیے نئی دُنیا ہے۔ جس طرح انسان گریوں کے موسم میں صبح چار بجے اٹھ کر باہر نکل جائے تو چرند و پرند اسے گھور کر دیکھتے ہیں اور اسے موسس ہوتا ہے گویا ہر چیز نئی ہے۔

وہ گھنٹوں وہاں بیٹھا رہا۔ لیکن جب سردی موسس ہونے لگی تو اٹھا۔ پتھروں اور بید کی بڑوں کے بیچ سے راستہ ٹوٹا ہوا شکر پر پینچا۔ شکر کی گڈنڈی پر نکلا اور چہرہ غلغلہ کے برابر ہوتا ہوا اپنے میں داخل ہوا۔ وہاں پہنچ کر دیاسانی جلائی اور گھڑی کو دیکھا بارہ بجنے والے تھے! چھ گھنٹے پشتر دن کا روشنی کچھ کچھ باقی تھی اور پھل سے چھپا رہے تھے۔ لیکن اب تو چاروں طرف تاریکی مسلط تھی اور کہیں بھی زندگی کے آثار نظر نہ آتے تھے اور چہرے نے ایک فلت اپنے عشق روستالی کو بیرونی نقطہ نظر سے دیکھا نفس میں اس گناگ صحت یعنی منرنیر و کلب کی ترشروٹی اس کی سانپ کی سی

مڑی ہوئی گھوناس کی تیز سیاہ آنکھیں بائوں کا جائزہ لیتی ہوئی دکھائی دیں جسے دیکھ کر
 ٹکڑوں کے شبہات اور ان کے ناشائستہ ٹھنڈے سنائی دیتے۔ اکھڑو کا چہرہ منقرض سے لال
 نظر آیا۔ صوف ڈکھ بھری آنکھوں والا جم ہی آیا تھا۔ جس کا تصور تکلیف دہ نہ تھا۔
 گاؤں کے شراب خانہ میں کیا کیا پرہیزگاریاں نہ ہوں گی۔ بوڑھی عمر میں جنہیں اکثر
 سیر کے وقت سڑک پر چلنے دیکھا تھا کیا کیا باتیں نہ بنائیں گی۔ اور پھر اس کے
 اپنے دوست کیا کہیں گے۔ رابرٹ گارٹن تو رخصت ہوتے وقت واقفکارانہ
 انماز سے اور طنز کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔ اس مادل گھن سے بھر گیا۔ لمبے سہرے کلا سے
 اس اسفل طعنہ زن دنیا سے نفرت ہو گئی جس میں انسان زندگی گزارنے پر مجبور ہے
 جس بچانگ کے سہارے کھڑا تھا۔ اس کی سیاہی مدجم ڈگ گئی۔ اور ایک لڑکی
 جسک اس کے پاس سے گزر کر نیلی نیلی ہار کی میں پھیل گئی۔ چاند نکل آیا۔ ایشیئر سٹ
 نے دوا کر دیکھا۔ عجیب نظارہ تھا۔ چاند مٹی کے پتھر پر دکھائی دے رہا تھا لیکن
 سُرخ اور قریبا گول ایشیئر سٹ نے گھر کی طرف قدم اٹھائے۔ چنگڑی پر رات اور گوبر
 اور نوزولتہ سبزے کی خوشبو آ رہی تھی۔ اعلیٰ تان مویشی بڑے بڑے کالے کانے
 دجتے سے صوم ہونے تھے اس سیاہی میں کہیں کہیں ان کے پیلے پیلے سینگوں
 کے قوس دکھائی دینے تھے جیسے آسمان سے بلبل تو کون کے بل آگے ہوں۔
 گھر میں کہیں بدلتی نظر نہ آئی۔ دبے پاؤں ڈیوڑھی تک پہنچا اور ایک پو کے وقت
 کی تاریکی میں گم ہو کر سینگ کی کھڑکی کی طرف سڑاٹا کر دیکھا۔ کھڑکی کھلی تھی نہ صوم سینگ
 سمجھ رہا ہے یا اس کی جہائی میں پریشانیوں سے سبقت لے کر وہیں جا رہا ہے۔ کھڑکی
 کھل رہا تھا کہ ایک آؤ بولا۔

بجورندی کے جکے جکے مسل و متاز ٹور کے چاندوں طرف خاموشی چھائی ہوئی
 تھی۔ اٹور کی آواز جیسے ہار کی میں گونجا اٹھی۔ دن کو ٹکڑوں کا چہرہ آنا۔ رات کو آؤوں
 کا ہونا۔ ایشیئر سٹ کے دل کے بھانوں کا ان کے بچرے جہاں کہیں ہو سکتا ہے
 دن میں سینگ نے کھڑکی کے باہر جانا۔ ایشیئر سٹ دلوں سے ڈراہٹ آیا اور
 نہایت ہلکی آواز میں بولا۔ سینگ۔ سینگ چلے ہی۔ ثابت ہوئی۔ پھر ان باہر کو جھل

ایشرسٹ اس گھاس کے قطرہ پر چوں سے بل آگے بٹھا۔ سبز کرسی سے ٹھوکر تگی۔ دم روک لیا۔ میگن کے چہرے اور پچیلے بونے بازو میں جو غیر واضح نظر آ رہے تھے۔ کوئی حرکت نہ ہوئی۔ ایشرسٹ نے کرسی سرکا کر دیوار کے ساتھ لگا دی۔ اور چپ چاپ اس پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہاتھ بڑھایا تو میگن تک جا پہنچا۔ میگن کے ہاتھ میں دردانہ کی ایک بڑی سی چابی تھی۔ ایشرسٹ نے گرم ہاتھ ٹھنڈی چابی سمیت ندر سے پکڑ لیا۔ میگن کا چہرہ دھندلا سا نظر آتا تھا۔ ہونٹوں کے بیچ میں دانستہ چمک رہے تھے اور بال پریشان تھے۔ کپڑے اس نے بھی نہ اتارے تھے۔ بے چاری ایشرسٹ کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ خوبصورت میگن۔ اس کی گرم گرم کھردری انگلیاں ایشرسٹ کی انگلیوں سے اپٹ گئیں۔ بفر سے سے کھوٹی کھوٹی مہوم ہوتی تھی۔ چہرے پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ اس کے چہرہ تک ہاتھ پہنچ جانا بھی کتنی خوش نہیں ہے! اُتو پھر بولڈ سوٹ برائڈ کی خوشبو ایشرسٹ کے نغموں میں سما گئی۔ فارم کا ایک کتا ہونکا۔ میگن کی انگلیاں دھیلے پڑ گئیں اور وہ پیچھے ہٹ گئی۔

”گروہٹ میگن!“

”گروہٹ جناب! وہ ہل گئی ایشرسٹ تہ بھر کے پینچا لگا کر کاپر بیٹھ کر جوتے ندر نے گلا۔ اس کے ساتھ کچھ ہلکا سا جھکا جھکا چپ چاپ جا کر سوج ہے۔ لیکن پھر بھی وہ بہت پر تک ہے جس حرکت جٹا دل۔ اس کے بازو میں میں لٹکتے ہو رہے تھے۔ لیکن وہ غیر متوجہ ہو کر ان کے سامنے چہرہ لٹکا سوہ گرم

ننگیاں۔ اسے یاد آ رہی تھیں جو چابی اس کی تھیلے میں جا کر اس کے ہاتھ کو پٹ گئی تھیں اور ایشرسٹ پر ایک نغمہ سا پہلایا ہوا تھا۔

(تھیں)

یہ کونسا ہے جو گیا تھا۔ لیکن سچا اٹھا تو طبیعت میں گرائی تھی۔ جیسے رات کو کانا پیٹ بھر کر کھایا جو۔ کل کی گوشت مشن رہا تھا پیٹے کی ایک کھالی مہوم ہوتی تھی

لیکن اس دن پھر صبح میں ایک مجیب سی دلفریبی تھی۔ پیار کا موسم آتا پورے جو بن پر تھا۔ رات سنہری چھل تمام مرغزار پر چھا گئے تھے اور کھڑکی میں سے باغیچہ سیب کے تنگوں سے ڈھکا ہوا نظر آتا تھا۔ جیسے کسی نے گلابی اور سفید رنگ کا لباس پہنا دیا ہو۔ جب ایئر سٹ نیچے اُتتا تو دل ڈرسا رہتا تھا کہ میگن سے سامنا نہ ہو لیکن جب اس کا ناشتہ میگن کے بجائے مندریہ کو مہلے کر آئی تو ایئر سٹ کو ناگوار گزارا اور مایوسی ہوئی۔ آج مندریہ کو مہلے کی تیز آنکھ اور سانپ کی سی گردن پہلے سے بھی زیادہ چمکتی تھی اسے کہیں معلوم تو نہیں ہو گیا؟

• اچھا سٹائر سٹ۔ رات آپ کو کیا چاند کے ساتھ ساتھ سیر کرتے رہے۔

کھانا بھی کہیں کھایا یا نہیں؟

ایئر سٹ نے سر ہلادیا۔

• ہم نے تو آپ کے لیے کھانا رکھ چھوڑا تھا لیکن میں جا فل آپ کا دماغ اتنا موزون تھا کہ کھانے کا خیال بھی نہ آیا ہو گا؟

کیا وہ اپنے ویلز کے بے بی میں (جس کی پیچم کی بول بہت غالب آتی جا رہی تھی)

اس کا مذاق اڑا رہی تھی؛ اگر اسے اس بات کا علم ہو جائے تو — ایئر سٹ نے اس وقت دل سے کہا: "نہیں نہیں میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

لیکن ناشتہ کر چکنے کے بعد میگن سے ملنے کی خواہش بھر لہو بڑھتی گئی۔ دل میں

ڈرتا تھا کہ کہیں کسی نے اس سے ایسی ویسی بات نہ کہہ دی ہو جس سے سب بنا بنا یا

کیل بگڑ جائے۔ تاہم وال میں کچھ کالا کالا مزدور ہے جو صبح سے اس نے شکل تک

نہیں دکھائی وہ عشقِ نغم جو کل سہ پہر کو سیب کے درختوں کے نیچے اس پر اس قدر چھائی

ہوئی تھی۔ اب اسے اتنی پسکی معلوم ہوئی کہ اسکو سچا ڈر ڈالا اور اس کی بتیاں بنا بنا کر

اس نے پائپ سلگایا۔ اس لمحہ کو پکڑ لینے سے پہلے وہ عشق کے مزوں سے بے خبر

تھا۔ اور اب تو کوئی بھی کیفیت ایسی نہیں جس سے وہ بے خبر ہو۔ لیکن ان کیفیات

کو نغم کرنا گویا پانی کی لہریں گنا ہے۔ ایک کتاب لانے کو سونے کے کمرے میں

گیا۔ وہاں پہنچا تو دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میچن اس کا بستر لگا رہی تھی ایئر سٹ

دروازہ میں کھڑا اسے دیکھتا سا۔ میگن نے جبک کر تیکے کو عین اس کی جگہ پر جہاں
 ایشیئر سٹ کے سر رکھنے سے پچک گیا تھا۔ چوم لیا۔ ایشیئر سٹ کے دل میں یک ملت
 مسرت کا ایک طوفان بپا ہوا۔ اب اس پر کس طرح ظاہر کرے کہ میں نے دیکھ لیا
 ہے۔ اگر وہ بے پاؤں واپس لوٹ گیا اور اس نے بہت سن پائی تو اور بھی بڑا ہوگا۔
 میگن نے تیکے کو ہاتھ میں اٹھایا۔ معلوم ہوتا تھا کہ رخسار کے نقش کو مٹانا نہیں پڑتی
 پھر اسے نیچے رکھ دیا اور دروازہ کی طرف مڑی۔
 ”میگن :-“

”ٹھکی نے چونک کر اپنے ہاتھ رخساروں پر رکھ لئے۔ لیکن اس کی آنکھیں ایشیئر سٹ
 کے آر پار دیکھ رہی تھیں۔ ایشیئر سٹ کو ان چپکستی ہوئی آنکھوں کی گہرائی پاکیزگی اور
 ان میں رقت انگیز وفا کی جھلک۔ ان کا اس قدر احساس پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ رُک رُک
 کر بولا۔“

”رات تم میرے انتظار میں بیٹھی رہیں۔ میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔“
 ٹھکی کچھ نہ بولی۔

”میں رات جنگل میں ادھر ادھر پھرتا رہا۔ بڑا سہانا وقت تھا۔ اب میں۔“
 کتاب لینے اُپر آیا تھا۔“

میگن کا وہ تیکہ کو بوسہ دینا یاد آیا بہت بڑھی۔ دل میں ایک جوش سا اٹھا۔
 قریب آیا اور اس کی آنکھیں چوم لیں۔ رگوں میں خون تیز تیز دوڑنے لگا۔ دل نے
 کہا: ”اب بتاؤ کل جو کچھ ہوا تھا۔ وہ تو دفتر۔ اضطراری حالت میں سرزد ہوا تھا۔
 لیکن اب؟ اب کس منہ سے کہو گے کہ.....“ ٹھکی نے اپنا ماتھا ہونٹوں سے
 الگ کیا۔ ایشیئر سٹ کے ہونٹ نیچے کو سوتے گئے اور آخر کار میگن کے ہونٹوں
 سے جا ملے۔ عمر بھر میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی کو مکمل احساس عشق کے ساتھ چھنا ہو۔ بوڑھے
 عشق جس میں کیفیت اور نغمہ لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک معمولیت سی بھی تھی۔ اس سے
 دونوں میں سے کس کا دل زیادہ تڑپا ہوگا؟

”رات کو جب سب لوگ سو جائیں تو اس بڑے سے سب کے درخت کے

پاس ملنا۔ میگن وعدہ کرو۔

میگن نے بڑی دھیمی آواز میں کہا: "میں وعدہ کرتی ہوں۔"

میگن کارنگ فق تھا۔ ایشرسٹ نے کچھ اسے دیکھا۔ کچھ اس سارے

واقعات پر غور کیا۔ سہم گیا۔ روٹی کو چھوڑ کر پھلی منزل میں اتر آیا۔ جانتا تھا کہ اب
پہچے نہیں ہٹ سکتا۔ اس کے مشق کو قبول کر لیا۔ اپنا مشق ظاہر کر دیا۔ اب باقی کیا
رہ گیا ہے؟ کتب خانہ تو قبول ہی گیا تھا۔ خالی ہاتھ اس سبز کرسی پر جا بیٹھا۔ اس کے
سانے اور پیچھے فارم کے ٹک کام کانا میں مشغول تھے لیکن ایشرسٹ کی نظریں
سبوت تھیں۔ اترا بھی رہا تھا۔ پچتا بھی رہا تھا نہ معلوم کتنی دیر یونہی بیٹھا رہا اور پھر
جو دیکھا تو حائیں ہاتھ کو ذرا پیچھے ہٹ کر جو کھڑا تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ کھیت پر
سے ابھی ابھی ٹٹا ہے جسم کا بوجھ سمجھی اس ٹانگ پر ڈال دیتا سمجھی اس ٹانگ پر۔ چہرے
کارنگ ڈوبتے سوزج کی مانند تھا۔ نیلی قمیض کی آستینیں چڑھا رکھی تھیں۔ بازوؤں کی
زنجت اور چمک پکے ہوئے آڈوؤں کی مانند تھی۔ لال لال ہونٹ کھلے ہوئے
تھے اور سانس دھونکنی کی طرح سنائی دیتا تھا۔ نیلی نیلی آنکھیں سن کی سی پلکیں نظریں
ایشرسٹ کے چہرے پر گاڑ رکھی تھیں۔ ایشرسٹ نے طنز سے پوچھا۔

"کیوں تو۔ کوئی خدمت میرے لائق؟"

"ہاں۔"

"کیا؟"

"تم میاں سے چلے جاؤ۔ یہیں تمہاری ضرورت نہیں! "

ایشرسٹ پہلے ہی کلن سا مسکین صورت تھا۔ ادواب تو وہ اور بھی تن

کمر بولا۔

"تمہاری بڑی مہربانی ہے لیکن تمہیں خدائی فوجدار بننے کو کس نے کہا۔

جو ایک دو قدم آگے بڑھا۔ مہنتی فوجوانوں کے پسینے کی بو ایشرسٹ کے

نقنوں کو ناگوار گندی۔

"تم یہاں کیوں ٹھہرے ہو؟"

”میری مرضی“

”پنڈیا کی دستری ہوگئی تو مرضی و مرضی سب بھول جائے گی۔“

”تو تمہارا لہو کس نے روکا ہے؟“

”جوانے کچھ نہ کہا۔ صرف سانس اور جی تیز ہو گیا۔ جوان اور بچہ ہوتے
سانڈ کی طرح آنکھوں سے آگ برسنے لگی عفتہ کے مارے چہرے کے پٹھے
اٹھ گئے۔“

”میگن تبیں نہیں چاہتی“

اکٹر۔ بدتمیز دہقان کی یہ بات سن کر الیٹریسٹ کے سر سے پاؤں تک
آگ لگ گئی۔ حقارت اور عفتہ اور حد سے آگ بگولا ہو گیا۔ اپنے آپ پر قابو
نہ رہا۔ یک طنت اٹھا۔ کرسی پیچھے کودھکیں دی۔ اور بولا۔
”ایسی کی تھی تمہاری“

یہ الفاظ منہ سے نکالے تو سامنے میگن پر نظر پڑی۔ بادامی رنگ کا
کتے کا پلاگود میں اٹھائے دروازہ میں کھڑی تھی۔ جلدی سے پاس آئی۔
اور بولی۔

”دیکھو اس کی آنکھیں نیلی ہیں“

”جو چل دیا۔ گردن کا رنگ پیچ پیچ تو مزی ہو رہا تھا!
الیٹریسٹ نے کتے کے ہنٹوں کو پار سے چھیڑا۔“

مینڈک کی مانند موٹا تازہ کتلہ بڑے مزے سے میگن کی گود میں لٹا ہوا تھا۔

”یا بھی سے تمہیں پیار کرنے لگا ہے۔ سبھی تم سے پیار کرتے ہیں“

”جو آپ سے کیا کہہ رہا تھا؟“

”کہتا تھا تم یہاں سے چلے جاؤ۔ میگن کو تمہاری ضرورت نہیں“

رک کی نے پاؤں زور سے زمین پر مارا۔ پھر آنکھ اٹھا کر ایک پجارن کی
نظروں سے الیٹریسٹ کو دیکھا۔ الیٹریسٹ کانپ اٹھا۔ جیسے کسی پروانے کے پڑ
چلتے دیکھ لئے ہوں۔

”نہیں؟ سر ہلکا کر سکتے کو پیار کیا اور اس کے موٹے تازے جسم سے چہرہ
ڈھانپے اندر چلی گئی۔“

ایشرسٹ پگڈنڈی کے ساتھ ساتھ چل دیا۔ مرغزار کے چائیک پر وہ نگرہ
آدی طا۔ گائیں چڑھا رہا تھا۔ ایشرسٹ بولا۔

”جہم بڑا اچھا موسم ہے۔“

”گھاس کے لیے بہت اچھا ہے۔ اس لیے اوک کے درخت ایٹس کے
درختوں سے پبے ہرے ہوں گے۔ مثل بنے کہ جب اوک کے درخت ایٹس
سے پبے۔“

ایشرسٹ نے یونہی پوچھا: ”جہم جب تمہیں جیتی تو نظر آیا تھا تو تم کہاں
کھڑے تھے؟“

”ہاں اس بڑے سبب کے درخت کے نیچے سمجھ لیجئے۔“

”کیا واقعہ بھی کہہ سکتا یا یونہی؟“

”اب تو خدا جانے۔ کم از کم مجھے یہی معلوم ہوا کہ کھڑا ہے۔“

”یہ تو آتا کیوں ہے؟“

نگرہ آدی نے دھیمی آواز میں کہا۔

”کسی کی بُرائی نہیں کرنی چاہیے لیکن کہتے ہیں کہ سٹرنیو کو سب نسل کا چپسی
تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ چپسی لوگ اپنی نسل کے آدی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔
انہیں کسی نہ کسی طرح خبر پہنچی ہوگی کہ سٹرنیو کو سب مرنے والا ہے۔ چنانچہ
انہوں نے مجھوت کو بھیج دیا کہ جاؤ تم پکس رہو۔ میں تو یہی
سمجھتا ہوں۔“

”دیکھنے میں کیسا تھا؟“

”چہرے پر بال ہی بال۔ یوں چلتا تھا جیسے ہاتھ میں فڈل اٹھا رکھا تھا۔“

”بعض لوگ کہتے ہیں مجھوت پریت سب مجھوت ہے۔ لیکن ماما باندھیری
رات میں اس کتے کے جسم پر رونگٹے کھڑے ہوئے تو میں نے اپنی آنکھ سے

دیکھے ہیں۔ خود چاہے مجھے عبوت نظر نہ آیا ہو۔

”چاند نکلا ہوا تھا؟“

”کوئی بد بو تیر بوئیں رات تھی۔ چاند ابھی ابھی نکلا تھا اور ان درختوں کے

پیچھے سنہری دکھان دسے رہا تھا“

”تمہارا خیال ہے عبوت خوش ہوتے ہیں؟“

منگڑے آدمی نے اپنی ٹوپی پیچھے سرکادی۔ اوپر اٹھی ہوئی نظروں سے الیٹریٹ

کو اور بھی غور سے دیکھنے لگا۔

”صاحب یہ خدا جانتا ہے۔ لیکن آخر عبوت یوں مادے مارے کیوں پھرتے

ہیں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ خدا کے ان بھیدوں کو ہم کیا جانیں۔ بعض لوگوں کو کچھ نظر

آتا ہے۔ بعض کو نہیں آتا۔ اب ہمارے جو گویا ہمارے رٹکوں کو لیجئے۔ سامنے پڑی

چنیز دکھائی نہیں دیتی۔ لیکن میگن کی نظر کیا حال جو کبھی چوک جائے۔ جو ہوگا۔ دکھائی

دے گا بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی نظر آئے گا“

”وجہ یہ ہے کہ وہ حواس ہے“

کیا مطلب؟

”میرا مطلب ہے وہ ہر چیز کو محسوس کرتی ہے“

”یہ سچ ہے میگن کا دل بڑا نرم ہے“

الیٹریٹ کو اپنے چہرے پر خون دوڑتا ہوا محسوس ہوا۔ تمباکو کی تھیلی آگے

بڑھادی۔ ”وہاں پھر لو“

”تھینکی حضور۔ بس لاکھوں میں ایک رٹکی ہے یہ“

الیٹریٹ نے جواب میں مختصر سا فقرہ کہا۔ تھیلی لپیٹ لی اور چل دیا۔

”اس کا دل نرم ہے۔ بجائیکن میں جہاں کس فکر ہوں۔ میری نیت کیا ہے۔ ادھر

ادھر کھیتوں میں گھومتا پھرا لیکن اس خیال نے پیمانہ چھوڑا۔ کھیتوں میں بٹرکپ کے

تھیلے آگے رہے تھے اور دل رنگ کے بچڑے گھاس چر رہے تھے۔ آسمان

پر ابا بیلین لڑ رہی تھیں۔ واقعی ایش کے درخت ابھی ہرے نہ ہوئے تھے۔ لیکن

لوک کے درختوں پر مجڑے مجڑے سنہری پھول کھل رہے تھے۔ ہر درخت
 کا رنگ جُدا تھا۔ کسی کی اٹھتی جوانی تھی۔ کوئی اپنے مجڑے بون پر تھا۔ لگو اور
 ہزار اپند سے چھپا رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی ندیوں کا پانی دیکھ رہا تھا۔ قدیم
 ننانے کے لوگوں کا عقیدہ تھا کہ عیش و عشرت کا زمانہ آنے والا ہے.....
 باغ جنت میں..... ایک جھڑاس کی آستین پر آ بیٹھی۔ ایک جھڑ سے دو ہزار
 جھڑیں آستین پر آ بیٹھی۔ ایک جھڑ سے دو ہزار جھڑیں پیدا ہوتی ہیں اور ایک جھڑ کو
 مار ڈالو تو گویا جو سب ان شگوفوں سے اُگیں گے۔ وہ دو ہزار جھڑوں کی دستبرد سے
 محفوظ ہو جائیں گے۔ پر کون ایسا سنگدل ہوگا جو ایسے خوشگوار موسم میں کسی کی جہان
 لے سکے۔ ایک کھیت میں سُرنا جگ کا ایک جوان ساٹھ چوڑا تھا۔ ایشرسٹ نے
 اسے دیکھا تو جو کی شکل یاد آئی۔ لیکن ساٹھ نے ایشرسٹ سے کچھ ترمین نہ کیا۔ شاید یہ
 پست قد بانور خود بھی اس سنہری چاگاہ کی خوبورتی اور موسیقی سے مست تھا ایشرسٹ
 بے کھلے ندی کے پاس ڈھلان پر جا پہنچا۔ سامنے ایک پہاڑی چٹانوں کا تاج پہنے کھڑی
 تھی۔ بیوہل اس کثرت سے آگ رہے تھے کہ ذہن پر ایک نیلی سی دُھند چھا گئی تھی۔ اور
 سیب کے کوئی ہیں درخت شگوفوں سے لڑے کھڑے تھے۔ ایشرسٹ گھاس پر
 لیٹ گیا۔ کھیتوں کے منظر پر اوک کے درختوں اور بڑکپ کے پھولوں کا سنہری
 رنگ چڑھا ہوا تھا۔ لیکن یہاں میاں لے رنگ کی پہاڑی کے دامن میں تو جیسے آسمان
 کا سن زمین پر آ رہا تھا۔ ایشرسٹ اس فرق کو دیکھ کر محویت تھا۔ ککوؤں کا چھپانا
 اور ندی کا شور البتہ ویسے ہی سنائی دے رہا تھا۔ بہت دیر تک لیٹا رہا۔ شہد کی مکھیوں
 کے سوا اور کوئی ساتھی نہ تھا۔ ٹھنڈے نے رفتہ رفتہ اپنا رخ بدل لیا اور سیب کے درختوں
 کے سائے بیوہل کے پھولوں پر پڑنے لگے۔ دیوانہ وار خیال آیا۔ آج صبح اسے چوما تھا
 آج رات سیب کے پتے کے نیچے ملاقات ہوگی۔ بن دیویاں ایسے ہی درختوں پر آرام
 کرتی ہیں اور سوکھے ہوئے بریکن کی رنگت کے نیچے کانل والے دیواناں کے انتظار
 میں پڑے رہتے ہیں بکوش میں آیا تو ککو چھپا رہے تھے اور بہتے پانی کی آواز سنائی
 دے رہی تھی لیکن ٹورنچ پہاڑی کے پیچھے جا چھپا تھا۔ ڈھلان پر ایک خشکی سی آ

گئی تھی اور کہیں کہیں خرگوش باہر نکل آئے تھے۔ سوچا "آج رات" جس طرح ہر شے زمین سے اچھری آ رہی تھی۔ اور ایک غیر مرئی ہاتھ کی نرم اور پلاسٹک شاپلی سے اس کا سنی ہر لمحہ آشکار تر ہو رہا تھا۔ اسی طرح اس کے دل اور اس کے حواس کی بھی جیسے تہیں ایک ایک کر کے کھلتی جا رہی تھی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ سیب کے درخت کی بھی ایک ٹہنی توڑی۔ خشک فوں میں وہی میگن کا سامن صحرائی۔ وہی بیسی سا شہابی رنگ۔ وہی تازگی اور کھلے ہوئے پھولوں میں میگن کی سی سفید رنگت، وہی دل کو موم کر دینے والی دلفریبی جلوہ گر تھی۔ ٹہنی کو کوٹ میں لگایا۔ دل کے اندر جو بہار کھل رہی تھی۔ اس کا تمام تر جوش فتمندی کے ایک گہرے سانس کے ساتھ ہونٹوں سے باہر نکلا۔ لیکن خرگوش بیک کر جاگ گئے۔

(۶)

اڈویسے کی جلد آدھ گھنٹے سے انٹرنیٹ کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن پڑھا ایک لفظ بھی نہ تھا۔ رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ کتاب دکھ دی اور احاطے میں سے بوکر باغیچے میں پہنچ گیا۔ پابڑی کے عقب سے سنہری رنگ کا چاند ابھی ابھی نکلا تھا اور ایک ایش کے درخت کی نیم رہنہ ٹہنیوں میں سے ایک نورانی ٹہر جلال محافظ فرشتہ کی طرح جھانک رہا تھا۔ سیب کے پٹیوں کے نیچے ابھی اندھیرا تھا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ میں کہاں ہوں اور مجھے کس طرف جانا ہے۔ نامہوار گھاس کو پاؤں سے ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھا اس کے پیچھے قریب ہی کسی تاریک چیز نے حرکت کی اور ڈکارینے کی سی آواز آئی۔ تین بڑے بڑے سور فدا چونکے اور ہل جمل کر پھر ایک دوسرے کے پیلو میں دیوار کے نیچے لیٹ گئے۔ اس نے کان لگا کر سنا۔ ہوا بند تھی۔ لیکن راہ میں ندی کی سرگوشیاں اور تھپتھپ دوچند سنائی دیتے تھے۔ ایک پرندہ دن معلوم کون سا، لگا تا پپ۔ پپ۔ پپ کر رہا تھا اور ایک نائٹ جار کے اڑنے اور ایک سو کے پونے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ انٹرنیٹ ایک دو قدم آگے بڑھا۔ اور پھر رگ گیا۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ اس کے سر کے ارد گرد ایک دھندلی

سی سفیدی چھائی ہوئی ہے جس میں زندگی دھڑک رہی ہے۔ ساکن اور سیاہ درختوں پر بے شمار گلیاں اور شگوفے جس کے نقش پھیلے ہوئے اور دھندلے سے دکھائی دے رہے تھے۔ بڑھتی ہوئی چاندنی کے طلسم سے زندہ ہو رہے تھے۔ اسے ایک عجیب احساس ہوا کہ وہ تنہا نہیں بلکہ رنیتوں کی صحبت میں ہے۔ گویا کئی لاکھ پرولسیا فرشتے کہیں سے اڑ کر آئے ہیں اور تاریک آسمان اور تاریک تر زمین کے درمیان آکر ٹھہر گئے ہیں اور اس کی آنکھوں کے برابر اپنے پر کھول رہے ہیں اور بند کر رہے ہیں۔ اس ہوش رُبالے کے حسن سے سحر ہو کر جس میں کوئی آواز کوئی خوشبو نہ آتی تھی۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ باغیچہ میں کیوں آیا تھا۔ وہ جہن یاں جس میں زمین دن بھر ملبوس رہی تھی۔ چاندنی اسے تھیل نہ کر سکی۔ صرف اس کی دمنج بیل ڈالی۔ جھاڑیوں اور شاخوں میں سے ہوتا ہوا جن پر وہ نندہ سفیدی سفوف کی طرح بکھری ہوئی تھی۔ آگے نکل گیا اور بڑے سید کے درخت

نک جا پہنچا۔ اندھیرے میں بھی وہ درخت باقی درختوں سے گہرا اور بلندی میں قریباً دگن۔ کھلے میدان اور ندی کی طرف جھکا ہوا صاف چھاپا جاتا تھا۔

گھنی ٹہنیوں کے نیچے پونچ کدو رک گیا۔ اور کان لگا کر سننے لگا۔ وہی آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔ اور نیم خوابیہ سوردھی آواز میں ڈکرا رہے تھے اس کے مس سے تنے کی کھردری کائی دار سطح میں سے کونٹے کی مٹی کی سی خوشبو نکلی۔ کیا وہ آئے گی؟ کیا سچ بچ؟ تھر تھرائے ہوئے مسور بانجاب درختوں کے درمیان اس کے دل پر ہر طرح کی بگمگانی نے احاطہ کر لیا۔ یہاں کی کوئی نشے بھی اس کو دنیا کی معلوم نہ ہوتی تھی۔ یقیناً یہ مقام فانی عاشقوں کے لیے ہے۔ الیٹرمٹ اور اس دہقانہ راک کی کے لیے نہیں۔ صرف دیوتاؤں اور دیویوں کے لیے بنا ہے اگر وہ نہ آئی تو کیا طبیعت کو ایک اطمینان ایک فلم کا سا احساس نہ ہوگا؟ یقین پھر بھی اس کے کان اس کی آہٹ سننے کے منتظر تھے وہ نہ معلوم پرند بدستور ہپ ہپ کر رہا تھا۔ ندی کا شور بدستور سنائی دے رہا تھا اور سخت کی ٹہنیوں میں ملبوس چاندنی کو جھانک رہا تھا۔ آنکھ کے برابر جو شگوفے تھے وہ معلوم ہوتا تھا

ہر لمحہ زندہ تر ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کا پٹا سر پر نقری من بھی ایشرسٹ کی
بے نابی کا جزو بنا جا رہا تھا۔

اس نے ایک ٹیپ جس پر تین شگوفے کھل رہے تھے، توڑ لی، چل دار
دختوں کے شگوفوں کو نرم، پاکیزہ، مقدس، نوخیز شگوفوں کو توڑنا اور پھر صینک
وینا کیا یہ گناہِ عظیم نہیں؟ یک ملت بچا ملک کے بند ہونے کی آواز آئی سوز
پھر جاگ اٹھے اور ڈکرانے لگے۔ ایشرسٹ درخت کے ساتھ ٹیک لگائے
کھڑا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کائی دار تنے کو دبا رہے تھے۔

میگن کو دیکھا تو حیرت سے دم روک لیا۔ اس کی خاکوش زقاری ایک پری
کی سی تھی جو درختوں کے بیچ میں پھر رہی ہو۔ جب قریب پہنچی تو ایسا معلوم
ہوتا تھا کہ اس کا ناریک جسم ایک پھوٹے سے درخت کا حصہ ہے اس کا سفید چہرہ
شگوفوں میں ایک شگوفہ ہے۔ وہ چپ چاپ ایشرسٹ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایشرسٹ
نے وحشی آواز میں کہا۔

”میگن؟ اور ہاتھ بڑھا دینے وہ سیدھی دوڑ کر اس کے سینے سے آگئی۔ جب
اس کا دل اپنے دل کے ساتھ دھڑکتا ہوا محسوس کیا تو ایشرسٹ نے اپنے دل کو توڑ
لواں اور وفور عشق سے لبریز پایا۔ چونکہ وہ اس دُنیا کی نہ تھی۔ نوجوان تھی۔ معصوم تھی
اپنا سب کچھ قربان کرنے پر تیار تھی۔ عشق میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اور کسی طرح اپنی حفاظت
نہ کر سکتی تھی۔ اس تاریکی میں اس کا محافظ نہ بنے تو کیا کرے؟ مگر چونکہ وہ سجدت
حسن اور سادگی تھی اور زندہ شگوفوں کی طرح بہار کی اس رات کا ایک جزو تھی۔
یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ وہ جو کچھ دے وہ سب کا سب قبول کرے اور اس کے دل
کی بہار اور اپنے دل کی بہار دونوں کی نیل نہ کرے؟ یہ دو جذبے اپنی اپنی
طرف اسے کھینچ رہے تھے۔ راک کی کوند سے سینے سے لگایا اور اس کے بالوں
کو بوسہ دیا۔ کچھ معلوم نہ ہوا کہ کتنی دیر دونوں وہی خاکوش دہاں کھڑے رہندے
بڑھاتی رہی۔ اُتو بولتے رہتے چاند چمکے چمکے بلند تھا اور سفید تر ہوتا گیا۔ ان کے
ارد گرد شگوفے زندہ حسن کے دل کی دھڑکی سے اور بھی جھک اٹھے۔ جڑوں

کے وصل نے گشتو کے دروازے بند کر رکھے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گتار
 لایاں کوئی کام نہیں۔ بہار صرف سرسلائی بستے اور سرگوشیاں کرتی ہے۔ بہار بولتی
 نہیں۔ لیکن بہار کے کھلے ہوئے پھول چھوٹی ہوئی کونپلیں۔ ندریوں کی سبک پائی۔ ان
 کی خوش آہنگ اور اہلانہ جستجو یہ تعریف گتار سے کہیں بڑھ کر نہیں اسی طرح بہار بعض
 اوقات دندہ بھی ہو جاتی ہے اور ایک پر اسرار ساحر کی طرح دو عاشقوں کے پاس
 کھڑی ہو کر ان دونوں کے گرد اپنی بانہیں ڈال دیتی ہے۔ اپنی انگلیوں کے مس سے
 ان پر اپنا جادو پھیر دیتی ہے اور پھر وہ ہونٹوں سے ہونٹ ملائے بغیر اس بوسے کے
 سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ جب میگن کا دل اس کے دل کے ساتھ دھڑک رہا تھا۔
 اور میگن کے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر پھڑک رہے تھے ایئر سٹ کے دل کو نشیلی
 مسرت کے سوا اور کوئی احساس نہ تھا۔ مسرت میں یہی لکھا تھا کہ وہ اس کی آغوش کو زینت
 بننے۔ عشق کا کہا کون موڑ سکتا ہے؟ لیکن جب سانس لینے کو ان کے ہونٹ
 جدا ہوئے۔ تو دہائی فوراً حائل ہوئی۔ البتہ عشق کا جذبہ اب پہلے سے زیادہ موہنے
 زور تھا۔ ایئر سٹ نے آہ جبر کر کہا۔

”او میگن۔ تم کیوں آئیں؟“

میگن نے نظر اٹھائی۔ کچھ حیران تھی۔ کچھ مجروح۔

”جناب آپ ہی نے بلایا تھا۔“

”میری جان مجھے جناب نہ کہو۔“

”تو پھر کیا کہوں؟“

”فرینک۔“

”میں نہیں کہہ سکتی۔ برگز نہیں۔“

”تو کیا تمہیں مجھے ثابت نہیں؟“

”ہاں پر میرا وعدہ نہیں۔ میں جیتے آپ کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔“

”بس۔“

وہی آواز میں جو مشکل سنائی دیتی تھی۔ میگن نے کہا۔

”آپ کے پاس نہ رہ سکی تو میں مر جاؤں گی۔“

ایشریٹ نے ایک لباس لیا۔

”تو آؤ پھر میرے پاس آؤ۔“

”اوہ۔“

اس ”اوہ“ میں جو گلوں اور سرت تھی۔ اس سے ایشریٹ پر ایک نشہ سا چھا گیا۔
وہ جی آواز میں بولا۔

”میں تمہیں لندن لے چلوں گا۔ میں تمہیں سب دنیا کی سیرکراؤں لگا۔ اور
یہاں میں قسم کھاتا ہوں کہ میں ہر طرح تمہارا خیال رکھوں گا۔ کبھی تم سے مددنی کے
ساتھ پیش نہ آؤں گا۔“

”اگر میں آپ کے پاس رہ سکتی تو یہی کافی ہے۔“

ایشریٹ نے اس کے بالوں پر ہاتھ چیر کر کہا۔

”کل میں ٹور کی جاؤں گا اور وہاں سے رو پیسے کر تمہارے لیے کپڑے
خریدوں گا۔ ان کپڑوں میں لوگ خواہ مخواہ شبہ کریں گے۔ پھر ہم چمکے سے لندن
چلے جائیں گے اور وہاں پہنچ کر ہمیں مجھ سے محبت ہوئی تو شادی کر لیں گے۔
یہاں کے بالوں کا حقہ اسٹریٹ سے لے کر کھڑکی جنبش کا پتہ چلتا تھا۔“

”نہیں نہیں میں یہ نہیں کر سکتی۔ میں صرف آپ کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔“

اپنی موٹائی سے خود مسرور ہو کر ایشریٹ نے کہا۔

”نہیں بلکہ میں تمہارے قابل نہیں۔ میں نہیں مجھ سے محبت کب پیدا ہوئی؟“

”جب میں نے آپ کو سڑک پر دیکھا اور آپ نے مجھ پر نگاہ ڈالی۔ پہلی ہی بارے

مجھے آپ سے محبت ہو گئی تھی۔ لیکن یہ بھی میرے دم میں بھی دیا تھا کہ آپ مجھے
چاہیں گے؟“

یک وقت گھٹوں کے بل جھک کر ایشریٹ کے پاؤں چومنے لگی۔

ایشریٹ کانپ اٹھا۔ ٹوٹا اس کو چھو لیا اور پہنچ کر اس کے ہاتھ لایا۔ بہت
پریشان ہو گیا تھا۔ اس سے کہہ نہ سکا۔

میگن نے کہا۔

”آپ مجھے چومنے کیوں نہیں دیتے؟“

”مجھے تمہارے پاؤں چومنے چاہئیں۔“

میگن کی سکرابٹ سے ایشرسٹ کی آنکھوں میں آنسو جبر آئے۔ چاند کی روشنی میں ایشرسٹ کے قریب میگن کے چہرے کی سفیدی اوداس کے کھلے ہوئے ہونٹوں کا ہلکا گلابی رنگ ان میں سبب کے شوگونوں کا سا زندہ غیرارضی من تھا۔

اور پھر ایک لذت میگن نے آنکھیں پھاڑ کر دکھے ہوئے انداز میں سامنے دیکھا۔ کسا کراس کی آغوش سے اپنا آپ بھرا آیا اور بولی۔

”وہ دیکھو؟“

ایشرسٹ کو رگزشندی۔ ہلکے سنہری رنگ کے پچکنے ہوئے بیچ کے درختوں

اور ان کے پیچھے چاندنی میں اس پھاڑی کے سوا اور کچھ نظر نہ آیا۔ پیچھے سے اس کو میگن کی سہمی ہوئی آواز سنائی دی۔

”سہمی ہوا؟“

”کس؟“

”وہ درختوں کے نیچے۔ پتھر کے پاس؟“

ایشرسٹ نے با فروختہ ہو کر ندی کو چاند اور بیچ کے درختوں کی طرف چلا۔ چاندنی کا قریب ہے! کچھ بھی نہیں! چٹانوں اور تھارن کے درختوں کے بیچ میں بڑبڑاتا، اور سنتیں سمیتا! دھر! دھر! جاگتا اور ٹوکریں کھاتا پھرا۔ وایات! منبول! پھر سبب کے درخت کے پاس گیا لیکن وہ جا چکی تھی۔ اسے ایک سرسراہٹ سوروں کے ڈکرنے اور چٹانک کے بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ وہ چلی گئی۔ صرف وہ پرانا سبب کا درخت وہاں رہ گیا۔ اس نے اپنی بانہیں تانے کے گرد ڈال دیں۔ کہاں اس کا نرم جسم کہاں یہ سمت ننا! کمر دئی کاٹی اس کے چہرے کو چھو رہی تھی۔ کہاں اس کا کھر داپن۔ کہاں اس کا نرم رخسار! صرف خوشبو، جنگل کی خوشبو۔ کم و بیش ویسی تھی۔ اوداس کے ارد گرد شوگونے پہلے سے زیادہ زندہ۔ چاندنی میں پہلے سے زیادہ رگزشن، دکتے اور

سانس لینے معلوم ہوتے تھے۔

(۷)

ٹور کی ایشین پر ریل سے اتر کر ایشرسٹ نے سمندر کا رخ کیا اور ساحل کے ساتھ ساتھ ڈک کر ہلتا رہا۔ کیونکہ وہ انگلستان کے ساحلی مقامات کی اس جگہ یعنی ٹورک سے اچھی طرح واقف نہ تھا۔ اسے باکس کا چنداں خیال نہ تھا۔ اس لئے اسے اس بات کا احساس نہ ہوا کہ یہاں کے باشندے اسے تعجب کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ ایک موٹی سی نار نوک جیکٹ - گرد آلود بوٹ اور چھٹی پڑانی ٹوپی پہنے بے بے قدم اٹھائے چلا جا رہا تھا۔ اس بات سے بعض بے خبر لوگ اس بات کو حیرت سے ٹک رہے ہیں۔ اس کا بیک نڈن میں تھا لیکن وہ اس تلاش میں تھا کہ یہاں اس کی کوئی شاخ موجود ہو تو یہیں سے روپیہ نکلوالے۔ جب بنک میں پہنچا تو اس کے خوشگوار قبلا کو پہلا دھچکا لگا۔ انہوں نے پوچھا آپ ٹورک میں کسی کو جانتے ہیں؟ جواب ملا نہیں۔ انہوں نے کہا کہ آپ لندن تازہ صبح دیکھئے۔ وہاں سے جواب آئے گا تو ہم بڑی خوشی سے روپیہ ادا کریں گے۔ ٹھوس کاروباری دنیا کے مشتبہ سانس نے اس کے درخشاں تصورات کو دھنلا کر دیا۔ لیکن تازہ اس نے صبح دیا۔

ڈاکخانے کے سامنے عورتوں کے بیوسات کی ایک دوکان نظر پڑی۔ اس نے کھڑکی میں لٹکے ہوئے کپڑوں کو اندر کھینچنے کے احساس کے ساتھ دیکھا۔ اپنی محبوبہ دہقانی کے لیے کپڑے خریدنا خاصا پریشان کن ثابت ہوا۔ دوکان کے اندر گیا۔ ایک جوان عورت سامنے آئی۔ اس کی آنکھیں نیلی تھیں اور ماتھے پر خاصے تعجب کے آثار تھے۔ ایشرسٹ بغیر کچھ بولے اسے نکتا رہا۔

”کچھ جناب؟“

”مجھے ایک نوجوان خاتون کے لیے لباس خریدنا ہے۔“

نوجوان عورت مسکادی۔ ایشرسٹ نے ہاتھ پر تھوڑی ڈالی۔ ایک لحنت اور بڑے زور سے اس بات کا احساس ہوا کہ یہ فرمائش انوکھی فرمائش ہے۔

نوجوان عہدت نے جلدی سے کہا۔
 "کس قسم کا لباس چاہیے آپ کو؟ بہت دھندلا رہا؟"
 "نہیں کسی خاص سادا۔"
 "یہ نوجوان خاتون کس قد کی ہے؟"
 "معلوم نہیں۔ بس تم سے دو اونچے چھوٹی ہوں گی؟"
 "مگر کاناپ آپ مجھے بنا سکتے ہیں؟"
 "میگن کی کمر!"

"بس یہی جو عام طور پر ہوتا ہے؟"
 "بہت خوب!"

جب وہ چلی گئی تو ایشرسٹ کھڑکی میں رکھے ہوئے لباسوں کو پریشان نظروں سے دیکھتا رہا۔ اور ایک طنت اُسے خیال پیدا ہوا کہ میگن — اس کی میگن — سوائے کھردری پٹی کے سوائے کھردرے بلاؤز اور دہقانہ ٹوپی کے یعنی سوائے ان کپڑوں کے جن میں اسے بنا دیکھا تھا۔ کسی اور لباس میں بہت ہی عجیب معلوم ہوگی۔ نوجوان عہدت بازو پر بہت سے کپڑے ڈالنے والی آئی۔ اور ایک ایک لباس کو اپنے طرہ دار جسم سے لگا کر دکھانے لگی۔ ان میں سے ایک کا فاختی رنگ ایشرسٹ کو بہت پسند آیا۔ میگن کی یہ لباس پہنے ہوئے تفتور نہ کر سکتا تھا۔ نوجوان عورت چلی گئی اور چند اور کپڑے اٹھا لائی۔ لیکن ایشرسٹ کا دماغ سن ہو گیا تھا۔ کیا چُسنے اور کیونکر چُسنے؟ ٹوپی اور جوتا اور کستانوں کی بھی ضرورت ہوگی اور فرمن کرو سب کچھ خرید کر لے پنا دیا اور اس لباس نلے سے بالکل ہی بے رنگ بنا دیا۔ جیسے اتوار کے کپڑے اکثر دہقانہ کو بنا دیتے ہیں۔ تو پھر کیا ہوگا؟ سفر میں بھی اپنے ہی کپڑے کیوں نہ پہنے؟

ہاں۔ لیکن ان کپڑوں میں وہ بہت نمایاں معلوم ہوگی۔ یہ منہسی کیل نہیں بخندونکر کا سا ہے۔ نوجوان عہدت کو بے معنی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ کیا معلوم یہ سب کچھ ہمارے گئی ہو لہذا مجھے ایک بد معاش شخص سمجھتی ہو۔ آخر کار بولا: "یہ فاختی رنگ

کا باکس حلیہ رکھ دو۔ میں اس وقت فیصلہ نہیں کر سکتا۔ دوپہر کے بعد پھر آؤں گا۔“

زوجین عہدت نے ایک آہ بھری۔

”بہت اچھا۔ بہت خوبصورت لباس ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو اس سے موزوں لباس نہیں مل سکتا۔“

الٹیرسٹ نے کہا: ”غالباً نہیں۔“ اور چل دیا۔

مشتبہ دنیا کے کاروباری پن سے ایک بار پھر آزاد ہو کر اس نے ایک لباس اسٹور لیا اور پھر تعزیرات میں مشغول ہو گیا۔ تعزیرات میں اس بھولی بھالی پیاری لڑکی کو دیکھا جو اپنی زندگی اس کی زندگی کے ساتھ وابستہ کرنے کو تیار تھی۔ دیکھا کہ دونوں رات کے وقت چپکے سے باہر نکلے ہیں۔ وہ جنگل میں جا رہے ہیں۔ اس کا بازو لڑکی کی کمر کے گرد ہے۔ لڑکی اپنے نئے کپڑے اٹھائے جا رہی ہے۔ علی الصبح وہ کسی دور دراز جنگل میں پہنچ گئے ہیں۔ لڑکی نے اپنے پُرانے کپڑے اتار کر نئے کپڑے پہن لئے ہیں۔ اسٹیشن پر صبح کی گاڑی نیا رکھڑی ہے۔ جس میں سوار ہو کر وہ اپنے سنی مومن کے سفر پر روانہ ہو گئے ہیں اور پھر لندن سے انہیں نکل لیا ہے اور مشق کے خواب پتے ثابت ہو رہے ہیں۔

”فرینک الٹیرسٹ! واللہ رکبتی کے بعد تمہیں آج دیکھا ہے۔“

الٹیرسٹ کے ماتھے کے تکیوں صاف ہو گئے۔ جو چہرہ اس کے قریب تھا اس کی آنکھیں نیلی تھیں اور بشرے پر آفتاب کی جھلک تھی۔ ایسے شخص کا چہرہ تھا۔ جس کا آفتاب دل آفتاب فلک کے ساتھ مل کر اس کی زندگی کو درخشاں بخش رہا ہو۔

”ارے فل ہی ڈے“

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”کچھ نہیں۔ یونہی گھوم رہا تھا۔ مدد لینے آیا تھا۔ میں جنگل میں رہتا ہوں۔“

”پنچ کے لیے کہیں جانا تو نہیں؟ آؤ ہمارے ساتھ پنچ کھاؤ۔ میرے ساتھ میری

بہنیں بھی ہیں انہیں خسرہ نکلا تھا۔“

ایک دوسرے کی بانہ میں بانہ ڈالے دونوں دلوں سے روانہ ہوئے اور ایک پاڑی پر سے ہوتے ہوئے شہر سے باہر نکل گئے۔ پہلی ڈسے کا چہرہ آفتابی تھا تو آواز میں بھی بہت اور تانگی اور خوش دلی پائی جاتی تھی کہہ رہا تھا کہ یہاں اجاڑ مقام میں تو سوائے ہانے اور کشتی چلانے کے اور کوئی شغل نہیں۔ ہوتے ہوتے مکانات کی ایک ہلالی قطار کے سامنے آکر ٹھہر گئے جو سمندر سے فدا ہٹ کر واقع تھے۔ عین وسط میں ایک ہوٹل تھا۔ دونوں اندر داخل ہوئے۔

”میرے کمرے میں آکر موہنہ ہاتھ دھو لو۔ پنچ ابھی تیار ہوا چاہتا ہے۔“
 ایشرسٹ نے اپنا چہرہ آئینے میں دیکھا۔ فارم ہاؤس میں پندرہ دن تک صرف ایک کنگھی اور دو ٹیپٹوں پر گزارہ کیا تھا۔ اور یہاں تو کئی کپڑے اور کئی برش رکے تھے۔ سو چاہیب بات ہے۔ انسان کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ — کاجے کا احساس ایہ اُسے ٹیک معلوم نہ تھا۔

پہلی ڈسے کے ساتھ بیٹھنے کے کمرے میں پنچ کھانے گیا۔ تو تین اجنبی چہرے نظر آئے۔ لنگ بہت گدا۔ آنکھیں نیلی۔ پہلی ڈسے نے کہا۔
 ”یہ فرنیٹ ایشرسٹ ہے۔ یہ میری چھوٹی بہنیں ہیں۔ تینوں کے چہرے ایک لذت اور پراٹھے۔“

وہ تو بہت ہی چھوٹی تھیں۔ ایک دس سال کی۔ ایک گیارہ سال کی لیکن نمیری کی عمر سترو سال کے لگ بھگ تھی۔ قد لمبا۔ بال بکے رنگ کے۔ سُرخ و سپید رخسار جن کو سُرخ نے فدا سولا دیا تھا۔ جنویں سامنے سے نیچی۔ دائیں بائیں فدا اٹھی ہوئی تھیں۔ اور ان کی رنگت سر کے بالوں سے قد سے گہری تھی۔ آوازیں تینوں کی پہلی ڈسے کی طرح بلند اور بکاش تھیں۔ تینوں سیدھی کھڑی ہو گئیں۔ جلدی جلدی ہاتھ ملایا۔ ایشرسٹ پر ایک متبسس نظر ڈال کر ڈسا آنکھیں بٹالیں اور سر پر کے مشاغل کے متعلق باتیں کرنے لگیں۔ ایک ڈاٹنا اور باقی دوس کی دلیاں معلوم ہوتی تھیں۔ قدم کی نندگی کے بعد ان کی سُرخ پر جوش، بے تکلف گنگو۔ ان کا پر سکون منہا جو اب بے تکلف انداز شائستگی پہلے تو انوکھا اور پھر اس قدر ہنس معلوم

ہوا کہ قدم اڈس کا ماحول یک ملت کسی دور دراز دنیا کا خواب معلوم ہونے لگا۔ چوٹی
بیٹوں کا نام بیٹیا اور فریڈ اور بڑی کا نام اسٹیلا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد بیٹیاں کی طرف متوجہ ہوئی اور بولی۔

”آپ ہمارے ساتھ پھدیاں پکڑنے چلیں گے! بڑا لطف رہے گا۔“

اس غیر متوقع بے تکلفی پر متعجب ہو کر ایشرسٹ نے کہا۔

”مجھے آج سہ پہر واپس جانا ہے۔“

”اچھا؟“

”جانا متوی نہیں کر سکتے؟“

یہ سٹیلا کا فقرہ تھا۔ ایشرسٹ اس کی طرف مڑا اور سر ہلا کر مسکرا دیا۔ کیا حسن

تھا۔

بیٹیا نے افسوس کے بوجے میں کہا: ”متوی کر دیجئے تو بہتر ہو۔“ اس کے بعد پھر

خادوں اور تیرنے کے متعلق باتیں ہونے لگیں۔

”آپ بہت دور تیر سکتے ہیں۔“

”قریباً دو میل۔“

”سچ سچ؟“

”لوب۔“

”واقعی۔“

بیٹوں نے نیلی نیلی آنکھیں اس کے چہرہ پر گاڑ دی تھیں۔ ایشرسٹ کو اپنی نئی

اہمیت کا احساس ہوا۔ خوشگوار احساس۔

ہلی ڈے نے کہا۔

”ایشرسٹ تمہیں ٹھہرنا پڑے گا۔ ہمارے ساتھ نہانے نہ چلو گے؟“

”میں تو کہتا ہوں رات یہیں ٹھہر جاؤ۔“

”ہاں ضرور۔“

لیکن ایشرسٹ نے چہرہ مسکرا کر سر ہلا دیا۔ اور چہرے کی لنت ہی دکھائی اس کے

کھیوں اور جہانی کرتبوں کے متعلق دھڑا دھڑاس سے سوالات پوچھنے لگیں۔ رفتہ رفتہ معلوم ہوا کہ وہ کانچ میں کشتی بھی چھتا رہا ہے۔ فٹ بال کی ٹیم میں شامل تھا اور ایک میل کی دوڑ میں اہل بھی آیا تھا۔ پینچ ختم ہونے تک اس نے ان صفات کی بدولت رکھیوں کے دل میں گھر کر لیا۔ چھوٹی لڑکیاں معر بوبیں کہ جوار سے ساتھ چل کر وہ غار دیکھنے جہاں ہم کھینے جاتی ہیں۔ چنانچہ لوطوں کی طرح ٹائیں ٹائیں کرتی وہ الیٹریٹ کو ساتھ لئے غار کی طرف روانہ ہو گئیں۔ پیچھے پیچھے پیٹلا اور اس کا جانی تھا۔ غار دوسرے غاروں کی طرح سیلا ہوا اور تاریک تھا۔ خوبی اس میں صرف یہ تھی کہ اندر ایک پانی کا تالاب تھا جس میں سے کئی جانور پکڑا کر بوتلوں میں بند کئے جا سکتے تھے۔

سینا اور فرنیٹیا نے جن کی سڈل پنڈیاں موزوں سے بے نیاز تھیں۔ تالاب کے بیچ میں کھڑے ہو کر الیٹریٹ کو شمولیت کی دعوت دی۔ تاکہ تینوں اکٹھے پھلیاں پکڑیں۔ الیٹریٹ نے ٹوپی اور موزے اتار دیئے۔ جس کے دل میں احساس غمی ہو۔ اسے وقت گزرتا معلوم نہیں ہوتا۔ دو خوبصورت بچے پانی میں کھیل رہے تھے نوجوان ڈائناکانر سے پرکھڑی تھیں اور جو کچھ یہ تالاب میں سے نکالتے تھے۔ اسے حیرت اور تعجب سے پکڑتی جاتی تھی۔

الیٹریٹ یوں بھی وقت کا اندازہ ٹھیک نہ لگا سکتا تھا۔ جب گھڑی جیب سے نکالی تو حیران رہ گیا۔ تین کب کے بچے چلے تھے۔ گویا بنک بند ہو گیا ہوگا۔ اور روپیہ آج نہ مل سکے گا۔ اس کے بشرے کو دیکھ کر چھوٹی لڑکیاں چلانے لگیں۔

”آٹا — اب تو آپ کو ٹھہرنا ہی ہوگا۔“

الیٹریٹ نے کچھ جواب نہ دیا۔ اسے میگن کا چہرہ نظر آتا تھا۔ نامشرد کے وقت میگن سے دیکھی آواز میں کہا تھا۔

”میری جان میں سامان خریدنے ٹوکی جا رہا ہوں۔ آج شام واپس آ جاؤں گا۔ اگر موسم اچھا ہو تو آج صبح ہی چل دیں گے۔ تم تیار رہنا۔ اسے یاد دہا کہ میگن تو خیر اٹھی تھی اور اس کا آواز کو سن کر بہت خوش ہوئی تھیں۔ وہ دل میں کیا کہے گی؟ پھر ایک طنت احساس ہوا کہ تیسری لڑکی۔ لہا قند۔ گورا رنگ، ڈائناکانر کا ساجن، تالاب پر

کھڑی متحیر بنی آنکھوں سے اُسے بغور دیکھ رہی تھی۔ انہیں کیا معلوم کہ اس کے دل پر کیا گزر رہی ہے؟ انہیں کیا معلوم کہ آج رات کے لیے اس کے دل نے کیا ٹھان رکھا تھا؟ اگر انہیں معلوم ہو جائے تو وہ نفرت کا اظہار کر کے اُسے تنہا خار میں چھوڑ کر خود چلی سائیں۔ اس خیال سے کچھ مایوسی ہوئی۔ کچھ شرم سی آئی۔ گھڑی کو جیب میں ڈال کر ایک منٹ بولا۔

”آہا! — تو آپ ہمارے ساتھ ہی نہائیں گے۔“

یہ خوبصورت بچے کس قدر بے فکر تھے۔ سیٹلا مسکرا رہی تھی۔ بلی ڈسے کہہ راتھا۔ لطف آگیا۔ بس رات کے کپڑے میں نہیں دیدوں گا۔ اس تمام خوش دلی سے متاثر نہ ہونا ناممکن تھا۔ لیکن پھر مہی پشیمانی اور تننا کے جذبات سے دل دھڑکنے لگا اُھاسی کے بے میں بولا۔

”مجھے ایک ستارہ بیچنا ہے۔“

تالاب کے کنارے سے اگتائے تو ہوٹل کو لوٹ آئے۔ ایئر سٹٹ نے سزنیو کو اب

کے پتہ پر اس مضمون کا تارہ بیچا۔

”انوس ہے مجھے آنحضرت ہیں ٹھہرنا ہوگا۔ کل ڈوں گا۔ اس سے دل پکو ہکا ہو گیا۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ بلی بلی کی گری جسم کو بہت اچھی معلوم ہوتی تھی۔ سندر پوسکون اور نیلا نیلا تھا اور ایئر سٹٹ تیر کی کاشوقین خوبصورت بچوں کی تعریف و توصیف سے اس کی نورت کی نکین ہوئی تھی۔ سیٹلا اور بلی ڈسے کے بٹاش چہرے کو دیکھ کر لاشی حاصل ہوتی تھی۔ گویا سینگ کے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کرنے سے پہلے اپنی اصلی زندگی کو آخری نظر دیکھ رہا ہے۔ بلی ڈسے سے غسل کا باس مستار بیا اور کٹھے روانہ ہوئے۔ بلی ڈسے اور ایئر سٹٹ نے ایک چٹان کی لاکھٹ میں کھڑے ہو کر کپڑے اتار دے سب سے پہلے ایئر سٹٹ پانی میں داخل ہوا اور اپنی زبانی اپنی جو تعریف مان کو سنا جا چکا تھا۔ اس کو کھت ثابت کرنے کے لیے جان بوجھ کر دلیرانہ تیر کر بہت دور نکل گیا۔ مڑ کر دیکھا تو بلی ڈسے ساحل کے ساتھ ساتھ تیر رہا تھا۔ رکیاں پانی میں اچھل رہی تھیں اور ڈبیاں گھڑی تھیں اور چھٹی بہروں کے ملنے سے اپنے جسم کو ڈیلا چھوڑتی تھیں۔ ایئر سٹٹ

علم طوطی پر ایسے نظارے کو حقاقت کی نظر سے دیکھا کرتا تھا لیکن اس وقت لڑکیوں کی یہ کمزوری معتول اور دکھش معلوم ہوئی۔ کیونکہ اس کے مقابلہ میں اس کا اپنا کمال بہت نمایاں معلوم ہوتا تھا۔ جب ان کے قریب پہنچا تو سوچنے لگا۔ میں ایک اجنبی ہوں میری ملوثیت کہیں ان کو ناگوار نہ گزرے۔ اس نازک بلکہ دشمنیہ کے قریب جاتے ہوئے اسے ختم آتی تھی۔ لیکن بیتا نے اسے خود بلایا اور کہنے لگی مجھے تیرا سکاٹینے۔ چھوٹی لڑکیوں نے اسے اس قدر مصروف رکھا کہ اسے یہ معلوم کرنے کا کہہ سکیا اس کے قریب سے ماٹوس ہو چکی ہے لہذا نہیں، موقع ہی نہ ملا یہ تلفت اسٹیل پوکھ کر پکاری ایشرسٹ نے دیکھا تو اسٹیل مرمرین اور نازک بازو...

باندھ پھیلائے جسم ذرا آگے کو جھکائے مگر کڑھک پانی میں کھڑی ہے۔ اس کے ترچہ پرے پر ڈھوپ کی وجہ سے چندیں سی پڈ ہی تھیں اور وہ سہی ہوئی ایک طرف کو اشارہ

کر رہی ہے۔ "فل کو دیکھو! یہ کیا کردار ہے، اسے دیکھو یہ..."

ایشرسٹ تارگیا کہ فل خطر سے میں ہے۔ وہ ایشرسٹ سے سوگڑ کے فاصلہ پر تھا اس کے پاؤں اکھڑ چکے تھے۔ اور وہ ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ ایک لذت اس نے چیخ ماری۔ بانغا اپنے کیسے اس پانی میں ڈوب گیا۔ لڑکی اپنے بھائی کی طرف بڑھی۔ لیکن ایشرسٹ نے واپس جاؤ اسٹیل "کہہ کر اسے رکھ دیا۔ اور خود لپکا۔ علم ہر اس قدر تیز کہنی نہ تیرا تھا۔ پہلی ڈسے دو سے زیادہ غوطہ نہ کھانے پایا تھا کہ ایشرسٹ نے اسے پکڑ لیا جلاشے کی وجہ تیشخ اعضا تھی۔ لیکن اسے بچانے میں اسے وقت پیش نہ آئی۔ کیونکہ اس نے ذرا مزاحمت نہ کی۔ آخر وہاں پہنچنے جہاں ایشرسٹ لڑکی کو روک گیا تھا۔ جب زمین پہ پاؤں گئے تو لڑکی بھی آگے آئی فل کو اٹھایا اور ساحل پر لے گئے۔ ایشرسٹ اور اسٹیل اس کے بارنڈوں اور ٹانگوں کی مالش کرتے رہے۔ چھوٹی لڑکیاں سہی ہوئی کھڑی رہیں۔ خورٹی دیر میں پہلی ڈسے مسکرانے لگا۔ اور اس قدر تکلیف کا موجب ہونے پر مذمت کا اظہار کرنے لگا۔ ایشرسٹ سے بلایا ذرا سہارا دو تو میں کپڑے بدل لوں۔ ایشرسٹ سہارا دینے لگا تو اسٹیل کتر۔ اشک آو اور سُرخا پہرے پر جس کا سکون برجم ہو چکا تھا۔ نظر پڑی تو سوچنے لگا۔ میں نے اسے اسٹیل کہہ کر پکارا تھا۔ اس نے بڑا

تو نہیں مانا۔

کپڑے پہن رہے تھے تو ہیلی ڈے نے سچی آواز میں کہا۔
 "ایشرسٹ تم نے مجھے موت سے بچایا ہے؟"
 "کیا کہہ رہے ہو؟"

کپڑے پہن چکے تو ہوٹل میں آئے۔ لیکن ابھی کچھ پریشان تھے۔ باقی لوگ تو چائے
 پی کر بیٹھ گئے۔ ہیلی ڈے کو شادیا۔ مزید اور روٹی کے ایک دو ٹکڑے کھا چکی تو
 سبنا بولی۔

"آپ نے تو بہت بھاری دکھائی۔"

اور فریڈا بولی۔

"آپ کمال کے آدمی ہیں۔"

ایشرسٹ نے دیکھا کہ اسٹیل کی نظریں نہیں ہیں۔ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کھڑکی
 کے پاس جا کھڑا ہوا اور وہاں سے اس نے سبنا کو دھیمی آواز میں کہتے سنا۔ آؤ خون
 قسم کھائیں کہ ہم ہمیشہ دوست رہیں گے۔ فریڈا تمہارا چاقو کہاں ہے؟ کنگھیوں سے
 دیکھا کہ تینوں نے چاقو کی نوک اپنے جسم میں چسکا کر خون کا ایک ایک قطرہ نکالا ہے
 اور کاغذ کے ایک ورق پر کچھ لکھ رہی ہیں۔ وہ مرا کر دروازے کی طرف چلا۔

"اب نیولے نہ بیٹے یہاں آئے؟" چھوٹی بڑکیوں نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔

اور گھسیٹ کر میز تک لے آئیں۔ میز پر وہ کاغذ پٹا تھا جس پر خون سے ایک انسان
 کی تصویر بنی تھی۔ اور خون ہی سے تین نام لکھے تھے۔ سٹیل، ہیلی ڈے، سبنا، ہیلی ڈے
 فریڈا، ہیلی ڈے کاغذ پر بیٹے ہوئے ہوئے ایسی شکل بن گئی تھی۔ جیسے ایک ستارے
 کی شعاعیں! دھرا دھرا چل رہی ہوں۔ سبنا بولی۔

"یہ سچ میں تم ہو۔ تمہیں معلوم ہوا ہے۔ اب وہم تمہیں چومیں گی؟"

اور فریڈا بولی: "مہے ماں واتس؟"

ایشرسٹ کے لئے کوئی مفر نہ تھا۔ اس کے گیلے ہلی اس کی آنکھوں کے
 سامنے ٹھک آئے تھے۔ کسی نے اس کی ناک کو جیسے کاٹ لیا۔ اس کے بائیں بازو

پر کسی اور نے چٹکی بھری اور دانت اس کے رخسار پر آگئے۔ اس کے بعد انہوں نے اس کو چھوڑ دیا اور فریڈا بولی۔

”سٹیلا اب تمہاری باری ہے۔“

ایشرسٹ کانگ سڑخ پور لہتا تھا۔ اس کا جسم اکڑا ہوا تھا۔ میز کے اس طرف اسٹیلا کا بھی جی مل تھا۔ بیٹیا نے ایک لفظ نہ قبضہ لگایا اور فریڈا پکاری۔

”اب چلو بھی نہیں تو سب مزا کر کرنا سو ہاتے گا۔“

ایشرسٹ کے جسم میں ایک عجیب و غریب محبوب سے اشتیاق کی بہرہ دہ گئی۔ اس نے سچی آواز میں کہا۔

”بکومت بہت شریر لڑکیاں ہوتی ہیں۔“

بیٹیا پھر سنیں دی۔

”اچھا تو سٹیلا اپنے ہاتھ چومے اور تم اس کے ہاتھ کو لے کر اپنی ناک سے لگا لو۔ آپ کی ناک بھی اس طرف کو مڑی ہوئی ہے۔“

سٹیلا نے سچ پچ اپنا ہاتھ چوم کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ایشرسٹ نے بڑی متانت کے ساتھ اس نازک ہاتھ کو اپنے رخسار سے لگایا۔ چھوٹی رکیاں تالی بجانے لگیں فریڈا بولی۔

”بس اب جب موقع آیا ہمیں آپ کی جان بچانی ہوگی۔ میں چائے کا ایک اور پیالہ پی لوں سٹیلا؟ لیکن ایسی جکی پانی سی چائے نہیں جیسے تم نے پہلے پی ڈی تھی؟“

چائے کا ادھر پھر چلنے لگا۔ ایشرسٹ نے وہ دستاویز تہہ کر کے جیب میں رکھ لی۔ پھر خسروے پر ناز بچوں پر۔ چمچے سے شہد کھانے پر اور اسکول نہ جانے کے فوائد پر گفتگو ہوتی رہی۔ ایشرسٹ چپکاستا رہا۔ صرف کبھی کبھی سٹیلا سے جس کے چہرے کی صنفید رنگت پھر عود کر آتی تھی آنکھیں چار ہو جاتیں۔ اور نظروں ہی نظروں میں عہد رفاقت کا احادہ ہوتا رہتا۔ ایک اجنبی کے ساتھ ان بناش وگوں کے مستفاد مسوک سے ایشرسٹ کے دل کو راحت ہوتی۔ ان کے بننے ہوئے چہروں سے آنکھیں

نہ بٹاسکا۔ چائے کے بعد چھوٹی ڈرکیاں تو سمندری کانی کو خشک کرنے کے مشغل میں مصروف ہو گئیں۔ اوزا ایشرسٹ کھڑکی کے قریب پوزیشن تھی اس پر بیٹھ کر سیٹلا سے باتیں کرتا رہا اور سیٹلا کی کھینچی ہوئی آبی رنگوں کی نقادہ یہ کو دیکھتا رہا۔ اس پر ایک خوشگوار خواب کی سی کیفیت طاری تھی۔ وقت اور واقعے اور اہمیت اور حقیقت کا احساس مٹل و مفلن ہو گیا تھا۔ کل وہ پیر میگی کے پاس چلا جائے گا۔ اور اس لطف و مسرت کی کوئی نشانی اس کے پاس نہ ہوگی۔ بجز اس کاغذ کے جو ان بچوں کے خون سے رنگین تھا۔

بچے! سیٹلا تو عمر میں میگی کے برابر ہے۔ وہ بچہ کیونکر ہوئی؟ اس کی باتیں تیز تیز۔ قدرے خشک اور عجوبہ تاہم دوستی کے رنگ میں ڈوبی ہوئی۔ ایشرسٹ کی خاموشیوں میں کسی ساز کی آواز کی مانند گونج اٹھتی تھیں۔ سیٹلا کے انداز میں ایک جھکی۔ ایک دو شیزنگ پائی جاتی تھی۔ جیسے کسی انسانے کی عبور بہ پھولوں کی عبور نیٹری میں بیٹھی ہو۔ بیل ڈسے کے پیٹ میں بہت سا کھاری پانی جا چکا تھا۔ اس سے وہ کھانے پر نہ آیا۔ کھانے کے دوران میں بیٹا بولی۔

”میں تو آپ کو فرنیٹک بلایا کر دوں گی۔“

اور فریٹا پکا راضی: ”فرنیٹک۔ فرنیٹک۔ فرنیٹک۔“

ایشرسٹ نے سکرا کر تینٹھا سر جھکا دیا۔

”جب کبھی سیٹلا آپ کو سٹر ایشرسٹ کہہ کر بلائے۔ اسے جہانہ ادا کرنا ہوگا۔ سٹر ایشرسٹ کہنا کیا فضول معلوم ہوتا ہے۔“

ایشرسٹ نے سیٹلا کی طرف دیکھا جس کا رنگ حجاب سے سُرخ ہو رہا تھا۔ بیٹا ہنس دی سٹریٹ ابولی۔

”وہ دیکھو۔ وہ دیکھو شرار ہی ہے۔ اللہ سے شرم۔“

ایشرسٹ نے دائیں بائیں دونوں رنگیوں کے منہری بال پکڑ لئے۔ اور پولا۔

”دیکھو دیکھو سیٹلا کو مت چھیرو ورنہ میں تم دونوں کو بانہ ہدوں لگاؤ۔“

فریٹا ابولی: ”تمست وحشی ہو؟“

اور بیٹیا نے قہار بن کر کہا: تم جو اسے سیٹلا بلاتے ہو:

”تو کیوں نہ بلاؤں؟ سیٹلا بہت اچھا نام ہے۔“

ایشرسٹ نے ان کے بل تھوڑے ویسے، سیٹلا! اس گفتگو کے بعد وہ جلا۔ اسے

کس نام سے پکارے گی؟ لیکن بس نے نام استعمال ہی کیا۔ سونے کا وقت آیا تو

ایشرسٹ نے عمل کہا۔

”گوڈ نائٹ سیٹلا!“

”گوڈ نائٹ سٹر۔ گوڈ نائٹ فرنیچر! آج تم نے بہت بہا دی دکھائی۔“

”اس کا ذکر مت کرو۔“

سیٹلا کا معاملہ سیدھا سا معاملہ تھا لیکن لہو بھر کو اس نے ایشرسٹ کا ہاتھ نڈ

سے دیا۔ اور پھر ایک طنت اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

ایشرسٹ خالی کمرے میں بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ صوفی کل رات کا ذکر ہے

کہ سیب کے پتروں اور زندہ شگوفوں کے نیچے کھڑا میگن کو سینے سے چٹائے۔

اس کی آنکھوں اور ہونٹوں کو چوم رہا تھا۔ یہ بات کیا یاد آئی جیسے کسی طوفان کے تھیرے

سے پاؤں اکھڑ گئے۔ وہ ہانپنے لگا۔ آج رات ایک نئی زندگی کا آغاز ہونا تھا۔ ایک

ایسی لڑکی کے ساتھ جس کی تمنا صرف یہ تھی کہ وہ اس کے ساتھ رہے اور یہ سب

کچھ متوی ہو گیا۔ جو میں گھنے آگے جا پڑا۔ عرض اس لیے کہ — اس نے اپنی گھڑی

کو نہ دیکھا تھا۔ ان معصوم بچوں سے تعلقات کیوں پیدا کر لئے۔ جبکہ خود معصومیت

ہی کو خیر باد کہنے والا تھا؟ لیکن پھر سوچا میرا ارادہ اس سے شادی کرنے کا ہے

میں نے اسے کہہ بھی دیا تھا۔

روشن شمع ہاتھ میں لئے سونے کے کمرے کی طرف چلا۔ ہیلی ڈے کا کمرہ راستہ میں

پڑتا تھا۔ اس کے پاس سے گزرا تو ہیلی ڈے اندر سے پکارا۔

”تم جو! ایشرسٹ! اندر آ جاؤ۔“

ہیلی ڈے بصر پر پٹیا پائپ موند میں نے پڑھ رہا تھا۔

”جیٹے جاؤ۔“

ایشیئرٹ کھلی ہوئی کھڑی کے پاس پر بیٹھ گیا۔
 ہیلی ڈے ایک لذت بیل اٹھا: تمہیں معلوم ہے آج دن بھر مجھے بار بار تمہارا
 ہی خیال آتا رہا۔ وگ کہتے ہیں۔ جب انسان ڈوبنے لگتا ہے تو گزشتہ زندگی آنکھوں
 کے سامنے پھر جاتی ہے۔ لیکن میرے حافظے میں ہمارا کبھی شہتہ حمتہ جوں کا وہی دونوں
 رہا۔ شاید میں ابھی موت سے بہت ڈرتا تھا۔

”تو پھر تمہیں خیال کس بات کا آیا؟“

ہیلی ڈے پہلے تو کچھ نہ بولا اور پھر کہنے لگا۔

”عجیب بات ہے مجھے کیمبرج کی ایک لڑکی کا خیال آیا جس سے میں ایک وفد۔
 قریباً۔۔۔ اب میں کیا بتاؤں تم خود سمجھ لو۔ میں نے شکر کیا کہ اس کے بارے میں میرا
 ضمیر صاف تھا۔ بہر حال تمہاری بدولت میں زندہ ہوں۔ ورنہ اس وقت تملیک گہرے
 سمندر میں جو استراحت ہوتا۔ وہاں نہ بیٹھنے کو بستر ملتا اور نہ پینے کو تباکو۔ کچھ بھی نہ ملتا۔
 ایشیئرٹ جب ہم مر جاتے ہیں تو کیا ہوتا ہے؟“

ایشیئرٹ بولا۔

”میں ہاؤں ششوں کی طرح کچھ جانتے ہیں:“

”عاشق؟“

”شاید بچنے سے پہلے تمہارا بہت ٹھٹھایتے ہوں:“

”یہ تو بہت غماز خیر خیال ہے۔ بہر حال۔۔۔ میری بہنیں تو ابھی طرح پیش
 آئیں:“

”بہت ابھی طرح:“

ہیلی ڈے نے اپنا پاپ بٹا دیا۔ اپنے داڑھی گولن کے چھپے ایک دوسرے
 پر رکھنے اور کھڑکی کی طرف سر موڑ کر بولا۔

”بچاؤ ہی نہیں:“

ہیلی ڈے بستر پر دھنڈکا۔ بوتھوں پر سگلسٹ تھی۔ چہرے پر غم کی روشنی پڑ
 رہی تھی۔ ایشیئرٹ نے اپنے دوست پر نظر ڈالی تو پلپسی سی جہم میں دھنڈکی۔ اگر

زندہ نہ ہوتا تو مندر کی تہ میں پڑا ہوتا۔ چہرے پر سکر ایٹ نہ ہوتی۔ اور یہ بٹاشنت
 ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتی۔ شاید بیٹنا بھی نہ ملتا۔ ریت ہی میں دنن ہو جاتا۔ اور
 مشرک کے لیے (دوبی دن کا) منتظر رہتا۔ دفنہ الیٹریٹ کی سکر ایٹ عجیب و غریب
 چیز معلوم سمجھنے لگی۔ یہی زندگی کا شعلہ ہے۔ یہی سب کچھ ہے اٹھ کھڑا ہوا اور
 دھیمی آواز میں بولا۔

”میرے خیال میں تمہیں سوجانا چاہیے۔ شمع بجادوں؟“

ہیلی ڈے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”تم جانتے ہو جو کچھ میرے دل میں ہے وہ ادا نہیں کر سکتا۔ موت بہت بڑی چیز

ہے گزناٹ الیٹریٹ“

الیٹریٹ کا دل بھرا آیا۔ ہیلی ڈے کے ہاتھ کو جا کر خلی منزل میں آ گیا۔ مال کا
 دو لڑہ ابھی کھلا تھا۔ اس میں سے گزر کر مکافوں کی قطار کے سامنے جو چین تھا۔ وہاں
 جا چنپا۔ آسمان کا رنگ گہرا نیلا تھا۔ تارے چمک رہے تھے اور ان کی روشنی میں لائٹک
 کے پھولوں کی رنگت کہیں کہیں ایسی پراسرار دکھائی دیتی تھی۔ جیسی رات کے وقت اکثر
 پھولوں کی دکھائی دیتی ہے اور جس کا بیان کرنا ناممکن ہے۔ الیٹریٹ نے اپنا رخسار
 ایک ٹہنی پر رکھ دیا۔ آنکھیں بند کیں تو سمجھی گئے کہ بچے کو سینے سے چٹائے سامنے
 کھڑی دکھائی دی۔

”مجھے کیمینج کی بیک رٹکی کا خیال آیا۔ جس سے ایک دفنہ — تقریباً —

میں نے شکر کیا کہ اس کے بارے میں میرا ضمیر صاف تھا۔ ایک منت سرکولائٹک
 کی شاخ سے بنا لیا۔ اور گھاس پر بیٹھنے لگا۔ دونوں سروں پر دو لمبے روشن تھے
 ان کی مدد سے میں تقور لہو بھر کو پھر زندہ ہو گیا۔ الیٹریٹ اس کے ساتھ شگوفوں
 کی زندہ سانس لیتی ہوئی سفیدی کے نیچے کھڑا تھا۔ ندی بہتی کھیلتی بہ رہی تھی۔ چاندنی
 کی نیلا سہٹ تالاب کے پانی پر چمک رہی تھی۔ وہ اوپر کو اٹھا ہوا چہرہ اس پرچہ و میت
 اور عشق نیاز مندی کی جھلک وہ آگ لگا دینے والے لہے سے۔ اس کا فریاد کا وہ صحن
 اور دل کی وہ دھڑکن سب کچھ یاد آیا۔ لائٹک کے سامنے میں کھڑا ہو گیا۔ یہاں رات کے

وقت بندی کی اولاد تھی۔ یہاں سمندر کا شور تھا اور سمندر سرسرا رہا تھا اور آہیں بھر رہا تھا۔ کوئی ننھا پندہ۔ کوئی الو۔ کوئی نائٹ جا۔ یہاں بوتا نہ اڑتا تھا۔ ان کی بجائے پیانو کی آواز آرہی تھی اور سفید مکانات نے آسمان کو جیسے تینچی سے کتر دیا تھا۔ اور لائلک کی خوشبو سے فضا مسموم تھی۔ کسی اونچی منزل میں ایک بوٹل کی ایک کھڑکی میں روشنی نظر آرہی تھی۔

پردے کے سامنے ایک سایہ حرکت کرتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے دل میں عجیب و غریب احساسات نے شور کشن باکر دی۔ جیسے کوئی ایک ہی جذبہ بیچ و تاب کھا رہا ہو۔ بلویا جا رہا ہو۔ پٹیا جا رہا ہو۔ جیسے ہمارا درشت پریشانی کے عالم میں نکریں مار رہے ہوں۔ رستہ ڈھونڈ رہے ہوں انہیں رستہ نہ ملتا ہو۔ یہ لڑکی جس نے اسے فرنیٹک بکر کر پکارا تھا۔ جس کے ہاتھ بنے اس کے ہاتھ کو دفعتاً پیچ لیا تھا۔ یہ نائٹ اور پاکیزہ لڑکی اس کے سرکش خلاف شرع عشق کے جال سن لے تو کیا کہے۔ وہ مکان کی طرف پٹیجے ہوئے گوتہ بہہ کے مجھے کی طرح بے حس و حرکت آنتی پالتی مار کر گھاس پر بیٹھ گیا۔

کیا واقعی اس کا یہ ارادہ تھا کہ جنگلی چول کی خوشبو سونگھ لے۔ اور — شاید — پھر اسے پھینک دے؟ کیمبرج میں ایک لڑکی تھی جس سے میں ایک دفعہ تم خود ہی سمجھ لو۔ دو فون پیٹیاں دائیں۔ بائیں گھاس پر دکھ کر دبا دیں! ابھی گھاس میں کچھ کچھ گرمی باقی تھی۔ ابھی اس میں نمی ناکئی تھی۔ ابھی اس کا سہارا لے سکتا تھا اپنے آپ سے پوچھا۔

”میں کیا کر رہی؟ شاید میگن کھڑکی کے پاس کھڑی ٹیگولوں کو دیکھ رہی ہے۔ اور اس کے خیال میں مجھ سے بے چاری میگن! پھر خیال آیا یہ کیا ہرج ہے؟ میں تو اسے چاہتا ہوں! لیکن — لیکن مجھے اس سے واقعی محبت ہے؟ یا صرف اس کو اس لیے چاہتا ہوں کہ وہ خوبصورت ہے اور مجھ سے محبت کرتی ہے؟ میں کیا کروں؟ پیانو کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ تارے جگمگا رہے تھے۔ ایئر سٹ بمبوت ہو کر کالے سمندر کو تکتا رہا۔ آفراتھا۔ احنار جیسے جڑ گئے تھے اور جسم کو خشکی میں ہو رہی

تھی۔ کھڑکی میں اب مدنی نظر آتی تھی۔ جا کر سوتا۔

(۸)

ایشیئر سٹ گھری نیند سوتا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی اور آٹکھ
کھل گئی۔ پھر کرفت آواز میں پکارا۔
”اٹھو جانی ناشتہ تیار ہے۔“

ایشیئر سٹ ایک منٹ اٹھ بیٹھا۔ میں کہاں ہوں۔ ہاں یاں یاد گیا؟
باقی لگ مر رہا تھا۔ سٹیلٹا اور سینا کے درمیان ایک نشست خالی تھی
ایشیئر سٹ اس پر جا بیٹھا۔ سینا کچھ دیر بغور اسے دیکھتی رہی اور پھر بولی۔
”ذرا جلدی کیجئے ساڑھے نو بجے یہاں سے پلنا ہے۔“

”ایشیئر سٹ ہم سری بیڈ کوارٹر جا رہے ہیں۔ تمہیں بھی پلنا ہوگا۔“
ایشیئر سٹ نے سوچا: ”میں ان کے ساتھ جاؤں نا لیکن! مجھے تو چیزیں لے کر واپس
جانا ہے۔“ اس نے سٹیلٹا کی طرف دیکھا۔
سٹیلٹا نے جلدی سے کہا۔

”ممنوعہ چلیے۔“

اور سینا بولی۔

”آپ کے بغیر کیا خاک لطف آئے گا؟“

فریڈا اٹھ کر کرسی کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔

”آپ چلے گئے ہیں تو میں آپ کے بال کیسے چومی؟“

ایشیئر سٹ نے سوچا: ”ایک دن اور بھی! اس میں کچھ بزرگی کر لوں گا ایک دن

اور! اور پھر بولا۔

”اچھا اچھا میں چلتا ہوں۔ میرے بال کیسے کی ضرورت نہیں۔“

”بہتر۔“

ایشیئر سٹ پر پہنچ کر اس نے ایک اور تاریخ سے کلام لکھ دیا۔ لیکن لکھ کر چاٹ ڈالا

انہیں کیا جائے کہ کہیں نہیں آسکتا۔ برسم سے ایک چھوٹی سی گاڑی میں سوار ہو گئے
 ایئر سٹ بنیاء فریڈیا کے بیچ میں چپا ہوا بیٹھا تھا۔ گھٹنے ٹیلا کے گھٹنوں سے
 جاگے تھے۔ راستہ میں "اب جینکٹر" لاکھیل کھینے رہے۔ دل بہل گیا۔ سوچا یہ تھا کہ
 ایک دن مزید غم کرنے میں صرف کر دل گا۔ لیکن اب غور کرنے کو دل نہ چاہتا تھا۔
 دن بھر دوڑتے رہے۔ کشتی روتے رہے۔ گھٹنے گھٹنے پانی میں جاگتے پھرے (ہانے
 کو کسی کا دل نہ چاہتا تھا) گیت گاتے رہے۔ کھیل کھینے رہے اور جس قدر سلمان خوردنوش
 ساتھ لائے تھے سب چٹ کر گئے۔ دلہی میں چھوٹی لڑکیاں ایئر سٹ کے کندھے سے
 لگ کر سو گئیں۔ ایئر سٹ کے گھٹنے ٹیلا کے گھٹنوں سے چور رہے تھے۔ یقین نہ آتا تھا کہ
 تیس گھنٹے پہلے وہ ان تین لڑکیوں میں سے (ان کے بال کس طرح طاقم تھے) کسی
 کو جانتا تک نہ تھا۔ ریل میں وہ ٹیلا سے شاعری کے متعلق تبادلہ خیالات کرتا رہا۔
 ٹیلا نے ایئر سٹ کو اور ایئر سٹ نے ٹیلا کو (مگر ایک خوشگوار احساس برتری کے
 ساتھ) اپنی اپنی پسند کے شعرا کے نام بتائے۔ ایک لخت لڑکی نے دھیمی آواز
 میں کہا۔

"فل کہتا ہے آپ حیات بعد الموت کے قائل نہیں۔ یہ تو بہت بڑی بات
 ہے فرینک!"

ایئر سٹ نے پریشان ہو کر کہا۔

"نہ قائل ہوں نہ منکر۔ میرا عقیدہ تو صرف یہ ہے کہ ہم حیات بعد الموت کے
 متعلق کچھ جانتے ہی نہیں۔"
 لڑکی نے جلدی سے کہا۔

"میرا تو یہ عقیدہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ زندگی کا جھلا چہرہ فائدہ ہی کیا؟"

ان خوبصورت ابروؤں کے شکنوں پر نگاہ ڈالتے ہوئے ایئر سٹ نے
 جواب دیا۔

"یہ کیا کہ جس چیز کے وجود کی تمنا جو اس کے وجود پر انسان ایمان ہی لے

آئے"

”میکن اگر اس کے بعد اور کوئی زندگی نہیں تو انسان کو دوبارہ زندہ ہونے کی
 تمنا ہی کیوں ہوتی ہے؟
 یہ کہا اور نظر بھر کر ایشیئرٹ کی طرف دیکھنے لگی۔
 ایشیئرٹ اس کے جذبات کو مجروح تو نہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن بہتری کی خواہش غالب
 آگئی۔ بولا۔

”جب تک انسان زندہ ہے اس وقت تک اس زندگی کو دائمی بنانے کا آرزو مند
 ہوتا ہے۔ یہ آرزو خود زندگی کا جز ہے۔ مگر اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔“
 ”تو کیا تم انجیل کو نہیں مانتے؟“

ایشیئرٹ نے سوچا اب ضرور اسے مدد ہوگا۔ بولا۔
 ”سیوٹ مسیح خے پاڑی پر جو وعظ سنایا تھا۔ میں اس کو مانتا ہوں کیونکہ وہ
 بہت دلکش ہے اور اس کے الفاظ ہمیشہ سچے رہیں گے۔“
 ”لیکن کیا تم سیوٹ مسیح کو خدا کا جز نہیں مانتے؟“
 ایشیئرٹ نے سر ہلا دیا۔

رٹکی نے اپنا تپہرہ جلدی سے کھڑکی کی طرف موڑ لیا۔ ایشیئرٹ کو یک طنت
 مسیح کی دُعا یاد آئی ”خدا یا ہم سب پر اپنا فضل کر اور مسٹر ایشیئرٹ پر بھی“ اور
 کون ایسا ہوگا جو اس رٹکی کی طرح یوں اس کے لیے دُعا مانگے۔ اس رٹکی کی
 طرح جو اس وقت ضرور منتظر ہوگی اور رٹکی پر کھڑی اس کی راہ دکھ رہی ہوگی۔ دل
 نے کہا۔

”تم کس قدر ذلیل ہو۔“

یہ خیال بار بار اس کے دل میں اٹھتا رہا لیکن اس کی چھین رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی۔ اکثر
 یہی ہوتا ہے، حتیٰ کہ ذلیل بننا نہایت معمولی بات معلوم ہونے لگی اور تعجب کی بات ہے
 اس کی سمجھ میں یہ نہ آتا تھا کہ واپس میگن کے پاس چلے جانا۔ ذلیل بات ہے یا اس سے
 ملنے کا خیال ترک کر دینا۔

شام کے وقت سب مل کر تاش کیسے ہے اور جب بچوں کے سونے کا وقت

آپنی پاور وہ چلے گئے تو سیٹلا پیا نو پر جا بیٹھی۔ ایشرسٹ کھڑکی کے باہر اندھیرے میں بیٹھا شموں کے بیچ میں سے سیٹلا کو دیکھتا رہا دوسرے بال ہلکے رنگ کے ان کے نیچے وہ بھی گوری گردن جو ہاتھوں کی حرکت کے ساتھ ساتھ خم کھاتی تھی!، سیٹلا کے پیا نو بجانے میں کوئی خاص رنگینی نہیں تھی۔ لیکن بلا تکلف بجاتی تھی۔ ایشرسٹ کو وہ ایک دلکش صورت معلوم ہو رہی تھی جس کے ارد گرد ہلکے نیلے رنگ کا نور جھللاتا تھا۔ گویا انسان نہیں فرشتہ ہے۔ اس بڑکی کی موجودگی میں جس کا لباس سفید جس کا سر فرشتوں جیسا اور جس کا جسم موسیقی کے ساتھ ٹپک رہا تھا۔ کس کی جہالت ہے کہ بے معنیان خواہشات یا گمراہ خیالات کا دل میں گزر ہونے دے۔ وہ شو مان کا ایک گیت بجا رہی تھی جس کا نام ”و ارم“ تھا، اس کے بعد پہلی ڈسے نے اپنی ہانہری نکالی اور طلسم ٹوٹ گیا۔ پھر انہوں نے ایشرسٹ کا گانا سنا۔ اور سیٹلا شو مان کی گیتوں کی ایک کتاب کو سامنے رکھ کر اس کے ساتھ پیا نو بجاتی رہی۔ ”ارغ گردل نخت“ کا گیت ابھی ختم نہ ہونے پایا تھا کہ چھوٹی لڑکیوں نے رجونیلے رنگ کے ڈریسنگ گاؤں پہنے تھیں، دبے پاؤں کمرے میں داخل ہو کر پیا نو کے پیچھے چھپنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ اس کے بعد کھلسل پچ گئی اور بقول سینا کے ”بڑا فزہ آیا“

اس رات کو ایشرسٹ کو نیند نہ آئی۔ اس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات چکر لگا رہتے تھے وہ بے چینی کے عالم میں کھڑے ہو کر بدلتا رہا۔ دو دن کے اندر اندر ان لوگوں سے اس قدر بے جا پیدا ہو گیا تھا اور ان کی بے تکلفی اور اپنائیت نے اس کے دل پر اس قدر حاظ کر لیا تھا کہ فادم اور یگن — خود یگن، خواب و خیال ہو گئی۔ کیا پچ پچ اس سے اظہارِ محبت کیا تھا، کیا پچ پچ اسے جھگالے جانے کا اور اس کے ساتھ رہنے کا وعدہ کیا تھا؟ نہیں نہیں وہ سو رہا ہو گیا تھا۔ اس پر جادو چل گیا۔ بیمار کا۔ رات کا۔ سب کے خوفوں کا! اس کو۔ اس کس بچی کو جس کی عمر ابھی اٹھارہ سال۔ جس نے ہونے پائی تھی۔ اپنی داشتہ بنانا۔ اس خیال کے آتے ہی ایشرسٹ کو اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔ لیکن پھر بھی جسم میں گرمی اور خون میں تیزی پیدا ہو گئی۔ دل سے کہا۔ میں نے سب بُرا کیا۔ میں نے سب بُرا کیا۔

شمان کی برسی میں اس کے پریشان خیالات کے ساتھ مل کر اس کے دل کے اندر جیسے دھڑکنے لگی۔ اسے تصور میں سٹیلا کا چہرہ نظر آیا۔ پرسکون۔ مرمری بلکے رنگ کے بال۔ لگے لگے بدن۔ اور مفرشتوں کا سانور اس نے سوچا: میرے جواس قائم نہ تھے۔ میں دیوانہ تھا۔ مجھے کیا ہو گیا تھا؟ بد نصیب مگن!

”خدا یا ہم سب پر اپنا فضل کر اور سٹر ایشیٹ پر بھی!“

”میں صرف آپ کے پاس ہی رہنا چاہتی ہوں۔“

اور اس نے چہرہ تکیے میں ڈھانپ لیا۔ چکی بندھ چلی تھی۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھالا واپس چلا جائے تو معیبت نہ جائے اور بھی آفت!

جان آوی اگر اپنے دل کی کبھی اس نکال لے تو اس کی بے چینی مٹ جاتی ہے۔ ایشیٹ کی آنکھ لگ گئی۔ جب نیند آنے لگی تھی تو سوچ رہا تھا: آخر کیا ہوا۔۔۔ چنوب سے۔۔۔ مہینہ بھر میں مجھ کو جانیں گے۔

اگلے دن صبح کے وقت اس نے چمک کے روپے وصول کیے۔ لیکن کپڑوں کی دکان کے پاس بھی نہ چھٹکا۔ اس ناخوشی رنگ کے لباس کی بجائے اپنی مزدورت کی چند چیزیں خریدیں۔ دن بھر اس کے دل کی عجیب حالت رہی۔ جیسے اپنے آپ سے روٹھا ہوا ہے۔ دورن سے دل میں انگلیں اٹھ رہی ہیں۔ لیکن اب جذبات سے یکسر خالی تھا۔ جیسے آنسوؤں کے طوفان سے دل کے شعلے سب بجھ گئے ہوں۔ چائے کے بعد سٹیلا نے ایک کتاب اس کے پاس رکھ دی اور کچھ شکر مارا کر بولی۔

”فرزیک تم نے یہ کتاب پڑھی ہے؟“

فرزیک ”سوانح یسوع“ ایشیٹ مسکرا دیا۔ سٹیلا اس کے عقائد کے متعلق کبھی فکر مند ہے۔ اس پر کچھ سنسی آئی۔ کچھ پار آیا۔ اپنی طبیعت کو بھی گدگدی ہوئی کہ اسے اپنا ہم عقیدہ بنانے کی کوشش کرے یا کم از کم ان کے عقائد کی حمایت میں کچھ بولے۔ شام کے وقت چھوٹی بڑکیاں اور بلی ڈسے اپنے اپنے جال کی مرمت کو رہے تھے ایشیٹ سٹیلا سے مخاطب ہوا۔

”مذہب انعام اور صلے کا لالچ دلاتا ہے کو نیک زندگی بسر کی تو یہ کچھ صلے گا۔“

گویا انعام کے لیے ہمیں بیک مانگنا سکتا ہے۔ یہ رجا درحقیقت ہم سے پیدا ہوتا ہے۔

وہ ٹوفز پر بیٹھی رسی کے ایک ٹکڑے پر گناٹھیں دے رہی تھی۔ اس نے ایک منت نگاہ دوڑائی۔

”نہیں اس کی وجہ اور ہے اور اس سے کہیں گہری ہے۔“

ایڈیٹ کے دل میں پھر وہی تحکم کی خواہش پیدا ہوئی اور بولا۔
 ”کیا واقعی آپ کا یہ خیال ہے۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کسی بات کی وجہ دریافت کرنے کی خواہش ہی سب سے زیادہ عین ہے اور اس کی تہہ کو پہنچنا بہت مشکل ہے۔“

سیلانے ماتھے پر توری ڈال لی۔

”میں نہیں سمجھی۔“

ایڈیٹ اپنی ہٹ پر قائم رہا اور بولا۔

”ذرا سوچ کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آخرت کے معتقد بیشتر وہی لوگ ہوتے ہیں جو یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کی تمام خواہشات اس دنیا میں پوری نہیں ہو سکتیں۔ برعکس اس کے میں نیکی کا قائل اس لیے ہوں کہ نیکی ایک اچھی چیز ہے۔“
 ”تو آپ نیکی کے قائل تو ہیں۔؟“

وہ کتنی خوبصورت معلوم ہوتی تھی اور اس کی صحبت میں نیکی کس قدر سہل! ایڈیٹ نے

اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔

”اس طرح کی گرہیں لگانا مجھے ہی سکھا دو۔“

جب گرہیں لگا رہے تھے تو اور راحت ملتی تھی۔ سونے کو چلا تو بالارادہ اسی

کے متعلق سوچا رہا۔ اس کے درختوں، پر سکون، خواہراں تصور کے انوار سے اپنا

آپ یوں ڈھانپ لیا۔ جیسے اس ٹبکس میں اب اسے کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا۔

انگلے دن معلوم ہوا کہ انگلے دن وہ لوگ ریل میں سوار ہو کر ”ٹونٹس“ جانا چاہتے

ہیں اور بیری پورائے کاسل کے مقام پر پنکک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ ماضی کو

دل سے محو کر دینے کا مہم ارادہ کر چکا ہے۔ اس نے اسے فتح نہ کیا اور گھوڑوں کی طرف
پیٹھ کر کے بلی ڈے کے ساتھ لینڈ میں بیٹھ گیا۔ سمندر کے ساحل کے ساتھ ساتھ
چلے جا رہے تھے اور اسٹیشن کی طرف مڑنے ہی کو تھے کہ ایئر سٹ کا دل دھک سے
رہ گیا میگن — خود میگن! —

پہلی پگڈنڈی پر پہلی جا رہی تھی۔ وہی پٹا پرانا سا یہ اس نے پہن رکھا تھا۔ وہی
جیکٹ۔ وہی ٹوپی اور لہ گھروں کے چہروں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ کچھ سوچے سمجھے
بغیر ایئر سٹ نے بک منت لہٹا اٹھا کر چہرہ ڈھانپ لیا اور ظاہر یہ کیا گیا کہ آنکھ میں
سے مٹی کا کوئی ذرہ نکال رہا ہے۔ لیکن انگلیوں کے بیچ میں سے میگن پھر بھی دکھائی
دے رہی تھی۔ اس کی چال میں دو بتانوں کی سی بے تکلفی نہ تھی۔ برعکس اس کے وہ
کھوئی کھوئی سی معدوم ہوتی تھی۔ اس کے قدم متال تھے اور اس کی حالت رحم کی طالب۔
جیسے کوئی کتا اپنے آقا سے بُدا ہو گیا ہو۔ اور یہ جانتا ہو کہ سیدھا دوڑتا چلا جائے یا
واپس پلٹ جائے اور جائے تو کہاں؟ یہ یہاں کیسے آگئی؟ بیان کیا بنایا ہو گا؟ یہ
کس امید میں پھر رہی تھی۔ گاڑی کے پیٹے گھومتے چلے گئے اور وہ میگن سے قُود
ہوتا گیا۔ لیکن اس کا دل اس پر لعنت بھیج رہا تھا اور جنہیں مارا کر اس سے کہہ
رہا تھا کہ ٹھہر جاؤ۔ گاڑی سے اتر جاؤ۔ اس کے پاس جاؤ۔ جب گاڑی اسٹیشن
کی طرف مڑی تو ایئر سٹ سے نہرا گیا۔ دروازہ کھول کر بولا۔

”میں کچھ بھول آیا ہوں۔ تم چلو۔ میرا انتظار نہ کرو۔ میں اگلی گاڑی سے آؤں گا۔
اور تمہیں کاسل میں تاملوں گا۔“ یہ کہہ کر گاڑی سے کود پڑا۔ ٹھوکر کھائی۔ گھوم گیا۔ پھر
سنبھلا اور چل پڑا۔ بلی ڈے اور اس کی بہنیں حیران تھیں کہ یہ کیا ہو گیا۔ لیکن ان کی
گاڑی آگے نکل گئی۔

موٹر سے اسے میگن بہت دور دکھائی دے رہی تھی۔ ایئر سٹ چند قدم دوڑا۔
پھر رک گیا اور آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ جوں جوں میگن کے قریب تر اور بلی ڈے
اور اس کی بہنوں سے قُود تر ہوتا ہو گیا۔ قدم ڈھیلے پڑتے گئے اسے دیکھ لیا تو پھر
کیا ہوا۔ کیا فرق پڑ گیا؟ اس سے جو ملاقات ہو گی اور اس ملاقات کا نتیجہ ہو گا۔ اس کی

کراہت کو کیونکر کم کرے۔ اچھی طرح جان چکا تھا کہ پہلی ڈسے کی بہنوں سے ملنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچ چکا ہے کہ میگن سے فساد کی کرنا نہیں چاہتا۔ چند دن اس سے عشق کرے گا۔ تکلیفیں سہے گا۔ پھپھتائے گا اور پھر اکتا جائے گا۔ مضم اس لیے کہ وہ اپنا سب کچھ دے ڈالے گی۔ اس لیے کہ وہ سادہ لوح ہے۔ جھولی ہے۔ شبنم آؤد ہے لیکن شبنم جلد خشک ہو جاتی ہے۔ اس کی ٹوپی جو دُور سے پھیکے رنگ کا ایک دھبہ سا معلوم ہوتی تھی۔ جو ہم میں نظر آرہی تھی جس سے میگن کی متاثر حرکات کا پتہ چلتا تھا۔ وہ ہر چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ ہر کھڑکی پر نگاہ ڈالتی تھی کیا کسی مرد کو اس سے بھی زیادہ دکھ کا لمحہ نصیب ہوا ہو گا! جو ارادہ کرتا تھا۔ دل اسی پر ملامت کرتا تھا۔ اور اپنا آپ ذلیل معلوم ہوتا تھا۔ درد کی ایک ہلکی سی چیخ اس کے منہ سے نکلی۔ جسے سن کر ایک راہ گیر ملازمہ مڑ کر اس کا منہ دیکھنے لگی۔ سامنے دیکھا تو میگن ساحل سمندر کے پاس جو دیوار کھڑی تھی۔ اس کے ساتھ سہارا لینے کو ٹھہر گئی۔ اور سمندر کی طرف دیکھتی رہی۔ انٹیرسٹ بھی رُک گیا۔ شاید میگن نے سمندر اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس اضطراب کی حالت میں بھی وہ اس نظارے سے باز نہیں رہ سکتی۔ انٹیرسٹ کے لیے سچا اس بے چاری نے ابھی کچھ نہیں دیکھا۔ اس کا مستقبل نہ جانے کن کن نعمتوں کا سرمایہ دار ہے۔

چند ہفتوں کے عیش کی خاطر میں اس کی زندگی کے مستحضرے اڑا دوں؟ ایک لذت تصور میں سیٹلا کی پرسکون آنکھوں سے آنکھیں ملیں۔ اس کے ملائم بال جو اسے اس کے ماتھے پر نظر آئے۔ یہ دیوانگی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ جن چیزوں کو قابل احترام سمجھتا ہے۔ ان سب سے اور احترام نفس سے ملتا دھو بیٹھنا پڑے گا۔ مڑ گیا اور جلد جلد اسٹیشن کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ لیکن اس بے بس سراسیمہ لڑکی کی یاد سے جس کی متفکر آنکھیں راہ چلتوں کے چہروں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ دل کو دھچکا لگا۔ اور پھر وہ سمندر کی طرف پٹا۔ وہ ٹوپی اب نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ وہ دھبہ میر بینیوں کے جو ہم میں کہیں غائب ہو گیا تھا۔ دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ جینے میں خلا سا محسوس ہوا (جب توقف و تامل کی وجہ سے کوئی چیز ملتا ہے تو یہی حال ہوتا ہے) وہ تیز تیز

چھنے لگا۔ لیکن میگن کہیں دکھائی نہیں دی۔ آدھ گھنٹہ تک وہ اس کی تلاش میں پھرتا رہا۔ اور پھر ساحل سمندر کی ریت پر پڑ کر اوندھا لیٹ گیا۔ جانتا تھا کہ اس سے ملنے کی سہل ترکیب یہ ہے کہ میٹیشن پر جا کر اس کا انتظار کرے۔

حتیٰ کہ وہ مایوس ہو کر لوٹ آئے۔ یار ملی سپوار ہو کر فارم کو چلا جائے۔ تاکہ وہ واپس آئے تو یہ وہاں پہلے ہی موجود ہو۔ لیکن پھر بھی بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ اور اس کے آس پاس بے پروا ننھے بچے بیٹھے اور بالٹیاں مٹے کھیلتے رہے! اس متلاشی سرگردوں مڑکی پر رحم ضرور آتا تھا۔ لیکن یہ دم بھی کم و بیش خون کی اس سرگرمی اور تیزی کا ایک جزو بن گیا۔ جو بہار نے جسم میں پیدا کر دی تھی۔ اب دل میں صرف ایک بے ممان جذبہ باقی رہ گیا تھا۔ توقیر نسواں کے جذبات مغفود ہو چکے تھے۔ دل میں پھر میگن کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس کے بوسوں۔ اس کے نازک اور گداز جسم۔ اس کی وارفتگی۔ اس کے کافرانہ عشق کی گرم جوشی کے لیے دل پھر بے قرار ہو گیا۔ مہتاب سے روشن سیب کے درختوں کی شاخوں تلے اس رات کا پھر لطف اٹھانا چاہتا تھا۔ اور اس کا دل ان خواہشات کی تکمیل کے لیے یوں مضطرب تھا۔ جیسے کوئی جنگل کا دیوتا کسی بن دیوی کے لیے مضطرب ہوتا ہے۔

اس ندی کا پریقین شور۔ بٹرکپ کے پھولوں کی دمک۔ وہ پُرانی تاریخی ٹپانیں گلو اور سیفل کی کوک اُلوؤں کا بولنا۔ سُرُخ چاند کا مغلّی تاریکی میں سے شگوفوں کی زندہ سفیدی کو حجاب کنا۔ وہ کھڑکی میں اس کے چہرہ کا نظر آنا دل تلے دہان پہنچ کر رہ جاتا تھا، اس کی مشق میں ڈوبی ہوئی لگا ہیں۔ سیب کے درخت تلے دو دھڑکتے ہوئے سینوں کا ملنا۔ اپنے ہونٹوں سے اس کے پھڑکتے ہوئے ہونٹوں کا محسوس کرنا۔ ان لغزات نے اس کے دل کو محسوس کر لیا۔ لیکن پھر بھی بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ یہ کیا ہے جو گرم کے جذبات اور ان بے قرار خواہشات کے ساتھ دست و گریباں ہے اور جس نے اسے مفلوج بنا کر گرم گرم ریت پر ٹٹا رکھا ہے؟ تین ملائم ہالوں والی لڑکیاں۔ ایک دلغزیب چہرہ۔ جس کی نیلی آنکھوں میں دوستی کا جذبہ جھلک رہا ہے۔ ایک نازک ہاتھ جو اس کے ہاتھ کو ہمیںچ رہا ہے۔ ایک آواز جو جلدی سے اس کا نام پکار رہی ہے۔

کہتی ہے ” تو آپ نیکی کے قائل تو ہیں ؟“

یہ کچھ اور اس کے علاوہ ایک عجیب فضا۔ جیسے چادر یواری کے اندر ایک باغیچہ ہو۔
 زیم انگریزی و منخ کا جس میں جا بجا گلابی رنگ کے پھول ہوں۔ کارن فلا اور گلاب کے
 پھول اور لونڈر اور لانک کی خوشبو ہو، خشک اور دلفریب۔ انسانی مس سے غیر ملوث
 مقدس۔ غرضیکہ ان تمام چیزوں کا پورا جنہیں وہ بچپن سے پاکیزہ اور قابل احترام سمجھتا
 تھا ایک نلت اسے خیال آیا ” مکن ہے وہ ادھر ہی کو آئے اور مجھے دیکھ پائے “
 اٹھ کھڑا ہوا ساحل سمندر کے دوسرے سرے پر ایک چٹان تھی اس پر جا بیٹھا۔ سمندر
 کی چٹانیں اس کے پہرے کو کاٹ رہی تھیں۔ اس سے ہوش و حواس پھر بجا ہو گئے۔
 فارم کو واپس چلے جانا اور وہاں جنگلوں میں اور چٹانوں کے درمیان رہ کر سینگن سے
 عشق کرنا یعنی روکتائی ماحول میں اس دہقان لڑکی کو چاہنا۔ قطعاً نامکن ہے۔
 اسے کسی بڑے شہر میں لے جانا اور کسی ٹیٹ میں رکھنا۔ اس سے اس کی شانہ و شوکت
 کو صدمہ ہوتا تھا۔ کیونکہ جانتا تھا کہ وہ لڑکی تو قدرتی مناظر کا ایک جزو ہے۔ اسے
 شہر میں لاکر رکھا تو محبت کا جذبہ ایک نفسانی خواہش بن کر رہ جائے گا اور دونوں
 ہی میں غائب بھی ہو جائے گا۔

لندن میں اس کی سادگی اور اس کا گنوار پن اس قدر نمایاں ہو گا کہ اسے محض
 کھونا سمجھ کر رکھنا پڑے گا۔ جس سے چوری چھپے دل بہلا لیا جائے۔ وہ چٹان پر
 بیٹھا ایک سبزی مال تالاب کے اوپر ٹانگیں لٹکائے جس کا پانی اتر رہا تھا۔ ان خیالات
 میں محو تھا اور یہ سب باتیں اس پر روشن تر ہوتی جا رہی تھیں۔ لیکن ایسے معلوم
 ہوتا تھا جیسے سینگن کا بازو اور اس کا جسم ڈھیلا پڑ رہا ہے۔ آہستہ آہستہ نیچے سر کا با
 رہا ہے اور پھر اس تالاب میں جا گرا ہے اور بہہ کر سمندر میں جا پہنچا ہے۔ سینگن
 کا چہرہ اُد پتک رہا ہے۔ اس کی کھوٹی ہوئی نظروں میں ایک التجا ہے اور اس
 کے سیاہ بال جھگے ہوئے ہیں۔ اس تصور نے دل میں پتے گھڑ دیئے۔ ہر چند اسے
 دل سے بٹانے کی کوشش کی لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ یہ خیال اسے رہ رہ کر ستاتا۔
 آخر کار وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ چٹان سے نیچے اترا اور پانی کے قریب ایک غار میں

جا کر کھڑا ہو گیا۔ شاید سمندر میں نہانے سے اس کا دل بہل جائے اور یہ بخلا تر جائے
 کپڑے اتار دیئے اور تیکر دور نکل گیا۔ چاہتا تھا تھک کر چور ہو جائے تاکہ حواس سُٹ
 ہو جائیں۔ اس لیے تیز تیز اور دور دور چکر کاٹے۔ پھر دفعہ بغیر کسی وجہ کے اسے
 خوف سا معلوم ہوا فرس کر وہ واپس ساحل تک نہ جاسکا اور سمندر کی رُو اسے
 بہا کر لے گئی۔ یا ہیلی ڈے کی طرح اس کے پٹھے اینٹھو گئے۔ تو کیا ہو گا؟ یہ سوچ
 کر وہ واپس پٹا۔ سُرخ رنگ کی چٹانیں بہت دُور معلوم ہوتی تھیں۔ اگر وہ ڈوب گیا
 تو کسی کی نظر اس کے کپڑوں پر پڑے گی۔ ہیلی ڈے اور اس کی بیٹیوں کو تو خبر مل جائے
 گی۔ لیکن میگن کو شاید کبھی علم نہ ہونے پائے گا (فارم کے لوگ کوئی اخبار نہیں خریدتے)
 فل ہیلی ڈے کے الفاظ اسے پھر یاد آئے۔

”کیمبزنگ میں ایک لڑکی تھی جس سے میں شاید — بہر حال خدا کا شکر ہے
 کہ اس کی طرف سے میرا ضمیر صاف ہے۔“ مجنونا نہ خوف کے اس طوف میں اس نے قم کھاٹی
 کہ میں میگن کی طرف سے اپنا ضمیر صاف رکھوں گا۔ لیکن خوف جاتا رہا۔ اطمینان سے
 تیرا ہوا ساحل پر آن پہنچا۔ دھوپ میں جسم مکھایا اور کپڑے پہن لئے۔ اس کا دل
 زخمی تھا۔ لیکن درد محسوس نہ ہوتا تھا۔ جسم خشک اور تروتازہ تھا۔

ایئر سٹ کی عمر میں رحم کا جذبہ شدت کے ساتھ محسوس نہیں ہوا کرتا۔ جب واپس
 ہیلی ڈے کے کمرے میں پہنچا اور چائے پر خوب پیٹ مہر کر کھایا تو ایسے معلوم ہوا
 جیسے ایک بخار یا تھاجو اب اترا چکا ہے۔ ہر شے نئی نئی اور صاف ستھری معلوم ہوتی
 تھی۔ چائے۔ تو اس ان پر مکھن لگا ہوا۔ مرتبہ فرضیکہ ہر چیز میں اسے بہت مزا آیا۔
 تبا کو کی خوشبو آج تک اتنی اچھی معلوم نہ ہوئی تھی۔ خالی کمرے میں ٹہلتا ٹہلتا ڈک
 جاتا۔ کبھی اس چیز کو دیکھتا کبھی اس کو چھوتا۔ پھر سیٹلا کے سینے پر دسنے کی ٹوکری
 اٹھائی۔ تانگے کی گوٹوں اور خوش رنگ ریشم کی ایک گچی کوس کرتا رہا۔ ٹوکری میں
 ایک تھیلی تھی۔ جو کسی خوشبو دار بوٹی سے بھری ہوئی تھی۔ اسے اٹھا کر سونگھا۔ پھر
 پیانو کے پاس جا بیٹھا اور ایک انگلی سے مختلف سُرخ جاتا رہا۔ پھر سوچنے لگا۔ کل پھر وہ
 جائے گا۔ اور میں پاس بیٹھا اسے دیکھتا رہوں گا۔ اسے دیکھتے رہنے سے دل کو تسکین حاصل

ہوتی ہے۔ جکتاب اسٹیلانے اس کے پاس لاکر رکھ دی تھی۔ وہ وہیں پڑی تھی۔ اسے اٹھا کر اس کی وصی گردانی کرنے لگا۔ لیکن بیگن کی اداسی پھر آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ اٹھ کھڑا ہوا اور کھڑکی میں سے جھک کر باغیچہ میں جو تھرش بول رہے تھے۔ ان کو ستار لٹا۔ اور سندھ کا نظارہ کتارا اور درختوں کے نیچے نیلا نیلا اور خواب آور نظر آتا تھا۔ ایک طائر اندر آئی اور چائے کے برتن اٹھا کر لے گئی۔ لیکن وہ وہیں کا وہیں کھڑا شام کی ہواؤں کا لطف اٹھا تا رہا۔ اس کو کشش میں کہ اس کا دماغ کسی بات کو سوچنے نہ پائے۔

تھوڑی دیر کے بعد سیلی ڈے اور اس کی بہنیں مہا ملک ہیں سے اندر داخل ہوتی ہوئی دکھائی دیں۔ سیٹلا آگے آگے تھی۔ اس کے پیچھے فل اور فل کے پیچھے چوٹی رکھیاں اپنی اپنی ٹوکریاں اٹھائے چلی آرہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر ایشرسٹ اضطراب سے بٹ گیا۔ اس کا مجروح اور مایوس دل ان لوگوں کی ملاقات سے گھبراتا بھی تھا اور ان کی دوستانہ شفقت سے تسکین بھی حاصل کرنا چاہتا تھا ان کے سحر بوسوں کر کے پڑتا تھا۔ لیکن ان کی پُرمکون معصومیت اور سیٹلا کی دید سے مسرت اندوز ہونا چاہتا تھا۔

پیانو کے پیچھے دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا کہ سیٹلا اندر داخل ہوئی۔ لیکن کچھ کھوئی سی جیسے کوئی مایوسی ہوئی ہو۔ پھر ایشرسٹ پر نظر پڑی۔ مسکرا دی۔ اس کا تہتم بجلی کی طرح سرخ اور درخشاں تھا جس سے ایشرسٹ کو مسرت بھی ہوئی اور کبھی بھی گیا۔

”فرنیک تم نہ آسے نا؟“

”اں آنا ہی نہ ہو سکا۔“

”دیکھو ہم کیسے بنفشے کے پنچول چن کر لائے ہیں۔ اب ان کا موسم ختم ہونے کو ہے۔“

سیٹلا نے پنچول آگے بڑھا دیئے۔

ایشرسٹ نے انہیں سونگھا۔ دل میں مہم سہی خواہشات پیدا ہوئیں۔ لیکن پھر یک لذت مر جی گئیں۔ بیگن کا متفکر چہرہ نظر آیا۔ وہ اُدپر تک رہی تھی راہ گیروں کے جھروں کا جائزہ لے رہی تھی۔

اس نے مختصر سا جواب دیا۔

”بہت خوبصورت ہیں اور منہ موڑ لیا۔ چھوٹی بچی میٹھی سی چڑھ رہی تھیں۔ ان سے بچتا ہوا اپنے کمرے میں چلا آیا اور لبتہ رہ جاگرا اور دونوں بانڈوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ قرعہ چھینک چکنے کے بعد۔ میگن کو تھوڑا چکنے کے بعد اسے نہ صرف اپنے آپ سے بلکہ کم و بیش بلی ڈسے اور اس کی بہنوں اور ان کی انگریز گھرانوں کی سی خوش دلی سے بھی نفرت ہونے لگی۔ ہمت نے یہ کیا ظلم کیا کہ اچھے میاں لے آئی اور اس کے اولین عشق کا گلا گھونٹ دیا اور اسے یہ سمجھایا کہ یہ عشق لوباٹی سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔

سٹیلا کا کیا حق تھا کہ اس کا دل فریب محبوب حُسن اسے یقین دلا دے کہ وہ میگن سے کبھی شادی نہیں کرے گا اور اس کے عشق کو منہ مٹا کر کے اس کا دل تاسف اور حسرت اور دم سے بھر دے۔ میگن بے چاری تلاش کے بعد مایوس ہو کر واپس چلی گئی ہوگی۔ اور شاید یہ امید دل میں لئے گھر کو جا رہی ہوگی کہ الیٹریسٹ پیبے سے پہنچ گیا ہوگا۔

تاسف اور حسرت سے بے تاب ہو کر الیٹریسٹ نے اپنی آستین کو کاٹ لیا۔ کھانے پر بیٹھا تو اس اور چپ چپ تھا۔ اس کی اداسی کو دیکھ کر بے چہرے ہی پتھر مردہ ہو گئے سب کے سب تنکے ہوئے تھے۔ اس لیے ان کا مزاج بہم تھا۔ چنانچہ شام کے وقت بے لطفی سے کٹا۔ کئی بار الیٹریسٹ کی آنکھیں سٹیلا سے چار ہوئیں۔ وہ پریشان اور مجروح نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ الیٹریسٹ بگڑا ہوا تھا۔ اس لیے اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔

رات صبر بے چین رہا۔ صبح بہت سویرے اٹھا اور باہر نکل گیا۔ ساحل سمندر کے پاس پہنچا تو تنہائی کے عالم میں پرسکون۔ نیلے روشن سمندر کو دیکھ کر اس کا دل قدر سے پیجا۔ مغز و اعصاب ہمتا ہے کہ میگن کو بہت ہی صدمہ ہوگا۔ بیٹے دو بیٹے میں بھول بھی جائے گی۔ باقی رہا وہ خود تو اسے اپنی پاکبازی کا صلہ ملے گا

نیک رہا!

سٹیلا کو اس کا علم ہو جائے تو وہ اس ضبط نفس کو کس قدر سراہے۔ وہ شیطان کی
 قاتل ہے۔ شیطان کو نیچا دکھایا یہ خیال آیا تو ایک کرخت تہتہ لگایا۔ لیکن رفتہ رفتہ
 سمندر اور آسمان کے سکون اور حسن اور سمندری پرندوں کی پرواز کے نظارے سے
 شاعر ہو کر اس کو شرم سی آنے لگی۔ بنایا اور گھر کے چلا۔

سٹیلا مکان کے باہر باغیچے میں ایک سفری اسٹول پر تصویر بنا رہی تھی چپکے
 سے اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ وہ کس قدر حسین ہے۔ جسم کو آگے جھکاٹے۔ موقلم ہاتھ
 میں تھامے۔ ماتھے پر ہلکی سی تیردی ٹوالے وہ کس قدر پیاری معلوم ہوتی ہے۔
 بڑے ملائم لہجے میں بولا۔

”سٹیلا مجھے انوس ہے کہ رات میں نے بہت ہی بدتمیزی کی؟“
 سٹیلا چونک کر مڑی۔ چہرے پر سُرخی دوڑ گئی۔ حسب عادت جلد
 جلد بولی۔

”اس کا ذکر مت کرو۔ میں سمجھ گئی تھی کہ کچھ نہ کچھ بات ہوگی۔ لیکن دوستوں میں
 ایسی باتوں کا تذکرہ ہی فضول ہے نا؟“
 ایشیٹ نے جواب دیا۔

”ہاں دوستوں میں۔۔۔ تو ہم آپس میں دوست ہیں نا؟“
 سٹیلا نے اس کے چہرے کو دیکھا۔ بڑے زور سے اثبات میں سر ہلایا۔
 برتن سفینت سر بیچ اور رخشاں تہتم سے اس کے پھلتے دانت پھر دکھائی دیئے۔
 تین دن کے بعد ایشیٹ ان لوگوں کے ساتھ لندن چلا گیا۔ فارم کے لوگوں
 کو خط نہ لکھا۔ لکتا تو کیا لکتا؟

اگلے سال اپریل کے آخری دن سٹیلا سے اس کی شادی ہو گئی.....

یہی وہ لاجتات قصے جن کی یاد اب ایشیٹ کے دل میں جیکہ وہ اپنی شادی کی
 پچیسویں سالگرہ کے دن گورنرس کے بیچ ہیں دیوار کا سہارا لگائے بیٹھا تھا۔ تارہ ہو

رہی تھی۔ جہاں اب پنچ پٹن رکھتا تھا۔ یہی وہ مقام ہو گا۔ جہاں میگن اسے پہلی دفعہ آسمان کے بالمقابل کھڑی دکھائی دی۔ انسان کو زندہ گی میں کیسے کیسے اتفاقات پیش آتے ہیں۔ دل میں تمنا پیدا ہوئی کہ اس فلام اور باغیچے اور جہتی ہوتے و اسے مرغزار کو پھر جا دیکھے۔ اس میں بہت دقت نہ لگے گا۔ سیٹلا ابھی شاید گھنٹے بھر تک نہ لوٹے۔

بلندی پر وہ چڑیہ کے درختوں کا جنٹا اور عقب میں وہ گھاس سے ڈھکی ہوئی ڈھلان اسے اچھی طرح یاد تھی! فلام کے دروازہ تک پہنچ کر رُک گیا۔ وہ پتھر کی نیچی عمارت۔ یو کے درختوں کا وہ محراب۔ وہ انگور کے شگوفے بالکل جڑوں کے ٹوں تھے وہ پُرانی سبز رنگ کی چوکی بھی وہیں کھڑکی کے نیچے گھاس پر رکھی تھی۔ جہاں کھڑے ہو کر اس نے میگن کے ہاتھ سے چابی لے لی تھی۔ پگڈنڈی پر چل کر باغیچے کے پھانگ تک پہنچا جو پہلے کی طرح اب بھی سیاہی مائل اور شکستہ تھا۔ درختوں میں ایک سیاہ رنگ کا سوراخ بھی اب دھرا دھرا پھرا ہوا تھا۔ کیا پتھ پتھ چھبیں سال گر چکے ہیں یا معنی کسی خواب سے بیدار ہوا ہے۔ اور اس بڑے سیب کے درخت کے پاس میگن اس کا انتظار کر رہی ہے؟ خود فراموشی کے عالم میں اپنی مجبوری ڈاڑھی کو لٹکتا لٹکتا اور واقعات کی گونیا میں واپس آ گیا پھانگ کھول کر باغیچے میں داخل ہوا اور خار دار جھاڑیوں میں سے ہوتا ہوا کنارے تک جا پہنچا۔ جہاں وہ پُرانا سیب کا درخت کھڑا تھا۔ بالکل ویسے کا ویسا! ہلکے رنگ کی کائی پھلے سے قدم سے زیادہ تھی۔ دو ایک شاخیں بھی خشک ہو رہی تھیں۔ لیکن اس کے سوا اس میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

معلوم ہوتا تھا کل رات ہی کا واقعہ ہے جبکہ میگن کے جھاگ جانے کے بعد وہ ایک درخت کے کائی دار تنے سے لپٹ گیا تھا اور اس کی خوشبو شے جو ہیں سے شام کو لطف اندوز کیا تھا اور سوسے اوپر چاندنی میں شگوفے سانس لیتے ہوئے زندہ معلوم ہوتے تھے۔ اوائل بہار کا زمانہ تھا۔ کہیں کہیں کلیاں چوٹ چکی تھیں۔ بیک بڑا اپنے راگ الاپ رہے تھے۔ ایک ککو کی کوک سنائی دے رہی تھی۔

دُھوپ کھلی ہوئی تھی اور اس کی میٹھی میٹھی گڑی خوشگوار معلوم ہوتی تھی۔ مقام حیرت ہے کہ کہیں کوئی تبدیلی نظر نہ آتی تھی۔ وہی شور مچاتی ہوئی ندی تھی اور وہی تنگ سائلاب جس میں وہ ہر روز صبح کے وقت لیٹ جایا کرتا تھا۔ اور پانی اچھال اچھال کر اپنے پہلوؤں اور سینے پر ڈالا کرتا تھا۔ ویران مرغزار میں بیچ کے درختوں کا وہی ٹھنڈ تھا اور ان کے پاس وہی پتھر جہاں کہتے تھے جھپی ہوا آن کر بیٹا بت گم شدہ شباب کا خیال آیا۔ عشق کی بربادی کا خیال آیا کہ کس بے دردی سے اس کی شیرینیوں کو صنایع کر دیا تھا۔ دل میں ایک ٹھیس ایک سوک اٹھی جس نے الیٹرسٹ کا گلا گونٹ دیا۔ اس غیر ملوث حسن سے بھری ہنر کی دُنیا میں انسان اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ جو سرت اسے حاصل ہوا سے دل سے جُدا نہ ہونے دے۔ جس طرح یہ آسمان جُدا نہیں ہونے دیتے؛ لیکن انسان بے بس ہے:-

ندی کے کنارے پنپا تو اس مپوٹے سے تالاب پر نظر پڑی۔ سوچا۔ شباب اور ببار کیا معلوم دونوں کہاں چلے گئے۔ پھر یک طنت ڈر گیا کہ کسی سے سامنا ہو گیا تو یہ خوشگوار تصورات برہم ہو جائیں گے۔ پگڈنڈی کی طرف پٹا اور کسی سوچ میں کھویا ہوا چہرہ اس چوراہے پر جا پہنچا۔

موٹر کے پاس ایک کڑ بڑی ڈاڑھی والا بوڑھا شخص ایک چھڑی کا سہارا لئے کھڑا شو فرسے باتیں کر رہا تھا۔ الیٹرسٹ کو دیکھ کر وہ یک طنت رُک گیا۔ گویا کوئی بے ادبی کر رہا ہے اور تنلیا ٹوپی کو چھو کر سنگڑا اتا سنگڑا اتا پگڈنڈی پر ہویا۔

الیٹرسٹ نے مٹی کی اس سبز ڈھیری کی طرف اشارہ کیا اور پوچھا: تمہیں معلوم

ہے یہ کیا ہے؟

بوڑھا شخص ٹھہر گیا۔ چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ دل میں کب رہا ہے: مجھ سے

بہتر تمہیں بنانے والا اور کون مل سکتا ہے؟

ہوا: یہ ایک قبر ہے:-

لیکن یہاں کیوں؟

ٹھہرا کر دیا۔

”یہ لمبی داستان ہے۔ میں اُسے کئی دفعہ سنا چکا ہوں۔ کئی لوگ پوچھتے ہیں کہ یہ ڈھیری کیسی ہے ہم لوگ اسے دشمنیہ کی قبر کہتے ہیں۔“

ایشیٹ نے تباہی کی تیلی آگے بٹھادی۔ پائپ جبروت۔ بڑھے نے اپنی ٹوپی کو چھوا۔ اودا بستہ آ بستہ اپنی مٹی کا پائپ مہرنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں جو جبروتوں اور بالوں میں سے اود پر کو تک رہی تھیں۔ ابھی چمک باقی تھی۔

”جنابہ اجازت ہو تو میں بیٹھ جاؤں۔ آج ذرا ٹانگ ڈکو رہی ہے۔“

یہ کہہ کر میری پر بیٹھ گیا۔

”اس قبر پر ہمیشہ ایک آدھ پھول پڑا رہتا ہے۔ کچھ ایسی تہنائی بھی نہیں یہاں اب تو بیٹ سے یہ موٹروں کا جھیلنا شروع ہوا ہے۔ اکثر لوگ ادھر سے گذرتے ہیں۔ پچھلے زمانہ کی اور بات تھی اب تو یہاں چیل پیل رہتی ہے۔ اس بے چاری نے خودکشی کر لی تھی۔“

ایشیٹ نے کہا۔

”سمجھ گیا۔ جب ہی چورا ہے میں دفن ہے۔ میرا خیال تھا۔ اب یہ دستور نہیں رہا۔“

”مگر یہ تو بڑے عرصہ کی بات ہے۔ ان دنوں ہمارے مل کا پادری بڑا خدا ترس تھا۔ اگلے میکس میں میری پنشن کو چھ سال ہو جائیں گے اور جب یہ واقعہ ہوا۔ اس وقت میں پچاھویں برس میں تھا۔ اب تو کوئی ایسا شخص زندہ نہیں جسے اس کا حال مجھ سے بڑھ کر معلوم ہو۔ وہ یہاں قریب ہی رہتی تھی۔ اسی فارم میں جہاں مسز نیرو کو مہب کے مل کام کیا کرتا تھا۔ اب وہ فارم بک نیرو کو مہب کے پاس ہے۔ میں کبھی کبھی اس کے مل ہی متفرق کام کرتا ہوں۔“

ایشیٹ پچانک کے سہارے کھڑا پائپ سلگا رہا تھا۔ دیا سلان بچھ گئی۔

لیکن ایشیٹ نے دینک غیدہ ہاتھوں کو چہرے کے سلنے سے نہ ہٹایا۔

اس نے کہا۔

”اچھا؟ لیکن اپنی آواز خود اپنے کانوں کو عجیب معلوم ہوئی۔ جیسے بیٹھی ہوئی ہو۔“

”وہ لڑکی لاکھوں میں ایک تھی! جب میں گذرتا ہوں یہاں ایک آدھ پھول ڈال جاتا ہوں۔ خوبصورت اور نیک تھی گواہوں نے اسے گرجے میں دفن نہ کیا نہ وہیں دفنایا جہاں وہ خود چاہتی تھی۔“

بڑھا مزور ٹھہر گیا اور اپنا بالوں والا مٹراترا لہتہ کھول کر اس ڈھیری پر بیوبل کے پھولوں کے پاس رکھ دیا۔

ایشیٹ نے کہا: ”اچھا!“

بڑھے نے کہا۔

”بس یوں سمجھے کہ کسی سے عشق ہو گیا تھا۔ اس لڑکی کو۔ گو یقین سے کوئی نہ کہہ سکتا تھا۔ کسی لڑکی کے دل کا حال اللہ ہی جانے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اسے کسی سے عشق تھا۔“

قبر پر ہاتھ پھیرا مجھے اس لڑکی سے بہت محبت تھی۔ لیکن وہ خود بھی بہت زیادہ محبت کرنے والی تھی۔ یہی اس میں خرابی تھی۔ اس نے نظریں اور پراٹھائیں اور ایشیٹ نے جس کے ہونٹ اس کی ڈاڑھی کے بالوں میں چھپے ہوئے تھے لیکن چپڑک رہتے تھے۔ کہا۔

”اچھا؟“

”یہ موسم بہار کا موسم ہے۔ بس یہی موسم تھا جو اب ہے یا فدا چند دن بعد ہو گا۔ شگوفوں کے دن تھے۔ فارم میں ایک کانگ کا لڑکا آکر ٹھہرا تھا۔ اچھا لڑکا تھا۔ اپنا ذرا کینچ کر ہتا تھا۔ مجھے بہت پسند تھا۔ میں نے تو صاحب کوئی ایسی بات نہیں دیکھی لیکن میرا خیال ہے کہ اسے اس لڑکی کا سر چھرا دیا تھا۔“

بڑھے نے پائپ منہ سے بٹایا منہ پر تھوکا۔ پھر بولا۔

”بات یہ ہوئی کہ یہ لڑکا ایک ایسی میاں سے چل دیا اور واپس کبھی نہ آیا۔ اس کا تھلا اور چھوٹی موٹی چیزیں ابھی تک فارم میں پڑی ہیں۔ میں ہمیشہ یہی سوچتا رہا کہ اس

نے اپنی چیزیں مٹھواکیوں نہ لیں۔ ایشریا ایسا ہی کچھ نام تھا اس رٹ کے کا۔

ایشرٹ نے پھر کہا: "اچھا!"

بڑھے نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"اس دن سے اس رٹ کی کے ہونٹوں پر تو جیسے ہیرنگ گئی۔ دن بھر یوں پھرتی رہتی تھی جیسے جو اس بجانہ ہوں۔ وہ تو کچھ دیوانی سی ہو گئی۔ میں نے کبھی کسی کی حالت یوں بدلتے نہیں دیکھی۔ فارم میں ایک اور رٹ کا تھا۔ جو نامی۔ وہ اسے چاہتا تھا۔ میں جانوں رٹ کی اس سے بہت ہی پریشان رہتی تھی۔ رفتہ رفتہ اسکی حالت بگڑتی گئی۔ بعض اوقات میں شام کے وقت بھڑوں کو لے کر آتا تو وہ رٹ کی بائینچے میں بڑے سیب کے دھت کے پاس کھڑی ہوئی اور بالکل سامنے تک رہی جوتی۔ میں دل میں کہتا "یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے لیکن تمہاری حالت زار ہے۔"

بڑھے نے پناپناپ پھر سلگایا اور سوچ کے انداز میں کش لگانے لگا۔

ایشرٹ نے کہا: "اچھا!"

"ایک دن مجھے یاد ہے میں نے اس سے کہا کہ میگن تمہیں یہ کیا ہو گیا ہے (اس کا نام میگن ڈیوڈ تھا اور وہ اس کی خالہ بڑھی مسٹریو کو موب دونوں ولینڈ سے آئی تھیں) میں نے کہا۔ تمہیں ضرور کوئی ڈکھ ہے۔"

کہنے لگی نہیں مجھ کسی چیز کا ڈکھ نہیں۔

میں نے کہا: "ڈکھ کیسے نہیں؟"

تھے اور ضرور ہے کہنے لگی نہیں تو۔ یہ کہا اور اس کی آنکھوں سے دھانسی چھلک پڑے۔ میں نے کہا تو پھر تمہوتی کہیں ہو؟ اس نے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ یہاں ڈکھ ہوتا ہے۔ لیکن تھوڑے دنوں میں آپ ہی ہٹ جائے گا۔ پھر کہنے لگی۔ مجھ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو مجھے اس سیب کے درخت تلے دفن کیجیو۔ میں ہنس دیا۔ میں نے کہا تمہیں کچھ ضرور ہونے لگا ہے۔ پگلوں کی سی باتیں منہ سے نہ نکالو۔ وہ بولی نہیں میں پگلوں کی سی باتیں نہ کروں گا۔ میں نے دل میں سوچا رٹ کیوں

کی باتوں کا کیا ہے۔ آپ ہی ٹھیک جو جانے لگی۔ چنانچہ اس بات کا خیال میں نے
دل سے نکال دیا۔ لیکن دو دن کے بعد کوئی شام کے چھ بجے میں بھپڑوں کوٹے
آ رہا تھا کہ میں نے نہی میں سیب کے درخت کے پاس کالی سی چیز پڑی
دیکھی۔ میں سمجھا سو رہا ہے۔ پھر خیال آیا یہ بھی کوئی سور کے بیٹے کی جگہ ہے قریب
پہنچا تب معلوم ہوا کہ کیا ہے؟

بڑھا لگ گیا۔ اس کی آنکھیں اوپر کوٹک رہی تھیں۔ نظر میں چمک تھی
اور دکھ جراتھا۔

”نہی میں ایک چٹان ہے اس میں رک کر پانی کا ایک تالاب بن گیا ہے
وہاں وہ لڑکی پڑی تھی۔ اسی مقام پر میں نے اس لڑکے کو ایک دو مرتبہ ہاتھ بھی
دیکھا تھا۔ لڑکی پانی میں اونڈھی پڑھی تھی اور اس کے سر کے پاس ایک پتھر کے
شگاف میں سے سنہری پتھروں کا ایک پودا لگا رہا تھا۔ پھر سے کو دیکھا تو اس
پر ایسا حسن آگیا تھا کہ آپ سے کیا کہوں۔ ننھے بچے کی طرح پرسکون اور خوبصورت
تھا جب ڈاکٹر نے اسے دیکھا تو وہ بولا۔ اتنے پانی میں ڈوبنا تو ناممکن ہے اور
بچ پوچھنے تو اس کے چہرے سے بھی یہی معلوم ہوتا تھا۔ میں تو زار و قطار رو دیا
وہ کتنی خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔ جون کاہینہ تھا لیکن اسے سیب کے ٹکڑے
کی ایک آدھ ٹہنی کہیں سے مل گئی تھی۔ اسے بالوں میں لگا رکھا تھا۔ اسی لیے میں
کہتا ہوں کہ اسے شادی مرگ ہوئی تھی ورنہ اس بناؤ سنگھار سے کیوں مرتی۔ اور
پھر پانی بھی فٹ ڈیڑھ فٹ سے زیادہ نہ تھا۔ لیکن یہ تو میں آپ سے کیسے کہوں
کہ یہ جنگل جاری ہے۔ مجھے بھی معلوم ہے اسے بھی معلوم تھا اور کوئی کچھ کہہ
جاری نہیں۔ تو میں کبھی داناؤں میں نے لوگوں سے کہہ دیا کہ وہ سیب کے درخت
تھے نہی ہونا چاہتی تھی۔ لیکن یہ سنکر لوگ اور بھی خلاف ہو گئے۔ انہیں یقین ہو گیا
کہ اگر یہ بات ہے تو ضرور خودکشی کی ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے یہاں دفنایا۔ ہمارے پاس
کو ایسی باتوں کا بہت خیال تھا۔“

بڑے نے پھر ڈھیری پر ہاتھ پھرا اور پھر ٹک ٹک کر بولا۔

”رہا کیاں عشق کی خاطر کیا کچھ نہیں کر گزرتیں۔ وہ بڑی محبت کرنے والی لڑکی تھی۔ میرے خیال میں اس کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ لیکن یقین سے کسی کو کچھ معلوم نہیں۔“
 داد لینے کے لیے اس نے نظر ادا پڑھائی۔ لیکن ایئر سٹ وہاں سے چل دیا تھا۔
 اس طرح کہ گویا اور کوئی وہاں موجود ہی نہ تھا۔

پہاڑی کی چوٹی پر جہاں بیچ چن رکھا تھا۔ اس سے پرے نظروں سے اوجھل وہ زمین پر اوندھا بیٹ گیا تو اس کی پاکبازی کا صلہ یہ تھا! یہ عشق کی دیوی سا پیرین کا انتقام! اس کی پُرم آنکھوں کو میگن کا چہرہ دکھائی دیا۔ جس کے سیاہ بیگے بوئے بالوں میں سبب کے شگوفے لگتے تھے اور اس نے دل سے پوچھا۔
 ”میں نے کیا گناہ کیا تھا؟ میں نے کیا کیا تھا؟ لیکن اسے کوئی جواب نہ ملا۔ وہ تو یہ سمجھتا تھا کہ اس کے دل میں جذبات خیز، گل ریز۔ مترنم بہار نے طوفان بپا کر دیا تھا۔ اس کے او ر میگن دونوں کے دل میں کیا دراصل عشق کو معنی کسی کی جان لینا مطلوب تھا! تو پھر وہ یونانی ہی راستی پر بسے اور باپلٹس کے الفاظ آج بھی سچے ہیں۔

عشق کا دل دیوانہ ہے۔

اور اس کے پر وں کی چمک سنہری ہے

اور جب وہ جست بھر کھاڑتا ہے۔

تو کوئی اس کے جا دو کی تاب نہیں لاسکتا۔

وہ تمام زندگی جو پہاڑ اور موز اور آب جو ہیں

شباب اور خود سری سے مست ہے۔

مردہ شے جو سینہ زمین سے چھوٹی ہے۔

یا سوزج کی شہابی شاعروں میں سانس لیتی ہے۔

ہاں یہ سب کچھ ہر مرد اور ہر عورت

سب کے اوپر اسے سائپرین۔ اسے سائپرین حکومت کرتی ہے۔

صرف تو۔

یونانی پر کتاب ہے۔ میگن! حسوت زوہ میگن! پہاڑی سے نیچے اترتی ہوئی! میگن
پانے سب کے دفت کے نیچے ماہ تکستی ہوئی! بے جان۔ مردہ میگن جس پر
حسن کی ہر شے ہے!

لیک اور لڑکانوں میں پڑی۔

۔۔۔ دماغ ہونے۔۔۔ ہاؤ ڈیکھو!

ایشیٹ اٹھا۔ بیوی نے جو لقمہ کھینچی تھی اسے ہاتھ میں لیا اور چپ چاپ
اسے دیکھتا رہا۔

۔۔۔ فرنیٹ اس کا پیش منظر ٹھیک ہے؟

۔۔۔ ہاں!

۔۔۔ لیکن پھر بھی کچھ کمی رہ گئی ہے۔ سنا!

ایشیٹ نے اثبات میں سر ہلا دیا: کمی؟ سبب کا اور نعت۔ مریقی اور

سنہری پھول!

(کاروان)

تفیدی مضامین

فہرست

انگلستان کا جدید فنکار
یوپی کے تنقید نگاروں کی خدمت میں
بارے زمانے کا اردو ادیب
کچھ عصمت خجندی کے بارے میں
ہیبت ناک افسانے
پاکستان میں تعلیم کا مستقبل
ایڈیٹنگ کا فن

انگلستان کا جدید تھیٹر

چونکہ مجھے تھیٹر اور اس کے فن سے خاص دلچسپی ہے اس لیے سفر یورپ کے دوران میں ہمیں نے اپنی فرصت کا بیشتر حصہ اس کے مطالعہ میں صرف کیا۔ اس سے میرا مقصد صرف اپنی پیاس بجھانا تھا۔ یہ ارادہ ہرگز نہ تھا کہ ہندوستان واپس آکر اس کے متعلق کوئی تبلیغ کروں گا یا کسی رسالے یا اخبار میں کوئی سلسلہ مضامین شروع کروں گا میرے احباب میں سے یہ امتیاز علی تاج کا تجربہ ہندوستانی ناٹک کے متعلق بہت وسیع ہے اور یورپ کے تھیٹروں کے متعلق بھی ان کی معلومات کا ذخیرہ حیرت انگیز ہے وہ اور میں اپنے پرانے کالج یعنی گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر گروت سونڈہی کے زیر قیادت ایک کلب بنا کر برسوں سے ناٹک کے شوق کو پودا کر رہے ہیں چنانچہ اس موضوع پر کلب ہے گا ہے امتیاز صاحب کو خط لکھا۔ اور۔ واپسی پر ہمیں انہیں سے اس کے متعلق تبادلہ خیالات کرنا رہا۔ باقی رہے پروفیسر سونڈہی سو میرا نہیں کچھ بتانا سونچ کو چراغ دکھانا ہے۔ اندر میں حالات میں ہرگز اس بات کے لئے تیار نہ تھا کہ یورپ کے تھیٹروں کے متعلق کوئی مضمون لکھتا اور حق تو یہ ہے کہ اگر امتیاز صاحب کی یہ رائے نہ ہوتی کہ میرے بعض بعض مشابہت تاریخی نیز گنگ خیال کے لیے دل چسپی کا باعث ہو سکتے ہیں یہ تو مضمون کبھی ظہور میں نہ آتا۔

ایک تو ہندوستان کا تھیٹر یورپ کے مقابلے میں اس قدر حقیر ہے کہ یورپ کے تھیٹر کا ہندوستانی نقطہ نظر سے مطالعہ کتابے معنی بات ہے اور ایک ہندوستانی رسالے میں اس کا کما حقہ بیان کتابے حد مشکل ہے۔ دوسرے موضوع اس قدر وسیع ہے کہ میں کسی طرح بھی اس سے جہدہ برآ نہیں ہو سکتا، لہذا اگر آپ اس تحریر سے کسی طرح بھی مستفید یا لطف اندوز نہ ہوں تو کم از کم میرے اس تامل سے شاید تو ضرور رہیں جس کا اظہار میں شروع ہی میں کر رہا ہوں۔

اس وقت میں صرف ایک تھیٹر کا ذکر کروں گا جس کا نام فیسٹل تھیٹر (FESTIVAL THEATRE) ہے اور جو کیمبرج (انگلستان) ہی میں ہے، خوبصورت سے اس تھیٹر کا افتتاح من اس وقت ہوا جب میں کیمبرج پہنچا، لیکن اس کے لیے آٹھ مہینے مدت سے تیار ہو رہی تھیں اور اس کے شروع ہونے سے پہلے جو ہر بیانات وقتاً فوقتاً اس کے متعلق اخباروں میں شائع ہوتے رہے ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ کم از کم انگلستان میں اس تھیٹر کی نظیر ہوگی مجھے یاد ہے کہ جب پہلی دفعہ میں نے لندن سے کیمبرج کا سفر کیا تو سفر کے دوران میں ٹائمز کے کالموں میں اس تھیٹر کے آئندہ پروگرام کا حال بہت اچھا لگا۔ پڑھ کر دانتوں پر نیورسٹی کے کھٹے ہی پہلا کھیل دکھایا گیا، اور اس دن سے لے کر آج تک میں نے سب کھیل دیکھے ہیں اور آج کل جہاں یورپ کی اور باتیں یاد آ رہی ہیں، وہاں ہمیشہ دل تھیٹر کا فراق کچھ کم افسوسناک نہیں۔

شروع ہی میں اس تھیٹر کے اعراض و مقاصد ان الفاظ میں بیان کئے گئے تھے۔

یہ تھیٹر کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ
ہر ملک اور ہر زمانے کے عظیم انسان ڈرامے
سینچ پر پیش کرے۔ اور اس بات کا مطلق
خیال نہ رکھے کہ لوگوں کو کس چیز کی عادت
پڑنی ہوئی ہے یا اور لوگوں کو کس چیز کی عادت

ہی کے کیڑے ہیں اور جو ڈراموں کا بحیثیت
تصانیف کے مطالعہ کرتے ہیں اور تاہم
کے فن کے نقطہ نظر سے ان پر غور نہیں
کرتے۔ ان کے دماغ میں ڈراموں کا تصور
کیا ہے، دنیا کے سب سے دلچسپ ڈرامے
یہاں دکھائے جائیں گے موجودہ زمانے
میں جو تھیٹر محض تجارتی اغراض کے لیے کھلے
ہوئے ہیں ان میں اسے ڈرامے کے فن کو

کاش کتابے سو ہے کیونکہ ان تھیٹروں کا
 انعام ایسی نمانداز کمپنیوں کے ہاتھوں
 ہے جن کے نزدیک ڈرامے کا فن کچھ معنی
 نہیں رکھتا اور وہ لوگ جو اس فن کے
 دل دیوہ ہیں اور انی الواقع اس فن کے
 اعظمی سے اعظمی نمونے پیک کے سامنے
 پیش کرنا چاہتے ہیں وہ ایسا کرنے سے
 قاصر ہیں کیونکہ عام تھیٹروں میں مہارت
 کی ساخت اور شیخ کا سالانہ پچھلی صدی
 سے چلا آتا ہے اور جدید ترین طریقوں
 کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

اس میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہے ایک تو یہ کہ عام تجارتی تھیٹر اصل فن
 سے محض بے خبر ہے اور صرف عامتہ اناس کی اسکل خواہشات کو پورا کرنا ہی اپنا
 مقصد سمجھتا ہے کیونکہ وہ پیکمانے کا یہی ایک ڈھنگ ہے دوسری بات ہے کہ تھیٹر
 کا طرز تعمیر اور شیخ کی مشینری وغیرہ خود انھیں ہی ترقی یافتہ ملک میں بھی فرسودہ
 اور بے کار ہے یہ دونوں باتیں بہت حد تک تفصیل طلب ہیں لیکن مسنونہ کو اس
 قدر طول دینا کہ ہر تفصیل سلجھ جائے میری طاقت اور نیز گنج خیاں کی ضخامت سے انزوی ہے
 انھیں ان کے عام تھیٹروں میں سے ہر ایک ہی کھیل ہر رات ہر صبحوں کے بسا
 اوقات برسوں ہوتا رہتا ہے دیکھنے والوں کی تعداد بے شمار ہوتی ہے اس لیے
 ایسا کرنا ممکن ہوتا ہے، کھیل بہت ہی مقبول ہوتا ہے اور سال ڈیڑھ سال تک آمدنی کا
 ذریعہ بنا رہتا ہے۔ اور کوئی بڑا کھیل نہیں ہونے پر آگے تو دوسرے ہی دن نفل ہو جائے
 جب ایک کھیل ختم ہو جائے تو پھر دوسرا کھیل تیار کیا جاتا ہے اور وہ کبھی اس طرح اپنی
 مقبولیت کی حد تک دکھایا جاتا ہے کہ خلاف اس کے فیشن دل تھیٹر میں ہر ایک کھیل
 صرف ہفتہ بھر تک ہوتا رہتا ہے جب زینڈرٹس میں چٹیاں ہوں تو تھیٹر بھی بند ہو

جاتا ہے تو یہ ہے کہ یہ تعمیر شدہ نوٹس ہی کے سر پر قائم ہے کیونکہ یہاں کھیلوں کا
 بوجھ ہے اس کے مطابق دیکھنے والے بھی ایسے ہی تربیت یافتہ آدمی ہوتے
 پائیں جو یونیورسٹیوں میں پائے جاتے ہیں اس لئے اس تعمیر کا قیام لندن یا کسی
 بڑے شہر کی بجائے کیرنجا ہی میں مناسب سمجھا گیا۔

کھیلوں کے انتخاب میں بہت ہی وسعت نظر سے کام لیا جاتا ہے، ایک طرف
 توجہ دے جائیں جو عام تعمیروں کے ملک میں ڈسکے مارے قبول نہیں کرتے کہ

کبھی ان کی جدت مارتہ لٹاس کے ناپسندیدہ ہو اور کاروبار میں نقصان نہ اٹھانا
 پڑے پیش کے جاتے ہیں (شہر لیک ان میں فن کے اعتبار سے کوئی خاص غول ہوا اور
 دوسری طرف قدیم سے قدیم یونان کھیلوں کے دکھانے میں ماہرین تعمیر کل فن کا
 ثبوت دیتے ہیں۔ اور ان دونوں کے مابین ڈرامے کے ہر مشہور دور کا ایک
 نیک نمونہ مزور پیش کیا جاتا ہے اور اس میں مک و قلم کی کوئی قید نہیں چنانچہ یہاں
 میں نے جو من اور فرانسیسی اور امریکن اور سپانوی آسٹریں اور نارویکن سبھی مصنوعات
 کے کھیل دیکھے ہیں، البتہ ہوتے سب انگریز کنبان میں ہیں اور پھر اس کے علاوہ
 ڈیٹھی، بیٹھی فلس وغیرہ سب اصناف ڈرامہ شامل کر لیے جاتے ہیں۔

یہاں کی سٹیج کا اصل خاص طور پر بیان کرنا ضروری ہے کہ یہی چیز ان کا طرز
 امتیاز ہے۔ اس کو کہ میرے پاس کوئی ایسی تصویر نہیں جس سے خالی سٹیج کا
 مشہور پیش کر سکیں، کام تصویر مانے نکالنا پڑے گا اس تصویر میں سٹیج پر جو سین لگا
 ہوا ہے وہ ایک قدیم یونانی کھیل کا ایک سین ہے، سٹیج کا بہت سا حصہ سین کی وجہ
 سے ڈک گیا ہے تاہم جو حصہ نظر آتا ہے وہ بعض نکات بیان کرتے کو کافی ہے۔

پہلی بات قابل غور یہ ہے کہ سٹیج اور حاضرین کے درمیان بڑی بڑی سیڑھیاں
 ہیں جو تصویر میں سب سے ددے کو نظر آرہی ہیں (سٹیج کے اوپر جو سیڑھیاں دکھائی
 دے رہی ہیں وہ سین کا حصہ ہیں لیکن جن سیڑھیوں کا میں اس وقت ذکر کر رہا ہوں
 وہ تعمیر سٹیج کا مستقل حصہ ہیں) گویا اگر آپ تماشائیوں کی پہلی قطار میں بیٹھیں تو
 سٹیج آپ کے پاس سے بدلتی جاتی شروع ہوتی ہے، حتیٰ کہ آپ سٹیج کی سب سے

بڑی سطح پر پینچ جائیں اس سطح کا کچھ حصہ شیخ کی بیڑھیوں اور سین کی بیڑھیوں کے درمیان دکھائی دے رہا ہے اس لئے پائپ غصے رکھیں تو طے کا شکل میں ایک خط سا کھینچا ہوا ہے یہ ایک دائرہ ہے جس کا کچھ حصہ کھپلی بیڑھیوں کے نیچے آکر چھپ گیا ہے اس دائرے کے اندر جس قدر حصہ شیخ کا ہے وہ باقیہ کے حصہ سے علاحدہ ہوا تو ضرورت اس حصے کو گھمایا جاسکتا ہے۔

۔۔ شیخ سادگی کی ساری ایک ہی پورے سطح نہیں بلکہ اس کا حقیقی نصف حصہ اور بھی ایک دہرہ اوپر کھینچا ہوا ہے۔

اسی تصویر میں سب سے پہلے جو ایک سفید پارزہ نظر آتا ہے وہ اصل کوک سفید دیوار ہے جو سیدھی نہیں بلکہ گول ہے جیسے پلٹی ہوئی شیخ کو ہول کے جھونکے سے پکانے کے لیے ہاتھ کو تم کر کے شیخ کے پچھلے کھلیا جاتا ہے یہ دیوار کھوکھلا ٹیٹوں کی بنی ہوئی ہے تاکہ ایکڑوں کی آواز اس سے بخوبی منعکس ہو سکے اور اس پر بہت پختہ سفید رنگ کا پلستر ہے جس پر کسی چیز کی ٹکڑے تراش وغیرہ آنا بہت محال ہے اس دیوار کے اطلال میں سائیکلوڈاما (Cycloedama) کہتے ہیں اور یونین کے جدید تھیٹروں میں اس کا ہونا بے حد ضروری ہے۔

تھیٹر کا وہ حصہ جہاں تماشا ٹائی بیٹھتے ہیں تصور دماغ میں دکھائی گیا ہے (یہ گویا وہ منظر ہے جو ایک ٹکڑے کو شیخ پر سے دکھائی دیتا ہے) اس سے آپ اس بات کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں کہ تھیٹر کی لمبائی بہت کم ہے۔ ایکڑوں کو خواہ مخواہ چلانا نہیں پڑتا، وہ تقریباً وہ تمام خوبیاں جو گھانڈے کے ککے کے آندر پڑھاؤ پر منحصر ہیں ضائع ہو جاتیں۔ تھیٹر کے اس حصے کی شکل گھوڑے کے نعل کی مانند ہے۔ وہاں اوپر کی منزلوں میں ہیں، اور فرش کی نشستیں بہت تنگی اور کچھ

اٹھتی جاتی ہیں۔ گویا فرش نہیں فرش کی بجائے بہت سی بیڑھیوں ہیں اور ہر بیڑھی پر کسیوں کی ایک قطار دکھیں ہے صرف دو راستے آمد و رفت کے لیے خالی چھوڑ دیے

ہیں۔

اس کو انگلستان کے باقی تمام تھیٹر اولڈ رتنوں کا مال ہے اور جو اس کے لیے خاص طور پر ہائیڈروٹرانز ہے۔ وہ یہاں کی کمیشن کا انتظام ہے، فٹ لائٹس وہ لمپ جو شیٹ کے کنڈے پر لیکٹروں کے قومی میڈگے ہوتے ہیں اور جہاں کا رخ ایکٹروں کی طرف ہوتا ہے وہ قطعاً مفقود میں سامنے سے روشنی کے آنے کا حرف ایک ہی قدر ہے سب سے اوپر کی گیلری میں چار بڑے بڑے لمپ گھم ہی (تصویر) جن کا رخ شیٹ کی طرف ہے اور جو بڑی احتیاط کے ساتھ ایسے زاویے پر لگائے گئے ہیں کہ ان کا شعاع شیٹ یا ایکٹروں پر تو پڑتی ہے لیکن سائیکلوگرام پر نہیں پڑتی شیٹ کے اوپر ایک پل مانی ہے (اس کے عمل وقوع کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے) کہ اگر اس پر سے کوئی چیز گرائی جائے تو شیٹ کے مین وسط میں آگرتی ہے) اس پر لپوں کا قطر میں لگی ہیں۔ لیکن کوئی شیٹ تو بالکل نیچے کی طرف ہے۔ بیسکس چھوٹے لمپ ایسے ہیں جن کی روشنی سائیکلوگرام پر پڑتی ہے اور بس سات سات لپوں کی ایک ایک قطار ہے۔ ان سات لپوں کے ساتھ قوس قزح کے سات مختلف رنگوں کے شیشے لگے ہیں۔ اور چونکہ ان سات رنگوں میں سے مختلف رنگ انتخاب کر کے ان کو مختلف مناسب میں لگا دینا کا ہر ایک رنگ بنایا جاسکتا ہے اس لیے سائیکلوگرام پر جس قسم کے رنگ کی روشنی ڈالنی مطلوب ہو سکتی جا سکتی ہے۔

ان لپوں کے علاوہ اور بھی لمپ ہیں جو مختلف مقاصد پر لگے ہیں لیکن ان کا بیان

ضروری نہیں۔

سائیکلوگرام کے لپوں کی روشنی اس قدر تیز ہوتی ہے اگر ان کے سامنے مائل قسم کے شیشے لگائے جائیں تو یا تو حرکت کا دور سے ٹوٹ جاتے ہیں یا ان کا رنگ بدم پڑ جاتا ہے اس لیے ان میں ایک تو اس قسم کا شیشا استعمال کیا جاتا ہے جو جرم میں جلتا ہے اور جو بہت مرہم ہوتا ہے۔

صرف ایک اور بات یاد رکھنی ہے اس کے بعد اس شیٹ کے گورنر کے کونڈے کے کونڈے کا ہر ایک لمپ کے جلنے کا ثمن طویل ہے یہ صرف ایک اسٹیشن کے ساتھ ہی انتظام میں ہے کہ لمپ کی روشنی نہایت آہستہ آہستہ بالکل ہی

بے معلوم طور پر مدیم یا تیز کی جا سکتی ہے، تمام لمپوں کے تار ایک خاص کمرے میں جاتے ہیں جہاں بٹنوں کی قطاریں لگی ہیں، اور جہاں سے تعمیر کا ماہر روشنی اپنا کام کرتا ہے۔ اس ماہر کو اپنی نشست پر سے بیٹھ کر بالکل نظر نہیں آتی لیکن مسٹر ریح جو آج کل وہاں کام کر رہے ہیں ان کے تجربے کا یہ عالم ہے کہ اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے مختلف بٹنوں کو دیکھ کر اندازہ لگالیتے ہیں کہ سائیکلو راما پر کس رنگ اور کس شدت کی روشنی پڑ رہی ہو گی۔ یا ان کو کس رنگ کا کپڑا دکھا دیجئے وہ بجلی کے بٹنوں کو ادھر نیچے سرکا کر آپ سے کہہ دیں گے کہ اس وقت سائیکلو راما پر جو رنگ ہے اس میں اور اس کپڑے کے رنگ میں ہر موافقت نہیں اور وہ اس میں کبھی غلطی نہیں کرتے۔ یہ ہر سال کے دوران میں جب ڈائریکٹر مختلف رنگ آزمائے ہتلبے تو بال اور بجلی کے کمرے کے درمیان عارضی ٹیلی فون لگا دیتے ہیں ڈائریکٹر تو تماشائیوں کی نشست پر بیٹھا ہوتا ہے، ماہر روشنی اپنے کمرے میں ہوتا ہے۔ ڈائریکٹر مباحثات دیتا رہتا ہے کہ مثلاً سُرنی مائل کبر بالی رنگ مطلوب ہے ماہر روشنی اپنی اٹکل سے محض بٹنوں کو ادھر نیچے سرکا کر اس کی نمیبیل کرتا ہے مالا کہ سائیکلو راما خود اسے نظر نہیں آتا۔

تصویر ۱۰ میں سائیکلو راما کو دیکھتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ رنگ کی گہرائیاں دُور تک پھیل جا رہی ہیں، جب تک مجھے یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ دیوار ہے مجھے اس بات کا گمان تک نہ تھا۔

یہ تمام وہ سامان ہے جس کی مدد سے وہاں کے خدو خد تعمیر دینا کے اعلیٰ ترین ڈرامے پیش کرتے ہیں، سینری کے متعلق ان کے بعض خیالات انوکھے ہیں پر پے پر پیٹ کی ہولی سینری تو ضرور ذلیل سے ذلیل تعمیر ہیں وہاں استعمال نہیں کرتا، بل کا تو ذکر ہی جانے دیجئے، فیٹی دل تعمیر کار جہاں زیادہ تساہی سینری کی طرف ہے جس میں اتنا دوسرے کی سادگی سے بڑے سے بڑا کام عمل کے تصویر ماسا میں محض کڑی کے کندوں کو چمکایا گیا ہے لیکن بیٹھ جوں اور ستونوں کے تنہا سے پاکیزگی اور رفت چمکتی ہے سائیکلو راما رنگ اس میں آسانی ہے۔

تصویر ۱۱ ایک محل کا منظر ہے کالے پردوں میں سائیکلو راما دکھائی دے

ہے، یہ ایک قتلے کا آخری سین ہے کہیں اس واقعے پر ختم ہوتا ہے کہ ایک بادشاہ اپنی سلطنت چھوڑ کر چلا جاتا ہے، یہ ادا یوں کیا گیا کہ بادشاہ بیٹھ پر آگے کو بڑھتا بڑھتا بیٹھ بیٹھ بیٹھوں پر سے اتر کر تماشائیوں میں سے ہوتا ہوا تھیٹر سے باہر نکل گیا، فیٹی دل کی یہ خاص صفت ہے کہ اکثر اوقات ایگر تماشائیوں میں سے ہو کر بیٹھ پھرتے ہیں اور اسی طرح باہر نکل جاتے ہیں، البتہ یہ صرف وہی کیا جاتا

ہے جہاں موزوں معلوم ہو۔

تصویر ۱۴ ان کی سیر کی سادگی کا ایک اور نمونہ ہے یہ منظر ایک خوشنما باغ ہے آسمان (یعنی سائیکلوراما کا تنگ شہابی سے جو بہت ہی مجلا معلوم ہوتا ہے، درخت بہت ہی نفاست اور سادگی سے پیش کئے گئے ہیں

تصویر ۱۵ ولے منظر میں بہت ہی گھنا بھگلا دکھانا مقصود تھا اس سین پر صرف تین طرف سے روشنی ڈالی گئی ہے، ایک تو سائیکلوراما روشن ہے اس کے علاوہ دائیں بائیں دو چھپے ہوئے لمپوں سے روشنی کی شعائیں ستونوں پر پڑ رہی ہیں، بے شمار ستونوں میں دو تین مدحتوں کو کھڑا کر دیا یہ ستون اور بھی کئی مثالیں میں استعمال ہونگے) اس لیے درخت گو صرف زمین ہیں لیکن جو اثر پیدا کرتا مطلوب تھا وہ ہو گیا۔

ایک خدائی نیکوئی دکھانے کے لیے جو انتظامات کئے پڑے، ان کو سوچتے ہوئے صانع گھبرا لے، لیکن اس تعجب نے اس شہسب کو یوں حل کیا کہ بیٹھ کے اوپر کے پل پر جو لمپوں کی قطاریں لگی تھیں ان کا سایہ سائیکلوراما پر ڈال دیا یعنی ان تمام لمپوں کو ان کے پیچھے ایک اور لمپ روشن کر دیا نتیجہ تصویر ملتا ہے ظاہر ہے۔

تصویر ۱۶ میں ایک ڈرامے کا آخری منظر ہے ڈرامے کی کہانی مصر کی قدیم تاریخ سے تعلق رکھتی ہے، دولا شول کی میاں بنا کر لے جا رہے ہیں صرف سائیکلوراما روشن ہے باقی سب تاریکی ہے لیکن یہ کہہ سکتے ہیں کہ آخری سین ہے لوگ کیریکٹروں سے کب کے آشنا ہو چکے ہیں اس سے کوئی ہرج و مرج واقعہ نہیں ہوتا، البتہ روشنی کی اس ترتیب سے سین میں ایک خاص خوبی پیدا ہو گئی ہے۔

792



1

4

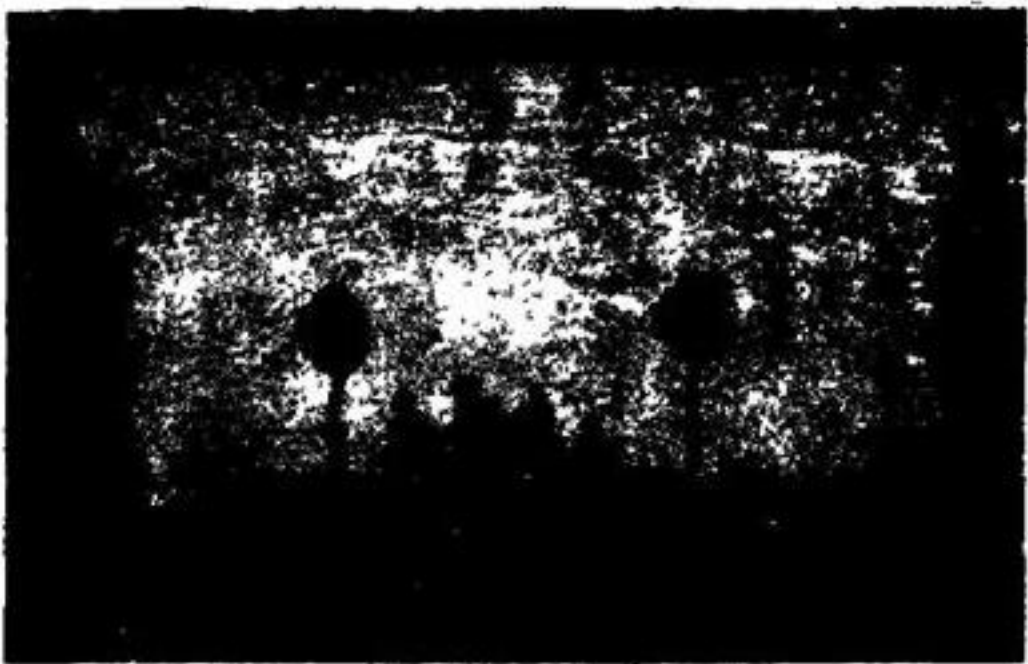


۲۹۸



۴

۳



599



2

1



5..



5

2



سائیکلوراما پر ڈسٹری ک بجائے سائے ڈالنے کی مثال اور پریشی کی ہانچک سے
اس کی ایک اور مثال بھی ملاحظہ کیجئے جو میرے خیال میں بہ اعتبار فن کامیاب تر
تھ۔ دیرورہ شکسپیئر کے رچرڈ سوم کا وہ سین ہے جہاں رچرڈ سو یا ہوا ہے اور
طرح طرح کے پریشان خواب دیکھ رہا ہے ہیبت ناک صورتیں دکھائی دے رہی
ہیں سٹیج پر ایک ملپ کسی چیز کے پیچھے چھپا کر رکھ دیا ہے اور اس کی وجہ سے جو سائے
سائیکلورا ملہر پڑ رہے ہیں ان سے ہیبت اور وحشت میں اور نہیں اضافہ ہو گیا ہے،
اور بہت سے مناظر پیش کرنے کا ارادہ تھا لیکن امید نہیں کہ نیرنگ خیال میں
ان سب کے متعلق تصاویر چھاپنے کی گنجائش ہو اور تصاویر کے بغیر میرا کچھ بیان کرنا بے
معنی ہو گا، اس لیے اس قصہ کو یہیں ختم کر دیتا ہوں اس امید پر کہ ان چند مثالوں
سے قارئین کو اس تھیٹر کے طرز و سبج کا کچھ اندازہ ضرور ہو گیا ہو گا۔
صرف ایک کھیل کے دو سین تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں ایک تو تصنیف
ہی بالکل نرالی طرز کی ہے اور اس کے علاوہ جس طریقے سے یہ ڈرامہ پیش کیا گیا
وہ بھی سٹیج کے فن کی بعض حدت طرازیوں پر روشنی ڈالتا ہے اس کیلئے کا نام -
(THE ADDING MACHINE) یعنی جمع کرنے والی مشین ہے اس کھیل
میں جو "پنیام" مصنف ہے وہ یہ ہے کہ امریکہ اور (اس سے کم درجے پر) انگلستان اور
یورپ کے بعض اور ممالک میں جو حیرت انگیز مادی ترقی ہوئی ہے اس کا ایک نتیجہ
یہ بھی ہے کہ ہزار ہا افراد (مثلاً کلرک اور مزدور) ایسے پیدا ہو گئے ہیں جن کی زندگی
بالکل ایک مشین کی طرح چلتی ہے گویا روح اور اس کی تمام لطافتیں مر چکی ہیں۔ زندگی
میں کوئی دلچسپی نہیں۔ کام میں کوئی لطف نہیں برسوں تک ایک ہی دفتر میں ایک
بے رونق، معسوفیت میں مبتلا ہیں۔ ہر صبح اسی وقت پر کام کو جانا۔ اسی کرسی
پر بیٹھنا وہیں ہندسے جمع کرتے رہنا، ہر شام اسی گھر کو واپس آ جانا۔ کوئی تفریح
نہیں کوئی انوکھے خیالات نہیں۔ کوئی ترقی کی امید نہیں۔ اس کا روبرو دنیا میں نیرنگی
بالکل مفقود ہے یہ رنگ بے حیانت پھالی ہوئی ہے جس کی وجہ سے ایک کلرک

یا ایک مزدور یا دوسرے مزدور میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے سب کے سب جانوروں کی طرح ایک ہی لاکھ سے ہنکے جاتے ہیں۔ سب ایک ہی جیسی باتیں کہتے ہیں ایک ہی جیسے خیالات رکھتے ہیں غرضیکہ کوہوم کے بلی کی طرح پیدائش سے مرگ تک ایک ہی نقطے کے گرد چکر لگاتے رہتے ہیں۔

ڈرامے میں جس کلرک کی زندگی پیش کی گئی ہے اس کا نام مسٹر زیرو یعنی صفر ہے۔ ڈرامے کے بیشتر افراد کے ناموں کی بجائے اسی طرح ہنسے دیئے ہوئے ہیں یعنی کسی میں کوئی انفرادیت نہیں۔ کس کی کوئی خاص شخصیت نہیں گویا یہ ذکی روح اشخاص نہیں۔ چلو ریکڈ مشین ہے ایک بالکل دوسرے جیسا۔ ان میں تمیز کرنا ہو تو بجز اس کے کہ ہر ایک پر ایک ایک لیبل لگایا جائے اور کوئی طریقہ نہیں اس لیے افراد کو بند سوں سے تعبیر کیا گیا ہے، صرف چونکہ کیل سنے "بیرو" یعنی منجملہ ان انسان نامشیموں کے ایک خاص مشین کو باقی مشینوں سے تمیز کرنا تھا اس لئے اس کا نام زیرو رکھ دیا۔

کھیل کا پلاٹ اور اس کو سٹیج پر ادا کرنے کا ڈھنگ دونوں ساتھ ساتھ بیان کرتا جاؤں گا۔ میں صرف اپنے حافظہ کی مدد سے لکھ رہا ہوں۔ تفصیلات میں

کسی بیٹی کمان ہے مگر اتنی نہیں کہ اس سے کوئی خاص فرق پڑے، پہلا سین مسٹر صفر کی خواب گاہ کا ہے، میاں بیوی دو لمبٹروں پر ساتھ ساتھ بیٹھے ہیں، بیوی بد مزاج ہے اور ہر وقت میاں کو ڈانٹتی ڈپٹی رہتی ہے گویا یہ صرف یہ کہ اس کلرک بے چارے کی زندگی دفتر ہی میں ہے رونق ہے چکہ گھر پر بھی اس کو کوئی آرام کوئی خوشی نصیب نہیں، ایک سین میں بیوی نہایت غصے میں بلند آواز کے ساتھ بول رہی ہے اور میاں کو طرح طرح کی باتوں پر ملامت کر رہی ہے میاں سامنے سے کچھ نہیں بولتا چنانچہ اس تمام سین میں میاں کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلتا، صرف کہیں کہیں ہب لمے بھکر کے لئے بیوی آرام لینے کے لیے ٹھہر جاتی ہے تو اس وقفے میں مسٹر صفر کے داغ میں اپنے محدود سے خیالات گونجتے رہتے ہیں، اس کو یوں ادا کیا گیا ہے کہ جہاں بیوی چپ ہوتی ہے پر دے کے کچھ

سے چلپانچے اکیڑ بھاری اہ ڈراؤ کی اور نہایت ہی مدہم آواز میں ہندسوں کا ایک بے معنی سلسلہ دہراتے لگ جاتے ہیں حتیٰ کہ پھر خاموشی چھا جاتی اور بوی پھر بولنے لگ جاتی اس کے دوران میں مسٹر صفرب تک :- بلا تھتا صرف بے قراری سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا تھا اور پھر جیسے نیند میں قوب جاتا تھا۔

ہم اکیڑ پر دست کے پیچھے سے بولتے تھے ان کی آوازیں ایک بجلی کے آنے کے ور ایسے سے تمام بالوں میں گونجتی تھیں گویا پانچ بچہ آوازوں والا مہیب دیو سرگوشیاں کر رہا ہے۔ ہندسوں کے دہرانے سے مطلب یہ تھا کہ مسٹر صفرب کی روح روزمرہ کی بیزنگ کا دباری مصروفیت کا وجہ ہے آہنی مردہ ہو چکی ہے اور نئے خیالات کے بہیا ہونے کی طاقت اس درجہ سلب ہو چکی ہے کہ دفتر کے دن بھر کے کام کے علاوہ اسے اور کچھ نہیں سوجھتا، دل و دماغ پر اس شین کی طرح مرز تنگ نے اس قدر قابو پایا ہے۔

دوسرا سین دفتر کمرے، پیچھے سیاہ رنگ کے پردے لکھے ہوئے ہیں۔ سٹیج کے عین وسط میں ایک بہت اونچا سا ودر فاؤنڈیک ہے دو نو طرفت وواونچے سٹول ہیں جن پر بیٹھنے سے آدمی کے پاؤں زمین سے تین فٹ کے قریب اونچے رہتے ہیں ایک طرف مسٹر صفرب بیٹھا ہے دوسری طرف ایک کام کرنے والی عورت بیٹھی ہے ڈیک کے عین اوپر ایک لمپ لٹک رہا ہے، لمپ تو دکھائی نہیں دیتا لیکن اس میں سے جھری پٹی تیز روشنی کا ایک مخروطی مینار سلینچے ڈیک پر پڑ رہا ہے وہاں دگر دکی تاریک فضا میں تہا یاں نظر آتا ہے یہ سب سامان بیٹھ کے اس صفحے پر ہے جو گھمایا جاسکتا ہے۔ مسٹر صفرب اور لٹکی دونوں نے آنکھوں پر سبز رنگ کے چھبے لگا رکھے ہیں، لٹکی کے ہاسنے بل فامول کا ایک ڈھیر ہے۔ ایک بل کو اٹھاتی ہے، رقم بلند آواز سے بول کر اس کو فائل میں لگا دیتی ہے پھر دوسرے بل کو اٹھتی ہے اس کو بھی یونہی پڑھتی ہے عزیزیکہ متواتر یہی کے جاتی ہے مسٹر صفرب رقم کو دہراتا ہے اور سامنے جو رقموں کی فہرست رکھی ہے اس پر نشان لگاتا جاتا ہے یہ رقمیں جس لیے میں بولی اور دہراتی جاتی ہیں اس سے تمکین اور بے

روثقی ٹپکتی ہے بیچ میں کہیں کہیں ٹھہر جاتے ہیں ایک دوسرے سے ہم کلام نہیں ہوتے مگر بغیر نظر اٹھانے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں جس سے ان کی زندگی کی مرہ ہوسوں اور شکست خوردوں انگوں کا پتہ چلتا ہے معرفت کا یہ عالم ہے کہ مسٹر صفحہ کی گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے کہ گویا یہاں شاید برسوں سے اس لڑکے کے سامنے بیٹھا کام کر رہا تھا لیکن کہیں جی بھر کے اس کا چہرہ دیکھنے کی نوبت نہیں آئی دل میں یہ امید ہے کہ آج نہ سہی کل میری ترقی ہوگی آخر اتنے سالوں سے کام کر رہا ہوں تاکہ کمپنی سے آج تک صرف ایک مرتبہ گفتگو کا موقع ملا وہ یوں کہ ایک دفتر میں نے اس کے لئے دروازہ کھولا اور اس نے کہا کہ توازشیں لیکن کیا ہوا آخر کہیں تو اس کو خیال آئے گا کہ شیخض اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی تنخواہ میں اضافہ کیا جائے۔

اتنے میں دفتر کی سیٹی بجتی ہے۔ دن کا کام ختم ہو گیا۔ دونوں ایک ساتھ سٹوڈیوں پر سے اترتے ہیں دونوں کی حرکات میں اس درجہ مماثلت پیدا کرنے سے صرف یہی بتانا مقصود تھا کہ ان کی زندگیاں بالکل مشین کی مانند ہو گئی ہیں لڑکی باہر چلی جاتی ہے مسٹر صفحہ جانے ہی کو ہے کہ ماہک کمپنی اندر داخل ہوتا ہے جڑے محکم کے انداز میں پوچھتا ہے تم کو یہاں ملازم ہونے کتنے سال ہو گئے تم کیا کام کرتے ہو؟ دیکھو دیکھو، اور آخر میں مسٹر صفحہ کے کہتا ہے کہ جو کام تم یہاں کرتے یعنی رقبیں جمع کرنے کا، اس کے لئے ایک ایسی مشین ایجاد ہو چکی ہے جو تم سے کہیں تیز کام کرتی ہے وہ مشین میں سے رنگاں ہے اس لیے تم آج سے درخواست کئے جاتے ہو۔ سب کچھ بہت تیز تیز ہوتا ہے مسٹر صفحہ کچھ احتجاج کرتا ہے وہ نہیں ملتا اس بحث کے دوران میں دونوں کی آوازیں بلند نہ ہو جاتی ہیں سیٹج گھومنے لگتی ہے لیکن مسٹر صفحہ اور مالک کمپنی دونوں اس طرح چلتے ہیں کہ گویا سیٹج گھومتی رہتی ہے۔ لیکن وہ دونوں اپنی جگہ پر قائم ہیں آوازیں اور بھی بلند ہوتی جاتی ہیں گفتگو لمحہ بہ لمحہ تیز ہو رہی ہے سیٹج پر سرخ اور سفید رنگ کی روشنی کہیں ٹپکتی کہیں بجتی ہے۔ پردے کے پیچھے سے ایک ٹرڈا وٹی سرگوشیاں شہد کر دیتے ہیں جو رفتہ رفتہ مہیب تر ہوتی جاتی ہیں الفاظ کچھ بھی

مجھ میں نہیں آتے کہیں ایک گھنٹی یعنی شروع ہو جاتی ہے قسم قسم کے شور سناؤ دیتے ہیں مسٹر صفرمیز پر سے فائل اٹھا کر اس کے نوک دار لوہے سے ٹاک پر حملہ کرتے کو بڑھتا ہے آوازیں اور شور اور روشنی کی چمک اور سیٹج کا گھومنا سب کچھ بہت تیز ہو گیا ہے تماشا یوں کے دل رہ کر گئے گئے ہیں مسٹر فردنسا اپنا ہاتھ اوپر کو اٹھاتا ہے ایک لحنت ایک روز کا دھماکہ سناؤ دیتا ہے (یہ آواز پتیل کے ایک تھال کو زور سے زمین پر مار کر پیدا کی گئی تھی) اور تمام چراغ گل ہو جاتے ہیں مکمل خاموشی اور تاریکی چھا جاتی ہے اور پھر جو دوبارہ لپ روشنی ہوتے ہیں تو پردہ گر چکا ہوتا ہے تماشا یوں کے دل کی دھڑکن درست ہوتی ہے تو زور سے داد دیتے ہیں ۔

یہ اس صیرت غلے کی جھلک ہے مکمل ڈرامے کو اس تفصیل سے بیان کرتے کی ہمت اور فرصت کہاں ۔

یوپی کے تنقید نگاروں کی خدمت میں

نیاز مندان لاہور

بستی فرہنگیں اور فرہنگ طراز ہیں یہ سب کتابیں اور یہ سب جامع ماخذ پیاہ ہیں
تو تو اور لباس در لباس وہم مد وہم اور قیاس در قیاس پیاہ کے پھلکے جس قدر اتار تے جاؤ
گے پھلکوں کا ڈھیر لگ جائے گا، مخزنہ پافنگے (غالب)

کاروان مکا یہ دوسرا منبر دنیا کے سامنے ہے، یہ رسالہ پنجاب کے چند توجہ والوں کی
مخت کا نتیجہ ہے جنہوں نے پچھلے سال جناب چغتائی اور جناب تاثیر کا زیر قیادت اور
اس سال جناب چغتائی اور جناب عمید ملک کے زیر ہدایت اس بات کی کوشش کی ہے،
کہ حسب استطاعت ان فنونِ لطیفہ کے ذریعے جن کا طہور سطح قرطاس پر ممکن یا سہل
ہے، ہندوستان کے موجودہ اہل فن کے مزاج سے تعلیم یافتہ حضرات کو روشناس کر دیا
جائے اس میں کسی سبب کی قید نہیں اور فہرست نمایاں سے ظاہر ہو گا کہ اس مبارک دیدہ
گمری کے لئے ہندوستان کے سب صوبوں کے سامنے ہاتھ پھیلا گیا ہے، اگر آپ
کو اپنے بعض دلہند ناما اس فہرست میں نظر آئیں تو اس کو سائل کے استغنا پر
ہیں اس کی نمرادی پر محمول کیجئے۔

ادب وانشا کے نمونے پیش کرنے کے لئے زبان اردو کو منتخب کیا گیا ہے نہ اس
لئے کہ اردو کوئی زبان در خود اتنا نہیں۔ نہ اس لئے کہ پنجاب میں صرف وہیں ایک زبان
بولی اور سمجھی جاتی ہے، بلکہ اس لئے کہ پنجاب کے توجہ والوں کا ادبیت سے کاوانے
دائستگ کا فخر حاصل ہے، اپنی تہذیب، اپنی تربیت اور اپنے جذبات، عقیدت،
والفت کی وجہ سے اردو ہی کو اپنے لیے بہترین ذریعہ اظہار سمجھتا ہے، ممبرین سے

پوشیدہ نہیں کہ اس وقت ہندوستان میں ہندو کے تین مرکز ہیں۔ یوپی، حیدرآباد (دکن) اور لاہور۔ لیکن اہل بنیش بھی یہ بات گواہ ہے گاہے بگاہے جلتے ہیں کہ یوپی میں یہ زبان تمدن ہے حیدرآباد میں یہ زبان ایک والی ملک کے سایہ عاطفت میں پل رہی ہے اور صرف پنجاب ہی ایک علاقہ ہے جہاں اس کی نشوونما محض خونِ حشا کی مرہونِ منت ہے جس جگہ یہ زبان قوموں سے وہاں توہین بھی ہے جہاں آتالیق شاہی سے تعلیم پائی ہے وہاں عوام سے کچھ کچھ کے رہتی ہے لیکن پنجاب میں اس زبان کی حالت ایک جہتہ ترموند فوجوان کی ہے جس کا خون گرم ہے مادہ جس کے اعضاء میں لپک ہے جو چلا لگیں ملتا ہے اور اس بات کو یاد نہیں کرتا کہ اس کا ہر قدم گپھٹ ٹھکی پر پڑتا ہے یا نہیں۔ اسے سمت کا اتنا ہی شعور ہے جتنا کسی اوتھہ نیٹو کو جوتل ہے۔ یعنی یہ کہ سوائے گرمی حیات کے اور کسی ہیروئی قوت کا احساس نہیں لیکن قوت نامیہ خود ہی راستہ ڈھونڈتی ہے جو بظن مستقیم کھلی روشنی اور تازہ ہوا کی طرف ہٹا ہے۔

یہ کہنا کہ پنجاب نے یوپی سے کسب فیض نہیں کیا یا یہ کہ پنجاب یوپی کی روٹیاں سے ایک ٹھم متعاظہ کرنے پر تالا ہوا ہے۔ کذب اور مبالغہ ہو گا۔ یوپی کے اساتذہ قایم میں سے کون سا ایسا ہو گا جسے پنجاب نے ایک بار سو بلڈ ہزار بار نہیں پڑھا۔ وہ کون سا ایسا دیون ہے جس کی طرف گروانی نہیں کی۔ وہ کون سا ایسا شاہکار ہے جسے حریفان بگڑ نہیں دکھا لیکن یوپی کے چشمے خشک ہو چکے۔ پیاس بھاننے کے لیے اب ہاں جانا ہے سو ہے، اب پنجاب کی دہری بجز اس کی اپنی قوت نامیہ کے کون پز نہیں کر سکتی۔ یوپی میں ادیب اور کلاسیک سکتا ہوا سانپ ہے جو کبھی کبھی ایک نحیف سی بچھکار ملتا ہے اور بس اب یوپی صرف اعتراض کر سکتا ہے۔ درہنما نہیں کر سکتا اور نہیں جانتا کہ اس کا پوٹو پڑا ہوا اس کا مرتبہ انڈیا اس کی طفلانہ تنقید ہے سب اخطا کی نشانیاں ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ یوپی ایک خودیہ ہستی کا اس کے اخطا کی خبر سننا یہ جی سہ لیکن یہ سب دہلی ایک فخر زن کہ ہے دہلی ہے اس میں معول کی دلہاری کا خیال

کنا فضول ہے۔

اس اسخطاط کے ثبوت میں کوئی سی ایسی تنقید اٹھا کے دیکھ لیجئے جو کسی یوپی کے مرتب کئے ہوئے رسالے میں چھپی ہو۔ اگر وہ تنقید ڈرامے پر ہے تو ڈرامے کے اصولوں سے کچھ بحث نہیں، مناظر کی ترتیب سے کچھ واسطہ نہیں، اگر انسان ہے تو توازن کا ذکر نہیں، نضار کا احساس نہیں، مسلک کا شعور نہیں، اگر ترجمہ ہے تو فقروں کی ترتیب پر تو یہ نہیں اصل سے متبادل کا حوصلہ نہیں، اجتهاد کو پختے کی استعداد نہیں، صرف زبان کے اعتراضات پر نورد ہے، اس محاورے پر اس لفظ پر اس حرف پر، اس نقطہ پر نظریں گڑی ہوئی ہیں، رنگان میں یہ وسعت نہیں اور طبیعت میں یہ بلندی نہیں کہ کسی اندھیرے کو جانچ سکیں، یا اصل مدعا کے متعلق پھوٹے منہ سے دو لفظ بھی کہنے کی توفیق پیدا کر سکیں، زمانہ کہاں پہنچ گیا، کھوان اردو کسی منزل میں طے کر گیا، لیکن حضرات یوپی ہنوز ممکن اور ممکنات کے پھیر میں ہیں، وہ زبان اندو کو اشوک کا ایک کتبہ سمجھتے ہیں، جو دہلی یا کمپنر میں نصب ہے اور

سب کا مجمع ان پر بھی ضروری ہے جو جمادات کی منزل سے آگے نکل چکے ہیں، گذشتہ سال کے کھوان پر کسی رسالے نے زبان کے اعتراض کئے تھے لیکن ہم لوگ اس قسم کے اعتراضات تھنے کے عادی ہو چکے ہیں، ہم یوپی کے حضرات کو اس مشغلے سے محروم نہیں کرنا چاہتے، اس اسخطاط کے ناساتے میں یوپی کے پاس یہی ایک کھلنا رہ گیا ہے گو جڑ چڑھے پن کا یہ عالم ہے کہ غور اس سے کھیل نہیں سکتے اور کسی کو کھیلنے نہیں دیتے بے ہنر نقادوں کا ہنزاب یہی رہ گیا ہے کہ جہاں پنجاب کا کوئی مضمون چھپے اس کے بڑھپوٹے سے پھوٹے فقرے کو ہر ٹی سے بڑی فرہنگ کے ساتھ پرکھیں، اہل قلم کی ہر قوت کو محض تذکیر و ثابیت کے مبار سے ناپیں اور اس کے بعد ایک "حضرت اسخطاط" مرتب کر کے فن تنقید کی گورہر لات لادیں، مطاب یا فن یا حسن بیان کی طرف ڈر کے مارے صرف کھکھیلوں سے دیکھ لیں، اہل اگر باوجود اپنی نااہلی کے مرعوب ہوئے بغیر چارہ نہ ہو تو اپنی بے چاگی کو اچھا یا خوب ہے جیسے بے معنی نظروں سے ٹھانپ کر اپنی کم مانگی کو فہرت

افلاطون کی طوالت سے پورا کرنا کی کوشش کریں یا اگر کسی ریویو سے بک مثال سے کسی انگریز لال بھگت کی کوئی ارنال کتاب مبادیات انٹار کے متعلق دستیاب ہو جائے تو اس کے فرسودہ خیالات کے پھوسٹروں سے اپنی تھوڑی بہت سرسپوشی کر کے بچھڑھیں کہ اب ہم علم و فن کی تمام آرائشوں سے مزین ہیں اور کیا مشرق اور کیا مغرب دنیا بھر کا ادیب ہمارے ہی گوشہ چشم سے کھینچنے کو ہماری دہلیز پر ہے۔

اگر یورپ کے سب سائے اسی جہل سے مرکب ہوتے تو اس مضمون کا لکھنا۔

مضن بے سود تھا لیکن ان میں سے چند سائے لیے بھی ہیں جن کی ہر اشاعت کے ساتھ نہایت خوش گو اور توقعات والہتہ ہوتی ہیں، اور جنہیں پنجاب کا ہر وہ ادیب آشنا ہے اہل نظر کی تلاش رستی ہے بہت تڑق سے پڑھتا ہے، انہی کا مقام ہے کہ ایسے رسالوں کے مرتب کرنے والے بھی باوجود اپنے علم اپنے ذوق اور اپنی متانت طبع کے یورپی کے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے ہمارے سخن اس وقت ان کی طرف ہے امدان میں سے ددر سائے خاص طور پر ایسے ہیں جن سے مخاطب ہونا خود ہمارے لئے فخر کا باعث ہے۔ ہماری مراد علی گڑھ میگزین اور جامعہ سے ہے۔

علی گڑھ کا خط مردم غیر خط ہے، اور اس کی زمین کا ہر ذرہ قابل احترام ہے، ہندوستان میں جہاں بھی کوئی ایسا شخص ہے جو تہذیب جدید کے ساتھ ہمارے میں پریشان نہیں ہوتا لیکن پھر بھی ابد زبان کو اپنے لیے روح پرورد تصور کرتا ہے وہ علی گڑھ کے نام کو اسم اعظم اور علی گڑھ کی مطبوعات کو ترقی کا پرچم سمجھتا ہے، لیکن علی گڑھ میگزین بھی جب کاروبار پر تنقید لکھنے بیٹھا تو اس نے اس تنقید کا تقریباً نصف حصہ زبان کی لغزش کی تندہ کر دیا، افسانوں پر پانچ سطروں کا ایک پیرا گراف لکھا اصدہ بھی ایسا جس میں علم کم اور متانت بیش بچپن زیادہ پایا جاتا ہے تصادیر کے متعلق صرف اتنا لکھ دیا کہ سب کی سب رکش اور دلاویزی ہیں۔ یہ الفاظ نہایت محفوظ ہیں لیکن نہ اس قدر کہ ان

کے ڈھکافوں میں سے تنقید نگار کا کوہ پرن نظر نہ آئے، البتہ یہ بڑا مٹوٹی سے کہہ دیا کہ "موان" مونت چھند کر نہیں اس کا جواب حاصل تو یہ ہے کہ بہت اچھا مادہ موان مونت ہی ہے لیکن اس کی وجہ سے آپ کو صرف اتنی ہی نعت اٹھانی پڑے گا کہ جہاں موان مٹوٹی لکھا ہے وہاں پوسل سے مٹوٹی کی بجائے مٹوٹی کر لیجئے، قصہ ختم ہو گیا اس کے بعد مٹوٹی کو پڑھئے، اگر لطف آئے تو سب سے اچھا یہ ہے ورنہ اس پر ملک ڈالئے، خقیانہ انداز اختیار کرنے کی یہ ضرورت ہے بقول آپ کے ہم اس قسم کے اعتراضات سے آنفہہ جوتے ہیں: ہمیں آندہ وہ کرنے سے کیا حاصل؛ اس مٹوٹی کو اگر آپ نظر انداز کر دیتے تو نہ صرف آپ کی تنقید کا عیار ہی بلند رہتا بلکہ ہمارے دلی عقیدت بھی منزل لزل نہ ہونے پائی۔

ناسخ کے کیا خراب کیا ہے۔

کسی دن تک سالانہ ہو کے کو حشرت یہی
عزیز و عزیز نہیں موان مٹوٹی کا

شعر معمول ہے لیکن جذبات صحیح ہے اور عجیب نہیں کہ آپ اس سے متاثر ہوں۔
تو لڑ پالا تنقید خود ایڈیٹر صاحب کے نذر قلم کا نتیجہ ہے مالا لکھ تاتہ ترین
اشاعت میں انہوں نے "آغاز داستان" کے عنوان سے جو مٹوٹی لکھا ہے اس
کے تقریباً پورے پراس سے بدتر لغزشیں موجود ہیں، فرماتے ہیں۔

سالنامہ کی خصوصیات اس کی دلچسپی اور لفظی بیانیہ

سے نہ کہہ لائیے۔

در علمت کا یہ غلط استعمال خاص علی گڑھ سکرین کا حصہ ہے

اور خصوصیات کہہ لوانا تو ایسا محال ہے کہ کیہ کہئے۔

پھر پورے برسوں سے ملتا رہا اس مطلب کو یوں ادا کیا تو آپ ہی تر کیا

تسم سے فرماتے کریں ان کھڑے ہڈوں پانچے۔

نہ سے زیادہ عجیب مٹوٹی خبر نہ ہو سکتی اس کا نام نہیں ہوتی، عجیب قائم
ہو جائے کہ تو جو آپ کا دل پانچے کہیے کہہ لال تو میں بلرے آپ کو مسترت

ہوئے سے وہ قیام کی تجویز ہے)

پہلے سے جو مضامین کی آخری تاریخ مقرر کی جاتی ہے... (مضمون کی نہیں ہوتی مضمون بھیجنے یا پہنچنے کی تاریخ ہوتی ہے)۔
 • تمام ضروری خبریں اور اہم اجتماعوں کے متعلق پچھلے ممبروں میں لکھا جا چکا ہے
 (اس لکھ فقرے میں صرف دستخط اور بیان کی آسانی غلطیاں ہیں کہ ان میں سے دو ایک تو خود ہی آپ کو سمجھنی چاہئیں)

معلوم ہوتا ہے آپ ہماری اصلاح میں اس قدر وقت ضائع کر دیتے ہیں کہ خود کچھ سیکھنے سکھانے کی فرصت ہی نہیں ملتی لیکن پنجاب کا ایک رسالہ بھی ایسا نہیں جو آپ پرزکتہ چینی کرنے کو اپنے لیے باعث فخر و تازہ سبھے ہے ہم چہیتے کے چہیتے خود یورپی کے رسالوں میں سے زبان صرف دستخط اور انشا کی غلطیوں کی ایک طویل فہرست اہل بصیرت کی عبرت کے لیے مرتب کر سکتے ہیں، لیکن ہم نے اب تک یہ پیشہ اختیار نہیں کیا اور سچ پوچھے تو ہمیں اس کی فرصت بھی نہیں۔ یہ مشغلہ آپ ہی کو مبارک ہو ہم آپ کی خوبوں پر نظر رکھتے ہیں کیونکہ ہم نوشت و نواذ کو جو مسرت اور ذریعہ اتمام سمجھتے ہیں۔ آپ ہمارے نقائص کو یاد دہانتے ہیں آپ نے زبان کو اپنے لئے مرد قسم پانا یا ہے جو نجیف ہے مگر جس نے آپ کا ٹینٹو ادا بار کھا ہے۔

• جامعہ کی حالت اس سے بھی زیادہ قابل افسوس ہے کیونکہ جامعہ کے حلقے میں بعض ایسی شاندار ہستیاں بھی شامل ہیں جن کی توجہ کو جذب کرنا بھی باعث سعادت ہے ان کا جوش عمل ادا ان کا متوجہ علمی ہم پینچ میرزوں کی تشریف دتوینت سے بالاتر ہے۔ پھر کیا یہ عبرت کا مقام نہیں کہ یہ زبان کا جنون ان کی سلامت طبع کو بھی ملوث کر رہا ہے۔ اور وہ بھی تنقیص کے نشے سے بے خود ہو کر تفکر و تمق سے بے نیا تہ ہو جاتے ہیں۔ اس زبان بدازی کا حوصلہ ہمیں سزا اس لیے ہمارا کہ جامعہ نے فہرست اغلاط میں منزل گاہ بھیج لفظ کو بھی شامل کر لیا۔ اور کہہ دیا کہ یہ ترتیب صحیح نہیں، غالباً قافیہ کی مجبوری تھی۔ یہی وہ ادا ما او تین

تیسے جی کی ایک موٹی سی تزیوپی کے اکثر دماغوں پر چھی ہوئی ہے، اسے کاش کہ
فاضل تنقید نگار صاحب اپنے لہجے میں عقوڑا سا منکرانہ مگر مختصراً تامل
پیدا کر لیتے۔ اسے کاش اب بھی کبھی کبھار اپنا انداز طالب علمانہ بتالیا کریں اور
خوشوع و غضوع کے ساتھ یہ شعر گایا کریں سے

کس ندانت کہ منزل کہ مقصود کجاست

ایں قدر بہت کہ بانگِ خبر سے می آید

لیکن اسے پڑھ کر بھی وہ شاید یہی کہیں گے کہ ترکیب صحیح نہیں غالباً

تافیہ کی مجبوری تھی،

جامعہ کے جس نمبر میں کاروان پر تنقید تھی چنانچہ اسی نمبر میں زبان کی کئی دل
چسپ غلطیاں موجود ہیں جنہیں ہم یہاں نقل کرنا سو رادب سمجھے ہیں لیکن ارباب
جامعہ کا اشارہ پاتے ہی ہم ان کی خدمت میں پیش کرتے کو تیار ہیں۔

جامعہ کی تنقید کا انداز ضرورت سے زیادہ پیغمبرانہ ہے اور اصل پیغمبر اور
قومی سیرت اور اصلاح و نظر ہے اور ہمیں خوشی ہے، اور ہمیں امید ہے
اور اسی قسم کی آیات سے فالو ا بسودہ میں ٹیپہ پر عمل کرنے کی کوشش بہت نمایاں
ہے لیکن چونکہ یہ انداز جامعہ کا مستقل انداز ہے، اور اس کے اعتراض و مواضع

میں شامل ہے اس لئے ہمیں اس پر اعتراض کرنے کا حق غالباً حاصل نہیں تاہم
اتنا عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ نقد و نظر کے اعتبار سے اس تنقید کا وزن
مخصوص بہت کم ہے اور پڑھتے وقت اس سے حال کچھ نہیں ہوتا۔ سب سے اس
احساس کے کہ تنقید نگار اپنے سینے میں دل دردمند رکھتے ہیں، اور یہ احساس

لا ریب دونوں جہاں میں امت مرحومہ کے لیے بھلائی کا موجب ہوگا۔

پنجابی محاورے خاص طور پر قابلِ بحث ہیں، علی گڑھ میگزین اور جامعہ دونوں
نے ان کا ذکر کیا ہے، اور کئی بار بالکل سبھا فرمایا ہے کہ یہ محاورے محض پنجاب
کا پیداوار ہیں۔ یہاں تک تو ہمیں ان سے پورا اتفاق ہے مثلاً پنجاب کے لوگ بچے
جاننے کی بجائے "میں نے جانا ہے" اور میری سمجھ میں نہ آتا تھا، کہ بجائے

مجھے سمجھنا آنا تھا بولتے ہیں لیکن یہ دونوں رسالے اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ جب پنجاب نے اردو کو اپنا پایا ہے تو اس قسم کے تصرفات لایڈ ہیں اور جوں جوں پنجاب میں اردو ترقی کرے گی ایسے تصرفات کی تعداد بچائے کم ہونے کے اور بڑھے گی، اس کے ثبوت اور جواز دونوں کے لئے کسی زبان کی تاریخ ارتقار کا مطالعہ کیجئے اس کے بعد اگر آپ فرامیڈ نظری سے کام لیں تو آپ پریکٹیشن ہو جائے گا کہ اگر اردو کو پنجاب میں نشوونما نصیب ہونی ہے تو ان تصرفات کے بغیر چارہ نہیں بلکہ ان ہی کی بدولت پنجاب میں اردو کی جڑیں مضبوط ہوں گی اور وہ ایک اکتسابی زبان کے درجے سے ایک نظری زبان کے درجے تک جا پہنچے گی۔ وہ وقت آن پہنچا ہے جب کہ آپ اردو لغت کی کتابوں میں مضمون اور دہلی کے محاوروں کے پادوبہ پہنچو پنجاب کے محاورے جس شامل کر لیں، چہ جائیکہ آپ ان کو غلط قرار دیں۔ پنجاب کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی تو اب یہ حالت ہو چکی ہے کہ جہاں کوئی محاورہ بانٹنیجھے جانتیے کتاب پڑھے کچھ نوٹس اسے علامت کرتے ہیں کہ یہ کیا چڑھتیوں کی زبان بول رہے ہو۔ اپنا پنجابی ڈھنگوں کی طرح باتیں کر رہے ہیں مت بولو کاروان کی اس اشاعت میں جناب تاثیر کی منظم کا پہلا معرہ ہے۔

تو نے الفت لہجے سے کہنا ہے تو کو میرے لیے

ان سے کہا گیا کہ تو نے... کرتی ہے کی بجائے مجھ کو الفت لہجے کو کرنی ہے۔ دکھ لیجئے، انہوں نے فرمایا ہرگز نہیں: تو نے الفت مجھ سے کرنی ہے میں محرم زیادہ ہے۔ میں مصدر کے ساتھ نے استعمال کرتا بھی ہوں اور نہیں بھی کرتا معرے یا جملے کے ترنم کے مطابق جہاں پنجابی محاورہ لہجے مفید مطلب نظر آتا ہے وہاں میں بحیثیت پنجاب اردو خوان کے اسے استعمال کرتا اپنا حق سمجھتا ہوں، یوں ہی کے حضرات اس حق سے محروم ہیں وہ مجھوں تو جوں میں مجور نہیں۔

علی گڑھ میگزین اور جامعہ دونوں بہترین ہندوستانی تہذیب کے علم بردار اور آئینہ دار ہیں جس فضا میں یہ رسالے تہذیب پانتے ہیں، وہ ہندوستان

کی بہترین علمی فضا ہے اور ان کے مدیر مہمانِ حضرات اہل پنجاب کے نزدیک
بوجہ مجتہد و متقدم ہیں۔ ہم میں سے اکثر ایسے ہیں جن کو ان حضرات سے
ذاتی تعارف کا فخر حاصل ہے اور خدا گواہ ہے کہ ان کا حسن اخلاق اور ان
کی باغ نظر سیما سے نزدیک مستم اور ان کی صحبت کی یاد (برچند کہ وہ صحبت
بہت مختصر تھی) بالیدگنی روح کا موجب ہے لیکن جہاں ہماری عقیدت
کا یہ عالم ہے وہاں توقعات بھی کچھ کم نہیں۔ ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ یہ دور سولے
ہندوستان بھر میں تنقید کی رہنماں کریں گے۔ ادب و انشا کے مقابلے میں ایسے
معیار قائم کریں گے جو کم از کم نصف صدی تک اہل علم کے لئے مثل ہدایت
کا کام دیں۔ جو بجاتی اور بلدیاتی حدود سے باہر قدم رکھ کر کل ہندوستان میں اردو
کے مستقبل پر غور کریں کریں گے، اور اپنے رویے سے ایسے ایسے اصولوں
کی گنجبانی کریں گے جن کی تاسید ہمیشہ فرنگ آصفیہ سے نہ ہوتے گی، بلکہ
جن کی بدولت خود فرنگ آصفیہ رفتہ رفتہ بے کلمہ ہو کر رہ جائے گی تاکہ دنیا
پر یہ ثابت ہو جائے کہ اردو ایک زندہ زبان ہے جو برٹھ رہی اور پھول رہی ہے۔
جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں پنجاب اس زبان کو اپنے خون سے سینچے
کو تیار ہے اس نے ہم سے اگر اس سے بار بار یہی کہا جائے کہ تمہارا خون رقیب
ہے، اور اس کے مقابلے میں بار بار ان مردہ بڈیوں کو سراہا جائے جو مدت
ہوئی ہے مغز ہو چکیں، ہم آپ سے رہنمائی کی توقع رکھتے ہیں رہنمائی کو آپ
کی شایان نہیں سمجھتے ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ آپ ہم تیار مندوں کو شرفِ پارسیا
بخش کر ہماری عقیدت اور اپنی دریا دلی سے بزمِ اردو کی نیت کو زمجیاں
گے۔ نہ یہ کہ قلمِ معلیٰ کے کھنڈروں پر نیت نئے ملک ڈالنے پلے بائیں گے

ہمارے زمانے کا اردو ادیب

پطرس مرحوم نے یہ مقالہ ۱۹۴۵ء میں پی ای اے کے سالانہ اجلاس منعقدہ پور میں پڑھا تھا اس میں انھوں نے اردو ادیب کے جدید دور یعنی اقبال کے فوراً بعد کے زمانے کو موضوع بنایا تھا۔ اور اپنے مخصوص چبھتے ہوئے انداز میں اس پر رائے زنی کی تھی اس مضمون کی اصل خوبی تو ان کی انگریزی انشا پر دازکی ہے جس کا اردو ترجمہ وہ خود ہی کرتے تو کتنے، تریز نظر ترجمہ محض اس لیے کیا گیا ہے کہ وہ لوگ بھی جو انگریزی سے زیادہ واقف نہیں ان کے انداز نظر اور جدید اردو ادیب کے بارے میں ان کے نقطہ خیال سے واقف ہو جائیں۔

چونکہ پطرس مرحوم کا اپنا تعلق اس دور کے ادب سے دو گونہ تھا نئے ادیب کی حیثیت سے اور اس سے بھی زیادہ نئے ادیبوں کے استاد کی حیثیت سے اس لئے اس مقالے کی مروجہ صیت 'اوزبے لاگ مٹا لو' شاید عجیب معلوم ہو۔ پطرس نے اپنے نوجوان ساتھیوں کو ایک پہاڑی پر چڑھ کر دیکھنے کی کوشش کی ہے (یہ الگ بات کہ دو ایک سوزیوں کو بھی اپنے ساتھ لے گئے ہیں) اور ان پر ہلکی ہلکی گلگیاں بھی پھینکی ہیں۔

مکن ہے آپ اس مضمون کو محض تبرک سمجھیں مگر واقعہ یہ ہے کہ چند ایک ٹکڑے اس میں ہر لحاظ سے اچھے ہیں۔
گیارہ سال پہلے، جب اقبال اپنے اسلاف سے عالم بالا میں جا کر

تو در نزدیک کے زانوں سے کسی ایک دوست ان کے گرد آکھٹے ہوئے
 غالب اور میر۔ حالی، شبلی اور گرامی، حتیٰ کہ نظیری، رومی اور حافظ بھی چنانچہ
 گنگوڑی سے ہونے لگی۔ کچھ لمبے گوگو کی حالت میں بھی گزرے مثلاً جب غوی
 کے مسئلے پر ایک عالماہ بحث رومی اور اقبال کے درمیان شروع ہوئی تو باقی لوگ
 اونگھے گئے اور تقدیر اہم پر اقبال کی تنہا کلامی کے دوران میں تو غالب کے حوالے
 بھی سنائی دیئے مگر مجموعی طور پر یہ محبت بے حد سازگار رہی۔ جاتے پہپاتے
 اقتباسات کتابوں سے ما حافظے سے باوان بلند پڑھے گئے اور شب و روز کی
 بے زباں لہروں پر حکمت اور ظرافت کا ملاح پ ہوتا رہتا بہت سے قصبے سانسے
 آئے، اور ان میں سے کسی ایک محل نہ ہو سکے اس کے باوجود فہم و بصیرت کے
 تازہ اور فروغ بخش نقش و نگار دریافت ہوئے۔ اقبال قسام میں سے نئے پھر
 بھی قسام کے لئے اجنبی نہ تھے۔ بس ذرا نئے نئے اور بھرپور سے گھٹتے
 آج کا نوجوان اردو ادیب، اگر مگر سفریہ وقت سے پہلے روائت ہوتا
 پڑے، اس محفل میں کیسا گنگے گا، بھے یقین ہے کہ اس کا استقبال مروت اور
 شفقت سے کیا جائے گا مگر یہ خوف بھی ہے کہ وہ ذرا کھویا کھویا سا گنگے گا۔
 قسام سے اظہار خیال اس کے لیے آسان نہیں ہوگا، نیا مسافر اپنے اور ان
 پیشروں کے درمیان ایک بہت بڑی خلیج مائل پائے گا جیسے پاٹنے کے لیے اس
 کو کتب خانہ فرودس میں طویل نشستوں کا پروگرام بنانا پڑے گا، وہ حالات کی
 بھونڈی سے اپنے اجراء کا جائزہ دہشہ وصول نہیں کر سکا اللہ اللہ۔ ما شد
 اور فیض، فراق اور فرحت اللہ بیگ، جوش اور خیند، ماضی کیساتھ ان سب
 کے مراسم اچھے ہیں اگرچہ اٹھوں لے، متھوڑے بہت فرق کے ساتھ، اپنے آپ
 کو حال یا مستقبل کے ساتھ وابستہ کر رکھتا ہے، مگر وہ پیہم کم ہوتی ہوئی اقلیت
 سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور سلف کی ایسی یادگار ہیں جو نجانے پھر کب پورا ہو۔
 ہمارے لکھنے والوں کی اکثریت اپنے آپ روایت سے دور ہوئی جا رہی ہے
 مولوی تہرہ احمد جو آج بے پاپس پرس پہلے کے مادل نگار تھے، انبیاء

کو کراہت اور شعراء کو لذت کے ساتھ نقل کرتے، مگر بات یہ ہے کہ مصنف اور اس کے کردار دونوں میں حوالہ دینے کی اہمیت تھی، دونوں نے ادب کی ایک مشترک دولت ورثے میں پائی تھی جو اس دور کے ذہنوں میں صاف تہ تیغ کے ساتھ موجود تھی۔ آج کے اردو ناول نگار میں اور اس کے ہیرو میں کوئی بات مشترک ہے تو یہ ہے کہ دونوں کوئی قول نقل نہیں کر سکتے یہ نہیں۔ وہ بلا نوش قسم کا قاری ہے مگر دلایتی تاثر دہن کی چھاپی ہوئی، بہار کی فہرستیں، نزاں کی نہریتیں، اور مندر پار کے ایڈیشن، کچھ ایسے تسلسل کے ساتھ چلے آتے ہیں کہ نہ پختے اور چھاتھنے کی فرصت رہ جاتی ہے، نہ کسی چیز کو دوبارہ پڑھنے کی ہمارے دور کا نصاب بھی اُلجھا ہوا ہے اور پیچھے مڑ کے دیکھنے کی تو حرکت ہی پیدا نہیں ہوتی۔ ہمارے زمانے کے اردو ادیب کا مستقبل جو تو ہوا ماضی کوئی نہیں

اس قطع تعلق کی وجوہات گونا گوں اور پیچیدہ ہیں، اوپری نظر سے دیکھیں تو یہ خیال ہوتا ہے کہ ہمارے ادیب نے جس نظام تعلیم کے تحت نشوونما پائی ہے۔ یہ سب اسی کا تصور ہے، رسمی تعلیم پچھلے پچاس سال میں شرافت اور ریافت کے اس قدیم تصور سے دور ہٹ گئی ہے جو طالب علم کو اس دنیا اور (یا اس دنیا کے لیے) اخبار و شعراء کی مناسب مقدار کی مدد سے تیار کرتا تھا، پرانے مسلمات قائم ہو چکے ہیں اور اس کے ساتھ انبیاء شعراء بھی، یہی ایک کارنامہ ہے جو ہمارے نظام تعلیم نے سرانجام دیا ہے۔ باقی اس سڑھے میں ہماری تعلیم ایک نئے تصور کی تلاش میں جو پڑانے تصور کی جگہ لے سکے، تجربوں یا ٹیکنالوجیوں کا ایک سلسلہ ہے اور یہ ٹیکنالوجی اب بھی جاری ہیں۔

مگر یہ خیال پوری طرح صحیح نہیں، بنیادی وجوہ اس سے کہیں زیادہ گہری ہیں، دنیا بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے، اور کھینے والا بھی نئی نسل کی طرح اس بڑھتے ہوئے پھیلاؤ کو محسوس کرتا ہے، اس نصف صدی میں بہت سے اور پستے نوٹ پھوٹ گئے ہیں۔ روایتی اقدار جو ماشرے کو بقا اور استحکام

بخشتی تھیں، اسی وقت تک کارآمد تھیں جب تک معاشرے کا ناک نقشتہ درست تھا، ناک نقشتہ پھیل پھیل کر یوں متزلزل ہو گیا ہے، جیسے پانی کی سطح پرتیل کے لہریں، قدیم معاشرے سے اس کا کوئی ربط نہیں کیونکہ قدیم معاشرہ باقی نہیں رہا، وہ اپنے آپ کو ایک نئے اور ہر لحاظ بدلتے ہوئے معاشرے میں گھرا ہوا دیکھتا ہے جس سے مربوط ہونا اس کے لیے لازم ہے اگر وہ بالکل

ہی کٹ کے رہ جانا نہیں چاہتا وہ پوری طرح اس کا شعور نہیں رکھتا مگر یہ بات اس کو معلوم ہو چکی ہے، کہ کچھ نسل نے اس کو کچھ نہیں دیا نئی دنیا میں کوئی مناسب تمام اس کو حاصل کرنا ہے، ماضی کی کئی چیزیں اس کو ایسا کرنے سے روکتی ہیں اور وہ ماضی مردہ باد کا نعرہ گاتا ہے۔ اس لیے نئی پود کا سب سے بڑا تقاضا بنیاد ہے، رسم و رواج کے خلاف، قوت اور اختیار کے خلاف، والدین اور پولیس کے خلاف، وہ قدیم انبیاء اور شعراء دونوں سے دور بھاگتا ہے بلکہ ہر اس چیز سے جو اسے ماضی کی یاد دلائے یہ جنگ کبھی کبھار ضدی اور غیر دفاعی ہو جاتی ہے اور پیکار کے نقطے آپس میں گڑھ ہو جاتے ہیں مگر خیر ایسا تو برحکام میں ہوتا ہے۔

اردو ادیب کو اپنے ماضی سے قطع تعلق کر کے کم سے کم ایک بڑی قربانی تو دینی پڑی ہے۔ وہ بیک جیش تمام الفاظ و تلمیحات اور روکایاتِ ظلم کے ذخیرے سے ہونے کا مصنف کو نازک اور کارآمد ترین آلات اظہار بن جاتا ہے، محروم ہو گیا ہے، لفظِ عرصہ پتلا آوازوں اور کیروں کا نام نہیں جو مٹ جانے کے بعد پھر پیدا کی جاسکیں، ان میں ہمارے پشیروں کی جذباتی وارداتیں اور نغیاتی... مشاہدات معجز ہوتے ہیں، ان میں سے ہر ایک، انسانی تجربے کے طیف میں ایک خط کا حکم رکھتا ہے، اگر طیف کا ایک خط گم ہو جائے تو ہم اس کی جگہ دوسرا خط نہیں یکپہنہ سکتے، اسی پہلے خط کو پھر سے دریافت کرنا پڑے گا۔ آج کے سمیٹنے والے کو اس وجہ سے نئی چیزوں کو نئے نام دینے ہیں اسے ان چیزوں کو جو پہلے معلوم و محسوس تھیں پھر سے جانا اور پہچاننا ہے، ماضی سے دست بردار ہو کر اس

نے اپنی تخلیق شخصیت پہ ایک بوجھ ڈال دیا ہے جس سے اس کی فنی مشکلات دوپہنڈ ہو گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس کو بیک وقت نازک ادسا کھڑا، واضح اور مضبوط، گو گو میں گرفتار اور ہزار معنوں میں مضطرب دیکھتے ہیں۔ لفظ جن سے اس نے پہلو تہی برقی تھی، اب اس سے پہلو چراتے ہیں۔ (سر) ڈینی سن روس نے جو اس بات سے واقف تھے کہ زندہ زبانوں میں تعلیمات اور حوالوں کا ایک ذخیرہ مخفی ہوتا ہے۔ جسے تعلیم یافتہ افراد اپنا کر اپنی تحریر و تقریر میں رنگ اور زور پیدا کرتے ہیں، چند سال پہلے ایک کتاب کی صورت میں انگریزی زبان کے پس منظر کا نقشہ کھینچا تھا، ادبی حوالوں کے زیر عنوان انہوں نے بائبل کے مستند ترجمے کا نیکسپر کا ادبچوں کے گیتوں کا تذکرہ کیا تھا اور انگریزی روایت کے تحت قومی تہوار معروف شخصیتوں کے القاب و خطابات اور مشہور اشتہارات گنائے تھے، حتیٰ کہ ایک جڑ بگھے بیٹے چلنے پر بھی لکھا تھا، آج سے پچاس برس پہلے، اسی اناڑ سے اردو کا ناک نقشہ کتنی آسانی سے بیان ہو سکتا تھا! اور آج یہ کام کتنا مشکل ہے!

اردو ادیب کو یہی مشکل درپیش نہیں، وہ دو زبانیں پڑھا اور بولتا ہے اور جب یہ دو زبانیں اردو ادب انگریزی کا سا وسیلہ اخلاق دکتی ہوں تو یہ خوب کتنی بڑی تخرابی بن جاتی ہے، علماء اور باہرین تسلیم تاریخ اور تجربے کی مدد سے کسی ایک ناقابل تردید دلائل پیش کر کے ارشاد کریں گے کہ دونوں زبانوں کی مہارت بہت بڑی نعمت ہے، بین الاقوامیت کے قائل یہ کہیں گے کہ ہر بزرگ و ذی زبان دو گونہ رحمت ہے، اس ملک کے لیے جس کی وہ زبان ہے، اور اس کے لیے

یہی جس نے اسے اختیار کیا ان کا ارشاد بجا ہے۔ کیونکہ ہر نئی زبان ذہن میں ایک نیا دریچہ کھول دیتی ہے اور کون ہے جو روشنی کو ہستہ نہیں کرتا، انسانوں کی اکثریت کے لیے اس کے اثرات خوشگوار ہوں گے مگر اتنیس کہ لکھنے والے کو اپنا دماغ ہی روشن نہیں کرنا کچھ کام بھی کرتا ہے، اظہار خیال اس کا فرض ہے اور اس پر مرہ یہ کہ ایک وقت میں ایک ہی زبان کے ذریعے، چاہے کتنی زبانوں

سے اس نے ذہنی تعامل کی ہو۔ ذہن تو اس کے پاس ایک ہی سے ایک
 دیکھ بھریے تو دوسرا سرخ بگڑتا ہے میں یہ دونوں رنگ آرام سے ایک دوسرے
 کے پہلو پہ پہلو اور ایک دوسرے سے جڑا نہیں رہ سکتے، وہ آپس میں گھل جلا
 کر ایک میسرے رنگ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جو ایک دیکھے کے پاس قدا
 تیا دہ سبز ہے اور دوسرے کے پاس ذرا زیادہ سرخ، مگر نہ تو کہیں پوری طرح
 سبز ہے اور نہ پوری طرح سرخ، یہ لطیف اور پیاسا روشنی اس کے لیے ہمیشہ
 نشاط بھی ہو سکتی ہے۔ اور باعث فزیبی، مگر اس ملی جلی روشنی کو سبز یا سرخ
 فلٹر میں سے اپنے اصلی رنگ میں گزرنے کا کتنا مشکل ہو گا، ایک لحاظ سے یہ کہا جاتا
 ہے کہ دو زبانوں اور اپنے دل کی بات آپ سے نہیں کہہ سکتا جب تک کہ دونوں
 زبانیں استعمال نہ کرے، مگر اس صورت میں بھی ایک وقت ہے، اس کا ذہن
 کسی واضح شکل میں ہمارے سامنے نہیں آتا بلکہ ذہن کی دو لہریں یکے بعد دیگرے
 پیہم پھرتی ڈوبتی دکھائی دیتی ہیں، اگر اس کو ایک زبان کا پابند کر دیا جائے
 اور پوری بات کہنے کی بھوری بھی ہو تو نرم واضح اور بے ربط و مہل قسم کا
 گفتگو سنتے میں آئے گی، اس کی سترے کی نیت میں آپ کو عجیب قسم کے غم و

پہنچ نظر آئیں گے اور ابا و اشکال کی کئی صورتیں ملیں گی اور سب سے بڑھ کر انگریزی
 ساخت کے جاپے و مٹکی اردو میں ملبوس دکھائی دیں گے جن کو دونوں زبانوں
 کے ماہرین ہی سمجھ سکیں گے، زبان ایک نانک اور لطیف آواز اظہار ہے جسے فن
 کار بڑی مہارت سے برتا ہے مگر یہ عقلی زبان معنی کے گرد طواف کرنے کے سوا
 کچھ نہیں کر سکتی اور گونگے کے اشاروں سے زیادہ قابل فہم نہیں ہوتی، لفظ اپنے
 معنوں کو ساتھ لے کے نہیں چلتے بلکہ محض دور سے ان کی طرف اشارہ کر کے برد
 جاتے ہیں، جب احساس شکست قوی ہو جاتا ہے، تو اردو کا ادیب اردو کو پھوٹ
 کے انگریزی میں لکھنے لگ جاتا ہے مگر فلٹر سبز ہو یا سرخ مسئلہ جوں کا توں رہتا ہے
 ہم پہلے کچھ لکھ چکے ہیں کہ ہمارا ادیب اپنے آپ کو ایک نئے معاشرے میں
 گھرا ہوا دیکھتا ہے، یہ معاشرہ اس کے فہم و بعیرت کی حدود سے بڑھ کر وسیع

اور پیچیدہ تو مچلا جاتا ہے، ایسا معاشرہ اس کے اسلاف کے تجربے اور مشاہدے سے ماورا ہے۔ اور اسی وسیع و عریض حقیقت سے اس کو موافقت پیدا کرنا ہے تاکہ تکیں اور استحکام حاصل ہو۔ جب تک یہ موافقت پوری نہیں ہوتی وہ بڑے پر جوش اضطراب کے ساتھ کسی زکسی طرز کی محفل بنا کے بیٹھے جائے، اس اضطراب کی وجہ سے اس زمانے کے اکثر ادیب ایک نہ ایک انجمن یا حلقے سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ اور ایک دوسرے کی تصانیف پر دیباچے اور پیش لفظ لکھتے رہتے ہیں۔ آج سے پہلے شاہد ہی کبھی ہمارے ادیبوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑنے محفلیں، انجمنیں اور حلقے بنانے کی ضرورت محسوس کی ہو۔ یہ ادارے کتنی ہی بخیہ گی اور خلوص سے کیوں نہ وجود میں آئے ہوں معاشرہ سازی کی جعلی اور

جذباتانہ گوششوں کا نتیجہ ہیں اور ادیب کو ان ادارگیوں اور سیاحتوں کی قیمت اپنے تخلیقی جوہر سے ادا کرنی پڑتی ہے۔ ان غیر واضح قسم کی حرکتوں سے اس کا مدعا یہ ہے زندگی کے کل کو پل اور پونہ بردن خانہ سے اس کا رابطہ قائم نہیں ہوا، اس کو درون تلذذ میں تلاش و تجسس سے کام لینا پڑتا ہے۔ مگر اس تلاش کے دوران میں زندگی کا کاروبار ملتوی ہوتا رہتا ہے اور جب تک کوئی زرخیز زمین ملے، زندگی کا رس خشک ہو جاتا ہے۔

پی. ای. این کی سترھویں سالانہ مجلس میں تقریر کرتے ہوئے آر تھر کیٹلرنے بتایا تھا کہ تو رگنیف کیسے لکھتا تھا۔ اپنے پیروں کو گرم پانی کی باٹھی میں ڈالے ہوتے وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھتا رہتا تھا۔ گرم پانی کی باٹھی کیٹلرنے کے نزدیک الہام یا تخلیق ہے۔ عمارت اور کھل کھڑکی سے مراد باہر کی دنیا تھی۔ جو فن کار کے لیے خام مواد کا کام دیتی ہے۔ کیٹلرنے یہ بھی کہا تھا کہ باہر کی دنیا ادیب کے دل میں ایک زبردست خواہش کو جنم دیتی ہے، یعنی یہ کہ وہ کھڑکی بند کر کے بیٹھ جائے اور اپنے تخلیقی سرچشمے پر اکتفا کرے مگر اس کے علاوہ بھی ایک خواہش پیدا ہو سکتی ہے۔ باہر کی مواد یا ڈاٹا کی بجائے اس کو باہر بھی کھینچ سکتی ہے تاکہ وہ گرم پانی سے اپنے پزیر کمال کر کھڑکی پر بھجک جائے۔

نام سے اردو ادیب کو بازار کے واقعات سمجھنے یعنی شایدہ اور مرکزیت پیدا کرنے کی ضرورت کچھ اس شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ اس کو اکثر و بیشتر کھرد کی پر جھکا دیکھ کر ہمیں حیرانی نہیں ہونی چاہیے۔ باہر منظر اس کے لیے اتنا دلخیز ہوتا ہے کہ وہ چھینے چلائے سے بھی باز نہیں رہ سکتا، وہ کہنے

کی میز پر واپس نہیں آتا اور گرم پانی پڑا پڑا اٹھٹھا ہوتا ہے۔ اس کے سامنے ایک نئی دنیا ابھرتی ہے۔ دیکھنے اور سمجھنے کے لئے بے شمار چیزیں ہیں اور سمجھانے کے لیے بے پناہ مسالہ ہے اس حالت میں اس عظیم فن پاروں کی توقع بے جا ہے اور یہ ایسے بہن جوٹ ہے کہ وہ اپنے پی گرم پانی میں ڈالے رکھے گا اور گلیوں بازاروں کے جھوم ہیں شامل نہیں ہوگا، آئیو اے فنکار سامعینوں کو اس کے یہاں مقصد کی بنیاد کی گئی اور آگ بڑھ کر دیکھنے اور مستقبل کو تلاش کرنے کی ہمت، چاہے اسلاف کی دعائیں اس کے ساتھ ہوں یا نہ ہوں اس کی تیز نظری، اضطراب آگاہی اور بے جگر می، نئی راموں پر چلنے کا عزم اور کچھ کھونے پانے سے اس کی بے نیازی یا دگار رہے گی ہم اس سے بڑا اقرار محسوس اس کو نہیں دے سکتے کہ اس کی مشکلات اور عجوبوں، تکلیفوں اور تعزیروں کو ہمیں تاکہ اس کی جدوجہد اور اس کے کارنامے کی بیش از پیش قدر کر سکیں۔ میں نے اس جگہ یہی کرنے کی کوشش کی ہے

پچھری عصمت چغتائی کے بارے میں

عصمت چغتائی کے افسانے میں ایک لڑکی دوسری کے متعلق کہتی ہے کہ "سیدہ موتی تھی تو کیا، کمزور تو وہ سے زیادہ ممتی بے چارہ سی، لوگ سمجھ دیکھتے ہیں یہ نہیں دیکھتے جی کیسا بروقت خواب رہتا ہے۔" جب میں نے عصمت کی کلیں اور چوٹیں ردو نول بمسومے ختم کر لیے اور چند ویساچے اور مضامین ان کے ماسٹرن اور معترضین نے ان پر ازہ تنقید و تعارف لکھے ہیں ان سے بہرہ یاب ہو چکا تو استعارہ کے رنگ میں یہ فقرہ پھر یاد آیا لوگ سمجھ دیکھتے ہیں یہ نہیں دیکھتے کہ جی کیسا بروقت خواب رہتا ہے۔

اس فقرے کے معانی کو کھینچ مان کر پھیلا لیجئے اور اس پر تھوڑا سا فلسفانہ رنگ پھر لیجئے، تو عصمت کے بعض کمالات اور نقادوں کی بعض کوتاہیوں کو بیان کر لیا جاسکتا ہے۔ اچھا خاصا جہان ہمتی آجاتا ہے جو حال فریبی کا ہے وہی حال کئی اور معروف اور متداول لیبلوں کا ہے جو مستعمل الفاظ اور عادات مستمرہ کی شکل میں قسم قسم کی اشیاء پر چپکے نظر آنے میں ذہنی کالت اور خوف اور بزدلی کے مادے ہم اکثر فیصلے لیبلوں ہی کو دیکھ کر صادر کر دیتے ہیں ان سے آگے نکل کر اصل چیز کو جانچنے اور تولنے کی سمت اپنے آپ میں نہیں پاتے، ماما اور عشق پر دل گردانی کا لیبل مت سے لگا ہوا ہے اس لئے جہاں ان کا ذکر آئے کہنے اور سننے والے دونوں ایک طوا اور ایک پاکیزہ رقت کے لیے پھل ہی سے تیار ہو بیٹھے ہیں جنسی مشاغل تحقیق کہ لہجے کی طرف سے جاتے ہیں چنانچہ ان کا بیان بغیر کراہت یا اخلاقی غیظ کے ہو تو لوگ برہم ہو جاتے ہیں بہن بھائیوں کا سپا یا جاننا چاہیے کہ پلگ محبت کا سب سے اونچا درجہ ہے لہذا بہن بھائی کے درمیان بجز اس جذبہ عالیہ کے

کسی اور تعلق کی گنجائش ناممکن یا کم از کم نامناسب ضرور سمجھی جاتی ہے، بھمت پختائی کے رہنما جس اندھا دھند ایسے ہی کیے جوتے ہیں تو ارباب ان کی بہترین انشا سے خروم رہ جاتا لیکن ان کی بھیرت اس سے کہیں زیادہ دور رس ہے، وہ لیبیلوں کے زرب میں نہیں آتیں اور جسم اور دل اور دماغ کی کسی کیفیتیں ایسی ہیں جن سے وہ ایکھے میں دوچار ہوتے نہیں گھبراتیں، ایسے انشا پر دات کا بغیر حوصلہ مشاہدہ، دقت نظر اور جرأت بیان کے گزارہ نہیں، اور یہ ادب کی خوش قسمتی ہے کہ بھمت کو تینوں نعمتیں میسر ہیں۔

برخلاف اس کے احساس عروجی کے ساتھ کہتا پڑتا ہے کہ اس جرأت اور دقت نظر سے عہمت کے نقادوں کو حقدہ واقف نہیں بلکہ لالی الحال ان کا ذکر جانے دیجئے جن کو عہمت کی تقریروں میں اپنے اغلاق اور ادب دونوں کی تباہی نظر آتی ہے وہ تو ان لوگوں میں سے ہیں جن کے لیبیل گوئد سے چپکے ہوئے نہیں، میٹوں سے جٹے ہوئے ہیں، جنہوں نے ذہنوں میں ایک موٹی موٹی ٹیکرلا وال جہواں بنا رکھی ہے کہ ان چیزوں کا ذکر حلال ہے ان کا حرام ہے۔ ناممکن کا ذکر ہم مقرر کر چکے ہیں کہ فحش ہے، محرم کا ذکر معاملہ بند کا ہے یعنی جائز ہے۔ حرام کا بچہ فطرت کو منظور ہے تو ہوا کر سے، ہمارے ادیب کو منظور نہیں۔ اور یہ

فطرت کا مطالعہ؛ محض ایک ڈھونگ! آوارہ مزاجوں کا طرز آوارگی! یہیں بچپن میں مطالعہ پر کوئی مجبور نہ کر سکا تو اب کسی کی کیا مجال ہے ہم جب کھلونوں سے دل بہلاتے تھے اب بھی کھلونوں سے دل بہلاؤں گے ایسے لوگوں سے اس وقت بحث نہیں کیونکہ ہے

وہ وہاں ہیں جہاں سے ان کو بھی

کوئی ان کی خبر نہیں آتی

شکایت ان سے ہے۔۔۔ اور انہوں کی شکایت سے بیگانوں کی سی نہیں جو عہمت پختائی کے قدر دان اور ملا سہ ہیں، ان کے معنایں کو پڑھ کر روح میں ایک بالیدگی محسوس کرتے ہیں جس سے دل میں انگلیں پیدا ہوتی ہیں، اور نئی نئی مایاں کھلتی

ہیں، مگر ہے کہ وہ بھی ہر چہرہ لیبوں ہی کے چکر میں بچنس جاتے ہیں افسوس
 کہ عصمت مرد نہیں اور افسوس کہ لیبوں میں سے سب سے بڑا اور گمراہ کن لیب
 عورت ہے مرد ذات کے قرنوں کے خرابوں اور محرومیوں سے چپکا ہوا عورت
 و لقریب ہے مکار ہے منف نازک ہے ایک سو ہے کمزور ہے کم عقل
 ہے، مجھوہ افسانہ ہے جہاں آپ نے عورت کا نام لیا، ان میں سے دو چار
 گھڑے گھڑائے معنی زمین اگل کے سامنے رکھ دیتا ہے بچا نچہ اسی قریب
 میں آکر ایک ہونا ساوندین ویسا پھولیں فرماتے ہیں

عصمت کے افسانے گویا عورت کے
 دل کی طرح پھینچ اور دشوار گزار نظر
 آتے ہیں، میں شاعری نہیں کر سکا اور

اگر اس بات میں شاعر کی ہے تو اسی
 جہاں تک شاعری کو سچی بات
 میں دخل ہوتا ہے مجھے یہ افسانے اس
 جو ہر سے متشابہ معلوم ہوتے ہیں جو
 عورت میں ہے، اس کی روح میں
 ہے، اس کے دل میں ہے، اس کے
 ظاہر میں ہے، اس کے باطن میں ہے

اب نہ معلوم اس نوجوان نقاد کے تصور نے عورت کا لیب کس قسم کی چیر
 پر لگا رکھا ہے، یہ معلوم ہوتا تو وہ جو ہر بھی کہتا جو یہ قول ان کے عصمت کے
 افسانوں میں ہے، لیکن ان کے رنگین تصورات و مفروضات کے خلوت کدہ میں
 ہیں کیونکہ باریا ہی ہو سکتی ہے اور کوئی ایسی ڈکشنری بھی نہیں جس میں عورت کے
 وہ معنی مل جائیں جو اس تنقید کے میں کام کر رہے ہیں، ویسا ہے کا قطع ہے :-

عصمت کا نام آتے ہی مرد افسانہ لگا
 کھورے پٹتے گتے ہیں بشر مندہ

ہو رہے ہیں، آپ ہی آپ خفیف
ہوتے جا رہے ہیں، یہ دیکھا چھ بھی اسی
خفت کو مٹانے کا ایک نتیجہ ہے۔

لیجئے، عورت کے ایک دوسرے تصور سے پھر میرے عزیز کا ناقدا نظر
برہک گئی، دکھانے تو چلے تھے عصمت کے افسانوں کے جوہر لکھیں آخر میں کہہ
گئے کہ یہ عورت ناقص العقل جانور ہے ڈاکٹر جانسن کے کتے کی طرح کر، دو
ٹانگوں کے بل کھڑا ہو جائے تو تعجب و تحسین ہی کا نہیں بلکہ ہم انسانوں رہینی
مردوں کے لیے شرم و عیاشی کا موجب ہے۔

ایک اور مقتدر دستخط کار و بیباچہ نویس نے بھی سلوم ہوتا ہے انشاء
پروازوں کے ریورٹ میں نر اور مادہ الگ الگ کر رکھے ہیں عصمت کے متعلق فرماتے
ہیں کہ اپنی جنس کے اعتبار سے اردو میں کم و بیش انہیں وہی مرتبہ حاصل ہے
جو ایک زمانہ میں اردو ادب میں جارج ایلیٹ کو نصیب ہوا، گویا ادب بھی کوئی
ٹینس کا ٹورنامنٹ ہے جس میں عورتوں اور مردوں کے پیچ پیچہ علیحدہ ہوتے ہیں۔
جارج ایلیٹ کا رتبہ مسلم لیکن یوں اس کا نام لے دینے سے ٹک ہی ملا اور بوجھلا
تو کوئی کیا مرے گا، اب یہ امر ایک علیحدہ بحث کا محتاج ہے کہ کیا کوئی ماہر بلاستیا
ایسا ہے، خارجی اور شگامی اور اتفاقی نہیں بلکہ داخلی اور جلی اور بنیادی جو انشاء
پرواز عورتوں کے ادب کو انشاء پرواز مردوں کے ادب سے ممیز کرتا ہے اور
اگر ہے تو وہ کیا ہے، ان سوالوں کا جواب کچھ بھی ہو، بہر حال اس نوع کا برگز
نہیں کہ اس کی بنا پر سفینین کو جنس کے اعتبار سے الگ الگ دو قطاروں میں
کھڑا کر دیا جائے۔

اسی طرح جہاں کسی افسانے میں خاندان، گھر بار، اعز و اقربا کا ذکر آگیا کسی
متمول رقم کے لئے کسی مجلس بڑی پر اٹھ ڈالا، جو شیلے اور درو مندول رکھنے والے نکالا
نے مسرت کا نعرہ لگایا اور ٹکلیں بجائیں کہ سماج کی خبر لیا رہی ہے، اب غور سے
دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ عصمت کے اچھے انسانوں میں ماحول محض اسی لئے مثال

فنانہ ہے کہ اس کے بغیر چارہ نہیں کر دار کہیں تو رہیں گے کسی سے تو ملیں گے ،
افسانہ کا جو ڈھانچہ ہے اس کا کوئی گوشت پرست تو ہو گا ، پھر اس کے بغیر بھی
چارہ نہیں کہہ سکتے ماحول جن معاشی اصولوں کی وجہ سے پیدا ہوا خود وہ اصول جاننے
اور پرکھنے جا رہے ہیں ۔

عصمت کے بعض مضامین ایسے ہیں جن پر شبہ ہوتا ہے کہ سماج کو سامنے
دکھ کر لکھے گئے ہیں۔ لیکن انہوں نے کہاں بھی سماج کو اپنا نشانہ بنانے کی کوشش
کی ہے اپنی کا ہاتھ جوڑنا ہی پڑا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ سماج کی جن باتوں سے
عصمت کا یہی برا ہوتا ہے ان پر عصمت نے غور ضرور کیا ہو گا۔ لیکن تلخی کام و دہن
ابھی ان کے رگ و پے تک نہیں پہنچی اور جب تک یہ نصیب نہ ہو سماجی کمزوریوں
پر اخباروں میں مضامین لکھ بیٹھے پائیں۔ ان کوفن کی لپیٹ میں لانے کا خیال
چھوڑ دینا چاہیے۔ عصمت کوئی الحقیقت شغف سماج سے نہیں شخصیتوں بلکہ
اشخاص سے ہے۔ ان کے جوش اور جوش سے تو جسم پھٹنے لگتا ہے اور
دوران خون تیز ہو جاتا ہے۔ یا اعصاب ہیں الجھاؤ اور طبیعت میں تناؤ پیدا
ہو جاتا ہے۔ اگر عصمت اور سماج کا باہم ذکر اس نقطہ نظر سے لیا جائے کہ ان کی
نئی انتشار ان کا سار جہان اور ان کا سا اسلوب انتخاب ایک خاص زمانے
اور خاص سماجی کشش کی پیداوار میں تو یہ بحث مناسب ہی نہیں بلکہ نتیجہ خیز
بھی ہوگی۔ یہ کون نہیں جانتا کہ اردو میں عصمت جیسے ادیب اس صدی کے
ادائل میں بھی منقود تھے۔ اور اس سے پہلے کا تو ذکر ہی کیا یہ ایک امر واقعہ
ہے اور اس میں کسی دلچسپ بحث کے مضمون ہیں جن کی توضیح یقیناً خیال انگیز ہوگی۔

لیکن حالات سے اثر پذیر ہونا اور حالات کا مفسر ہونا دو مختلف چیزیں ہیں
اس بات کا مطالعہ کرنا ہو کہ بعض سماجی حالات نے کیوں کر عصمت جیسی انشا پر واز
کو پیدا کیا تو شوق سے کیجئے لیکن اس شوق میں خواہ مخواہ سماج کی باطنی عصمت
کے سر نہ منڈھ رہے۔ عیب درخت سے گرا تو یقیناً کشش ثقل ہی کی وجہ سے
گرا لیکن اس کا گزاری کے حل میں عیب کا نام نہیں نہیں رکھا جاسکتا نہ عیب

کو سب سمجھنے یا کچھ اس کی ہنسی ہوتی ہے۔

عصمت کے دونوں مجبوسوں میں ڈرامے، افسانے اور ایک تینوں قسم کی پیریں شامل ہیں۔ ان میں ڈرامے سب سے کمزور ہیں اور اس کی کئی وجوہ ہیں۔ اول تو یہ کہ ڈرامے کی ٹیکنیک عصمت کے قابو میں نہیں آئی۔ یا یہ کہے گا بھی تک ان کو اس پر قدرت حاصل نہیں ہوئی۔ پلاٹ کو مناظر میں تقسیم کرتی ہیں۔ تو ناپ کے تین چھ سے نہیں کترتیں۔ روایتوں سے پیریں ہار کر عصمت کے بنا ڈالتی ہے۔ چنانچہ پھر سٹر بنا بھاڑ کھائی دیتے ہیں، کوئی سین جب بھیلتا ہے سٹے پیر ہی ختم ہو جاتا ہے جیسے گاڑی دواسٹیشنوں کے درمیان کہیں بھی رک جائے۔ پھر اس قدر نادرک مزاجی سے کیا حاصل؟ کیریز سبھی دیا ہی سہی پیٹ بھر جائے تو کیا مضائقہ ہے ڈرامے کو ڈرامہ سمجھے کہانی سمجھ کر پڑھے اور فرض کرے کہ کہانی ڈرامے کی سنک دی جائے تو ایک بھرا پنہ اور مزور کنا پڑتا ہے۔ اور وہ یہ کہ قصہ اول سے آخر تک مع اپنے لٹریچر فراز کے تمام ترا فراز قصہ ہی کے اقوال و افعال کے

ذریعے بیان کرنا پڑتا ہے۔ مصنف سے آزاد ہی پھر چھن جاتی ہے کہ ساتھ کر دیا کے جذبات، خیالات کو اپنی زبان سے واضح کرتا جائے۔ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ پابندی عصمت کے بس کا رنگ نہیں۔ افسانہ ہو تو عصمت کو کسی اور یاتیس کے واضح کرنے میں وقت پیش نہیں آتی، انہیں افسانہ نویس کے اس حق سے فائدہ اٹھانا خوب آتا ہے کہ جب جا بجا کیریکٹر سے کچھ کہلوایا، جب چاہا خود کچھ کہہ لیا۔ لیکن جب اپنی زبان بند ہو اور سب کیریکٹر وہی ہی کو کھیلنا ہو تو عصمت تاسر رہ جاتی ہے۔ اور ان مجبوروں میں گھر کر ان کا مطلب اکثر فوت ہو جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ کمالے جس پھیسے ہو جاتے ہیں اور ان میں اس کو اپنی کا نام و نشان تک نظر نہیں آتا۔ جو ان کے افسانوں کے مکالموں میں اکثر پایا جاتا ہے۔ رپے کے پیسے میں کچھ قدر ہستی اور پھر تیل اپن ہے، بعض اوقات تو مکالمہ کچھ لیا

یہ جوڑ ہو جاتا ہے کہ یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ واقعہ کیا پیش آیا، پناہچہ ان کا ڈرامہ انتخاب کے واقعات بہتیرا اس کے کہ سمجھ میں آسکیں بہت کچھ، وضاحت کے محتاج ہیں۔ یہ نقص ان کے افسانہ تاریکی میں بھی رہ گیا ہے، ڈرامہ نویس کو تو اجازت نہیں کہ وہ سیدھے سادے ہم سے بات کرے باقی رہے کہ کبھی سو وہ آپس میں الجھن سلجھی گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ (ڈرامہ جو ٹھہرا) مگر ہمارے پلے کچھ نہیں پڑنے دیتے ڈرامہ نویس عدم تعاون پر مجبور ہے اعدا کیر کھیڑوں کو تعاون کا لیتے نہیں، ان حالات میں ڈرامہ کامیاب ہو تو کیونکر! پھر ان ڈراموں میں رجباں نکس مری سمجھ میں آئے ہیں، عصمت کی شمشیر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ چہرہ ٹاپ پیش کریں۔ یعنی ہر شخص ایک طبقہ کا نمائندہ بن کر سامنے آئے گا اس کے لیے اشخاص کا ادراک نہیں گروہ کا احساس چاہیے، اور عصمت اور گروہ میں وہ انہماک نہیں جو اشخاص میں ہے تو پھر نہ معلوم انہوں نے یہ مصیبت کیوں مول لی۔

ملا وہ ان سب باتوں کے ان ڈراموں کی کمزوری کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان میں عصمت نے جس قسم کے لوگوں کا نقشہ کھینچنا چاہا ہے ان سے وہ جڈا گھٹل مل نہیں سکتیں، یعنی وہ مردہ الحال لوگ جو کہلاتے تسلیم یافتہ ہیں مگر جن کی ترکیب میں تسلیم کم اور یافت زیادہ ہوتی ہے جو خوش مالی ہے جس کا تعلق اور اپنے دماغ و روغن کے بل پر اپنے مشاغل اور اپنی گفتگو میں بے فکر اپن اور چمک پیدا کر لیتے ہیں جس کی بدولت وہ سمارٹ سیٹ کہلاتے ہیں، اور کم نصیب لوگ کچھ ان سے نفرت کچھ ان پر رشک کرتے ہیں، معلوم ہوتا ہے اس طبقے کی بعض حالتوں اور خود فریبوں پر عصمت کو غصہ آتا ہے جس کو وہ بیان کرنا چاہتی ہیں، اور اس کی عورتوں پر محمود اسازشک جس کو وہ خود بھی نہیں جانتیں لیکن یہ بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کھیلے طبقہ کو انہوں نے دور ہی سے دیکھا ہے، قریب آنے کا موقع نہیں ملا کہ اس کے نقوش اور خدو خال واضح دکھائی دیتے ہیں، اور اس کے خوب درشت اور ظاہر و باطن کا وہ اچھی طرح موازنہ

کر سکتیں، چنانچہ جب عصمت اس قسم کے کیرکیمٹروں یا ان کے ماحول کی تصور کھینچتی ہیں تو نوک پلک کبھی درست نہیں ہوتی، پھری، کانٹے اور غنوں (یعنی چہ؟) ٹینس ڈرائنگ روم، ڈز سیٹ، الم علم اس قسم کی اصل اور خیالی چیزیں جمع کر کے ایک کباڑ خانہ سبنا لیتی ہیں۔ گو ان کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ اس ساز و سامان سے میرا نہ ٹھاٹھ باننا صحا جائے اور کچھ اس یقین کے ساتھ اسباب بنتی جاتی ہیں کہ ان کی سادگی پر شک آتا ہے۔

کیرکیمٹروں کی ٹنگ اور حرکتیں بھی اس قسم کی ہوتی ہیں کہ جب مصنف ہنسائے تو دنا آتا ہے اور سلاٹے تو ہنسی آتی ہے، ایک تصنع تو ان میں دہ ہے جس کا مصنف کو علم ہے مگر ایک تصنع ان میں ایسا بھی آجاتا ہے جس سے مصنف خود بے خبر ہے۔ اور جو اصل اس کے اپنے تصنع کا کس ہے یعنی کیرکیمٹروں کی سطحیت کو تو بے نقاب کرنا ہی تھا اپنی سطحیت بھی ساتھ بے نقاب ہو رہی ہے ایگزٹوں سے پہلے کیرکیمٹروں خود ایکٹ کرتے ہیں۔ بات بات پر اپنی زندگی میں تھیٹر کی سی سچویشن (SITUATION) پیدا کر لیتے ہیں، اور کچھ اس طرح ہنستے ہیں کہ ان کے توفیر خود ڈرامہ نویس کے حسن مذاق پر شبہ ہونے لگتا ہے، سانپ میں عصمت نے چند ایسی عورتیں دکھانے کی کوشش کی ہے جو بزم مصنف "شکاری عورتیں" ہیں یعنی وہ رنگین تر یا پلتر سے مردوں کے جذبات کے ساتھ کھیلتی ہیں، جیسے بلی چوہے سے کھیلتی ہے، لیکن ان کی تھکی ہوئی باتیں سننے اور ان کی اکتا دینے والی خوش فہمیوں کا تا شاکیئے، تو اس نتیجے پر پہنچے گا کہ کسی چوہے کا شکار تو یہ شاید کریں لیکن اس سے زیادہ کی امید بے چاریوں سے نام ہے، معلوم ہوتا ہے، چند کم عقل چھوکریاں ہیں جنہوں نے کوئی ارزاں قسم کا خوش پوش امریکن فلم دیکھ لیا ہے، اور گھڑیوں دو ایک جگہ صوفے کرسیاں بچھا کر اس کی نقل آمارتے کی کوشش کر رہی ہیں، قیاس اس امکان کو بھی رد نہیں کرتا کہ وہ فلم خود مصنف ہی نے دیکھا ہو، اور اس کی ارزاں کا احساس اس کو نہ ہوا ہو، ایک مکالمہ تو اس ڈرامے میں ایسا ہے کہ اس نے ساخوہ میلوڈرامٹک

اسلوب کی دھبے کشتِ زعفران سے کم نہیں، رفیعہ کی شگنیِ غفار سے ہونچکی
یے لیکن اب وہ اس سے نہیں ہنر سے شادی کرے گی، غفار کو اس سانحہ
جانکاہ کا علم یوں ہوتا ہے۔

رفیعہ - نہیں میں تمہاری زندگی برباد نہیں کروں گی۔
غفار - (جوش سے) برباد نہیں، تم میری زندگی آباد کرو گی۔
رفیعہ - نہیں، میں تمہیں نکل جاؤں گی، سانپ جو بھڑھی۔
غفار - (شدتِ جوش سے) سانپ کس کیسی باتیں کرتی ہو، تم مجھے نکل بھی
جاؤ تو میرے لیے عین راحت ہوگی۔

خالدہ (رفیعہ کی پہلی) گرا اب تو رفیعہ نے فیصلہ کر لیا۔

غفار - (چونک کر) کیا فیصلہ کر لیا؟

خالدہ - یہی کہ تمہیں وہ نہ بھلے گی۔

رفیعہ - ہاں اب تو میں ہنر کو نکلوں گی۔

(ہنر پریشان ہو کر مسکراتا ہے)

غفار - (سمجھ کر) تو... تمہارا یہ مطلب ہے کہ تم مجھے نکلا رہی ہو؟

رفیعہ - ادنیہ۔ اب تم نے بھی غلط شاعری شروع کر دی۔

غفار - (پریشانی سے انگلیاں چمکا کر) ادھر تم مجھے دھوکا دیتے رہے

ظفر۔ غفار بچپن سے یہ فتنہ تمہارے میں کا، تھا شکر کرو کہ میرے ہی

اد پرستی اور تم نے گئے، تم دیکھنا میری وہ گت بنائے گی کہ تو بہ ہی بھلی۔

غفار - کاش میری ہی وہ دگت بن جاتی۔

خالدہ - مگر غفار سوچو تو...

غفار - ایک عرصہ دراز سے بندگوں نے یہ بات طے کر دی تھی۔

خالدہ - یہ ٹھیک ہے کہ آباؤ حق تو تمہارا ہے پر یہاں تو رفیعہ کا معاملہ آتا ہے

وہ ایک ضدی ہے!

خدا کرے تم خوش رہو۔

عصمت اس سین کو کاک سین سمجھ کر نکلتی تو شاید ڈرامہ نویسوں میں ان کا نام رہ جاتا لیکن افسوس کہ ان کے ہنٹوں پر بھے مسکراہٹ نظر نہیں آئی اور یہ مسنت بنانے والی باتیں کھے اور خود اسے سننے کی کوئی بات نظر نہ آئے تو افسوس ہوتا ہے۔

کچھ ایسا ہی بے تکاپن ڈراموں کے علاوہ ان افسانوں میں بھی پایا جاتا ہے جن میں عصمت نے ان جدید ناچکیلی لوگوں کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ ایسے افسانوں میں نہ پلاٹ کی چولیں ہی ٹھیک بیٹھتی ہیں نہ کیریکٹر کا ناک نقشہ ہی درست ہوتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی میگزینوں میں سے کہانیوں کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر جوڑے ہیں اور پیشہ ور افسانہ نویسوں کی طرح رسمی روانہ کارنگ دے کر بھرت موٹ ایک بات بنالی ہے، پیکرز اور شادی پڑھ کر دل پر یہی اثر ہوتا ہے اور میرا بچہ میں تو بڑا بڑا شاہ کے آرمز اینڈ دی مین کے پہلے سین پر کچھ افسانوں سے باقی صاف کیا ہے کہ شبہ کی گنجائش نہیں۔

یہ سیلیا اور نیلی اور ازخون اور پارٹیوں کی دنیا نہیں، اس میں وہ اجنبی برتی ہیں۔ اس کی تہ کو وہ جب پہنچیں گی تب دیکھا جائے گا، فی الحال تو ان کی دنیا میں ہے جو ان کے بہتر افسانوں یعنی جوانی، ڈائن، بیڑا، بھول بھلیاں، ساس، بیار اور تل میں پائی جاتی ہے، یہ وہ دنیا ہے جس میں عورتیں پر دے کے پیچھے سے فوٹے چست کرتی ہیں جس میں زینوں پر اور دیواروں کی آڑ میں آنکھ مچولی کھیل جاتی ہے جس میں نولڈ کی پلانگٹریوں پر پٹاریاں رکھی ہیں بہتر اینوں کی جوان بہوئیں کمر لچکا کر چلتی ہیں۔ المضر لڑکیاں گویہ بنتی پھرتی ہیں۔ اور تلیاں میں ڈبکیاں لگاتی ہیں۔ جس میں گھنگلے بچے ماں کے پیٹ سے پھپکی کی طرح پھپکے ہوئے ہیں چہرہ چہرہ نہ مارتے ہیں اس کے گرد پیش میں وہ اس بے تکلفی اور احساس ہم آہنگی کے ساتھ گوتی پھرتی ہیں کہ اسی کا ایک جزو معلوم ہوتی ہیں چنانچہ وہ کس سہولت کے ساتھ دوہی چارفظ کی بچ کر اس دنیا کو کاغذ پر لے آتی ہیں عصمت

کے بہترین افسانوں میں آپ کو نقصا اور ماحول کے لمبے لمبے پڑکھنے اور سکرپشن
(DESCRIPTION) کہیں نہیں ملیں گے جو بات ہے وہ ایسے پتے کی ہے
کہ اختصار سے تشنگی اور خلا کی شکایت پیدا نہیں ہوتی، اس کے شروع کے
فقروے ہیں۔

سورن کچھ ایسے زاویے پر پہنچ گیا کہ معلوم ہوتا تھا چھ سات سو بج
ہیں جو تاک تاک کر بڑھیا کے گھر میں ہی روکھنی پہنچانے پر تلے
ہوئے ہیں۔ تین دفعہ کھٹولی دھوپ کے رت سے گھسیٹی
اور اسے لو پھر پیروں پر دھوپ اور جو ذرا ادنگھنے کی گوشش
کی تو دھادیم کھٹوں کی آواز چھت پر سے آئی نہ خدا غارت
کرے پیاری بیٹیوں کو نکاس نئے بے جیا بہو کو کو سا جو نکل
کے چھو کر دن کے سنگ چھت پر آنکھ مچھلی اور کبھی اڑا رہی
تھی دنیا میں ایسی بہو نہیں ہوں تو کوئی سما ہے کو بیٹے۔
لے لہو پیر ہوئی اور لاڈلہ پڑھ گیس کر بٹھے پر، ذرا ذرا سے
پھو کرے اور چھو کر یوں کا دل آپہنچا، پھر کیا نہال ہے جو کوئی آنکھ
جو چکا کے :-

انتنے خورے سے الفاظ میں اس سے زیادہ کوئی کیا رنگ بھرے گا
اور رنگ بھی لیے کہ نہ ضرورت سے زیادہ شوخ اور نہ ضرورت سے زیادہ ہلک
یہی حال نیراز کے ایک ٹکڑے کا ہے۔

چھوٹے تال سے گزر کر پیا پیر سے
ہوتے ہوئے دنوں نمنے سے بیوپار
شہر کی سڑک پر چلنے لگے، یہ کم بخت
جاڑا تو اب کے ایسا دانت پسیر کہ
پھیپے پڑا تھا کہ نرم ہونے کا نام
ہی :- لیتا تھا گرمی تو جیسے تیسے

کت جاتی ہے، رچا ہو بتنا زیادہ پیاد
 پر سے سٹنٹ۔ اپانی جتنا چاہو پی لو
 نہ کپڑوں کی ضرورت نہ کچھ، رشو کو

تو دعوتی کا بھی سر پہن منت نہ ہوتا
 پڑتا تھا سیاہ سوت کا ڈو جا جو اس
 کے پکھری جیسے پیٹ پر سے پھیل
 کر لوہے کی ہڈیوں پر منہ سے نکلا
 جاتا تھا ضرورت سے زیادہ تھا منہ سے
 تلیا میں ڈبکی لگائی، کناروں پر اکڑوں،
 بیٹ گئے اور لو کے چھپا لوں سے سوکھ
 گئے۔

اور اس سے بھی مختصر یہ کہ۔

اندھیری سنان رانیں جیسے تیسے
 کھٹے گلے، بھیڑ کی روٹیاں اور ٹوٹا بھر
 مٹھا حاصل کرنے کے لئے سارے گھر
 کو دن بھر تیرے میرے کھیت میں
 بنے بچے گزرتی تیرا گھاس پھیل لاتی
 بھینسوں کو بھی دن لگے اور دودھ چرانا
 بھی شروع کر دیا، کون دیکھتا بھاتا۔
 کابھی ہاؤس میں ہی ایک تو ضبط ہو گئی
 دوسری بیاہنے کا نام ہی نہ رہتی تھی۔ عین
 جب بوڑھی ہو جاتی ہے تو پتہ بھی نہیں
 پلتا۔ نہ اس کی کمر بھکے نہ بال کھوڑی
 ہوں۔

ان افسانوں میں پانچ پانچ چھ چھ فقرے ایک ساتھ پائے جاتے ہیں، اس لیے ان کو یہاں نقل بھی کر لیا اور نہ اس قسم کے ایک ایک دو فقرے کے کانسے تو کسی جگہ ہیں۔

یہ دنیا بیشتر مغلسوں اور اکھڑوں کی دنیا ہے، بہر حال امیروں، نقاست پسندوں اور تراشیدہ لوگوں کی دنیا نہیں، اس میں ناسے ہیں غلاطیس ہیں اور غلاطیس کا حال عصمت کتنی بدم ہو کر اور برہمی کے مزے لے کر بیان کرتا ہے (جیسا کہ میں ہیں، بد زبانیاں میں، ماتہ پامیاں ہیں، بیماریاں ہیں۔ ڈھیروں بچے ہیں، لیکن پھر بھی ان میں زندگی کا ایک خطیے جو دبائے نہیں دیتا، انگلیں ابھرتی ہیں، جوانی لپنے کر شمس دکھاتی ہے۔ ذہن میں شرارتیں چٹکیاں لیتی ہیں۔ اور نفس انسانی کا پہلوان زور آزما کر تلبے جن افسانوں کو میں نے بحث کے لیے منتخب کیا ہے ان میں آپ کو بہت بڑی بلندی یا بہت پر معنی گہرائی نظر نہ آئے گی، عمیق امن، خاموش آسودگی یا مسرت عالیہ کہیں نہ ملے گی نہ وہ حزن و ملال ہی ملے گا جو کہہ کی طرح دل پر جم جاتا ہے اس میں ٹریسیڈی کی گوشش ہے نہ کامیڈی کی لیکن انسانی خون آپ کو رگوں میں دوڑتا نظر آئے گا۔ اسی طرح دوڑتا ہوا جیسے پراہی ندی کا پانی دوڑتا ہے، لبالب اور ابلتا ہوا اڈر کر آتا ہوا اور سنہ چیرتا ہوا۔

ان افسانوں کا مومنوع کیا ہے اگلے وقتوں کے لوگ ان افسانوں کو (اگر ایسے افسانے انہیں ہاتھ نہیں آتے تو) عشقیہ افسانے یا، عشقیہ افسانے ہی سمجھ سکتے ہیں، لیکن عشق کے معنی اس قدر پچیل پچکے ہیں کہ عشقیہ ہر وہاں کا کام نہ چلے گا، لیلے مجنوں کا عشق، صوفیوں کا عشق، مزوں کا عشق، ظہور کا عشق، امر و پرستوں کا عشق، سبھی طرح کے عشق ہمارے ہاں پائے جاتے ہیں اور ہر ایک کا مزاج جدا ہے، اس لیے عشق کے لفظ سے نہ جانے کہنے والے کا مفہوم کیا ہو، اور سننے والے کیا سمجھ بیٹھیں: جنسی بھوک پر مجھے کوئی خاص اعتراض نہیں، لیکن محض اس نے بھی بات نہیں بنتی، کیونکہ جنسی بھوک تو دانستہ بااثر سن سے لے کر کتہ کتہ ایک سمجھ کو لگتا ہے، عصمت کے افسانوں میں جو جذبہ مرد و عورت کو

ایک دوسرے کی طرف کھینچتا ہے اس کی کسی قدر اور تخصیص کرنی چاہیے۔ ایک بات تو ظاہر ہے اور وہ یہ کہ اس جذبے میں شاعرانہ لحاظاتوں کی رنگینی نہیں پائی جاتی، اس کا رد مان سے کوئی تعلق نہیں، عصمت کے کسی انسانے میں مردیہ یا عورت کے حسن کا کبھی ذکر نہیں آتا۔ لیونکو جو جذبہ ان کے پیش نظر ہے اس کی ترکیب کے لیے حسن کی ضرورت نہیں رہے، محض خون کی تازگی اور حرارت اور جسم کی جھلکا دینے والی گرمی سے پیدا ہوتا ہے اور جب انسان کے جسم میں یہ آگ لگتی ہے تو وہ کبھی اس کو بجھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ کیونکہ اس آگ سے کوئی پھپھیاہ نسیاتی معنی پیدا نہیں ہوتے، صرف تند و تیز شراب کا سا نشہ روئیں، روئیں میں سرایت کر جاتا ہے۔ دل کی کیفیتیں جسم ہی سے رنگ پکڑتی ہیں، اور جو کرب یا تسکین بھی نصیب ہوتی ہے اس کا مظہر اول سے آخر تک جسم ہی رہتا ہے، عصمت ہی کے فترے ہیں کہ شہر کے تندرست لوگوں کا گھر مڑی لہسی پیرٹ بیویوں سے اجڑ جاتا ہے اور جب تک بدن پست ہے اور کمال چکنے میں سب کچھ سینہ اور پھر کچھ نہیں رہتا اور پھر وہ بیمار تھا تو کیا، دل تو مردہ نہ ہوا تھا پھر اس میں بیوی کا کیا تصور، وہ نوجوان تھی، اور رگوں میں خون دوڑ رہا تھا، مگر وہ کبھی بھوت موٹ کو ہی اس سے کچھ کہتا تو وہ ایٹھ جاتی، مطلب یہ کہ جسم مردہ ہو تو یہاں دل کی زندگی سے کام نہیں چلتا، جسم کا شعور عصمت کے افسانوں میں اس قدر نایاں ہے کہ پڑھنے والا جسم کے متواتر ذکر سے خود مصفت کی طرح ہیبت زدہ اور مسحور ہو جاتا ہے، صلو د بلا پتلا آئے دن کامرینس تھا، اور پھر عجب جوانی آئی تو خون کی حدت سے اس کا چہرہ سانولا ہو گیا، اور پتے سوکھے زرد ہاتھ سخت گھٹلی دار، سبوط شانوں کی طرح جھلے ہونے باوجود ڈھک گئے۔۔۔ یکم جان کے اوپر کے ہونٹ پر ہلکی ہلکی مونچھیں تھیں، اور پنڈلیاں سفید اور چکنی۔۔۔ ربو کا گھٹا ہوا منہ جس میں جسم اور کس ہوئی چھوٹی سی توند اور بڑے بڑے پھولے ہونٹ جو ہمیشہ نمی میں ڈوبے رہتے ہیں۔۔۔ بیمار کا موٹا پڑوسی

اور جس کے جڑے پگی کو طرح چلتے ہیں۔ رانی کے چکنے چکنے یا گال اور وہ دیسی جگہ سائل۔۔۔ بشراتی کھینے پر کتنے بال تھے، گھنے پینے میں ڈوبے ہوئے اور اس کے کتے ہوئے ڈٹروں اور رانوں کی پھلیاں کیسے اچلتی تھیں، اور وہ اس کی پھولٹ چھوٹی مونچھیں اور چکنی جیسی موٹی انگلیاں۔۔۔ بہاؤ کے بڑے بڑے بالوں دار ہاتھ اور اس کا کافی سینہ۔۔۔ جن کی کھوٹے جین ناک۔۔۔ عزم جسم سے کہیں چھٹکارا نہیں اور یہ بھی مزدوری نہیں کہ دل سبحانے والا جسم یا آلات جسم اپنے تناسب میں رعنائیاں لئے ہوئے یا پاکیزگی اور نقاست کے لیے داد غالب، نہیں، بلکہ محض جسم اپنی گرمی سے پریم اور متناہسی خون کی حرارت سے سننا تا جو، یہ جسم بھی ایک آفت ہے، یہ ہم پر اپنی خوابشوں کے ساتھ اندھے شہنشاہ کی طرح یا بقول عصمت کے یوان باطن کی طرح سوار بے بی نوا ریش پینکارتی ہیں، اور جسم جسم کو پکارا تلبہ تو ان انسانوں کے کیر کیر آہیں نہیں بھرتے، عزیزیں نہیں کاتے شعر نہیں کھتے، بلکہ بغیر پون دھرا کے اس پر اسرار آذان کے پھپھے ہو جیتے ہیں۔ اور وہ جلد ہرے جائے بغیر سوچے بوجھے اس طرح چل دیتے ہیں، مائیں گھڑکتی ہیں، ساکیں اچلتی ہیں، بے پروا لوگ عبادے جانتے ہیں، افلاس کا سڑاؤ سے دم گھٹتا ہے لیکن اس کے قدم نہیں رکھتے یا عصمت کے الفاظ میں یوں کہتے کہ "جو اتی غربت کو نہیں دیکھتی، بن بلائے ٹوٹ پڑتی ہے، اور بے کہے چل دیتی ہے، پیٹ بھر دوٹی نہ ملی تو کیا سہاؤ نے خواب تو کوئی روک نہ سکا، جمپر اور شلو کے نہیں جڑے تو کیا جسم سے پیر روک لئے، وہ تو بڑھتا ہی گیا۔ اور یہاں غربت اور شلوکوں کی جگہ کچھ ہی رکھ لیجئے، جسم کے پیر نہیں رکھتے۔"

اور جب اس جسم میں ہنمان آتا ہے اور پیٹ پر گن کجور سے لرنگنے، لگتے ہیں :-
 اور دل و دماغ پر اندھی کیفیتیں طاری ہو جاتی ہیں تو یہ عجیب عجیب ہیرا بندھ لیتا ہے لیکن جسم اپنا بلہ جسم ہی سے لیتا ہے چنانچہ اس کش کش کے زیر اثر علم اور گداز اور ملاکت نہیں پیدا ہوتی کیر کیر تخیل کے جسم میں لپٹ کر غنودہ نہیں ہو جاتے

بلکہ ان میں گرفت قسم کا العرین اور درشت قسم کی شرارتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو پھیرتے ہیں، دق کرتے ہیں، کچلپاک کھٹولیوں پر پٹخ دیتے ہیں، ہنگے جسم پر بدھیاں ڈال دیتے ہیں، ہونٹوں کو چکھیلوں سے مل دیتے ہیں، پیر سے دیر دباتے ہیں، تھڑر سید کرتے ہیں، بال پیر کر کے دیتے ہیں، دھولیں مارتے ہیں، جھاکس کس کر گاتے ہیں، گھیٹے میں چھوڑتے ہیں، یعنی دل پر کچھ ہی گند سے جسم کا گرفت کبھی ڈھیل ہونے نہیں پاتی، اور یہ جذبہ شروع سے آخر تک اپنے کھردے پن اور بدویت کی شان کو نہیں چھوڑتا۔

تو عصمت کے افسانوں کا موضوع جسم ہے، نہیں یہ کہنا تو درست نہ ہو گا، کیونکہ یہ افسانے بلاشبہ ادب کے دائرے میں شامل ہیں، اور ادب (یا کسی بھی آرٹ) کا موضوع جسم نہیں ہو سکتا، یعنی وہ جسم جو علم الاعضا کی کتابوں میں پلا جاتا ہے، جسم نہ پانتا ہے، نہ پھول، نہ سحر، نہ آرٹ کو تو ذہنی کیفیات سے سروکار ہے، کیونکہ آرٹ کا منصب ذہنی الحادات کا بیان اور بالآخر ان کیفیات کی تربیت ہے، یہ سب چیزیں تو محض محرکات ہیں، ان میں نہ سہی دوسری سہی اس سے گزر جائے کہ کس چیز کا نام لیا ہے، یہ دیکھنے کو ذکر کیا ہو رہا ہے، اگر ذہنی کیفیات کا ذیل نہ ہو تو حضور مفسور نہیں ایک کیمرا ہے، ادب ادب نہیں نقل نہیں سوسے ادب جسم کا دتلے بھکار علم الاعضا کا ماہر اور شارح تو بن سکتا ہے ادب پیدا نہیں کر سکتا۔

جو کچھ میں ادب پر بیان کر چکا ہوں اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ عصمت کی جنسی کشش کی ماہیت واضح کر دی جائے، اور یہ سمجھ لیا جائے کہ اس کے محرکات اور مظاہر کیا ہیں، لیکن بحیثیت آرٹ کے عصمت کو پکھنے کے لئے بالآخر یہ دیکھنا پڑے گا کہ جنسی بھوک سے پیدا ہونے والے جذبات و احساسات کو انہوں نے کس سطح پر لیا ہے، اپنی مخلوق کو ان سے جو بھیجنی بخشی ہے، وہ کس سطح پر ہے، اور روح کے لیل و نہار میں ان کا کیا مقام ہے، ان سوالوں کا جواب میں بھلاؤ اور پر ایک دعوے چکا ہوں، اس سے زیادہ تفصیل شاید سو و مند نہ ہو ایسی

باتوں کو جہاں تک ہو سکے بجٹ سے نملص دلا کر مذاق کے سپرد کر دینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

لیکن ایک بات ظاہر ہے کہ جو کرلٹ عصمت کی طرح اپنی مخلوق کو یلٹا جوتا۔
کے کنارے تک لے جاتا ہے وہ تو ایک دھار پر پلٹا ہے چنانچہ ان کے مشہور افسانہ
الحافہ میں میں سمجھتا ہوں۔ ان کا قدم آخر اکھڑ ہی گیا ان کی لغزش یہ نہیں کہ اس
میں انہوں نے بعض سماجی ممتوعات کا ذکر کیا ہے۔ سماج اعداد کی شریعتیں
کی ایک دوسرے کے متوازی ہوتی ہیں، میلے کے ڈھیر سے لے کر کھکشاں
تک سبھی چیزیں احساسات کی محرک ہو سکتی ہیں۔ اور جو چیز محرک ہو سکتی ہے وہ
ادب کے اٹاک میں شامل ہے آپ جس زمین سے چاہیں شعر کہیں۔ اس سے
کیا سزمن کہ زمین کون سی ہے عزمن تو اس سے ہے کہ شعر کیا ہے اس پہ
اس پر متعرض ہونے کی ضرورت نہیں کہ انہوں نے ویسی باتوں کا ذکر کیوں کیا،
لیکن اس کہانی کی قیمت گھٹ یوں جاتی ہے کہ اس کا مرکز نقل (یا عسکری صاحب
کی اصطلاح میں اس کا "ٹاکیڈن نقطہ") کوئی دل کا معاملہ نہیں، بلکہ ایک جسمانی حرکت
ہے۔ بڑوح میں یہ خیال بڑھتا ہے کہ گلیم جان کی نسیات کو بے نقاب کریں گے پھر اُسید
بندھتی ہے کہ جس رڈ کی کہانی یہ کہانی سنائی جا رہی ہے، اس کے جذبات میں
دل چسپی ہوگی لیکن ان دونوں سے ہٹ کر کہانی آخر میں ایک اور ہی سمت اختیار کر
لیتی ہے اور اپنی نظروں امانڈتے ہوئے لحاظ پر گاڑ دیتی ہے چنانچہ پڑھنے والا
بے چارہ اپنے آپ کو اس قسم کے لوگوں میں شامل پاتا ہے جو مثلاً جانور عدل کے
مداشتے کا تاثر کرنے کے لئے سرکل کے کنارے اکڑوں بیٹھ جاتے ہیں۔

عصمت نے کچھ تھوڑے سے ایکچ بھی سمجھے ہیں جن میں سے ایک کبھی
ڈیپٹی، وقت نظر اور عصمت کی مخصوص کنایہ بازی سے غالی نہیں، کیسی پھر بھی ان
میں کوئی لغزش کے رتبے کو نہیں پہنچتا۔ اور صحیح تر یہ ہے کہ اردو ادب میں اس
اسلوب نظر کی مثال نہیں ملتی جو عصمت نے اس ایکچ میں اختیار کیا ہے۔ ان چند
صفحات میں عصمت کچھ اس طرح اپنے پردوں کو پھیلا کر اڑتی ہیں کہ دیکھتے ہی دیکھتے

اپنے بلند ترین مقام پر پہنچ جاتی ہیں، میں ایک بہن کی حیثیت سے نہیں عورت بن کر
 ... میں بہن ہو کر نہیں انسان بن کر کہتی ہوں، انہیں اس عندہ خواہی کی ضرورت
 بھی یوں پیش آئی کہ اپنی دیانت پر تو ایمان تھا پڑھتے والوں کی دیانت پر ایمان
 نہ تھا لیکن چند ہی فقروں میں وہ اپنے علوم اور اپنی جرأت سے پڑھتے والوں
 کی بہت بلند کر دیتی ہیں، آرٹسٹ کسی کا بھائی نہیں ہوتا، کسی کی بہن نہیں ہوتی،
 احساسات اور اقدار کی دنیا میں ایسے رشتے تو بعض اتفاقات کا نام ہیں، چند
 ایبل ہونے معلوم کن چیزوں پر لگے ہونے ہیں، سیل پشاکر دیکھئے، تو نیتوں اور
 دہریوں کا استمان ہوگا، اور ذہن بلا پائے گا، عصمت نے کس قدر خود اعتمادی
 کے ساتھ ایبلوں کو ہٹا کر پھینک دیا ہے، اور جو زندگی میں کبھی لاش تھا اس
 کی لاش کو بھی زندہ کر دکھایا ہے،

مضمون تم کرنے سے پہلے دو ایک باتیں عصمت کی زبان کے متعلق سمجھی کہنا
 چاہتا ہوں کیونکہ ان کے لغوی مذاق میں بھی ہمارے لیے ایک ہدایت ہے عصمت
 کی انشا پر نارس اور غریب کا اثر یہ نسبت اور ایچوں کے بہت کم بلکہ نہ ہونے کے
 برابر ہے۔ اور یہ بے نیازی الفاظ تک ہی محدود نہیں بلکہ ترکیبوں اور فقروں
 کی ساخت میں بھی پائی جاتی ہے، اس طرح ان کی تحریر بجز ایک آدھ لا حاصل سے
 نقالی کے انگریزی ترکیب اور انگریزی اسالیب خیال سے بھی پاک ہے، اس
 زمانہ کے اکثر انشا پردازوں کو یہ وجہ اپنی تعلیم یا ماحول کے اس سے معز نہیں کہ ان
 کے کلام میں وقتاً فوقتاً انگریزی کے سڑ بھی سنائی دے یا بیٹن۔ اردو میں مندرجہ
 تعلیمات روز بروز بڑھتی جاتی ہیں، چنانچہ ماہ مصنفوں میں ہیں اور کچھ نہیں تو ترجمہ
 شدہ ترکیبوں کی گھٹیاں تو اکثر مل جاتی ہیں، عصمت انگریزی کے خیر و شر دونوں سے
 متبر ہیں، یہ تو بتانا ممکن ہے کہ وہ کیا لطف سے جو ان کی تحریر میں پیدا ہو جاتا اور
 اس پاکلامنی کی وجہ سے پیدا ہوا کہین اتنا ضرور ہے کہ اس کی پڑت وہ ٹیٹھ
 اندو کے بہت سے ایسے الفاظ کام میں لے آئی ہیں جو آج تک پردے سے
 باہر نہ نکلے تھے، اور جن کو اب انہوں نے نئے نئے مطالب کے اظہار کے قابل

بنا ویلیجے۔ گویا۔ ادبِ اردو انشا کو ایک نئی جوانی نصیب ہوئی۔ ادھر خانہ نشین
 الفاظ کو تازہ ہوا میں سانس لینے کا موقع ملا، عصمت کے فغروں میں بول چال
 کی سی لطافت اور۔ روانی ہے اور جہوں کا زیر و بم روزمرہ کا سا پھرتیلانہ زیر
 و بم ہے۔ اس لیے ان کے فغروں کا سانس کبھی نہیں چھوٹتا، اور ان میں نشیاً
 ثقافت اور تکلف صغیر نہیں آنے پاتے، مختصر یہ کہ الفاظ کے انتخاب اور فغروں
 کی ساخت ان دونوں رستوں سے وہ انشا کی زبان کو زندگی کے قریب تر سے
 آئی ہے۔ جس کے لیے ہمیں ان کا ممنون ہونا چاہیے۔ اس ایک کام میں عصمت
 کے ملاوہ چند اور قابل زبان انشا پرداز بھی شریک ہیں (اور سچ تو یہ ہے کہ یہ
 کام اہل زبان کے سوا کسی دوسرے کے لیے کچھ ایسا آسان بھی نہیں) لیکن عصمت
 کے احسان کا بوجھ کچھ اس وجہ سے ہکا نہیں ہو جاتا۔

عصمت کوئی قدر اور تعریف نہیں۔ لہذا ادب میں جو امتیاز ان کو حاصل
 ہے۔ اس سے منکر ہونا کج بینی اور نخل سے کم نہ ہو گا، اور یہ مضمون بذاتِ خود
 اس امتیاز کا اعتراف ہے لیکن بھول نہ جانا چاہئے کہ ہمارا افسانہ ابھی سنِ رشد
 یا سنِ بلوغ کو نہیں پہنچا۔ آج کل جب کہ نظروں کو دوستِ نصیب ہو رہی ہے۔
 اور دنیا بھر کا ادب کتاب کی طرح ہمارے سامنے کھلا پڑا ہے، اردو ادب
 کے قدردانوں میں یہ حوصلہ پیدا کرنا چاہئے کہ وہ دقیقاً وقتاً لپنے ادب کا دنیا
 کے بہترین ادب سے مقابلہ کرتے رہیں، تاکہ تناسب کا احساس کفہ نہ ہوتے
 پائے، منقاسی تعصبات کی حقیقت واضح ہوتی ہے اور دل میں انگسہ پیدا ہو
 ہلے سے ادبِ بدید کے پاتھروں کو چکنے چکنے ہیں لیکن اس میں ابھی بڑے بڑے
 پھول نہیں گئے، آتمی حد بندی کر لینے کے بعد ہمیں اس بات کو تسلیم کرنے میں ذرا
 بھی تامل نہ ہونا چاہئے، کہ عصمت کی شخصیت اردو ادب کے لئے باعثِ فخر ہے،
 انہوں نے بعض ایسی پرائی فغیوں میں سنے ڈال دیئے ہیں، کہ جب تک وہ کھڑی تھیں
 کچھ رستے آنکھوں سے اوجھل تھے، اس کا نامہ کے لئے اردو خوانوں ہی کو نہیں
 بلکہ اردو کے ادیبوں کو بھی ان کا ممنون ہونا چاہیے۔

ہیبت ناک افسانے

ہیبت ناک افسانے ہکا پکٹ جب یہاں پہنچا میں گھر پر موجود نہ تھا۔ میری عدم موجودگی میں چند انگریز اجاب نے جو کتابوں اور اشیائے خوردنی کے معاملے میں ہر قسم کی بے تکلفی کو جائز سمجھتے ہیں ریکیٹ کھول دیا۔ یہ دوست اردو بالکل نہیں جانتے، بجز چند لکھے کلموں کے جو غصے یا سنج کی حالت میں وقتاً فوقتاً میری زبان سے نکل جاتے ہیں اور جو بار بار سننے کی وجہ سے انہیں یاد ہو گئے ہیں۔ اردو تقریر میں ان کی قابلیت یہیں تک محدود ہے، تحریر میں اخبار انقلاب کا نام پہچان لیتے ہیں، وہ بھی اگر حفظ ظفری میں لکھا تھا ہو چنانچہ جب واپس پہنچا تو ہر ایک نے محض کتاب کی وضع قطع دیکھ کر اپنی رائے قائم کر رکھی تھی، سرورقی پر جو کھوپری کی تصویر تھی ہوئی ہے اس سے ایک صاحب نے اندازہ لگایا کہ کتاب۔

میں بھی کبھی کسی کا سر پر غرور تھا

سے متعلق ہے، ایشیا کے ادیب (عمر خیام، گوتم بدھ وغیرہ) اکثر اس قسم کے خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں، ایک دوسرے صاحب سمجھے کہ فنِ جراحی کے متعلق کوئی تعریف ہے، ایک بولے جادو کی کتاب مسوم ہوئی ہے، (ہندوستان کے مداروں کا یہاں بڑا شہرہ ہے) ایک خاتون نے

کتاب کی مریخ زنگت دیکھ کر بالشوکی شبہات قائم کرے۔

میں نے کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھا، گوہ سب کی سب کہانیاں ہیں پہلے انگریزی میں پڑھ چکا ہوں، اور ان میں سے اکثر تراجم کتابی صورت

میں شائع ہونے سے پہلے خود امتیاز سے سن چکا ہوں۔ وہ مختلف قسم کی دفریبا
جو کچھ کبھی کسی تصنیف کو مسلسل پڑھنے پر مجبور کر سکتی ہیں سب کی سب یہاں
یکجا تھیں۔ کتابت ایسی شگفتہ کہ نظر کو ذرا الجھن نہ ہو، تحریر میں وہ سلاست
اور روانی کہ طبیعت پر کوئی بوجھ نہ پڑے، اور پھر امتیاز کے نام میں وہ جادو جس
سے ہندوستان یا انگلستان میں کہیں بھی مفریہ ہو۔

یہ کتاب تیرہ ہیناک افسانوں کا مجموعہ ہے جن کے مصنف کا مدعا یہ تھا
کہ پڑھنے والوں کے حیم پر روزگئے کھڑے ہو جائیں ہر افسانے میں درد و کرب
خوف و دہشت یا پھر رگ و ابتلا کی ایسی خوبی تصویر کھینچی جائے کہ بدن
پر ایک سنتی سی طاسی کی جائے، ایڈگرا میں پو کے پڑھتے والے ایسے افسانوں
سے بخوبی آشنا ہوں گے، حق تو یہ ہے کہ پورا اس فن کا استاقتار اور یہ
جو آج کل کسی صنف ادب کی کثرت فرانس میں نظر آئی ہے عجیب نہیں کہ اس
کا بیشتر حصہ توہی کی بدلت ہو۔ کیونکہ فرانس کی ادبیات پر پورا کا اثر مسلم
ہے اور ادب کا شاید ہی کوئی ایسا شعبہ ہو جہاں کسی نہ کسی صورت میں اس نے
پناہ لگ نہ پھیر رکھا ہو۔ پریس میں ایک خاص تھیٹر اسی بات کے لیے وقت
ہے کہ اس میں دہشت انگیز کھیل دکھائے جائیں، اس کہیں نے اس قسم کے
ڈراموں کا اچھا ناٹا مجموعہ تہیا کر رکھا ہے، تھیٹر کی ڈیورٹی میں چیدہ چیدہ
ڈراموں کے مشہور مناظر کی تصاویر آویزاں ہیں کہیں کوئی بارہ نصیب موت
کی آخری انگڑائیاں سے لڑے چہرہ تانا ہوا ہے، اور آنکھیں باہر پھول پڑتی
ہیں کہیں کوئی سفاک کسی حینہ کی آنکھیں نکال رہا ہے، بائیں ہاتھ سے گردن
دبوچے ہوئے ہے، دائیں ہاتھ میں خون آلود چھری ہے اور لڑک کی آنکھوں سے
لہو کی دھاریں بہ رہی ہیں، کھیل کو ہیبت ناک بنانے کے لیے جو جو تدابیر
بھی ذہن میں آسکتی ہیں، ان سب پر عمل کیا جاتا ہے، ایک بڑا اپنی شکل،
ثبات اپنی آواز اور اپنی حرکات کے لیے ایک خوف سے کا پتی ہوئی
فضا پیدا کر سکتے ہیں، پردہ اٹھنے سے پہلے ہی گھنٹی نہیں بجائی جاتی

بلکہ چراغِ گل کے کڑی کے تختے پر دستک دی جاتی ہے۔ اس سے بریت اور کبھی زیادہ ہو جاتی ہے۔

اس بات میں بحث کی گنجائش نہیں کہ درد و کرب یا خوف و درمشت کے مناظر یا افسانوں کے ایک خاص قسم کی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ یہ فقرہ بظاہر خود اپنی تردید کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ جس کو درد کہا جائے اس سے خوشی کیسے جاہل ہوگی۔ لیکن یہ ہمارے متبادل الفاظ کی کم مائیگی کا نتیجہ ہے اصل نیاں کو جو اس کو فقرہ سے ظاہر کیا گیا ہے۔ الفاظ کے اس گور کھدھندے سے باہر نکالنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اسی وجہ سے بعض ماہرین نفسیات دکن درد، کرب وغیرہ اس قسم کے الفاظ کے استعمال سے بجنب رہتے ہیں کیونکہ وہ کب کے اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ بہت سے ایسے کیفیات جن کو ہم عام زبان میں درد، دکن وغیرہ سے موسوم کرتے ہیں، بسا اوقات اس قدر تسکین بخش ہوتی ہیں کہ لوگ ان کے اصول کے لیے جدوجہد کرتے ہیں اور ان میں اپنی مسرت ڈھونڈ لیتے ہیں، یقیناً آپ کے پڑھوس میں کسی ایسی صورت میں ہوں گی جو اس تلاش میں رہتی ہیں کہ کسی نہ کسی کی موت کی خبر سن پائیں اور بین اور وادیا میں شامل ہو کر آنسو بہا بہا کر اپنی تینا پوری کریں، جرم اور اموات کی گمناؤنی سے گمناؤنی تنفیلات کی اشاعت یورپ اور امریکہ کے کسی اخبارات کی مقبولیت کا باعث ہے لوگوں کو ان کے پڑھنے میں ایک خاص لطف آتا ہے۔ اسی طرح اگر آپ یا میں بعض درمشت ناک افسانوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں تو ہمیں ان کا اعتراف کرتے ہوئے محض اس وجہ سے تامل نہ ہونا چاہیے کہ ہمیں لوگ اس کو ہماری طینت کے لئے نقص پر محمول نہ کریں۔ مجھے یقین ہے کہ قدیم زمانے میں رومن قوم کے جوہم اپنے اکھاڑوں میں پہلوانوں کی لڑائیاں اسی جذبے کے ماتحت دیکھنے آئے تھے، ہر کشتی ایک نہ ایک حریف کی موت پر جا کر ختم ہوتی تھی، اور کشتی خون کا یہ نظارہ ہزار ہا لوگوں کو خوشی کے مارے دیوانہ بنا دیا کرتا تھا، ہماری

تہذیب اس تباہ کنی کے متحمل نہیں لیکن افسانوں اور ڈراموں سے بطف اندوز ہونا اب بھی ہمارے بس میں ہے۔ اور اگر ہم اس جذبے کو فن کی کمیابی سے کشید کر کے لمحے بھر کو اپنے اعصاب میں ایک کیف انگیز تھر تھرا ہٹ پیدا کر لیتے ہیں تو کم از کم میں تو کسی طرح بھی نام نہاں نہیں۔ آپ اپنے دل کو ٹول لیجئے۔

اعصاب میں ایک تھر تھرا ہٹ! بس یہی ان افسانوں کا مقصد ہے اور جس کامیابی جس خوبی اور جس فن کے ساتھ اس کتاب کے مصنف نے اس مقصد تک تکمیل پاہلی ہے اس کی تعریف اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ امتیاز جیسے ذی مطالبہ اہل فن کو اس کے ترجمے کی خواہش ہوئی۔ ان لوگوں کے سامنے جو اردو ادب کے مشاہیر سے واقف ہیں اس سے زیادہ قابلِ وقت ضمانت نہیں پیش کی جاسکتی۔ مصنف کی سب سے بڑی خوبی خود ترجمہ کرنے کتاب کے دیباچے میں واضح کہی ہے۔

موسولیل پناہ تریا سلیس عبارت
استمال کرتے ہیں جس کی پختگی اور
روانی پڑھنے میں نینلم کا سا لطیف
دیتی ہے۔ ایک فقرہ یا لفظ بھی ضرورت
ہے زیادہ یا کم نہیں ہوتا۔ مختلف
پیزوں کے بیان میں تناسب کی سمجھ
بے حد تیز ہے۔ چنانچہ ان کی ہر مکمل
کہاں ایک نفس اور سانس
سفرے ترشے ترشے میرے
کی طرح دلکش معلوم ہوتی ہے۔

یہ اختصار دہشت انگیز افسانوں کی ایک نثری صفت معلوم ہوتی ہے، اس کے بغیر ان میں وہ تیزی نہیں رہتی جس کے سنسنی پیدا کی جا

کے اردو پھر یہ اختصار بہرہنگ میں شامل حال رہتا ہے۔ ورنہ افانے یا ڈرائے کی کامیابی میں نمایاں طور پر فرق پڑتا ہے۔ اس کی وجہ میں کبھی ٹھیکے طور پر تجزیہ نہیں سکا۔ لیکن اس کی حقیقت کے متعلق میرے دل میں کوئی شبہ نہیں پیرس کے جس تھیٹر کا میں نے ذکر کیا ہے وہاں اکثر کھیل صرف ایک ایکٹ کے ہوتے ہیں۔ اور نوڈ تھیٹر میں بہت سے پھوٹا سا لیسے چند دن ہوئے ہیں نے لندن میں ایک ایسی قسم کا کھیل دیکھا جو ہیرا دا بھول کے ایک ناول سے مرتب کیا گیا ہے۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ اس کھیل کے لیے بھی لندن کا ایک بہت سے پھوٹا سا تھیٹر منتخب کیا گیا۔ اس تھیٹر کا نام نیشنل تھیٹر یا پھوٹا تھیٹر ہے۔

باقی رہا امتیاز کا ترجمہ۔ میں حیران ہوں کہ اس مختصر سے تبصرے میں اس موضوع کے متعلق کیا کہوں اور کیا کسی اور وقت پر اٹھا رکھوں۔ آج کل اردو میں تراجم کثرت سے شائع ہو رہے ہیں اور ضرورت ہے کہ کوئی صاحب فہم ان کے متعلق ایک بیسٹ تنقیدی مضمون سپرد قلم کر دیں تاکہ "پترا اور تائیس" اور "منزب اور سائیس اور حذرا اور لیسٹ" ایسی تصانیف کی ادبی حیثیت کو جانچنے کے لیے ایک معیار قرار ہو جائے۔ میں ایسی بحث سے گریز کرتا ہوں۔ خصوصاً اس وقت جب کہ میرے زیر نظر صرف بہت ناک افانے ہے اور میرا قلم بہت اس کی خدمت میں مصروف ہے۔

یہ کہنا کہ امتیاز صاحب انگریزی جانتے ہیں۔ اس وقت تک بے معنی فقرہ نہ بہتا تاکہ کہ میں اس کی مزید تشریح نہ کروں۔ آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی جانتا ہوں کہ گدھا کب کب کہتے ہیں کس انگریز کے لیے اس لفظ کے معنی سکھانا لینا کچھ مشکل نہیں۔ جانور کی تصویر دکھا دیجئے اور نام بتا دیجئے اور نام بتا دیجئے۔ قصہ ختم ہو گیا لیکن اس لفظ کے ساتھ آپ گدھے سے لے کر خیریت تک بوشمر و لوب، فلسفہ و مذہب، رسم و عادات، مواد و روزمرہ کی ایک تاریخ والہانہ ہے۔ اس کو منتقل کرنے کے لیے ایک علم چاہیے اور پھر اس کے لیے بصیرت، ذہانت، مذاق اور مطالعے کی ضرورت

تھے۔ امتیاز کو خدائے یہ سب خوبیاں عطا کی ہیں اور ہندوستان کی نوشی
 قہمتی تھے کہ انہوں نے اپنی ان قوتوں کو مطالعہ اسناد اور علم و ادب
 کی تہیں کسے لئے وقف کر رکھا ہے ہاں وہ انگریزی جانتے ہیں اس
 لیے جب کہیں ان کا کوئی دلدادہ اپنی عقیدت کی دہشت ان کے نام کے ساتھ
 ملے گا دیتا ہے تو مجھے غصہ آتا ہے۔

ان کی اردو پرکھتے کیلئے ہندوستان میں مجھ سے بہتر جہاں نفاذ ہو جو
 ہیں۔ اس کے علاوہ میں امتیاز کے نیاز مندوں میں سے ہوں مجھے سنبھل کر تعلیم
 اٹھانا چاہیے۔ مبادا تارین میرے جذبات کی تو تفریق کریں مگر سیرت تنقید کو
 ممنوع اظہار نیاز مند سمجھ کر پس پشت ڈال دیں اس لیے بہتر یہی ہو گا کہ
 اس کتاب کے ایک دو صفحے آپ اور میں مل کر پڑھیں۔

شام پڑھی تھی۔ غیر سڑک کے کنارے مذاق کے پاس کھڑا ہو گیا اور ادھر
 ادھر دیکھنے لگا کہ کوئی کونا کھڑا نظر آئے تو وہاں پڑکرات بھر کرے۔ اور
 کوٹ سمجھ لویا جو کچھ سمجھ بوا جب بڑا سا اس کے پاس تھا۔ اسی میں گھس گیا۔ لاشی کے
 سر سے پر ایک گھڑی سی بانہ جو کر کندھے پر اٹھا رکھی تھی۔ تہیے کی بندہ اسے سر کے
 نیچے لٹکایا۔ لیکن سے جو چور ہو رہا تھا۔ بھوکا تھا پڑ رہا اور نیلے آسمان پر
 تاروں کو اچھو۔ المک کر کے ابھرتے ہوئے دیکھنے لگا۔

سڑک کے دونوں طرف جنگلی بیابان پڑا تھا پڑوں پر چڑیاں میندیں
 چپ چاپ تھیں مدور بہت فاصلے پر گاؤں ایک بہت بڑا سیاہ دھبہ سا دکھائی
 دے رہا تھا۔ یہاں سکون اور نائے میں لیٹے لیٹے غریب بٹھے کا دل
 بھر آیا۔

اسے کچھ معلوم نہ تھا۔ میرے ماں باپ کون تھے، لاڈلے کو ثواب
 کمانے کے لئے کسی زمیندار نے لے لیا تھا، اسی کے ہاں پروان چڑھا تھا۔
 بچہ ہی سا تھا تو وہاں سے نکل بھاگا۔ ادھر ادھر اس نکر میں پھرتے لگا کہ کہیں
 کچھ کام مل جائے جس سے رومیوں کا سہارا ہو سکے، بڑی کشش زندگی گزرتی

رہی ہے۔ دکھوں کے سوا جینے کا کوئی مزاج دیکھنا تھا۔ جاڑوں کی لمبا ہسی
 راتیں چلیوں کی دیواروں تلے پردے پر کساٹ دی تھیں۔ سوال کے لیے ہاتھ پھیلا نے
 کی ذات اعلیٰ تھی بچا ہوا تھا کہ مر جائے۔ ایسی نیند سوسے کہ پھر کبھی آنکھ نہ
 کھل سکے، جتنے لوگوں سے اب تک واسطہ پڑا تھا، بے درد تھے، شکی تھے
 سب سے بڑی مہینیت۔ یہ تھی کہ معلوم ہوتا تھا، ہر ایک اس سے ڈرتا ہے پیکے
 دیکھ پاتے تو بھاگ جاتے کتے اس کو پتھر ڈوں میں دیکھ کر بھونکنے لگتے۔
 پتھر بھی کبھی کسی کا برا نہ چاہتا تھا، ریدھی سادی اور نیک طبیعت پائی
 تھی، جسے مہینوں نے مردہ بنا دیا تھا۔

یہ وہ زبان ہے جو قلعے میں پیدا ہوئی اور جو برسوں تک اہل زبان
 کے لیے باعث فخر و ناز رہی، شمال ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقے کو یہ زبان
 دین تاتھ، سرشار، دانت اور امیر، نذیر اسد اللہ محمد حسین آزاد سے ورثہ
 میں ملی، اور اسی فزالتے کے سکوں سے جنہیں خود اہل زبان، محض ممکن
 کی طرح اپنے ہاتھوں ہی میں مل کر خوش ہو لیتے ہیں، اب لاہور کا ادیب
 زانس اور انگلستان کا متاع ادب خرید کر ہندوستان میں منتقل کر رہا
 ہے۔ اس قدیم دولت سے ادب جدید کے بازار میں اپنی ساکھ قائم رکھنا صرف
 امتیاز ہی کا کام تھا۔

اب ایک اور صحنے کو پرے مٹے جو دہلی اور کھنڈوں سے بے نیاز ہے
 بلکہ جاکر پرائی وینس کے بزرگوں کو اپنی جدت سے برم کر دے گا۔
 اس روز میں بہت دیر تک کام کرتا رہتا تھا اتنی دیر تک کہ آخر کار
 جب میں نے میز پرست نظریں اٹھائیں تو دیکھتا ہوں کہ شفق شام سے میرا مطالعہ
 کا کردار لہ ناز بن رہا ہے۔ فدا دیر تک میں بے حس و حرکت بیٹھا رہا، دماغ
 پکسل کی وہ کیفیت لہاری تھی جو کسی بڑی ذہنی محنت کا نتیجہ ہوتی ہے بے
 تعلق نظروں سے اور عمر اور عمر بھرتا رہا، مدد سبب شہنشاہی میں ہر پیر و صندلی و صندلی
 اور بے وضع نظر آ رہی تھی، اگر کچھ روشنی تھی تو وہ من گھڑیوں پر جہاں سوز بھرتے

ہوئے سورج کی آخری شعاعیں میز آئینہ اور تصویر پر سے منعکس ہو کر روشن
 کے دھبے ڈال ہی تھیں کتابوں کی الماری پر ایک انسانی کھوپڑی رکھی تھی۔
 اس پر شعاعیں مزور خاص قوت سے منعکس ہو کر پڑ رہی ہوں گی کیونکہ میں
 نے نظریں اٹھائیں تو وہ مجھے ایسے روشن طور پر نظر آئی کہ گال کی ہڈی سے لے
 کر ہڑے کے زبردست زانے تک ہر حصہ بخوبی واضح تھا، شام کا دھندلا
 بڑی سرعت سے گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اور ہر چیز کو جیسے نکلے جا رہا تھا۔ اس
 وقت مجھے ایسا معلوم ہوا کہ رفتہ رفتہ مگر قطعی طور پر اس سر میں زندگی کی چمک کا
 چمک اٹھی ہے۔ وہ گوشت پوست سے منڈھا گیا ہے۔ دانتوں پر ہونٹ مرک
 آئے ہیں۔ ملتوں میں آنکھیں جڑی گئی ہیں۔ بہت جلد کسی انوکھے سحر سے مجھے ایسا
 نظر آنے لگا کہ میرے سامنے تاریکی میں گیا ایک سر معلق ہے اور میری طرف تک رہا
 ہے۔

وہ سر جس ہونٹوں سے مجھے گور رہا تھا۔ اور اس کے چہرے پر استہزا
 کا ایک متم تھا۔ کون اس قسم کا گریز یا تصور نہ تھا جو انسان کا تخیل پیدا کر
 کر لیتے۔ یہ چہرہ واقعی حقیقی چیز معلوم ہوتا تھا کہ کیا سرتبہ تو ہیں بے قرار ہو گیا۔
 کہ ہاتھ بٹھا کر اسے جھولوں کی ن بکھلت رخسار جیسے تخیل ہو کر رہ گئے۔ جلتے
 خالی ہو گئے۔ ایک بکلی س گہرنے ات ملتوں کیا۔۔۔ اور پھر مجھے عام
 کھوپڑیوں کی طرح ایک کھوپڑی نظر آنے لگی۔

یہ اُردو بازار میں پیدا ہوئی۔ گھر میں اس نے دھسکر میں پرورش
 پائی۔ تلے میں بکسہ یہ صرف مک کے بہترین دماغوں کی کاوش کا نتیجہ ہے
 نئی تہذیب کی ضروریات نے اسے ایجاد کیا اور مطالعے اور خوش مذاقی نے اسے
 یہ دلفریب صورت بخشی اس باسے میں ہمارا ادب سجاد حیدر، لکھنؤ خان
 ڈاکٹر اقبال اور ابوالکلام آزاد جیسی شخصیتوں کا ممنون ہے جنہوں نے بس
 ایسے دروازے کھول دیئے کہ ترقی کے نئے راستے آنکھوں کے سامنے پھیلتے ہوئے
 نظر آنے لگے۔

یہ دو مختلف نمونے ہیں نے امتیاز کی تا اور اسکلامی کو ثابت کرنے کے لیے
 پیش کئے ہیں۔ ان پر یہ اعتراض بجا نہ ہو گا کہ ایک ہی تعینیت میں اسنے
 متباہن ڈھنگ یک رنگ کے منانی ہیں اس کے جواب میں میں یہ کہوں گا ،
 کہ جیہ آپ کسی ایک ایسی کتاب کو جو ایک غیر ملکی تہذیب میں ڈوبی ہوئی ہو
 محض اردو جلتے داتے ہندوستان میں کی نیافت طبع کے لیے کس دینی بات
 میں ڈھالنے کی کوشش کریں تو یقین مانئے انشاء پر داری کا کوئی ایسا فن
 نہ ہو گا جس سے آپ بے نیازی برت سکیں۔ اس کے لیے تلم نہیں بلکہ دوسوں
 انکلیاں دس چراغ برنی پائیں ۔

• پطرس • از کیمبرج

د مخزن سن ۱۹۲۰ء

پاکستان میں تعلیم کا مستقبل

یہ امر کس قدر قابل مسرت ہے کہ سب سے پہلے جو کل پاکستان کا نفرنس منعقد ہوئی وہ تعلیم کا نفرنس تھی جو سال گذشتہ ماہ نومبر میں کراچی میں ہوئی یہ وہ وقت تھا جب سر صہ پار سے مہاجرین کی آمد کا تانا بندھا ہوا تھا اور کشمیر کا مسئلہ روز بروز اس قدر زیادہ نزاکت پر ڈھانچا جا رہا تھا کہ بہ مشکل تو جو کس دوسری طرف مہذول کی جاسکتی تھی اور پھر دیگر اہم ترین سیاسی سائل کے مقابلے میں تعلیم کا نمبر ویسے بھی بعد میں آئیے، نیا پاکستان کے بعد تقریباً ایک سال گزر چکا اس عرصہ میں نہ تو تعلیم کی مد میں کوئی کشمیر رقم مخصوص کی گئی اور نہ ہمارے سکولوں اور کالجوں کی تعداد میں کوئی نمایاں اضافہ ہوا، نہ ہمارے نظام تعلیم اور طریق امتحان میں کوئی انقلاب برپا ہوا اور نہ رضا کاروں اور کارکنوں کی کوئی جماعت نوجوانوں کی خلافت جہاد کرنے کے لیے میدان عمل میں اتری لیکن یہ سب کچھ نہ ہونے کے باوجود اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ہم نے آزادی کے پہلے سال کو رائیگاں کھو دیا تو وہ بر خود غلط ہے اس لئے کہ اس عرصہ میں تعلیمی مسائل پر جوش و خروش سے گامگم بحثیں بھی ہوئی ہیں اور بنیادگی و مسانمت سے غور و خوض بھی، ادا ل سال ہی میں پاکستان کے طول و عرض سے ماہرین تعلیم کا اجتماع منعقد ہوا تاکہ پاکستان

کے تعلیمی مسائل کو سامنے لا کر ان کا حل تلاش کیا جائے۔
 اگر مجھے ایک فرسودہ سلاستارہ استعمال کرنے کی اجازت دی جائے
 تو میں کہوں گا کہ ہماری تعلیمی آزادی ہماری پونجی ہے محض اس کی ملکیت

اسی اس فزدا عتماد پیدا کر دیتی ہے لیکن جلدی یاد میں ہمیں اس پونجی کو فرو
استعمال کرنا پڑے گا ورنہ اس کی حیثیت مردہ دعوات سے زیادہ نہ رہے گی اتنا
کی کئی صورتیں ہیں۔ پونجی فضول خرچ کرنے کے ہم دوبارہ مخلص بن سکتے ہیں
پونجی کو ایسی میں نکالیا جاسکتا ہے جہاں سے کوئی فائدہ نہ ہو یا سوچ بچھو کر
پونجی کو کسی سود مند کاروبار میں نکالیا جاسکتا ہے تعلیمی آزادی کا منہم یہ ہے کہ
ہم جس طرح چاہیں جس کو چاہیں جو چاہیں پڑھائیں تعلیمی آزادی کا مطلب یہ
ہے نصاب تعلیم اور طریق تعلیم بلکہ یوں کہئے مکمل نصاب تعلیم میں حسب ضرورت
مناسب رد و بدل کرنے کی آزادی، سات کروڑ بندگان خدا کو جہالت کی تاریکی
سے نکالنے کے لیے نہایت تفصیلی ڈھانچہ تیار کرنے کی ضرورت ہے اس سلسلے
میں مفصل تعلیمی رپورٹوں کی ترتیب و تدوین بھی ایک امر ناگزیر ہے پاکستان کے
ماہرین تعلیم خواہ وزارتوں میں ہوں خواہ یونیورسٹیوں میں خواہ خالص علمی حلقوں
میں کئی ماہ سے بغیر معمول خلوص اور عنایت سے اس قسم کی رپورٹیں مرتب کرنے
کی کوششوں میں مصروف ہیں ان کوششوں کے نتائج تا حال برآمد نہ ہو سکنے
کا سبب یہ ہے کہ نہ صرف تعلیمی مسائل پیچیدہ ہیں بلکہ ہمارے سامنے تعلیم کا
نصاب الدین بھی مکمل طور پر واضح نہیں بہت سی حقیقی اور واضح چیزیں بغیر حقیقی
اور مبہم چیزوں سے کچھ اس طرح خلط ملط ہو چکی ہیں کہ امتیاز مشکل ہو گیا ہے۔

موجودہ طریق تعلیم کو گذشتہ کئی برسوں سے بالفاق آراء و مذہبوں قرار دیا
جاتا رہا ہے موجودہ نظام تعلیم سے بے اطمینانی و بدولی کے احساسات ہر جگہ
موجود تھے اگرچہ ان جذبات کے اسباب و علل مختلف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان
بیتے ہی لوگوں نے فزدا اس طرف توجہ کی اور موجودہ نظام تعلیم کے نقائص سے
آزاد ہونے کی مساعی شروع کر دیں۔ موجودہ نظام کے نقائص و عیوب کی مفصل
و مکمل فہرست تیار کرنا تو یقیناً ایک حد و شمار سے تین باتوں پر تو غالباً سب متفق
ہوں گے

اول تو انگریزی زبان کی حیثیت ہمارے موجودہ نظام تعلیم میں

انگریزی کو قدیمہ تعلیم اور لازمی مضمون ہونے کی حیثیت سے جو اہمیت حاصل ہے وہ صرف قومی بلکہ خاص علمی نقطہ نگاہ سے بھی بے حد قابلِ اعتراض ہے غیر ملکی زبان کو قدیمہ تعلیم قرار دے دینا نہ صرف غیر فطری ہے بلکہ یہ طالب علم کی ذہنی نشو و نما کو محدود بھی کر دیتا ہے۔ یونیورسٹی کی تعلیم میں انگریزی زبان و ادب کے مطالعے کو لازمی قرار دے دیا گیا ہے اور اس اقدام کا جواز بجز سماجی نظام کے بالی کی حماقت خالص و غرور بے جا کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔

دوسرا نقص ہے ہماری تعلیم کی ناقصیت۔۔۔۔۔ اس ناقصیت کے مختلف مظاہر ہیں مثلاً ایک طرف تو یہ کہ ایسی ملکی قومی زبانیں کس پھر سی کی حالت میں پڑی ہوئی ہیں اور دوسری طرف یہ کہ ہماری موجودہ تعلیم نہ صرف ملوثی اعتبار سے فضول دے سو دے بلکہ اخلاقی نقطہ نظر سے بھی ناسکارہ اور لائینی سے تیسری خصوصیت یہ ہے ہماری تعلیم کی 'محدودیت'۔۔۔۔۔ پڑھے

کچھ لڑکوں اور مردوں کی تعداد پندرہ فی صد سے بھی کم ہے اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو محض دستخط کرنا جانتے ہیں اور عورتوں کا تناسب فی صد تو اس سے بھی کہیں کیا گزرا ہے۔

اب دیکھئے یہ ہے کہ ان نقائص کو دور کرنے کا ہمارے پاس کینا طریقہ ہے ابھی تک ہم کسی آفری فیصلے یا قطع نتیجے پر تو نہیں پہنچ سکے لیکن بحث و تمحیص کے دوران میں بعض جدید رجحانات اور نئے میلانات منظر عام پر آئے ہیں ان کا جائزہ نہ سو دنہ ہوگا۔ مثلاً زبانوں کے مسئلہ پر کراچی کی تعلیمی کانفرنس میں بہت کچھ کہا گیا لیکن پھر بھی بہت کچھ نہیں کہا گیا۔ سد نے خطبہ صداقت میں کہا تھا کہ :

پاکستان میں صوبائی زبانوں کو
نشوونما کے زیادہ سے زیادہ موقع
بہم پہنچانے ہولڈ گے چنانچہ ہمیں
ان صوبائی زبانوں کو مختلف صوبوں

میں نہ صرف ذریعہ تعلیم قرار دینا ہوگا
 بلکہ دیگر ایسے طریقے بھی اختیار کرنے
 ہوں گے جن سے وہ تہذیب تمدن
 جو کسی خاص صوبائی زبان سے متعلق
 ہے اس زبان کے توسط سے تدریج
 و ترقی پاسکے۔ لیکن اس کے ساتھ
 ساتھ ہمیں یہ بھی مد نظر رکھنا ہوگا کہ
 ہماری پاکستانی پھر کی وحدانیت
 و یکگانگت کو صدمہ نہ پہنچنے پلٹے
 ثقافتی وحدت کو برقرار رکھنے اور
 مختلف صوبوں کے درمیان ذریعہ مواصلت
 و مکاتیب و اظہار و استظہار کا کام
 لینے کے لئے ایک خاص زبان کی
 ضرورت ہے اور اس سلسلے میں
 اردو زبان کے حقوق خاص طور پر قابل
 غور ہیں اور نہایت آسانی اور عمدگی
 سے بیرونی زبانوں کے الفاظ اپنے اندر
 سمونے اور جذب کرتے کی صلاحیت
 رکھتی ہے اور وہ متعلق فارسی عربی
 سنسکرت اور انگریزی سے تاریخی
 ہے اور وہ میں گراں بہا ادبی سرمایہ
 موجود ہے ان سب حصہ کی بنا پر میں
 سمجھتا ہوں کہ اردو پاکستان کی قومی
 زبان بننے کی مستحق ہے۔ جہاں تک انگریزی

کا تعلق ہے غیر ملکی زبان کو ذریعہ

تسلیم قرار دینا یقیناً مضرت رساں
 ہے کہیں پھر بھی آئندہ کئی سال
 تک ہمیں انگریزی زبان کو یونیورسٹی
 کی تعلیم میں اہم بین الاقوامی مراسلت
 و مکاتبت کے ذریعے کی حیثیت سے
 صفِ اول میں بیگہ دینا پڑے گی گذشتہ
 تیس پالیس برس سے فرانسیسی
 کی جگہ انگریزی دنیا کی ممتاز ترین زبان
 ہوتی جا رہی ہے علاوہ انہیں محض
 ذاتی منفعت کے نقطہ نگاہ سے
 قطع نظر ہیں اس قدر جلد ایک
 ایسی زبان آتے سے نہیں کھو دینی
 چاہئے جو نہایت آسانی سے ہمیں
 مغربی سائنس اور کلچر سے روشناس
 کراتی ہے۔

فارسی اور عربی زبانوں میں ہمارا
 ثقافتی اثاثہ محفوظ ہے لہذا ان زبانوں
 کے مطالعے کو بھی ہمارے نظامِ تعلیم
 میں متاثری حیثیت حاصل ہوگی۔

(خطبہ صدارت سہلی کل پاکستان تعلیمی کانفرنس)

اس اقتباس کو دو مرتبہ پڑھنے کی ضرورت ہے پہلی مرتبہ تو ایسا معلوم
 ہو گا کہ اس میں ہماری قیادت کا کافی سامان ہے لیکن دوسری دفعہ پڑھنے سے
 معلوم ہو گا کہ اس میں ایک پچھیدہ سئلہ کو صرف بیان کیا گیا ہے حل معلوم کرنا اہم

باقی ہے اس آفتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے نزدیک کچھ نہیں تو نصف دین زبانوں کو مساوی حیثیت حاصل ہے اور ذکوہ خاص اہمیت دیا جائے گی کلپوری جھانگت و وحدانیت کی خاطر صوبائی زبانوں کو زیادہ سے زیادہ نشوونما کا موقعہ دیا جائے گا شروع کی خاطر انگریزی کو نصف اول میں جگہ دی جائے گی۔ صنعت کی خاطر فارسی اور عربی کو ممتاز جگہ دی جائے گی۔ ثقافتی اثرات کی حفاظت کے سبب اب سوال یہ ہے کہ آیا کھیل حیات ملی کی خاطر چاری لے ان تمام زبانوں کا سکھنا ضروری ہے یا نہیں اس میں حق انتخاب یا کم از کم حق تزییح بھی ہو سکتا ہے مختلف صوبوں میں مختلف طبقوں میں اس مسئلہ پر غور و فکر ہوا ہے۔ لیکن ابھی تک کہیں سے نئے قلعے کے صدر کی اطلاع موصول نہیں ہوئی۔

زبان اور کے متعلق مختلف نظریوں کا اظہار کیا گیا ہے صدارتی خطبہ میں اسے پاکستان کی قومی زبان (نگو ذرا نکا) بننے کا استحقاق قرار دیا گیا ہے۔ لیکن یہ بہت غیر واضح اور مبہم سی بات ہے اور یہاں کے مباحث سے ظاہر ہوا کہ اس سے مختلف معانی تعبیر کرنا ممکن تھا مثلاً اس مسئلہ پر جب کمیٹی میں بحث ہوئی تو کمیٹی نے سفارشات کی کہ اردو کی تعلیم و تدریس کو تمام اسکولوں میں لازمی قرار دے دیا جائے اور اسے بتدریج زیادہ سے زیادہ تک ذریعہ تعلیم بنانے کی کوشش کی جائے دوسرے نظریوں میں مشرقی پاکستان کے اسکولوں میں بنگالی کو ذریعہ تعلیم قرار دے سکتے ہیں لیکن زیادہ عرصے تک نہیں، یہ تو ہونے کی کمیٹی کی سفارشات ہیں جن میں پنجاب ماہرین تعلیم کی اکثریت تھی لیکن جب معاملہ پوری کانفرنس میں پیش ہوا تو مشرقی بنگال کے اس کی زبردست مخالفت کی اور آڑی جو ٹھوٹا ہوا اس کی حیثیت کچھ نیچے نیچے یوں کی سی تھی کانفرنس نے مجلس دستور ساز سے سفارشات کی کہ اردو کو پاکستان کی قومی زبان (نگو ذرا نکا) تسلیم کر لیا جائے۔ یہ حیثیت اس سے بھی کمتر تھی جو اسے صدارتی خطبے میں دی گئی تھی کانفرنس نے یہ بھی سفارشات کی کہ اردو کی تعلیم کو تمام

اسکویوں میں لازمی قرار دیا جائے لیکن اسے کس منزل سے شروع کیا جائے۔ اس کے تعین کا اختیار صوبائی حکومتوں کو دے دیا گیا، صوبائی حکومتوں کو یہ عقیدہ بھی دے دیا گیا کہ وہ چاہیں تو اسے ذریعہ تعلیم بنائیں اور نہ چاہیں تو نہ بنائیں۔

اس سے ظاہر ہوا کہ اگرچہ اردو کو اکثر قومی زبان کے خطاب سے نوازا جاتا ہے، لیکن وقت آنے پر صورت مختلف ہو جاتی ہے ممکن ہے سیاسی ہتھیاروں کی زیر قیادت مشرقی بنگال اور زبان سے قطعی بے تعلق کا اعلان تو نہ کرے لیکن مشرقی بنگال میں اردو زبان کے لیے بیش از بیش جوش و خروش پیدا کرنے کی ضرورت ہے جب تک انگریزی موجود ہے اس وقت تک ایسے صوبے کے لیے اردو کا قومی زبان (انگوار فراسکا) ہونا بھی زیادہ وقت نہیں

رکھ سکتا۔ سندھ اور صوبہ سرحد نے پنجاب کا ساتھ دے کر اپنا فرض ادا کیا ہے لیکن خدرشہ یہ ہے کہ آگے چل کر اگر سندھ نہیں تو پشتون یہ دعوت نہ کرے کہ قومی یکجاگت کے اندر ثقافتی انفرادیت کے تحفظ و بقا کی خاطر پاکستان کی تعلیمی ترقی میں مجھے اور زیادہ اہمیت ملنی چاہیے۔

مغربی پاکستان تو بلاشبہ اردو کا سب سے بڑا پرستار ہے مغرب پنجاب میں پنجاب کی حمایت کو وطن سے غداری کے مترادف سمجھا جاتا ہے اس کی کچھ وجہ یہ بھی ہے کہ پنجابیوں کو سکھوں نے اپنی بھیبذبان قرار دیا ہے مگر ہے جب سکھوں کی یاد عویار ہو جائے تو پنجابی گناہ بھی صاف ہو جائے لیکن اس سے پہلے نہیں لہذا منزل پنجاب میں اردو نہایت آسانی اور سہولت سے اپنا راستہ طے کر رہی ہے ہمسامی میں تقسیم سے پہلے اردو کی ترقی و ترقی میں من لوگوں نے ٹوڈ سے اٹھائے وہ غیر مسلم نہیں بلکہ وہ قدیمت پرست تھے جن کے نزدیک عرب و نوح و نوح عربی فارسی کے مترادف تھا انہوں نے اپنے علاوہ چند اور لوگوں کے ذہنوں میں یہ بھی خیال عام راسخ کر دیا کہ چونکہ اردو اور ہندی دونوں جدید ہندوستانی زبانیں ہیں لہذا اردو کی ترقی و ترقی کے سارے منصوبے دشمن

کی چالیں ہیں اور ان چالوں کو نذرنا کام بنانا چاہیے، خواہ اس میں اپنا ٹکسر بنائیوں نہ لٹ جائے کیوں اب اس قسم کے خیالات کا وجود نہیں چند ہی ماہ کے عرصہ میں پنجاب سکول بورڈ نے فیصلہ کر لیا ہے کہ دو تین سال ہی کے عرصے میں تمام اسکولوں میں اردو کو فروغ و تعلیم ہو جائے گی اور یونیورسٹی نے بھی انٹرمیڈیٹ میں اسے اردو کو دیگر انتخابی مضامین کے برابر اہمیت دی ہے۔

اردو کی حقیقی ترقی کا کام واقعی محنت طلب ہے یونیورسٹی میں تمام مضامین کے لئے اردو کو فروغ و تعلیم ہانے کا اخصار اس امر پر جو محکمہ اردو میں ان مضامین پر کتنا قدر جلد کتابیں تیار کی جاسکتی ہیں اور کتابوں سے مراد محض نصاب کی کتابیں ہی نہیں بلکہ اعلیٰ و تحقیقی مواد جو طالب علم اور استاد دونوں کے ذہنی آفاق کے لیے وسعت اور پس منظر کے لیے سنگلی کا سامان پیش کرے یہ کام اس قدر پیچیدہ اور وسیع ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ بجز حکومت کے شاید اور کوئی ادارہ آتا ہے اس کا رخانا قائم کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا لیکن حال اس قسم کے اقسام کی کوئی ملامتیں ظاہر نہیں ہوتی ہیں۔

ہماری تعلیم کو ہمارے قومی جذبات و تصورات ہمارے ہی مقاصد اور نصب العین کے مطابق بنانے کے لئے ہماری تھکیں نوکی ضرورت ہے چنانچہ اس سلسلے میں کراچی کانفرنس میں مندرجہ ذیل قراردادیں منظور کی گئیں۔

پاکستان کے نظام تعلیم کی اساس اسلامی طرز فکر پر پرانی چاہیے خصوصاً مالگیر اخوت و ادا داری اور صلہ و انصاف کے اوصاف حسنہ پر زیادہ زور دیا جائے۔

صرف عام میں ہم اسے آزادانہ (لبرل) اعلان کہہ سکتے ہیں لیکن اس کا یہ مطالب نہیں کہ اسے بالتمام اتفاق آراء منظور کیا گیا تھا۔ حقیقت اس قدر داد نے بہت سے ماہرین تعلیم میں تشنگی باقی رہنے دی۔ ان کا کہنا تھا کہ جن اوصاف پر یہاں تعدد دیا گیا ہے وہ اسلام سے متعلق نہیں کوئی مذہب بھی ان کے اپنے ہونے کا دعوے کر سکتا ہے ان کا تعلق یہ تھا

کہ اوصاف و خصائل کی جگہ عقائد کا لفظ استعمال کیا جائے اور عالم گیر اخوت
 و عبادت اور عدل کی جگہ توحید رسالت و آخرت کو دی جائے کیوں کہ ان کے نزدیک
 مورخ الذکر عقائد ہی اسلم کا طرہ امتیاز تھے اس سے اجالاً یہ اندازہ ہو سکتا
 ہے کہ کون سے طریقہ فکر ہماری تعلیم پر غلبہ پانے کے لیے برسرِ کار ہیں۔ اور ابھی
 تک آفاقیت اقصیت کا مجادلہ ختم نہیں ہوا۔

یہ تو ظاہر ہے کہ ہماری تعلیم اسلامی رنگ میں رنگی جائے گی کیونکہ طلباء
 اور اساتذہ، مصلحین، محسنین، ممتحنین میں اکثریت مسلمانوں کی ہوگی، لیکن سوال
 محض تشکیلی نوع کی ماہیت اور وسعت کا ہے اگر اس مسئلہ پر آزادانہ بحث کا
 پورا موقع دیا جائے تو ہماری قوم کی ذہنی کشش مختلف مظاہرہ میں جیاں بوند
 جائے گی اور اس کا ثبوت اس امر سے قنا ہے کہ ہر کیٹی سب کیٹی پنل یا بورد
 جو مدرسہ نصاب تعلیم پر نظر ثانی کرنے کے لیے مقرر کیا جاتا ہے وہ اس ذہنی کشش کی
 کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے چلے یہ مان لیا کہ ہماری تعلیم میں قومی رنگ ہونا چاہیے
 لیکن قومیت کے مفہوم میں اختلافات ممکن ہیں اور یہ اختلافات ہر جگہ پر اپنا سراٹھا
 دیتے ہیں۔ مثلاً ہماری قومی زبان اردو ہے لیکن عربی بھی سے کیونکہ قومی
 کا مطلب پاکستانی بھی ہو سکتا ہے مسلم بھی ہو سکتا ہے لیکن بعض ماہرین
 تعلیم نے تو نہایت بخیگی سے یہ تجویز پیش کی ہے کہ عربی کو مدرسوں کے
 ابتدائی مدارج میں لازماً قرار دیا جائے۔ پنجاب کی ایک سلیس کمیٹی میں یہ
 احساس قومی تھا کہ ملال سکول میں عربی اور فارسی کو لازمی قرار دے دیا جائے۔
 لیکن اس تجویز کو اس حدتہ کی بنا پر مسترد کر دیا گیا کہ اگر ملیا کو حق انتخاب
 دیا گیا تو وہ زیادہ عربی کی بجائے فارسی ہی لیں گے اس سے کم از کم والدین اور
 نصاب مرتب کرنے والوں کی آراء کا اختلاف ظاہر ہوتا ہے۔ دوسری کشش کشش ادبی
 اور انادی مضامین کے بارے میں ہے افادیت کے حامی اولیٰ مطالعہ کو محض
 تعبیش تصور کرتے ہیں اور جہاں کہیں سے بنا پڑتا ہے وہ اقباز کے قومی
 شاعر ہونے کی تصویر و کاریل پیش کرتے ہیں ان دو الجہنوں کے علاوہ دو اور۔

بڑی بڑی الجینس ہیں "موقف بر مقابلہ استاذ۔۔۔۔۔ فارسی صرت، انگلستان کے ذریعے پڑھائی جا سکتی ہے، فارسی کیمیائے سعادت پڑھنے کا محض ایک ذریعہ ہے (۱۶) مذہبی فرقہ فکر بر مقابلہ عقلی طریقہ بکھر۔۔۔۔۔ آیا تاریخ فلسفہ کو انسانی فکر و ذہن کے ارتقاء کے مطالعے کی حیثیت سے پڑھایا جائے یا محض کلمات کفر کے مجموعے کی حیثیت سے

یہ الجینس ہمیں ایک لیے مقابلہ پسہ جاتی ہیں جہاں ہمیں ایک طرف زراہان تشکک کا پیش کیا ہوا اسلام اور دوسری طرف قوتوں اور تحریکوں کا حقیقی یا غیر حقیقی چیلنج نظر آتا ہے اس امر پر زبردست اختلاف ہے کہ کس حد تک اسلام بغیر اپنی مخصوص اساس کھوئے افکار جدید کو اپنے اندر سمونے کی صلاحیت رکھتا ہے؛ کیا ہم جدید ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی بھی ہو سکتے ہیں؛ کسی نے کیسی یہ سوال نہیں کیا کہ آیا ہماری سے لئے واقعی اسلامی ہونا بالکل ضروری ہے سوال ہمیشہ یہ لیا گیا ہے کہ آیا ہمیں "ماڈرن" ہونے کی ضرورت ہے،

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ ان سوالوں کے جوابات مختلف اور متضاد ہیں، کین کسی کسی طرح ان سب کو ایک نکتی میں پرانا ہو گا ورنہ ہمارا نظام تعلیم ہماری احتیاجات کا پورا اٹھانے کی استعداد سے محروم ہو جائے گا، سرسید کے زمانے میں بھی اس قسم کی الجینس اور سچیدگیاں اس وقت بھی سطح پر ابھرائی تھیں، امر قابل ذکر ہے کہ اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو سرسید پر ہندو کیبتا ن میں اسلام کی بیخ کنی کا الزام دہرانے میں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آج بھی ہمیں دعوائی اور ذہنی سکون حاصل نہیں،

اس مسئلے کا حل یا تو قوت کے ماتھوں ہو سکتا ہے اس میں دیر لگے گی یا زبردست جنگ کے ذریعہ اس میں خدشہ ہے کہ تعمیر سے زیادہ تخریب ہوگی یا قابل قیادت کے توسط سے جو اس وقت موجود معلوم نہیں ہوتی جب تک یہ نہیں ہوتا تعلیمی مباحث کا نتیجہ سنجیدہ اور اشراک مسیوں۔ بلکہ اشتعال کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے گا، اشتعال کی علامتیں ابھی سے ظاہر ہیں، اگر ہم ہر

مختلف نادبہ بنگاہ کو تسلیم کر کے اپنے نعابوں میں اضافہ کرتے گئے تو طلباء تو ایک طرف رہے مگر ہی تسلیم بجائے خود اس بارگراں کی شاید مستعمل نہ ہو سکے، ہر تجویز کو اس شد و مد سے پیش کیا جاتا ہے اور اسے لازمی قرار دیا جاتا ہے جانتے بڑے قدم زور دیا جاتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے نظام کے تحت جو طالب علم بھی کلبیاب ہو کر نکلے وہ ایک ہی وسیع طریق کے مطابق چلا رہا ہو اب تک انگریزی اردو فارسی، عربی، دینیات، اسلامی تاریخ، عسکری تربیت اور سائنس ان سب کو لازمی سفار میں قرار دینے جلنے کی تجویز میں پیش کی جا چکی ہیں کہا گیا ہے کہ انہیں نہ صرف کالجوں اور سکولوں میں بلکہ مقابلے کے امتحانوں میں بھی لازمی قرار دیا جائے گا۔ سانسے جو خطرہ اس وقت درپیش ہے وہ یہ نہیں ہے کہ ہماری تعلیم کا مواد بہت کم ہوگا، بلکہ یہ کہ بہت بھاری ہوگا، اس قدر بھاری کہ یا تو تسلیم بالکل ناممکن ہوگی یا تو بالکل منقول ہوگا۔ تعلیمی طبقوں میں انگریزی کے متعلق بہت کم کچھ کہا جاتا ہے بس خاموشی سے یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ انگریزی ایسی چاری رہے گی لیکن انگریزی کی پرورش حمایت سے اہم کیا جاتا ہے، اس کے بین الاقوامی رتبہ اور اہمیت کا تو امکان ہے لیکن اس کی ماسٹری اہمیت پہلے ہی بہت کم ہو چکی ہے، اور اس کی پھیری وقت سے اگرچہ اعلانیہ انکار تو نہیں کیا جاتا ہے لیکن بعض لوگ لے لپند نہیں کرتے ان حالات میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اب اس کا مستقبل کیا ہوگا یا یہ کہ آیا اس کا مستقبل بھی ہے یا نہیں؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریزی کے خلاف جو ماحولہ جھنڈا پایا جاتا ہے خواہ وہ فطری اور حقیقی ہو اور خواہ انتقامی ہو اس کا بالآخر اثر یہ ہوگا کہ اس معمول کی تعلیم کا معیار گر جائے گا ایسے مابریج تعلیم بھی موجود ہیں جو اس قسم کی صورت حال کو بحالی از خطرہ تصور نہیں کرتے ان کا کہنا ہے ہمیں منصور و ہارون و نامون کے بنیاد کے مقابلے کا بغداد وطنی از سر نو تیار کرنا پڑے گا لہذا ہمیں زمانہ مال کو زمانہ تراجم بنانے کی ضرورت ہے تاکہ انگریزی کی مراجبت

ان الوطن سے پہلے ہم اس سے منزلی سائنس اور کلچر کے تمام راز ہائے سرسبزہ اخذ کر چکے ہوں لیکن بظاہر علامات سے پتہ چلا ہے کہ ہم اپنے کلچر اور زبانوں کے تحفظ و بقا کے جوش و خروش میں اس انگریزی زبان سے بھی اپنے آپ کو محروم کر لیں گے جو ہمارے لئے نعمت بخش ہو سکتی ہے۔

ان خطرات، مشکلات اور الجھنوں اور پیچیدگیوں کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی ایک واقعاتی جھک بھی نظر آتی ہے مثلاً سائٹیفک بلک ایوں کہنا چاہیے کہ ٹیکو لاجیکل ترقیت کی خواہش پاکستان میں اس وقت سب سے بڑی اپنا ہے زندہ رہنے کی اچھی اس وقت دنیا کے کونے کونے سے آوات جنگ کی جھکا سائی دیتی ہے حتیٰ کہ اس فوجی ترقی و مملکت کو بھی اپنے حالات کو صنعتی اور جنگی نقطہ نگاہ سے جانچنا پڑتا ہے یقین مذہب کی روٹ ہے شک سائنس کی جان ہے لیکن زندہ رہنے اور اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے کی اچھی اس شدید حد تک قومی ہے کہ بڑے سے بڑا اقدامت پرست ملاحی سائنس کو محض چند ظاہری شرائط کا پابند بنا کر منظور کرنے کو تیار ہے، سائنس دانوں، ٹیکنیکل سائڈ سامان کی مانگ کو بلا روکد فوجیت اور برتری دی جاتی ہے اور تعمیری مباحث میں سائنس ایک ایسا طبعاتی لفظ ہے جس سے اختلاف آرا پر مہر لگ جاتی ہے غالباً یہی وہ حکمتہ اتفاق ہے جو ہمارے دوسرے اختلافات کو دور کرنے کا باعث بن سکتا ہے ہمیں سائنس کی زیادتیوں کا پتہ ہے ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ سائنس کا نظریہ حقیقت و صداقت، بہت محدود اور تنگ ہے ہمیں یہ بھی احساس ہے کہ سائنس حسن و مسترت کے سے لطائف کو سمجھنے کی صلاحیت سے بے بہرہ ہے اور ہمیں اس کے غیر اخلاقی راخلاقیات سے بے نیاز نقطہ نظر کا بھی علم ہے لیکن ان تمام خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود اگر سائنس ہمیں اپنی الجھنوں اور پریشانیوں سے نکلنے میں مدد دے سکتی ہے تو اس کی راہ چنا اس سے بدتر راہ چلنے سے بہتر ہے۔

انتقام سے قبل تعلیم عامہ و تعلیم بالانفال کے بارے میں بھی دو چار کلمے مناسبتاً
 رہیں گے، اندازہ لگایا گیا ہے کہ اگر تعلیم کی موجودہ رفتار جاری رہی تو ملک
 پھر سے ناخواندگی اور جہالت دور کرنے کے لئے کچھ نہیں تو ڈیڑھ سو سال
 مددگار ہوں گے اگر ہم فرقہ لطیفیاتی گوشش کا مظاہرہ کریں اور اپنے تمام
 وسائل کو بروئے کار لے آئیں یعنی یہ کہ ہر پڑھے لکھے آدمی کو استاد بنادیں
 اور ہر گلہ کے کونٹے کو اسکول بنادیں تو ڈیڑھ سو سال کا کام رہے صدی میں کٹے
 پاسکتا ہے افسوس ہے کہ اس محاذ پر کوئی بات قابل ذکر نہیں۔ برطانوی راج
 پر سب سے بڑا داغ یہ ہے کہ انہوں نے ہمیں ہمارے فائدے کے لیے نہیں
 بلکہ اپنے فائدے کے لیے پڑھایا۔

کس قدر افسوس کا مقام ہو گا اگر ہمارے ارباب اختیار بھی برطانوی
 روایت کو برقرار رکھیں اور اسے نہایت احتیاط سے پرواں چڑھاتے ہیں

ایڈیٹنگ کا فن

اگر خوش قسمتی سے مجھ سے محض حضرات بھی ایسے مل جائیں جو اس مضمون کو پڑھ کر اگوار کریں تو ان میں سے کم از کم ایک بزرگوار تو ایسے ضرور ہوں گے جنہیں سینما سے نفرت ہے اور اظہارِ نفرت میں کوئی تامل محسوس نہیں کرتے باقی حضرات میں بھی بعض ایسے ہوں گے جو کبھی کبھی اس گناہ کا ارتکاب تو کر جیتے ہیں لیکن اقبالِ مردم نہیں کرتا چاہتے اور اکثر اوقات اپنے سینما تشریف لے جانے کی تاویل یوں فرمائی کرتے ہیں۔

• کل شام کو کوئی مشغلہ نہیں تھا، آپ جانتے ہیں میری بیوی روتلڈ کالمین کے فلموں کو بہت پسند کرتی ہے میں نے سوچا کہ لاڈیم بھی چلے ہیں چنانچہ ہم.....

لیکن اس جگہ نہ تو میں ان اصحاب کے خلاف جہاد کرتا چاہتا ہوں جنہیں سینما سے نفرت ہے نہ دوسرے گروہ کو بچے بیوی کے سہاوارم مقہور پنہ میں لطف آتا ہے اس لطف و مسرت سے محروم کرنا چاہتا ہوں میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر سینما واقعی آرٹ کہلاتے کے قابل ہے اور اس کے کالات کا کوئی جوڑا نظر آتا ہے اور اس کے آرٹ کا کوئی مخصوص وسیلہ اظہار ہے تو وہ کیا ہے، مصوروں کے کالات کا مظہر خطوط اور رنگ ہیں، شاعرِ الفاظ کے ذریعے اپنا مطلب ظاہر کرتا ہے، دیکھنا یہ ہے کہ فلم کار کن چیزوں سے کام لیتا ہے، اس کے پاس کس قسم کا مواد موجود ہے اور اس مواد کے امکانات کا دائرہ کہاں تک وسیع ہے اس قسم کے سوالات کا جواب دینے سے پہلے ہیں، دیکھنا چاہیے کہ فلم کیوں کر بنایا جاتا ہے کیونکہ اس طرح ہیں، بتانے میں آسانی ہوگی کہ سینما میں کس قدر

دست ہے آپ جانتے ہیں کہ علم متحرک کیمبرے کی تصویر کے ایک سلسلہ کا نام ہے جو یکے بعد دیگرے دکھائی جاتی ہیں یا یوں کہتے کہ سینما کے شاٹ جب ترتیب و تسلسل کے ساتھ دکھائے جاتے ہیں تو انہیں فلم کہا جاتا ہے، شاٹ فلم کے ایک ایسے ٹکڑے کا نام ہے جس کی تصویر متحرک کیمبرہ میں بیک وقت لی جاتی ہے جہاں تسلسل ڈراما شاٹ ختم ہو جاتا ہے جب کیمبرہ دوبارہ پھنے لگتا ہے تو دوسرا شاٹ شروع ہو جاتا ہے۔

قصہ ریا جو کچھ بھی فلم کا موضوع ہو، کے انتخاب کے بعد دوسرا مرحلہ فلم تلے کا مرتب کرنا ہے۔ میں یہ تو یہ تفصیل نہیں بیان کرنا چاہتا کہ فلم نامہ کتنے مرحلوں کے گزرنے کے بعد تکمیل کی منزل تک پہنچتا ہے بلکہ میں صرف اس قدر عرض کر دوں گا کہ فلم نامے میں قصے یا موضوع فلم کی تمام روئے ادا کا تجزیہ کیا جاتا ہے اور اسے "شاٹوں" میں تقسیم کیا جاتا ہے ہر شاٹ کا اصل پسے تفصیل کے ساتھ کھاجاتا ہے۔ اس کی تمام جزئیات کو واضح طور پر بیان کیا جاتا ہے گویا وہ تمام اجزا جن کی ترکیب سے فلم کی تکمیل ہوتی ہے اسی ترتیب اور تقدم و تاخر کے ساتھ فلم بند کرنے جاتے ہیں جس ترتیب کے ساتھ انہیں پسے پر دکھانا منظور ہے، ہر شاٹ کے متعلق پوری وضاحت اور تفصیل کے ساتھ ہدایات دی جاتی ہیں اور بتایا جاتا ہے کہ شاٹ کا موضوع کیا ہوگا۔

آیادہ یکبارگی نمودار ہوگا اور کیا رنگ فانی ہو جائے گا (یا سینما کی اصطلاحی زبان میں یوں کہہ لیجئے کہ اسے ابتدا میں اور خاتمہ پر کانا جائے گا) یادہ ابتدا میں بدرتیج نمودار ہوگا اور خاتمہ پر بدرتیج فانی ہو جائے گا۔ اور آیا تصویر کے نمودار ہونے اور فانی ہونے کا یہ عمل آہستہ آہستہ ہو گیا یا بہت اور اگر یہ دونوں صورتیں نہیں تو کیا وہ پہلے شاٹ میں سے رفتہ رفتہ نمودار ہو کر آگے شاٹ میں تحلیل ہو جائے گا جسے اصطلاح میں عمل تحلیل کہتے ہیں اور آیا عمل تحلیل آہستہ آہستہ ہو گیا یا تیزی سے پھرے بتانا بھی ضروری ہے کہ شاٹ لیتے وقت کیمبرہ ایک ہی جگہ رہے گا یا آگے بڑھ کر معمول کے قریب ہو جائے

گایا پچھے پٹ جلنے گا یا اس کے متوازی حرکت کرے گا۔ اور یا گھوم کر پڑے
منظر کی تصویر برے گا۔

۱۰ قلم نامہ میں یہ بھی بتایا جائے گا کہ جس چیز کا شاٹ لیا جا رہا ہے کیمرا اس
کے سامنے آتی ہی بلندی پر ہوگا یعنی بلندی پر انسان کی آنکھ ہوتی ہے یا کسی
اور نقطہ یا زاویے سے شاٹ لیا جائے گا کیمرا اس کے کس قدر فاصلے پر ہوگا شاٹ
قریبی ہوگا یا وسطی یا بعیدی، غرض فلم نامے میں ان تمام سوالوں کے جواب اور ہر
شاٹ کے متعلق تفصیلی ہدایتیں موجود ہوتی ہیں۔

میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ قلم نامہ میں شاٹ اسی ترتیب سے لکھے
جاتے ہیں جس ترتیب سے انہیں لہروں پر دکھایا جاتا ہے لیکن یہ مزوری
ہیں کہ شاٹ لیتے وقت بھی یہی ترتیب ملحوظ رکھی جائے۔ شاٹ تو اسی ترتیب
سے لے جاتے ہیں جس میں زیادہ سہولت ہو۔

فرض کیجئے کہ ایک کہانی کا آغاز لاہور سے ہوتا ہے اور خاتمہ بمبئی
میں، اگر مزور ت پڑے تو آپ بمبئی کے تمام سین پہلے لے لیں گے، اور لاہور
کے بعد میں، اور پھر انہیں فلم نامے کے مطابق مرتب کر لیں گے اور اگر
کیفیت یہ ہو کہ کہانی کا ایک سین تو ایک مقام قدرتی یا سٹوڈیو میں مصنوعی
طور پر تیار کردہ سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرے سین کا تعلق کسی دوسرے
مقام سے ہو اور مناظر کے مقامات متواتر اسی طرح تبدیل ہوتے رہتے ہیں،
جیسا کہ اکثر فلموں میں ہوا کرتا ہے تو آپ وہ تمام مناظر جو ایک جگہ سے تعلق
رکھتے ہیں ایک مرتبہ لے لیں گے، اور پھر دوسری جگہ پہنچ کر تمام متعلقہ مناظر کا کس
لے لیا جائے گا اس بات کا خیال نہیں رکھا جائے گا کہ ترتیب کے لحاظ سے
جو سین پہلے ہے اسے پہلے لے لیا جائے، اور جو بعد میں ہے اسے بعد میں فلم
بند کیا جائے اس کے بعد آپ گھر آکر تمام عنوانات کے فوٹولے لیں گے جب
تمام واقعات اور عنوانات کا کس لے لیا جائے گا تو سولو لائٹ کو مختلف حصوں
میں تقسیم کر دیا جائے گا ایک ایک شاٹ الگ الگ کر لیا جائے گا پھر ہر شاٹ

میں کسی قدر سائٹ پچاٹ ہوگی رہا سائٹ کے دونوں سروں پر کسی قدر نامدِ نلم لے لیا جاتا ہے تاکہ بعد میں اسے سائٹ کرتا سب پیدا کر دیا جائے اور آخر میں یہ سائٹ مناسب ترتیب کے ساتھ جوڑ دیے جائیں گے اور نلم کی ٹیکس ہو جائے گی نلم کی قطع دبرید اور از سر نو شیرازہ بندی جسے تدبیر یا ایڈجسٹنگ کہتے ہیں، نلم سازی کا ایک اہم مرحلہ ہے کہ بعض ڈائریکٹر خصوصاً دوست ماہرین کو حقیقت میں اس کو سمجھتے ہیں۔

سینا ایک "سورس" فن ہے، تمام صوتی فنون سے کم عمری کے باوجود اسے ایک حیثیت سے ان پر فوقیت حاصل ہے تمام صوتی فنون حرکت کے اظہار سے قاصر ہیں، بہت ہو کائنات حرکت کا مفہوم ادا کر دیا لیکن نلم کو یہ دشواری نہیں وہ "حرکت" کو بتین اور واضح طور پر ظاہر کر سکتا ہے عمل ڈرامے کی جان ہے اور نلم میں بھی اسے یہی حیثیت حاصل ہے کیونکہ نلم میں تو کوئی چیز دکھائی نہیں جاتی جس کی ظاہری حالت اس کی تمام کیفیت کی ترجمان ہو اور جس میں واضح طور پر حرکت نظر آئے اور وہ نلم ہی کیا ہے جس میں حرکت ادا اس کا آثار چرچاؤ اس کا تمم جانا تک جانا اور حرکت کا باہمی تضادم نہ دکھایا جائے، تمام صوتی فنون میں یہ امتیاز نلم کو ہی حاصل ہے کہ مسلسل حرکات اور روانی کو اس کا اصول موضوعہ قرار دیا جاسکتا ہے گویا نلم کا آغاز حرکت سے ہوتا ہے اور ایک سائٹ سے دوسرے سائٹ کے درمیانی فاصلہ میں بھی تسلسل یا روانی موجود ہوتی ہے اور یہی خصوصیات ہیں جو اسے دوسرے فنون سے ممتاز کرتی ہیں، آپ نے بہتر سے تصویر دار پوسٹ کارڈوں کے اہم تو دیکھے ہوں گے جن پر تفریح گاہوں اور صحت افزا مقامات کے مناظر ہوتے ہیں، یہ تصاویر ایک خاص قطع کی بنا پر ایک دوسرے سے منسلک تو ضرور ہوتی ہیں لیکن ان میں یہ خاصیت کہاں ہے کہ ایک تصویر دوسری تصویر میں ڈھل جائے اور اس متواتر تحلیل سے ایک تسلسل پیدا کرے یعنی ٹوٹو سے یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ کیا ہوا؟ لیکن یہ کون بتاے گا کیوں کہ ہوا؟ اس

کے اظہار پر مفہم ہی قائم رہتا ہے، جب تک واقعہ کی پوری ترتیب اور پوری صورت اور کیفیت اس کی مالہ و ماطیہ سمجھ میں نہ آجائے لطف نہیں آتا۔
 ناولٹ الفاظ میں منظر کی تصویر کھینچتا ہے، ڈرامہ ٹٹ مکالمے سے یہ کام لیتا ہے، فلم نگار کے لیے مزوری ہے کہ جب وہ فلم نامہ لکھنے کے لیے قلم اٹھائے تو اس کے ذہن میں ایسی مرئی اشکال ہوں جو بہ آسانی ایک دوسرے پر ڈھلتی چلی جائیں۔

ایک کہانی میں جو فلم کے لیے لکھی گئی ہے ایک فقرہ یہ ہے۔
 • زید اس کے مکان میں اکثر آیا کرتا تھا، یہ جملہ بجا بیٹے فقرے کے با معنی اور اظہارِ مطلب پر پوری طرح قادر ہے، لیکن اسے بعینہٴ فلم کی صورت میں منتقل کر دینا ناممکن ہے، ناولٹ کے فلم سے جب یہ جملہ نکلا تھا تو اس کے ذہن میں اشکال و صورت نہیں بلکہ الفاظ تھے یہ تو اسی صورت میں فلم کے لیے ممکن ہو سکتا تھا کہ لکھنے والے کے ذہن میں الفاظ کے بجائے تصاویر ہوتیں، اکثر ایک غیر معین جملہ ہے جس کے معنی کئی مرتبہ کے ہیں، اگر فلم میں زید کو اس مکان پر پانچ چھ مرتبہ آنا دکھایا جائے تو کہیں یا کہ اکثر کا مفہوم پیدا ہوگا لیکن شکل یہ ہے کہ اکثر کا مفہوم ادا کرنے کا یہ طریقہ بے حد سرخاز ہے ایک فلم میں یہ مشکل اس طرح حل کی گئی تھی کہ زید مکان میں قدم رکھتا ہے تو بچے خوشی سے اس کی طرف دوڑتے ہیں اور کتا اچھلتا اور دم ہلاتا اس کی جانب پکارتا ہے، اس طرح تماشائیوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ زید اس مکان میں نوازدہ نہیں بلکہ اکثر آتا ہے۔

• لے دوین آف پیرس " نام فلم میں جس کا ڈائریکٹر چارلی چپلن تھا یہی مفہوم زیادہ لطیف طریقے پر ادا کیا گیا ہے مکان میں نہ تو بچے دکھائے گئے ہیں، اور نہ کوئی پالتو حیوان تھا تو کردوں کے سوا مکان میں کوئی نہ تھا نہ ہی ایک مکان میں داخل ہوتا ہے صوفے پر جا بیٹھا ہے کچھ دیر سیکسوفون بجاتا رہتا ہے پھر اسے خیال آیا ہے کہ میرے پاس رو مال نہیں وہ بغیر کسی پس پیش

کے اٹھتا ہے اور دوسرے کمرے میں جا کر اور نہایت بے تکلفی سے کہتے راز
کھول کر ایک حال نکال لیتا ہے۔

لیکن یہ تو ایسی مثالیں ہیں کہ کہانی پہلے موجود تھی، بعد میں اسے فلم
کی صورت میں ڈھال لیا گیا اور بہتر ہے کہ تصاویر سے کہانی مرتب کی جائے گی۔
گویا تصویر بے بیج کے بیجے جو کہانی کے پودے کو جنم دیتی ہے اس کے برعکس کہانی
کو بیج اور تصویر کو پودا فرض کر لینا سخت غلطی ہے میں یہاں بعض اچھے فلموں
کی ایک فہرست پیش کرتا ہوں جس کی ترتیب میں کسی خاص غور و فکر سے کام نہیں لیا
گیا، ایک نقاد نے اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے یہی فہرست یہ طور و دلیل
پیش کی ہے۔

دی کروڈ ٹوٹکن، وی کینٹ آف ڈاکٹر کیلی گاری اسے وڈن آف پیرس
وارنگ ٹیڈ وزوی سالوشن ہسٹری، وایول، وی پلگرم، برلن اور وی میزنج
سرکل۔

یہ سب کے سب کامیاب فلم ہیں لیکن ان میں سے ایک بھی کسی ناول یا ڈرامے
سے ماخوذ یا مختار نہیں، اس سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ جب کسی ناول
کو فلم کے قالب میں ڈھالا جاتا ہے تو کیوں ناکامی ہوتی ہے، مثال کے طور پر
ہڈس کو بچے، فلم میں خیر ایک تو یہ جاہلانہ تعریف کیا گیا ہے کہ کہانی کو سرت
انجام بنا دیا گیا ہے لیکن اس سے ذرا تعلق نظر کر کے دیکھئے تو بھی فلم اکثر ٹیٹیوں
سے مامیانا نظر آئے گی، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تمامس ہارڈی نے جو
مطالب الفاظ میں ادا کئے ہیں، انہیں تصاویر میں ظاہر کرنے کے لیے ہارڈی
جیسے نکتہ رس و ناخ کی ضرورت نہ تھی اتنا تو ضروری ہے کہ فلم کا تصاویر
کے فن میں اتنی ہی مہارت رکھتا ہو جتنی مہارت ہارڈی کو الفاظ کے فن میں
تھی لیکن بد قسمتی سے وہ بے چارہ اس مہارت اور قابلیت سے محروم تھا،
اس فلم کے بہترین حصے جن میں فلمکار نے بزعم خود بڑا کمال صرف کیا ہے
دیکھئے تو زیادہ آہ اسے ہارڈی کی کتاب کا سہرا سامعورا ٹیشن کہہ لیجئے

گا، اب اس کا مقابلہ ایک اور فلم پٹراٹ سے کیجئے یوں تو وہ بھی ناول سے ہی ماخوذ ہے لیکن جو کہتے ہیں پیش کر رہا ہوں اسی کے اعتبار سے بے حد کاٹنا اور مختلف حیثیات سے جامع ثابت ہونے سے اس میں کوئی شک نہیں کہ اس فلم کا ڈائریکٹر لرنسٹ لوبش جیسا شخص جتنے ہی اس کا شمار کا ملین فن میں کیا جاتا ہے لیکن میرے خیال میں فلم کی کامیابی کا راز خود ناول میں نہیں ہے بلکہ اس میں ناول کے ایک حصے کا اقتباس پیش کرتا ہوں۔

”سیکا ایک فوجی انسٹریکٹور تھا اور اس کا ایک ہاتھ سلاخ کے لیے ٹوپی پر جا پھنسا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پتھر کی بے حس و حرکت مودت کھڑی ہے۔ ہزار کے پیش خدمت کا دھڑا آگے کی طرف جھکا ہوا تھا، اور سارا جسم دوہرا ہو گیا تھا اس کے کولہوں کو دیکھ کر تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جسم کے اوپر کڑے ہو بائیں گے اس کے کندھے سے تانوں کے ساتھ پیوست ہو گئے تھے۔ پیشانی پر رگیں ابھری ہوئی تھیں اور سر سینے کے ساتھ جا لگا ہوا تھا۔“

زار دروازے میں کھڑا تھا۔ آنکھوں کے پوٹے پھڑک رہے تھے، برآمدے میں جس قدر لوگ تھے وہ انہیں نہیں دیکھ رہا تھا، بلکہ اس کی نظریں ان سے گزر کر برآمدے کے بیرون چلتے تھیں۔ ہزار اس کیفیت میں سزا کی تھی۔ اس کے بڑھ گیا۔ اس کے چہرہ پر بدستوری ہی محویت چھائی ہوئی تھی اس کا دل ہٹا ہوا تھا۔ اس سے اونچا معلوم ہوتا تھا، اور بار بار پھڑک رہا تھا، وہ ایک سن رسیدہ شاف کپتان کے پاس سے گذرا۔ پھر کھارنگی پلٹا، اور سالے کے مہاراجہ بھکر مہجوت کو بھڑکھڑا کر ماری، اپنی غلطی محسوس کر کے فوجی تاع کے مطابق سیدھا کھڑا ہو گیا، زار نے سر اٹھایا اور کپتان کے چہرے پر جو لمبی کی طرح تڑپ رہا تھا، نظریں گاڑ دیں، اور بلند آواز میں پکارا،

”مرادینف“

ایڈیٹورسٹین تمام آگے بڑھ کر زار کے پیچھے کھڑا ہو گیا، زار نے

شاف کپتان کی طرف اشارہ کر کے کہا: "اسے ازراہ تینہ پیدل فوج کی جھنڈ
متعین موبلیف میں تبدیل کیا جاتا ہے۔"

مرادلیف نے حکم کی یادداشت رکھ لی زار کی مطالعہ گاہ کے دروازے میں
کوئٹ پابن کا مضبوط جسم اور خوشونت آمیز چہرہ نظر آ رہا تھا، اس نے نیم
باز آنکھوں سے معتوب کپتان پر نظر ڈالی جس کی ہنگاموں میں غصہ کی
بجلیاں کوند رہی تھیں۔ اور اس کے ارد گرد کسی قدر اوپر چڑھ گئے۔

کیا اس سے زیادہ واضح اور سینما کے مقاصد سے اس قدر مطابقت
رکھنے والا کوئی ناول لکھا جاسکتا ہے۔ ہر لفظ بجائے خود ایک تصویر ہے،
یہاں میں معنی سوکت کرتے نظر آتے ہیں بھر جب فلم نگار کا قلم ان تصویروں
میں رنگ بھرتا ہے تو اور ہی کیفیت ہو جاتی ہے۔ مثلاً زار ایک جگہ کہتا ہے۔
سنو! میں تمہیں کب راز بتاتا ہوں میرا باپ بھی قتل کیا گیا ہے اور غالباً
میرا بیٹا بھی کسی دن میری طرح قتل کر دیا جائے گا۔

اب فلم کار کی بہت مزاحیہ دیکھنے کے زار کے منہ سے یہ الفاظ کہلانے کی
بجائے اس کے باپ دوا کی تصویر دکھائی جاتی ہے جو نہایت موزوں طریق پر
ہماری نظروں سے گزرتی ہے زار آخری تصویر کے سامنے جو اس کی اپنی تشبیہ
پر مٹھ جاتا ہے یہ عجیب پرصرت منظر ہے زار کی آنکھوں میں اتجا اور استہمام
کی مدلی کیفیت نظر آتی ہے نگاہیں کچھ مانگ بھی رہی ہیں کچھ پوچھ بھی رہی ہیں۔
ایک جگہ ناولٹ لکھتا ہے کہ زار نے گھونسا مان کر کہہ میں زار ہوں اور
زار ہوں گا۔ فلم نگار نے یہاں بھی اپنی معنی آفریں قلم کے عجیبے شے دکھائے ہیں
تو سبک کر اپنے دربار کے کمرے میں پہنچا ہے تال پھینچ پھینچ ہیں زار سبک
کر چوتھے پر چڑھ جاتا ہے اور تخت کے سامنے تن کر کھڑا ہو جاتا ہے،
پھر وہاں ہاتھ بلند کر کے کہتا ہے۔

"میں زار ہوں اور زار رہوں گا۔"

فلم نگار کے قلم کی مکی سی جنبش نے اس منظر کو کہاں پہنچا دیا۔ جب ناول

کے الفاظ کو جو خود تصاویر سے کم نہ تھے یوں واضح تر کر دیا جائے تو ایسی
علم کی کامیابی پر کسے تعجب ہو سکتا ہے۔

علم میں ہر نئی اشکال سے بنتا ہے وہ بہ آسانی دوسرے قالب میں ڈھل
جاتی ہے اور اس کی جگہ دوسری تصویر لیتی ہے اور یہ رنگ بدلنے اور
نئے نئے پیکر اختیار کرنے والی سکلیں اپنے حالات کی ترجمان آپ ہوتی ہیں
ہر تصویر واضح اور غیر مبہم معنی رکھتی ہے ہنر کی شرح بیان کرنے کی ضرورت
پیش نہیں آتی بلکہ ذہن خود بخود انہیں سمجھ لیتا ہے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ ہر
خیال کو سینکڑوں طریقوں سے ادا کیا جاسکتا ہے، ایک مفہوم کو ادا کرنے کے
لیے ہزاروں تصویریں بن سکتی ہیں ضرورت تو اس بات کی ہے کہ پورے خود
نکھر کے بعد تصاویر کا انتخاب کیا جائے اور وہی تصاویر منتخب کی جائیں جو
سب سے زیادہ واضح ہوں اور ہمارے مفہوم ذہنی کو پوری طرح ادا کر سکیں
کیرہ دیکھتا ہے، سنا ہے چھوٹا ہے، سوچتا ہے، چکھتا ہے گویا وہ انسان کی
طرح حواس خمسہ رکھتا ہے لیکن اس کی آنکھ بے پردہ تماشائی کی آنکھ نہیں بلکہ وہ
ہر چیز کا مطالعہ غائر نگاہ سے کرتا ہے اور نظر کار کو بڑی آسانی یہ ہے کہ کیرہ
کی وسیع طاقت اور قوت اسے سہارا دینے کے لیے موجود ہے۔

فرض کیجئے کہ ہمارے سامنے دربار شاہی کا منظر ہے تماشائی اگر اس
منظر کا پوری طرح مطالعہ کرنا چاہے گا تو وہ بالائے خانے پر چلا جائے گا تاکہ
بندی سے تمام منظر اچھی طرح دیکھ سکے، پھر بھی اس کی خواہش یہ ہوگی
کہ بادشاہ کو قریب سے دیکھے درباریوں کے ہجوم میں مل کر ایک ایک چیز
پر نظر ڈالے۔ غمگین تماشائی کی تو جہ پوری طرح تعریف کرتا ہے۔ تماشائی
انہیں چیزوں کو دیکھتا اور یاد رکھتا ہے جنہیں قلم ڈالر سیکڑا نہیں دکھانا چاہتا
ہے اور پھر ان مناظر کا انتخاب اس ڈھنگ سے کیا جاتا ہے کہ تماشائی
انہیں صرف دیکھتا ہی نہیں بلکہ وہ اس کے ذہن پر نقش ہو جاتے ہیں۔

اسے ۱۴۲۲ء کا واقعہ یاد رکھو کہ جو یہ کھینچتا ہے، اور صاف معلوم ہوتا ہے

کہ ظلم میں جو قدرت ہے وہ تھیٹر میں نہیں،

ظلم کی قدرت کا دائرہ اس اقباس سے بھی وسیع ہے کہ وہ جزئیات اور تفصیلات کو نہایت واضح طور پر پیش کرنے کی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ظلم کا کیمیرے کی مدد سے جو ہر چیز کی گہرائیوں تک اتر جاتا ہے اور تصویر کی روح کو بے نقاب کر دیتا ہے چنانچہ ایک نقاد لکھتا ہے کہ:

کیمیرہ ہمیشہ زندگی کی گہرائیوں میں اترنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور ایسی ایسی پوشیدہ چیزوں تک پہنچتا اور انہیں بے نقاب کر دیتا چاہتا ہے جنہیں عام تماشائی کی نظر نہیں دیکھ سکتی۔ کیمیرے کی قدرت کا دائرہ اس سے بھی زیادہ وسیع ہے۔ جو ہر چیز میں اس کے سامنے آتی ہے وہ اسے سولائیڈ پر محفوظ کر لیتا ہے۔ جب ہم کسی تصویر کو دیکھتے ہیں تو بہت دیر کے بعد اچھی خاصی کوشش کر کے ہماری نگاہ کسی خاص نقطے پر مرکوز ہوتی ہے اور ہم تصویر کے حاسن کو سمجھنے لگتے ہیں۔ لیکن ظلم میں نہ اتنا وقت صرف کرنے کی ضرورت ہے نہ تصویر کی خوبیاں سمجھنے کے لیے کوئی کوشش کرنا ضروری ہے۔

ظلم کو ایک اور بھی سہولت حاصل ہے جو اس سے بھی بڑھ کر کہیں ہم ہے۔ ظلم اپنے لئے آگ زبان و مکان پیدا کر لیتا ہے جو حقیقی زبان و مکان سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ سٹیج میں کسی مددک یہ بات ہے کہ امتدادِ ناز کو واضح کرنے کے لیے پردہ گرایا جاتا ہے یا اٹھایا جاتا ہے، لیکن ظلم اس بارے میں تھیٹر پر سبقت لے گیا ہے۔ سٹیج پر ہر کیمیرا کبہ نقطے سے دوسرے نقطے تک حرکت کرتا ہے اور یہ کیفیت ہوتی ہے کہ کوئی اہم واقعہ اسی وقت رونما ہوتا ہے اور کسی ایگر یا پروڈیوسر کو یہ قدرت حاصل نہیں کہ اس بید سکانی کو جو ان دونوں نقاط کے درمیان مائل ہے دور کر دے یا اس وقت کہ جو حاصل ہے کرتے ہیں صرف ہوتا ہے۔ مثلاً ڈالے اور تماشائی کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ جب کیمیرا ایک نقطے سے دوسرے نقطے کی جانب حرکت کر رہا ہو تو وہ اپنے ذہن کو معطل کر سکے۔

اب دوسری طرف فلکار کو دیکھئے جو اس بعد مکانی کو بڑھی آسانی سے مٹا دیتا ہے۔ وہ ایک شاٹ اس وقت لیتا ہے جب کیریکٹر نقطہ الف پر ہوتا ہے اور دوسرا اس وقت جب وہ نقطہ بت پر پہنچ جاتا ہے پھر دونوں شاٹ ملا دئے جلتے ہیں اور مقوڑی دیر کے لیے آپ کی ساری ٹوہ ایک نقطہ پر مرکوز ہو جاتی ہے وقت کو ایک دھارا سمجھئے جس کے بعض لمحے اہم ہوتے ہیں اور بعض غیر اہم۔ فلکار کی ہنرمندی غیر اہم لمحوں کو نظر انداز کر کے بلکہ ٹوکر کے ایک نیاز مان پیدا کر دیتی ہے جس میں محض اہم لمحے ہوتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ چاہے تو ایک جگہ وقت کا دھارا تمہارے اور دوسری جگہ بہتا دکھائی دے اور مختلف متکات پر بیک وقت دو مختلف کیفیتیں نظر آئیں اور تو اور وہ یہ بھی کر سکتا ہے کہ وقت کا میل دو شاخوں میں تقسیم ہو جائے اور دو دھارے پہلو بہتے نظر آئیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ ظلم میں جب کوئی ایسا نظر دکھایا جاتا ہے کہ ایک طرف ایک مصیبت زدہ کی زندگی کے آخری لمحے میں اور دوسری طرف کوئی اسے نجات دلانے چلا ہے تو فلکار اپنے فن کے ایسے ہی عجائب و غرائب دکھایا کرتا ہے۔

جس طرح آپ ظلم میں نیاز مان پیدا کر سکتے ہیں اس طرح نیاز مکان بھی خلق کیا جا سکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک ڈائریکٹر چند ایسے مناظر ظلم بند کر لیتا ہے جو مختلف مقامات سے تعلق رکھتے ہیں۔ امدان کے درمیان بعد مکانی مائل ہے لیکن وہ ان تمام اجزاء کو ملا کر ایک نیا فلمی مکان بھی پیدا کر سکتا ہے۔ ایک روسی نقاش کلینٹا ناہل نے جو ظلم سازی کے فن میں بصیرت رکھتا ہے۔ ۱۹۲۰ء میں تجربے کے طور پر حسب ذیل مختلف شاٹ جمع کئے تھے۔

- ۱۔ ایک نوجوان بائیں جانب سے کہیں جانب بلانا دکھائی دیتا ہے۔
- ۲۔ دوسری جانب سے ایک لڑکتی آتی ہے۔
- ۳۔ وہ دونوں ملتی اور ہاتھ ملاتے ہیں۔ نوجوان انگلی سے اشارہ کرتا ہے۔
- ۴۔ ایک وسیع سفید رنگ کی عمارت دکھائی جاتی ہے جس کی سیریلیاں بہت فراخ ہیں۔ تو وہ سیریلیوں سے چڑھ کر مکان میں داخل ہو جاتے ہیں۔

یہ تمام مناظر الگ الگ مقامات پر لے گئے تھے، اور پھر انہیں متذکرہ طور ترتیب سے علم کے پردے پر دکھایا گیا تو دیکھنے والوں کو ایک مرتبہ واقعہ نظر آیا کہ ایک نوجوان مرد اور ایک عورت آپس میں ملتی ہیں، مرد پاس کے مکان کی طرف اشارہ کر کے اندر چلنے کی دعوت دیتا ہے اور دونوں مکان میں داخل ہو جاتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سارے اجزا الگ الگ مقامات سے تعلق رکھتے تھے، مثلاً وہ نوجوان، اسکو کی ایک پبلک عمارت کے قریب تھا، اور عورت شہر کے دوسرے حصے میں تھی، مصافحہ انہوں نے ایک تھیٹر کے پاس کیا جو ان دونوں مقامات سے بہت دور واقع ہے، سپیدنگ کی عمارت کاشٹ کس امریکن فلم سے لیا گیا تھا، اور حقیقت یہ سپیدنگ کی عمارت امریکہ کا مشہور قصر سپید تھا اور نیویارک میں ہے وہ چڑھ کر مکان میں داخل ہوئے ایک گرجا کی سیڑھیاں تھیں، اب دیکھئے کہ سلوانڈ کے مختلف کمرے ملانے سے ایک نیا فلمی مکان پیدا ہو گیا جو محض نائش سراب ہے اور درحقیقت کوئی وجود نہیں رکھتا یہی چیز ہے جسے تخلیقی جغرافیہ کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

پڈوکن سب سے پہلے فلم کاری سے جس نے فلمی مکالموں کا زمانہ کا منتخب وضاحت سے پیش کیا، گواہ دنیا کے ہر ملک میں اکثر ڈائریکٹر اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، اور نامد کیوں نہ اٹھائیں اس سے کیمیرہ کی قدرت کے امکانات بھی بہت وسیع ہو جاتے ہیں، پچھلے سال جو برف پڑی تھی اس سے اگلے سال کام لیا جاسکتا ہے، ایک ڈویس کے قطب مینار سے کوئی تہا ہے اور دریلے راوی میں آگرتا ہے، آپ کسی کمرے سے باہر قدم رکھتے، اپنے آپ کو شمالاً ماباغ میں پائے گا، خواہ آپ نے کمرے سے باہر نکلنے سے کسی سال پہلے یا کسی سال بعد شمالاً ماباغ میں قدم رکھا ہوگا۔

اب آپ پر واضح ہو گیا کہ فلم کے حدود کس قدر وسیع ہیں، اور ان کا دائرہ کہاں سے کہاں تک پھیلا ہوا ہے، فلم کا نقطہ نگاہ ایک نہیں کسی ہیں وہ جس راوی سے چاہے دنیا پر نظر ڈالے جس نقطہ سے چاہے مشاہدہ کرے اور سارے

جزئیات کو ایک ایک کر کے رکھا جائے اس میں یہ بھی قہمت سے کہ یہاں زمانہ و مکان پیدا کرے۔ اور اس پر سترادویہ کہ وہ ڈائریکٹر کی خواہش کے سوا کسی کا طابع نہیں، فلم کے سامنے ساری کائنات اور زمانہ کا لامتناہی سلسلہ پڑا ہے اسے اختیار ہے کہ زمانہ و مکان کے دائرے میں جتنے رنگارنگ جلوے ہیں ان میں سے جسے چاہے منتخب کرے اور جسے چاہے چھوڑ دے البتہ انتخاب بہت اہم کام ہے اور ایک فلم پر کیا موقوفیے ہر فن میں انتخاب کو اہمیت حاصل ہے۔ میں پہلے مثال کے طور پر "اے دو من آف پیرس" کے ایک سٹاٹ کا ذکر کر چکا ہوں، اس فلم کا ڈائریکٹر چارلی چپن تھا، اور یہ پہلا فلم تھا جو چارلی کی تگرانی میں تیار ہوا۔ لیکن اس میں خود اس نے پارٹ نہیں کیا بجز ایک نہایت ہی معمولی منظر پارٹ کے۔ جہاں تک ڈائریکٹر کے فرائض کا تعلق ہے، یہ فلم بہت کامیاب ثابت ہوا ہے۔ میں نے جو مثال پیش کی تھی، وہ آپ کو یاد ہوگی، اور ابھی آپ کے ذہن سے اس شخص کا خیال محو نہیں ہوا ہوگا، جس نے درازت سے دو سال نکالا، تو ایک مردانہ کار بھی گر پڑا، اس نے کار اٹھایا اور پھر مزے میں رکھ دیا، عورت کے مکان میں مردانہ کار کا پایا جانا اور مہمان کا اس پر اظہارِ تعجب نہ کرنا بخور کیجئے ایک کتنا بلیغ انداز بیان ہے جسے انتخاب کی بدولت جڑی باتوں میں کیا کیا زائکتیں بھری جاسکتی ہیں، اور کیا کیا معنی پہناؤں کے جاسکتے ہیں: ان مارسن، میں جس کا ڈائریکٹر ڈی ڈبلیو گرتھ تھا، ایک عورت دکھائی گئی جس کا فاونڈ کسی مقدمہ میں مانوڈ تھا، وہ بچھری اس انتظار میں بیٹھی ہے کہ مچھیں بیچ مقدسے کیا فیصلہ کرتا ہے، بہن صرف اس کا چہرہ دکھایا گیا ہے، یا ہاتھ نہیں بار بار مڑتی ہے، لیکن اس کا بے پناہ اثر ہوتا ہے، تشویش و فکر کے جتنے ٹھکانے ہو سکتے تھے، ان میں سے ڈائریکٹر نے صرف وہی منتخب کر لیے ہیں، جو سب سے زیادہ موثر ثابت ہوں۔

ایک اور مثال بتئے، پھلی گرمیوں میں لاسٹ پرفارمنس میں نامی ایک فلم لاہور میں دکھائی گیا تھا، پال چنوس ڈائریکٹر تھا، اور اڈویٹ ہیرڈ کا پارٹ ادا کر رہا

تھا کہانی کا موضوع تو کچھ ایسا شاندار تھا لیکن صنعتی اور فنی حیثیت سے یہ فلم جس صبح کمال کو پہنچا ہوا تھا اور ڈائریکٹر نے اپنی قابلیت کے جوکر سب سے دکھائے تھے، ان کے لحاظ سے بہت قابلِ تعریف تھا۔ اس میں سے ایک واقعہ پیش کرنا ہوں۔

ایک مداری ایک شعبہ دکھاتا ہے وہ یہ کہ اس کا ایک اسٹنٹ ایک صندوق میں داخل ہوتا ہے، صندوق کے چلوؤں میں سوراخ ہیں جو ایک ڈر کے قریب واقع ہیں۔ ان سوراخوں میں سے صندوق میں اس طرح تلواریں داخل کی جاتی ہیں کہ اس کا بیچ جانا نامکن معلوم ہوتا ہے تلواریں نکال لی جاتی ہیں لیکن اس کا بال تک بیجا نہیں ہوتا، تلواریں نکال لی جاتی ہیں صندوق کا ڈھکنا اٹھایا جاتا ہے تو وہ صحیح و سالم نکل آتا ہے تماشائی اس کے لیے پہلے ہی تیار بیٹھے تھے، اور بے چینی سے انتظار کر رہے تھے، کہ کب صندوق کا ڈھکنا اٹھائے۔ مقصود اس بے چینی کو بڑھانا اور کانپتے ہوئے دلوں کی ترجمانی کرنا ہے۔ صندوق سے تلواریں نکال کر اس طرح سیٹج پر کھڑی کر دی جاتی ہیں کہ ان کے قبضے اوپر کی جانب ہیں، اور نوکیں فرش پر دھنسی ہوئی ہیں، ڈائریکٹر کو اس مقام پر یہ فکر تھی کہ کسی طرح دیکھنے والوں پر اضطراب و پلے تاپی اور منفذب کی کیفیت طاری ہو جائے، چنانچہ اس نے ایک ایسا شٹ لیا جس نے تماشائیوں کو عجیب جھیں اور گورگو میں مبتلا کر دیا۔

مداری سیٹج پر کھڑا ہے اور اس کے سامنے تلواروں کا ایک کٹھن سا بن گیا ہے، کبیرہ نشیب میں رکھ دیا گیا تاکہ مداری کا سر تلوار کے دستوں کے عین اوپر نظر آئے، تلواروں کے دستے جو جمل ہیں اس لیے ان میں ایک لٹنٹس پیدا ہو رہی ہے، اصل جمل چمک رہے ہیں ان کے اوپر مداری کا ہونا کب چہرہ دکھائی دیتا ہے اس شٹ نے دیکھنے والوں پر وہی کیفیت طاری کر دی، جو آؤ کسر آؤ کے گھبیر لڑاں کا ڈھسے سے پیدا ہو جایا کرتی ہے۔

ایک اور فلم ایچ پوکن میں جس کا ڈائریکٹر آئن سٹائن تھا، ایک منظر دکھایا گیا

تھا کہ باغی اپنے جہاز سے اوڈیہ تعمیر پر گولہ بارسی کرتے ہیں اس منظر کے پہلے
 ٹاٹ میں توپ کونفار کرتے دکھایا گیا ہے، دوسرے ٹاٹ میں دکھایا گیا ہے کہ
 آتش گبر لوہ پھٹ گیا ہے، بہت بڑا دھماکہ ہوا جس سے تعمیر کا مچا ٹک کانپ
 اٹھا ہے اس کے بعد تین ٹاٹ آتے ہیں ایک میں تو ایک پتھر کا کاسٹیر
 دکھایا گیا ہے جو پڑا سو رہا ہے، اور دوسرے ٹاٹ میں شیر کی آنکھیں کھلی
 ہوئی ہیں۔ اور تیسرے میں شیر کھڑا نظر آتا ہے، یہ تینوں ٹاٹ ملا دیئے گئے
 ہیں، تو یہ نظر آیا کہ پتھر کا شیر ایک بیک کھڑا ہو کر چننے لگتا ہے ایک نفاذ کا
 خیال ہے کہ اس منظر سے وہی اثر ہوا کہ جو بجل پر تین چڑھتے ہوئے سر جانے
 سے ہوتا ہے، اس ضمن میں ہم یہ بتا دینا بھی ضروری سمجھتے ہیں، کہ جنگی جہاز کا منظر
 اوڈیہ میں لیا گیا تھا پتھر کے شیروں کی تصویریں کریمیا میں نلم بند کی گئیں تھیں،
 اور پھانگ کی تصویر ماسکو میں یہ گویا تخلیقی جغرافیہ کی ایک اور مثال ہے،
 اب ایک اور مثال سنئے، یہ موضوع کے سن انتخاب کی مثال نہیں بلکہ
 اس سے میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ جس تلویہ سے ٹاٹ لیا جاتا ہے اس کے
 انتخاب میں کتنی لقیاط برتی جاتی ہے، 'ڈیول' جو ہندوستان میں 'دیرائی' کے
 نام سے دکھایا گیا ایک ایسا نلم تھا جس کے لیے: 'ایل جنگل' ایکڑ اور دو پان
 نلمساز مستحق تھیں ہیں، تماشائیوں کو ہل کی چھت کے وسط میں جو بہت بلند
 تہ بازی گر بھرتے نظر آتے ہیں، اور بازی گروں کو کبھی چھت میں برقی روشنی
 کے قفقے دیپاریں اور تاشائی نظر آتے ہیں، یہ سب جوسے ان کی نگاہوں میں
 اس طرح آتے ہیں گویا نظریں سمندر کی لہروں کا آمار چڑھاؤ دیکھ رہی ہیں، یہ
 مختلف مناظر یکے بعد دیگرے نہایت سرعت کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں، تو
 ہر گھومنے لگتا ہے اگر کسی دوسرے زاویے سے تصویر لی جاتی تو، اثر پیدا کرنا
 ناممکن تھا۔

ادھر کی مثالوں سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ تصویروں کے انتخاب میں کتنا مخور
 فکر کیا گیا ہو گا، اور پھر ان سے دیکھنے والوں پر جو اثر ہوا اسے پیش نظر رکھئے،

تو فلم کار کے حسن انتخاب کی داد دینا پڑتی ہے، یہ کیمیرے کا کارفرمایاں نہیں بلکہ فلم کار کے دماغ کی کرشمہ سازیاں ہیں کیمیرہ دیکھتا بھی ہے اور دکھاتا بھی سکتا ہے لیکن یہ فیصلہ کرنا تو فلم کار ہی کا کام ہے کہ وہ کیا دیکھے اور کیا دکھائے۔

فلم کے نام لے لینے کا فن جوں جوں ترقی کرتا جاتا ہے، فلم کار کو ایسے نئے نئے طریقے ملتے آتے جاتے ہیں جن کی بدولت وہ فلم کی جزئیات کو نمایاں کر کے پیش کر سکتا ہے ان نئے نئے طریقوں کے طفیل ڈائریکٹر کو یہ قدرت حاصل ہو گئی ہے کہ وہ اظہار واقعات پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ اہم واقعات کو زیادہ نمایاں اور واضح کر کے پیش کرتا ہے۔ ان میں رنگ بھرتا ہے اور جو واقعات زیادہ توجہ کے محتاج ہیں انہیں ہمارے ذہن پر نقش کر دیتا ہے۔

تصویر کو واضح اور نمایاں طور پر پیش کرنے کا ایک طریقہ کلنڈ اپ یا قریب شات سے کیمیرہ پھینچے جاتا ہے تو قریب شات سے وسطی شات تک پہنچتا ہے اور وسطی شات سے ہٹتا ہے تو بعیدی پر آٹھرتا ہے گو یا جوں جوں جزوی حرکات کی اہمیت کم ہوتی جاتی ہے وہ پھینچے جاتا جاتا ہے جب تصویر بدیم ہو جاتی ہے تو غائب ہو جاتی ہے تو تماشائی کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ معمول سے رفتہ رفتہ جدا ہو رہا ہے۔ اور جب وہ آہستہ آہستہ ابھرتی ہے تو جذبات اس کے برعکس ہوتے ہیں، ان کے علاوہ بعض اوقات کیمیرہ گھومتا ہے، اور پوز سے منظر کو فلم بند کر لیتا ہے بعض اوقات سداوید منظر سامنے ہوتا ہے تمام جزئیات دکھائی دیتی ہیں، اور پھر کسی ایک جگہ پر تماشائی کی توجہ مرکوز بھی کر دی جاتی ہے مین کوئی چیز جسے نمایاں کرنا مقصود ہو ایک چھوٹے سے طبقہ میں اس طرح دکھائی جاتی ہے کہ وہ ہماری توجہ جذب کر لیتی ہے پھر کبھی ایک شات میں تبدیل ہو جاتا ہے ان مختلف طریقوں کو فلم سازی میں جو اہمیت حاصل ہے وہ ہندواں محانا بیان نہیں۔

اب تدوین یعنی ایڈیٹنگ کو لے لیں جسے فلم سازی کا آخری مرحلہ سمجھنا چاہیے ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب سارے ڈرامے کو فلم بند کر لیا جاتا ہے، تو سولو لاند کو

کاٹ کر شاٹ انگ انگ کر لئے جاتے ہیں پھر مرشاٹ میں کسی قدر قطع و برید ہوتی ہے اور آخر کار سب شاٹ مناسب ترتیب و تسلسل سے جوڑ دیئے جاتے ہیں۔ انگلستان اور امریکہ میں تو بجائے خود ایڈیٹر کو چنداں اہمیت نہیں دی جاتی۔ فلم کے بگڑنے اور بننے کا مرحلہ ہو جاتا ہے تو کہیں ایڈیٹر کی باری آتی ہے۔ اور اس کے کام کو فلم سازی کے دوسرے معنوں کے مقابلے میں رکھا جائے تو بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایڈیٹر کو زیادہ دائمی محنت صرف نہیں کرنا پڑتی، وہ مشین کی طرح ایک ہی دھڑے اور بندھے ہوئے قاعدہ پر چلتا ہے یعنی مختلف شاٹ جمع ہو جاتے ہیں تو انہیں کاٹ کر جوڑ دیا جاتا ہے لیکن روسی اور جرمنی ڈائیکٹر تدوین کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ اسے تدوین کی بجائے تعمیر کہتے ہیں ان کے نزدیک تدوین میں طبیعت کی اپنی اور تخلیقی قوت کے جوہر دکھانے کی ضرورت ہے میں بھی اس معنوں کے اغراض کے لیے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ تدوین کو محدود چیز نہ سمجھا جائے اور اس کے یہ وسیع معنی مراد لیے جائیں ورنہ بعض باتوں کے لیے مجھے انگریزی کا نام قائم کرنے پڑیں گے۔ ایک مرتبہ کلیسیا نے کہا تھا کہ تمام فنون لطیفہ میں دو چیزیں ضروری ہیں، اول مولد دوم اس کی ترتیب کا اسلوب یہ ضروری ہے کہ مواد کو اس فن سے خاص مناسبت ہو مصلحتاً مواد مختلف رنگ ہیں جنہیں وہ کینوس کی سطح پر ترتیب دیتا ہے منحنی کے نزدیک آوازوں میں بن کے مطابق مرتب

کتاب ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ فلم ساز کے پاس کس قسم کا مواد موجود ہے اور اس کی ترتیب کا طریقہ کیا ہے کہ انہیں ایک خاص تسلسل سے جسے ذہن کی تخلیقی قوت معلوم کر سکتی ہے جوڑ دیا جائے۔ وہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ کام لوگوں کے نزدیک فلم سازی کا فن ایڈیٹر کی حکمت و سکنت سے شروع ہوتا ہے اور شاٹ پر قائم ہو جاتا ہے لیکن یہ وسائل مواد کی ذراہم کے مدارج میں فلم ساز کا اصل کام تو اس وقت شروع ہوتا ہے جب ڈائریکٹر فلم کے مختلف مرحلوں کو آپس

میں جوڑنے لگتا ہے کیونکہ انہیں جیسے جوڑا جائے ویسے ہی معنی پیدا ہوتے ہیں۔

فلم ایڈیٹر کے ذمہ دو باتیں ہوتی ہیں ایک تو اس امر کا فیصلہ کہ شاٹ کتنا لمبا ہے دوسرے یہ بات کہ شاٹ کس ترتیب سے جوڑے جائیں ان دونوں باتوں میں سے ترتیب کو زیادہ اہمیت حاصل ہے کیونکہ فلم کے معنی کا اختصار اجزاء کے سیاق و سباق اور ان کے باہمی ربط پر ہے جس طرح ایک جملے کے معنی کا اختصار الفاظ کی ترتیب پر ہے اسی طرح فلم کے معنی بھی اجزاء کی ترتیب کے مطابق ہوتے ہیں، مثال کے طور پر یہ جملے لے لیجئے، کتے نے آدمی کو مار ڈالا، آدمی نے کتے کو مار ڈالا، دیکھئے لفظوں کی ترتیب میں تھوڑے سے الٹ پھیرنے سے جملے کے معنی بدل ڈالے یہ مثال فلم پر پوری طرح منطبق ہوتی ہے، ایک مستبم چہرے کا شاٹ لیجئے، دوسرا شاٹ ایک بچے کا ہو جو کھلونے سے کھیل رہا ہو، اور تیسرا شاٹ اسی چہرے کا لیکن اب تبسم کی

بجائے آبرو پر بل پڑے ہوئے ہیں، اگر یہ تینوں شاٹ اسی ترتیب سے دکھائے جائیں تو آپ ان کو دیکھ کر یہ سمجھیں گے کہ یہ شخص بچے کو دیکھ کر خوش نہیں ہوا اب ساری ترتیب الٹ دیکھئے، یعنی آخری شاٹ پہلے آجائے اس کے بعد بچہ کھیلتا نظر آئے پھر مستبم چہرہ دکھائی دے تو اس کے معنی بالکل بدل جائیں گے، اسی مثال سے پہلے آپ کو معلوم ہو گا کہ جو شخص فلم کے اجزاء کو ترتیب دیتا ہے اسے ڈائریکٹر کہہ لیجئے یا ایڈیٹر کے نام سے پکارے، یہ بہر حال وہی فلم کا تہم و اہم ہے، فلم کی کامیابی میں ایڈیٹر کی ہنرمندی کو کوئی دخل نہیں۔

بعض روسی ڈائریکٹر تو تدوین کی قدرت کے اس حد تک تامل ہیں کہ ان میں سے ایک نے تدوین کی رنگارنگیوں کو واضح کرنے کے لئے ایک لپٹا تجربہ کیا ہے اس نے لس نلم سے مشہور روسی ایڈیٹر موس یوین کے لئی کلوڈ اپ یعنی قریبی شاٹ لے اس نے کلوڈ اپ بھی ایسے منتخب کئے تھے جن میں ایڈیٹر کو صدمہ، کسم، طفل کے اثرات نظر نہیں آتے ہیں، پھر اس نے اپنی فلم

کے دوسرے ٹکڑوں کے ساتھ تین مختلف طریقوں پر شاٹ جوڑ دیا ایک کلوز اپ کے ساتھ ایک شاٹ جوڑا جس میں میز پر شور بے کی ایک پلیٹ پڑی دکھائی گئی تھی، ان دونوں کے ملانے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موس یوخین شور بے کی جانب دیکھ رہا ہے، دوسری مرتبہ اس نے اسی کلوز اپ کے ساتھ ایک اور شاٹ جوڑا جس میں ایک مردہ عورت کا تابوت دکھایا گیا تھا، تیسری مرتبہ اس نے ایک رمل کا شاٹ یا جو کلونوں سے کھیل رہی ہے اور اسے موس یوخین کے کلوز اپ سے جوڑ دیا، اس ڈائریکٹر نے لندن کن فلم سوسائٹی کے سامنے اس کے نتائج کی رپورٹ داستان ان الفاظ میں بیان کی تھی۔

جب یہ تینوں تصویریں ایسے لوگوں کو دکھائی گئیں جو اس راز سے واقف نہ تھے تو ان پر حیرت انگیز اثر ہوا، لوگ اچھڑنے لگے، کان قن کی تڑپیں کرتے نہ چھلکتے تھے، انہیں پہلی تصویر میں اچھڑنے کے چہرے پر فکر اور سوچ کے آثار نظر آئے اور ایسا معلوم ہوا کہ وہ شور بے کی پلیٹ کو بھول چکا ہے اور اس کی طرف اب کھنٹی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے، دوسری تصویر پر انہیں اچھڑنے کے چہرے پر حزن و دلال کی کیفیات نظر آئیں گویا مردہ عورت کا تابوت دیکھ کر اسے بہت قلق ہوا ہے، تیسری تصویر میں انہیں اچھڑنے کے ہنٹوں پر بکا سا تبسم دکھائی دیا، جو گویا لڑکی کو کھیلنے دیکھ کر پیدا ہو گیا تھا، لیکن ہم جانتے تھے کہ تینوں تصویروں میں ایک ہی چہرہ ہے جس سے اصلاً کوئی جنتہ ظاہر نہیں ہوتا۔

اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ فلم سازی میں جتنے لوگ حصہ لیتے ہیں ان میں سب کو کوئی نہ کوئی اہمیت حاصل ہے، بجز اچھڑنے کے ہم میں ان لوگوں کی تعداد زیادہ ہے، اچھڑنے کو اتنا بے حقیقت نہیں سمجھتے، تاہم اتنا تو ماننا پڑے گا کہ شاٹ کے اثر کا انحصار اس کے سیاق و سباق پر ہے اور یہ ظاہر ہے کہ فلم کے اجزاء کی ترتیب میں اچھڑنے کو مطلق کوئی دخل نہیں۔

لیکن فلم کے مختلف اجزاء کو مرتب کر دینا ہی کافی نہیں، ایڈیٹر میں یہ سمجھنا پڑتا ہے کہ اجزاء کی لمبائی کتنی ہو کیونکہ جس طرح موسیقی میں نہ صرف

سروں کا آنا سڑھاؤ بلکہ ان کی کمی بیشی ہمیں اپنا اثر پیدا کرتی ہے اس طرح فلم
 میں یہی شائوں کی کمی بیشی سے خاص خاص تناسب اور آہنگ پیدا ہوتے ہیں
 اور ان سے دیکھنے والوں پر مختلف قسم کے اثرات طاری ہوتے ہیں یہ آہنگ
 دناسب کا سوال ذرا زیادہ ماسا ہے اور اس قابل ہے کہ سینما سے شفقت رکھنے
 والے لوگ جن کا مطالعہ مجھ سے زیادہ وسیع ہے اس جانب توجہ کریں،
 میں صرف چند نذر دسی باتیں بیان کرنے پر اکتفا کروں گا،

میں اس جگہ صرف دو مثالیں پیش کروں گا یہ مثالیں پڑوکن نے یہ
 ظاہر کرنے کے لئے پیش کی ہیں، کہ مختلف مقاصد کے لیے آہنگ میں کیا تبدیلی
 ہوتی ہے یعنی شاٹ پے در پے جس رفتار سے آتے ہیں وہ رفتار کس طرح بدلتی
 رہنی چاہئے اس سے منشا بھی معلوم ہوتا ہے کہ مناظر کو نظم بند کرنے میں وقت
 و محل کے اعتبار سے کیا کیا خاص طریقے اختیار کئے جاتے ہیں،

سخوان

۱۔ مزدور ملک بنا دت فرد کردی گئی۔

۱۱۔ تصویر آہستہ آہستہ نیلیاں ہوتی ہے اور زمین پر عالی سہار توں اور
 بندوقیں پڑی نظر آتی ہیں۔

۱۲۔ کبیرہ گھما کر پورے منظر کا شاٹ لیا جاتا ہے اور لینز کے سامنے سے ایک
 لمبا پشہ گزرتا ہے جس پر مزدوروں کی لاشیں پڑی ہیں،

۱۳۔ ان میں ایک عورت بھی ہے جس کا سر پیچھے کی طرف جھکا ہوا ہے ایک
 ٹوٹے ہوئے کھینے کے ساتھ ایک پٹا ہوا قبضہ اٹکا ہوا ہے، یہ شاٹ اگلے
 شاٹ میں تحلیل ہو جاتا ہے۔

۱۴۔ قریب سے شاٹ لیا جاتا ہے۔ عورت جس کا سر پیچھے کی طرف جھکا ہوا
 ہے، لینز کی طرف گھور گھور کر دیکھتی ہے، یہ شاٹ اگلے شاٹ میں تحلیل ہو جاتا
 ہے۔

۱۵۔ پٹا ہوا قبضہ ہوا میں ہرتا ہوتا ہے۔

یہ تو ایک ابتدائی واقعہ کی مثال ہے جس میں سکون بلکہ سکون اور غم لایا جاتا ہے ایک شاٹ ڈیڑھے میں اس لئے قیام ہو جاتا ہے تاکہ نگاہ کے سامنے آہستہ آہستہ آئے۔ اور اس سکوت و سکون کی پوری کیفیت معلوم ہو جائے۔ کبیرہ گھما کر پورے منظر کا شاٹ لیا جاتا ہے اور تصویر کے آہستہ آہستہ نمودار ہونے اور غائب ہونے سے بھی یہی واضح کرنا مقصود ہے کہ ظلم کا یہ منقرض حقہ بذاتِ خود ایک واقعہ کی سی اہمیت رکھتا ہے اب ایک پُر شور اور ہنگامہ فیز واقعہ کی مثال پیش کی جاتی ہے۔

۱۱۔ ایک گوشے سے مزدور کا جم غفیر دوڑتا نظر آتا ہے وہ بینز کی جانب بڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ بیکے بعد دیگرے لینز کے سامنے سے گزر جاتے ہیں۔

۱۲۔ ایک مزدور ایک آہنی سلاخ پر سے کودتا ہے اور بھاگتا ہوا چلا جاتا ہے پھر ایک بیک مٹھرا جاتا ہے اور پکارا مٹھرا ہے۔
عنوان

نسب سے پہلی دکان کو بچاؤ

۱۳۔ ایک مزدور کرین پر چڑھ جاتا ہے۔

۱۴۔ وہاں ہوا میں بلند ہوتا ہے بھاپ کی سیٹی بجتی ہے

۱۵۔ مزدور کرین پر چڑھا ہے اسے بھک کر نیچے دیکھتا ہے

۱۶۔ مزدور بھاگتے دکھائی دیتے ہیں (یہ شاٹ اوپر سے لیا گیا ہے)

۱۷۔ مزدور جو کرین پر پوری قوت سے چلتا ہے۔

پہلی دکان کو بچاؤ

۱۸۔ اوپر سے شاٹ لیا گیا ہے۔ بھاگتے ہوئے مزدور مٹھرا جاتے ہیں تھوڑی

دیر توقف کرنے میں اور پھر بھاگ نکلتے ہیں

۱۹۔ ایک عودت ان سے ٹکرا کر گر پڑتی ہے۔

۱۱۰۔ کلوز اپ دکھایا جاتا ہے عودت گر کر پھوٹ کھڑی ہوتی ہے اور لہنا

سردیوں کے حصول سے تمام یقینی ہے۔

۱۱۔ مزور بھاگتے دکھائی دیتے ہیں۔

اگر ان میں سے کوئی شاٹ پر وہ پر اپنے اصلی وقت سے آدھریکٹ زیادہ دکھایا جائے تو سارا شاٹ بھگ میں مل جائے گا اور بھاگتے پر آکرنا مقصود ہے پیدا نہیں ہوگا۔

اب اس سے بھی زیادہ آسان مثال لیجئے یہ بھی پڑوکن نے ہی پیش کی ہے اور کس بازار کے ماوٹے کے متعلق ہے ماوٹہ اس طرح دکھایا گیا ہے۔
۱۔ ایک بازار دکھائی دیتا ہے جس میں گاڑیاں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں ایک راگنر بنار کو عبور کرتا ہے اس کی پشت کیمرے کی جانب ہے، پاس سے ایک موٹر کار گزرتی ہے جو اس کے اور کیمرے کے درمیان مائل ہو جاتی ہے۔

۲۔ موٹر ڈرائیور کے چہرے کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے وہ بریک پر قدم رکھتا ہے اور گھبراہٹ ہو کر نظر آتا ہے۔

۳۔ جو بد نصیب حادثے کا شکار ہوتا ہے، اس کے چہرے کی ایک جھلک نظر آتی ہے اس نے چیخ مارتے کے لئے منہ کھول دیا ہے۔

۴۔ یہ شاٹ موٹر ڈرائیور کی نشست سے لیا گیا ہے۔

گھومتے ہوئے چہرے کے قریب ڈانگیں نظر آتی ہیں۔

۵۔ موٹر کے پیچھے گھومتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

۶۔ گاڑی ٹھہر گئی ہے اور اس کے پاس لاش پڑی ہے۔

اس واقعہ میں اگر مرتے والے کا منہ دیکھنے کے بجائے ایک منٹ تک

کھلا رکھا جائے تو سارا اثر خاک میں مل جاتا۔

یہ تو تعمیری تدوین کی مثالیں ہیں۔ یہ مضمون ختم کرنے سے پہلے میں چاہتا

ہوں کہ تدوین کے اس اہم شعبہ پر بھی اچھی ہوئی نظر ڈالی جائے۔ جیسے

اصطلاحات میں تخلیقی تدوین کہتے ہیں جس میں ایڈیٹر کے ذہن رسا کے عجیب

عجیب کرشمے نظر آئیں۔

میں گزشتہ اوراق میں دی لاسٹ پینڈ منٹیں نام ایک فلم کا ذکر کر چکا ہوں۔ اس فلم میں ایک واقعہ بھی ہے کہ چند اشخاص مقبوضہ میں بیٹھے تماشاً دیکھ رہے ہیں اور ایک پیشہ ور ماہر سمرینم ان پر عمل کر رہا ہے اب اس عمل کا اثر فلم کے ذریعے دکھانا مقصود ہے اور فلم کے لئے حقیقتاً یہ موضوع بہت مشکل ہے جو عمل پیدا کرنے کے لیے پہلے عامل کے چہرے کا قریبی شاٹ لیا۔ اس کی آنکھیں چند اشخاص کے چہرے پر جمی ہوئی ہیں، اوروہ انہیں گھور گھور کر دیکھ رہا ہے اس کے ساتھ ہی ایک اور تصویر اس طرح دکھائی گئی کہ دونوں تصویریں ایک دوسرے کے بیچ میں جھلملاتی نظر آتی تھیں اس دوسری تصویر میں بڑے بڑے ادنیٰ مکانات جیسے نئے نئے میں جھومتے دکھائے گئے ہیں۔ یہ شاٹ دوسرے شاٹ میں تحلیل ہو جاتا ہے اور جس میں وہ تماشائی نظر آتے ہیں جن کا ذکر ہو رہا ہے، جب عالم کا چہرہ آہستہ آہستہ غائب ہو جاتا ہے۔ کیمرا پیچھے ہٹتا ہے اور دھندک سے تماشائیوں کے چہرے ابھرتے نظر آتے ہیں اور کیمرا قریب آ جاتا ہے یہ تمام شاٹ خاص آہنگ و تناسب سے کیے بعد دیکھے دکھائے جاتے ہیں اور کہیں دوسرے میں تحلیل ہو جاتے ہیں، اس طرح پردے پر رنگارنگ شکلیں نظر آتی ہیں۔ کوئی دیکھے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہے کوئی پیچھے ہٹتی ہے کوئی آگے بڑھتی ہے اور کوئی بھوم رہی ہے چنانچہ اس کا اثر بے حد صدمت آگیز ہوتا۔۔۔۔۔ ایڈیٹر تماشائیوں پر اس قسم کے جو اثرات طاری کر دیتا ہے ان کا تجزیہ آسان نہیں چنانچہ اس کے کال فن کی مثالیں مہیا کرنا مشکل ہے۔ پڑھکن تے اپنی فلم دی اینڈ آف سینٹ پیٹرز برگ سے ایک مثال پیش کی ہے جسے اسی کے الفاظ میں بیان کرتے ہیں وہ لکھتا ہے کہ جنگ کے مناظر کے آغاز میں میں ایک ہونک دھماکہ دکھانا چاہتا تھا اور کہہ دھماکہ اپنی پوری قوت کے ساتھ فلم کے پردے پر نمودار ہو جائے، میں نے بہت سا ڈائنامیٹ زمین میں دفن کر دیا پھر اسے اڑایا اور اس کا شاٹ

یا اس سے بڑا دھماکہ تو پیدا ہو گیا لیکن یہ نغم کے کسی نام نہ تھا پڑے پر محض ایک بے جان سی حرکت دکھائی دی بہتر سے تجربات کے بعد آخر کار میں ظلم کے پردے پر دھماکہ ہوتا اور اس کے تمام اثرات دکھانے میں کامیاب ہو گیا اور وہ بھی یوں کر ڈائنامیٹ کے دھماکے کا جوشاٹ لیا اس کا کوئی متکرمہ استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی میں نے ایک مشعل سے دھوئیں کے بادل پیدا کئے اور شور و شوش و تصادم کا اثر پیدا کرنے کے لیے بگنزم فتیلہ سے کام لیا اس ٹاٹ کے درمیان میں نے ایک دریا کا شاٹ بھی داخل کر دیا جو میں نے اس سے پہلے کسی زمانہ میں لیا تھا اس طرح پردے پر وہ مرنی مشکل آگئی جسے میں پیدا کرنا چاہتا تھا دھماکہ تو پیدا ہو گیا لیکن اس عرض کے لیے کوئی ایسی چیز استعمال نہ کی گئی تھی جو درحقیقت دھماکہ پیدا کرنے کے لیے استعمال کی جاتی

تھی۔

میں اس مثال کی روشنی میں آپ پر ایک مرتبہ پھر واضح کر دیتا چاہتا ہوں کہ دراصل تدرین ہی نغم کو منہم دیتی ہے فطرت محض نام مواد مہیا کرتی ہے جس سے اینڈیٹرا اپنی دنیا آپ پیدا کر لیتا ہے حقیقت اور نغم میں یہی تعلق ہے۔۔۔ نغم کے مضمون کو انہی الفاظ پر نغم کر دینا چاہئے میرا یہ مضمون سینما کے مبادیات سے تعلق رکھتا ہے، ہندوستان میں رہ کر جو لوگ سینما کا مطالعہ کرتے ہیں انہیں کئی دشواریاں پیش آتی ہیں خوش قسمتی سے لاہور میں دنیا کے بعض بہترین نغم دکھائے گئے ہیں جن کی وجہ سے لاہور کی خوش قسمتی انگلستان کے بڑے بڑے شہروں کے لئے بھی قابل رشک ہو سکتی ہے لیکن انہوں نے کہ سینما کے درپرست ماکوں اور تقلید پسندوں کے نزدیک ابھی تک اکثر نغم نغم مردود ہیں جنہیں انسانی ذہن و عقل میں عظیم ترین کامیابی سمجھنا چاہیے اور ہمیں ان کے دیکھنے سے محروم کر دیا جاتا ہے

امید ہے جب آپ اس نغم کی جیو یوں کو میری دوسری نامیوں کے ساتھ مل کر دیکھیں گے تو آپ کو مضمون غنیمت معلوم ہوگا۔

خطباتِ پطرس

تذقیہ

- مشکوٰۃ توفیقیہ پر پہلی تقریر
" " " " دوسری تقریر
" " " " تیسری تقریر
تقریر اول جنرل اسمبلی

مسئلہ تونیسیہ

پاکستان کے مستقل نمائندہ پروفیسر احمد شاہ بخاری کی اس تقریر
 کا متن جو انہوں نے ۱۴ اپریل ۱۹۵۴ء کو حفاظتی کونسل میں تونیسیہ کے
 مسئلے پر کی۔ پروفیسر مرحوم اس اجلاس کے صدر بھی تھے:—
 اس اجلاس کے مقررین کی فہرست میں اگلا نام پاکستانی وفد کا ہے اگر میرے
 رفکار کو اعتراض نہ ہو تو میں پاکستان کے نمائندے کی حیثیت میں تقریر شروع
 کر دوں۔

فرانس کے نمائندے نے اس معاملے کے متعلق جو خیالات ظاہر کئے ہیں میرے
 وفد نے انہیں اسی طور اور توجہ سے سنا جن کے وہ مستحق تھے۔ مجھے یہ معلوم کر کے
 خوشی ہوئی تھی کہ فرانسیسی نمائندے نے اے ایجنڈا منظور کرنے کے ضمن میں طریق کار
 کی بحث کے متعلق سب سے پہلے تقریر کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ تاہم جب
 انہوں نے اس مسئلے کو اے ایجنڈے میں شامل کرنے کی مخالفت کی تو میری خوشی
 چھرت میں بدل گئی۔ حیرت اس لئے نہیں ہوئی تھی کہ فرانسیسی وفد کی طرف سے
 اس قسم کے رویہ کی توقع نہ تھی۔ اس لئے ہونی کماصل مسئلے کو اے ایجنڈے میں شامل
 کرنے سے تو سخت اختلاف کیا اور تقریر سب سے پہلے سوال اے ایجنڈے سے پر جانے
 کے بعد ہی کی جاسکتی تھی۔ ظاہر ہے کہ نمائندے نے یہ طرز عمل بظاہر اس لئے
 اختیار کیا کہ کم از کم اسے واقعی سیر حاصل بحث ضروری محسوس ہوئی۔ جب واقعہ

ہے تو اس کا یہ کہنا ہمارے لئے یقیناً حیرت کا موجب ہے کہ وہ راجنٹسے کی منظوری کے خلاف رائے دے اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسے خود تقریر کئے موقع کی تلاش تھی۔ اسے موقع مل بھی گیا اور اس سے فائدہ بھی اٹھایا گیا۔ گویا ایجنڈا منظور ہو چکا تھا۔ مگر وہ دوسروں کو اس موقع سے محروم رکھنا چاہتا ہے۔ بلاشبہ دوسرے جو لوگ اس میز کے گرد جمع ہیں انہیں اس موقع سے محروم نہیں کیا جاسکتا کیونکہ انہیں بحث میں حصہ لینے کا ٹھیک ویسا ہی حق حاصل ہے جیسا فرانس کے نمائندے نے اپنے لئے حاصل کرنا مناسب جانا۔ لیکن یہ بات ایک حد تک نا فاجیب و غیر مناسب ہے کہ خود تو تقریر کر لی اور فرانس کا نقطہ نگاہ پیش کر دیا۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ بڑی قاطعیت سے پیش کیا گیا اس نمائندے کی حد تک ایجنڈا منظور ہو چکا تھا۔ پھر راجنٹسے کی منظوری کی مخالفت کے دس دوسرے وفد کو انہار رائے کا موقع دینے سے اختلاف کی کوشش ان کے حقوق پر بھاپہ مارنا ہے جہاں اس فرض سے حفاظتی کونسل کو تحویری وغویں بھیج چکے تھے۔

نمائندہ فرانس نے اپنی تقریر میں جس منطق کا سہارا لیا ہے مگر اس کی دہری کی جلتے تو نہ محض یہی ضروری نہیں کہ ایجنڈا منظور کر لیا جائے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ان دس وفد سے کہا جائے کہ وہ فوراً حفاظتی کونسل میں اپنی نشستیں سنبھال لیں اور فرانس کے زاویہ نگاہ کی مخالفت میں اپنا موقف پیش کریں۔ واضح ہے کہ یہ وفد ان قوموں سے تعلق رکھتے ہیں جو ہمیشہ اقوام متحدہ کی رکن ہیں اور اس معاملے کے متعلق حفاظتی کونسل سے درخواست کر چکی ہیں۔

فرانس کا نمائندہ تو ایک قدم اور آگے بڑھ گیا یعنی دس وفد نے حفاظتی کونسل کے نام اپنے مکتوبات کے ساتھ جو تو منیجی نوٹ اور خوشگوار ریپارک سناٹہ

فرانس کے نزدیک ناخوشگوار۔۔۔ بچھے تھے ان میں سے وہ تمام عبارتیں بڑھ دیں جن کی تسدید اس کے خیال کے مطابق ضروری تھی۔ موصوف نے نہ صرف ان باتوں کا جواب دینے پر زور فصاحت صرف کیا بلکہ انہیں بہتان سے بھی تعبیر کیا۔ یاغیاہ دیگر اتوں نے کیا رہ لملک پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے حکومتِ فرانس کے خلاف بہتان آمیز بیان دیا ہے۔ میں پاکستان کے نمائندے کی حیثیت سے اس الزام تراشی کے خلاف احتجاج کرتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ دوسرے دس وفد بھی۔۔۔ اگر انہیں اظہارِ خیال کا موقع ملتا تو۔۔۔ اس کے خلاف احتجاج ہی کریں گے۔ نہ ہمارا یہ منصب ہے، نہ ارادہ اور نہ خواہش کہ ان کے عظیم ملک کو یا اس کی حکومت کو غیر ذمہ دار طریق سے بہتان طرازی کا نشانہ بنائیں۔

فرانس کے نمائندے نے اپنی تقریر میں متعدد واضح اشارے کئے ہیں اور رمز و کنایہ سے بھی کام لیا ہے۔ مثلاً انہوں نے کہا کہ ہم دس یا گیارہ سادہ لوح قوموں کے پیس ڈی جلیو کی رفاقتوں میں سوچے سمجھے بغیر بعض غیر ذمہ دار لوگوں کی باتیں سن لیں۔ پھر ہم نے وہ قدم اٹھالیا جو ہرگز اٹھانا نہیں چاہیے تھا۔ مجھے اس بات پر خوشی ہے کہ موصوف نے ایسی بات کہہ کر مجھے یہ بیان کرتے کا موقع دیا کہ ہم نے کس درجہ صبر و تحمل سے کام لیا۔ ذمہ داری کے احساس کا کتنا اچھا ثبوت دیا اور کتنے تامل و تدبیر سے یہ معاملہ موردِ غرض کی فرضِ حفاظتی کونسل کے سامنے لائے ہیں۔

اب ساری دنیا کو معلوم ہو چکا ہے کہ حکومتِ تونسہ کے دو وزیر۔۔۔ ایسے وزیر جنہیں اپنی وزارت کے زلمے میں حکومتِ فرانس کا اعتماد بھی حاصل تھا۔۔۔ پیرس پہنچے۔ حفاظتی کونسل کے صدر کو ایک مکتوب بھیجا۔ جس میں کونسل کی توجہ تونسہ کے بعض افسوس ناک اور اہم انگیز حالات کی طرف منطقت

کرائی۔ اس خط کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ یہ مکتوب سیلویل عرصے تک اقوام متحدہ کے دفتر خانہ میں پر مہلک سوچ کی کڑی نگرانی سے پیرس کے "پلیس ڈی چیلو" میں بھروسہ کیے اور نہ نیویارک کے اس ایوان میں جس میں بے شمار کھڑکیاں موجود ہیں۔ اسے لوگوں کی نگاہوں تک پہنچنا اس دن نصیب ہوا۔ جب مہرے وفد نے درخواست کی کہ اس کی نقلیں تمام ارکان کے پاس بھی جائیں۔

اگرچہ ہمیں معلوم تھا کہ یہ مکتوب حفاظتی کونسل کے صدر کو پہنچا یا گیا تھا اور ہم کے مانند سے ایک وفد کی شکل میں جنرل اسمبلی کے صدر سٹریٹ لارڈ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے استدعا کی کہ وفد فرانس سے نیز اس کی وساطت سے حکومت فرانس سے کہا جائے کہ اہل تو نیسیہ کو باہوس کی اس منزل پر نہ پہنچا یا جائے جس کے بعد انسان ننگ آمد بھنگ آمد کا مصداق بن جاتا ہے۔ اس عالم کا تقاضا یہی ہے۔ مقاصد حفاظت کا تقاضا یہی ہے اور قوموں کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم رکھنے کا تقاضا بھی اس کے سوا کچھ نہیں۔

جنرل اسمبلی کے صدر نے ہمارا پیغام پہنچا دینے کا وعدہ کر لیا اور اسے پورا کیا۔ ہم انتظار کرتے رہے۔ پلیس ڈی چیلو کے بلڈوں میں سرسید دارگشت لگانے والے لوگ یونس کے ذریعہ تھے بلکہ ہم تھے جو بھاگ دوڑ کرتے رہے۔ ہم اس پیغام کے جواب یا اس سلسلے میں کسی اشارے کا انتظار کرتے رہے انہوں نے نہ کوئی جواب ملا اور نہ کوئی اشارہ ہوا۔

مزید انتظار کے بعد ہم ایک مرتبہ پھر جنرل اسمبلی کے صدر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے کہا کہ ہمارے جذبات حکومت فرانس تک ایسے ذرا نفع سے پہنچا دینے یا جن جنہن ممبر خیال فرمائیں۔ یہ بھی بتا دیا کہ ہمارے لئے قدرتی اور معمول کے ہیں۔ ان کا یہ نکتہ ہمارے لئے نکتہ ہمارے لئے قدرتی اور معمول کے ہیں۔ ان کا یہ نکتہ ہمارے لئے نکتہ ہمارے لئے قدرتی اور معمول کے ہیں۔

اجلاس میں کرتے۔ لیکن اس اجلاس کے آخری آلام میں بھی اچھا علوم نہ ہو کہ اقوام
 متعدہ کے کام میں مشکلات اور پھیدگی پیدا کر دیں۔ صد نے ہم سے پھر وہ وہ
 یہ بھی جانتے تھے کہ اسی دور میں نوٹیسہ قتل عام، قساعات، گرفتاریوں اور توجہ
 کاروائیوں کی جو لالنگاہ بنا ہوا تھا۔۔۔ میں رفت تشدد کے واقعات کا ذکر کر
 رہا ہوں اور اس مرحلے پر کسی کو ان کے لئے ذمہ دار نہیں ٹھہرانا چاہتا۔۔۔
 اس سارے علم کے باوجود ہم صرف اس امید پر پرٹے صبر و تحمل سے انتظار کرتے
 رہے کہ حکومت فرانس خود دانش مندی سے کام لے گی موقع کی نزاکت کا احساس
 کرے گی۔ ان لوگوں کے ساتھ خونگوار سمجھوتے کا بندوبست کرے گی۔ جب کا
 شمار دسے زمین کی شریف ترین قوموں میں ہوتا ہے۔

ہمارا انتظار بہت دنوں تک جاری رہا۔ ہم نے آپس میں مشورے کیے۔
 اس مسئلے پر بحث و تمحیص جاری رکھی۔ ہم نے مختلف ذرائع سے غیر رسمی طور
 پر اور دوستانہ انداز میں حکومت فرانس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ لیکن اس کا کوئی
 نتیجہ نہ نکلا۔ ہمیں اس امر کا احساس تھا کہ یہ مسئلہ بے انتہا اہمیت کا حامل ہے۔
 لیکن ایسا نہیں کہ نا واجب جلد بازی سے کام لیتے ہوئے حکومت فرانس کو
 پریشانی میں مبتلا کر دیا جائے۔ بشرطیکہ اس کے ارادے یک ہوئے اور ہمیں
 یہی امید تھی کہ اس کے ارادے یک ہیں۔

علم احساس یہ تھا کہ اس معاملے کو حزل اجمالی کے اجلاس پیرس کے آخری
 محنتوں میں یا اس سے بھی پہلے پیش کر دیا جائے۔ لیکن زیادہ دور اندیش اصحاب کی
 رائے کو فوقیت حاصل ہوئی ہم سے کہا گیا کہ تحمل سے کام لینا چاہیے چند ہفتوں
 کیا کہ یہ پیغام حکومت فرانس تک پہنچا دیا جائے گا۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ انہوں نے
 یہ وعدہ بھی پورا کر دیا۔ لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

پھر ہمارے سامنے یہ سوال آیا کہ آیا ہمیں یہ معاملہ جنرل اسمبلی میں پیش کر دینا چاہیے؟ اس ضمن میں ہمیں ایک بڑی رکاوٹ پیش آگئی کیونکہ کچھ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ انہی ممالک کو جن کے نام موجودہ شکایت نامے پر درج ہیں افسوس ناک اور زلزلہ شکار تجربے سے گزرنا پڑا۔ ہم میں سے بعض نے سرائی کا مسئلہ جنرل اسمبلی میں پیش کرنا پایا تھا۔ عارضی ایجنڈے کی اس شق کو جنرل کمیٹی کے روبرو زیر بحث آنا تھا۔ اس کمیٹی میں ان ممالک کو اکثریت حاصل نہ تھی جن کے نام اس سٹادیز پر ثبت ہیں۔ جن کمیٹی نے اس مسئلے پر بحث کی اجازت نہ دی۔ یقیناً اس نے لکھا کہ اس سوال پر بحث فی الحال منوی کر دی جائے اس وقت ہمیں خوب معلوم تھا کہ فی الحال اس سٹیج پر یہ فیصلہ حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔ اس وقت ہمیں خوب ڈال دینے کے سوا کچھ نہیں۔

پھر یہ معاملہ جنرل اسمبلی کے ابتدائی اجلاس میں زیر بحث آیا اور اس پر متعدد نمائندوں نے یکے بعد دیگرے اپنے شدید جذبات کا اظہار کیا لیکن ہم اس سوال کو ایجنڈے پر لانے میں بھی کامیاب نہ ہو سکے۔ ہم دل شکستہ ہو گئے۔ پھر بھی مزید انتظار مناسب سمجھا۔ نیویارک پہنچے۔ آپس میں مدح مشورہ کیا ہم ہر روز اخباروں میں نشوونما لیکر خبریں پڑھتے رہے۔ ہر روز اسلوج حوالہ کی نئی امیدیں باندھتے رہتے ہر روز یہی توقع لگی رہی کہ فرانس اور اہل توینیسیہ کے درمیان بہتر معاہدہ ہو جائے کی علامات ظاہر ہوں گی۔ ہم اہل توینیسیہ اور جمہوریہ فرانس کی سلامتی کے لئے دعائیں کرتے رہے لیکن خبریں روز بروز بد سے بدتر ہوتی گئیں۔

اب ہم نے سوچا کہ ہمیں اخبارات کی خبروں پر ہی کاملاً انحصار نہ کر لینا چاہیے اور غالباً ہتھیار ہو گا۔ کہ اہل توینیسیہ میں سے چند اصحاب کو نیویارک بلایا

جاتے۔ تاکہ ہم ان پر جرح کر سکیں اور معاملے کو حفاظتی کونسل میں لے جانے سے قبل ذمہ دار وفد کی حیثیت میں یہ جان لیں کہ صحیح صورتِ حال کیا ہے ہمیں معلوم ہوا کہ اہلی تونسہ کے نیویارک آنے کی راہ میں سخت اور ناقابلِ غور مشکلات مائل ہیں۔ پتہ چلا کہ تونسہ کے ذمہ دار وزراء سے ان کے سفارتی پروانے ہائے اہداری واپس لے لئے گئے ہیں اگر فرانس کا نمائندہ اس بیان کی تردید کرے تو مجھے بے حد خوشی ہوگی۔ بہر کیف یہ امر واقعہ ہے کہ وزیر امور پر وائے راہداری کی منتظرات کے باعث نیویارک نہیں آسکتے تھے۔ عالمِ خطر اب میں ہم نے کچھ اور لوگوں کو بلوانے کی بے انتہا سعی کی۔ لیکن ان کے رستے میں بھی ہر طرح کی مشکلات مائل تھیں۔ اس کے بعد ان جملہ اقوام کے عظیم دوستوں نے جن کے نام یہاں دیئے گئے ہیں۔ ہمیں بتایا کہ حکومتِ فرانس کو پارلیمانی بحران سے سابقہ پڑا ہوا ہے۔ اس لئے جب تک یہ بحران دور نہیں ہو لیتا، حکومت مذکورہ سے اس معاملے میں کسی واضح اقدام کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ ہم کچھ زیادہ پروا میدان تھے۔ پھر بھی ہم نے سوچا دانش مندی نہ سہی جو آخر دی کا لٹا ضایع ہے کہ دانش میں حکومت کو استحکام مل جانے کا انتہا دیکھا جائے آخر یہ بھی ہو گیا اور حکومت کو استحکام مل گیا۔ ہمیں فرانس کی خاطر اس سے بڑی خوشی ہوئی۔ اب ہم پر اُمید ہے کہ حکومت فرانس کوئی قدم اٹھائے گی۔

حکومت کے استحکام کے چند روز بعد ہم نے دیکھا کہ صرف یہی نہیں تونسہ میں صورتِ حال اصلاح پذیر نہیں ہوتی بلکہ ہمارے ساتھ ایوسی، دہشت اور جیرت کا ایک طوفان اٹھ آیا۔ جب ہم نے سنا کہ جمہوریہ فرانس نے تونسہ کی پوری کابینہ کو گرفتار کر لیا ہے۔ پورن کا مینسے میری مراد وزارت کے تمام وہ افراد ہیں جو حکومت فرانس کے قابو میں آسکتے تھے مجھے معلوم ہوا کہ حکومت فرانس کابینہ کے

دو خبروں کو پکڑ نہیں سکی۔ یہ وہ کا بیٹہ تھی جسے ۱۹۵۰ء میں دونوں حکومتوں کے درمیان صلح ہو جانے پر نر-ٹیپ دیا گیا تھا اور یہی کا بیٹہ تھی جت فرانس اور تونیس کے درمیان بہتر معاہدے کے لئے اصلاحات کے معاملے پر حکومت فرانس کے ساتھ بات چیت کرنا تھی۔ کا بیٹہ اب جیل میں پہنچ گئی اور تونیس کے ممتاز افراد میں یہ آخری لوگ تھے جو تید ہوئے۔ نونس سے سب سے بڑی اور مقبول عام پارٹی یعنی حزب دستور کا کرنی نیشنلسٹ لیڈر ایسا نہ تھا جو پہلے جیل میں نہ پہنچ چکا تھا۔ وہ بھی نہیں بکا۔ اطلاع کے مطابق ہزاروں تونیس نے بندوں کے کیمپوں میں پہنچا دیے گئے تھے۔ یکنزدوں ہلاک کر دیئے گئے تھے اگر اس اطلاع کی تردید کی جا سکے تو بھیسے بہ خوشی ہوگی۔ تونیس کے بعض علاقوں سے اطلاعات حاصل کرنا ہی مشکل ہو رہا تھا۔

ہم نے پھر بھی انتظار کیا اور سوچا کہ بہر حال ہم پوپ سے بڑے کیتھولک ہونے کا دعوت نہیں کر سکتے۔ اگر خود اہل بونیس ایک اور حکومت کی تشکیل کریں اور وہ خوش اسلوبی سے کام کرنے لگے تو ہمارے لئے کوئی وجہ اضطراب نہ ہوگی۔ ہمیں اس انتظار میں بہت دن گزر گئے اور پھنز میں پتہ چلا کہ باکوش نام کے ایک صاحب کو وزیر اعظم مقرر کر دیا گیا ہے۔ ہم نے اس کی سابقہ کیفیت معلوم کرنی چاہی اور ایسے لوگوں سے حالات دریافت کئے جو اس کے ماضی سے آگاہ تھے انہوں نے بتایا کہ یہ صاحب کسی وقت سہل کے سرکاری ملازم تھے۔ دوران جنگ میں تھوڑی دیر کے لئے وزارتِ عظمیٰ کی گدی پر براجمان ہوتے تھے۔ تونیس میں ان کی قیادت تسلیم کرنے والے افراد زیادہ نہ ہوں گے اور یہ تنہا بزرگوار ہیں جو ۱۹۷۰ء میں نے ہماری دانست میں فرانس کے دباؤ کے تحت وزارتِ عظمیٰ کا کام نبھانے کے لئے اپنی جان خطرے میں دے کر اپنی پیمانہ نگاری ظاہر

کر دی ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ وہ کاہنہ وزارت تشکیل کریں گے۔ ہم نے انتظار کیا اور دن گزرتے گئے۔

یہ مسٹر یاگوش وزیر اعظم ہیں۔ فرانسیسی ریڈیو سٹیشن جنرل کی ساری قوت اسلام آباد ان کی مشقیان ہے اور حکومت فرانس ان کی امداد اعانت کے لئے مکر بند ہے۔ لیکن یہ حضرت ابناک کوئی کاہنہ نہیں بنا سکے "ہیر لڈر ٹیمپوین" اور "نیویارک ٹائمز" میں یہ اطلاعات شائع ہوئی ہیں کہ تونیسیہ کے اس وزیر اعظم کے خلاف عوام کی ناراضگی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ جب وہ بے حکمران تونیسیہ سے ملنے کے لئے عمل میں تسریع لے جاتے ہیں۔ تو عقبی دروازے سے داخل ہوتے ہیں۔ وزیر اعظم یاگوش کیوں نے دباؤ ڈال کر ایک اور ایسے شخص اور صرف ایک شخص کو ڈھونڈ نکالا۔ جو وزیر پینے کے لئے تیار ہو گیا۔ ان صاحب نے "ہام کے جبر و قہر کا نشانہ بنتے ہوئے وزارت کے سنگھاس پر بیٹھنے کی مانی تو بھری۔ لیکن جب عملاً وزارت سنبھالنے کا وقت آیا تو اس نے دیکھا کہ عوام کی غمگی اور نفرت اس کے خلاف حد سے بڑھ رہی ہے۔ چنانچہ اس نے دانش مندی سے کام لیتے ہوئے وزارت کا بہ "تراج" مہر پر رکھنے سے انکار کر دیا اس پر فرانسیسیوں نے اسے جیل میں ڈال دیا۔

مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تونیسیہ نے آج کل برائیوں اور غزابیوں کے اعتبار سے مثالی حیثیت اختیار کر رکھی ہے اور وہاں کا دستور یہ ہے کہ آپ وزیر بننے اگر اس سے انکار ہے تو سیدھے جیل جلیئے۔

اس کے بعد ہم نے سنا کہ فرانس کی جانب سے موسیو ہٹلر کوک نئی اصلاحات لے کر تونیسیہ پہنچے ہیں۔ ہم نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہ اہلی تونیسیہ کے لئے امیدوں کا پویشا رہے کر گئے تھے اس کا کیا حشر ہوا۔ اس اجلاس میں

دوسرے ممالک کے جو نمائندے تشریف فرما ہیں ان کے لئے میں خراہم کردہ اطلاقاً میں سے چند فقرے پیش کرنا چاہتا ہوں جن سے تمام مندوبین کو پتہ چل جائے گا۔ کہ موسیو ہاسکلوک کے تونیسہ پہنچنے کی کیا کیفیت تھی اور یہ اس لئے تھے کہ تونیسہ کو دوست بنائیں اور فرانس کے دعوے کے مطابق اسے آزادی اور اصلاحات کی دولت سے مالا مال کر دینے والے تھے۔

موسیو ہاسکلوک ۱۳ جنوری کو تونیسہ پہنچے۔ ان کے استقبال کو فرانس کی فوجی قوت کے مظاہرے کی سیسے بڑی تقریب بنایا گیا۔ جو پہلے دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ آپ نے ایک بحری جنگی جہاز سے اتر کر ساحل پر قدم رکھا۔ شہر پر فرانسیسی فوجوں نے قبضہ جا رکھا تھا وہ بدصورتے گزرے سڑکیں مسلح فوجوں کی قطاروں سے اٹی پڑی تھیں۔ سارا شہر بکتر بند گاڑیوں، مسلح کاروں اور ٹینکوں سے بھرا ہوا تھا۔ گویا یہ عام استقبال نہ تھا بلکہ فرانسیسی نمائندے کی آمد کو فرانس کی فوجی قوت کے مظاہرے کے لئے نوزوں ترین موقع بنایا گیا تھا۔

ریڈیٹرنٹ جنرل نے بتے سے پہلی ہی ملاقات میں ان پر واضح کیا کہ وہ ان سے براہ راست روابط رکھنا پسند کریں گے۔ تاہم وزیراعظم نے ریڈیٹرنٹ جنرل کو نئے کی جانب سے مطلع کر دینا ضروری سمجھا کہ تمام سرکاری روابط وزیراعظم کی وساطت سے ہونے چاہئیں۔

جب حکومت تونیسہ نے ۱۳ جنوری ۱۹۵۲ کو اپنی شکایت اقوام متحدہ میں پیش کی تو اس وقت ریڈیٹرنٹ جنرل نے بتے سے علیحدگی اور تخیلیہ میں گفتگو کرنے کا مطالبہ کیا۔ بتے نے انکار کر دیا اور انہیں وزیراعظم سے بات کرنے کی ہدایت کی۔ ۱۵ جنوری کو ریڈیٹرنٹ جنرل نے لکھا کہ وہ بتے سے وزیراعظم کی موجودگی میں گفتگو کرنے کو تیار ہیں۔ اس ملاقات میں انہوں نے متعدد مشرطنہ پیش کیں۔

ایک یہ کہ اقوام متحدہ سے شکایت واپس لے لی جلتے۔ دوسری یہ کہ وزارت بدل دی جائے۔ تیسری یہ کہ بے دو قرانوں پر دستخط کریں۔ ایک کے ذریعے فرانسیسی ریڈیڈنٹ جنرل کو اپنا وزیر خارجہ مقرر کر دیں اور دوسرے کے ذریعے جنرل گارے کو وزیر دفاع کا عہدہ سونپ دیں۔ یہ جنرل گارے وہی ہیں کہ جس کے نامہ اعمال میں ڈیٹا سکرپٹ میں سب سے بڑا فوجی اقدام شامل ہے جسے نے وزیر اعظم کو ہدایت کی کہ ریڈیڈنٹ جنرل کو ان شرائط کا جواب دے دیا جائے وزیر اعظم نے جو جواب دیا وہ ریکارڈ میں موجود ہے اس نے بتایا کہ وزیر اعظم کو بے نے تو نیسی کے متعلق اقوام متحدہ میں شکایت پیش کرنے کا مجاز بنایا تھا۔ اس سے نمائندہ فرانس کے اس بیان کی قطعاً کھل جاتی ہے کہ اقوام متحدہ میں یہ شکایت بے کی ہدایت پر پیش نہیں کی گئی تھی۔ ہمارے خیال میں اس کے لئے خود وزیر اعظم کے اختیارات ہی کافی تھے۔ لیکن اگر یہ موقف پیش کیا جائے کہ بے کو ہی اجازت یا ہدایت دینا چاہئے تھی تو ہم کہتے ہیں کہ یہ اجازت یا ہدایت بے سے حاصل کی گئی تھی۔

اس کے بعد ریڈیڈنٹ جنرل اور جنرل گارے کو پیرس طلب کر لیا گیا اور ۲۲ مارچ کو تو نیسی اپنی سٹیٹس اور ڈیپلومیٹک سٹیٹس ریڈیڈنٹ جنرل نے بے سے بنی انٹرویو کے لئے وقت مانگا۔ چنانچہ ۲۴ مارچ کو ہدایت کے لئے انہیں طلب کیا گیا لیکن اس موقع پر تو نیسی کے وہ تمام وزراء بھی موجود تھے جو اس وقت شہر میں تھے۔ ریڈیڈنٹ جنرل نے بے سے کہا کہ حکومت فرانس بات چیت کرنے کے لئے تیار ہے۔ لیکن اس شرط پر کہ کابینہ کو موقوف کر دیا جائے اور اقوام متحدہ سے شکایت واپس لے لی جلتے۔ بے نے یہ دونوں باتیں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ریڈیڈنٹ جنرل نے ایک دستاویز بے کو دکھائی۔ جس پر فرانسیسی وزیر خارجہ کے

دستخط تھے اس میں لکھا تھا — کہ ریڈیڈنٹ جنرل امن و قانون بحال کرنے کے لئے — مجھے امید ہے کہ میں بعد کسی موقع پر یہ واضح کر سکوں گا کہ استعمار پریشہ حکومتوں کے نزدیک "امن و قانون" کی اصطلاح کن معنوں میں استعمال ہوتی ہے — اور فرانس کے مفاد کی حفاظت کے لئے جو کچھ بھی کارروائی کرنا مناسب سمجھیں اس کا انہیں مکمل اختیار حاصل ہے۔ بے نے جواب میں اس مسئلے پر سوچنے کے لئے ہمت مانچی اور اس سوال پر اپنی پوزیشن محفوظ رکھی۔ ریڈیڈنٹ جنرل نے انہیں صرف تین گھنٹے کا الٹی میٹم دے دیا۔ یہ سلوک فرانس کی حکومت تو نیسیہ کے حکمران سے کم نہیں ہے جس کے بارے میں فرانسیسیوں کو دوستی کا دعویٰ ہے۔ ریڈیڈنٹ جنرل ہسپتال کی نالی سیدھی کر کے اور اسلحہ کی قوت کا ہولناک مظاہرہ کر کے اس عمر رسیدہ اور قابل احترام بادشاہ کو ایسا جواب دینے کے لئے مجبور کر رہا تھا اس طریق سے جو اب حاصل کر کے منطقی اور آئینی منیر کے سوا اور کسی منیر کی تسکین نہیں ہو سکتی۔

جب بے کے ساتھ یہ بدسلوکی کی گئی تو انہوں نے جمہوریہ فرانس کے صدر کو فوری طور پر بھیجا جس میں بتایا کہ فرانسیسی ریڈیڈنٹ جنرل نے حکومت کے نام سے ان پر کس طرح دباؤ ڈالا ہے۔ ساتھ ہی ریڈیڈنٹ جنرل کو واپس بلانے کا مطالبہ کیا اسی رات ریڈیڈنٹ جنرل نے تو نیسیہ کے وزیر اعظم اور تین اور وزراء کو گرفتار کر لیا ایک اور وزیر موجود تھا لیکن بڑھاپے اور بیماری کے باعث اسے گرفتار نہ کیا گیا۔ یہ جناب سعد اللہ تھے اس بوڑھے اور بیمار وزیر نے ریڈیڈنٹ جنرل کو لکھا مجھے گرفتار کر لیجئے تاکہ میں قید و بند میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ رہ سکوں۔ ان سب کو تو نیسیہ کے جنوبی علاقے میں بھیج دیا گیا سیکڑوں سیاسی کارکنوں صحافیوں، مدرسوں، ہوکیلوں اور دوسرے معززین کو جن کی ہمدردیاں نیشنلسٹوں کے

ساتھ تھیں۔ گرفتار کر لیا گیا تمام نیشنلسٹ اخباروں کو بند کر دیا گیا۔ تمام باقی اسکولوں کے دروازوں پر قفل چڑھا دیئے گئے اور مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ ہمارے پاس ایسا ذریعہ نہیں جس سے معلوم ہو سکے کہ ملک بھر میں جس قدر گرفتاریاں ہوئیں ان کی صحیح تعداد کیا تھی تاہم یہ امر بعد روشنی کی طرح واضح ہے کہ نظر بندی کے جو بڑے بڑے کیپ قائم کئے گئے تھے ان میں مقید نیشنلسٹوں کی تعداد ہزاروں سے کیا کم ہوگی؟

اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ فرانسیسی فوجوں نے بے لکے عمل کا معاہدہ کر لیا۔ ریڈیٹ جنرل ۲۵ کی صبح کو بے لکے سے ملنے کے لئے گیا مگر اس انٹرویو میں کسی دوسرے کو موجود رہنے کی اجازت نہ دی گئی اس کے بعد ریڈیٹ جنرل نے اعلان کیا کہ بے لکے ایک فرمان جاری کرنے کی منظوری دے دی ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس پر بے لکے نے دستخط نہیں کئے تھے۔

ہماری اطلاع کے مطابق تو نیسیہ کے حکمران اور ریڈیٹ جنرل کی اس خفیہ ملاقات میں جو کچھ ہوا وہ بے لکے کے لئے ہرگز خوشگوار نہ تھا۔ لیکن جب ریڈیٹ جنرل ملاقات کر کے باہر آیا۔ تو اس نے موجود لوگوں سے ہنستے ہوئے اور قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "انند تو بڑے سیار محبت کی باتیں ہوتی ہیں" یہ ہولناک اور کرب انگیز تمسخر اس بوڑھے شخص سے کیا گیا جس کے تمام ساتھی اس سے بچیں لئے گئے تھے اور جو تو نیسیہ میں فرانسیسی سام کے بھاری فوجی دباؤ کا مقصد پھر مقابلہ کرنے کے لئے بالکل تنہا رہ گیا تھا۔

موجودہ صورت حال کا یہ نقشہ ہے۔ فرانس نے اپنے ایک آئہ کا کو جس کا نام باکوش ہے وزیر اعظم بنا دیا۔ ہم یہ تو نہیں جانتے کہ وہ کب تک وزیر اعظم ہے گا۔ البتہ اگر مجھے پیش گوئی کرنے کی اجازت دی جائے تو کہوں گا کہ اسے اپنے

ضمیر کی ملامت یا جیل میں اپنے مقید نیشنلسٹ بھائیوں کی ملامت کے زیر اثر یہ ہمہ جلد از جلد ترک کرنا پڑے گا۔ حالت یہ ہے کہ وہ تا حال اپنی کابینہ میں ایک بھی وزیر نہیں لے سکا اور ادھر ہمیں بتایا جا رہا ہے کہ فرانس کے حکام اصلاحات کی خوبصورت سکیموں اور تونیسینہ کو خود مختاری دینے کے منصوبوں کے ساتھ متحرک کھڑے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ ان سکیموں اور تجویزوں کے بارے میں گفتگو کس سے کریں گے؟ انہیں آخر بات چیت کس سے کرنی ہے؟ کیا خواہش یہ ہے کہ جس مینز پر بیٹھ کر انہیں گفتگو کرنی ہے اس کے دونوں جانب صرف فرانسیسی ہی ہوں یا پھر ان کی کٹھ پتلیاں ہوں؟ اگر ان کا مقصد کچھ کام کرنا ہے اگر الفاظ بے معنی نہیں ہو گئے اور اگر وہ فی الواقعہ کوئی مفاہمت کرنا چاہتے ہیں تو نہ صرف انسانیت کے نام پر بلکہ علم عقل اور منطق کے نام بھی حد درجہ لازم ہے کہ وہ بات چیت ان لوگوں سے کریں جو فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں۔ ان لوگوں سے بات چیت کرنے کا کیا فائدہ جو خود فرانسیسیوں کے ہاتھ کٹھ پتلی کی طرح کام کر رہے ہیں؟

اس وقت صدمت حال یہ ہے لیکن فرانس کے نمائندے نے کہا ہے کہ ”چند ہفتے قبل تو حالات ایسے تھے جن پر حفاظتی کونسل یا جزئی اسمبلی میں بحث کے لئے شاید کوئی وجہ جواز ہوتی۔ آج یہ صورت ہرگز نہیں اور حالات کی ابتری ختم ہو چکی ہے اب تونیسینہ میں امن، خوشحالی، شادمانی اور دوستی کا دور شروع ہو رہا ہے۔۔۔“

لیکن حالات وہی ہیں جو اوپر پیش کئے گئے ہیں۔ ہزاروں تونیسینہ جیلوں میں بند ہیں پوری کابینہ جیل میں ہے اور نیشنلسٹ تحریک کے تمام بڑے لیڈر جیل میں ہیں یہ وہی لوگ ہیں جن کی عزت و حرمت نہ صرف اپنے ملک میں ہے بلکہ باہر بھی ہر جگہ انہیں ویسی ہی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

کیا یہی وہ خوشحالی اور شادمانی کی صبح ہے جس کی نوید ہمیں فرانس کے نمائندے

نے سنائی ہے اور کہا ہے کہ ہمیں اس صورتِ حال پر بحث نہیں کرنی چاہیے؟
اس مسئلے میں میری پہلی مداخلت ہے میں اسے مختصر رکھوں گا کیونکہ مجھے معلوم ہے
وقت کم ہے اور دو سرے مندوبین بھی کچھ کہنے کے خواہاں ہیں میں اس مسئلے پر پھر
انہما را خیال کرنے کا حق ٹھنونا رہتا ہوں۔ مختصر طور پر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہماری
اطلاع کے مطابق شاید ہم اس مسئلے کو ایک بجٹ سے بر لانے کے لئے سات بت وٹ
حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ اگر ہمارا یہ اندازہ غلط نکلے تو ہم سے زیادہ
خوشی کسی کو نہ ہوگی۔ لیکن اب تک ہمارا خیال یہی ہے کہ اتنے وٹ ہمیں نہیں
مل سکیں گے۔ ہمارے رفقاء تو معلوم ہے کہ یہاں وٹ نہ دینے کا مطلب بھی منفی
وٹ ہوتا ہے اس کا یہ مطلب ہے کہ اس مسئلے کا بھی وہی حشر ہوگا جو اس سے
قبل پیرس کے اجلاس میں مسئلہ مراکش کا ہوا تھا لیکن کونسل میں یہ سوال گیا وہ ملکوں
نے پیش کیا ہے یہ تمام ملک اقوام متحدہ کے رکن ہیں اور انہیں غیر ذمہ دار قرار نہیں
دیا جا سکتا۔ جو اقوام متحدہ کے رواتوں میں یو نہیں گھومتے پھرتے ہوں۔ وہ اقوام متحدہ
ہیں اقوام متحدہ کا معتد بہ جزو ہیں۔ انہیں اعتماد و یقین ہے کہ یہی ایک ادارہ ہے
جس میں وہ دیکھ دو کامیاب تلاش کر سکتے ہیں۔ جن کے پاس اور کوئی راہ نجات نہ ہو۔
کیا فرانس کی حکومت اس بات پر خوش ہوگی کہ اس کا مل تو غیبیہ اپنی تکالیف کے
انزال کے لئے تحریکات چلاتے رہیں؟ وہ اس مقصد کے حصول کے لئے بہت
سے غیر ذمہ دارانہ طریقے اختیار کرنے لگیں؟ کیا کوئی اور تنظیم ایسی موجود ہے
جو اقوام متحدہ سے بہتر کام انجام دے سکتی ہے؟ فرانس والے انہیں کہاں بھولنا
چاہتے ہیں؟ میں یہ سوال تمام ان فرانسیسیوں سے کر رہا ہوں جن تک میری تقریر کے
اجزا جلد یا بدیر پہنچیں گے اگر تو غیبیہ جیسی صورت حال پر اقوام متحدہ میں بحث
ہمیں ہو سکتی تو اقوام متحدہ کس مرض کی دعا ہے اگر مظلوم و متہور اقوام گیارہ ذمہ دار

ملک کی وساطت سے — نمائندہ فرانس اور دوسرے نمائندوں کو خوب علم ہے کہ یہ ممالک چند ملکوں کو چھوڑ کر سارے ایشیا سے عبارت ہیں — اپنی واز یہاں نہیں پہنچا سکتیں تو پھر ہم لوگ یہاں کس غرض سے جمع ہیں؟ عملی طور پر مالا ایشیا اقوام متحدہ کے دروازے پر دستک دے رہا ہے اور یہ نہیں کہہ رہا کہ فرانس کو سزا دیجئے یہ بھی نہیں کہتا کہ تو نیسیہ کو آج ہی پر فائدہ آنا دی دے دیجئے صرف یہ کہتا ہے کہ ازراہ کرم اس سوال پر بحث کیجئے لیکن اگر سلامتی کونسل کے سات ارکان اس مسئلے کو زیر بحث لانے کے لئے نہیں مل سکتے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ گیارہ قوموں سے یہ کہا جا رہا ہے کہ تم جہنم کی راہ لو۔ ہم تمہارے سوال پر بحث نہیں کریں گے تم اس مسئلے پر خواہ کتنے ہی شدید احساسات رکھتے ہو لیکن ہم اسے اپنے ایجنڈے پر بھی لانے کے لئے تیار نہیں۔ تاکہ سچائی بروئے کار آجائے۔

ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے آگ لگی ہوئی دیکھی ہے۔ یہ آگ ہم نے خود نہیں لگائی۔ ہم نے شعلے بھر رکھے دیکھے ہیں اور ہم آگ بجھانے والے ٹکڑے کے پاس یہ کہنے کے لئے آئے ہیں کہ فلاں آگ کو دیکھئے اور اسے بجھائیے۔ اب آگ بجھانے والے کہتے ہیں کہ ہم تو اس طرف نگاہ بھی نہیں کریں گے۔ یہ بڑی عجیب صورت حال ہے اس کے باوجود ہم اس سوال سے دل چسپی لینے رہیں گے۔ کیونکہ یہ مسئلہ ان مظلوم انسانوں کا ہے جنہیں ہم اپنے بھائی سمجھتے ہیں۔ جی ممالک نے اس مکتوب پر دستخط کئے ہیں ان میں سے اکثر ماضی قریب تک خود اسی طرح حکومتیں دیوری تھے۔ ابھی اتنا وقت نہیں گزرا کہ وہ نامساوات کی ان مصیبتوں کو بھول گئے ہوں۔ جن کا تختہ مشق وہ حکومت ہونے کے باوجود بنے ہوئے تھے بہر حال ہم اہل تو نیسیہ کی حالت ناز کو فراموش نہیں کر سکتے۔ ہم ان سے کہہ دینا چاہتے ہیں کہ حفاظتی کونسل اپنے صوابدیکہ سے مطابق خواہ کوئی فیصلہ کرے یا کرنا چاہے اس کونسل کی میز پر بعض ایسے آدمی بھی بلجئے

ہوں گے جن کا طرز عمل پکار پکار کر کہہ رہا ہو گا کہ ہم اس معاملے کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے کے روادار نہیں، ہم اپنے دلوں میں چراغ روشن رکھیں گے اور جو کچھ ہم سے ہو سکے گا لڑ گزرنے میں قطعاً دریغ نہ کریں گے۔

اس مقام پر میرا وفد فی الحال ریک جانا چاہتا ہے۔ نمائندہ فرانس نے تاریخ ماضی کے بعض واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ میٹرو فنان کے متعلق بھی جو اب کا حق محفوظ رکھنا چاہتا ہے اس وقت تو نیسیہ کی صورتِ سال کے مزید پردے چاک ہو جائیں گے اور وہ استعماری کیفین سامنے آجائیں گی۔ جو وہاں موجود ہیں اور اس پوری بے چینی اور اضطراب کی بنیاد و اساس ہیں۔ فی الحال ہم صرف طریق کار کی بحث میں حصہ لے رہے ہیں۔ مجھے اعتراف کرنا چاہیے کہ میری تقریر میں مطلب کے بعض نکات بھی زیر غور آگئے ہیں لیکن ان کا اصل باعث نمائندہ فرانس کی تقریر تھی جس نے مطلب کے معاملات اپنی تقریر میں شامل کر لئے۔

یہاں میں نمائندہ پاکستان کی حیثیت میں اپنی تقریر ختم کر رہا ہوں۔

اقوام متحدہ کی حفاظتی کونسل میں تو نیسیا مسئلہ ایجنڈے پر لانے کے
سلسلے میں پروفیسر احمد شاہ بخاری — پطرس — کی دوسری تقریر جو
انہوں نے ۱۰ اپریل ۱۹۵۱ء کے اجلاس میں کی۔ بخاری اس وقت کونسل
کے صدر بھی تھے:

تقریریں کرنے والوں کی جو فرست میرے پاس موجود ہے اس میں اگلا نام
پاکستان کے وفد کا ہے۔ اگر حفاظتی کونسل کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں نمائندہ پاکستان
کی حیثیت سے کونسل سے خطاب کروں گا۔
اب تک حفاظتی کونسل کے تمام گیارہ ارکان اس مسئلے کو ایجنڈے میں شامل کرنے
کے بارے میں اظہار رائے کر چکے ہیں۔ اب یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ کچھ ملکوں کے
وفد سے ایجنڈے میں شامل کرنے کی حمایت نہیں کریں گے۔ ان میں مختلف ملکوں
کے وہ دوست اور رفیق بھی شامل ہیں جن کے لئے ہمارے دل میں انتہائی احترام
ہے۔ ان میں سے تین ملک ایسے ہیں کہ جو عام لوگوں کے نزدیک زبردست استعماری
مخلاف کے نمائندے ہیں جو تھے ملک کی عظمت و شان میں بھی کلام نہیں۔ اسے استعماری
مخالف سے بھی کوئی ملاقات نہیں۔ تاہم اس نے مذکورہ بالا ملکوں سے ہی کا ساتھ دینا پسند کیا۔
اب یہ حقیقت بالکل واضح ہو چکی ہے کہ اگر اس بارے میں دو ٹوٹ کی نوبت آتی
اور جب کبھی بھی آتی، ہم ہار جائیں گے۔

کج گادوں — ۱۱ اپریل ۱۹۵۱ء — اقوام متحدہ کی سرگزشت میں ایسا دن مقصود

ہوگا جب مختلف معاملات پر آنا مانا ہو اور بحث کو با دینے کی بنیاد رکھی گئی ہے۔
میرے دوہا ندریش رفیق چین کے نمائندے کا کٹر سیلانگ نے اقوام متحدہ میں وسیع
بجھریے کی بنا پر ہمیں جابا سچکہ یہ واقعہ اس انجن کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا باکل
پہلا واقعہ ہوگا جب ایک معاملے کو محض ایک بجنڈ سپر لائن کے سلسلے میں کونسل کے
انداس درجہ شدت اختیار کی گئی کہ اسے ختم کئے بغیر پارہ نہ رہا۔ اقوام متحدہ کی تاریخ
میں آج کا دن ایک اور لحاظ سے بھی یادگار رہے گا اس لئے کہ ایک پالیسی کو درجہ
انسوسناک اور عالم انگیز طریق پر الٹ دیا گیا۔

چکلی مرتبہ میرے وفد نے حفاظتی کونسل سے خطاب کیا تو اس کی ضرورت میرے
معزز دوست نمائندہ فرانس کے خطاب کی وجہ سے پیش آئی تھی۔ میرے لئے یہ امر
درجہ غیر مناسب ہوگا کہ میں اس دوسرے موقع کو بھی ان کی تقریر پر نکتہ چینی کے
لئے استعمال کروں مجھے ایسے طرز عمل سے متحرز رہنا چاہیے میری آرزو یہ ہے کہ
اس موقع پر اپنے رفیق کے سلسلے خود حکومت فرانس کی رائے میں سے چند اقتباسات
پیش کروں۔ یہ رائے اس مسئلے پر دی گئی تھی کہ کسی مسئلے کو ایک بجنڈے میں شامل کیا
جائے یا نہ کیا جائے اور یہ اس وقت دی گئی تھی جب تو نیسیہ کا مسئلہ قطعاً زیر بحث
نہ تھا۔ ۳ ستمبر ۱۹۶۶ء کو حفاظتی کونسل یونان کے خلاف یوکرین کی شکایت پر بحث
کر رہی تھی۔ اس وقت نمائندہ فرانس نے جو تقریر فرمائی تھی میں اس کا ایک حصہ
یہاں پڑھوں گا۔ نمائندہ فرانس مسٹر پروڈی (MR PARODI) نے اس موقع
پر کہا تھا۔

• ایک معاملے کو ایک بجنڈے پر لانے سے انکار کا طریقہ سخت نقصان رساں
اور خطرناک ہے۔ مزید برآں یہ فیصلہ کرنے کے نون سے وعدہ ہو سکتے ہیں کہ
ظاں شکایت کے لئے مناسب بنیاد موجود نہیں؟ کیا اس کا مطلب

یہ ہے کہ کونسل عام سیاسی وحدتِ حال کے متعلق قیاسی علم کی بنیاد پر فیصلہ صادر کر دے گی ایسا کرنا ممکن ضرور ہے لیکن مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تمنا اس قسم کی شہادت کے پیش نظر کونسل کے لئے اس قسم کا طریقہ اختیار کرنا ایک حد تک خطرناک ہے اس لئے کہ جب تک کونسل پورے مسئلے پر تھنڈے دل سے غور و خوض نہ کرے گی اسے شہادت کے بارے میں صحیح اندازے کا موقع کیونکر مل سکے گا؟ اندیشہ ہے کہ ایسے معاملات میں کونسل عام سیاسی مصلحتوں سے متاثر ہو جائے گی اور ان مقاصد انصاف کا پورا خیال نہ رکھ سکے گی۔ جو پیش کردہ مسئلے کے سلسلے میں ملحوظ رہنے چاہئیں۔“

فرانس بہت بڑا ملک ہے وہ حفاظتی کونسل کے پانچ مستقل ارکان میں سے ہے۔ یعنی ان پانچ ارکان میں سے ایک ہے جنہوں نے ابجمنی اقوام متحدہ کے پورے نظام کے نشرو ارتقار میں حصہ لیا تاکہ انصاف مساوات اور آناؤانہ خود بحث سے مسائل کا تصفیہ ہو سکے۔ لیکن آج اسی فرانس کا وفد اسی ملک کے ایک سابقہ نمائندے کے الفاظ میں، عام سیاسی مصلحتوں سے متاثر ہو گیا ہے اور اس نے انصاف کے وہ مقاصد پیش نظر نہیں رکھے جو اس خاص مسئلے میں پیش نظر رہنے چاہئیں تھے۔ جس حد تک میرے معزز دوست نمائندہ فرانس اور اس بحث میں اس کی حکومت کی مداخلت کا تعلق ہے۔ میں سمجھتا ہوں مجھے اس سے زیادہ کچھ نہ کہنا چاہیے۔ میں نے سلطنت متحدہ (برطانیہ) کے معزز نمائندے اور اپنے دوست مرگلیڈون جیب (SIR GLADWYN JEBB) کی تقریر سنی۔ اس سے بعد خاص مایوس ہوا معزز مرگلیڈون جیب کی تقریر میں متعدد خوشگوار باتیں تھیں۔ جن میں میں بھی ان کا شریک ہوں۔ ان میں انگریزی زبان کے لئے محبت اور عزت بھی شامل ہے۔ مجھے گلہ ہے کہ

سلطنت متحدہ کے معزز نمائندے نے آج ہمارے اس مشترکہ محبوب کی بے حرمتی کر دی ہے انہوں نے یہاں اس خط میں سے کچھ اقتباسات سنائے جس کے مطابق گیارہ ملکوں نے یہ معاملہ حفاظتی کونسل کے سامنے پیش کیا تھا اور جب وہ اس فقرے پہنچے جس میں حکومتوں نے کونسل سے درخواست کی تھی کہ موجودہ حالت کو ختم کرنے کی غرض سے وہ تمام ضروری تدبیریں منظور کے مطابق اختیار کرنے کے لئے اجلاس منعقد کیا جائے تو نمائندے نے فرمایا کہ یہ جملہ مبہم ہے دوسرے لفظوں میں ان کے نزدیک اس جملے کے متعدد مفہوم تھے۔ جن کی وجہ سے انہیں پریشانی لاحق ہوئی۔ میں ان سے کہنا چاہتا ہوں کہ اس مفہوم کو بہترین طریق پر پیش کرنے کی شاید یہ صورت ہوگی کہ یگانہ قومیں حفاظتی کونسل سے معتدل اور متوازن طریق پر درخواست کرتیں اور کونسل کو پورا موقع دیتیں کہ وہ اس مفہوم کے مطابق کم یا زیادہ جیسا مناسب سمجھے انتظام کرے میں نمائندہ برطانیہ کی خدمت میں عرض کرتا چاہتا ہوں کہ اس میں تو کوئی ابہام نہیں الایہ کہ ہم انگریزی زبان کی بے حرمتی پر کمر باندھ لیں۔

سرکلینڈوہ یہ بات کہہ کر بے تکلفی سے آگے بڑھا اور فرمایا کہ کم از کم برطانوی وفد کی رائے یہ نہیں کہ فرانس یا تو نیسیہ پر کوئی حل منظور کیا جاسکتا ہے میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ زیر بحث جملے میں ایک بھی ایسا الفاظ موجود ہے جس سے قوت یا جبر کا مفہوم پیدا کیا جاسکے یا سمجھا جاسکے کہ کوئی چیز منظور نہیں مقصود ہے؟ اگر سلطنت متحدہ کے وفد کو صرف اس بات پر اعتراض تھا تو وہ ایسی تجویزیں یا سفارشاتیں پیش کر سکتا تھا جو فریقین پر کوئی حل منظور کرنے سے بالکل پاک ہوئیں سلطنت متحدہ کا وفد کہہ سکتا تھا کہ آئیے اس مسئلے پر بحث کریں، ہمیں تو نیسیہ یا فرانس پر کوئی حل منظور کرنا چاہیے۔ محض یہ سفارش کر دینی چاہیے کہ وہ کٹے بیٹے کر جیگر سے کاٹھنہ کر لیں کیلئے

فیصلہ ٹھونسنے سے تعبیر کیا جاسکتا تھا؛ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ سلطنت متحدہ کے نمائندے نے اپنا نقطہ نگاہ جس انداز سے پیش کیا اس سے یہی مترشح ہوتا ہے۔ کہ ہم نے حفاظتی کونسل میں جو شکایت پیش کی وہ بہم اور لغو تھی۔ ساتھ ساتھ ایک دھمکی بھی موجود تھی اور ہماری درخواست میں کوئی ایسی بات موجود تھی جس کی بنا پر حفاظتی کونسل کے لئے لازم ہو جاتا کہ وہ اپنا عمل تو نویسہ یا فرانس پر خواہ خواہ ٹھونس دے اور حقیقت سے منزلوں دور ہے۔

سلطنت متحدہ کے نمائندہ کا بیان ایک مسلمہ بالیسی کا بھی اہم اور اہم انگیز نقص ہے۔ قبل ازیں انجمن اقوام متحدہ میں یہ مسئلہ پیش تھا کہ اس قسم کے مسائل ایجنڈے میں شامل کئے جائیں یا نہ کئے جائیں؟ اس موقع پر سلطنت متحدہ کے وزیر خارجہ نے اپنے نظریات پیش کئے تھے۔ میں حفاظتی کونسل میں سرکاری دستاویزوں سے اقتباسات پیش کروں گا۔ جیب روس کے خلاف ایمان اور احوال یونان کے متعلق روس کی شکایتیں زیرِ غور تھیں۔ مسٹر بیون (MR BEVIN) نے ۲۵ جنوری ۱۹۴۶ء کو فرمایا تھا۔

• میں دل سے چاہتا ہوں کہ حفاظتی کونسل ان تمام معاملات کے متعلق شکایت کرنے والوں کی باتیں سنے خواہ وہ کوئی ہوں اگر کوئی حکومت محسوس کرتی ہے کہ کسی چھوٹی یا بڑی طاقت کے خلاف شکایت کے بعد وہ اس کونسل میں نہیں آسکتی اور اپنا نقطہ نگاہ بیان نہیں کر سکتی تو میرے نزدیک یہ غلط ہے جس حکومت کا میں نمائندہ ہوں۔ اسے بھی اس کو خطرے میں ڈالنے کا ملزم گردانا گیا ہے۔ یونان کے معاملے میں جس حد تک میری یا کم از کم میری حکومت کی خاص ذمہ داری کا سوا ہے۔ اس کی پوری تحقیقات کر لی جائے اور اس پر بحث بھی ضرور

کی جائے۔ میری طرف سے قطعاً کوئی اعتراض نہ ہوگا۔۔۔۔۔ اگر حکومت ایران کو حکومت دوس کے خلاف کوئی شکایت ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ حکومت ایران کو ضرور موقع دیا جائے کہ وہ یہاں آئے اور اپنا معاملہ پیش کرے اس وقت ہم یہ اندازہ کر سکیں گے کہ شکایت درست تھی یا نہ تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس معاملے کو بھٹے پر رکھا جائے اور اس پر برسرعام بحث کی جائے اس لئے کہ مجھے یقین ہے حقائق کو دنیا کے سامنے لانے ہی پر اس کا انحصار ہے۔ خواہ وہ حقائق صحیح ہوں یا

غلط، (سرکاری ریکارڈ سال اول سلسلہ اول صفحہ ۱۱)

آج یہ گراں بہا الفاظ بھلا دیئے گئے ہیں۔ آج ہم سے کہا جاتا ہے کہ اس مسئلے کو بروئے کار لانے سے انجمن اقوام متحدہ کے اصول کو تقویت نہیں پہنچے گی بلکہ مجھے افسوس ہے کہ یہ بیان سلطنت متحدہ کے نمائندے کی تقریر میں ہے۔ اس مسئلے کو حفاظتی کونسل میں لانا اور اس پر آزادانہ اور عام بحث کا موقع بہم پہنچانا انجمن اقوام متحدہ پر بہت بڑا اثر ڈالے گا۔

اگر کسی معاملے کے متعلق آزادانہ بحث سے اقوام متحدہ پر بڑا اثر پڑتا ہے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آج کی دنیا میں اقوام متحدہ کا اہم کونسا بڑا وظیفہ رہ جاتا ہے۔ سلطنت متحدہ کے نمائندے کے نزدیک اقوام متحدہ کو اس خطا سے بچانے اور گیارہ قومیں اس پر جو بڑا اثر ڈالنا چاہتی ہیں۔ ان سے بچاؤ کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ تمام بحثیں ختم کر دی جائیں اور ہم سب امن و سکون کی زندگی بسر کریں ساتھ ساتھ اس نئی عمارت کو تاناکا کریں جس میں ہم جمع ہیں۔

سلطنت متحدہ کے نمائندے نے اور میں سمجھتا ہوں کہ ندر لینڈ کے نمائندے نے ایک بڑے خلوص اور پائنت سے کہی اور وہ یہ کہ اگر ہم نے اب کوئی

قدہا ٹھایا یا اس مسئلے پر حفاظتی کونسل میں بحث کی تو تو نیسیہ میں جو بات چیت ہو رہی ہے وہ ناکام ہو جائے گی۔

سوال یہ ہے کہ یہ بات چیت کس سے ہو رہی ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ ایک فریق فرانس ہے۔ دوسرا فریق کون ہے جو بات چیت کر سکتا ہے؟ تمام ارکان فرانس جیل میں ہیں اور یہ آخری عوامی وزارت تھی جو تو نیسیہ کو ملی تمام قومی لیڈروں اور کارکنوں کو اور ہر پڑھے لکھے آدمی کو جس نے قومی مقاصد سے کم یا زیادہ ہمدردی کا اظہار کیا یا تو پھینکا گیا یا کال کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا تو نیسیہ میں اس وقت سائل حمل و نقل پر شدید پابندیاں ہیں۔ پھر فرانس میں اس وقت کس کے ساتھ معاملات پر بحث و تھیس کر رہے ہیں؟ کونسی گنت و شنید ہے جو حفاظتی کونسل میں بحث کی وجہ سے درہم برہم ہو جائے گی؟ ریڈیڈنٹ جنرل تو نیسیہ میں کونسا درجہ نازک کام انجام دے رہے ہیں جو یہاں ہماری لب کشائی سے معرض خطر میں پڑ جاتے گا؟ اگر اقوام متحدہ میں اس مسئلے پر بحث تو نیسیہ کے انڈیڈنٹ جنرل کے کام کو تباہ کر دے گی اور اگر اس بین الاقوامی عدالت میں آزادانہ بحث اس کے لئے رکاوٹ بن جائے گی تو ہم بھی سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کسی بڑے کام ہی کے دھپے ہوگا۔ جس میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔ کسی اچھے کام میں رکاوٹ کا اسکاں ہی نہیں اور میں ہرگز نہیں سمجھ سکتا کہ اقوام متحدہ میں کوئی بحث بہبود انسانی پر ایسا ہلکا اٹھائے گی۔

ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اگر ہم نے یہاں اس مسئلے پر بحث کی تو اس سے تو نیسیہ میں بے پنی کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ بات شروع ہی سے کہی جا رہی ہے یہ پہلو سب سے پہلے نمائندہ فرانس نے پیش کیا اور میں سمجھتا ہوں کہ بعض دوسرے نمائندوں نے بھی غلوں کے ساتھ خطرہ محسوس کیا کہ ہمارے الفاظ کسی نہ کسی طرح وہاں کے عوام کو مشتعل کر دیں گے۔

تو نیسے میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ اول وہاں کے اصل باشندے، دوسرے فرانسیسی۔ فرانسیسیوں نے ہزاروں فوجیں وہاں اتار دی ہیں۔ ان کے ساتھ ٹینک ہیں توپیں ہیں اور ہر قسم کے آلات و اسلحہ ہے۔ جس حد تک مجھے علم ہے اہل تو نیسے کے پاس نہ کوئی اسلحہ خانہ ہے اور نہ کوئی حربی کارگاہ۔ لہذا اگر ہمارے الفاظ کسی کو شغل کر سکتے ہیں تو وہ صرف فرانسیسی ہیں۔ وہی موثر طریق پر مشغول ہوں گے اہل تو نیسے میں کیونکہ اشتعال پیدا ہو سکتا ہے؛ وہ کبھی کبھار ایک بم پھینک سکتے ہیں وقتاً فوقتاً شور مچاتے رہتے ہیں لیکن وہاں کی پوری فوجی قوت فرانسیسیوں کے قبضہ میں ہے۔ ہم انہیں اس وقت فوجی کارروائیوں سے باز رکھنا چاہتے ہیں۔ تاکہ وہ ان افعال کے مرکب نہ ہوں جنہیں ”مظالم“ سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ یہ ایسا لفظ ہے جو نمائندہ فرانس کے کانوں پر یقیناً گراں گزرے گا۔ تو نیسے میں فی الحال اور کچھ نہیں ہو رہا۔ البتہ ریڈیو انٹرنیشنل جنرل سرتوڈ کو سٹیشن کر رہا ہے کچھ نہ کچھ ہو جائے تاکہ دنیا کو بتا سکے کہ بات چیت از سر نو شروع ہو گئی ہے۔

سلطنت متحدہ کے وفد کی طرف سے یہ بات سن کر مجھ بے حد تعجب ہوا۔ اس لئے کہ سلطنت متحدہ کے سوادینا کا کوئی ملک نہیں جسے اس قسم کے حالات کا زیادہ تجربہ ہو۔ اس وفد کو خوب معلوم ہے کہ پاک و ہند کی سرزمین میں برطانوی اقتدار کی دست کشی سے پیشتر قومی لیڈروں کو بار بار جیلوں میں ڈالا گیا تھا اور ان کی جگہ مقامی معززین، نے حکومتیں بنالی تھیں۔ یہ وہی اصطلاح ہے جو فرانس نے تو نیسے میں اپنے پھوٹوں کے لئے استعمال کی، زیادہ معتدل اور زیادہ معقول عناصر سے کھوتے ہوئے، لیکن ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی کھوتہ کارآمد ثابت نہ ہو۔ جب تک عوامی خواہشات سے امراض جاری رہا۔ اصلاحات کی کوئی قسط اطمینان و صلاحیت سے کامیاب نہ ہو سکی یا انجام کار ایک ایسے طرز عمل کی بنا پر

جو میرے نزدیک تاریخ میں ہمیشہ شاندار اور برتر ہے گا۔ سلطنت متحدہ نے یہی مناسب سمجھا کہ ان لوگوں سے بات چیت کر کے جنہیں ایک موقع پر جیلوں میں ڈالا گیا تھا اس کے بعد ہی پاک و ہند اور سلطنت متحدہ کے درمیان پابندارہ اس دوستی کی بنیاد پڑی۔ اس دوستی پر ہمیں فخر ہے۔

تاہم یہ اس وقت تک ممکن نہ ہوا جب تک سلطنت متحدہ نے ایک جرات مندانہ اور خیال انگیز قدم نہ اٹھایا۔ روز بروز وقت گزر رہا تھا۔ تدریجاً تدریجاً کام لینے اور دینا کو اپنے اراکوں اور روش کے متعلق دھوکہ دینے کی کوشش کے بجائے سلطنت متحدہ جرات مندانہ اقدام سے اصل کام پر متوجہ ہو گئی اور عوام کے حقیقی مناسکوں کے ساتھ بات چیت کر لی۔ فرانس تو نیسے میں یہ طرز عمل اختیار کرنے پر آمادہ نہیں ہمیں امید تھی کہ سلطنت متحدہ کے نمائندے حکومت فرانس کو یہی مشورہ دیں گے جو ماضی قریب کی تاریخ میں خود ان کے اپنے تجربے پر مبنی تھا۔

اخبارات سے معلوم ہوا کہ کوئی دو ہفتے پیشتر فرانس کے وزیر صحافت کے درمیان بات چیت ہوئی تھی اور موضوع گفتگو تو نیسے تھا۔ اگر سر گلڈون کا بیان اسی مشورے پر مبنی ہے جو کہ مغلہ کی حکومت کو یہ معاملہ ایجنڈے میں شامل کرنے کے لئے دیا گیا۔ تو مجھے افسوس ہے کہ ان دو معزز اصحاب کی یکجہائی سے کوئی اچھا نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ سر گلڈون جیب نے انگریزی زبان پر قابل شک دسترس کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو کچھ سے اور مجھے خرگوش سے تشبیہ دی۔ اس طرح مجھے جلد بازی کا لازم گردانا موصوف نے بتایا کہ برطانوی دولت مشترکہ میں جس کے ساتھ وابستگی کی عزت انہیں مجھے اور ہمارے ملکوں کو حاصل ہے۔ بجا بجا کے سیاسی جانوروں کی گنجائش ہے۔ یہ تو غالباً درست ہے لیکن اگر برطانوی دولت مشترکہ میں مشرور بھی موجود ہیں تو وہ میرے

ملک میں نہیں پائے جاتے۔

اب میں اس معاملے کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جو میرے نزدیک حد درجہ
بے حد اہم تھا۔ یعنی اس مسئلے کے متعلق ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا موقف۔
جس حد تک آزادانہ بحث و تجویز کا تعلق ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ دنیا کا
کوئی دوسرا ملک ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے زیادہ عزت مندانہ ریکارڈ
پیش کر سکتا ہے۔ اس وقت تک امریکہ کی پالیسی براہم سے پاک رہی اور وہ
حد درجہ بلند آہنگ تھی۔ گزشتہ برسوں میں اس معاملے کے متعلق آزادی تقریر
کے بارے میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے جو کچھ کہا ان میں سے بعض حصوں کو
دہراتے ہوئے مجھے خوشی ہوتی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ان سے بہترے
اصحاب کے قلوب میں حرارت پیدا ہو جائے گی۔ ان میں سے بعض حصے بڑے
روح افزا ہیں۔ میں ان حصوں کو اس غرض سے یہاں پیش کروں گا۔
تاکہ اندازہ ہو سکے آج اقوام متحدہ کے بڑے ارکان کی روش میں کتنا نمایاں
تغیر آچکا ہے۔

کیا مجھے ۱۹۴۶ء کی طرف توجہ کی اجازت دی جائے گی۔ جب مہرٹے ٹینیس
(MR-STETTINIUS) نے روس کے خلاف ایران کی شکایت پر
تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔

”اگر ہم کونسل کے آئندہ اجلاس میں بحث کی غرض سے ایسے مسائل
کو اجنڈے میں لانے پر راضی ہو سکیں تو میں سمجھتا ہوں اس طرح صحت حال
ہمارے سامنے واضح ہو جائے گی میں یہ حقیقت زیادہ سے زیادہ واضح کر
دینا چاہتا ہوں کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی حکومت کو یقین ہے اگر ان
کے اہلکاروں میں سے کوئی ملک شکایت لے کر آتا ہے تو یہاں اسے اپنی بات

منلنے کا حق حاصل ہے۔“

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے اسی نمائندے نے فروری ۱۹۴۶ء میں یونان کے
اندر برطانوی افواج کے مسئلے پر تقریر کرتے ہوئے کہا:-

• جب مختلف ملکوں کے درمیان شدید غلط فہمیاں پیدا ہو جائیں تو بہتر یہی
ہے کہ وہ اپنے معاملات کو اس کونسل میں سے آئیں۔“

امریکہ کے ایک اور معزز نمائندے مسٹر جانسن (MR. JOHNSON) نے یونان
کے خلاف جمہوریہ شورا کی رائے کو کڑی تنقید کی شکایت پر ستمبر ۱۹۴۶ء میں بحث کرتے ہوئے کہا:
”اس نظام (حفاظتی کونسل) کی تاسیس کے وقت سے میری حکومت کا موقف
برابر رہا ہے کہ اگر اقوام متحدہ کا کوئی رکن کہتا ہے ایسے حالات موجود ہیں
جن سے بین الاقوامی امن و حفاظت کے لئے خطرہ درپیش ہے تو کونسل
اسے اپنا معاملہ پیش کرنے کا موقع دینے سے انکار نہیں کر سکتی۔ میری
حکومت اس اصل کو بہت اہم سمجھتی ہے۔“

امریکہ کے اسی نمائندے یعنی مسٹر جانسن نے ۱۹۴۷ء میں پھر کہا:-

• یہ واقعہ بھی بڑا اہم ہے کہ دنیا کے اس خطے میں گولی بیل رہی ہے اور آدی
مارے جا رہے ہیں۔ لہذا حفاظتی کونسل کو اس پر توجہ کا حق حاصل ہے۔ خواہ
سیادت کا تصور کچھ ہی ہو۔ اور انجام کار اس بارے میں کچھ ہی فیصلہ کیا جائے
موس نے چیکوسلوواکیہ کی آزادی میں مداخلت کی تھی اور اس پر چلی کی طرف سے شکایت
کی گئی تھی۔ مسٹر وارن آسٹن (MR. WARREN AUSTIN) نے اس سلسلے میں
تقریر کرتے ہوئے کہا:-

• جو مسئلہ سامنے ہے اس کے متعلق فیصلہ اصل معاملے کا فیصلہ نہ ہوگا
اس معاملے کے مالہ و مابیلہ پر فیصلہ نہ سمجھا جائے گا۔ مگر جب ایک

مسئلہ پیش ہو۔ جیسا کہ یہاں ہوا یعنی یہ کہ کوئی معاملہ بحث کے لئے لیجنٹس پر رکھا جائے یا نہ رکھا جائے تو اس معاملے کی نوعیت پر ضرور غور کر لینا چاہیے۔ تاکہ معلوم ہو سکے حفاظتی کونسل کی دسترس میں وہ آتا ہے یا نہیں آتا۔

سٹو آسٹن نے مزید کہا: —

یہ کیا حفاظتی کونسل اس ذمہ داری سے اعراض یا امانت کر سکتی ہے جو اس کے کندھوں پر ڈال دی گئی ہے کہ ان تمام الزامات کی سماعت کرے؟ ان وجوہ سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی حکومت اس امر کو ایجنڈے پر لانے کے حق میں دوٹو دے گی؟

میں وہ تمام اقتباسات پیش نہیں کروں گا جو اس وقت میرے سامنے ہیں۔ میں اپنے رفیقوں کو تھکا دینے کا خواہاں نہیں۔ امریکہ کی حکومت زمانہ نامنی میں اس مسئلے کی حمایت میں بڑی بلند آہنگ اور محکم رہی ہے۔ میں جیسپ (MR. JESSUP) کے بیانات میں سے بعض اقتباسات چھوڑتا ہوں اور اس اقتباس پر آتا ہوں جو میرے ذہن کا آخری اقتباس ہے۔ یہ مسٹر فارن آسٹن کے بیان سے ماخوذ ہے جو اس شکایت کے سلسلے میں دیا گیا تھا کہ حکومت ایران عالمی بین الاقوامی عدالت کی موقت تجاویز پر عمل کرنے میں ناکام رہی۔ موصوف نے فرمایا: —

”اقوام متحدہ اصولاً کسی ملک کے داخلی معاملات میں دخل دینے کا حق نہیں رکھتی۔ تاہم دخل دینے سے انکار اس وقت پیش نظر آسکتا ہے، جب ایجنڈا منظور کر لیا جائے اور اس پیش کردہ معاملے پر غور و خوض ہو جائے۔ یہ انکار پیشتر نہیں ہو سکتا۔ الا یہ کہ انکار کے معقول وجوہ موجود

ہوں۔“

تاہم یہی روش ان متعدد دوفونے اختیار کی جو اس موقع پر ہمارے نقطہ نظر کو قبول کرنے کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اختیار کے معاملے کی طرف اشارے ضرور کئے گئے ہیں۔ اگرچہ ان پر بحث نہیں کی گئی۔ بعض نمائندوں نے کہا کہ جب تک اس مسئلے کو ایجنڈے پر لانے کی رضامندی نہ دی جائے گی وہ کونسل کے اختیار یا عدم اختیار کی بحث میں نہیں پڑیں گے۔

اس طرح امریکہ نے سالہا سال تک واضح روش پر قائم رہنے کے بعد اپنی پالیسی بالکل بدل لی مجھے اعتراف کرنا چاہیے کہ یہ طرز عمل ہمارے لئے بہت بڑی مایوسی کا باعث ہوا۔ اس تبدیلی کے ابتدائی آثار گزشتہ موسم خزاں میں جنرل اسمبلی کے اجلاس پیرس کے دوران نمایاں ہو چکے تھے۔ اس اجلاس میں مراکش کا مسئلہ پیش ہوا تو امریکہ نے اسے جنرل اسمبلی کے ایجنڈے میں شامل کرنے سے اختلاف کا فیصلہ کیا۔ ہمیں اس معاملے میں امریکہ کے افکار اور طرز عمل کی سرگوشٹ کا علم تھا۔ ہم نے طے کیا کہ یہ امریکہ کے اس راستے سے ایک خلیفہ سا انحراف ہے جو اس نے اپنے لئے چن رکھا ہے۔ محض یہی نہیں ہم یہ سمجھتے ہوئے خوش تھے۔ اور اس کے لئے مجھے امریکہ کے وفد کو انتہائی تحسین کا مستحق سمجھنا چاہیے۔ کہ امریکہ نے کسی بھی معاملے کو ایجنڈے میں شامل کرنے کی کبھی مخالفت نہیں کی۔ اگرچہ اس میں خود امریکہ ہی کو شدید الزامات کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اسی سرگوشٹ کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم نے یہ سمجھا کہ مسئلہ مراکش کے متعلق امریکہ کے ووٹ کو ایک منفرد مثال سمجھنا چاہیے۔ غالباً بہت سی مصلحتیں پیش نظر تھیں جو مسئلہ مراکش کے متعلق امریکہ کے ووٹ پر اثر انداز ہوئیں لیکن پیش نظر مسئلے کو کسی مصلحت سے کوئی تعلق نہیں۔ شاید ایک مصلحت یہ تھی کہ ہمارا اجلاس پیرس میں ہو رہا تھا جو نمائندے یہاں تشریف فرما ہیں انہیں یاد ہو گا کہ فرانس کے وزیر خارجہ

نے جو تقریر کی تھی۔ ویسی عجیب و غریب تقریر اقوام متحدہ میں کسی نہیں سنی گئی۔ اس نے مقام تقریر پر پہنچ کر اسمبلی سے درخواست کی کہ مسئلہ مراکش کو ایجنڈے میں شامل کرنے سے متعلق ووٹ دینے سے احتراز کیا جائے اس لئے کہ ووٹر معاملات کے علاوہ اسمبلی اس وقت فرانس کی ممان ہے۔ یہ امر حوصلہ افزا ہے کہ جو وفد اس برقیے پر موجود تھے ان میں سے متعدد نے اس مروت اور خوش خلقی کو اپنا دوسرا لازم کر لیا جس کے متعلق وزیر خارجہ فرانس نے یاد دہانی کی تھی۔ اس قسم کی مروت و خوش خلقی پر کاربندی دنیا میں آج بھی مزید حوصلہ افزائی کی موجب ہوتی۔ اگر لاکھوں مراکشوں کی زندگی اور آزادی معرض خطر میں نہ ہوتی۔ جس طرح آج لاکھوں تونیسوں کی زندگی معرض خطر میں ہے۔

آج ہم کس کے ممان ہیں کہ وہی روش اختیار کرنے پر مجبور ہوں جو پیرس میں اختیار کی گئی تھی وہی وجہ ہے کہ آج امریکہ کا ووٹ سے احتراز نہیں ووٹ سے احتراز کے مقابلے میں زیادہ قابل توجہ ہے۔ ہم اس احتراز کا ماتم کرتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اپنے امریکی دوستوں اور امریکی وفد کے دوستوں کو یاد دلانا میرا کام نہیں کہ ان کا فیصلہ دنیا بھر میں آزادی فکر و خیال کے عامی عناصر کی بہت بڑی تعداد کے لئے باعث رنج ہوگا۔ ہم جانتے ہیں کہ حفاظتی کونسل کے گزشتہ اجلاس سے اب تک یہ مسئلہ بہت سے ملکوں کے باشندوں پر اثر انداز ہوتا رہا ہے۔ ہر جگہ دلوں کو ٹوٹنے کے بعد اس پر گرا غور و خوض ہوا۔ میں کسی آزاد خیال اخبار سے آگاہ نہیں جس نے یہ موقف اختیار کیا ہو کہ اس مسئلے پر بحث کا دروازہ بند کر دینا کوئی اچھی پالیسی ہوگی اور امریکہ بھی ان ملکوں میں شامل ہے۔ مجھے یقین ہے کہ امریکہ کی حکومت نے خطرات کا پوری طرح غائبہ و موازنہ

کر چکنے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہوگا۔ وہ اور ہم گیارہ ممبر جو اس شکایت کو حفاظتی کونسل میں لائے۔۔۔ محض ہمیں نہیں بلکہ آج کی تمام آزادی پسند قوتیں۔۔۔ کشیدگی اور تناؤ کے اس دور میں زیادہ سے زیادہ اور وسیع ہے وسیع اتحاد پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں۔ دنیا کو مصائب سے بچانے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ امید کرتا ہوں کہ امریکہ کی خاطر، ہماری رہنما خاطر اور اسمن و آزادی سے محبت رکھنے والے تمام ملکوں اور جماعتوں کی خاطر اس امر کا پورا خیال رکھا جائے گا۔ کہ امریکہ کا یہ فعل اصل مقصد کی تلاش میں خیر ضروری رکاوٹ ثابت نہ ہو۔

جس سنگ میں اندازہ کر سکتا ہوں طویل مدت تک ایک واضح طرز عمل اختیار کر چکنے کے بعد یکایک اس کے برعکس کار بند ہونا ایک ایسا معاملہ ہے جس کی کوئی معقول توجیح امریکہ کے بہترین دوست بھی دنیا کے سامنے پیش نہ کر سکیں گے۔ یہ تو تقریباً ایسا ہی معاملہ ہے کہ جس بانار میں سواریاں صرف ایک رخ پر جا سکتی ہیں۔ امریکہ نے اس میں چلتے چلتے اچانک لٹٹخ گامزنی کا فیصلہ کر لیا۔ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اس طرز عمل کے نتائج کیا ہوں گے تاہم میں امریکی وفد کے ارکان کو بار بار دیتا ہوں کہ انہوں نے اپنے بیان میں بہت سے حوصلہ افزا الفاظ ادا فرمائے انہوں نے قوت و طاقت کے استعمال کی مذمت کی اور یہ مذمت تو نیسیوں تک ہی محدود نہ تھی بلکہ اس میں فرانسیسیوں تک کو شامل کر لیا گیا۔ امریکی وفد کے اصحاب خوب جانتے ہیں کہ قوت و طاقت کے آلات تو نیسیوں کے پاس نہیں ان ہلاکت بار ہتھیاروں سے فرانس کا پلٹا زیادہ سے زیادہ جاری ہے نہ کہ تو نیسیوں کا۔ لہذا میں ان کے جملے کا مطلب یہ سمجھتا ہوں کہ انہوں نے قوت استعمال کرنے کے متعلق فرانس کو برسرِ عام متنبہ کر دیا ہے۔ فرانس اب تک تو نیسیہ میں قوت ہی استعمال کرتا رہا ہے۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ اس وقت تک یہی کرتا رہے

گا۔ جب تک عالمی ریسٹے عامہ کو اس صورت و حال کے خلاف بیدار نہ کیا جائے گا۔ فرانسیسی کس بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ وہ قوت استعمال نہیں کر رہے جب حالت یہ ہے کہ ایک بھی قابل ذکر شخص آزادانہ بانادوں میں چل پھر نہیں سکتا؟

لہذا میں خیر سنگالی کے ان الفاظ کا خیر مقدم کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اہل تونسیہ ان کا خیر مقدم کریں گے۔ ان لوگوں نے بارہا مدد کے لئے امریکہ پر نظر میں جملے رکھیں۔ اہل تونسیہ نے جب پہلی مرتبہ امریکہ سے امداد کی اپیل کی تھی تو اس زمانے میں مسٹر ولس صدر تھے۔ لوگ یہ حقیقت فراموش کر چکے ہیں کہ تونسیہ میں تین یا چار مرتبہ پڑے انقلاب پیا ہوتے ہوتے رہ گئے۔ لوگ بھول رہے ہیں کہ موجودہ قومی تحریک کا آغاز قریباً ۱۹۰۴ء میں ہوا تھا۔ یہ تحریک کل کی پیداوار نہیں۔ ہم نے اس معاملے پر کل، آج اور گزشتہ ہفتے بحث کی۔ اہل تونسیہ جب یہ الفاظ سنیں گے تو مجھے یقین ہے ان کی ہمتیں بندھیں گی۔

ہم امریکی مندوب کے آخری جملے سے بھی اس حد تک تسکین حاصل کرنے کی کوشش کریں گے جس حد تک ممکن ہوگا یعنی امریکہ صرف اس مرتبہ صورت میں سے احتراز کر رہے ہے جب پیرس کے اجلاس میں سزاکس کا مسئلہ مسترد کیا گیا تھا تو اس وقت بھی یہی جملہ استعمال کیا تھا۔ اس وقت کہا گیا تھا کہ ہم فی الحال ووٹ دینے سے احتراز کرتے ہیں۔ آج امریکہ نے اس مرتبہ "کا جملہ استعمال کیا ہے۔" یورپ کے رقیبوں کو معلوم ہے کہ پیشہ وارانہ پلوٹیک بولی میں اس مرتبہ کے الفاظ محض لیپ اپوت کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ اس جملے کو کسی فقرے میں ایسی جگہ رکھنا جہاں زیادہ سے زیادہ زور کے ساتھ کم سے کم معنی مقصود ہوں یہ اثر پیدا کرتا ہے کہ کہنے والے کے دل میں ابھی غلط سمجھتا باقی ہیں۔ ہم اس جملے کے استعمال کو یہ بڑے معنی نہ پہنائیں گے میں سمجھتا ہوں کہ

اس جیلے کی تعبیر کا بہترین طریقہ یہ ہو گا کہ امریکی ضمیر کی ایک چھوٹی سی کرن ادیقیا نوسی ڈپلومیسی کے دھندکے سے پنجہ آزمائی کرتی رہی اس لحاظ سے ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں اور مجھے امید ہے کہ وہ وقت نہ آئے گا جب ہمیں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو پابندی قول و عہد نہ کرنے کا طعنہ دینا پڑے گا۔ مجھے یہ بھی امید ہے کہ ہماری ناکامی اہل کونسیہ کی ناکامی نہ ہوگی۔

مجھے ایک چھوٹی سی بات اور کہنا ہے پھر میری تقریر کا یہ حصہ ختم ہو جائے گا۔ ہم اس معاملے میں فرانس کے مفلا کی مخالفت نہیں کر رہے۔ ہم ہمد دی کے ان زبردست روابط سے بے خبر ہیں جو جنگلے کے دوسری جانب بیٹھے ہوتے مختلف ملکوں کے درمیان قائم ہیں۔ ہم فرانس کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم نے اس کی مثالی شجاعت کا ہمیشہ احترام کیا۔ مصائب و آلام کے دور میں ہمیں اس کے ساتھ گہری ہمد دی رہی ہے اور ہم چلتے ہیں کہ وہ ہمد دی ابھی تک ختم نہیں ہوتی اور ہم مستقبل میں اس کے لئے امن و خوشحالی کے آرزو مند ہیں۔

تاہم ہم نے یہ مسئلہ اس لئے اٹھایا کہ ہم یہ صمیم قلب یقین رکھتے ہیں فرانس کے مفاد کا تقاضا اہل کونسیہ کے حقیقی نمائندوں سے پُرمان مفاہمت میں ہے۔ ان پٹھوؤں کے ساتھ مفاہمت نہیں جنہیں خود فرانس بروئے کار لایا۔ مسٹر ڈی ہائی کلوک (MR. DE HAUTE CLOCHE) ریٹرنٹ نٹ جرنل، اس وقت اتھائی سرگرمی سے تاش کے پتے پھینٹنے میں مشغول ہیں اور انہیں امید ہے کہ چاروں یکے کسی وقت بھی ان کے ہاتھ آجائیں گے۔ لیکن افسوس کہ جن چاروں کی وہ امید لگائے بیٹھے ہیں انہیں مسٹر ڈی ہائی کلوک نے قید میں ڈال دیا ہے۔

فرانس کے ارباب بست و کشاد غالباً یہ سمجھے ہیں کہ انہوں نے ہمارے ساتھ — ان گیارہ قوموں کے ساتھ جو اس مسئلہ کو حفاظتی کونسل میں لائے۔

شطر سنج کی بازی لگا رکھی ہے اور انہیں بلکہ سے جلد چال چلی جانی چاہیے ورنہ کوئی طوفناک واقعہ رونما ہو جائے گا۔ ہم ان سے شطر سنج نہیں کھیل رہے بلکہ ایسا ہو گا تو ہم یہ شکایت بڑی مستعدی سے بہت پہلے پیش کر دیتے اور فرانس کے لئے یہ مدد پیش کرنے کا موقع نہ رہتا کہ ہم نے اپنی توفیہ کے ساتھ بات چیت جاری کر رکھی ہے۔ یہ معاملہ آج یا کل شکایت پیش کرنے کا نہیں۔ اگر سٹر ڈی ڈی ٹی کلک کل اپنی آستین سے کاہینہ وزارت نکال کر پیش کر دیں تو وہ اپنے سوا دنیا کے کسی آدمی کو مبتلائے فریب نہ کر سکیں گے۔ وہ ہمیں مات دینے کی کوشش نہیں کر رہے، اگر ایسا ہے تو انہیں اس سے کوئی فائدہ نہ پہنچے گا۔ وہ ہم سے جنگ نہیں کر رہے اور ہماری ان سے کوئی لڑائی نہیں۔ وہ تاریخ سے جنگ کر رہے ہیں اور وہ واقعات کی رفتار سے سر توڑ ٹھکر لینا پسند کریں گے تو برابر نالام رہیں گے۔

لندا میں توفیہ کے فرانسیسی ارباب بست و کشاد سے التجا کرتا ہوں کہ وہ جان لیں یہ ہمارے ساتھ شطر سنج کیلئے اور تیز تیز چالیں چل کر ہمیں مات دینے کی کوشش کا موقع نہیں۔ یہ ایسا معاملہ نہیں کہ امریکہ کے جرمنی سے نیشن کے الفاظ میں حیران تیز رفتاری سے وزارتیں بنا دینے سے مل رہے ہو جائے گا۔ یہ معاملہ گہری مفاہمت کا مقامی ہے اس کا تجزیہ ٹھنڈے دل سے کرنا چاہیے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ انجام کار میرے دوست فائبرہ امریکہ کے الفاظ میں عوام کا ارادہ اور عزم بروئے کار آئے گا۔

ہم فرانس کے مفاد کی مخالفت نہیں کر رہے ہیں سمجھتا ہوں کہ خود فرانس کے ارباب بست و کشاد اپنے وطن کے مفاد کی مخالفت میں سرگرم عمل ہیں۔ وہ ان مٹھی بھر فرانسیسی آبادکاروں کے مفاد کی حفاظت میں مصروف ہیں جنہوں نے

تونیسیہ میں مدد جہ وسیع مراعات حاصل کر رکھی ہیں اور پیرس کے سیاسی طبقے ان کی حمایت میں مدد جہ پر ندمان و گرم جوش ہیں۔ فرانس میں بھی آزاد خیال لوگوں کا خاصا بڑا گروہ ہے جس نے تونیسیہ کی موجودہ صورتِ حال کو زلت خیز قرار دیا۔ فرانس آزاد خیالی کی عظیم الشان روایات کا حامل ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ تونیسیہ کے ڈیڑھ لاکھ فرانسیسی آبادکاران روایات کی مدد خانی کو مدہم کر سکیں گے وہ تھوٹی دیر کے لئے ان روایات کو پس پشت لٹالنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں لیکن ہمیشہ کے لئے ایسا نہیں کر سکتے۔

لہذا اگرچہ ہم پندرہ تو ہیں — پانچ جو حفاظتی کونسل کی رکن ہیں اور جنہیں اس معاملے میں ووٹ دینے کا حق ہے اور دس ہم جو حفاظتی کونسل سے باہر ہیں اور ووٹ کی مجاز نہیں — ہم اس کام میں ناکام ہو چکے ہیں جسے اپنا فرض سمجھ کر اٹھایا تھا۔ چھ قومیں ہمیں شکست دے رہی ہیں۔ دنیا خود بخود اس واقعے سے صحیح نتائج اخذ کرے گی۔

سوال یہ ہے کہ اس غم ناک صورتِ حال کے مداوا کی موجودہ مرحلے پر کیا سورت ہے؟ کیا کوئی ایسی چیز باقی ہے جس پر عمل پیرا ہو کر ہم بحیثیت اقوام متحدہ اپنی عزت ایک حد تک بچا سکتے ہیں؟ اگر حفاظتی کونسل اس مسئلے کو مسترد کر دینے پر تلی بیٹھی ہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ ہمیشہ نظر خطوط کے مطابق کوئی چارہ کار باقی نہیں رہے۔ صرف ایک چھوٹا سا کام شاید باقی ہے جس پر حفاظتی کونسل مناسب سمجھے تو راضی ہو سکتی ہے۔

جن گیارہ قوموں نے یہ مسئلہ اٹھایا تھا انہوں نے دفعہ ۳ کے ماتحت درخواست کی تھی کہ حفاظتی کونسل اس معاملے کو پیش کرنے کی اجازت دے۔ وہ مودعہ جس کے بھر سے پرابتدائی درخواست پیش کی گئی تھی اس وقت تک نہیں آسکتا جب

ہمک یہ معاملہ ایجنڈے پر نہ آیا جائے ہماری درخواست اس وقت رد ہوتی ہے
گی جب ووٹ لئے جائیں گے۔

اندریں اشنا طریق کار کی بحث کے دوران میں ہماری ہتک کی گئی۔ دس قومیں وہ
جو حفاظتی کونسل سے باہر ہیں اور ایک قوم وہ جو کونسل کی ممبر ہے ان گیارہ قوموں
نے بین الاقوامی امن کی خاطر یہ مسئلہ اٹھایا تھا۔ میرے فرانسیسی رفیق نے ہماری
ہتک کی۔ اس نے ہم پر الزام لگایا کہ جو بیانات ہم نے دیئے ان کا مقصد پروپیگنڈا
تھا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ ہم میں سے بعض پر ویسا اعتماد نہیں رکھتا جیسا دوسروں پر
رکھتا ہے لیکن میں زیادہ سے زیادہ دور افتادہ ملک کا معاملہ سامنے لاتا ہوں اور
کہتا ہوں کہ فلپینز کے دل میں پروپیگنڈے کی کونسی غرض ہو سکتی تھی جب وہ
اس مسئلے کو حفاظتی کونسل میں لانے پر آمادہ ہوا؟ نمائندہ فرانس نے ان فتووں
اور ان کی حکومتوں پر حفاظتی کونسل میں پھبتیاں کیں جب طریق کار پر بحث ہو
رہی تھی اور اس مسئلے کو ایجنڈے پر لانے کے بارے میں خود غرض کیا جا رہا تھا
لیکن قطعی فیصلہ کوئی نہ ہوا تھا۔ اس کے بعد دس قوموں اور ان کے نمائندوں نے
درخواست پیش کی کہ اگر انجام کار ناکامی ہمارے لئے مقدور ہو چکی ہے تو کم از کم
ہمیں ازراہ مروت جواب کے اخلاقی حق سے محروم نہ کیا جائے ہم پر الزامات
لگائے گئے۔ ان کے جوابات کا ہمارے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں ہے ہم قوام متحدہ
کے تمام مباحث کے دوران میں اور ان کے علاوہ جواب کا حق اس طرح تسلیم
کر چکے ہیں جسے قطعاً آگے بچھے نہیں کیا جاسکتا۔ شاید حفاظتی کونسل مسئلہ تو نیسیہ
پر بحث کے بعد دس گیارہ قوموں کی درخواست کو مسترد کر کے کم از کم تلافی کا
موقعہ ضرور پیدا کر سکے اور دس قوموں کو کونسل کی میز پر بلائے تاکہ وہ صوغ باقی
پروپیگنڈے اور غرض مندانه بیانات کے نگیں الزامات کا محض جواب دے سکیں جو فرانس

نمائندے نے گزشتہ جمعہ کے اجلاس میں ہمارے خلاف عائد کئے ۱۰ اس وجہ سے
 میرے رفیقوں کی تجویز ہے کہذیر خود مسئلے کے بارے میں فیصلہ سے پیشتر ہمیں
 حفاظتی کونسل کی حیثیت میں ان دس ملکوں کو دعوت دینی چاہیے جنہوں نے
 آج کونسل کی خدمت میں تحریر پیش کی ہے اور جن کے خطوط میں بحث کے آغاز میں
 پڑاھ کر سنا چکا ہوں دعوت یہ ہو کہ وہ حفاظتی کونسل میں آئیں اور ان الالامات کے
 جواب کا اطلاق ہی استعمال کریں جو نمائندہ فرانس نے ان کے خلاف استعمال کئے۔
 پاکستان کے نمائندے کی حیثیت میں میرا بیان یہاں ختم ہوتا ہے۔

اس بیان کا متن جو پروفیسر احمد شاہ بخاری نے حفاظتی کونسل میں ۱۲ اپریل ۱۹۵۲ء کو دیا۔

مسئلہ تو نیسیہ کو ایجنڈے پر لانے کے حق میں پاکستان نے جو ووٹ دیا ہے اس کے ضمن میں ضروری تصریحات کی غرض سے میں مندرجہ ذیل بیان دینے کا خواہ ہوں۔

سال ہواں کے قریباً آغاز ہی سے تو نیسیہ میں شدید بے چینی جاری ہے۔ قتل، تشدد، آتش بازی اور وسیع پیمانے پر گرفتاریوں کی خبریں دینا بھر کے اخباروں میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ میری حکومت نیز اقوام متحدہ کے رکن ملکوں میں سے دس اور حکومتوں کے نزدیک یہ صورت حال بے حد تشویشناک ہے۔ ہمارا قطعی یقین ہے کہ گزشتہ تین ماہ یا اس سے کسی قدر زیادہ مدت کے اندر تو نیسیہ میں جو دردناک حالات پیش آئے انہیں محض مقامی جنگلے قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ شہریوں میں کچھ فساد ہو یا معمولی امن شکنی۔ ہمیشہ آئے جیسے روکنے کے لئے نظم و قانون کے ٹھکے کو عام اقدامات کرتے پڑے جن لوگوں کے ہاتھوں یہ واقعات رونما ہوئے ان کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ فریقین کے احمق یا بدکردار لوگ تھے۔ اس صورت حال کی بجز میں مامنی میں چلی گئی ہیں۔ فی الحال توازن بڑی ہی نازک حالت میں ہے۔ مستقبل

کے دامن میں ناخوشگوار واقعات ہی نظر آ رہے ہیں۔ اسی لئے ہمارے نقطہ نگاہ سے یہ صورت حال بین الاقوامی امن و سلامتی کے لئے ایک شدید خطرہ بنی ہوئی ہے۔ میں اجانت پاہتا ہوں کہ اپنے ووٹ اور نقطہ نگاہ کی توجیح و جواز کے لئے اس کے متعلق مزید کچھ عرض کروں۔

فرانسیسی حکام امداد بل تونیس کی حکومت کے درمیان جس کش مکش نے سال میں ساری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ یہ اس کش مکش کا محض تازہ ترین منظر ہے جو سالہا سال سے جاری ہے۔

فرانس نے ۱۸۸۱ء میں تونیس پر قبضہ جمایا تھا۔ جب کہ ایک فرانسیسی فوج (موتخ کے بیان کے مطابق) الجزائر سے اس بھانے تونیس میں داخل ہوئی تھی کہ ایک قبیلے کو سزا دینی مقصود تھی۔ داخل ہوتے ہی اس فوج نے نمائشی نقاب تیزی سے اتار پھینکی حاکم الحکومت کی طرف پیش قدمی شروع کر دی اور حاکم تونیس کو فرانس کی اطاعت قبول کر لینے پر مجبور کر دیا۔

اسی سال معاہدہ یارود قرار پایا۔ یہ معاہدہ اپنی عمومی وضع میں ان معاہدوں کے عین مطابق تھا۔ جو استعمار کے بعد عروج میں طاقت ور دنیا اور ناتوانوں کے درمیان ہوتے رہے۔ بہر حال اس کی تمہید میں مرقوم ہے کہ قرطین دوستی اور خوشگوار ہمسائیگی کے روابط کو مستحکم بنانے کے آئندہ مند ہیں جو ان دو حکومتوں کے درمیان ہمیشہ سے چلے آتے ہیں۔ اس معاہدے کی دفعہ میں بتایا گیا ہے کہ فرانس کا فوجی قبضہ اسی وقت ختم ہو جائے گا۔ جب فرانس اور تونیس کے حکمران اس امر پر متفق ہو جائیں گے کہ مقامی انتظامیہ قیام امن بحال رکھنے کی اہل ہے۔

یہ ہمارے تصور جس کا مدعا یہ تھا کہ نظم و قانون بحال رہے۔ بدستور اب تک

قائم ہے اور اس کی کڑیوں میں ڈھیل کا کوئی نشان نظر نہیں آتا اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ توینیسیہ پر فرانس کی گرفت برابر سخت سے سخت تمہوتی گئی۔ فرانس کو توینیسیہ میں قدم جمائے دو سال ہو چکے تھے جب ۱۸۸۲ء میں ایک کنٹریشن پر دستخط ہوئے جو لامرسی (LA MARSA) کی کنونشن کہلاتی ہے اس میں پہلی مرتبہ توینیسیہ کے لئے "ذیر حمایت علاقے" کا جملہ استعمال ہوا تاہم اس سے اس ابتدائی معاہدے کی بنیادی حیثیت میں نہ کوئی تبدیلی ہوئی اور نہ اسے بدلا گیا۔ جو دو حکومتوں کے درمیان، ہو چکی تھی۔ اس کا مفاد یہی تھا کہ دو حکومتوں کے درمیان رہے گا۔ یہ نہ تھا کہ فرانس اختتامیہ کا براہ راست ذمہ دار ہوگا۔ تاہم مملایہ توینیسیہ کی حکومتی کا آواز تھا۔ کیونکہ اس کے بعد صدر جمہوریہ فرانس نے ایک طرفہ حکم جاری کر کے پہلے حکمران توینیسیہ سے اجرائے فرامین کے تمام اختیارات اپنے قبضے میں لئے پھر بہت جلد ایک طرفہ حکم نامے ہی کے ذریعے توینیسیہ میں فرانسیسی نمائندہ کے اختیارات اور بھی مستحکم کر دیئے اور وہ نمائندہ بطور خود توینیسیہ میں فرانسیسی جمہوریت کے اختیارات کا تحویل دار بن گیا۔

کسی علاقے کو ذیر حمایت لے لینے کی وجہ سے ہازیہ پیش کی جاتی ہے کہ پسماندہ اقوام کو خود اختیاری حکومت کے راستے پر چلایا جائے۔ لیکن توینیسیہ کے تعلق میں اس پر برعکس عمل ہوا یعنی اس آزاد ملک کو آہستہ آہستہ آزادی سے محروم کر دیا گیا اس کی قیادت اور برتری کا کھاکا کر ختم کر دی گئی اور جو خود مختاری اسے ایک صدی بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت سے حاصل تھی وہ غیر ملکی اقتدار میں بدل دی گئی۔

پھر توینیسیہ میں فرانسیسیوں کو آباد کرنے کا مسلک اختیار کیا گیا۔ ان آبادکاروں

کوزہ میں بھی دی گئیں اور مالی امداد سے بھی نوازا گیا۔ تو نیسیہ کے نظم و نسق میں فرانسیسی کارندوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ بہترین زمینیں ان آباد کاروں کے ہاتھوں میں جا چکی ہیں جو براہ راست فرانس سے آئے تھے یا ماضی قریب میں انہیں تو نیسیہ میں قومی حقوق مل گئے۔ ہزاروں ایکڑ زمین کو خواہ مخواہ جنگلات قرار دے کر حکومت قابض ہو گئی۔ ایک اور قانون کے ذریعے سے ان تمام جنگلات کی درجہ بندی کر کے خاص آباد کاروں کے فائدے کے لئے از سر نو تقسیم کر دیا گیا۔ تو نیسیہ کی آبادی تینتیس لاکھ کے قریب ہے۔ ان کے مقابلے میں فرانسیسی صرف ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہیں۔ تیس ہزار چھوٹے بڑے افسرک کا نظم و نسق سنبھالنے بیٹھے ہیں۔ گویا ایک سو باشتندوں کی ہر جماعت کے لئے ایک افسر مقرر ہے۔ ان افسروں میں سے تین چوتھائی فرانسیسی ہیں۔ تعلیم پر نظر ڈالی جائے تو مددوں میں جانے والے تو نیسی طلبہ کا تناسب $12\frac{1}{2}$ فیصد ہے اس کے مقابلے میں فرانسیسی طلبہ کا تناسب ۸ فیصد ہے۔

سب پر مستزاد یہ کہ فرانس کی طرف سے جو ریڈیڈنٹ تو نیسیہ میں مقرر ہے اس نے حکمران کے تمام اختیارات عصب کر لئے ہیں اور اس عزم کی برتری کا احساس قائم رکھنے کے لئے محض اس کی ہر استعمال کی جاتی ہے تو نیسیہ کے باشندوں کی کوئی قانون ساز مجلس یا پارلیمنٹ نہیں جس کے غیر رائے رائے سے منتخب ہوتے ہوں اور جسے کم از کم داخلی معاملات کے متعلق ہی قانون بنانے کا اختیار ہو اگرچہ وہاں وزیر مقرر کر دیتے ہیں۔ تاہم احکام نافذ کرتے کا پورا اختیار فرانسیسی افسروں کے ہاتھ میں ہے۔ اہل تو نیسیہ نے فرانسیسی استبداد کو کبھی بطیب خاطر قبول نہیں کیا۔

موجودہ مدی کے آقائے تو نیسیہ کی قومی تحریک میں زیادہ سے زیادہ

قوت و حرکت پیدا ہو گئی اور اس نے ذہنی شکل اختیار کر لی جو ذہنی شکل کے طور پر
 حصوں کی حکومت اور اس نے دور حاضر کی سیاسی فضا میں اختیار کر رکھی ہے۔ یعنی
 وہ بیدار ہوئے آزادی کے لئے جدوجہد شروع کر دی اور بعض حالتوں میں
 اب تک اچھی اقتدار اور عوام کے خلاف سنی و کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔
 اہل توئیسیہ کو بھی وہی مشکلات پیش آئیں جو دوسرے لوگوں کو پیش آ
 چکی ہیں۔ یعنی جن اجنبیوں نے وسیع وسائل ملک پر قبضہ کر رکھا ہے، ان
 کی طرف سے مخالفت اور استعماری طاقت کی طرف سے قوت کا کوتاہ اندیشہ
 استعمال۔ قوم پرست لیڈر بے مدد پے یا تو جیلوں میں ٹھونس دیئے گئے یا
 بلا وطنی پر مجبور ہو گئے اور یہ تمام لوگ بصیرت اور عافیت و ہمت کے مالک
 تھے۔ ان میں سے بعض بلا وطنی ہی میں وفات پا چکے ہیں۔ تاہم عارضی رسائیوں
 کے باوجود تحریک تخریب جارتی کرتی گئی پہلی جنگ عظیم اور ریڈیو ٹیلی ویژن
 کے بعد نکات کے بعد اہل توئیسیہ کے دل نئی امیدوں کی روشنی سے جھلک
 اٹھے۔ جدیدہ اکاٹومسٹ (ECONOMIST) کے بیان کے مطابق میں اسی
 وقت فرانسیسی حکومت نے اپنے افسروں اور چھوٹے چھوٹے آباد کاروں کی
 تعداد بڑھانے کا منظم سلسلہ شروع کر دیا اور فرانس کے سیاسی گروہ مختلف
 فریقوں کی حمایت میں لگ گئے بعض سیاست دان بائیں بازو کی ترقی پسند
 جماعت "نو دستور" کے ساتھ ہو گئے۔ بعض نے آباد کاروں کی پیشی بانی
 اختیار کر لی۔

پیرس میں حکومتیں پڑتی رہیں مگر حکومت کی ظاہری حیثیت کے ساتھ اہل
 توئیسیہ کی امیدوں اور آرزوؤں میں بھی شیب و فراڈ کا سلسلہ جاری رہا۔
 ۱۹۳۸ء میں ایک طرف نو دستور پارٹی کے خلاف مایوس ہو گئی اور اس نے

آخری فیصلے کا ارادہ کر لیا۔ دوسری طرف آبا د کا دعویٰ کے حامی فرانسیسی حکام
 کمر باندھ کر تیار ہو گئے۔ اس طرح وسیع پیمانے پر کش مکش کا اکھاڑہ قائم ہو
 گیا۔ کریمیا ایک ہزار قوم پرود جیلوں میں قائل دیکھے گئے فرانسیسی حکام نے
 اعلان کر دیا کہ تو نیسیہ میں عناصر کی صورت پیدا ہو چکی ہے۔ ہماری اطلاعات
 کے مطابق یہ صورت حال ابھی تک ختم نہیں ہوئی اگرچہ چودہ سال کے
 لیل و نہار گزر چکے ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد حقیقت زندگی کی طرح واضح ہو گئی۔ کہ
 تو نیسیہ میں فرانس کا نظم و نسق نظر ثانی کا محتاج ہے۔ حق یہ ہے کہ یہ نظم و نسق
 نہ تو دو حکومتوں کے درمیان معاہدوں کی بنا پر پر جائزہ تھا۔ اسے انصاف
 آزادی کے اصول کی بنا پر حق بجانب ثابت کیا جا سکتا تھا۔ میں یہاں پھر
 جریدہ اکانومسٹ سے اقتباس پیش کرتا ہوں۔ جریدہ مذکورہ ظہر ہے:-

”جس حکومت کو بدلنے پر وہ (تو نیسی اور فرانسیسی) اصرار کر رہے
 تھے اس کے اجزائے ترکیبی اس وقت یہ تھے۔ پتے (حکمران)
 ایک کابینہ کے ذریعے سے حکومت کا کاروبار چلاتا تھا جس میں
 سات فرانسیسی اور چھ تو نیسی شامل تھے۔ لیکن اس کابینہ کے
 فیصلوں کو اوپر بھیجنے سے پیشتر ایک فرانسیسی کی توثیق لازم تھی۔
 کابینہ کو معاشی اور مالی معاملات میں مشورے دینے کے لئے دو بڑی
 منتخب کونسلیں مقرر کر دی گئی تھیں۔ جن کے ارکان کی تعداد یکساں
 تھی (ایک تو نیسیوں پر مشتمل تھی اور دوسری فرانسیسیوں پر)
 لیکن ان کونسلوں کی حیثیت محض مشوروں کی سی تھی۔ لوکل گورنمنٹ
 برائے نام تو نیسیوں کے حوالے کر دی گئی تھی۔ عملاً پورا اقتدار

فرانسیسیوں کے ہاتھ میں تھا۔ اس لئے کہ ایک فرانسیسی افسر تمام اجلاسوں کی صدارت کرتا تھا۔ حکمران تو نیسیہ کے ہر حکم پر کسی فرانسیسی کے دستخط بھی فروری تھے۔ سب سے آخر میں اس لئے کہ جن فرانسیسیوں کے ہاتھ میں عام ملکی اختیارات تھے وہ بلدی اور دیہاتی اداروں کے بھی نگران اعلیٰ تھے۔

۱۹۵۰ء کے موسم گما میں ۱۹۴۹ء کے واقعات نے دعائم نتیجے پیدا کئے۔ فرانسیسی آبادکاروں کے سخت اصلاح دشمن عناصر کی مخالفت کے باوجود نئے فرانسیسی ریڈیٹنٹ جنرل کو ہدایت کی گئی کہ تین بڑی اصلاحات جاری کر دی جائیں اور اگر ممکن ہو تو اس بارے میں باہل تو نیسیہ کی حمایت حاصل کی جائے۔ اول فوڈا وزارت از سر نو ترتیب دی جائے۔ دوم سول سروس میں داخلے کی شرطیں تبدیل کر دی جائیں تاکہ اہل تو نیسیہ بھی مقررہ تعداد میں لئے جاسکیں اور مقابلے کا امتحان ضروری نہ رہے جسے فرانسیسی آبادکار ترجیح دے رہے تھے۔ سوم بلدیاتی خود مختاری جاری کر دی جائے۔ اگست ۱۹۵۰ء میں ریڈیٹنٹ جنرل نے حکمران کے مشورے کے بعد ایک ایسا قدم اٹھایا جس کی کوئی مثال پہلے موجود نہ تھی۔ اس نے نئی وزارت کی ترکیب کا اعلان کیا جس میں پہلی مرتبہ تو نیسیوں اور فرانسیسیوں کی تعداد مساوی رکھی گئی اور اس کی صدارت تو نیسی وزیراعظم ایم شینک (M. CHENIK) کے حوالے کی گئی۔ سات تو نیسی ارکان مختلف پارٹیوں کے نمائندے تھے۔ صرف کمیونسٹوں اور قدیم دستور پارٹی میں سے کوئی نمائندہ نہ لیا گیا۔ اس لئے کہ آخر الذکر بھی مشرق ہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بہر حال نو دستور پارٹی اس کا بیٹھ میں خدمت گزار ہی پر راضی ہو گئی۔

فروری ۱۹۵۱ء میں تو نیسیوں اور فرانسیسیوں نے باہمی رضامندی سے

کئی تبدیلیاں کرنی۔ ایک تبدیلی یہ بھی تھی کہ وزارت جو فیصلے کرنے گی۔ انہیں حکمران تک پہنچانے سے پیشتر کسی فرانسیسی کی نفرت انگیز توہین فردی نہ ہوگی۔ اب فرانسیسی آبادکاروں کے سوا سب اس صورت حال پر خوش تھے۔ پھر سوال یہ ہے کہ ۱۹۵۱ء میں خرابی کہاں پیدا ہوئی؟ اس کا جواب مختصراً یہ ہے۔ مانسی قریب میں جو مشکلات پیدا ہوئیں۔ ان کی اصل و اساس یہ ہے کہ نو دستور پارٹی نیز توہنیوں کی بہت بڑی تعداد ان اصلاحات کو جلد سے جلد کافی خود مختاری حاصل کرنے کی تمہید سمجھتی ہے اس کے برعکس فرانسیسی آبادکاروں کے رائے یہ ہے کہ ان حدود سے آگے پیرس کو ایک قدم بھی نہ بڑھانا چاہیے۔»

وزیراعظم ٹونی نے ۳۰ مارچ ۱۹۵۱ء کو فرانسیسی ریڈیو انٹرنیشنل کے نام ایک خط لکھا۔ موجودہ وزارت اس وجہ سے بہت بے بس ہے کہ جو نیا قدم یہ اٹھانا چاہتی ہے اس میں مسلسل مداخلت ہوتی ہے..... مذاکراتی وزارت کا قیام اس قسم کے دباؤ کا زیادہ دیر تک متحمل نہیں ہو سکتا خاص طور پر اس لئے کہ ہینوں سے یہ وزارت تو نیسیہ اور پیرس دونوں مقامات پر فرانسیسیوں کی تھخیر آمیز اور معاندانہ سرگرمیوں کا ہدف بنی ہوئی ہے۔ تو نیسیہ اور پیرس میں فرانسیسی نمائندوں کی اکثریت نیز فرانسیسی حکام کی روش اودان سب کی کوششیں کہ گفت و شنیدنا کام ہو جائے ایک کھلے ہوئے راز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ تمام ذرائع استعمال کئے گئے جن کی بنا پر حکومت تو نیسیہ اور اسمبلی کے تعاون کو ناممکن بنا دینا منظور تھا۔ مثلاً اجتماعی طور پر استغنے دئے دیئے گئے خاص سیاسی نقطہ نگاہ سے قراردادیں پیش کی گئیں۔ وزیراعظم نے ترجموں کے سلسلے میں جو مظاہر کیا تھا اسے مخلوط مزدوین کے

ساتھ پیش کر دیا گیا۔ ۲۲ اپریل ۱۹۵۱ء کو وزیر اعظم نے پھر ایک جمعی ریڈیٹنٹ جنرل کے نام بھیجی جس میں ان تمام کارروائیوں کی قلبی کھول لی گئی جو وزارت سے پہلے اس کے بعد اختیار کی گئیں۔ اس میں بڑی مجلس کے فرانسیسی حصے کے استعفیے بھی شامل تھے جو فرانسیسی حکومت اور پارلیمنٹ کے بھیجے ہوئے فندوں کے رد و پیش کئے گئے۔ دباؤ کی کارروائیوں کا بھی ذکر تھا۔ مثلاً پیرس تاریخ بھیجے گئے۔ مختلف انتظامی محکموں میں جو فرانسیسی کام کر رہے تھے۔ انہوں نے معاندانہ شعائر بھی مقرر کر لیا تھا۔ میں ان نازیبا اشاروں کا ذکر نہ کروں گا۔ جن کا مجھے ذاتی طور پر تجربہ ہوا۔ ان درگزر اشتوں کو یاد دلاؤں گا جنہیں میں سراسر غیر ارادی سمجھنے کے لئے تیار ہوں۔ سبالتہ میں آپ کی توجہ ان چند نمایاں واقعات کی طرف ضرور منعطف کرانا چاہتا ہوں جن سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ اہل تونیس کی طرف بعض لوگوں کی غلط اندیش ملاوت اور تونیس میں فرانسیسی مفاد کے عجیب و غریب تصورات، کس حد تک وسعت اختیار کر سکتے ہیں تاہم اب بھی ہر چیز کا ماوا ہو سکتا ہے، سمجھوتے کے امکانات موجود ہیں۔ دیانتدارانہ اور خیر خواہانہ گفت و شنید کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ خیر سگال لوگ جن پر وزارت مشتمل ہے مایوسیوں اور وعدہ یا شیوں کے باوجود گفت و شنید جاری رکھنے کے لئے تیار ہیں اگرچہ بار بار اس میں مداخلت ہوتی رہتی ہے۔ اس مداخلت کے ذمہ دار وہ چند لوگ تھے جنہیں سیاسی اور انتظامی تعطل ہی میں فائدہ نظر آتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں ۱۹۵۰ء کی روح ان فرانسیسیوں نے کاٹا کچل کر رکھ دی جن کی غرضیں تونیس سے وابستہ تھیں۔ تونیس کی ذرا امتہ جو اس غرض سے بنائی گئی تھی کہ حکمران اہل تونیس کی خود مختاری بحال کر کے رکھے۔

حکومت فرانس سے گفت و شنید کر کے اسے غلط طریق پر محروم اختیارات
 کر دیا گیا۔ فرانسیسی آباد کاروں کی سازشوں اور جاوے جا مداخلتوں نے وزارت
 کو بے اصل بنا دیا۔ تونسی وزیروں کو مسلسل ذلت کا نشانہ بننا پڑا۔

یاس ونومیڈی کی یہ فضا تھی جس میں تونسی وزیر ۱۹۵۱ء کے آخری حصے میں
 عازم پیرس ہوئے تاکہ حکومت فرانس کو از سر نو عہد و پیمان کی یاد دلائیں۔
 فرانس کے وزیر خارجہ نے ۱۵ دسمبر ۱۹۵۱ء کو جو جواب دیا اس نے امیدوں کا
 ہر آئینہ رینہ رینہ کر ڈالا۔ اس جواب میں بلدی اصلاحات کی ضرورت کے
 سوا اور کوئی چیز تسلیم نہ کی گئی۔ باقی جو کچھ تھا صرف یہ تھا کہ فرانس نے
 تونسیہ میں تہذیب کے لئے جو کام کیا اس کی خوب قصیدہ خوانی کی گئی اور بتایا
 گیا۔ تونسیہ میں فرانس نے کتنا اہم کردار ادا کیا ہے اس جواب نے اہل تونسیہ
 کو حد درجہ یاس کر دیا اور دنیا کے مختلف حصوں میں جو لوگ بس رہے تھے
 ان کے دلوں میں بھی شدید خطرات پیدا ہو گئے۔

۱۹۵۲ء میں ایم ماہرٹ شومان (M. ROBERT SCHUMAN) نے
 کہا کہ ”فرانسیسی یونین کے تمام علاقوں کے لئے ہمارا نصب العین آزادی ہے۔“
 اس سے اہل تونسیہ کے دل مسحور ہو گئے۔ تاہم ۱۵ دسمبر ۱۹۵۱ء کے مکتوب
 میں یہ اعلان کر کے تاریخ کا رخ بدلنے کی کوشش کی گئی۔ حکومت
 فرانس موجودہ ادارے (گراؤڈ کونسل) میں ترمیم پر غور و خوض سے نفور نہیں
 لیکن اس کے نزدیک ہزٹائی نس بتے کی حکومت میں فرانسیسی نمائندگی کے
 اجرا کی حفاظت سراسر ناگزیر ہے۔

اس ہمت شکنی اور مایوسی سے اہل تونسیہ کو جو صدمہ ہوا، اسے اس خط
 سے بہتر الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا جو تونسی وزیر اعظم نے حالات کی

مدد کی اسے آنکھیں بند کر کے خاموشی سے ٹال دیا جاتا ہے...
 کیا یہ سب کچھ بھلا دیا گیا ہے؟ کیا تو نیسیہ کو واقعی فرانس کا
 ہمیشہ کے لئے دستِ نگر تصور کر لیا گیا ہے؟

اس کے بعد جو کچھ ہوا، اس کا کسے علم نہیں؟ تو نیسیہ کے ہر دل عزیز
 محب وطن حبیب یورقیہ (HABIB BOURGOIBA) اور سرے
 توئی لیڈر جنہیں تو نیسیہ کے جوام عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔
 ۱۳ جنوری کو گرنا کر لئے گئے فسادات رونما ہوئے گویاں پر ساتی
 گئیں۔ جان و مال کا نقصان ہوا، ہزاروں تو نیسیوں کو اور انجام کار تمام تو نیسی
 وزیروں کو جیلوں میں بند کر دیا گیا۔ یہ سب حال ہی کی باتیں ہیں۔

ماضی کے حالات کا مختصر سا جائزہ پیش کرنے سے میری غرض محض یہ ہے۔
 کہ کشمکش کے گزشتہ تین مہینوں میں دونوں طرف جو واقعات رونما
 ہوئے ہیں ان پر روشنی ڈالی جا سکے۔

میں نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کو سامنے رکھ کر فرانس کے اس
 دعوے کو کہ وہ امن و قانون بحال کرنا چاہتا ہے۔ اس افسانوی کردار
 کے آئینے میں جانچئے۔ جس نے ایک مظلوم کا گلا صرف اس جرم کی
 پاداش میں شدت کے ساتھ دبا یا کہ دم گھٹنے کے باعث اس کی
 آنکھیں باہر نکل آئی تھیں۔

یہ درجہ ہیں جن کی بنا پر میری حکومت تو نیسیہ کی بعورتِ حال کو محض
 ایک معمولی مقامی یا داخلی مسئلہ نہیں سمجھتی۔ حکومت فرانس کا یہ کہنا
 کہ وہ اصلاحات کا نیا منصوبہ رائج کرنا چاہتی ہے۔ ہمارے دلوں میں
 اطمینان یا اعتماد کس طرح پیدا کر سکتا ہے۔ جب کہ اس نے تو نیسیہ کے

ان تمام قومی لیڈروں کو جیل میں ڈال رکھا ہے جن سے اس قسم کے منصوبوں کے بارے میں بات چیت ہو سکتی ہے؟
 تو نیسیہ سے حال ہی میں جو اطلاعات موسول ہوئی ہیں۔ وہ بہت اضطراب انگیز ہیں۔ نیویارک ہیرلڈ ٹریبیون "تو نیسیہ کی کابینہ" کے زیر عنوان ایسوسی ایٹڈ پریس کی یہ اطلاع شائع کرتے ہوئے کہ ۱۲ اپریل کو تو نیسیہ میں نئی کابینہ قائم ہو گئی لکھتا ہے :-

"اس کابینہ کو کوئی قابل ذکر اختیار حاصل نہیں۔ فرانس کی طرف سے اعلان اصلاحات کی جو تقریباً قریب قریب ہی قرطاجنہ میں سنائی گئی اس میں شریک ہونے والوں نے بیان کیا کہ شمالی افریقہ کے وزیر حمایت "ملاقے تو نیسیہ کے برائے نام حکمران پتے کے چہرے پر اس وقت ہتھیار کے کوئی آثار موجود نہ تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے مجبور کر کے یہ کرنا پڑا یا جا رہا ہے۔ فرانسیسی ریڈیو جنرل جین ڈی ہائی کلوک (JEAN DE HAUTE-CLOQUE)

نے وزارتِ خارجہ کا حوالہ سنبھال لیا ہے۔ تو نیسیوں کو اپنے ملک کے دفاع سے بھی سروکار نہ ہوگا۔ بیس ہزار سے زیادہ فرانسیسی فوج ملک پر حکومت کر رہی ہے۔ جن خطوں میں خالصتاً عرب آباد ہیں وہ اس وقت غسوری کی حالت میں ہیں۔۔۔۔۔ ہفتا و سالاہ سب سے سیدی محمد الامین پاشا پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ مسٹر باکوش (MR. BACCOUCHE) کو بحیثیت وزیر اعظم قبول کر لیں۔ باوثوق عرب ذرائع کا کہنا ہے کہ بیس لاکھ تو نیسیوں کی غالب اکثریت اور غوطہ پتے کے بارہ بیٹے

اس جھک جانے پر برا فروختہ ہو گئے ہیں۔ پیرس کے بیشتر اخباروں نے بھی باکوش کی موجودہ حکومت کو کٹھ پتلیوں کی کاہنہ قرار دینے میں تامل نہیں کیا اور فرانس نے تو نیسیہ کی جدوجہد آزادی کو جس انداز میں نمٹانے کی کوشش کی اس پر نکتہ چینی کر رہے ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حکومت فرانس پھر ایک مرتبہ اصل کی جگہ نکل کولانے کی خواہاں ہے بارہا دہرائی ہوئی استعماری صورتِ حال کو از سر نو دہرانا چاہتی ہے جس میں قوم کے جذباتِ خود مختاری کو دبا کر ایک موہوم اور شیعہ کاہنہ سکون پیدا کرنا چاہتی ہے تاکہ یہ استعماری طاقت کی کوتاہ اندیشی پالیسی کے لئے سازگار نظر آئے۔ استعماری طاقت کے لئے فائنل مندی کا واحد راستہ یہ ہے کہ اپنے نقطہ نگاہ میں وسعت پیدا کرے۔ محکوم قوم کے ان جذبات کے احترام میں متامل نہ ہو جنہیں دوسرے مقامات پر شاندار اور جوان مردانہ حب وطن کا منظر سمجھا جائے گا۔

ایک مشہور امریکی رسالے میں ایک مقالہ نگار نے لکھا ہے:-

”یہ بڑی حیرت انگیز بات ہے کہ افریقہ سے دست کشی کے مسائل اولاً اور موما فرانس کے سامنے پیش ہو رہے ہیں جو اوقیانوسی طاقتوں میں سب سے زیادہ کمزور ہے۔ اب برطانیہ اپنی نصف سلطنت ختم کر چکا ہے اور مقالہ نگار کے قول کے مطابق فرانس اس وقت دنیا کی سب سے بڑی استعماری طاقت بنا رہا ہے اس نے آٹھ کروڑ افراد کو محکوم بنا رکھا ہے جو دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں اور وہ اتنے بڑے خطے میں آیا دیں جو رقبہ میں ریاست ہائے

امریکہ سے ڈیرہ گنا ہے۔۔۔۔۔ فرانس کے لئے اب بھی موقع ہے کہ افریقہ میں دانش مندی کی پالیسی اختیار کرے۔ استعماری نظام کی جگہ تعاون لایج کر دے اور مقصد یہ ہو کہ بہر حال وہ افریقہ سے دست کش ہو جائے گا۔ اس طرح فرانس تمام افریقہ کی ممالک کے لئے رٹسٹی کی حیثیت میں عمل پیرا ہوگا۔“

یہ دست کشی نہ تو موجب شرم ہے اور نہ اسے شکست قرار دینا چاہیے۔ اس لئے کہ اگر اقوام متحدہ کے منشور کے کوئی معنی ہیں تو استعماری طاقتوں کے لئے انجام کار اس سے زیادہ تودش اور کوئی نہ ہوگی کہ اپنی نوآبادیوں کو چھوڑ جائیں۔ تمام امن و دست قوموں کی دلی خواہش یہی ہے کہ یہ دست کشی امن و نظم کے ساتھ پوری ہوگی۔ اس میں کم سے کم اخلاقی یا جسمانی بربادی کا موقع آئے گا اور فریقین میں ایسی خوشگوار یادیں باقی رہ جائیں گی جن سے دنیا میں امن کو تقویت پہنچے گی۔

اس مسئلے کو ایجنڈے پر لانے کے سلسلے میں برسوں کے معاصریتھے۔۔۔
۱۔ حفاظتی کونسل کے اثر و رسوخ کو وسیلہ بنا کر تو نیسیوں کو بے عزتوں اور پریشانیوں سے بچایا جائے ان کے اموال و نفوس کو تباہی سے محفوظ رکھا جائے ان کے شہری حقوق کو ضائع نہ ہونے دیا جائے اور یہ سب مصیبتیں ان پر اس تصور کی پاداش میں نازل کی جا رہی ہیں کہ انہیں اپنے ملک اور اپنی قومی آزادی سے محبت ہے۔ اس مقصد کو ہمارے نزدیک سب پر تقدم حاصل ہے۔

۲۔ حفاظتی کونسل کے اثر و رسوخ کو وسیلہ بنا کر اس تعطل کو ختم کیا جائے جو فرانسیسیوں اور تو نیسیوں کے درمیان دوستانہ تعلقات کو تیزی

سے برباد کر رہا ہے۔ حالانکہ یہ دوستانہ تعلقات قائم رہنے چاہئیں۔
 ۳۔ افریقہ اور ایشیا میں عوام کے جذبات یہ منظر دیکھ کر براہِ گنہگار ہو رہے ہیں۔
 کہ ایک کمزور بے یار و مددگار اور شریف قوم اور ایک حد درجہ قوی
 یورپی طاقت کے درمیان خوریزہ جدوجہد جاری ہے وہ یورپی طاقت
 بددجہان زیادہ قوی ہے اور دوسری قوم کے زار و بوم پر قبضہ و تصرف
 کے لئے آج کوئی اخلاقی وجہ جواز پیش نہیں جاسکتی۔ باشندگانِ افریقہ و
 ایشیا کے جذبات کی براہِ گنہگاری کو جلد سے جلد روکنا ضروری ہے۔

آئری میں آنا اور کنا چاہتا ہوں کہ میری حکومت اندمیر سے ملک کو فرانس کے
 ساتھ انتہائی محبت ہے اور وہ فرانس کی عظیم الشان آزادی پسندانہ
 روایات کو غلبانہ احترام کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ پاکستان کے
 ایک ممتاز روزنامے "ٹان" نے لکھا ہے:—

”بعض سیاسی مسائل میں ہمیں فرانس کے ساتھ کتنے ہی اختلافات
 ہوں لیکن ہم فرانس کی انتہائی عزت کرتے ہیں اس لئے کہ وہیں
 سے حریت، اخوت اور مساوات کے بلند پایہ نعرے اٹھے تھے۔
 ہم فرانس کو آزاد دینا میں اپنا دوست دیکھنے کے آرزو مند ہیں۔
 اور فرانس و پاکستان کے درمیان ملائق کو مستحکم کرنے میں کوئی دقیقہ
 سعی اٹھانا رکھیں گے۔“

اگر ان اعلیٰ اصول کا علم بلند رکھنے کی کوشش میں جس کا سہرا تاریخ نے فرانس
 کے سر باندھ لیا ہے۔ میں نے اپنے رفیقوں اور ممتاز نمائندہ فرانس کے بیرونی
 پر زیادہ بار ڈالا ہے تو میں بصیرت مند خواہ ہوں۔

تقریر ماڈل جنرل اسمبلی

ذیل میں پاکستان کے مستقل نمائندہ سفیر احمد شاہ بخاری کی اس افتتاحی تقریر کا متن دیا جاتا ہے جو انہوں نے ہناؤڈ کالج نیویارک کی ماڈل جنرل اسمبلی کے پچیسویں اجلاس میں ۷ اپریل ۱۹۵۲ء کو فرمائی :-

جناب صدر! سب سے پہلے میں آپ کی اجازت سے رئیس تدریسات یکم انگلش پروفیسر ڈون ہسٹر ولیم ہنڈسن اور مس روٹھ فیکر کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جن کے حسن اخلاق اور مہمان نوازی کے فیصل مجھے آج شام یہ اعزاز حاصل ہو رہا ہے جب مجھے کہا گیا کہ مجھے اقوام متحدہ کی اس ماڈل اسمبلی سے مقرر خصوصی کے طور پر خطاب کرنا ہے تو ایک لمحہ کھٹے بچھ پر صورت حال کے ابہام نے تبحر کی کیفیت طاری کر دی۔ مجھے علم یہ تھا کہ یہ اجتماع جس نے اپنے لئے "ماڈل اسمبلی" کا نام تجویز کیا ہے اپنا نظام اقوام متحدہ کی اسمبلی کے نمونے پر تیار کرے گی جو دریائے ایسٹ پر مختصر سی جگہ واقع ہے یا اقوام متحدہ کی اسمبلی کے متعلق یہ توقع قائم کر لی گئی ہے۔ کہ وہ تدریجاً اپنے طرز عمل کو آپ کے نمونے کے مطابق بنا لے گی۔ آپ یقین مانیں کہ ہم لوگ جو اقوام متحدہ میں ہیں اور یقیناً وہ مقرر بھی جو آج شام آپ سے مخاطب

ہے اپنے طرز عمل اور طریق کار کو آپ کے طرز عمل کے نمونے پر ڈھالنا پسند کرے گا۔ اس یقین کے ساتھ کہ ایسا کرنے سے وہ دنیا میں بھی اپنی زندگی سنوارے گا اور آخرت میں بھی۔

میں پیش گوئی تو نہیں کر سکتا کہ آپ لوگ اس اسمبلی میں جو "مباحثے" کریں گے۔ ان کا انداز کیا ہوگا لیکن اگر انہیں اسی مثال پر قائم رہنا ہے جو اقوام متحدہ میں پیش ہوتی ہے تو پھر میں ایک پیش گوئی کر سکتا ہوں اور وہ یہ کہ آپ کو آپس میں اختلاف رائے سے بھی سابقہ پڑے گا اور میں یہ پیش گوئی بھی کر سکتا ہوں کہ ان اختلافات کی بنا پر آپ کبھی کبھار اور شاید بسا اوقات اپنے آپ کو ٹکستے کے کنارے لڑکھڑاتا ہوا بھی پائیں گے پھر آپ کے سامنے بار بار سوال آئے گا کہ آیا یہ منظم چل سکتی ہے؟ اختلاف کی کئی صورتیں ہوتی ہیں لیکن میں ایک لحظے کے لئے فقط دو ہی صورتوں پر زیادہ توجہ کروں گا۔ ان میں سے پہلے اختلاف کی توضیح بالکل سہل ہے اور بچھاس پر زیادہ وقت صرف کرتا نہیں پڑے گا۔ یہ اختلاف بنیادی حیثیت کا ہے جس کی تائیں اقوام متحدہ کے ایوانوں میں بار بار ٹوٹی ہیں اور جس کے نعرے اس مجلس میں بار بار بلند ہوتے ہیں۔ اسے مشرق و مغرب کی آویزش کہا جاتا ہے۔

میرے نوجوان امریکی سامعین کو تفصیل سے بتانے کی ضرورت نہیں کہ آویزش کیلئے ہے؟ کیونکہ اگر کوئی امریکی نوجوان، مرد یا عورت، اس کش کش کے مالدوماطیہ سے آگاہ نہیں اور اپنی رائے پر ثابت قدمی سے قائم نہیں رہ سکتا تو اور کس سے ایسی توقع رکھی جاسکتی ہے؟

لہذا میں دوسرے اختلاف کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جو اقوام متحدہ میں وزیروز نمایاں تر ہوتا جا رہا ہے یہ اختلاف زیادہ اہم نہیں اور اس کی حیثیت ایسی ہے کہ اگر یہ جمہوری طریق کار کے دائرے کے اندر رہے تو اس کے لئے تصحیح کا باعث

بننے کے بجائے انجام کار تقویت و استحکام کا موجب بنے گا۔

آپ نے انسانوں کے ایک ایسے گروہ کا حال اکثر سنا ہوگا۔ جسے اخبارات اپنی فہرستوں میں ”عرب ایشیائی بلاک“ کہتے ہیں۔ اس کے لئے ”بلاک“ کا لفظ لیتنا اس لئے استعمال ہوتا ہے کہ یہ لفظ مختصر ہے اور اخبار کی ایک کالمی سرخی میں کھپ جاتا ہے ویسے لفظ ”بلاک“ کے مفہوم میں کوئی خاص سیاسی اہمیت نہیں۔ نہ یہ کسی خاص قسم کا سیاسی گروپ ہے۔ یہ چند ایسے مفادات کا ایک عام سماجی اجتماع ہے جو بعض قوموں میں ماضی کی تاریخ اور روایات کے باعث مشترک ہیں۔ میں خود ایک ایشیائی ملک کا تادم ہوں اسی لئے شاید آپ کو کچھ بتا سکوں گا کہ یہ اختلافات کیا ہیں؟ کہاں پیدا ہوتے ہیں؟ اور انہیں رفع کرنے کی تدبیر کیا ہے؟

یہ اختلافات دو فریقوں میں ہیں۔ ایک فریق تو وہ ہے جسے عام طور پر مغربی یورپی اقوام کہا جاتا ہے اور دوسرا فریق یہی مشرقی اقوام ہیں۔ یہ لوگ آپس میں کس نقطہ نظر پر متحد ہوتے اور ان میں قدر مشترک کیا ہے؟ آپ نے غور فرمایا کہ میں نے نقطہ نظر کیا ہے؟ میرے لئے آسان تھا کہ میں فرسودہ محاورہ بندی کا لغت استعمال کر کے اسے نظریہ یا تصور کا نام دیتا۔ آج کل نظریہ یا تصور کا لفظ نہایت مسرفانہ طریق پر جاوے جا استعمال کیا جا رہا ہے۔ مغربی یورپی قوموں کے اس گروہ میں جو بحر اوقیانوس کے کنارے آباد ہیں۔ تین چار اختلافات تو انداز فکر و نگاہ ہی کے ہیں۔ میں عقائد نہیں کہتا اور نظریہ کا لفظ تو ہرگز استعمال نہیں کرتا۔

ان میں پہلا اختلاف دنیا کے نسلی مسائل کی جذباتی تعبیر کے متعلق اٹھتا ہے آپ خوب جانتے ہیں کہ ہم یا ان میں سے اکثر و بیشتر اقوام ماضی میں شدید نسلی امتیازات کا شکار رہی ہیں اور بعض اب بھی اسی امتیاز کا تختہ مشق

بنی ہوئی ہیں۔ اگر وہ ان بے انصافیوں کو ہمیشہ کے لئے فراموش نہیں کر سکتیں جو نسلی امتیاز کا عقیدہ رکھنے والوں سے سرزد ہوں اور ان کے جذبات مشتعل کرنے کا سبب بنیں تو آپ انہیں قابلِ عفو سمجھیں۔ وہ نسلی امتیاز کے اس احساس کی علامات جہاں بھی دکھیں گی۔ شدید مخالفت کریں گی۔ آپ ازرہ کرم میرے مفہوم کو غلط نہ سمجھیں۔ میری مراد ان چھوٹے موٹے حادثات سے نہیں جو آپ کے ملک یا میرے ملک میں ہوتے رہتے ہیں۔ میں انکا دکا انفرامی واقعات کی جانب قطعاً اشارہ نہیں کر رہا۔ وہ وقت ابھی بہت دور ہے جب کوئی ملک سینہ تان کر یہ دھوٹے کر کے گا کہ اس کے حدود میں ایسا کوئی واقعہ رونما نہیں ہو سکتا میں اس نسلی امتیاز کا ذکر کر رہا ہوں جو وسیع بین الاقوامی پیمانے پر کیا جاسکتا ہے اور جو نہ صرف وقتاً بہ وقت انسانی کے منافی ہے بلکہ امن عامہ کے لئے بھی خطرے کا باعث ہے۔ آپ نے اجاروں میں کئی ملکوں کی خبریں پڑھی ہوں گی۔ جہاں نسلی امتیاز کے واقعات ظہور میں آتے ہیں۔ ایسے واقعات افریقی ملکوں میں بھی رونما ہوتے ہیں اور چند دوسرے ملکوں میں بھی۔ مجھے مغربی یورپ یا اوقیانوسی ممالک کا کوئی ایسا نمائندہ نہیں ملا جس کے خیالات ویسے ہی نہ ہوں جیسے ہمارے ہیں۔ البتہ فرق ہے تو صرف صورت حال کے جذباتی رد عمل کا ہے۔

دوسرا مسئلہ جس پر اقوام کے اس گروہ کے احساسات بڑھے شدید ہیں اسے عام طور پر استعمار سے تعبیر کیا جاسکتا ہے میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ یہ گروہ اقوام دنیا کی نصف سے زائد آبادی کی نمائندگی کرتا ہے۔ ایک وقت تھا جب مجھے یہ بات یاد دلانا پڑتی تھی اور لوگ اس سادہ سی حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے اس وقت تک تیار نہ ہوتے تھے۔ جب تک حدود شمار کی دستاویزیں دیکھ کر اپنا اطمینان نہ کر لیتے تھے۔ میرا خیال

سمجھتے ہیں کہ آج دنیا اتنی تاواقف نہیں کہ اس سادہ سی حقیقت کا اندازہ نہ کیجئے۔
 یعنی یہ کہ دنیا کے نصف سے زیادہ نفوس ایشیا میں رہتے ہیں اور اگر انسان
 ہونے کی کیفیت و حیثیت کے اعتبار سے نہیں تو کم از کم مقدار و عدد کے
 اعتبار سے وہ بہت وزن رکھتے ہیں۔ ان کے احساسات بھاری تعداد
 کے مطابق المضامین ہو کر عالمی حیثیت میں بڑی اہمیت و قوت رکھنے
 والا عامل بن جاتے ہیں۔ متعدد ممالک ایسے ہیں جو قریب تر ماضی میں استعماری
 اقتدار کا شکار ہوئے ہیں اس مکر سے میں بیٹھنے والے سب کو نہیں تو آپ
 میں سے بہتوں کو خدا تعالیٰ استعماری نظام حکومت کا مزہ چکھنے سے بچا لیا ہے
 ایک وقت تھا جب آپ کے آبا و اجداد اپنے آپ کو انگلستان کا محکوم اور
 اس کی نوآبادی سمجھتے تھے۔ ان کے سینوں میں اس کے خلافت طوفان اٹھتے
 تھے۔ لیکن ایک نسل پر دوسری نسل کے نپلے واقعات سے پیدا ہونے والے
 بعض مکروہ پہلو ایسے ہیں جو آپ کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتے۔ یہ
 قیام تو آپ آسانی سے کر سکتے ہیں کہ جب کبھی استعمار کا کوئی مثلہ سامنے
 آتا ہے تو اس گردپ کے بذبات بے انتہا شدید ہوتے ہیں۔ استعمار —
 ہم نے تو اسے نہایت قریب سے دیکھا ہے — وہ ہری لعنت ہے۔ یہ
 اس کے لئے بھی لعنت ہے جو حاکم و مقتدر بنتا ہے اور اس کے لئے بھی جسے
 غلام و محکوم بنایا جاتا ہے۔ استعمار میں مقتدر وجود مادی فائدے تو اٹھاتا
 ہی ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ ساتھ ہی انسانی فطرت کو اس طرح توڑ مروڑ کر
 رکھ دیا جاتا ہے جس کے بعد انسانیت کا وقار خاک میں مل جاتا ہے اور استعمار زدہ
 لوگ اس فوج میں شمار ہونے کے قابل نہیں رہتے جس کے افراد ہونے
 کے وہ دعوے رکھتے ہیں۔ استعمار محکوموں اور حاکموں دونوں کی نفسیات

برباد کر دیتا ہے اس لئے کہ ہر استعماری حکمران، بشرطیکہ وہ روشن دماغ ہو
 محسوس کرے گا کہ یہ کیفیت اسے شعوری طور پر فائدہ پہنچانے کی بجائے
 و شعوری طور پر بے طرح نقصان پہنچا رہی ہے یہی مسائل ہیں جن پر آپ
 ہمیشہ دیکھیں گے کہ استعمار زدہ ملکوں کی بھاری تعداد کسی صورت حال کے
 شدید جذباتی ردِ عمل کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے۔ دوسرے لوگوں کے
 لئے بسا اوقات اس کا سمجھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ یہ ممالک دنیا کے غریب ترین باشندوں کے
 نمائندے ہیں میں نے اپنے امریکی دوستوں سے غربت و افلاس کے بارے
 میں بار بار گفتگو کی ہے وہ اس کے معنی تو جانتے ہیں لیکن ان کے لئے
 اس حالت کا فہم و تصور تقریباً ناممکن ہے جس کے لئے یہ لفظ وضع کیا
 گیا تھا وجہ یہ ہے کہ معیشت کے معیار مختلف ہیں۔ امریکہ میں جس شخص
 کو مفلس کہا جاتا ہے ہمارے بہت سے ملکوں میں ایسے آدمی کو خاصا
 خوش حال قرار دیا جاتا ہے۔ امریکی دوستوں کو یہ سمجھانا بے حد مشکل ہے
 کہ دنیا میں ایسے ملک بھی ہیں جہاں آدمی کی سالانہ آمدنی سا لہا سال تک
 پچاس ڈالر سے زائد نہیں ہوتی۔ انہیں یہ یقین دلانا دشوار ہے کہ بعض

ملک ایسے بھی ہیں جہاں انسان کا اوسط عمر ۲۰ سال سے زیادہ نہیں
 اور خواندگی کا تناسب صرف پانچ سے دس فیصد تک ہے۔ اب
 کیفیت یہ ہے کہ یہ غریب ممالک بین الاقوامی تبدیلی احوال کے باعث
 اچانک اپنے آپ کو عالمی سیٹیج پر بیٹھا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ جہاں ان سے
 کہا جاتا ہے کہ عالمی برادری کے فرد کی حیثیت سے دوسروں کے برابر
 ذمہ داریاں اٹھائیں۔ یہ ان کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ ایسی ذمہ داریاں قبول

کہیں اس میں کوتاہی ان کے لئے انتہائی شرم و ندامت کا باعث ہوگی۔
لیکن انہیں جو وسائل میسر ہیں ان کے ساتھ وہ عالمی کوائف سے مددہر آ
ہونے میں اس اہلیت اور صلاحیت کا ثبوت نہیں دے سکتے جو ان کے
بعض ترقی یافتہ رفیق ملک پیش کر سکتے ہیں۔ یہ ممالک کہتے ہیں کہ اس
سورتِ حال کی اصلاح کر کے دنیا سے شدید اقتصادی نامساوات
دور کی جائے۔

ایک وقت تھا — اور تاریخ کا کوئی طالب علم ہی اس کی
تاریخ بتا کے گا — جب ہر ملک اور ہر قوم کے زیادہ آمدنی والے
لوگ سمجھ ہی نہ سکتے تھے کہ مفلس اور بے روزگار لوگوں کی امداد کے لئے
زیادہ آمدنی والوں سے بھاری ٹیکس کیوں وصول کئے جائیں؟ یہ لوگ
بھاری ٹیکس کی مخالفت اسی طرح کرتے تھے جس طرح وہ غریبوں اور
بے روزگاروں کو اپنے برابر لئے دینی کا حق دینے کے مخالفت تھے۔ اس
دور میں اسی قسم کے — سائل حقیقی اور واقعی طور پر درپیش تھے اور اصلاح
کے علمبرداروں کو سیاسی اور اقتصادی انصاف کے اصول کا پرچار کر کے
عوام کو ترغیب دینی پڑتی تھی۔ کہ وہ اس اصول کو مان لیں۔ آج ہمیں ایسا
نہیں کرنا پڑتا۔ اب کسی بھی متمدن ملک میں یہ تبلیغ کرنے کی ضرورت نہیں
کہ اسی لوگوں سے غریبوں کی نسبت زیادہ ٹیکس کیوں وصول کرنا چاہیے؟
گویا یہ باتیں تسلیم کر لی گئی ہیں اور معاشرے کا ہر فرد اپنی ذمہ داری
مخسوس کرتا ہے۔ تاہم یہ صورت ابھی بین الاقوامی معاشرے میں پیدا نہیں
ہوئی۔ آج اگر برادری کا کوئی رکن پسماندہ ہے، ناخاندہ ہے، بیمار یوں کا مارا ہوا
ہے، انداس اور قحط میں مبتلا ہے اور مدد کے لئے پکارتا ہے تو کم دیش ہی

تصور کر لیا جاتا ہے کہ اسے یہ امداد خیرات کے طور پر دی جائے یہ وہی بندہ ہے جو اب سے ایک یا دو صدی پہلے نیکس مینے والے دولت مندوں میں کا۔ فرما تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ وہ قوم کے باقی افراد کو اپنی دولت کی زکوٰۃ دے رہے ہیں۔

تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے۔ ہم اس امداد کو خیرات تصور نہیں کرتے۔ ہم اسے بین الاقوامی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ اس عام مسلمہ اصول کی تکمیل ہے کہ ہر شخص سے اس کے مقدر کے مطابق لیا جائے اور ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق دیا جائے۔ لیکن جب زیادہ ترقی یافتہ ممالک سے یہ امداد ان ملکوں کو ملتی اور احسان مندی کے ساتھ قبول کی جاتی ہے، تو کئی دوسرے سوال اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ کیا اس قسم کی امداد سیاہی مصالح کی حامل تو نہیں؟ کیا اس کے ساتھ شرائط و قیود کی پابندیاں تو نہیں؟ آخر اس امداد کا مقصد و مدعا کیا ہے؟

یہ آخری سوال بہت اہم ہے۔ اجازت دیجئے کہ میں نفسِ مضمون سے فدا ہٹ کر اس حقیقت کی یاد تازہ کراؤں کہ ان میں سے اکثر ممالک جب استعماری اقتدار اور غیر ملکی سامراج کے محکوم تھے۔ تو طویل عرصے تک خام مال مہیا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ وہی تھے اب دوسری سے یہ کیفیت چلی آتی ہے کہ تمام صنعتیں اور ہر قسم کی حرفتیں دنیا کے ان ملکوں میں مرکوز ہو گئی ہیں جنہیں ترقی یافتہ کہا جاتا ہے۔ ہم نے تجربے سے معلوم کر لیا ہے کہ جب تک کوئی ملک خام مال مہیا کرتا رہتا ہے اس وقت تک وہ خود کفیل ہو سکتا۔ اس لئے اگر ہمارے ملک میں کوئی ایسی ترقیاتی سکیم پیش ہوتی ہے جس کا انحصار خام اشیا کی زیادہ سے زیادہ

پیداوار پہ ہو، تو اس کے متعلق شک و شبہات پیدا ہو جاتے ہیں۔ آج ہمیں اس امر کی ضرورت ہے کہ ملک کے خام مال سے فائدہ اٹھانے کے لئے خود اس ملک میں صنعت رائج کی جائے، دوسری طرف ہمیں جو امداد باہر سے — مثال کے طور پر اقوام متحدہ ہی کہہ لیجئے — ملتی ہے اس سے ہمارے دلوں میں یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہم اس امداد کو خام مال ہٹا کرنے کی صلاحیت بڑھانے کے بجائے اپنی صنعتی ترقی میں صرف کریں گے تو دنیا ہمیں احمق کہے گی۔

لہذا جب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ دنیا کی اقتصادی ناہمواری دور کرنے کا بہترین حل کیا ہے؟ تو میں نہایت ادب سے یاد دلاؤں گا کہ سب سے پہلے بین الاقوامی معاشرے کو ان ممالک کی امداد ان وجوہ کی بنا پر کرنی چاہیے جو میں واضح کر چکا ہوں۔ اس کے بعد ان ممالک کو ایک دور سے نکال کر دوسرے دور میں داخل کرنا لازم ہے جو ملک صدیوں سے زردی دور کی زندگی بسر کر رہے ہیں ان میں اور ایسے ملکوں میں جو بھاپ کی دورِ پختہ کے بعد صنعتی ترقی کے میدان میں سبقت لے چکے ہیں۔ اتنا ہی وسیع اور بنیادی تفاوت ہے جتنا پتھر کے زمانے اور زراعت کاری کے زمانے میں تھا۔ سوال یہ نہیں کہ یہ ممالک جس کیفیت سے گزر رہے ہیں اسی میں ان کو ترقی دی جائے۔ سوال یہ ہے کہ آج کی دنیا نے صنعتی ترقی اور مشینی پیداوار کے لحاظ سے جو شکل اختیار کر رکھی ہے۔ اس کی طرف صحیح رہنمائی کی جائے۔

ان تین چار معاملوں کے بارے میں اختلافات ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اختلافات کبھی شدید اور کبھی کم تر ہوں گے۔ یہ ان ممالک میں بھی رہیں گے جن کے درمیان

بنیادی اصول پر کامل اتفاق رائے موجود ہے۔

میں کسی ایسے آزاد فکر، حسن ظن پر مبنی کسی ایسے عقیدے اور آزادی کے لئے کسی ایسے تصور سے واقف نہیں، جبرائے کے لئے امریکہ کی بہت سی ممتاز اور قابل قہد ہستیوں نے جدوجہد کی ہو یا اس کے لئے انہوں نے اپنی زندگیاں ختم نہ کر دی ہوں۔ ہم اپنی امیدوں کے محل یا سی بنیاد پر استوار کر رہے ہیں۔ آپ کا ملک بڑا وسیع ہے آپ پسند کریں یا نہ کریں پھر بھی دنیا کے متعلق آپ کی ذمہ داریاں بھاری ہیں جہاں تک مجھے علم ہے تہذیب و تمدن کے مستقبل کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ آپ اس ذمہ داری کو کس طرح خوش دلی سے قبول کرتے ہیں؟

اب مجھے اپنی بات ختم کر دینی چاہیے کیونکہ مجھے معلوم ہے اس اجلاس کی مصروفیات بہت زیادہ ہیں نیز میں آپ کے لئے واضح مشفق بننے کا بھی خواہش نہیں جیسا کہ میں نے کہا۔ میں آپ کی طرف رنج و کجی رہا ہوں آپ کی سرگرمیاں ہمارے لئے خراب ثابت ہوں گی آپ میں صرف ایک وفد ایسا ہے جسے میں کچھ نصیحتیں کرنے کی جرات کر سکتا ہوں اور وہ پاکستان کا وفد ہے میں اس وفد کو مشورہ دوں گا کہ وہ ہمیشہ یہ حقیقت پیش نظر رکھے وہ ایسے پسماندہ ملک کا نمائندہ ہے جسے آزادی کی دولت حاصل کرنے کا بھی صرف چارہاں سال گزرے ہیں۔ اسے اپنے آپ کو کسی بڑی طاقت کا نمائندہ نہیں سمجھنا چاہیے کیونکہ وہ ایسا نہیں ہے البتہ اسے کوشش کرنی چاہیے کہ عالمی مشکلات کے بہترین حل میں اپنا فرض انتہائی خلوص سے بہترین طریق پر ادا کرے ہو سکتا ہے کہ کسی وقتہ میں الاقوامی معاشرے کے مفاد کو اپنے ملک کے نسبتاً محدود منادات تابع کرنے کی ترغیب اس کے سامنے آجائے۔ ایسے

موقعے کے لئے میرا مشورہ یہ ہے اس قسم کی ذہنی کش مکشیں طبعی حیثیت رکھتی ہیں۔ مگر مجھے اُمید ہے کہ ایسی کش مکش کے موقع پر انجام کار میں اتنا ہی معاشرے کی بہبود کو ضرور ترجیح دیں گے۔

پاکستان کے دلدل کے لئے میری ایک چھوٹی سی اور آخری نصیحت یہ ہے کہ جب آپ کے پاس کہنے کے لئے کچھ ہو تو ضرور کہیں، لیکن جب کہنے کو کچھ نہ ہو تو براہ کرم خاموش رہیں۔

شاعری

فہرست

نقشِ سیم گشتگی

عنز

فرمودہ لپرس

دوریا

میکرے میں

دو شہر

دہلی کی سیر

نقشِ گم گشتگی

شدی تاباعتِ آرامِ جاں آرامِ جاں گم شد
حدیثِ نام تو بر زباں آمد زباں گم شد

پرس از جستجو و تار سائی ہائے بخونے
چو آوازِ جرس ہر سود وید و ہر زباں گم شد

نشانِ سجدہ ام اہلِ نظر را آستان باشد
کہ زیرِ سجدہ ہائے شوق من آستان گم شد

مرا جز خامشی غم نمود و وائے ناکافی
بہ اظہار سخن چون لب کشودم راز دال گم شد

گمہ آوارگی آرو سوائے مندرل بخاری را
کہ از گمراہی خود ہم ز راہ گم ہاں گم شد

غزل

ہم آل داغے کہ بردل از تو دارم حرز جانم شد
ہم آل چتے کہ نامدکش سخنگوراز وارم شد

دلے بود و در آغوشم بگفید و جہانم شد
جہانے داشتتم از سرگزشت و آسمانم شد

پرس اے داویر محشر چہ مے پرسی می پرسی
نگاہ حسرت آلام کہ مے بینی بیانم شد

نگہ دزدیدہ افگندی بل چوں راز جان دارم
نظر کردی بہ بیباکی و فضل داستانم شد

دگر فتوح جنوں در وہ کہ ہم در منہل اول
خیالی و حشتم داماند و گورد کار وانم شد

فرمودہ پطرس

اے حسن تو زیاد تماشا کہتم ترا
 عمرم دداز باد تمنا کہتم ترا
 برہم نظر مکن من نا کردہ کالدا
 گر انجانے بوسہ بے جا کہتم ترا

یہ تبسم چہ تسلی بہ بگلہ ہے چہ تزار
 مشکو آرزوئے از بیم اینگختہ
 بر میر خاک من کشتہ بے ریختہ باد
 قطرہ نے کہ تو از لغزشش پار ریختہ

دوراہہ

یہ میں نے کہہ تو دیا تجھ سے عشق ہے مجھ کو
 ترا ہی دل میری آوارگی کا غور ہے
 تجھی سے رات کی مستی تجھی سے دن کا غماز
 تجھی سے میری رگ و پے میں زہرا حمر ہے
 تجھی کو میں نے دیا اختسیار گدیے پر
 یہ چشم خشک اگر ہے۔ یہ چشم اگر تر ہے
 ترا ہی جسم چمن ہے ترا ہی جسم ہزار
 تری ہی زلف سے ہر آندہ معطر ہے
 ترا ہی حسن ہے فطرت کا آفری شاہکار
 کہ جو ادا ہے وہ تیری ادا سے کمتر ہے
 یہ میں نے کہہ تو دیا تجھ سے عشق ہے لیکن
 مرے بیان میں اک لہزش خفی بھی ہے
 تو میرے دعوئے الفت کی آن پر مت جا
 کہ اس میں ایک ندامت دلی دلی بھی ہے
 وفا طلب ہے ترا عشق اور مرے دل میں
 تری لگن کے سوا اور بے کلی بھی ہے

بجھی سے دل کا تلاطم ہے اور نگہ کا فترار
 اسی قرار و تلاطم سے زندگی بھی ہے
 مگر ہیں اور بھی طوفان اس زمانے میں
 کہ جن میں عشق کی ناؤں شکستی بھی ہے
 مری نگاہ کے ایسے بھی ہوں گے چند انداز
 کہ تو کہے کہ یہ حرم ہے اجنبی بھی ہے
 شب وصال کے اس ٹھنڈے اندھیرے میں
 مری تلاش میں سردا کی روشنی بھی ہے
 مجھے تو آ کے ہی وقت کے دوزخ پر
 کہ صبح زلیت بھی ہے موت کی گمڑی بھی ہے

میکدے میں

جو توکے تو کسی میکدے میں چل بیٹھیں
جو دل کی بات ہے دل میں وہ دل کی بات کریں

میں خم کے سائے میں سرگوشیاں کروں ایسی
کہ تیرے لب مری ہر بات کو نجات کریں

جو بے ثبات ہے دینا تو بے ثبات سہی
فریب دے سے اسے اور بے ثبات کریں

اگر منارہ کسرے پہ دن نکل آئے
تو چشم فانا کریں اور دن کو رات کریں

دو شعر

اُٹھ گیا اپنے یہاں سے ٹیلی فون
اب کہیں جا کر ملے گا اگلی جون

اس کے ہونے سے رہا کرتی تھی بیچ
یہ چین یونہی رہے گا اور — الخ

یہ دو شعر پڑھنے سے (حکومت ہند کے دیگر دفاتر کے واپسی کوچ کے ساتھ)
رخصت ہوتے ہوئے کہے تھے۔ جون کے ہر دو معنی کی رعایت بھی خوب
ہے لیکن الخ کا قافہ بول اور کون لا سکتا ہے۔

دہلی کی سیر

ایک چھوٹا سا لڑکا الہ آباد کا
اپنے گھر سے چلا اور دہلی گیا

واں جو پہنچا تو دیکھا

کہ س جا کے لڑکے	ہیں ویسے ہی ننھے
اور اس جا کے گئے	ہیں ویسے ہی لمبے
اور اس جا کی برفی	ہے ویسی ہی میٹھی
اور اس جا کی بتی	ہے ویسی ہی موٹی
اور اس جا کی چڑیاں	ہیں ویسی ہی چھوٹی
اور اس جا کے چالیس	ہیں بیس اور بیس

اس نے یہ کچھ جو دیکھا
تو حیراں ہوا اور تنکٹا رہا
اور تنکٹا رہا اور حیراں ہوا

(پھول)

پطرس کے خطوط

فہرست

- بنام عبداً مجید ساک
بنام مولانا غلام رسول مہر
بنام صوفی غلام مصطفیٰ تبسم
بنام سیدہ عائشہ رضا
بنام سید امتیاز علی تاج
بنام عبدالرحمن چغتائی
بنام حکیم یوسف حسن
بنام کلیم الرحمن
بنام حامد علی خاں
بنام عبدالقدیر رشک
بنام آمنہ مجید ملک
بنام بیگم فیض
بنام منیرہ فیض

بتام عبدالمجید سالک

۱

نویارک

۱۳ اگست ۱۹۷۷ء

برادر محترم!

سلام مسنون! گرامی نامہ جلا۔ لاہور کا نقشہ واقعی بدل گیا ہوگا۔ آپ کی (کا؟) شہر آشوب پڑھ کر افسوس ہوا۔ آپ کو خط لکھنا مبارک ہوا۔ کیونکہ اسی دوران میں ن۔م۔م۔راشد کا خط بھی ملا۔ جس میں حفیظ (ہوشیار پوری) کی تازہ تاریخ گوئی کا لطیفہ شگفتگی کا باعث ہوا۔ نہ سنا تو سنا دوں۔ راشد نے جدید شعرا پر ایک مضمون لکھا۔ جس کے بعض فقرے حفیظ صاحب (جانندھری) کو گراں گزرے، انہوں نے تاؤ کھا کر راشد کو یہ شعر لکھ بھیجا۔

خبت ددل دکھا دیا ہر دینِ خط نے

کچھ نہ کہا حفیظ نے ہنس دیا شکر ادا

اس پر حفیظ (ہوشیار پوری) نے اس واقعہ کی تاریخ کہی۔ چہ خبت ددوں (۱۳ اگست ۱۹۷۷ء) راشد نے چند اردو کی کتابیں بھی بیچ دیں۔ جن سے شب و روز میں کچھ رنگینی پیدا ہو گئی۔ آپ کو خط لکھنے سے طبیعت کا "ریخ" ٹوٹا تو سیما صاحب کو بھی ایک خط لکھ دیا۔ اگر انہیں جواب کی توفیق ہوئی۔ تو دل میں لہو کی ایک اور بوتہ نظر آنے لگے گی۔ بہر حال

اسے چاند نہ سکیں۔ جب تک ہم لوگ زندہ ہیں۔ یہ امر محال نہیں۔
 موت رستے میں حائل ہوگئی۔ تو کوئی اسے نہ بچاند کے گا۔ لیکن "حایا
 نغدہ" تو "پھینک" سکتے ہیں۔

ہندوستان سے جو تناؤ ہے۔ اس کی خبر محض سرکاری ذرائع
 سے ہم تک پہنچتی ہے۔ تفصیلات سے تشنہ رہتے ہیں۔ اس لئے
 طبیعت متشکر رہتی ہے۔ نہ معلوم نہرو صاحب کے سر میں کیا سودا
 سما یا ہے کہ حق و راستی اور صلح کوشی سے انہوں نے آنکھیں
 بند کر لی ہیں۔ شاید آئندہ ایکشن کی ہوس نے عمل و فکر میں
 کجی پیدا کر دی ہے۔ اخباروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹنڈن نے ان
 کے ڈنڈنا کر رکھا ہے۔ خدا ہم لوگوں کا حامی و ناصر ہو۔ پاکستان
 کی ہمت اور پاکستان کے بیڈروں کی دانائی اور مدبری کے سب لوگ
 یہاں قائل ہیں اور بیش از بیش کالم نویس ان کے معترف بنتے چلے
 جاتے ہیں۔ لیکن کوئی خدا کا بندہ ہندوستان کے کان نہیں مروڑتا۔ سب
 اپنا اوسیدھا کرتے ہیں۔

مجید لاہوری صاحب کا سلام پہنچا۔ خدا انہیں خوش رکھے۔ ان
 سے ملاقات افسوس کہ بہت مختصر ہوئی ہے۔ تاہم بار زندہ صحبت
 باقی۔ انہیں میرا سلام شوق بھی پہنچا دیکھئے۔

خاکسار

بخاری

نبو بارک

۱۶ ستمبر ۱۹۵۷ء

برادر محترم!

سلام مسنون! امید ہے آپ معہ الخیر لاہور پہنچ گئے ہوں گے۔

انقلاب کے معطل ہو جانے کے بعد آپ اغلباً مسلم ٹاؤن ہی میں خانہ نشین ہوں گے۔ تاہم جب کبھی شہر جانا ہو اور دوستوں سے ملاقات ہو۔ تو انہیں میرا سلام کہئے گا۔ چند دن ہوتے۔ میں نے اقیانوس کو خط لکھا تھا۔

جواب سے سب معمول محروم ہوں۔ اور شاید محروم رہوں اور۔ کچھ نہیں تو کم از کم میری محرومی ہی کا احساس ان تک پہنچا دیجئے کہ عشق کے کاروبار میں اس سے بھی بسا اوقات فائدہ پہنچتا ہے۔ کیا صوفی صاحب بدستور نیو ہاسٹل میں حکمران ہیں۔ یا کچھری روڈ کی سرکاری کونٹریوں میں سے کسی کوٹھی میں پہنچ گئے ہیں۔ نہ معلوم پرنسپل کون ہیں۔ آخری اطلاع ڈاکٹر صادق کے متعلق تھی۔ اور کیا شریف صاحب کراچی میں ہیں یا لاہور واپس آگئے؟ ان سوالات سے حکمانہ معاملات کو کریدنا مطلوب نہیں، محض احباب کے مستقر و ماحول کا نقشہ ذہن میں بنانا چاہتا ہوں۔ اسی طرح کے سوالات ہاشمی صاحب اور عابد علی صاحب کے متعلق بھی پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ کے خط سے معلوم ہوا کہ عابد صاحب نے زندگی میں چند در چند ڈرامے پیدا کر لئے ہیں۔ میں ابتدائی مناظر سے بھی بے خبر ہوں۔ اس لئے کھیل کا خاکہ تک سمجھ میں نہ آیا۔ خلیفہ حکیم کے متعلق آخری اطلاع تھی کہ وہ اقبال اکیڈمی کے ڈائریکٹر ہیں۔ کیا یہ اکیڈمی پنپ رہی ہے اور لاہور میں ہے؟ میں نے خلیفہ صاحب سے "اسلامی کلچر" پر یہاں کے ایک مقتدر مولف کے لئے ایک مضمون لکھوایا تھا۔ وہ عنقریب اور فلسفیان عالم کے دشمنان قلم کی معیت میں کتابی شکل میں شائع ہوگا۔ اور یہ پہلا موقع ہوگا کہ اسلام پر کسی پاکستانی کا مدلل مضمون اس ملک میں عزت و آبرو کے ساتھ چھپے۔ یہاں کی ایک یونیورسٹی میں مذہب قدیم اور حقوق انسانی کے مضمون پر دسمبر میں ایک مناظرہ ہوگا۔ اس سلسلے میں بھی میں نے خلیفہ حکیم صاحب کے لئے بے حد سعی کی کہ اسلام کی

نمائندگی وہ کریں۔ آخر اس میں کامیاب ہوا۔ خلیفہ صاحب کا کراہیہ وغیرہ یونیورسٹی دے گی۔ کینیڈا کا (MCGILL) یونیورسٹی دلیفے دے کر اسلامیات کے طلباء اور فارغ التحصیل بزرگوں کو سال دو سال کے لئے یہاں بلاتا چاہتی ہے۔ عنقریب وہاں کے پروفیسر سمیت انتخاب اشخاص کے لئے پاکستان کا دورہ کریں گے۔ میں نے اُن سے کہا ہے وہ آپ سے بھی ضرور ملیں۔ سمتہ پہلے بھی ہمارے ملک کی سیاحت کر چکے ہیں: "MODERN ISLAM IN INDIA" کے مصنف ہیں۔ آغا حمید وغیرہ انہیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ چوہدری ظفر اللہ خاں صاحب آج کل یہاں ہیں۔ مباحثہ کثیر کے آنے والے سین کے لئے سیٹج تیار کر رہے ہیں لودہ بے انتہا تنگ و دو میں معدوم ہیں۔ خدا کرے ہم اس قضیے سے عزت کے ساتھ اور بوجہ احسن عہدہ براہوں۔ ایک اور یونیورسٹی خشک علاقوں میں آب پاشی پر ریسرچ کرنا چاہتی ہے۔ لیکن کسی ایشیائی یونیورسٹی کے ساتھ مل کر بیروت اور پنجاب دونوں زیر غور ہیں۔ میں پنجاب کے لئے کوشش کر رہا ہوں۔ اغلباً کام بن جائے گا۔ بس اپنے حکومت اور پنجاب یونیورسٹی کے اشارے کا منتظر ہوں کہ وہ یہ بوجھ اٹھا سکتے ہیں یا نہیں۔ ڈاکٹر رائیس (سابق پرنسپل فارمن کالج) میرے محمد ہیں اور خوب ندر لگا رہے ہیں۔

آپ کے لاہور میں پھر براجمان ہونے کا خیال آتا ہے۔ تو کوئی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ تاہم جب تک آپ کراچی میں تھے۔ آپ کی موجودگی سے زبیدہ اور ان کے تعلق سے مجھے ایک اطمینان تھا سب لوگ کراچی کی سمت ہجرت کر رہے ہیں۔ لاہور کا (بقول طلب پرتاپ) اب کیا بنے گا؟

مہر صاحب کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ انہیں اب بھی اپنی
 چھڑی ہاتھ میں لے کر علی الصباح سانپ مارنے کے لئے جنگل میں
 گشت لگاتے ہوں گے۔ انہیں بھی میرا سلام کہیے گا۔
 آج اتوار کا دن ہے۔ رومی جھانٹ رہا ہوں۔ یہ مشغفہ ہر ملک
 اور ہر زمانے میں سولہاں رُوح ہوتا چلا آیا ہے۔ اگلے ہفتے سے پیرس
 کے سفر کے لئے ٹیکے لگوانا شروع کر دوں گا۔ پہلے ٹیکے سب کے سب
 زائد المعیاد ہو چکے ہیں۔ کل شام بیسی ویشن پر میری انٹرویو
 نشر ہوگی۔ کچھ کشمیر کچھ جاپانی عہد نامہ کچھ کوریا۔ دقس علی اہذا۔
 غرضیکہ صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے۔

خاکسار

بخاری

نویارک

۲۲ مارچ ۱۹۵۲ء

برادر محترم!

سوم سنون! نہ معلوم آپ کا کیا حال ہے۔ عرصے سے آپ کا خط
 نہیں آیا۔ یہ آپ کا خمیرہ نہیں۔ اس لئے آپ کے متعلق تشویش ہے۔
 خدا آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ چند دن سے بیماری ہی بخاری
 سننے میں آتی ہے۔ سسٹن بے چارے کو نمونیا ہو گیا۔ اتوار کا خط آیا
 تھا کہ آپ بہتر ہیں۔ اسے بھی ایک دو ہفتے گذر گئے۔ نہ معلوم اب
 ان کا کیا حال ہے۔ میں پیرس سے یہاں ۸ فروری کو پہنچا۔ بالکل
 ڈر۔ پہلے انفلوزنزا ہو گیا۔ اس سے صحت پائی تو خون کا دباؤ
 نیک لخت کر گیا۔ سر میں چکر آنے لگے اور صاحب فریشن ہونا پڑا۔
 اب بالکل تندرست ہوں۔ زبیدہ کو صحت سے ادنیٰ بیریہ کی شکایت

ہے۔ وہ آج کل پنجاب میں ہیں۔ اُمید ہے آپ سے ملاقات ہوئی ہوگی۔ (بشترطیکہ آپ کراچی نہ آٹھ آئے ہوں) آج کل کام میں گھرا ہوا ہوں۔ سیکورٹی کونسل آدر ڈس آرگنائزیشن کبشن میں ہونے کی وجہ سے مصروفیت بہت بڑھ گئی ہے۔ پاکستان کے کسی گوشے آگ میں ہیں۔ بہر وقت یہی فکر رہتی ہے کہ کوئی بولہ ٹھنڈا نہ پڑھ جائے۔ اسد صاحب بحیثیت وزیر کے میرے معاون مقرر ہوئے ہیں۔ جنوری کی یلے مارچ میں یہاں پہنچے۔ وزیر خارجہ انہیں اپنے ساتھ بلاوا اسلام کے فدرے پر لے گئے تھے۔ جب کراچی واپس پہنچے تو کہیں بیڑھیوں پر سے رہنے۔ دوسریں ٹوٹ گئیں اور ان کے آنے میں اور تاخیر ہوئی۔ غرضیکہ جو حیرت پریشان رہا۔ اب زندگی کا نقشہ پھر کچھ بننے لگا ہے۔

لاہور کی خبر صرف اتنی ملی کہ ہاشمی صاحب امریکہ آئیں گے۔ یہ مژدہ سکان نے مسکایا۔ اسے بھی کئی ہفتے ہونے میں آئے۔ مزید کوئی اطلاع نہ آئی۔ صوفی صاحب کا ایک نادر سلام حمید الدین (ابن مولوی صدر الدین مرحوم) کی وساطت سے پہنچا۔ حمید یہاں کولمبیا یونیورسٹی میں نفسیت پڑھ رہے ہیں۔ عنقریب واپس جائیں گے۔ عباس کو بی بی سی سے یو این بلاتے کی کوشش کر رہا ہوں۔ وہ آجائیں تو بہت ہی خوب ہو۔ خلیفہ عبدالکیم یہاں اپنی لیکچر بازی ختم کر چکے ہیں۔ اب واشنگٹن میں سستار رہے ہیں۔ اگلے ہفتے نیویارک آئیں گے۔ اور دو چار دن کے بعد کراچی کا غم کریں گے۔

اخبار و اطلاعات تو ختم ہو لیں۔ اب صبر توں کا ذکر باقی ہے۔ پرسوں یہاں برف پڑ رہی تھی۔ یہ بارش کا آخری سنبھال تھا۔ یوں جھڑی کے حساب سے بہار کا موسم شروع ہو چکا ہے۔ عنقریب مکان

کی دیوار پر جو بیلے سرما میں مضحل اور بے رونق تھیں۔ وہ ہری بھری ہوں گی۔ وطن یاد آتا ہے۔ طالب علم تھے۔ تو مارچ کے مہینے میں امتحان کے خیال سے رخصتہ طاری تھا۔ معلم ہوئے تو مارچ میں تعطیلات کا انتظار رہتا تھا۔ بیمار کی ہوائیں بوں بھی چلتی تھیں اور بوں بھی۔ اور کاروباری عشق بہر نوح جاری رہتا تھا۔ کیا اب بھی راوی کے پاس مغبرہ جہانگیر کے باغ میں کوئل کی صدا سنائی دیتی ہے؟ کیا اب بھی فالوڈے کا موسم قریب آ رہا ہے؟ جب بیماری کے عالم میں بالکل خالی الذہن تھا۔ تو شباب لاہور اور لاہور شباب کے کئی موقع ٹھوڑی ٹھوڑی دیر کو دماغ میں جاگ اٹھتے تھے۔ دارالاشاعت کی بزم عشاق، دہلی مسلم ہوٹل میں وارننگن کا مجوم۔ بے دل مرحوم۔ فرزند علی (جو ہر وقت پان کی دجہ سے رطب اللسان رہتے تھے) منشی نعمت علی کی "ہتیے یو" پرانی اتارکلی میں حکیم احمد شجاع کا مکان اور باپ کا گناہ۔ تاثیر کی فیس پائی اور تہہنی چراغ حسن حسرت (خدا کی قسم وہ یہیں ہیں) ڈیگ پر ٹھپسی کا شکار جنگل کی پر اسرار معشیں۔ پھر گورنمنٹ کالج لاج کا دور۔ صوفی کی پنجابی غزلیں۔ شب ڈیگ کی تقریبیں۔ اسے کاش کوئی از سر نو ان اوداق پریشان کا شیرازہ باندھ دے۔

دشس بر یادِ حرفیاں بخرابات شدم
خم سے دیدم دخن در دل و پا در گل بود
بس بگشتم کہ بیپرسم سبب درد فراق
مفتی عقل در این مسئلہ لا یعقل بود

آپ کی خریدت کا طالب ہوں اور آپ کے خط کا منتظر۔

ہر آنکہ جانب اہل وفا نگہ دارد خاکسار
خداکش در ہمہ حال از بلا نگہ دارد بخاری

نیویارک

۲۸ اپریل ۱۹۵۲ء

برادر محترم!

سلام مسنون! گرامی نامہ بے تاریخ لیکن نسیقہ ادا اول اپریل شرف صدور لایا۔ آپ خط نویس نہیں پرچہ نویس ہیں۔ ایک ہی مکتوب سے آپ خبروں کا ایسا پھر کا ذکر دیتے ہیں کہ مہینوں کی تشکی مٹ جاتی ہے۔ جب سے پیرس آیا۔ مسئلہ تیونس میں متفرق رہا۔ خدا نے اس بارے میں مجھے ایسا سرخود کیا کہ ناشکری کا کوئی بھی حیلہ تو باقی نہ رہا۔ امریکہ کے اخباروں نے وہ مجھے سر پر اٹھایا کہ شاید ہی یو این میں کسی کو نصیب ہوا ہو۔ ابھی تک تعریفی خطوط کا تانتا لگا ہوا ہے اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن دانے بہر وقت تعاقب میں رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ بہت نامی اخبار نے (نام ابھی نہ لوں گا) خاص مجھ پر ایک آرٹیکل لکھنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے اپنے طریق کار کے مطابق ایک نامہ نگار میرے ساتھ نکھتی کر دیا ہے جو رات دن میرے ساتھ پھرتا ہے۔ اور بے شمار سوالات پوچھ پوچھ کر نوٹ کرتا جاتا ہے۔ پندرہ دن یہی شغل رہے گا۔ اس کے بعد وہ دو صفحے کا آرٹیکل لکھے گا۔ یہیں کے صحافت باز لوگ بھی عجیب والہانہ طبیعت رکھتے ہیں۔ بعض لوگوں پر ایک آرٹیکل لکھنے کی خاطر چھ مہینے ان کے ساتھ ایک انشا پرداز کو نکھتی کر دیتے ہیں۔ سنا ہے میرے والے آرٹیکل پر ان کا دس ہزار ڈالر خرچ آئے گا۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے پاکستان کی اس خدمت کے لئے مجھے منتخب کیا اور پاکستان کی طفیل مجھ پر بھی اپنی رحمت فرمائی۔ قضیہ تیونس کیوں کر یو این میں لایا گیا۔ اور معاشے نہ کیا کیا پٹے کھائے اور دنوں میں کیا کیا تماشے ہوئے

یہ داستان ایک ڈرامہ سے کم نہیں۔ عند الملاقات انشاء اللہ کبھی عرض کروں گا۔ آپ جانتے ہیں میں تقریر بغیر نوٹ کے کرتا ہوں۔ ہر مرتبہ تقریر کے ابتدائی فقروں کے دوران میں ایک عجیب کیفیت مجھ پر طاری ہوتی ہے۔ مجلس امن کے سامعین (ریڈیو وغیرہ ملاکر) کروڑ دو کروڑ سے کم نہیں ہوتے۔ اور پھر دائیں بائیں بھی گڑگڑے اور جفا داری قسم کے لوگ۔ لیکن وہ نطقت رہا کہ کیا عرض کروں۔

پاکستان آنے کے لئے بے قرار ہوں ستمبر اکتوبر سے لے کر جنوری تک جنرل اسمبلی کی وجہ سے میرا نیویارک میں رہنا ضروری ہے۔ آیا تو یا ستمبر اکتوبر سے پہلے یا جنوری فروری میں۔ تاریخ کے تعین میں توقع یوں ہے کہ ہارون میاں چاہتے ہیں۔ میں ان کی شادی کے موقع پر کراچی میں ضرور موجود ہوں۔ شادی کی تاریخ بھی انہوں نے مقرر نہیں کی۔ خان بہادر میاں عبدالعزیز مرحوم کی صاحبزادی کے لئے پیغام بھیجا ہے۔ خاقان کا نام روکشن ہے اور ہر شخص سے اس بچی کی تعریف سُنی ہے۔ زبیدہ یقیناً آپ سے بات کریں گی۔ اُمید ہے آپ اپنے برادرانہ مشورے سے اُسے مجھے اور ہارون کو محروم نہ رکھیں گے۔ کبھی فرصت ملے تو ذوالفقار سے عام معاملات پر بھی تبادلہ خیالات کیجئے۔ اس کا اکثر باتوں میں رویہ کچھ غیروں کا سا ہے۔ میں تو متوکل انسان ہوں۔ البتہ زبیدہ کو جو خاندانی یک جہتی کی عادی ہے۔ ڈکھ ہوتا ہے۔ نہ زبیدہ ہی صبر شکر سے کام لیتی ہے۔ نہ ذوالفقار ہی کا دل پسینا ہے۔ اس بدمزگی سے میں اکثر پریشان رہتا ہوں۔ کسی کے بس کی بات نہیں۔ تاہم عجیب نہیں کہ کسی لمحے آپ کا کلام ذوالفقار کے دل میں

جاگزیں ہو جائے۔ اور اس کی کدورتیں (واللہ اعلم کیا کدورتیں ہیں) دود ہو جائیں۔

آپ بھی اب کراچی ہو گئے۔ خدا کرے آپ کو مکان خاطر خواہ مل جائے۔ مسلم ٹاؤن کی کوٹھی کے بعد بجائی بے چاری کو ہوٹل میں زندگی کا کیا لطف آئے گا۔ آپ کے کراچی آنے سے میں خوش ہوں۔ کراچی میں لاہور کا سارس نہیں۔ لیکن جب حلقہ احباب کے باقیات الصالحات سب کراچی میں ہیں۔ تو لاہور سے بہتر ہے۔ کم از کم آشتا صورت میں تو نظر آئیں گی۔ شریعت (محکمہ تعلیم) آج کل امریکہ میں ہے۔ ڈاکٹر وحید بھی (حقوق انسانی کے کمیشن کے سلسلے میں) یہاں ہیں۔ خلیقہ عبدالکیم اس وقت بلاد اسلامیہ میں مزار مولانا دم پر فاتحہ پڑھ رہے ہوں گے۔ یا غضنفر کے ہاں پلاؤ کھا رہے ہوں گے۔ عنقریب کراچی پہنچیں گے۔ مجید ملک اور آمنہ کی کہیں کوئی خبر نہیں آئی۔ فیننگ روڈ کے آیام کے بعد ان سے غلطی یا طبع ہونے کے موقعے کم ملے ہیں (بجز دوران جنگ اور ذہلی میں) سیمان یقیناً صحت مند ہوں گے۔ کیونکہ عرصہ سے ان کا خط نہیں آیا۔ سنا ہے امتیاز کراچی آئے تھے۔ چند محفلیں رکشن کر کے پھر لاہور چلے گئے۔ ان کی جانب سے تو کہیں خط آتا ہی نہیں۔ ہمارے دوست ماشاء اللہ اہل القسّم سے بڑھ کر اہل القظ ہیں۔

خط لکھتے رہا کیئے اور جو باجیب نشینی و ————— الخ۔

خاکسار

بجاری

نیرپارک
۱۳ اگست ۱۹۵۲ء

برادرم محترم!

سلام مسنون! یہ بھی میری ثولیدہ ایام زندگی کی ایک مثال ہے کہ جب آپ کا خط ملا۔ میں ایک کانفرنس میں تھا۔ کھول کر صرف آنکھیں سیراب کیں۔ اور پھر جیب میں رکھ لیا کہ فرصت میں پڑھوں گا۔ نہ معلوم وہ کون سی جیب کس کوٹ کی تھی۔ تین دن سے تلاش کر رہا ہوں۔ آخر ارادہ کیا کہ منہ زبانی "ہی جوب لکھ دوں۔ اتنا ضرور دیکھ لیا تھا کہ آپ میری خانوشی کے شاکی ہیں اور خط کا خانمہ اس پر معنی فقرے یا جملے پر ہوا تھا کہ آپ "عقب ریڈیو سٹیشن" رہتے ہیں۔ عقب پچائی نہ چھوٹی!

جولائی اگست کے مہینے یہاں مشکل سے کٹتے ہیں۔ گرمی اور رطوبت یعنی بالکل کھلتے اور گاہے گاہے مدراس۔ اس دوران میں کام برابر

جاری رہا۔ کشمیر کے مسئلے کو یہاں سے جینورا وادہ کیا۔ تو ڈس آرہیمنٹ کمیشن اور سیکورٹی کونسل کے اجلاس دھڑا دھڑا ہونے لگے۔ ۱۳ اگست کو جنرل اسمبلی ہے۔ اس کی تیاریاں ابھی سے شروع ہونی ہیں۔ معاونین سے جو توقع تھی کہ رستم کی گورنر پر لات ماریں گے۔ وہ توقع محروم ہوئی۔ ہم سمجھے تھے کہ

س "مبارک باد اسد غم خوار جان درد مند آیا"

لیکن انہیں فرصت کشاکش غم پنہاں ہی سے نہ ملی۔ کئی مرتبہ تکان کے مارے بُرا حال ہو گیا اور ہفتہ بھر صرف بستر میں لیٹ کر تاول پڑھنے کا ارادہ کر لیا۔ "پر کیا کریں کہ دل ہی عدد ہے فراغ کا" بہر حال اب دسمبر تک تو یونہی بار برداری کرتی

پٹسے گی۔ اس کے بعد چھٹی لے کر وطن واپس آنے کا ارادہ ہے۔ چھٹی "ایک سے دو مہینے" تک کی ہے مگر رہنے کو بھی دل چاہتا ہے۔ لیکن قواعد کی رو سے جتنا عرصہ پاکستان رہوں۔ اتنا عرصہ فارین الائنس جین جاتا ہے۔ خیر یہ بعد کی باتیں ہیں۔ فی الحال تو کراچی پہنچنے کے نقشے داغ میں ڈھل رہے ہیں۔

اس دوران میں غضنفر یہاں آئے۔ کسی تیل کے بادشاہ کے ہاں تھے۔ چنانچہ اس ٹھانڈے سے رہے کہ ہماری مینز بائی کے متوقع بھی رہے اور اس سے بے نیاز بھی۔ حسب دستور کچھ ہم سے خوش کچھ شاک کی گئے۔ غلام محمد چند دن سے یہاں ہیں۔ ایک دو مرتبہ ماحضر تناؤ فرمایا اور وطن کے حالات سنائے۔ امجد بھی موجود تھے۔ وطن کے حالات سے میں بیشتر بے خبر رہتا ہوں۔ بس اتنا ہی علم میں آتا ہے۔ جو سرکاری اطلاعات کے ذریعے پہنچتا ہے۔ ڈان پڑھنے کی کبھی فرصت ملتی ہے۔ کبھی نہیں ملتی۔ جو سیاح یہاں آتا ہے۔ وہ کسی نہ کسی افسر کی بیماری کا حل سنا جاتا ہے۔ غلام محمد بیمار تھے۔ پھر محمد علی بیمار ہوئے۔ اب سنا ہے عبدالقادر صاحب فرانس ہیں۔ کراچی کی آب و ہوا یکسر بدل ڈالنے کا تہیہ کر لینا چاہیے۔ سلمان ملے تو ان سے کہیے کہ ان کی جانب سے ایک مسودہ عرصہ ہوا موصول ہوا ہے۔ جس میں نیازی صاحب اور کسی اور تان سین کی آپس میں تونوں میں میں کا حال مفصل درج تھا۔ پھر ایک اور مسودہ شرف الصدور لایا۔ جو خود ان کی ایک ریڈیو ٹاک کا مسودہ تھا۔ حاشیے پر چند کیڑے کھڑے "بقلم خود" منقوش تھے۔ اسی کو ان کا گرامی نامہ سمجھ کر خوش ہو لیا۔ لیکن اس سے اتنی اکتاہٹ پیدا نہ ہوئی۔ کہ "لانیو تو محمدان" کہہ اٹھا۔ بہر حال انہیں

عنقریب نئے سازد سامان کے ساتھ خط لکھوں گا۔
 ہارون کی شادی دسمبر کے آخر میں ہوگی۔ میں وسط دسمبر سے
 کسی صورت پہلے نہ پہنچ سکوں گا۔ نہ معلوم ایسی تقریبوں پر کیا کیا
 انتظامات پیش از وقت کرنے پڑتے ہیں۔ امید ہے آپ زبیرہ کی
 اپنے مشورے سے وقتاً فوقتاً رہنمائی کرتے رہیں گے۔ آپ اور دیگر
 احباب اگر اس کام میں بقدر فرصت حصہ لیں۔ تو بتقاضائے نیاز
 مندی بے حد ممنون ہوں گا۔ ہارون منصور ماشاء اللہ جوان ہیں لیکن
 نا تجربہ کار ہیں۔ آپ کی ہدایت کی انہیں بے حد ضرورت ہوگی۔
 سلمان کی خدمت میں بھی میری طرف سے یہ درخواست پہنچا دیجئے۔
 ذوالفقار کو بھی خط لکھوں گا۔ لیکن نہ معلوم وہ کس حد تک توجہ
 کریں۔ آپ اور سلمان پر بھروسہ ہے اور خدا آپ کو خوشی
 رکھے۔
 امریکہ سے کچھ منگوانا ہو۔ تو ابھی سے لکھ بھیجئے۔ یہاں کا شاپنگ
 از حد صبر آزما ہوتا ہے۔

خاکسار
 بخاری

۶

نیویارک
 ۹ فروری ۱۹۵۳ء

برادر محترم!

سلام مسنون۔ جب نیویارک پہنچا تو جہاز سے بیمار اترائے۔

رہے آرامی میں ایک قیمتی اعداد کوٹ بھی جہاز ہی میں رہ گیا اور اب اس کے ملنے کی کوئی امید نہیں۔ سخت نزلہ اور بخار سیدھا ہسپتال لے گیا۔ اب آفاقہ ہے۔ لندن میں جو بیس گھنٹے ٹھہرنا پڑا۔ جہاز والوں نے ایک ایسے ہوٹل میں ٹھہرایا۔ جو مصافحات میں واقع تھا۔ بڑی سی عمارت جیسے کسی انگریز رئیس کا محل ہو۔ ارد گرد وسیع باغ، دن بھر ہوٹل ہی کے آفتاب خانے میں بیٹھا رہا۔ کسی دوست آشنا سے جو لندن میں رہتے ہیں۔ ملاقات یا ٹیلی فون کی کوشش نہ کی۔ موسم صاف تھا۔ خیال تھا کہ نزلے میں کچھ تخفیف ہو جائے گی۔ لیکن نہ ہوئی۔ قاہرہ کسی کو گزرنے کی اطلاع نہ دی تھی۔ البتہ روم کے ایئر پورٹ پر اسلام ملک اور ان کی بیوی ملنے آئے۔ گھنٹہ بھر کا وقفہ ان کی معیت میں گذرا۔ کراچی سے میرے ہی جہاز میں طیب حسین واپس قاہرہ جا رہے تھے۔ قاہرہ ایئر پورٹ پر ان کی بیگم صاحبہ (مزا محمد سعید کی صاحبزادی) انہیں لینے آئی ہوئی تھیں۔ ان سے کچھ گپ رہی۔ نیویارک ابھی خالی خالی ہے۔ ابھی تک کسی دوست سے تجدید مراسم کی مہلت نہیں ملی۔ چوہدری ظفر اللہ خاں یہاں سے جینوا جا چکے ہیں۔ آج پہلی مرتبہ دفتر گیا۔ جاتے ہی کام میں مصروف ہو گیا۔ کچھ مجبوراً کچھ دل بہلانے کے لئے۔ مصروفیت دافع تفکرات ہوتی ہے۔ آج بارون کا خط آیا ہے کہ میں شادی مارچ کے آخر میں کرنا چاہتا ہوں۔ اسے میں نے لکھا ہے کہ زبیرہ اور منصور کے ساتھ مشورہ کر کے خرچ کا تخمینہ لکھ بھیجے۔ منصور کی شادی کے اخراجات کا نقشہ اسے میں نے یہاں سے بھیج دیا ہے۔ اس سے مدد ملے گی۔ وہ سمجھتا ہے کہ شادی بھلے اپریل کے مارچ ہی کے مہینے میں مناسب ہوگی۔ خدا کرے اس وقت تک میں کچھ پونجی جمع کر سکوں۔ فی الحال تو تجوری بائیں بائیں کر رہی ہے۔ اندازہ ہے کہ گھر کے لوگ اس وقت منتشر ہوں گے۔

اور زبیدہ اکیلی ہوں گی۔ خربیت دریافت کرتے دیکھتے گا۔ جب میں
 کراچی سے روانہ ہوا تھا۔ تو اسے بھی زکام اور بخار تھا۔ شادی کی
 بساں دوڑنے کا فیصلہ دیا۔ منصور اور زربینہ اغلباً تعطیل منانے
 دہل چلے گئے ہوں گے۔ مارون لاہور میں ہے۔ بلکہ آج کل دورے
 پر ہے۔ وہ ۲۳ فروری تک دورے پر رہے گا۔ ذوالفقار کے
 اوقات جیسے مصروف ہیں۔ وہ آپ جانتے ہیں۔

کراچی آنے کا وہ لطف نہ آیا۔ جس کی اُمید تھی۔ لوگ پتہ مردہ
 اور ان کی گفتگو اکثر منظر تھی۔ علاوہ بریں شادی کے تفکرات بیشتر
 دماغ پر حاوی رہے۔ دو مرتبہ لاہور تو گیا۔ لیکن لاہور سے محلی بالطبع
 ہونے کی فراغت نصیب نہ ہوئی۔ تاہم غنیمت ہے کہ سب احباب
 سے (بجز ایک عابد علی کے جو برات میں بھی شامل نہ ہوئے) ملاقات
 تو ہو گئی۔ اب دیکھتے آگے دو ایک سال میں زمانہ ہر ایک سے کیا سلوک
 کرتا ہے۔ آپ کی صحبت بدستور فیض کا سرچشمہ تھی۔ جو قطعاً نصیب
 ہوئے وہ آپ ہی کی بدولت نصیب ہوئے۔ اور شادی کے انصرام میں
 آپ ہی کی ذات سے بہت کچھ ڈھارس بندھی رہی ورنہ میں بالکل
 ہی پچک گیا ہوتا۔ خدا آپ کو سلامت و شاداں رکھے۔ مجید لاہوری
 کی صحبت بھی حاصل وطن تھی۔ ان سے میری جانب سے معذرت کر
 دیکھئے گا۔ کہ وہ خدا حافظ کہنے آئے۔ تو میں گھر چھ موجود نہ تھا۔ ان
 کی طباطبائی اور بذلہ سنجی اور سب سے بڑھ کر ان کے اخلاق اور ان
 کی الفت کی یاد سے طبیعت تا ابر سیراب رہے گی۔ خدا ان کے
 دماغ کو امداد دے ان پر سلام ہو۔ نیز ندوی صاحب پر بھی
 جن کی کتاب پڑھی (جو آپ کو انہوں نے تحفۃ دی تھی) اور وہ
 میرے گھر پر ہے آپ دہاں سے وصول کر لیجئے گا۔

شاہد سہروردی نیویارک میں آکر مقیم ہو گئے ہیں۔ کو بیبا یونیورسٹی

میں ان کا منصب آرٹ لیچرار کا ہے۔ ابھی ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ پرسوں یہاں کے سب سے بڑے مجائب خانے میں تصویروں کی ایک نمائش کا افتتاح ہے۔ ڈائریکٹر اور اس کی بیوی نے مجھے نمائش سے پہلے کھانے پر بلایا ہے۔ ارادہ ہے کہ شاہد کو جی ساتھ لے جاؤں۔ انہیں وہاں سے بہت سے ہم سخن اور ہم زبان ملیں گے۔ سنا ہے کہ ان پر انحطاط آگیا ہے۔ اور ان کا دل پڑمردہ ہے۔ آخری عمر میں تنہائی کا عالم اور تلاشِ معاش میں وطن سے اس قدر دور ان پر ترس آتا ہے۔ طبیعت بھی ان کی حساس ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم کی سی خوش دلی ان میں نہیں رہتا وہ نرسنگہ داکس گارڈن کی زریں سہ پہر!) یہ محض نیویارک پہنچنے کا خط ہے۔ اس لئے اختصار مد نظر ہے۔ باقی آئندہ!

ترجمے کے لئے اردو کے مختصر فسانوں کا انتخاب۔ عباس کو یاد دلاتی کرانے رہیے گا۔ حسرت کو سلام۔ پڑھا انہوں نے کہ ایران میں بھی محتسب بیدار ہو رہا ہے؟

خاکسار
بخاری

نیویارک
۱۹ فروری ۱۹۵۲ء

برادرِ محترم!

سلام سنون۔ آپ نے جیسے جاہل تھا۔ اسی کے مطابق آپ کا ۱۵ فروری کا لکھا ہوا گرامی نامہ آج ۱۹ فروری کو نہیں بلکہ ۱۸ فروری کو یہاں پہنچ گیا۔ میرا یہ خط آپ کے خط کا جواب نہیں۔ بلکہ "خود بخود" خط ہے۔ اور ایک ضرورت سے آپ کو لکھ رہا ہوں۔ "بھنگیوں کی

توپ" کے مکمل حالات مطلوب ہیں۔ کس نے بنائی؟ کہاں بنائی؟ کیا توپ ساز کا نام اور کوالفٹ معلوم ہیں؟ توپ کا اصل مالک کون تھا؟ توپ کی عمر کتنی ہے؟ ہوتے ہوتے لاہور کے عجائب خانے کے سامنے کیسے پہنچ گئی؟ -

اس ریسرچ کا محتاج یوں ہوا کہ ایک جرنیل کی استمالت کرنی ہے۔ ان حضرات کی کیفیت یہ ہے کہ انہیں پاکستان کی کسی چیز کا مطلقاً کوئی علم نہیں۔ بجز بنگلیوں کی توپ کے۔ اور اس توپ کے بارے میں ایسا شغف ہے کہ عشق و جنون کی حد تک۔ کپلنگ کی کتاب "کم" KIM میں اس کا حال انہوں نے پڑھ رکھا ہے۔ (اسے کہتے بھی "کم کی توپ" ہیں)۔ اس کے مفصل حالات ان تک پہنچا سکا۔ تو وہ پھولے نہ سماتیں گے۔ بلکہ شاید انہیں مطلقاً و مجلداً کاغذ پر لکھوا کر اپنی لائبریری میں محفوظ رکھوا دیں۔ پہلے خیال آیا کہ لاہور کے عجائب خانے کے مہتمم صاحب کون ہیں اور جواب جلد دینا۔ انہیں گوارا ہوگا۔ یا میرا خط حکماتی مسلوں ہی میں کہیں چکر لگاتا ہے گا۔

اول تو مفصل حالات آپ کو خود ہی معلوم ہوں گے۔ (آپ کا حافظہ اور دماغ عمر عیار کی زنجبیل سے کم نہیں) اور نہ معلوم ہوئے تو آپ کراچی میں کسی ماہر سے حاصل کر لیں گے۔ جواب ذرا جلد بھیج دیجئے۔ نالاب کا ہندی ترجمہ خوب رہا:

”لو بھجہ کا کاج کام کیا کیا ہے۔“

یعنی ہو کس کو ہے نشاط کار کیا کیا۔ ”کاج کام“ کی داد دیجئے۔
نشاط کا ہندی ترجمہ ”کام“ اور (اردو کے) کام کا ہندی ترجمہ ”کاج“

لہذا "نشاط کار" "کاج کام" ہوا۔ یہ ترجمہ ہندی معذرتہ میں بھی مفید ہو سکتا ہے۔ مثلاً کہا جائے کہ "آج کل کام کاج میں کاج کام نہیں ملتا" مگر یہ تو فرمائیے "نندرا کیوں ماتری بھر نہیں آتی"۔ میں بحر (یا سندر کہوں؟) کون سی استعمال ہوتی ہے۔ "مارچ میں شادی" پر ہارون نے مجھے خط لکھا ہے۔ تجویز دراصل کسی کی ہو۔ وہ اس سے بہر فروع متفق بلکہ مصر معلوم ہوتا ہے۔ میں نے اسے جواب بھیجنا ہے کہ مجھے اعتراض نہیں۔ البتہ زبیدہ سے مشورہ کر کے اس کی رضا مندی حاصل کرے۔ روپے کا جو انتظام کرنا ہے۔ اس کے اعتبار سے میرے لئے آخر مارچ یا آخر اپریل دونوں برابر ہیں۔ لہذا اس کے متعلق تشویش نہ ہونی چاہیے۔ اور محض اس خیال سے مارچ کو رو نہ کرنا چاہیے۔ روپیہ کا انتظام انشا اللہ ہو جائے گا۔ باقی حالات آپ پر اور زبیدہ پر چھوڑتا ہوں۔ ہارون کے نزدیک شادی کا اپریل تک التوا خود اس کے (یعنی ہارون کے) لئے خوشگوار نہیں۔ بلکہ ذہنی پیچیدگی کا موجب ہے۔ اس کے خط سے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اپریل پر خواہ مخواہ اصرار نہ کرنا چاہیے۔ البتہ کوئی دیگر حالات مانع ہوں۔ تو کوئی اور بات ہے۔ ان کا مجھے علم نہیں۔ اگر تیاری میں کوئی کوتاہی رہ گئی۔ تو اس کا الزام ہم پر نہ آئے گا۔ لہذا اس بار سے میں زبیدہ کو کوئی ہر اس اپنے اوپر طاری نہ کرنا چاہیے۔ ہارون کا خط کہے "در دیلا" سا تھا۔ اس لئے میں نے مزاحم ہونا قرین مصلحت نہ سمجھا۔ صحیح حالات آپ کو منصور سے معلوم ہوں گے۔ جب وہ کراچی واپس آئے گا۔

احیاب کی یاد ابھی تازہ ہے۔ مجید لاہوری اور دیگر کرم فرماؤں

کو سلام پہنچے۔

غربت کی صبح میں بھی نہیں ہے وہ روشنی
 جو دکھتی کہ شام سواد وطن میں تھی
 "شام" سے مراد وہ شام ہے جو آپ کے ہاں کشتی تھی۔ اور
 "سواد" پنجابی کا "سواد" ہے۔

خاکسار
 بخاری

نیویارک
 ۱۶ اپریل ۱۹۵۳ء

برادرم محترم !

سلام مسنون۔ گرامی نامہ ملا۔ نمکدان بھی کتاب کے ساتھ ہی مل
 گیا تھا۔ خیال تھا اس کے متعلق علیحدہ خط لکھوں گا۔ لیکن فرصت نہ
 ملی۔ مجید صاحب کو بہر حال میرا دلی شکریہ پہنچا دیجئے۔ نمکدان کی وجہ
 سے کچھ دن اور شامیں روشن ہو گئیں۔ امد صحبتِ یاداں سرِ پیل کا
 مزہ آگیا۔ آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ نسیم کا ایسا جھونکا کیسی کبھار وطن
 سے آجاتے۔ تو میں کتنی دیر تک یہاں مست رہتا ہوں۔

تنخواہ میں جو تخفیف ہوئی ہے وہ پندرہ سو روپے ماہوار کے
 برابر ہے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ کہ تخفیف کی ضرورت
 اس حد تک محسوس ہوگی۔ میں سمجھتا تھا۔ یہ عہدہ اتنا اہم ہے۔ اور
 یہاں ہم نے رستم کی گورنر پر وہ لائٹ ماری ہے کہ ہم مامون رہیں گے۔
 بہر حال ہماری خوش فہمی صحیح ہی کیوں ثابت ہوتی ہے اور یہ بھی خیال
 تھا۔ کہ جو لوگ خود فارن سروکس سے متعلق نہ ہوں۔ اور یا وجود
 اس کے سفیر وغیرہ مقرر ہوں۔ ان کی ریٹائرمنٹ کہیں ساٹھ برس

کی عمر میں ہوتی ہے۔ میں نہ تو فارن سروس میں ہوں۔ نہ ابراہیم رحمت اللہ ڈاکٹر عمر حیات۔ غضنفر وغیرہ کی طرح سیاسی زندگی سے سفارت پر آیا ہوں۔ مجھے پر کون سا قانون گھے گا؟ ہم پھر خوش فہمی میں رہے تا آنکہ حکم آیا کہ یکم اکتوبر ۱۹۵۳ء سے تم پھر حال سبکدوش کر دینے جاؤ گے۔ عرض معروض کی ہے کہ مجھے پھر فارن سروس والوں کا قانون وارد نہ کیا جائے۔ تو مجھے تو وسیع ملازمت لرزاق فرمائیے۔ ضابطے کا جواب ابھی نہیں آیا۔ لیکن فرائین سے معلوم ہوتا ہے کہ مجھ پر کچھ نہ کچھ نوازش ضرور ہوگی۔ اور مجھے ایک سال کی توسیع یعنی یکم اکتوبر ۱۹۵۳ء تک مل جائے گی۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔ تاکہ مجھے کچھ مہلت مل جائے اور اپنا مستقبل قدرے سہولت کے ساتھ شکست و ریخت سے بچا سکوں۔

ساتھ ہی ساتھ تلاشِ معاش جاری ہے اور ادھر ادھر یا تھ مار رہا ہوں۔ آثارِ قدرے اُمید افزا ہیں۔ سرکاری ملازمت پر اب مزید تکیہ کرنا فضول ہے۔ کب تک کوئی میری معروضات پر غور کرتا رہے گا۔ ضابطے کا چکر بے پناہ ہوتا ہے۔ بار بار اپنے آپ کو مستثنیات میں سے ثابت کرنا طولِ عمل ہے۔ معاش کی تلاش امریکہ یورپ میں ہی کرنی پڑے گی۔ وطن میں بجز سرکاری ملازمت کے کیا ہے۔ جس کے ہم منشی لوگ قابل ہوں۔ اور جب سرکاری ملازمت سے ہل گئے۔ تو باقی کیا رکھا ہے۔ منشی کی معیاد کے ساتھ ہی ساتھ کہولت بھی وارد ہو جاتی۔ تو کسی بستر پر پڑا رہتا۔ لیکن سخت جانی کا کیا علاج؟ ”ابھی تو میں جوان ہوں“ یا کم از کم ستر بہتر انہیں۔ وہ بے چارہ کیا کرے جو ضابطے کا بوڑھا ہو۔ اور دل و دماغ کا بوڑھا نہ ہو۔

زبیدہ کے خط سے معلوم ہوا۔ کہ مارون کی شادی ستائیس اپریل

کو ہوگی اور آپ اس میں شریک ہوں گے۔ جزاک اللہ۔ آپ کی راہنمائی زبیدہ اور بچوں کو حاصل ہوگی۔ تو میں پریشان کیوں ہوں۔ تاہم دل وہی اٹکا رہے گا۔ ہو سکتا تو آتا۔ لیکن جو کچھ پس انداز کیا تھا۔ منصور کی شادی پر خرچ کر ڈالا۔ جو کھرچن باقی تھی۔ اسے جوں توں کر کے مارون کے لئے بھیج دیا۔ اب محض قلندر ہوں۔ آئندہ معاش کا بھی ابھی کچھ یقین نہیں۔ عمر بھر جو کچھ کمایا تھا۔ وہ کچھ زیادہ نہ تھا۔ لیکن نہ معلوم کہاں چلا گیا؟ کسی دن فرست سے اس پر غور کروں گا۔ ممکن ہے۔ میں نے کہیں دفن کر رکھا ہو اور بھول گیا ہوں۔ میں نے مرے تک آپ کو خط نہ لکھا۔ خیال تھا کہ آپ شاید مرزا غالب کے سلسلے میں سفر پر ہوں۔ خیر میں یہاں دیر سے پہنچتی ہیں اور جو پہنچتی ہیں۔ ان کا مالہ و ما علیہ اکثر پوری طرح سمجھ میں نہیں آتا۔ بہر حال کچھ سمجھنے کی ایسی جلدی بھی نہیں۔ رموزِ مکتب خورشید خرداں آئندہ۔

آپ کی بہبود کا طالب خاکسار
بخاری

نیریا رک

۵ مئی ۱۹۳۳ء

برادرِ محترم!

سلام سنوں۔ آپ کا بے تاریخ خط آج ملا۔ اس سے پیشتر وہ خط بھی موصول ہوا۔ جس میں عزیزہ کی اعجاز کے کوائف شامل (مشمول؟) تھے۔ اعجاز صاحب کے سلسلے میں میں نے سب سے پہلے باواسطہ تحقیقات کی۔ کہ ایسے گریڈوں میں کھپتہ کی کیا کیا گنجائشیں ہوتی ہیں۔ کیونکہ ابھی تک ہمیں ان سے سابقہ نہ پڑا تھا۔ (آپ نے فرمایا ہے کہ

”ان کا ایک ساتھی حال ہی میں مقرر ہو کر امریکہ جا چکا ہے۔“
 معلوم نہ ہوا کہ وہ کون ہے؟ تفصیل مل جائے تو اس سے ہمیں
 اپنی مساعی میں مدد ملے گی) جو حالات سرسری طور پر معلوم ہوئے
 ہیں۔ وہ یوں ہیں۔ کہ نمبر اگریڈوں میں ہمیں اپنے کوٹے سے
 زیادہ حاصل ہے۔ نمبر ۲ کلرک عموماً مقامی طور پر بھرتی ہوتے ہیں۔
 ورنہ آنے جانے کا خرچہ تنخواہ سے بھی تجاوز کر جاتا ہے۔ گویا
 یا تو امریکیوں کو بھرتی کیا جاتا ہے یا ان لوگوں کو جو غیر مالک
 سے آئے ہوں۔ لیکن یہاں موجود ہوں۔ نمبر ۳ بطریق مغرب
 ایسے کام عورتیں کرتی ہیں۔ امریکی ذہنیت کے لئے ایسے کام پر
 کسی مرد کو مامور کرنا ایسے ہی اچھنبے کی بات ہے۔ جیسے ہم اپنے وطن
 میں چھڑا سی کے عہدے پر کسی عورت کو مقرر کرنا چاہیں۔ حالانکہ
 ظاہر ہے کام وہ بھی کرے گی۔ یہ تو ہوتیں معمول کی باتیں۔ اب
 میں خود کسی یا اختیار افسر سے بلا تو اپنے طور پر پوچھوں گا کہ
 باوجود ان رسمی موانعات کے کیا پھر بھی کوئی گنجائش موجود ہے۔
 اور آپ کو بلا تاخیر اس سے مطلع کروں گا۔

تنخواہ تو یکم اپریل سے کم ہو گئی۔ توسیع کے متعلق ابھی کوئی باضابطہ
 حکم موصول نہیں ہوا۔ آخری خبر یہ ہے کہ وزیر خارجہ نے توسیع کی
 سفارش کی ہے۔ اور وزیر اعظم نے اس پر حکم صادر کیا ہے۔ مگر
 وہ سابقہ وزیر اعظم تھے۔ نہ معلوم اب صورت حال کیا ہے۔ افسوس
 آپ شادی پر نہ جاسکے۔ اس سے زیادہ افسوس اس بات کا کہ
 بیابی کی طبیعت اچھی نہیں۔ میں نے آپ سے کراچی میں بھی عرض
 کیا تھا کہ یہاں کسی ڈاکٹر سے بذریعہ خط و کتابت مشورہ کرتا ہو
 تو بلا تامل مجھے کہہ دیجئے۔ خدا کرے کہ ان کی طبیعت سنبھل گئی ہو۔
 شادی کے بعد زبیدہ کا خط نہیں آیا۔ اس لئے تفصیلات سے

بے خبر ہوں۔ البتہ عین شادی کے مدی منصور کا لاہور سے تار آیا تھا کہ کام بخوبی سرانجام پا گیا۔ اب زبیدہ کے خط کا انتظار ہے نہ معلوم اس مزید کو کس قدر کوفت ہوئی۔ لیکن بہو کا گھر لانا اس کے لئے یقیناً مسرت کا باعث ہوگا۔ افسوس کہ زمانہ اب وہ نہیں کہ شادیاں بطرز قدم چاؤ چوٹیلوں سے کی جائیں۔ دوہا بدل گئے۔ دلہن بدل گئیں۔ خوشی یہاں نہ رہی غرضیکہ ”عبوری دور“ مجھے اکثر اس بات کا شدید احساس رہتا ہے کہ زبیدہ کو کس قدر ذہنی شکست و رنجیت کا سامنا ہوتا ہے۔ آج ذوالفقار کا خط آیا کہ بیرون کی منگنی پشاور کے رئیس خان بہادر صفدر خاں کے صاحبزادے افضل سے ہو گئی ہے۔ الحمد للہ۔ خدا کرے اس بچہ کی زندگی کامران ہو۔ اس خبر سے بہت خوشی ہوئی۔

سلمان کو نیا گھر مبارک۔ میں تو میرا پیغام تہنیت پہنچا دیجئے گا۔ نکلان کے پرچے ملے ان کے صفحات پر بھی دوستوں سے مل گیا اور مجید صاحب کے ساتھ مل کر مہنس لیا۔ مجید صاحب کو خدانے شرافت اور شہادت کا جو نسخہ بنایا ہے۔ وہ دل کی گرمی اور دماغ کی ٹھنک کے لئے بہترین نسخہ ہے۔ انہیں میرا سلام شوق کہیے گا یقین مانئے نکلان پہنچا تو میں نے اس کے بعض حصے پانچ چھ مرتبہ پڑھے۔ اور سنائے۔ ان کی بددلت میں تو بالکل ہی نمک خوار ہو گیا ہوں۔

سرفراز کا پنجاب چلے جانا حیرت کا باعث ہوا۔ میں سمجھتا تھا کہ ان کا یہ عہدہ ان کے لئے بہت ہی موزوں تھا۔ لیکن شاید وہاں تنخواہ زیادہ ہو یا خدمت کی گنجائش زیادہ ہو۔ میرے نور احمد نے معلوم کیا کرتے ہیں؟ اختر صاحب کو بھی میرا سلام کہیے گا اور ہاں وہ مرد مومن کو جس کا نام ”مگر نہیں وصل تو“ ہے آج کل کسی شغل میں مصروف ہیں؟ ان کی کبھی کوئی خبر نہیں آئی؟ اگر سالک بے خبر نہیں تو وہ ضرور

سجادہ زنگین کر رہے ہوں گے۔ خدایا ان کا کیفیت کم نہ یادا !
خاکسار۔

بخاری

نویادک
۴ جون ۱۹۵۳ء

بلند محترم !

سہ ماہیوں کی توسیع کے متعلق آپ کو اطلاع میں چکی ہوگی۔ وزیر اعظم اور گورنر جنرل دونوں نے از حد محبت اور اخلاق کے خط لکھے۔ ایک سال کی توسیع منظور ہو گئی ہے۔ اب کاش کسی کو اس سے پہلے ایسے با اخلاق خط لکھنے کی توفیق ہوتی۔ اکثر لوگ ضابطے کا خط لکھتے ہیں۔ تو یہ تہیہ کر کے لکھتے ہیں کہ اس میں مکتوب الہ کو اچھی طرح رگید جائے چنانچہ پیوست اس میں کوٹ کوٹ کر بھر دیتے ہیں۔ آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا۔

مکاشش کی یہاں دو صورتیں ہیں۔ تعلیمی ادارے اور پورے این اسکانات دونوں ہیں۔ لیکن جب سے لوگوں کے کانوں میں بھنگ پڑی ہے کہ میں قومی خدمت سے شیکدوش ہونا چاہتا ہوں۔ دروازے پر کئی لوگوں نے دستک دی ہے۔ یو۔ این کا کام دفتری ہے۔ صبح نو بجے سے شام کے چھ بجے تک میز پر نشست۔ لیکن تنخواہ نسبتاً زیادہ ہے۔ تعلیمی اداروں کا کام (از قسم مشقت) ہلکا ہے۔ لیکن تصنیف و تالیف کی کئی دل کش گنجائشیں اس میں نکلتی ہیں۔ البتہ تنخواہ نسبتاً کم ہے۔ جسے بقدر لب و دندان تصنیف کی آمدنی سے پھیلا نا پڑے گا۔ آج کل اس گونگو میں ہوں۔ رحمان تعلیمی کام

کی طرف ہے۔ تصنیف کی ہو کس عمر بھر سے ہے۔ کچھ حالاتِ زمانہ اور بیشتر اپنی غیر صالح طبیعت کی بدولت وہ ہو کس کیسی ٹھیک طرح پوری نہ ہوئی۔ خدا کرے آخری فیصلہ یہی ہو کہ تصنیفی کام کیا جائے۔ جب خدا سے دعا کی ہے۔ کیسی نیکی کی بدایت نہیں چاہی۔ کیونکہ وہ اس نے پیسے سے دسے رکھی ہے اور دل و دماغ صراطِ مستقیم سے ہمیشہ آگاہ رہے ہیں۔ جب دعا کی ہے یہی کہ خدایا ہم کمزور ہیں۔ نیکی کو ہمارے لئے دل کسب بنا۔ جہاں ثواب کا امکان ہو۔ وہاں تھوڑا سا عمارت رکھ دے۔ بہت نہیں تھوڑا سا۔ ہم گدھے ہیں۔ تیرے اشارے کو تو سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن اپنی کمزوریوں میں پالنگل ہیں۔ اس لئے دُور سے کیسی کبار گاجر دکھا دیا کر۔

خیر آخری فیصلہ تو ہوتا رہے گا۔ ابھی تفصیلات پر بہت کچھ غور کرنا ہے۔ اس دوران میں تصنیف کی طرف رجوع ہونا چاہتا ہوں۔ لوگوں نے یہاں مشورہ دیا ہے کہ دو کتابیں تم فوراً لکھ ڈالو (انگریزی میں) ایک امریکیوں کے لئے اُردو سکھانے کی کتب۔ دوسرے امریکیوں کے لئے (ایک مختصر) تاریخ ادب اُردو سان کتابوں سے جو پیسے وصول ہوں گے۔ وہ آئندہ بہتر کتابیں لکھنے کے کام آئیں گے۔ اب آپ کے ذمے کام یہ ہے کہ پاکستان سے ان کے لئے مصالحہ بھیجے۔ تاریخ ادب کے لئے تو بہت سی کتابیں جمع کرنی پڑیں گی۔ لہذا پہلے اُردو سکھانے کی کتاب کا مصالحہ بھیجئے۔ اور وہ مصالحہ یہ ہے۔ عبدالحق کی قواعد اُردو، اور وہ پانچ چھ کتابیں جو کسی زمانے میں صاحب لوگوں کے لئے لکھی گئی تھیں۔ (ذوالفقار اودشمس عارف دونوں اس کے ماہر ہوں گے) اس سلسلے میں مجھ سے مزید تبادلہ خیالات کرنا ہو۔ تو وہ بعد میں۔ پہلے جو کتابیں ملتی آئیں۔ وہ بھجوا دیجئے۔ مصارف میں ادا کر دیں گا۔ اس کے ساتھ

ساتھ تاریخ ادب کے لئے فہرست کتب بھی مرتب کرنا شروع کر دیجئے۔

یہ کام بارِ خاطر تو نہ ہوگا اور کس سے کہوں؟ احتیاز کا بارِ خیال آتا ہے۔ لیکن وہ ایسے کاموں کے لئے مدت سے بے کار ہو چکے۔ وہ کستی نہ کرتے تو انہوں نے اور ہم نے مل کر تاریخ ڈرامہ پر ایک نہایت محقول کتاب آج سے دس پندرہ سال پہلے لکھ لی ہوتی۔ عباس صاحب اکثر کرم فرمائی کرتے ہیں۔ لیکن وہ کچھ اپنے محضوں میں ایسے گرفتار ہیں۔ کہ پہلی سی اچپلاہٹ ان میں نہیں رہی۔ باقی آئندہ!

خاکسار

بخاری

نیویارک

۱۲ جولائی ۱۹۵۲ء

برادر محترم!

سلام مسنون! آپ کا یکم جولائی کا خط چند دن ہوئے ملا۔ کتابوں کا پارسل بھی مل گیا۔ بے حد شکر ہے۔ جانتا تھا کہ کراچی میں کتابوں کا جمع کرنا جبرِ ثقیل ہے۔ تاہم آپ کو تکلیف دینے سے باز نہ آیا۔ اور کیا کرتا؟ رشید (ریڈیو داٹے) سے یہاں کئی سجتیں ہوئیں۔ ان سے کتابوں کے بارے میں میں نے اپنی مشکلات بیان کی۔ انہوں نے کہا۔ ہم آپ کے لئے کراچی میں ایک ایجنسی قائم کریں گے۔ جو آپ کے حسبِ ضرورت آپ کو اُردو کی کتابیں بھیج دیا کرے۔ تاکہ اگر آپ نیویارک میں بیٹھے بیٹھے تصنیف و تالیف کا شوق پورا کرنا چاہیں۔ تو بے کتابی سدا رہ نہ ہو۔ میں نے کہا۔ اس ایجنسی کا ہنم

کون ہو گا۔ یعنی میں یہاں سے خط کے لکھوں؟ انہوں نے اپنا نام پیش کیا۔ یعنی میں انہیں لکھوں گا۔ اور وہ احباب کو بے گار میں پکڑ کر جیسا جس سے ہو سکا۔ کتابیں حاصل کر کے مجھے بھجوا دیا کریں گے۔ اس وعدے بلکہ دعوے کی بنا پر ہیں انہیں کبھی آزمائش کا۔ لیکن وہ بھی آخر آپ ہی کی طرف رجوع کریں گے۔ اور اگر ان کی توجیہ کبھی کارگر ہوتی۔ تو اس میں آپ کا ہاتھ ہو گا۔ ان سے ملاقات ضرور کیجئے۔ یہاں آکر ان کی طبیعت میں چند شکوفے پھوٹنے لگے۔ اور ان کے ذہن کو ایسی جلا ہوئی۔ جس کی انہیں سالہا سال سے ضرورت تھی۔ واپس پہنچ کر پھر پھپھوندی لگنے لگے۔ تو میں کہہ نہیں سکتا۔ آپ کی جواں فکری کا اکثر تذکرہ رہا۔ گورنمنٹ کالج کے علم پرست اور سخن سنج گروہ یعنی راشد، رشید، حمید، امتیاز وغیرہم۔ چندے شعور کی طرح روکش ہوتے۔ لیکن کچھ عجب ہواؤں کا سامنا ہوا کہ شعلے سے زیادہ دھواں ان کی قسمت میں لگا تھا۔ کوئی گلگیری کا سامان بھی نظر نہ آیا۔ چنانچہ سالہا سال سے بس سلگ رہے ہیں۔ آپ کو جن چشموں نے میرا ب کیا ہے۔ ان کی تازگی کبھی کم نہ ہونے پائی۔ اس پر میں اور رشید گمنٹوں باتیں کرتے رہے۔ آخر آپ کو ہزار ہا دعائیں دے کر آپ سے عہدِ محبت پھر تازہ کیا۔ اس نے بھی میں نے بھی۔ یہ لمبے رشید اور میری زندگی کے بہترین لمحے تھے۔ اے وقت تو خوش کہ وقتِ ما خوش کر دی۔

کتابوں کا پھر شکریہ! تاریخ ادب کی مسخ کتابوں میں سے صرف آپ جیات میرے پاس ہے۔ باقی جب میسر ہوں۔ بھجوا دیجئے۔ پہلے ایک سرسری خاکہ بنا لوں۔ اس کے بعد اصل کتابوں کی ضرورت بھی پڑے گی۔ یعنی "سب رس" سے لے کر انارکلی تک۔ لیکن یہ مرحلہ ابھی دور ہے۔ ابھی تو پہلے چند قدم تول رہا ہوں۔

اب کے آپ نے طویل خاموشی کے بعد خط لکھا۔ خط لکھنے کے
 معطل میں آپ نے کچھ موصول کا سار تہہ حاصل کر لیا ہے۔ دو چار
 دن سے زیادہ ادھر ادھر نہیں ہوتے۔ اس لئے بارانِ کرم میں غیر
 معمولی تاخیر ہو۔ تو ہم مرجھانے لگتے ہیں۔ آج کل آپ کے کام کاج
 کا کیا حال ہے۔ کیا اب بھی آپ کا وہی منصب ہے جو سابق وزارت
 کے زمانے میں تھا؟

مجید لاہوری، رشید اختر ندوی اور حضرت اور دیگر احباب کو
 سلام پہنچے۔ امید ہے بھابی کا مزاج اب بخیر ہوگا۔ اور تشویش
 کی کوئی وجہ باقی نہ ہوگی۔ انہیں میرا مودبانہ سلام کہیے۔
 خاکسار

بخاری

نیویارک

۲۲۔ اکتوبر ۱۹۵۳ء

برادر محترم

سلام مسنون! گرامی نامہ ملا۔ بخاری میں آپ اکثر یاد آئے۔ جہاں
 گردی سیر و سلامت کے لئے خوب ہے۔ لیکن قدرت کو کوئی ایسا انتظام

ضرور کرنا چاہیے۔ کہ انسان بیمار ہو تو اپنے وطن ہی میں۔ اور دفن ہو
 تو اپنی ہی مٹی میں۔ علاج تو یہاں سے بہتر ساری دنیا میں نہیں۔ لیکن
 روح کے زخم بھرنے نہیں پاتے۔ روح کی کھیلائی احباب ہی سے
 ہو سکتی ہے۔ آپ خط جلدی لکھتے تو اچھا ہوتا۔ میں جواب نہ دے
 سکتا لیکن آپ کی آواز تو سن لیتا۔ بہر حال اب بھی آپ کا خط
 برکت کا موجب ہوا۔ یہ آپ نے خوب پوچھا کہ علالات کیا تھی۔

جو ہم جیسے اہل دل ہیں۔ وہ کب تک دل کو سنبھالے رہیں گے۔
اس سے پہلے تو کوئی آثار نہ تھے۔ لیکن یہ پچھلا سال مجھ پر بہت
گراں گذرا۔

پاکستان کا سفر اتنا مختصر تھا کہ اس سے جسم کو کچھ آرام نہ
ملا۔ اخراجات بہت زیادہ ہوئے۔ واپس پہنچا تو بعض بندگان کی
تنگ نظری سے جو خطرے لاحق تھے۔ وہ صحیح ثابت ہوئے پھر تنخواہ
کم ہوئی۔ پھر ریٹائرمنٹ کا نوٹس ملا۔ جب مجھ سے مابوکس ہوئے۔
تو امریکنوں نے اپنا ایک آدمی کھڑا کیا۔ اور اسے منتخب کر دیا۔ پھر
ہمیں سرکار پاکستان سے ایک سال کی توسیع ملی۔ اس میں تلاش
معاش شروع کی۔ کچھ تدبیریں کامیاب ہوتی نظر آنے لگیں۔ تو بیمار
پڑ گیا۔ اب اچھا ہوں۔ اللہ کا شکر ہے۔ پھر کوشش شروع کر
دوں گا۔

لاہور کے کاٹے کا علاج نہیں۔ آپ ہر دلعزیز انسان ہیں۔ جہاں
جاتے ہیں۔ آپ کے گرد عقیدت مندوں کا حلقہ ایک مستقل عرس شریف
کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ تاہم آپ کے لبوں سے بھی اکثر لاہور
کے نام پر آہ نکلی۔ خلیفہ حکیم کو میں نے ایک خط کئی مہینے ہوئے
لکھا تھا۔ دست بستہ عرض بھی کی تھی۔ کہ جواب ضرور کیجئے گا۔ لیکن
وہ بے کار یا کار انسان خط کے معاملے میں حد درجہ کاہل ہے۔ امتیاز
سے بھی سلسلہ پیام کچھ عرصے سے بند ہے۔ بشری ہاشمی کا ایک خط دراز
حدیقت امیر (البتہ چند دن ہوئے آیا تھا۔

لیجئے ایک اور کام آپ کے کرنے کا نکل آیا۔ ایک پبلشر نے مجھ
سے ایک بچوں کی کہانی مانگی ہے۔ (تخمیناً ایک ہزار الفاظ) یہ ایک
مجموعہ میں شامل کی جائے گی۔ جس میں سب دیگر اقوام کے بچوں

کی کہانیاں بھی شامل ہوں گی۔ کہتے ہیں۔ کہانی ایسی ہو جو قدیم
 FOLKLORE پر مبنی ہو۔ دس بارہ سال کی عمر کے بچوں کے
 لئے سوزوں ہو اور ممکن ہو تو ایسی ہو کہ اس سے صلح و آشتی کا
 سبق اخذ کیا جاسکے۔ نہ قتال و جدال کا۔ یعنی وہ ہو ٹیٹھہ رسی کہانی
 جو بھی بچوں کے کام کی۔ اور یو۔ این کے نصب العین پر بھی پوری
 اترے۔ اب ایسی کہانی کا انتخاب وہی لوگ کریں گے۔ جن کی
 کودکی اخبار پھول میں مفعول قاعدا تن کر کے کئے۔ ن۔ بو۔ پہلے خیال
 آیا۔ اقیانوس سے پوچھوں۔ لیکن ان سے جلد جواب لی توقع نہیں۔ اس
 لئے آپ کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ عباس جس تو نرا ہی ہی میں ہیں۔
 آپ دونوں مل کر ایسی کہانی انتخاب نہ کر کے تو اور کون کرے گا۔
 کہانی اُردو میں لکھا دیجئے۔ میں اس کا ترجمہ یہاں کر لوں گا۔ اور
 عباس سے کہئے کہ ان کی کہانیوں کا ترجمہ بھی جاری ہے (یعنی بیماری
 تک جاری تھا اب پھر متوجہ ہوں گا) امین الدین کے انتقال کی خبر
 آپ کے خط سے ملی۔ زبیدہ نے میری بیماری کے پیش نظر اسے
 مجھ سے پوشیدہ رکھا۔ حسرت کشمیری اور مجید لاہوری دونوں کو
 میرا سلام۔ وہ کشمیری اور لاہوری ایسے ہی ہیں۔ جیسے میں پاکستانی
 ہوں۔ ہم تینوں کی قسمت ایک ہی فرشتے نے تصنیف کی تھی۔ جس
 دیار کو قریہ ہم نے اپنا یا۔ اسی سے اخراج ہوا۔ عنقریب ایک
 اور خط لکھوں گا۔ پیاس نہیں نہیں۔

خاکسار

بخاری

نویارک

۲۱ نومبر ۱۹۵۷ء

برادریہ محترم!

سلام سنون! گرامی نامہ نیکم نومبر کا لکھا ہوا ملا۔ مختصر لیکن

بہر حال کمسوب محبوب۔ دل سیر نہ ہوا۔ آنکھیں تو روشن ہوئیں۔ اس
اساتیں بستیر ہنسی کا خط بھی ملا۔ جن دنوں آپ لاہور میں تھے۔
اور دھڑا دھڑا ضیافتیں آپ کے اعزاز میں ہو رہی تھیں۔ ان دنوں
وہ بے چارہ ٹائیٹنٹ میں مبتلا تھا۔ اور ماتم کر رہا تھا۔ کہ آپ کی
صحبت سے محروم رہا۔ ان کے میرے درمیان خط و کتابت نے حال
آسی میں ایک مخصوص رنگ اختیار کر لیا ہے۔ وہ بھی بیمار میں بھی
بیمار۔ وہ بھی برلین پنشن میں بھی برلین پنشن۔ دونوں کے خط
ایک ہی زمین میں ہوتے ہیں۔ البتہ ان کے کلام میں سوز مجھ سے
زیادہ ہوتا ہے۔ اور نزاکت طبع بھی مجھ سے وافر۔ چغتائی کے خطوط
بھی حال میں مسلسل آئے۔ وہ اپنے گنبد علاج میں میری بیماری سے
بے خبر رہتے۔ چنانچہ ان کے خطوں کا لہجہ بے حد تندرست ہے۔
اور اکثر مقوی ثابت ہوا ہے۔ ایک کہانی انہوں نے اس دوران
میں لکھی ہے۔ دیہات بعینہ راز ہے۔ آپ ہی سے ذکر کر رہا
ہوں۔ بات باہر نکلی تو وہ برہم ہو جائیں گے، کسی قلم ساز کمپنی
کو یہ افسانہ بختنا چاہتے ہیں۔ مجھے یہ خدمت سونپی ہے۔ کہ اس
کا پیسے انگریزی میں ترجمہ کروں۔ اور پھر دوستانہ دلالی کروں۔ خدا
کرتے ایسا ہی ہو۔ اور ان کی سب توقعات پوری ہو جائیں۔ لیکن
میرے اختیار و اقتدار و رسوخ کا اندازہ لگانے میں حاشیہ دکھائی ہے۔
ڈاکٹر بٹنک کا نام تجویز کر ڈالا ہے۔ کہ وہ ہی اس قسم کے افسانے

کو نبھائے گا۔ اور اس آپ یقیناً جانتے ہوں گے۔ بلکہ دانت کاٹنے کی روٹی ————— وغیرہ وغیرہ۔

آپ کا اور عباس کا شکریہ! یہ بچوں کی کہانی بس لی جھے تلاش ہے۔ محض خیراتی کام ہے۔ یو۔ این کی بعض ادھیڑ بھر کی عورتوں نے ایک مضمون کا "گلد" بنایا ہے۔ اس سے پہلے مختلف اقسام کے کھانوں کے ترکیبی نسخے شائع کر چکی ہیں۔ اب کہانیوں کی طرف متوجہ ہوئی ہیں۔ میں الا قوامی پن، ماوریت، اور تصنیف

تینوں پرندوں کو ایک پتھر سے مارنا چاہتی ہیں۔ امتیاز کو کیا ہوا کبھی خط لکھنے کا نام نہیں لیتے۔ کئی مرتبہ میں نے پہل کی۔ مگر ہر مرتبہ تھک کر بیٹھ گیا۔ پھر چند سے اور احباب کی وساطت سے ان کو سلام شوق بھیجتا رہا۔ وہ بھی قبول نہ ہوا۔ تو اسے بھی ترک کر دیا۔ اس بے چارے پر کچھ عجیب سی کہولت سی چھا گئی۔ سٹوڈیو اور گھر کے آگن سے باہر نہیں نکلتا۔ زبیدہ کے خط سے معلوم ہوا۔ کہ حجاب اور یاسمین کو ٹائیٹ لائٹ لایا۔ خدا رحم کرے۔ یہ خبر سنی کر بہت رنج ہوا۔ لیکن کیا کروں۔ امتیاز تک عرض نیاز کرنے کے سبب رستے بند معلوم ہونے ہیں۔ کبھی آپ سے عشق اللہ ہو تو میرا سلام کہتے گا۔

دو تین دن ہوتے حمید الدین (ابن ڈاکٹر صدر دین مرحوم) امریکہ پھر وارد ہوئے۔ ان سے لاہور کا ذکر دیر تک رہا۔ صوفی کی بے عنایتی سے طوم لکھے۔ کچھ تو اس میں حمید الدین کی اپنی تنگ نظری بھی شامل تھی۔ لیکن اس سے قطع نظر کچھ حقیقت بھی ان کے بیان میں نہ درستی۔ حمید کے خیال میں لاہور بے حد خزاں زدہ ہے۔ تیارہ بیٹے کے بعد محتسب تنگ کرتے ہیں اور بہر راہرو کو آفارہ سمجھتے ہیں۔ کچھ حال عابد علی عابد کا بھی بیان کیا۔ اس کی زندگی بھی سدا نوسوس

رہتی ہے۔ لیکن اگر ماندھیے ماند کا درد کرتے معلوم ہوتے ہیں۔
 چاہتا ہوں کوئی پیشتر ہم سے ٹیکسٹ بک کھولے۔ علم بھر
 یہ کام نہیں کیا۔ لیکن اب یہ گناہ کرنے کو بھی دل چاہتا ہے۔ کسی
 کو ٹھٹھل کر تو ذرا دیکھتے۔ میں تے ہاشمی سے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔
 آپ لوگ خیال رکھیں تو ممکن ہے۔ کوئی سبیل نکل آئے۔ تاکہ
 اس عمر میں جب میں خود یونیورسٹی وغیرہ میں نہیں۔ میری قیمت
 کر گئی ہوگی۔ تاہم کوئی عقل کا اندھا نہیں گانٹھ کا پورا مل جائے تو
 عجیب نہیں عمر میر میں ”نہ“ کہتا رہا۔ اب ”ماں“ کہنے کو تیار ہوں۔
 ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔

اور بھی باتیں کہنے کی ہیں۔ لیکن آئندہ خط میں ان کا ذکر کروں
 گا۔ آپ کو جب بھی خط لکھنے بیٹھتا ہوں۔ جیرا اسے ختم کرنا ہوں۔
 درنہ عاشق کی داستان اے محبوب کب ختم ہوتی ہے۔ حسرت اور
 خیر ملا ہو رہی اور اختر ندوی اور عباس اور دیگر احباب کو میرا نام
 اور شوق یاد دلا دیجئے گا۔ تازہ تازہ خبر آئی ہے کہ ڈان پر عتاب
 نازل ہوا۔ ڈان اور حکومت کے باہمی عشق کے رموز آج تک سمجھ
 میں نہیں آئے۔ موہانی کا شعر یاد آیا کہ

عشق کامل کے دلوں میں مرغوب

مخمسِ دمسلی و شامِ تنہائی

خدا ملنے رہیے۔

خاکسار

بخاری

نیویارک
۲۱ نومبر ۱۹۵۳ء

برادر محترم!

سلام مسنون! تجویز ہے کہ میں ایک کتاب ایڈٹ کروں جس کا عارضی نام فی الحال "A STUDY OF PAKISTAN" قرار پایا ہے۔ پندرہ ابواب ہوں گے۔ ہر باب میں پاکستان کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی ڈالی جائے گی۔ مصنف ایک نہیں بلکہ کئی ہوں گے۔ پبلشر کولمبیا یونیورسٹی پریس یا اسی پائے کا کوئی اور امریکن ناشر ہوگا۔ کئی نفاذ اور نقشے وغیرہ بھی کتاب میں شامل ہوں گے۔ مالیات کا باب غالباً محمد علی وزیر خزانہ لکھیں گے۔ بعض تاریخی موضوعات پر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کو دعوت دی گئی ہے۔ چند ابواب راقم الحروف لکھے گا۔ ایک باب پاکستان کے جرنلزم پر ہے۔ دو ہزار الفاظ سے پانچ ہزار الفاظ تک۔ میرا خیال ہے کہ آپ سے زیادہ موزوں کوئی شخص نہ ہوگا۔ آپ اردو میں لکھ ڈالیں۔ انگریزی میں ترجمہ یہاں ہو جائے گا۔ ثواب تو ظاہر ہے۔ شاید خرچے کی صورت بھی نکل آئے۔ ابھی کہہ نہیں سکتا۔ کتاب بہر حال دنیا بھر میں مشہور ہوگی۔

مضمون عالمانہ ہونا چاہیئے اور آپ کے قلم سے توقع بھی یہی ہے۔ قارئین کے دو پہلو مد نظر رہیں۔ اول وہ پاکستان کے جرنلزم سے محض بے خبر ہوں گے۔ دوم وہ خود جرنلزم کے نشیب و فراز کو اچھی طرح سمجھتے ہوں گے۔ کچھ سلسلہ کلام اس قسم کا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ تقسیم سے پہلے ہمارے ہاں اخبارات کی کیا حالت تھی۔ تعداد کیا تھی۔ اشاعت کیا۔ لکھنے والے ایڈیٹر اور مالک کون؟ اخبارات کی چال ڈھال کیا تھی؟ سیاست کے

کون سے پہلو اڈیٹر کو مرعوب تھے؟ تقسیم کے بعد جر نلزم میں کیا انقلاب آیا۔ پرسیوں کی کیا حالت ہوئی۔ انقلاب کے بعد تو ان دن کہاں کہاں آن کر ٹھہرا۔ اُردو کے کتنے اخبار ہیں۔ انگریزی کے کتنے؟ ہنگامی کے کتنے؟ اشاعتیں کیا ہیں؟ موضوعات کیا ہیں؟ اس

پانچ چھ سال کے عرصے میں سب سے زیادہ بحثیں اخباروں میں کن موضوعات پر ہوئیں اور کس قسم کے خیالات کا اظہار ہوا اور اخبارات کی تیاری کیوں کر ہوتی ہے۔ (لیٹو ٹائپ وغیرہ) اشاعتیں کیا ہیں۔ حلیہ اور نقشہ کیا ہے۔ روزانہ ہفتہ وار ایڈیشن، ادبی مضمون، شعر، مجید لاہودی وغیرہ وغیرہ) پرسی کے قوانین کس قسم کے ہیں؟ کیا اخباروں کی زد میں آتے ہیں۔ یا اکاؤنٹ کا (ایسی باتیں احتیاط سے لکھنی پڑیں گی۔ لیکن نہ اس قدر کہ بالکل ہی بے ذوق ہو جائیں۔ اسی لئے آپ کا خیال آیا کہ آپ میانہ رو مضمون اعلیٰ درجے کا لکھ سکتے ہیں) مضمون بہر حال معلومات سے پُر ہونا چاہیے۔ اور یہ آپ کے لئے مشکل نہیں۔ آپ کے مختصر سوانح میں خود لکھوں گا۔ کہئے کیا خیال ہے؟ خدا کرے آپ کا جواب اشہات میں ہو۔ مضمون کے لئے آپ کو کتنی مہلت درکار ہوگی۔ اردو کو ایک، دو مہینے کی مہلت دی گئی ہے۔ یہ کم نہیں اور امید ہے کہ آپ کو بھی منظور ہوگی۔ جواب سے سرفراز کیجئے۔

ایک باب ادبی رجحانات پر ہے۔ وہ خود لکھنے کا ارادہ ہے۔ لیکن مواد اور مصالحہ یہاں تاپید، یہ تو ایک طرف، یہاں مجھے یہ تک معلوم نہیں، کہ رسالے کون کون سے اور کتنے نکلتے ہیں۔ باقی ایسے مضمون کے لئے جو معلومات درکار ہیں۔ اس کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔ عباس کو بیگار میں پکڑیئے اور ان سے کہئے کہ

میری مدد کریں۔

جرنلزم کے سلسلے میں خیال آیا۔ کہ اگر کوئی مزے دار اخباری
نظیں پیش نظر ہوں۔ تو ان کا ترجمہ بھی غورنتہ شامل کیا جاسکتا
ہے۔ اور ہاں کارٹونوں کا ذکر بھی کیجئے گا۔

ذوالفقار سے ریڈیو پر کھواڈل گا۔ لیکن ذرا وقفے کے بعد۔
وہ آج کل پپو کی شادی کے انتظام میں منہمک ہوگا۔ شادی مورخہ
۲۵۔ دسمبر کو ہے۔ آج ذوالفقار کا خط آیا ہے۔ آج ہاشمی کا خط
بھی آیا۔ درسی کتابوں کا بازار مندا معلوم ہوتا ہے۔ بقول ہاشمی
کے ہزاروں لاکھوں کا زمانہ گیا۔ اب تو کوئی دو تین ہزار روپیہ
ساں کا بھی لے مرے۔ تو غنیمت ہے۔ لیکن اس نے مزید تفتیش

کا وعدہ کیا ہے۔ ایک کتاب "PUNJAB PRELUDE" نامی میرے پاس ریویو کے لئے آئی ہے۔ مصنفہ کا نام مس

"PRIOR" ہے۔ جو کچھ عرصہ ہوا۔ اچھی کسن کالج میں پڑھاتی
تھیں۔ شاید اب بھی پڑھاتی ہوں۔ پاکستان اور پنجاب پر فدا
ہیں اور ہندوستان سے متنفر۔ بار بار ثابت کرتی ہیں کہ پنجابی
اور انگریز دونوں ایک ہی نسل سے ہیں۔ ایک باب ہاشمی
صاحب کے خاندان پر (بہ تفسیر اسماء) ہے اور پیار سے لکھا ہے۔

ہیرا منڈی کے جلوے سے بھی واقف ہیں۔ ایک حصہ بوائے اینڈ
گرل ٹریبل کے متعلق ہے۔ مصیبتہ "بوائے اینڈ بوائے ٹریبل" کا حال

خاکسار

بھی بیان کیا ہے۔

بخاری

آج یہاں کے اخبار میں خبر چھپی ہے۔ کہ کابینہ میں ردوبدل

ہونے والی ہے۔ نیریز کہ فوج کے افسروں میں بددلی ہے۔

اللہ اپنے حفظ و امان میں رکھے اور ہر قسم کی آفت سے بچائے۔

ہم یہاں پاکستان کی بہبود اور پاکستانیوں خصوصاً اپنے احباب
و اقربا کی بہبود اور سلامتی کے لئے دست بدعا رہتے ہیں۔

نیویارک
۹ دسمبر ۱۹۵۳ء

برادر محترم!

سلام مسنون! گرامی نامہ ملا۔ جو ۳۰ نومبر کا تھا۔ یہ آپ کے
مفصل تر خطوں میں تھا۔ لہذا بہت لطف آیا۔ اور ذہن نے یہی
چوڑی مسافت مزے لے لے کر طے کی۔ مضمون کے متعلق عرض یہ
ہے کہ قبل پاکستان کے ان اخباروں کا تذکرہ دل سے خالی نہ ہوگا۔

جو موجودہ پاکستانی علاقہ سے شائع ہوتے تھے۔ تاکہ اس علاقے کی
صحافتی مدوجزر کا کچھ حال معلوم ہو۔ نیز ان اخباروں کا ذکر بھی
مناسب ہوگا۔ جو پاکستانی علاقے سے شائع تو نہ ہوتے تھے۔ لیکن
جن کا پاکستانی تحریک سے گہرا تعلق تھا۔ مثلاً "ڈان" اتنا کہنے کے
بعد یہ بھی کہنا لازم ہے کہ میرا یہ مشورہ کچھ فضول سا ہے۔ دراصل
پاکستانی صحافت کا حال بیان کرتا ہے۔ اب ان کا پس منظر بیان
کرنے کے لئے کن چیزوں کی ضرورت ہے۔ یہ آپ کے حُسن مذاق
اور احساسِ ربط پر چھوڑتا ہوں۔ اس سے بڑھ کر کسوٹی بھی
کوئی نہیں۔ البتہ یہ خیال رہے کہ فارین انگریز اور امریکن ہوں
گے۔ اور پس نتیج سے یہ باب کتاب میں شامل ہوگا۔ اس سے
پاکستانی معاشرت پر روشنی ملنا مقصود ہوگا۔ غیر ملکوں کے لوگ
ایسیائی ممالک کے بارے میں اکثر باتوں سے بے خبر ہیں۔ اور
معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ایشیا کے "لوگ" کس قسم کے لوگ

ہیں۔ کیا کر رہے ہیں۔ کیا سوچ رہے ہیں۔ کس رُخ جا رہے ہیں۔ رُخ کس کے ہاتھ میں ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان خیالات کے زیرِ عنوان صحافت کے بارے میں بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ کہ اس آلہٴ جمہور کا ایشیا میں استعمال کیا ہے۔ کون کر رہا ہے؟ کون لوگ اس سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایسی باتیں کہتے لوگ اخبار خریدتے ہیں اور اگر ہر اخبار کئی ہفتوں سے گزرتا ہے، کتنے لوگ اخبار پڑھتے ہیں۔ یہ لوگ کس طبقہ کے ہیں۔ کس قسم کی خبریں زیادہ جاذبِ توجہ ہوتی ہیں۔ کس قسم کی خبریں نادر یا مفقود۔ کون سے طبقے اخبار سے بالکل ہی مامون (یا محروم ہیں) اس نوع کی باتیں یہاں لوگوں کے لئے از حد دل چسپ ہوں گی۔ لوگوں کو یہاں کرید رہتی ہے کہ ایشیائی ممالک جنہوں نے حال ہی میں آزادی حاصل کی ہے۔ اپنی آزادی کو کیا لباکس پہنا رہے ہیں۔ اس کے تحت میں آپ جانتے ہیں۔ صحافت ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ لوگ اکثر اس کے متعلق سوالات پوچھتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب میں کراچی میں تھا۔ مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ آئین کے متعلق اچھی بُری جتنی بھی بحثیں ہو رہی ہیں۔ وہ اخبارات کے کالموں ہی میں ہو رہی ہیں اور ممالک میں ان کے علاوہ انجمنوں، سیاسی جماعتوں، جلسوں اور لیکچروں میں بھی مختلف آراء کا اظہار کیا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوا۔ جہاں تک میرا خیال ہے یا تو لوگوں نے دستوں کے حلقوں میں بحثیں کیں۔ یا اخبارات میں آئینی اقدامات کے عالم و مابلیہ پر بحث ہوئی اور سبب۔ اب اگر میرا اندازہ صحیح ہے تو یہ بات بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اب اس قسم کی کئی باتیں آپ کے بہار آفریں دماغ کو خود ہی سوچیں گی۔ آفتاب کو چراغ

کیا دکھاؤں۔ " ماہِ نوہ" والا مضمون مجھے بھجوا دیجئے۔

"ادبی رجحانات" کے متعلق عرض کیا تھا۔ کہ میری جانب سے عباس سے استمداد کیجئے۔ اس کے متعلق آپ نے کچھ نہ فرمایا۔ آپ کہیں تو میں اس سے براہِ راست خط دکتا بت کروں۔ شاید آپ کو اس میں سہولت ہو۔ بچوں کی کہانی کے متعلق آپ کی ماسعی کا شکر یہ! اجازت کے خط کا انتظار کر رہا ہوں۔

ہاشمی کہتا ہے۔ کتابوں والی بات یہ ہے کہ حالات قطعی وہی ہیں۔ جو اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں۔ ماں سالک صاحب کراچی کے امریکن پبلیشرز کو اور ٹٹول لیس تو بہتر ہوگا۔ چنانچہ ہاشمی صاحب کا ارشاد آپ کے گوش گزار کر رہا ہوں۔

اس خط کو ختم کرتا ہوں۔ عنقریب ایک اور خط بلاوجہ لکھوں گا۔ ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے۔ صحت بہت خراب ہے۔ آج چوہدری ظفر اللہ خاں یہاں سے رخصت ہوئے۔ سیاحت کرتے کراتے ۵ جنوری کو کراچی پہنچیں گے۔ اسمبلی ختم ہوئی۔ اب نسبتاً ذہن پر بوجھ کم ہوگا۔

خاکسار

بخاری

خط کے پتے پر میرا نام لکھ دیا تو منصب لکھنے کی ضرورت نہیں۔ دیکھا آپ کو اس کے لئے بہت ہی خفی ظلم استعمال کرنا پڑا۔ اس سے مجھے خفت ہوئی۔
تیویارک

جانِ برادر!

سلام مسنون! کئی دن سے آپ کا خط نہیں آیا۔ خدا کرے

آپ فریت سے ہوں۔ آپ کا آخری خط اغلباً وہ تھا۔ جس میں آپ نے "زمزمہ" کے تاریخی حالات لکھ بیٹھے تھے۔ اس کا میں نے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اچھا خاصا پُر از معلومات مقالہ بن گیا۔ اور اس کی بدولت میں مفت میں تاریخ دان بن گیا۔ ہینگ لگی نہ پھنگری۔ ترجمہ بھی کیا نعمت ہے۔ اسی لئے تو احباب سے عرض کرتا ہوں کہ ترجمہ کے لئے مصالحہ فراہم کیجئے۔ عیاں نے اس بارے میں دستگیری کا وعدہ کیا تھا۔ ایک خط بھی اس مضمون کا انہوں نے لکھا تھا۔ پھر خاموش ہو گئے۔ میں تو یاد دہانی کرا دیجئے گا۔ آج کل پڑمردہ رہتا ہوں۔ شخصیت کی زد میں آ گیا ہوں۔ تجویز ہے کہ اس عہدے کو فوراً یعنی ابہریں سے سفیر سے گھٹا کر وزیر کر دیا جائے۔ اس کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیے تھا۔ کہ مجھے یہاں سے بدر کیا جاتا۔ لیکن ارباب اقتدار نے اتنا کرم ضرور کیا کہ اگر مجھے وزیر بننا بھی منظور ہو تو یہاں سے نہ نکالا جاؤں گا۔ میرے حالات آپ جانتے ہیں۔ جس عارضے یعنی سرطان کا خطرہ لاحق ہے۔ اس کی وجہ سے میں یہاں سے ہل نہیں سکتا۔ چنانچہ یہی منظور کر لیا۔ مرتا کیا نہ کزنا۔ اب نہ معلوم یہ بھی کب تک ہے۔ اکتوبر میں اپنی مستقل ملازمت سے ریٹائر ہو رہا ہوں۔ وقت گزر گیا۔ اور ہمیں اس کا احساس بھی نہ ہوا۔ ریٹائر ہونے کا سال اور مہینہ بھی یاد نہ تھا۔ خط لکھ کر وزارتِ تعلیم سے دریافت کیا۔ جواب آیا۔ تو چونک اٹھا۔ نہ معلوم اکتوبر کے بعد کیا حشر ہو۔ تو سب سے بڑے اور بڑے تو کیا شرائط پر اور کیا کام مجھ سے لیا جائے۔ میں بھی عجیب خوش فہم ہوں۔ اب تک یہی عزم تھا کہ اس عہدے پر ہم نے وہ خدمت گزاری کی ہے۔ اور رستم کی گور پر وہ لات ماری ہے کہ ہمیں یہاں سے کہیں اور منتقل کرنے کا خیال بھی کسی کو نہ آئے گا۔ لیکن ملازمت تو ایک

چکی ہے۔ چکی میں دلنے کی کیا حیثیت ہے کہ چاہے تو پسے اور چاہے تو نہ پسے۔ عرض معروض تو کی ہے۔ دیکھئے کیا حشر ہو۔ آپ جانتے ہیں۔ میں عمر بھر جنبہ داری سے دور رہا ہوں۔ محض خدمت گزاری اور خدا پر اعتماد رہا ہے۔ کون ہو گا۔ جو اپنی مصلحتیں چھوڑ کر میری بہبودی کا بیڑا اٹھائے۔ بہر حال مترسک از بلائے کہ شب درمیان است۔ محمود نظامی یہاں سے گزرے۔ دو شاہیں ان کی صحبت میں بسر ہوئیں۔ زندہ دل انسان ہیں۔ اس بازار میں کانسخہ ملا۔ بعض مقامات اس میں نہایت دل چسپ ہیں۔ بعض خطیبانہ ہیں۔ دونوں کا لطف اپنی اپنی جگہ آیا۔ بعض لطیفے اس میں نادانستہ وارد ہوئے ہیں۔ مثلاً صفحہ ۱۱۱ "بعض حاشیہ نشین جنہیں میرے گوشت کی چاٹ پڑ چکی ہے" جو معنی فوراً ذہن میں آئے وہ اسفل کی طرف راجح تھے۔ لیکن دوبارہ غور کیا تو اصل معنی روشن ہوئے۔ آخری باب میں جو پنجابی گیت شامل کئے ہیں۔ ان میں سے بعض کئی روز داغ میں گونجتے رہیں گے۔

۵ میری لگدی کسے نہ دیکھی تے ٹڈی نوں جگ جاندا

۶ اگ بال کے دہوئیں دے پج ردواں

۷ ماچھے دیئے بند بوتلے۔

۸ تیرے لونگ دا پیا لٹکارا۔ تے لایاں نے ہل ڈک لئے

کتنا تشہ ان بے ساختہ جملوں میں بند ہے۔ پج کے معنی بچے

نہ آتے تھے۔ معلوم ہوا۔ "آڑ" کے مترادف ہے۔ چلنے یہ بھی

معلومات میں اضافہ ہوا۔ اس خط کی رسید فوراً بھیج دیجئے گا۔

آخبار سے معلوم ہوتا ہے کہ اب پاکستان میں ہر طرح امن و امان

ہے۔ خدا ہم سب کا نگہبان ہو۔

خاکسار

بخاری

بڑا دردِ محترم!

سلام مسنون! اس ڈاک میں دو خطے۔ ایک آپ کا۔ ایک والد کا۔ دونوں کے جذبات ایک سے تھے۔ گو مضمون مختلف تھے۔ دونوں کا اثر طبیعت پر ایک سا ہوا۔ فی الحال انقلوبتیرا میں مبتلا ہوں۔ تیز بخار ہے اور ڈاکٹر کے مفصل معائنے کے بعد معلوم ہوا۔ کہ اس جسم فانی میں کئی اور تعاقص پیدا ہو چکے ہیں۔ جن کا مجھے گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ قلب کی حرکت، خون کا دباؤ، جگر و معدے کی حالت، ان میں سے کوئی بھی صحیح نہیں۔ بہر حال اب یہ توقع تو ہمیں بھی نہ تھی۔ کہ زندگی ابدی ہے۔ نہ اس بات سے لاعلم تھے۔ کہ جوانی آنی جاتی پھیر ہے۔ افسوس صرف اس بات کا ہے کہ کشاکش غم پنہاں نے وقت سے پیسے بے کار کر دیا۔ بہر حال بقول ابلا و ہلیر و لاکس کی اس نظم کے جس کا ترجمہ آپ کسی ناسے میں مشاعروں میں نود شور کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ رونا تنہائی پسند ہے۔ اس لئے اب کیا آپ کی سمع خراشی کر دوں۔ بہتری کر چکا ہوں۔

آدم بر سرِ مطلب۔ حالات وہی ہیں۔ جو آپ نے بیان کئے ہیں۔ پالاں اور طوقی زریں کے متعلق آپ نے جو نظریہ بیان کیا ہے۔ وہ بھی حرفِ برف صحیح ہے۔ میری صرف اتنی درخواست تھی۔ کہ آپ کو میرے اخلاص یا مستعدی پر بھی شبہ نہ ہونا چاہیے۔ میرے خط کا مطلب اس سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ کہ آغذ لیب مل کر کریں آہ و زاریاں۔ مجھ سے جو کچھ بن پڑا۔ جب بن پڑا۔ میں دریغ نہ رکھوں گا۔ اس میں کوتاہی ہو تو اپنی روسیا ہی سمجھوں گا۔ کہنا صرف یہ تھا کہ میرے ہاتھ پاؤں اس وقت بُری طرح بندھے ہوئے ہیں۔ اس لئے میری بے بسی کو میری ہی محرومی سمجھیے۔ اس بے اعتنائی پر معمول

نہ کیجئے۔ فی الحال اتنا کیجئے۔ کہ لاہور میں جو صاحب اختیار ہیں۔ ان سے کسی وقت طے۔ اختیار کی معیت میں ملنا ہو تو اور بھی بہتر ہوگا۔ دو ایک دن میں انہیں بھی پیغام بھجوں گا۔ اور جو ترکیب میرے ذہن میں آئی۔ وہ انہیں سجاوٹوں کا۔ طے وقت میرا نام بھی لے دیجئے اور کہیے کہ میں اس کے ایما سے مل رہا ہوں۔ برادر محترم ان کشمکشوں میں کئی معرکے اور مرحلے پیش آتے ہیں۔ لا محالہ مسلسل کوشش اور صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ قسمت یاد رہے تو کامرانی جلد نصیب ہو جاتی ہے۔ ورنہ بعض اوقات شکب آزما صبر کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ وہ باتیں ہیں۔ جو آپ کہیں اور میں سنوں۔ برعکس اس کے ہیں آپ کو نصیحت کر رہا ہوں۔ میں مجبور بلکہ معذور نہ ہوتا۔ تو آپ کو اس معاملے میں ذرا بھی تشویش نہ ہونے دیتا۔ لیکن کیا کروں۔

نہ کبوتر حرم من نہ بدست جام جم من
کہ نہ بام من بلندے نہ کند من دروازے

مجھے اس خط کا جواب ضرور دیجئے۔ خواہ جواب پریشانی کے سوا کچھ نہ ہو۔ کم از کم اپنی پریشانی میں مجھے ضرور شریک کر لیا کیجئے۔

آپ کی محبت، شفقت، عوفطرت کی بدولت بسا اوقات مجھے تقویت نصیب ہوتی ہے۔ جب آپ پریشان ہوں۔ تو یہ گوارا نہیں کہ مجھے اس پریشانی کا حصہ نہ ملے۔ میرا اختیار ہوتا۔ تو میں آپ کے پاس اس کا عشر عشیر بھی نہ رہنے دیتا۔

میرا دماغ کا معاملہ فی الحال از حد تازک اور بہت مخدوش مرحلے میں سے گزر رہا ہے۔ کبھی فرصت ہو تو من موہن سے مل

لیجئے۔ شاید وہ آپ کے مشورے یا مدد کے محتاج ہوں۔ مجھ میں
اب اتنی ہمت نہیں۔ کہ سعی کر سکوں۔ صوفیا کا توکل بزدل اور
کمزور ہی ہے۔ لیکن کمزور کے پاس اس کے سوا اور مسلک بھی کیا ہے۔
آپ کی بجا بھی سلام کہتی ہیں۔ آپ کو بھی اور گھر کے لوگوں کو بھی۔

خاکسار

بخاری

۱۳۔ تعلق روڈ نئی دہلی

۱۹۔ دسمبر

برادر محترم!

سلام مسنون! فی الحال نیوز ایجنسیاں غیر انگریزی اخبارات کو بھی
خبریں انگریزی ہی میں بھیجتی ہیں۔ اور اخبارات خود اپنے مندرجہوں سے
ان کا ترجمہ کرا کر چھاپتے ہیں۔ اس سسٹم کے نقائص یہ ہیں۔
۱۔ نیوز ایجنسیوں کو خبریں جمع کرنے کے لئے لا محالہ ایسے کارسپانڈنٹ
رکھنے پڑتے ہیں۔ جو انگریزی سے کا حقہ واقف ہوں۔ محض ویسی
زبانیں جاننے والے کارسپانڈنٹ (خواہ انہیں اپنی زبان میں کتنی
ہی مہارت حاصل ہو) کارسپانڈنٹ نہیں بن سکتے۔

۲۔ تمام واقعات کی خبریں انگریزی ہی میں جمع کی جاتی ہیں۔ حالانکہ
مغضلات میں کئی ایسے دل چسپ واقعات پیش آتے ہیں۔ جو
ویسی زبانوں ہی میں بخوبی ادا ہو سکتے ہیں۔

۳۔ ہر غیر انگریزی اخبار کو ایک دو تین مترجم رکھنے پڑتے ہیں۔
بصاعت کم ہو تو مترجم ٹھوڑے اور کم سواد ہوتے ہیں۔ اور
خبروں کی ہیئت ناقص ہوتی ہے۔ علاوہ برائے ترجمے میں وقت
صرف ہوتا ہے۔

ان نقائص کو رفع کرنے کے لئے نینر دیسی زبانوں کی عزت افزائی کے پیش نظر کیا یہ نہ بہتر ہوگا کہ نیوز ایجنسیاں اپنے کار سپانڈنٹوں سے خبریں ویسی زبانوں ہی میں منگوائیں۔ اور انہی زبانوں میں اخبارات کو بھیج دیں۔ یعنی البوسنی ایٹڈ پریس کا نامہ نگار جینگ (مثلاً) اپنے ہیڈ آفس کو خبر اردو میں بھیجے۔ اور نیوز ایجنسی کا ہیڈ آفس آپ تک وہ خبر اردو ہی میں پہنچا دے، جو آپ بعینہ یا انتخاب و اختصار کے بعد بغیر مترجم کی ضرورت پیش آنے کے اخبار میں چھاپ سکیں۔

اب اگر آپ کو اس میں کوئی فائدہ یا سہولت نظر آتی ہے۔ تو پھر دوسرا سوال یہ ہوگا کہ ایسی خبریں ٹیلی پرنٹر پر کیوں بھیجی جائیں گی۔ اس کا جواب سوائے رومن رسم الخط کے اور کچھ نہیں۔ رومن حروف اور دیسی زبانوں کے حروف کی آپس میں پوری پوری تطبیق ممکن نہیں۔ لیکن شاید اس کی ضرورت بھی نہیں۔ دیسی زبانیں اچھی خاصی آسانی کے ساتھ رومن حروف میں منتقل کی جاسکتی ہیں۔ شاید کہیں کہیں ابہام رہ جائے۔ لیکن سیاق و سباق اکثر ابہام کے رفع کرنے میں مدد دے گا۔ جہاں اس سے بھی کام نہ چلے۔ شاید وقت ہو۔ لیکن ابہامات کا خطرہ تو موجودہ سسٹم میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ بعض تراجم اصل سے بہت دُور جا پڑتے ہیں۔

اس مسئلے پر اپنی رائے سے مستفید فرمائیے اور اگر ہو سکے تو یہ بھی فرمائیے کہ عام طور پر دوسرے دیسی اخبار کس حد تک اس بدعت یا جدت کا خیر مقدم کریں گے۔ ممکن ہے یہ مسئلہ پہلے بھی آپ کے زیرِ غور رہ چکا ہو۔ اور آپ اس کے نشیب و فراز پر دماغ سوزی کر چکے ہوں۔ مجھے اس میں ترقی کے بہت سے امکانات

نظر آئے۔ اس لئے آپ کی طرف رجوع کیا۔ کہ آپ کی رائے
دریافت کر لوں۔ جواب کا منتظر

بندۂ خاکسار

بخاری

برادرِ محترم!

سلام مسنون!

گرامی نامے کا شکریہ! میاں صاحب کی معاملہ فہمی
اور آپ کی معاملہ فہمائی کی بدولت خاطر خواہ فیصلہ ہو گیا۔ کل محکمہ
کے نام چٹرجی کا خط پہنچا کہ پرنسپل کا عہدہ یکم مارچ سے خالی ہو
گا۔ لہذا تجھ پر وقت سبکدوش کر دیا جائے۔ چٹرجی کے ایک نجی خط
اور میاں صاحب کے ٹیلیفون سے معلوم ہوا۔ کہ ڈکنسن یکم مارچ
سے رخصت لے گا۔

اپنا ارادہ اب یہ ہے کہ جنوری فروری کی چھٹی لے لوں۔ بہر حال
دسمبر کے آخر تک قطعی طور پر اس عہدے سے فارغ ہو جاؤں گا۔
آپ کی تگ و دو کا شکریہ دوست وہ ہے جو کہ۔۔۔۔۔ الخ۔
اس مصرعے کے مطابق پکڑنے کے جو معنی نکلتے ہیں۔ ان کے مطابق
دکھڑنے کے کیا معنی ہوتے؟ اور پکڑ دکھڑے کس کو کہتے ہیں۔ ایک
نسخہ مثلاً یہ ہے کہ دوست وہ ہے جو کہ دکھڑے دوست کو۔
لطیفہ۔۔ انگریزی روزمرہ میں رخصت کے وقت ٹا۔ ٹا
کہتے ہیں۔ جس کے معنی گڈ بائی کے ہیں۔ یار لوگوں نے تجویز کیا
ہے کہ چونکہ دہلی کے ارباب اقتدار پر آج کل کے سرمایہ دار
چائے ہوئے ہیں۔ اس لئے دہلی میں جس طرح اسلام و علیکم

کے جواب میں دیکھو السلام کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ٹا۔ ٹا۔ ٹا۔
کے جواب میں اسی لہجے میں برلا۔ ڈالمیا بولا جائے۔ جو لوگ
دیندار ہندو ہیں اور جے رام جی کی وغیرہ کہتے ہیں۔ انہیں چاہیے
اب سری رام (یعنی سرشری رام مالک دہلی کلاختہ طنز) کہا کریں۔ غصے
کے اظہار کے لئے موزوں ترین لفظ "گاندھو" ہے اور اسے "قومی"
گالی بنا لینا چاہیے۔ جاے گاندھو۔

نومبر کے تیسرے ہفتے میں لاہور دورے پر آنے کا ارادہ ہے۔
ملاقات ضرور ہوگی۔ سنا ہے اقبیاز لاہور واپس آ گیا ہے۔ نہ خط
لکھتا ہے نہ ملتا ہے۔ دہلی سے شمال جنوب کو گزر جاتا ہے۔ اور
ہم سے نہیں ملتا۔ جیسے عصمت بچائے بھرتا ہو۔ ملے تو ڈانٹے
گا۔

خاکسار
بخاری

برادرِ محترم!

سلام مستون!

گرامی نامہ ملا آپ نے جو زحمت اٹھائی۔ اس کے
لئے آپ کا ممنون ہوں۔ حالات سے آگاہی ہوئی۔ مجھے میاں صاحب
کے دہلی آنے کا علم نہ تھا۔ کل (یا ممکن ہے آج ہی) چٹرجی کے
یہاں ملاقات ہوگی۔ وہ اور میاں صاحب دونوں کا سفر دہلی ایک
دو مہرے سے غیر متعلق ہو۔ بہر حال میں میاں صاحب سے بھی مل لوں
گا۔ اور آپ کو جملہ کوائف سے مطلع رکھوں گا۔

نہ بیدہ نے آپ کا خط پڑھا۔ آبدیدہ ہو کر آپ کے بچوں کو

دُعائیں دیں۔ کہنے لگیں۔ سالک صاحب تے اس خط میں ہماری واپسی پر ذرا بھی اظہارِ خوشنودی نہیں کیا۔ میں نے کہا میرا خط بالکل کاروباری تھا۔ اس کا ویسا ہی جواب ضروری تھا۔ باقی حساب دوستوں در دل۔ بہر حال عرض نہیں کر سکتا۔ کہ لاہور واپس آنے کے خیال سے زندگی میں ابھی سے کتنی تازگی پیدا ہو گئی ہے۔ جانتا ہوں۔ کہ دس سال کا عرصہ اپنی طبیعت میں اور حالات میں کئی ایسی تبدیلیاں پیدا کر سکتا ہے۔ جس سے وہ پہلے کا سا نقشہ نہ ہم سکے۔ با ایں ہمہ کئی مرتبہ اور کئی موقعوں پر دل کو ٹٹول کر دیکھ لیا ہے۔ اور سب نشیب و فراز دیکھنے، کئی تلخیاں چکھنے اور کئی غلطیاں کرنے کے بعد بار بار اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ سہ

دریں زمانہ رفتہ رفتہ کہ خالی از خلل است

صراحی سے ناب و سفینہ غزل است

لاہور میں جو دوست تھے۔ وہ سب اپنے محور پر قائم ہیں۔ جگہ لاہور میں نہ جانے کب تک ہے۔ امتیاز کی یکسوئی کی کئی داستانیں سُننا ہوں۔ لیکن ایک سالک ہے جس کا حسن کلو پیٹرا کی طرح بقول شکہر کے فرور زمانہ سے اثر پذیر نہیں ہوتا۔ میرے لئے لاہور اگر کسی شخص کا نام ہے تو وہ آپ ہیں۔ یہ سوچ کر کے ایک بار پھر آپ کی طویل بعثتیں نصیب ہوں گی۔ اور فراغت بے خلل ہو گی۔ طبیعت میں ایک ہیجان سا پیدا ہوتا ہے۔ بہت تک گیا ہوں۔ دس سال میں کوئی چھٹی نصیب نہ ہوئی۔ آپ ہوں گے۔ ہاشمی ہوں گے۔ بے خودی و غم بے خلل ہو گی۔ اور اگر غم بے خلل اس دنیا میں کسی کو نصیب نہیں۔ تو پھر حال اس کے قریب ترین کیفیت جو نصیب ہو سکتی ہے۔ وہ مجھے لاہور ہی میں ہو گی۔ جذباتی سی باتیں ہیں۔ لیکن محض اضطراری نہیں۔ ان باتوں پر میں نے

بہت کچھ دماغ سوزی کی ہے۔ کوئی اور بات علم میں آئے تو مجھے مطلع رکھیے گا۔

خاکسار
بخاری

۱۳۔ تعلق رعد نئی دہلی

۱۰۔ جنوری

برادرِ محترم!

سلام مسنون! کل ایک خط آپ کو لکھا تھا۔ اس خط کو اس کا ضمیر سمجھ لیجئے۔ رات میرے ہاں یارانِ طریقت کھانے پر جمع تھے۔ تاثیر اور ذوالفقار بھی یہیں ہیں۔ ان کے علاوہ آغا حمید، حفیظ، فیض، راشد، حسرت، عباس، مجید ملک سب موجود تھے۔

میں نے سب کو ایک طرح کا مصرعہ دے رکھا ہے۔ یہ
گماں اور ہی تھا مجھے بدگماں پر

شرط یہ تھی کہ ہر ایک چند اشعار اس طرح پر ضرور لکھ کر لائے۔ چنانچہ سب نے حتیٰ کہ میں نے اور آغا حمید نے بھی طبع آزمائی کی۔ جب اس طرح شباطین جمع ہوئے۔ نزل بھی کہی گئی۔ ہزل بھی لیکا گیا۔ اور دونوں اصناف میں خوب خوب شعر ہوئے۔ اس طرحی مشاعرے کے بعد سنجیدہ شاعری کی طرف رجوع ہوئے۔ ذوالفقار، تاثیر، حفیظ اور فیض نے اپنا تازہ کلام سنایا۔ پھر خوش گپیاں ہوئیں۔ رات کے ڈھائی بجے مجمع برخاست ہوا۔ اور میں دور دور رہنے والوں کو موٹر پر گھر پہنچا کر سوا چار بجے خود گھر پہنچا۔ مگر نہ تھا کہ یہ سب لوگ جمع ہوں اور آپ کا ذکر ایک

مرتبہ نہیں ہزار بار نہ ہوا ہو۔ جب یہ خبر سنی کہ آپ ۲۰ جنوری کے لگ بھگ آ رہے ہیں۔ تو مصر ہوئے کہ آپ کے آنے پر پھر ایک ایسا مجمع اور ایک ایسا مشاعرہ ہو طرح تجویز ہوئی کہ "وہ کون سی زمین ہے جہاں آسمان نہیں؟" (قافیہ جہاں، آسمان) اور مجھ سے کہا گیا۔ کہ ساک صاحب کو مطلع کر دوں۔ کہ وہ اس طرح پر غزل بزل دونوں لکھ کر لائیں۔ اور قیام کی تاریخیں بتائیں۔ تاکہ باقاعدہ پروگرام بنایا جائے۔ آپ کے آنے تک تاثیر یہاں ہوں گے۔ ذوالفقار لاہور اور یعد ازاں بمبئی جا رہے ہیں۔ لیکن ممکن ہے وہ بھی اس وقت تک لوٹ آئیں۔

اس طرح پر آپ کو طبع آزمائی ضرور کرنی ہوگی۔ ورنہ سب کو مایوسی ہوگی۔ اور بزل کو نظر انداز نہ کیجئے۔ ورنہ مایوسی کے علاوہ صدمہ ہوگا۔ آپ کو فرصت ممکن ہے۔ کم ہو۔ لیکن یہاں بھی ایک تاثیر کو چھوڑ کر باقی سب عدیم الفرست ہیں۔ آپ ہی میں کیا سرخاب کا پتہ لگا ہے۔

اور آنے اور ٹھہرنے کی تاریخیں ضرور بتائیے۔ ایک آدھ دن کا قیام ہمیں پسند نہیں۔ ایک آدھ دن کو آنا ہو۔ تو لٹنے کی زحمت گوارا نہ فرمائیے۔ وہیں سے اپنی ٹاک کا ریکارڈ بھرا کر بھرا دیجئے۔ ہمیں یہ از حد ناگوار گذرے گا کہ آپ آئیں۔ بھی تو اس طرح کہ گھڑی دو گھڑی کو مل کر بیٹھنا بھی نصیب نہ ہو۔ دن بھر سب لوگ معاشش کے محضوں میں گرفتار رہتے ہیں۔ جب تک ایک ددین شامیں میسر نہ ہوں۔ ہم نشہ کاموں کی کیا تسلی ہوگی۔ باور رکھیے کہ آپ کے قیام کی آخری شام محض بے کار ہوگی۔ کیوں کہ نوبے کے قریب گاڑی جاتی ہے۔ مکان اسٹیشن سے نو میل ہے۔ آٹھ بجے تو آپ روانہ ہو ہی جائیں گے۔ چنانچہ آخری شام کو

ہمارے حساب میں شمار نہ کیجئے۔

خاکسار
بخاری

۲۰۔ جنوری

برادر محترم!

سلام مسنون! گرامی نامہ ملا۔ معاملہ کے متعلق روک تمام کی
مساعدی ابھی تک جاری ہیں۔ اور اس میں بہت کچھ دوڑ دھوپ
ہو رہی ہے۔ اگر ہمارے بزرگوں نے ذرا ہٹ سے کام لیا اور
عزم جزم کا اظہار کیا تو ممکن ہے بلا کسی حد تک ٹل جائے۔ کیوں کہ
یہاں تو مقابلہ ہٹ کا ہٹ سے ہے۔ ابھی تک کئی فیصلہ نہیں ہوا۔
دونوں طرف سے کچھ ضد کچھ اخلاق کا اظہار ہو رہا ہے۔ خدا کرے
اخلاق محض جاری طرف سے اور ضد محض ان کی طرف سے نہ
ہو۔ اس میں کچھ شبہ کی گنجائشیں ہیں۔ اس لئے ابھی مطلع صاف
نہیں ہوا۔ اور نتیجے کے متعلق اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ یہی وجہ
ہے کہ کچھ تاخیر ہو رہی ہے۔ لیکن بہر حال اپنی تیاری مکمل کر
رکھنی چاہیے۔ مجھے نتیجے کے متعلق کچھ ایسا حسن ظن نہیں۔ یہاں
بابائے اُردو سے بھی چند در چند مشورے ہوئے ہیں۔ اگر خدا نخواستہ
معاملہ حسب منشاء طے نہ ہوا۔ تو وہ علاوہ یہاں کام کرنے کے
فوراً لاہور بھی آجائیں گے۔ اور اہل صحافت کو مالہ و ما علیہ سے
آگاہ کریں گے۔ اور لائحہ عمل کے متعلق مشورہ دیں گے۔ اس پران
کو تیار کر لیا گیا ہے۔

میرے بَن ران میں عرصے سے ایک مسانکلا ہوا تھا۔ بڑھتے بڑھتے
پون اچ کے قریب ہو گیا اور اس کی بیخ بھی کوئی پون اچ کے

برابر ہو گئی۔ مدت سے ارادہ تھا۔ کہ اسے کٹوا ڈالوں۔ ”گتھاں“ ہونے کی وجہ سے تکلیف دینے لگا تھا۔ مصروفیتوں نے مہلت نہ دی۔ اب رخصت لی ہے۔ تو یہ خرخشہ بھی پاک ہو گیا۔ کاٹنے کے بعد دو تین ٹانگے لگانے پڑے۔ اس لئے نرسنگ ہوم میں چلا گیا۔ وہاں پانچ چھ دن ڈریسنگ گاؤن میں فرصت اور کیسویٰ نصیب۔ پھر واپس آیا۔ کوئی تشویش کی بات نہیں۔ جو مضمفہ گوشت کٹا تھا۔ اس کا معائنہ کرا رہا ہوں۔ شبہ ہے کہ سرطان نہ ہو ڈاکٹر اس شبہ بہہ منتے ہیں۔ لیکن دودھ کا جلا ہوں۔ اس لئے احتیاط کرتا ہوں۔ صحت اچھی ہے رخصت کے ایام میں برسوں سے جو کام معرض تغویق پڑے ہوئے تھے۔ ان کو نبٹانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اب احساس ہوتا ہے کہ اس دس گیارہ سال میں اپنی ذاتی مفاد اور بہبود سے کس قدر غفلت برتی ہے۔ ساتھ ساتھ مطالع کا شوق بھی اُبٹ کر آیا ہے۔ تاریخ اسلامیہ کے بارے میں میرے مطالع میں کئی رہنے ہیں۔ ان کو بھرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ادھر ہسپانیہ کی تاریخ بڑھ چکا ہوں۔ ادھر عباسیوں کے آخر تک پہنچ چکا ہوں۔ شعر العجم کے بھی پانچوں حصے پڑھ ڈالے۔

فسانہ آزادہ خلاصہ کر رہا ہوں۔ تاکہ ایک تنہائی میں سما جائے۔ اور اس کی لذت وہی رہے۔ دوستوں کی صحبت سے پھر رُوحِ دوداں کو میرا ب کرنے کے لئے بے قرار ہوں۔ اور دن گن رہا ہوں۔

خاکسار

بخاری

برادر محترم!

سلام مسنون! میرے تقرر کی معیاد پانچ سال تھی۔ جو اپریل ۱۹۶۶ء کو ختم ہوگی۔ وائسرائے کے مشورے سے فیصلہ ہوا ہے۔ کہ مجھے مزید پانچ سال کے لئے رکھا جائے۔ اب پنجاب گورنمنٹ سے پوچھا جائے گا۔ ایک آدھ ہفتہ کے اندر یہاں سے خط روانہ ہوگا۔ ٹھیک کس تاریخ کو اور مکتوب الیہ کون ہوگا۔ یہ ابھی مجھے معلوم نہیں۔ سبب معلوم ہوا تو آپ کو مزید اطلاع دوں گا۔ بہر حال ممکن ہے۔ مجھے کوئی علم نہ ہو۔ اور خط روانہ ہو جائے۔ پنجاب کے ارباب حل و عقد کا سنبھالنا اب آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ گویقین نہیں۔ وہ معترض ہوں۔ میرے واپس آنے سے کئی اصحاب کو ترقی معکوس ملے گی۔ اس لئے افسروں میں سے کون ایسا ہوگا۔ جو مجھے دور نہ رکھنا چاہے۔

دو ایک نقطے قابل غور ہیں۔ اول تو یہ کہ میرے جیسے افسر کے معاملے میں معیاد کا مقرر کرنا محض ایک اخلاقی اور رسمی بات ہوتی ہے۔ میں کنٹریکٹ آفیسر نہیں۔ مستقل سرکاری ملازم ہوں۔ نہ میں آئی۔ سی۔ ایس وغیرہ کارکن ہوں۔ جن کا صوبوں سے مرکز اور مرکز سے منتقل ہونا خاص قواعد و ضوابط سے منضبط کر دیا گیا ہے۔ میں خواہ پانچ سال صوبوں سے باہر کام کروں۔ خواہ دس سال کے لئے بہر حال اور ہر وقت پوزیشن یہی رہتی ہے کہ میرا LIEN قائم رہتا ہے۔ یعنی مرکز صوبہ اور میں خود۔ ہم تینوں میں جو جس وقت چاہے میری واپسی کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ اور اس کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ لہذا تقرر کی معیاد کا معین کرنا دراصل کچھ معنی نہیں رکھتا۔ بجز اس کے کہ اس سے سب متعلقہ لوگوں کے ذہن میں ایک اندازہ

سارہمنا ہے۔ علاوہ ازیں پنجاب میں میرا LIEN SUSPENDED ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ میری عدم موجودگی کی وجہ سے میری آسامی پر حکومت پنجاب کو کسی اور شخص کے مستقل کرنے میں کوئی امر مانع نہیں۔ مجھے مزید پانچ سال کا آفر حکومت پنجاب سے پوچھنے کے بعد کیا جائے گا۔

آپ اس معاملے میں کس طرح جنبانی کریں گے۔ یہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔ وہ نہ ہو کہ آپ کی کسی سہمی سے لوگ یہ اندازہ لگائیں کہ کوئی بہت اہم بات ہے۔ جس پر کھینچا تانی کا امکان ہے۔ حالانکہ دراصل یہ صورت نہیں۔ اگر برسبیل تذکرہ یہ بات ہو جائے۔ اور کوئی اس پر دو ہفتوں کے دوران میں نگاہ رکھے۔ تو مفید ہوگا۔

میں آج P.E.N کا فرنس میں شامل ہونے کے لئے جت پور جا رہا ہوں۔ وہاں "THE URDU WRITER OF OUR TIMES" پر ایک سپر پڑھ رہا ہوں۔ دو تین دن ہوسے بمبئی سے واپس آیا ہوں وہاں امتیاز حجاب سے ملاقات ہوئی تھی۔ امتیاز کو سوائے فلم کے اور کسی چیز کا شوق معلوم ہوتا ہے۔ نہیں رہا۔ اس سے کچھ سنج ہوا۔ وہاں یہ خیال آیا کہ آپ کو کبھی محض سیر و آرام کی غرض سے بمبئی جانا چاہیے۔ وہاں آج کل ذوالفقار ہیں۔ آپ کا قیام یقیناً ان کے پاس ہوگا۔ مرنے سے پہلے ایک دفعہ سمندر تو دیکھ لینا چاہیے۔ گو آپ ابھی دو سو سال زندہ رہیں گے۔ تاہم۔

خاکسلا

بخاری

۴۔ جولائی

برادر محترم!

سلام مسنون!

گرامی نامہ ملا میں بمبئی میں تھا۔ آپ کا خط دہلی میں

میرا انتظار کرتا رہا۔ اس لئے جواب میں تاخیر ہوئی۔

انتخاب افکار و حوادث کے باب میں مجرم و نادام ہوں۔ کچھ کسالت، کچھ معروفیت اور پریشانی علاوہ براں میں نے یہ کام توقع سے زیادہ محنت طلب اور دقت طلب پایا۔ آپ کی برہمی اور بے قراری حق بجانب۔ ۲۵ جولائی کی صبح کو لاہور آ رہا ہوں۔ تین چار دن ٹھہروں گا۔ تمام فائی بعد از تکمیل کار ساتھ لیتا آؤں گا۔ یہ وعدہ بھی وفا نہ ہوا۔ تو آپ مجھے حلقہ و حلقہ بگوشاں سے خارج تو کیا کریں گے۔ کچھ اور ڈانٹ لیں گے۔ وہ میرے سر آنکھوں پر۔ کام تو یہ مجھے ہی کرنا ہے۔ اور ضرور کروں گا۔ لیکن مذاق بر طرف اس مہینے میں یہ کام ضرور ختم ہو جائے گا۔ وما توفیتی الا باللہ۔ دو بکریاں جو آپ نے پال رکھی ہیں۔ ان کے حالات سے بھی آگاہی ہوئی۔ میں انشاء اللہ ہر طرح سے خیال رکھوں گا۔

اب صاحب اپنے بارے میں بغیر شعوری طور پر مبالغہ کرتے ہیں۔ جب عہدہ ہی عارضی ہے۔ تو جو اس عہدے پر مقرر ہے۔ وہ کیوں کر مستقل ہو سکتا ہے۔ اور عہدہ عارضی ہوں ہے کہ ابھی اس کام کے مستقبل کا فیصلہ نہیں ہوا۔ ممکن ہے یہ کام رت نہ ہے۔ ادب ہی قسم کے اہل علم کی ضرورت ہو۔ یا کسی اور قسم کی آدمی کے ذمے یہ کام سپرد کیا جائے۔ یہ تمام معاملے فیصلے کے محتاج ہیں۔ اور اس فیصلے میں ابھی کچھ عرصہ لگے گا۔ اس دوران میں اب صاحب کا کام اکثر کمزور پایا گیا۔ اس میں کسی کی شرارت مضمحل نہیں۔ کیونکہ ان کوتاہیوں کا علم براہ راست مجھ کو ہے۔ تاہم ان کو ہم گھیسے چبے جاتے ہیں۔ اب یہ استدلال ان کا عجیب و غریب ہے۔ کہ چونکہ مجھے برخواست نہیں کیا۔ اس لئے میں مستقل ہونے کا حقدار ہوں۔ اگر چہڑی دی ہے۔ تو دو ہونی چاہئیں! وہ خواہ مخواہ اپنا طلبی کرتے ہیں۔ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا تو سیکتے ہی نہیں۔ سفارکش اور دستگیری کے عادی

آپ فرماتے ہیں یہ شعر وضاحت طلب ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے اصلاح طلب نہیں۔ لہذا منظور۔

۳۔ کھلے موتیا۔۔۔۔۔ منظور

۴۔ درے خانہ دا ہے چشم ساقی میں ہے بے باکی میں نے کہا تھا۔ درے خانہ دا ہے آنکھ میں ساقی کی جیبا کی آپ فرماتے ہیں۔ ایک ہے کی کمی ہے۔ آپ کی اصلاح مجھے منظور ہے۔ گو میں اس بات کا ابھی قائل نہیں ہوا۔ کہ ایک 'ہے' کی کمی ہے۔ کئی فقرے با محاورہ ایسے ذہن میں آتے ہیں۔ جہاں بالکل یہی شکل ہوتی ہے۔ اور صرف ایک ہی استعمال ہوتا ہے۔ بہر حال اصلاح منظور۔

مختصر یہ کہ کلی اتفاق اور بہتر بھی یہی ہے۔ وہ نہ ہو غزل ہی سے ہاتھ دھو بیٹھوں۔ آپ کی اصلاح سے متفق نہ ہوں۔ جب یہی اتنا ضروری ہے کہ آپ کے اعتراض سے ایسا قوی شبہ پیدا ہو جاتا ہے کہ اتفاق کے بغیر چارہ نہیں رہتا۔ اس کو حسن اتفاق کہتے ہیں۔ بہر حال دماغ سوزی کا بہت شکریہ!

۳۰۔ جون سے (تاریخ یاد رہے) میں نمبر ۹ اشوکا روڈ نئی دہلی جا رہا ہوں۔ انگریزی میں اس کو ASOKA ROAD, ۹ کہتے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ اور امتیاز چند دن کے لئے آجائیں۔ برسات جو بن پر ہے۔

او بھائی نماز بخشنا نے گئے تھے۔۔۔۔۔ الخ من موہن کا معاملہ طے ہوتے ہوتے میرا معاملہ ایسا غائب ہوا کہ خبرش باز نیامد۔ یہ تو کہتے کہ کیا مہر صاحب اور میاں صاحب کی گفتگو میرے منے کے متعلق بھی ہوئی یا نہیں۔ اگر ہوئی تو کیا نتیجہ ہے۔ اس موضوع پر تو

برسوں سے آپ نے کچھ لکھنا نہ مہرنے۔

خاکسار

بخاری

۲۰ پرنسپل راج روڈ نئی دہلی۔

۲۰ اکتوبر

برادر محترم!

سلام مسنون! گورنمنٹ کو اس سال کے بجٹ میں کچھ خسارہ نظر آتا ہے۔ اس لئے خالی آسامیوں کی بھرتی ایک قلم رُک گئی ہے۔ اور معلوم نہیں کب تک رُک رہے گی۔ اس لئے ہر کام میں تاخیر لائے۔ یہ جواب ہے آپ کے اس خط کا جو عرصہ ہوا آپ نے لکھا تھا اور جس کے جواب سے آپ مایوس ہو گئے ہوں گے۔

پچھلے دنوں ابوالکلام سے ہم کلامی کا فخر حاصل ہوا۔ بڑی صحبتیں گرم ہوئیں۔ آپ کا ذکر اور ذکر خیر بار بار آیا۔ اور مولانا ممتاز علی مرحوم کا ذکر بھی آیا۔ اور اقیانوس کا ذکر بھی آیا۔ اور حمید علی صاحب کا ذکر بھی آیا (جو سٹائل بہ تتبع خواجہ حسن نظامی ہے) ایشیائی علم و ادب و تاریخ پر زوروں کی بجٹیں ہوئیں۔ شعر خوانیاں ہوئیں۔ بدلہ سنجی ہوئی۔ علامہ اقبال کی یاد تازہ ہو گئی۔ کیونکہ بحر اقبال اور ابوالکلام کے اور کوئی شخص ایسا نہ ملا۔ جو عالم اسلام اور اس کی نیرنگیوں اور رنگ آفرینیوں کا آئینہ دار ہو۔ یہ نسل ہی اب طس جاتی ہے۔

اس خط کو دیکھتے ہی رائے بہادر من مومن صاحب سے ملے۔ اور ان سے پوچھے کہ کوئی رکاوٹ تو نہیں اگر ہو تو اس کا مدد کیجئے۔ تفصیلات انہیں سے معلوم ہوں گی۔ ضرورت ہو تو حمید علی

صاحب کو بھی شامل کر لیجئے۔

اب کے کرسمس میں پھر ایک چکر سے۔ بشیر ہاشمی غالباً
والدہ پرستی کے سلسلے میں دہلی آئیں گے۔ ممکن ہے امتیاز بھی
بحیثیت وینیزکانفرنس کی ایک ڈیلیگیٹ کے شوہر کے آجائیں۔
آپ وینیزکانفرنس کی ایک ڈیلیگیٹ کے شوہر کے دوست کی
حیثیت سے آجائیں۔
زبیرہ سلام کہتی ہے۔

خاکسار

بخاری

بھی انقلاب بیچ کر فی الواقع بہت احسان کرتے ہو۔ جس
دن انقلاب نہ پہنچے۔ دن خالی معلوم ہوتا ہے۔ کل یہ عنوان نظر
آیا۔

لاہور میں گداگروں کی اکثریت۔

یہ اکثریت کی بھی ایک ہی کہی۔ مگر اس کے لئے سند موجود ہے۔
"اقلیت مال و اکثریت عیال" مشہور فقرہ ہے۔
ابوالکلام نے شاد عظیم آبادی کا ایک شعر سنایا تھا۔ آپ بھی
سنیں۔ یسے خوب ہے۔

بوں پہ ہے تڑپتے ہیں درمند تیرے

وہ اہد کوئی نہیں عاشقانِ چند تیرے

بخاری

۲۳۔ دسمبر

برادرِ محترم!

سلام مسنون! یاد آوری کا شکر یہ! خط کے مفہوم سے آگاہ

ہوا۔ اور اس کو ذہن میں محفوظ کیا۔ کام کی کثرت اور تنوع کی وجہ سے اکثر فروغی فرائض ماتحتوں کے سپرد کر رکھے ہیں۔ اور جیسا کہ قاعدہ ہے۔ ان میں حتی الوسع دخل نہیں دیتا۔ تا آنکہ کوئی اہم نکتہ اس میں پوشیدہ نہ ہو۔ آپ نے جس امر کا ذکر کیا۔ وہ بھی اپنی فروعات میں شامل ہے۔ تاہم اس سے غافل نہ رہوں گا۔ اگر فیصلہ حسب الخواہ نہ ہوا۔ تو مجھے دوبارہ تاکید کرنے میں تامل نہ کیجئے گا۔ کہ میرا منصب ہی موکد ہوتا ہے۔

ہمشیرہ کے رشتے کے متعلق کچھ آپ نے سلسلہ جنبات کی لفظی پیر معلوم نہ ہوا کہ بات کہاں تک پہنچی۔ یا کہاں رک گئی۔

ایک خط ایڈیٹر انقلاب کے نام طغوف ہے۔ انہیں پہنچا دیجئے گا۔ تاکہ ان کو افکار و حوادث کے لئے مصالحہ مل جائے۔ یا کم از کم ان کی اپنی ضیافت کا باعث ہو۔

میں کل صبح ہفتے بھر کے لئے لکھنؤ جا رہا ہوں۔ نہ معلوم اس میں کتنے دن ریل میں گزریں گے۔ لیکن سنتا ہوں کہ ریلیں اب چلنے لگی ہیں اور چلتی ہی کا نام گاڑی ہے۔ اجاب کو میرا سلام پہنچے۔ اور بالخصوص مہر صاحب، اقیاز صاحب اور حمید علی صاحب کو زہیدہ آپ کو اور بجابی کو سلام کہتی ہے۔

یہاں میرے پہلے جیم کے اہل قلم اور اجاب تو بہت جمع ہیں۔ لیکن وہی شہر نہیں صحرا ہے۔ فاصلے بہت ہیں۔ کچھ حسباتی۔ کچھ روحانی۔ پٹرول بھی کم ہے۔ دل بھی خشک۔ دہلی کی آب و ہوا ہی ایسی ہے۔ ہر شخص دفتر کی کش مکش اور ہوس رانی میں مبتلا۔ اردو مجلس کے احیا کی کوشش کر رہا ہوں۔ دیجیئے۔

ہوٹل ماریا کرٹینا میکسیکو

۲۱۔ جنوری

مرادرم !

سلام مسنون ! نوازش نامہ ملا۔ آپ کے سوا کسی اور دوست کا خطاب تک نہیں آیا۔ صوفی ہاشمی، فیض، تاثیر سب نے گویا مجھے دریا برد کر دیا۔ زبیدہ اور ہارون کے خط مسلسل آتے رہتے ہیں۔ ان سے باواسطہ کچھ احباب کا حال بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ اور گھر کے حالات سے تو باقاعدہ مطلع رہتا ہوں۔ ورنہ بالکل ہی رابن کسن کر دوسوین جاتا۔ سیاسی حالات سے باخبر نہیں۔ ریاض احمد کو کراچی سے خط آتے ہیں۔ ان سے دوچار اڑتی اڑتی باتیں معلوم ہوتیں۔ ادبی دنیا کی کوئی خبر نہیں۔ نہ معلوم کون سے رسالے بند ہو گئے۔ کون سے کھل گئے۔ کن پر کھل بندن کی کیفیت طاری ہے۔ کس کس شاعر نے غالب کے گور پر لات ماری۔ آپ نے انقلاب کا ایک ورق بھیج کر میرے کم از کم چوبیس گھنٹے رنگین کر دیئے۔ سلور جوہلی پر آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔ لاہور میں ہوتا تو دوستوں کے اجتماع کا ایک اور بہانہ ہاتھ آجاتا اور سب شاعر دوستوں سے بزل لکھواتا۔ اور شب دیگ پکٹی، خیر، گرچہ دوریم بیاد تو قدح ہی تو کشیم۔ انقلاب کے مدوجزر کا حال پڑھ کر میں کچھ مغموم ہو گیا۔ عمر بھر کی بذلہ سنجی، بذلہ گوئی اور چھکتی ہوئی صحافت کے بعد آپ کو یہ سخت مرحلے پیش نہ آنے چاہئیں تھے۔ لیکن آپ نے اخبار کا نام ہی معلوم ہوتا ہے۔ لسان العیب کے کہنے پر رکھا ہے۔ بہر حال آپ طبعاً قلندر ہیں۔ قلندری کو کام میں لائیے۔

کانفرنس کہنے کو تو انجیر بازی تھی۔ لیکن آنے کے ساتھ ہی

معلوم ہو گیا۔ کہ ریڈیو بھی سیاسی کھینچ تان کا اکھاڑہ ہے۔ چھوٹی لہریں بجز ددر مار اسلے کے اور کچھ نہیں۔ دو مہینے تک کانفرنس کا ٹکیہ کلام یہ تھا کہ اصول وضع ہونے چاہئیں۔ چھوٹی لہروں کی تعداد کل (۱۸۰) ہے۔ دن رات کے گھنٹے چوبیس ہیں۔ دونوں کو ضرب دیجئے۔ تو تقریباً ساڑھے چار ہزار "لہر گھنٹے" بنتے ہیں۔ سب لگوں سے ان کی "ضروریات دریافت کی گئیں۔ تو ضروریات کا میزان ہندسہ ہزار تک جا پہنچا۔ ہر ایک نے حرص سے کام لیا اور بعض سینکڑوں بلکہ ہزاروں سے بھی اوپر "لہر گھنٹے" پہلے سے دباتے بیٹھے ہیں۔ ایک انار صد بیار۔ تقسیم کیوں کر ہو۔ رات دن لوگ اصول اصول پکارتے ہیں۔ اور اس بارے میں ہر ملک "غلام محمد الدین" بنتا پھرا۔ اور ڈھائی مہینے کی جھک جھک کے بعد معلوم ہوا۔ کہ اصولوں کی کمی نہیں۔ بلکہ بھرمار ہے۔ ہر ملک اپنے اپنے مطلب کے اصول وضع کر لیتا ہے۔ فیصلہ ہوا کہ ہمہ گیر اصول جن پر سب کا یا اکثریت کا اتفاق ہو۔ وضع نہیں ہو سکتے۔ روس اور اس کے بعد امریکہ (ریاست ہائے متحدہ) دو بنے بنائے ہزار ہزار ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار منے کے PLAN ترشے ترشائے لے آئے۔ روس نے اپنے PLAN میں اپنے حواریوں کو مٹیاں بھر بھر کر لہر گھنٹے دیئے۔ امریکہ نے لاطینی امریکنوں (یعنی جنوبی امریکہ کی ریاستوں) کو بڑی بڑی رعایتیں دیں۔ غرضیکہ ہر ایک نے اپنا سیاسی آؤسیدھا کرنے کی کوشش کی۔ جس مرحلے پر کانفرنس اس وقت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں سودے ہوں گے۔

غریب پاکستان کس برتے پر کسی سے سودا کرے۔ سوچا کہ ہمارے پاس بجز شخصیت کے اس میدان میں کچھ نہیں۔ خدا کا نام لے کر شروع ہی سے اسے چمکانے کی کوشش کی۔ لیکن اس طرح کہ اسے بالکل ہتھیلی پر ہی نہ لئے پھریں۔ جب یہاں آئے تو کوئی ہمیں

جاننا نہ تھا۔ بلکہ اکثر لوگ تو پاکستان سے بھی بے خبر تھے۔ خدا کی مہربانی سے پہلے ہی ہفتے کے اندر دو تین زوردار تقریروں کا موقع مل گیا۔ ساتھ ہی ساتھ میں نے ہسپانوی بھی سیکھنی شروع کر دی۔ کچھ بحث بازی میں کرتب دکھائے۔ موقع پا کر محض تقریر کے زور سے ایک دن انگریزوں کو وہ شکست دی۔ کہ انہیں ۷۰ میں ۵ سے زیادہ ڈوٹ حاصل نہ ہوئے۔ چنانچہ لوگوں کو خیال ہوا۔ کہ بحث و تہنیت میں پاکستان دوستی مفید ہے۔ بہر حال اس کی دشمنی مفز ہو سکتی ہے۔ گاہے گاہے لطیفہ بازی سے بھی کام لیا۔ ایک

مزاجیہ نظم انگریزی میں کانفرنس کے بارے میں کہی۔ جو پارٹیوں کے رستے سے کانفرنس کے روزانہ سرکاری اخبار میں چھپ گئی۔ اور لوگوں نے پاکستانیوں سے موقع بے موقع مسکرا مسکرا کر مصافحے کرنا شروع کئے۔ ہندوستان والوں نے اپنا وفد محض انجیریوں سے مرتب کیا ہے۔ وہ لوگ انجیر تو اچھے ہیں۔ باقی صورت نہ شکل۔ انج انگریزی مدد اسی پہچے میں بولتے ہیں۔ جس پر ترجمان تھوکتے ہیں اور خون بھی تھوکتے ہیں۔ اب میں ہسپانوی بلا تکلف بول لیتا ہوں۔ اور اخبار وغیرہ پڑھنے میں تو کوئی دقت نہیں ہوتی۔ ارادہ ہے کہ رخصتی تقریر ہسپانوی میں کروں گا۔ میری اس لسان دوستی پر جنوبی امریکہ اور میکسیکو کے لوگ بہت خوش ہیں۔ غرضیکہ سب ہنسنڈے استعمال کر رہا ہوں۔ باہر آکر انسان پہلے سے بھی زیادہ پاکستانی ہو جاتا ہے۔ یہی کیفیت ہماری ہے۔ اب خدا کرے کہ آخری مرحلوں میں ہمیں کامیابی نصیب ہو۔ اور دو تین مہینے کی محنت کہیں ٹھکانے لگے۔ کانفرنس کا کام توقع سے بہت زیادہ نکلا۔ اجلاس صبح دس بجے سے شام کے سات بجے تک اور بعض اوقات

رات کے دس بجے تک رہتے ہیں۔ ایک دن تو صبح کے دو بج گئے۔ سوائے سینچر کے آدھے دن اور اتوار کے کوئی تعطیل نہیں ہوتی۔ اور یہ اوقات اور اکثر کی ساعتیں سازشوں اور مشوروں میں صرف ہو جاتی ہیں۔ کانفرنس کی دستاویزات کا بھی باقاعدہ مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ اور ان کی تعداد اس وقت تک چھ سات ہزار صفحوں تک پہنچ چکی ہے۔ انجینئر بازی کے مسئلے بھی سمجھنے پڑتے ہیں۔ ریڈیو کی تعلیم جو دس سال میں حاصل کا ہے۔ وہ ایسے وقت میں کام آتی ہے۔ تاہم بعض باتیں بچوں کی طرح بیٹھ کر سمجھنی پڑتی ہیں۔ آپ خوش ہوں گے۔ کہ میں کچھ مرتبہ اتفاق رائے صدر منتخب ہو چکا ہوں۔ اور بلند طبقوں کے مشوروں میں مجھے بلایا جاتا ہے۔

میکسیکو مجھے بے حد پسند آیا۔ پیارٹی ملک ہے آب و ہوا بھی خوشگوار ہے۔ لوگ رنگین طبع، بااخلاق، رنگین پوشش میں۔ پابندی اوقات کو مذہبوں کا شیعہ نہیں سمجھتے۔ موسیقی، ناچ اور سواری کے بڑے حد شوقین ہیں۔ (کانفرنس کا افتتاح ارکسٹرا سے ہوا) گفتگو میں آپ، جناب، حضور وغیرہ کثرت سے استفادہ کرتے ہیں۔ ناممکن ہے کہ رذیل سے رذیل آدمی آپ کا شکریہ شاعرانہ ادا نہ کرے۔ اور آپ شکریہ ادا کریں تو انگسار کے دو تین فقرے جواب میں نہ کہے۔ یہاں اکثریت اصلی یا شدوں کی ہے۔ ان سے کم دو غلے لوگ ہیں۔ دراصل خالص ہسپانوی نژاد لوگ اقلیت میں ہیں۔ پچاس سال سے یہاں ایک نئی نیشنلزم ہونے کا آرہی ہے۔ جو اپنے آپ کو صرف میکسیکو سے وابستہ کرتی ہے۔ اور ہسپانیہ کو بہت سرعت سے بھلا رہی ہے۔ چنانچہ ہسپانوی اقتدار کی دو تین صدیاں جو میکسیکو پر گزری تھیں۔ انہیں تاریخ سے محو کیا جا رہا ہے اور موجود دور کا

سلسلہ قبل از ہسپانیہ دور سے ملایا جا رہا ہے۔ جب یہاں کے اصلی باشندے برسرِ اقتدار تھے اور ان کی ایک عظیم الشان سلطنت اور تہذیب تھی۔ اور ہسپانوی لیٹروں نے اگر ان کو نہیں نہیں کر دیا تھا۔ میکسیکو شہر کی آبادی تقریباً بیس لاکھ ہے۔ اور ہمارے نقطہ نظر سے بالکل جدید شہر ہے۔ گواہل یورپ کو اس میں کئی غریب باتیں نظر آتی ہیں۔ پچھلا انقلاب یہاں تیس سال تک رہا۔ جس میں میکسیکو کے ذکور آدمے سے زیادہ مارے گئے۔ اب یہاں REPUBLIC ہے۔ (بطرز امریکہ) تعلیم کا بہت شوق ہے اور امریکہ نے ناخواندگی کو ترقی دینے میں جتنا کام کیا ہے۔ اس کی مثالیں دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ وزیر تعلیم پاکستان نے مجھ سے کہا تھا۔ کہ اس پر ایک رپورٹ لکھنا۔ میں نے بہت کچھ معالجہ اس پر جمع کیا اور اسے اس قدر خیال انگیز پایا کہ دل میں ایک کتاب (خواہ انگریزی خواہ اردو خواہ دونوں زبانوں میں) پاکستان کی خاطر لکھنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ لیکن افسوس کہ کانفرنس کی وجہ سے فرصت بہت کم ملی۔ وزیر تعلیم اور اس کے افسروں سے تبادلہ خیالات کے لئے کئی مرتبہ وقت مقرر کیا۔ مگر وعدہ ایسا نہ کر سکا۔

اور کیا کھوں میں کئی دلچسپ خط لکھتا۔ اگر دوستوں کے خط اس کے محرک ہوتے۔ بس تحریک ہی کا انتظار طبیعت کو رہا۔ وہ نصیب نہ ہوئی تو سبہل انگاری غالب آئی۔ فرصت بھی بہت کم ملتی ہے۔ تاہم آپ لوگ اگسائے تو لکھنے کو یہاں انباروں کے انبار لکھ ڈالتا۔

دوستوں کو میرا سلام دیجئے گا۔

خاکسار

بخاری

ہوٹل مرینا کرستینا میکسیکو

یکم اپریل

برادر دم !

سلام مسون ! آپ کا تیسرا منظر ملا۔ یعنی جس خط کے متعلق آپ کو شبہ تھا۔ وہ بھی مل گیا تھا۔ جواب لکھنے کا بہرہ ہوں۔ فرصت ہی نہ ملی نیز فرصت کے جو چند لمحے ملتے ہیں۔ اس میں اتنے خط لکھنے پڑتے ہیں کہ عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ ذوالفقار، زبیدہ، سرکار پاکستان، فیض، تاثیر سب کو خط لکھے۔ کسی کو معرفت ایک اور کسی کو مشلا سرکار پاکستان کو ہر ہفتے اور بعض اوقات اس سے بھی زیادہ۔ یہاں رٹ بدل گئی ہے اور اپریل میں بھی وہ حال ہے جو ہمارے ہاں مارچ اور اوائل میں ہونا ہے۔ آنکھیں دھوپ سے گریز کرنے لگی ہیں۔ اور کوٹ پہننے کو دل نہیں چاہتا۔ کانفرنس آخری مرحلے پر ہے۔ لوگ تھک کر چور ہو گئے ہیں اس لئے مباحثے میں یا تو چڑچڑا پن دکھاتے ہیں۔ یا مہتیار ڈال دیتے ہیں۔ لیکن جو قومیں اٹیل ہیں۔ وہ اب بھی ختم نہیں آنے دیتیں اور آنکھ تک نہیں جھپکتی۔ ہمارا کام خدا کے فضل سے بہت ہی ٹھیک رہا ہے۔ دو تین دن ہوئے یہ طے پایا۔ کہ یہاں کی کانفرنس نو منقریب ختم کر دی جائے گی۔ کیونکہ اصول وغیرہ طے ہو چکے ہیں۔ باقی اسل پلان سازی کا کام جو تفصیلی کام ہے اور جس میں کم از کم چھ مہینے اور لگیں گے۔ ایک مختصر سی کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے۔ جو ۱۵ جن کو پیرس میں جمن ہو۔ جب باغی چھ مہینے میں وہ اپنا کام ختم کرے۔ تو کانفرنس جمع ہو۔ لیکن چند دن سے لے کر اور پلان کمیٹی کے کام پر نظر ڈال کر معاہدے پر دستخط کر دینے جائیں۔ اس پلان کمیٹی میں شامل ہونے کے لئے ہر ملک نے ماتھے پاؤں مارے۔ جیسے بندیاں ہوتیں۔ سودے ہوتے۔ رعب گانٹھے کئے۔ تقریریں ہوتیں۔ آنکھیں

دکھائی گئیں۔ چوما چاٹی ہوئی۔ عرضیکہ سیاست کے سب حربے استعمال ہوئے۔ خدا نے یہ معجزہ دکھایا کہ جب ستر ملکوں میں سے صرف پندرہ ملکوں کی ایک کمیٹی بنی تو اس میں پاکستان کو شامل پایا۔ یہ فیصلہ ایک دن صبح کے ڈھائی بجے کئی گھنٹوں کی گرما گرم بحث اور تقریر بازی کے بعد ہوا۔ جب ڈھائی بجے میں گھر واپس آیا تو عجیب اطمینان اور مسرت کی کیفیت تھی۔ بازار خاموش اور دیران تھے اور اپنے قدموں کی آہٹ کے سوا کوئی آواز سنائی نہ دیتا تھی۔ جب ۲۲ اکتوبر کو ہم یہاں پہنچے۔ تو کوئی ہمیں جانتا نہ تھا۔ پاکستان کے نام سے بھی لوگ ناواقف تھے۔ ستر قوموں میں سے سب سے نئی قوم۔ ستر قوموں میں سے سب سے نا تجربہ کار ملک۔ نہ ٹرانسمیٹر پاس ہے۔ نہ کہن سال انجنیئر۔ ریڈیو کی صف میں کوئی حیثیت ہی نہیں۔ لیکن پانچ مہینے کے عرصے میں پاکستان کو خدا نے یہ عزت دی کہ ہراہم کمیٹی اور اہم مشورے میں اس کی حیثیت صدر یا نائب صدر کی ضرور تھی۔ اور اب جب کہ کانفرنس نے دنیا بھر کی ایک مختصر کمیٹی بنائی ہے۔ تو اس میں بھی پاکستان اس خوبی سے دھرا ہے کہ کسی کو اس کے حق شمولیت پر شبہ کرنے کا خیال تک نہیں آتا۔ وزارتِ تعلیم پاکستان کا ارشاد ہے۔ کہ کانفرنس کے بعد کچھ عرصہ ٹھہر جاؤں۔ اور میکسیکو کے نظامِ تعلیم کا مطالعہ کر کے اس پر ایک رپورٹ لکھوں۔ یہاں کے عوام بھی ہماری طرح نادار اور ان پڑھ تھے۔ میکسیکو کی انقلابی جماعت نے برسرِ اقتدار آتے ہیں۔ تعلیم کے میدان میں حیرت انگیز کام کیا۔ تمام دنیا انگشت بدنداں ہوئی۔ اس میں سالوں کی تاخیر نہیں۔ ہفتوں کی، وہ بھی ایسا پوری طرح طے نہیں ہوا۔ دیکھئے پٹے لوگ پاکستان کو ہندوستان کا شاگرد اور بر خوردار سمجھتے تھے۔ اور جب یہی انتخاب کی نوبت آتی لوگ سمجھتے کہ پاکستان اور ہندوستان دونوں

میں ہے صرف ایک کا ہونا کافی ہے۔ رفتہ رفتہ لوگوں نے محسوس کیا کہ پاکستان ہندوستان کا چھوٹا بھائی نہیں۔ تمام مسلم ممالک کا بڑا بھائی ہے۔ پھر اس کے بعد یہاں تک توجہ آئی کہ لوگ ہندوستان کے ساتھ پاکستان کا ہونا از حد ضروری سمجھنے لگے۔ اب آئندہ خدا کے فضل سے کم از کم ریڈیو کے بین الاقوامی میدان میں پاکستان کو کرسی ہمیشہ صفتِ اقل میں ملا کرے گی۔ ہم پاکستانیوں نے اس پر ایک حشبنِ صغیر کیا۔ اور سب آبدیدہ ہو گئے۔

خاکسار

بخاری

یکم جولائی ۱۹۵۱ء

برادرِ محترم !

سلام مسنون ! آپ کے خط سے دُہری ندامت ہوئی۔ جب آپ کا خیال آتا ہے۔ تو شرم کے مارے لمحہ بھر کو ہاتھ پاؤں سرد ہو جاتے تھے۔ لیکن یقین مانئے۔ کہ اپنی خاموشی کی سزا بھی سب سے زیادہ مجھ کو ہی ملتی رہی۔ اجاب بعید تر ہوتے گئے۔ اور میری تنہائی بڑھتی گئی۔ مہینوں کی غفلت کے بعد کسی کو خط لکھا بھی۔ تو جواب نہ آیا۔ کیونکہ وہاں توجہ کا چشمہ اس عرصے میں خشک ہو چکا تھا۔ تجھے ندامت اور توبہ کا صلہ بھی نہ ملا۔ لیکن سالک کی وفا شعاری ہمیشہ استحقاق سے تجاوز کرتی ہے۔ خدا آپ کو زندہ سلامت اور عو کش و غم رکھے۔ آئین دوستی آپ ہی کے دم سے زندہ ہے۔ ورنہ دائیں بائیں الفیتیں مر رہی ہیں۔ جو مر نہیں چکیں۔ وہ زندہ در گور ہیں۔

جولائی ۱۹۵۱ء میں یہاں پہنچا۔ تو ذیابیطس کا شکر اپنے ساتھ لایا۔

کئی ہفتہ روزانہ پیشاب کا مطالعہ کرتا رہا۔ اور زندگی کے باقی اوراق سب تہ کر کے رکھ دیئے۔ کہ شنائے شاشی ہوئے۔ تو زندگی کا دھارا پھر ٹھیک سے بہنے لگے گا۔ لیکن جب تک اس میں شکر شامل ہے۔ باقی شیربنیاں حرام ہیں۔ ٹیکے کی پیکاریاں اور قطرہ پیمانیاں دن رات اسی نوع کے شیشہ آلات کی نظر ہو گئے۔ اس عرصے میں مکان کی تلاش رہی۔ یکے بعد دیگرے دو اپارٹمنٹ بدسے۔ دونوں عارضی تھے۔ لیکن یقین ہو گیا۔ کہ اپارٹمنٹ میں رہنا ہم تہنا پسندوں کے لئے نامکن ہو گا۔ ایک پہاڑی عمارت اس میں درجنوں ڈریے کوئی چھوٹے کوئی بڑے، پھر ہسائیہ مفضل اور پراسرار، اٹومینٹک لفٹ میں پندرہویں منزل پر رہتا تھا۔ کئی مرتبہ خیال آیا کہ اگر ۱۵^{وا} کا بٹن دباتے کے بعد رُوحِ قفسِ عنصری سے پرواز کر جائے۔ تو یہ لفٹ کا منقس کبھت بے حس و بلا تامل پندرہویں منزل تک چڑھتا چلا جائے گا۔ اور وہاں پہنچ کر اس کا دروازہ کھل جائے گا۔ اور اسے اتنی بھی تیز نہ ہوگی۔ کہ جس نے یہ بٹن دبایا تھا۔ وہ اب محض ایک تلاش ہے۔ اور دروازہ کھلے پر بھی باہر نہیں نکل سکتا۔ تو عجیب وحشت ہوتی تھی۔ انسان کو ہر وقت یہ توقع رہتی ہے۔ کہ اس کے مرجانے پر کچھ غلغلہ ہو گا۔ کوئی تھامے گا۔ کوئی اٹھائے گا۔ کوئی روئے گا، کوئی چلائے گا۔ جب یہ توقعات یک لخت مفقود ہو جائیں۔ تو ہم ایشیائی لوگوں کو چاروں طرف تاریکی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ یہاں آ کے معلوم ہوا کہ ہم لوگوں کی زندگی جماعت کی کتنی عادی ہے۔ اس عرصے میں ملازم بھی کوئی نہ تھا۔ کھانا ہمیشہ باہر کھاتا تھا۔ بجز صبح کے ناشتے کے۔ چنانچہ انڈسے پکانے میں جہارت حاصل کرنی لیکن وہ جو بازار پر دوسرے تیسرے دن سودا سلفت کے بیڈل اٹھا کر گھرانے پرستے تھے۔ اس میں کبھی جہارت حاصل نہ ہوئی۔ ہمیشہ

اپنے آپ پر ترنس اساتقا۔ کہ اللہ اللہ جن کے طویلے بیج کئی
دن کی بات ہے۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ زندگی احتیاج اور
افردگی کا مجموعہ تھی۔

ستمبر ۱۹۴۷ء میں مکان کرانے پر لے لیا۔ ایک حبشی کو ملازم
رکھ لیا۔ لیکن ساتھ ہی جنرل اسمبلی کا زمانہ آگیا۔ ڈیلیٹیوں کا قافلہ
پاکستان سے آن پہنچا۔ رات تو شہر میں گذرتی تھی۔ لیکن صبح نو بجے
سے شام کے سات آٹھ بجے تک سکیمیں میں رہتے تھے۔ جو یہاں
سے بیس میل کے فاصلے پر ہے۔ دن کم و بیش فجر کے وقت شروع
ہوتا تھا۔ کیونکہ ظفر اللہ خاں صاحب جو یہاں سے احمد یاس تیس میل
دور رہتے تھے۔ باوجود اس فاصلے کے صبح نو بجے سب سے پہلے آن
پہنچتے تھے۔ ہم شب زندہ دار ٹھہرے۔ کچھ نہ پوچھتے۔ کہ دنیا و عاقبت
دونوں میں سرخروئی حاصل کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارا یہ
حال تھا کہ رات ہی زمزم پے سے اور مسجد دھوئے دیکھ جاتے احرام
کے۔ اسمبلی ختم ہوتی۔ تو کشمیر کا شعلہ پھر بھڑکنے لگا۔ اسمبلی کے ڈیلیٹی
اسمبلی ختم کرنے کے بعد موٹروں اور فزیکل ٹرینوں کا سودا چکانے کے
بعد پاکستان لوٹے تو محمد علی اودان کا قافلہ آن پہنچا۔ وہ گئے۔ تو
ڈاکٹر گرامم کا قضیہ لکھا ہوا چھوڑ گئے۔ خدا خدا کر کے پچھلے ہفتہ گرامم
یہاں سے روانہ ہوئے۔ تو پہلی مرتبہ اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن یہ بھی
کب تک رات دن چکر میں ہیں صحت آسمان۔

رفتہ رفتہ نئی زندگی کا عادی ہو گیا ہوں۔ جب میں یہاں پہنچا
تو دفتر کو (اپنے معیار کے مطابق) مردہ پایا۔ اس سے متقدمین کی
گستاخی یا مذمت مقصود نہیں۔ بہر طبیعت کا تقاضا الگ ہوتا ہے۔
میری طبیعت ایسی ہے۔ کہ بے حسی سے کام کر ہی نہیں سکتا۔ ہلکا
ہلکا سا نجا چڑھا ہے۔ تو سمجھتا ہوں۔ کہ حرارت غریزی سے محروم

ہوں۔ اور مجبور طاری ہے۔ یہاں حالت یہ تھی کہ یو۔ این کا فیصلہ کراچیا پہنچا دیا۔ کراچی کے کہنے پر ووٹ دے دیا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ یشمن محض ایک ڈاکٹر بن کر رہ گیا ہے۔ کاردار خاص ہجر ہر کار سے کے کچھ نہ تھا۔ کام پھیلایا تو خود اس کا بوجھ میرے کندھوں پر کھڑا تھا اپنی وقت پسندی کی شکایت کس سے کر دلا۔ یہاں کا کام وقت بہت زیادہ مانگتا ہے۔ ساٹھ ملکوں کے ساٹھ وفد۔ ہر ایک کا ووٹ کسی نہ کسی موقع پر اہم بن جاتا ہے۔ سفارتی گفت و شنید عجیب سست رفتار ہوتی ہے۔ ساٹھ وفدوں میں سے ہر ایک کو سلام کیجئے۔ مناسب وقفے کے بعد خیریت دریافت کیجئے۔ بیوی بچوں کا حال پوچھیے۔ کھانے کی دعوت دیجئے۔ موسم کا ذکر بالتفصیل کیجئے۔ حرف مطلب زبان پر یوں لائیے۔ کہ بار نہ ہو۔ پھر ہفتوں جواب کا انتظار کیجئے۔ اس دوران میں مسکراتے رہیے۔ اور نگاہ رکھیے کہ پیٹے چل رہے ہیں کہ کہیں رگ گئے۔ رگ گئے ہوں تو روغن تاز، آئشن سیال، یا قطرہ تیزاب جیسا حکم بتائیے۔ کام میں لائیے۔ کاک ٹیل پارٹیوں میں حاضری دیجئے۔ یہ کاک ٹیل پارٹیاں بھی خدا جانے کس موذی نے ایجاد کی تھیں۔ جب حکومت شخصی ہوا کرتی تھیں تو کس باتیں دسترخوان پر پودی ہو جاتی تھیں۔ محمد شاہ ایسی دعوت دے کہ نادر شاہ کا دل لپیچ جاسے۔ تو یہ ہوتی سیاست۔ لیکن یہاں تو کوئی بغیر اپنی حکومت کے اشارے کے انگلی تک نہیں ہلاتا۔ پھر بھی کم محنت ضیافتوں پر وقت اور روپیہ ضائع کرتے رہتے ہیں۔ شراب کا بھی کبھی دلدادہ نہ تھا۔ لیکن عصمت بچانے کے لئے ایک گلاس ضرور ہاتھ میں رکھنا پڑتا ہے۔ ورنہ ہر دو منٹ کے بعد مٹی نہ کوئی آپ سے تواضع برتے گا اور آپ جواب دیتے دیتے دامن پاتے بچانے تک جائیں گے۔ پھر بھیڑ ہمیشہ اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ

کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ (اودے تقادم محض کھووں تک ہی محدود نہیں ہوتا) وقت ایسا ہوتا ہے۔ کہ آپ شام کا کانا نہ اس سے پہلے کھا سکتے ہیں۔ نہ بعد میں۔ لیکن جو لوگ سفیر یا وزیر بن جائیں۔ ان کی قسمت میں یہی لکھا ہے۔ کہ ہفتے میں دو تین مرتبہ یہ سزا ضرور بھگتیں۔ میں کاک ٹیل کا یوں منتظر رہتا ہوں۔ جیسے کوئی کسی اپریشن کا منتظر ہو۔ کہ تکلیف بھی ہوگی۔ لیکن اس کے بغیر چارہ بھی نہیں۔ جس دن کاک ٹیل پانٹی ہو۔ میری شام غارت ہو جاتی ہے۔ دو گھنٹے مسکرا مسکرا کر کھٹے اکڑ جاتے ہیں۔

خوبی قسمت سے مجھے مکان ایسا مل گیا ہے۔ کہ طبیعت اس میں عموماً رہتی ہے۔ مکان سرکار دیتی ہے۔ لیکن ملازموں کا خرچ خود برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اور چونکہ رتبہ بڑا ہے۔ تنخواہ تھوڑی۔ اس لئے تنخواہ کے مطابق مکان لیجئے۔ تو پاکستان کی توہین ہوتی ہے۔ اور رتبہ کے مطابق ٹھاٹھ کیجئے، توجیب ساتھ نہیں دیتی۔ ہفتوں اس کشمکش میں گزرے۔ بالآخر ایسا مکان مل گیا جس میں ڈیڑھ ملازم سے کام چل سکتا ہے۔ اور پاکستان کے نام کو بھی بڑھ نہیں گتہ۔ ملازم کی تنخواہ چھ سو روپے ماہوار ہے۔ اس کی خوراک اور رہائشی کمرہ (انگ) چھ کمرے ہیں۔ لیکن تین منزلوں پر، بالکل لب دریا ہے اور

رات دن آنے جانے جہازوں کے نظام سے سے تنہائی کا احساس کم رہتا ہے۔ ایک ہزار کے قریب کتابیں اور چند سرخ پتھر کے مجسمے چنپائی کی تین تصویریں اور ایک اؤنٹ کی اوچھڑی کا لمپ اور تین پاکستانی پھلکاریاں، ایک تانبے کا آفتابہ۔ یہ سب ساتھ لایا تھا۔ ان کا درجہ سے دل میں لہو کی ایک بوند نظر آتی رہتی ہے۔

میرے شغل تین قسم کے ہیں۔ ایک تو سیاسی یعنی شطرنج اور ملاقاتیں

اور جاسوسی اور دعوتیں اور بحثیں اور گفت و شنیدیں اور کراچی کے ساتھ تفرات بازی اور تعین احکام۔ دوسرے پبلسٹی یعنی مسلسل تقریریں بیشتر کشمیر پر۔ بعض پاکستان کے عام حالات پر۔ چند ادب اور دیگر کلچرل معاملات پر۔ میری مانگ بہ نسبت ادب حلقوں کے کالجوں۔ اسکولوں یونیورسٹیوں اور گرجوں میں زیادہ ہے۔ اور رنڈ بروز بڑھتی جاتی ہے۔ اب تک کوئی سو دوسرے لیکچر دے چکا ہوں۔ اور اس سطح میں اکثر سفر میں رہتا ہوں۔ دنیا میں ہمارا دشمن بھارت ہندوستان کے اور کوئی نہیں ہے۔ لیکن ہندوستان کا نام بڑا ہے۔ گاندھی اور سانپ اور ساڑھی اور بھان متی اور شیر اور مانتھی سب اس کے حصے میں آتے ہیں۔ پاکستان سے لوگ کم واقف ہیں۔ کما حقہ پبلسٹی کے لئے کھربوں روپیہ چاہیے۔ اس لئے جو موقع مل جاتے ہیں۔ ان سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اکثر لوگ صاف دل لیکن ہندوستان سے بے حد مرعوب ملتے ہیں۔ تاہم معقول بات کیجئے تو اثر پذیر ضرور ہوتے ہیں۔ ایک گرجے میں لوگ پاکستان کے حالات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ لیکچر کے بعد سب نے زانوؤں کے بل کھڑے ہو کر پاکستان کی بہبود کے لئے دعا مانگی۔ اور ایک مذہبی HYMN میں پادری صاحب کے تصنیف کردہ دو بند پاکستان کے متعلق شامل کر لئے۔ کالجوں اور سکولوں کے بیشتر طالب علم میرے گھر کے طواف کرتے رہتے تھے اور پاکستان کے ٹکٹ اور تصویریں اور پمپلٹ مجھ سے لے جاتے ہیں۔ ان دو شعبوں سے فراغت ملے تو ادبی ذوق کی آبیاری کرتا ہوں۔ یہاں پڑھے لکھے لوگ زیادہ ہیں۔ علماء کم دیکھنے میں آتے ہیں بھڑکین اس قدر مختلف ہیں کہ گھنٹوں ہنر بانی کے بعد بھی ہم خیالی کم نصیب ہوتی ہے۔ بے چاروں کی سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ جب امریکہ کے پاس سب کچھ موجود ہے تو اسے لوگ اپنے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔

کلچرل دنیا میں سب کچھ حاصل کر لیتے ہیں۔ بجز عین مذاق کے۔ چنانچہ حسن کو لپ اسٹک اور ہوائی جہاز میں ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ روپے اور سامان کی بہتات ہے۔ جتنا کھا سکتے ہیں۔ اس سے دگنا بھینک دیتے ہیں۔ دکانیں اثاثہ سامان سے بھری رہتی ہیں۔ اشتہاروں کی وہ ہزار ہے کہ سوچ چاند نظر نہیں آتے۔ ایک اخبار کے سنڈے ایڈیشن میں اتنا کاغذ لگاتے ہیں کہ پاکستان کے سب اخباروں میں سال تک اس پر پھپکتے ہیں۔ تاہم خوش نہیں رہتے۔ کسی چیز پر قانع نہیں ہوتے اور ایک بے قراری سی ہر وقت ان پر مسلط رہتی ہے۔ جب موقع ملے ایک آدھ دن ہاورڈ یونیورسٹی میں جا کر گزارتا ہوں۔ وہاں رچرڈ ز صاحب انگریزی کے پروفیسر ہیں۔ کیمبرج میں میرے استاد تھے۔ ان کی مردت کی وجہ سے وقت وہاں اچھا کٹ جاتا ہے۔

ان ہی کی بدولت میرے وہاں چند پیکر بھی انگریزی اور امریکن اساتذہ کے متعلق ہوئے۔ نیویارک میں دوست مشکل سے دستیاب ہوتے ہیں۔ ذہنی اور مادی دونوں قاصدے زیادہ ہیں۔ دوستوں کا جھگڑا جس کے ہم عادی ہیں۔ وہ یہاں بیٹھ نہیں۔ بجز اس کے کہ ایک "پارٹی" کا ایک وقت۔ لیکن میں نے پارٹیاں صرف سیاست دانوں کے لئے وقت کر رکھی ہیں۔ ان سے عہدہ برآ ہونے کے بعد پیسہ ہی اتنا پاس نہیں ہوتا کہ انسان پاؤں پھیلا سکے۔ لیکن دو تین مصنفوں اور ایک آدھ تھیٹر کے ارباب حل و عقد سے ملاقات ہے۔ ان کی بدولت کبھی کبھار شام رنگیں ہو جاتی ہے۔ مگر آپ جانتے ہیں دوستی کے جو رشتے شباب میں قائم ہو جائیں۔ ان کا بدل باقی تمام عمر میں نصیب نہیں ہوتا۔ اس لئے تشنہ رہتا ہوں۔ اب کچھ آندو کی کتابیں بھی منگوا آئی ہیں۔ تین چار مہینے آندو کی صورت سے محروم رہا۔ پیاس کے مارے زبان باہر کھنے لگی تھی۔

صحت کے متعلق پریشانی رہتی ہے۔ ڈاکٹروں سے چھٹکارا نہیں ہوتا۔ خدا حکومت پاکستان کا بھلا کرے۔ کہ علاج معالجے کے اخراجات وہ برداشت کرتی ہے۔ ورنہ یہاں کی فیسیں ایسی ہیں کہ خود ادا کرتی پڑتیں تو مرہ ہی خراب ہوتا۔ ذیابیطس مجھے نہیں۔ مگر احتیاط ضرور کرنا پڑتی ہے۔ پھر کچھ سرطان کے عود کا شبہ ہوا۔ مگر جگر میں خرابی پیدا ہوئی۔ چنانچہ ہر ہفتے ایک نہ ایک ٹسٹ ہوتا رہتا ہے۔ ناک میں دم آگیا ہے۔ (ان باتوں کا ذکر زبیدہ سے ہرگز ہرگز نہ کیجئے گا۔ وہ بھاری ناسخ پریشان ہوگی)۔

اجاب سے محض بے خبر ہوں۔ تاثیر کی موت کا اب تک یقین نہیں آتا۔ آغا مجید کی شادی پر تہنیت کا ان کو ایک تار دیا۔ جواب نہ آیا۔ حسرت، صوفی، لاشمی، عابد کسی نے بھی خط نہیں لکھا۔ (مہرم میں بھی ہوں)۔ ذوالفقار مجھ سے بلا وجہ رنجیدہ ہے۔ اس کی بچیوں کو یہاں سے کچھ تحائف بھیجے۔ اسے بھی ایک دو خط لکھے۔ لیکن کسی چیز کا جواب نہ آیا۔ جو پاکستانی یہاں آتے ہیں۔ ان سے داستا نہیں سنتا رہتا ہوں۔ لیکن وہ اپنی دنیا کا حال بیان کرتے ہیں۔ میری دنیا کی بات کوئی نہیں کرتا۔ تباہی شعرا ایک برس سے نہیں سنتا۔ بار بار وہی شعر گنگناتا رہتا ہوں۔ جو عہدِ رنگیں میں فردوسِ گوش ہوتے تھے۔ مارمونیم ساتھ لایا تھا۔ کبھی کبھی اس پر فوالی گاتا ہوں۔ پاکستانیوں میں سے محمد علی، آفتاب، عبدالقیوم، زبیدہ، ایچی خاں، عبدالقادر، غلام محمد وغیرہم یہاں آتے جاتے ہیں۔ ان سے چند مجلسیں قائم ہو جاتی ہیں۔ لیکن بلا لوشوں کو اس سے کیا نسیکین ہو سکتی ہے۔ بڑھانا بھی آرہا ہے۔ اس کا احساس مجھے ابھی تک نہیں ہوا۔ لیکن آثارِ قوائد سے کو بھی دکھائی دیکھ رہے ہیں۔ وزیرِ اعظم کے ساتھ جو امریکہ کا دورہ کیا تھا۔ اس سے صحت پر سخت چوٹ پڑی۔ کسی دن

دو تین گھنٹے سے زیادہ نہ سویا۔ اور عظیم ذمہ داری کی وجہ سے میرے اعصاب پر بھی سخت اثر پڑا۔ اس کے بعد آج تک نعتیں نصیب نہ ہوئی۔ اکتوبر، نومبر میں تین مہینوں کے لئے پیرس جانا ہوگا۔ کیوں کہ جنرل اسمبلی اس سال دہاں ہوگی۔ ابادہ ہے کہ بیچ میں گرس کے لگ بھگ دو تین ہفتوں کے لئے کراچی کا چکر لگاؤں۔ لیکن دیکھئے حالات کیا کر دیتے ہیں۔

آپ کی زندگی میں بھی انقلاب کی وفات سے انقلاب آگیا ہوگا۔ خدا کرے۔ آپ کی ہمت میں خم نہ آئے۔ اپنے حالات سے مجھے مطلع رکھیے گا۔ انشا اللہ اب میں خط و کتابت میں کوتاہی نہ کروں گا۔ خط ضرور لکھیے کوئی شعر مل جائیں۔ تو وہ بھی بھیج دیجئے گا۔ کوئی کتاب کام کی ہو تو وہ بھی۔ منصور سے کہیے۔ فارن آفس کی معرفت ڈیپو میٹک بیگ میں بھجوادے گا۔

خاکسار

بخاری

اس خط پر نظر ثانی کی۔ تو احساس ہوا۔ کہ رونا رویا ہے اور پتہ مردگی کے سوا کم کسی چیز کا ذکر کیا ہے۔ اسے مکمل تصویر نہ کیجئے۔

پہلا خط ہے۔ اس لئے دکھڑا سا معلوم ہوتا ہے۔

بخاری

بنام مولانا غلام رسول قہر

یہ مکاتیب مختصر سی تمہید کے متقاضی ہیں۔

۱۔ یہ اس زمانے کے ہیں۔ جب بخاری صاحب کی خدمات آل انڈیا ریڈیو نے مستعار لے لیں تھیں۔ حکومت پنجاب کے روبرو ان کے گریڈ کا معاملہ پیش ہوا۔ تو یہ اعتراض اٹھا۔ کہ جن اصحاب کی خدمات دوسرے محکموں میں منتقل ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنی سابقہ تنخواہ سے زیادہ تنخواہ وصول کرتے ہیں۔ نئے محکمے میں ترقی کے زیادہ مواقع ہوں گے۔ تو ان سے فائدہ اٹھانے ہیں۔ اور سابقہ محکموں میں نہ صرف اپنی ملازمتوں کا رشتہ استوار رکھتے ہیں۔ بلکہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ گریڈ سے اسی طرح مستفید ہوتے رہیں۔ جس طرح اصل محکمے میں رہ کر رہتے ہوئے مستفید ہوتے۔ ان حالات میں اس وقت کی حکومت پنجاب کا رجحان یہ تھا۔ کہ کسی ایسے شخص کو گریڈ سے مستفید ہونے کا موقع دیا جائے جو اصل محکمے میں برسرِ کار ہوں۔

۲۔ اس وقت سردار سکندر حیات خاں مرحوم نے وزارت قائم کر رکھی تھی۔ اور میاں عبدالحی مرحوم وزیر تعلیمات تھے۔ کسی نے میاں صاحب اور

سردار صاحب دونوں سے عرض کیا تھا کہ اول جس شخص کی خدمات سے کوئی دوسرا محکمہ فائدہ اٹھانے پر آمادہ ہو جائے۔ بلازائدہ وسیع صلاحیتوں کا مالک ہوگا۔ اور اسے ان خوبیوں کی سزا نہ دینی چاہیے۔ دوسرے بخاری صاحب کی غیر معمولی شخصیت ہمیشہ کی تھی۔ اور کہا تھا کہ ان کے معاملے

کو مستحق سمجھا جاسکتے۔ دونوں نے میری یہ استدعا قبول کر لی اور بخاری صاحب کو گریڈ مل گیا۔

۳۔ مسٹر من موہن ڈپٹی ڈائریکٹر تعلیمات تھے اور جن اصحاب کو ان سے ملاقات کا موقع میسر آیا۔ وہ اعتراف کریں گے کہ موصوف بلند قابلیت اور بلند اخلاق کے افسر تھے۔ آج یہ حقیقت عرض کر دینا غالباً غیر مناسب نہ ہو کہ مسٹر من موہن کے خلاف سب سے زیادہ شکایات جنوبی و مشرقی پنجاب کے جاٹ ممبروں نے ہمیشہ کی تھیں جو اتحاد پارٹی کا ایک اہم عنصر تھے۔ اور جو بھدی جھوٹورام کو اصل طور پر تھا کہ مسٹر من موہن کو ڈپٹی ڈائریکٹر سے ہٹا دیا جائے۔ اس سلسلے میں بڑی تگ و دو کی ضرورت پیش آئی۔ یہاں تک کہ جھوٹورام کی خدمت میں بھی تمام تفصیلات عرض کر کے انہیں راضی کیا گیا۔ کہ مسٹر من موہن وقت کے لحاظ سے بہترین شخص ہیں۔ مسٹر من موہن بخاری صاحب اور بعض دوسرے اصحاب کے عزیز دوست تھے۔ ان سب نے اس دورِ ابتلا میں موصوف کے لئے ہر ممکن کوشش کی تھی۔ یہاں تک کہ بخاری صاحب نے ان کے معاملے کو اپنے معاملے پر بھی مقدم رکھا۔ اس کا نتیجہ بھی حسبِ مراد نکلا۔ یعنی مسٹر من موہن اپنے عہدہ پر برقرار رہے۔

۴۔ دھرم پور میں ملاقات نہ ہو سکنے کا یہ معاملہ ہے۔ کہ بخاری صاحب اپنے حقوق کے سلسلے میں ڈائریکٹر صاحب تعلیمات نیز وزیر تعلیمات و قذیر اعظم سے منے کے لئے شملہ گئے تھے۔ میں اس زمانے میں اپنے بھائی کے پاس سناور میں ٹھہرا ہوا تھا۔ جو دھرم پور کو بہتان شملہ سے قریب ہے۔ فون کے ذریعے سے طے ہو چکا تھا۔ کہ میں دھرم پور پہنچ کر ان سے مل لوں گا۔ بخاری صاحب کو شملہ سے آنے میں دیر ہو گئی۔ اور کسی قدر اندھیرا ہو گیا۔ میں دھرم پور

اسٹیشن پر بیٹھا رہا۔ جب کوئی موٹر آتی۔ کسی آدمی کو بھیج کر دریافت کرا لیتا۔ بخاری صاحب اسٹیشن سے آگے نکل کر اس سڑک پر میرا انتظار کرتے رہے۔ جو کسوی اور سناور کی طرف جاتی ہے۔ میں مایوس ہو کر سناور چلا گیا۔ وہ مایوس ہو کر کالکا پہنچے۔ اور وہاں سے سناور ٹیلی فون کرتے رہے۔ چونکہ میں دھرم پور میں تھا۔ اس لئے فون پر گفتگو نہ ہو سکی۔ سناور پہنچنے پر ان کے فون کا علم ہوا۔ تو وہ کالکا سے ٹرین میں سوار ہو کر دہلی جا چکے تھے۔

۵۔ بخاری صاحب نے ایک مکتوب کے آخر میں لکھا ہے کہ اول اس کی رسید بھیجی جائے۔ دوسرے اسے پڑھنے کے بعد چاک کر دیا جائے۔

اس آخری ارشاد کا مدعا یہ تھا۔ کہ خط کسی کے ہاتھ نہ پڑ جائے۔ کہ اس کی اشاعت سراسر خلاف مصطمت تھی اور میں نے اسے چاک نہ کیا اور یہ ارادتا نہیں۔ بلکہ اتفاقیہ محفوظ رہ گیا۔ اب اس کی اشاعت کسی بھی مصطمت کے خلاف نہیں۔ اور یہ اس عزیز دوست کی نگارشات کا بیک مرتع ہے۔ جس پر تقریر کو اس وقت ایک بیش قیمت تھے کی حیثیت حاصل ہے۔

۳۰۔ پرتوی راج روڈ نئی دہلی۔

بروز اتوار

مشفق محترم!

نہ معلوم کیا بات ہوئی۔ دھرم پور میں آپ دکھائی نہ دیئے سناور کی سڑک اور بڑی سڑک کے مقام اتصال پر میں آدھ گھنٹہ انتظار کرتا رہا۔ پھر مایوس ہو کر چلا گیا۔ کالکا پہنچ کر آپ کو سناور ٹیلی فون

کیا۔ اور ساڑھے نو بجے تک تین مرتبہ ٹیلی فون کیا۔ لیکن آپ سناور میں تشریف فرما نہ تھے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ آپ ضرور دھرم پور تشریف لے گئے ہوں گے۔ اور دہلیں میرے منتظر ہوں گے۔ مجھ سے نہ مل کر آپ کو بے انتہا کوفت ہوئی ہوگی۔ جس کے لئے میں بہت تادم ہوں اور معافی کا خواستگار ہوں۔ معلوم ہوتا ہے۔ میری بصارت نے مجھے دھوکا دیا۔ آپ ضرور سڑک پر ہوں گے۔ لیکن مجھے نظر نہ آئے تھے۔

بہر حال شعلے کی داستان سُن لیجئے۔ ڈائریکٹر صاحب سے ملا پھر میاں صاحب قبلہ سے ملا۔ دونوں نے حامی بھری کہ تمہیں سلیکشن گریڈ دے دیا جائے گا۔ اس مسئلے پر کہ میں پنجاب میں واپس آؤں۔ یا آؤں تو کب آؤں۔ بحث ہی نہ ہوئی۔ بلکہ اس بات کا ذکر تک نہ آیا۔ میں نے بھی اسے چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔ کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس وقت میں نے واپس آنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ تو میاں صاحب کو گونا گوں دقیقہ پیش آئیں گی۔ اور میں نہیں چاہتا کہ انہیں اس وقت مشکلات میں مبتلا کیا جائے۔ جب انہوں نے مجھے بغیر واپس بلانے کے سلیکشن گریڈ دینے کا وعدہ کر لیا۔ تو اس پر اکتفا کرنا چاہیے۔ میاں صاحب کا رویہ از حد مشفقانہ اور ان کا سلوک بہت ہی اچھا تھا۔ خدا ان کو خوش رکھے۔ انہوں نے ہر طرح سے میری تسلی کر دی۔ وزیر اعظم صاحب سے بھی ملا۔ انہوں نے بھی امداد کا وعدہ کیا۔

اب سوال یہ ہے کہ آپ کو شملہ جانے کی تکلیف دی جائے یا نہ، بظاہر تو اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن فی الحقیقت اس کی ضرورت ابھی تک موجود ہے۔ جانے سے قابض نہ ہو۔ لیکن نہ

جانے سے اغلباً نقصان ہوگا۔ اس لئے مجھ پر اتنا کرم کیجئے۔ کہ ایک دن کے لئے شمسہ چلے جائیے۔ میاں صاحب سے مل کر پوچھئے۔ کہ سلیکشن گریڈ کے متعلق انہوں نے کیا فیصلہ کیا۔ اور میرے واپس پنجاب آنے کا تذکرہ نہایت سرسری (وہ بھی اگر ضرورت پڑے تو) کیجئے۔ ورنہ خیر۔ میاں صاحب سے ملنے سے پہلے من موہن سے ضرور مل لیجئے۔

اس کے علاوہ ایک اور کام ہے اور وہ شاید میرے کام سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بعض شریر لوگ اور بعض نیک مگر غلط فہمی میں مبتلا لوگ اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ من موہن کو موجودہ عہدے سے ہٹا دیا جائے۔ ڈائریکٹران کے کام سے خوش ہیں۔ میاں صاحب خود ہر طرح سے خوش اور مطمئن ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ خواہ مخواہ من موہن پر کلنک کا ٹیکہ لگایا جائے؟ لیکن اہل غرض کا دباؤ دُور تک پہنچ چکا ہے۔ جب میں شمسہ سے سے روانہ ہوا۔ حالات تشویش ناک تھے۔ آپ سے ملاقات ہو جاتی تو بیشتر وقت میں اسی بات پر صرف کرتا۔ اب حقیقت یہ ہے۔ کہ حکومت خواہ مسلمانوں کی ہو خواہ ہندوؤں کی۔ ہندوؤں افسروں کا وجود تو ضروری ہے۔ مگر یہ سچ ہے تو کیا وجہ ہے کہ ایسے ہندوؤں کی حمایت نہ کی جائے۔ جو لائق، فہیم اور ایماندار ہیں۔ اور خدا گواہ ہے۔ کہ من موہن سے بہتر آدمی اس وقت کسی مذہب میں بھی نہیں مل سکتا۔ ان کا رلیکار ڈھب سے ضعیف ٹھے سے بھی پاک ہے اور ان کی دیانت اور احسانیت مسلم ہے۔ اور پھر کوئی ایسا مسلمان افسر بھی موجود نہیں۔ جو ان کی جگہ مقرر کیا جاسکے۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ انہیں خواہ مخواہ پریشان کیا جائے اور وہ اس قدر دگھیر ہیں۔ کہ استغفا تک دیتے یہ آمادہ ہیں۔ ذرا ان سے مل لیجئے۔ اور اس کام کو میرے

کام سے بھی ضروری سمجھ کر ان کی حد دیکھتے۔ میں آپ کی عنایتوں کا بے انتہا ممنون ہوں۔ آپ نے میرے لئے بہت زحمت برداشت کی۔ اور آپ کا احسان عمر بھر نہ بھولوں گا۔ آخر میں دو ضروری باتیں عرض کرتا ہوں۔ ایک تو اس خط کی رسید ضرور بھیجئے۔ دوسرا اسے پڑھ کر چاک کر دیجئے۔

خاکسار
بخاری

۲۰۔ پرنسوی راج روڈ، نیروہلی

۵۔ جون

محترم دوست

سلام مسنون! میں ایک معافی کی عرضی پہلے آپ کی خدمت میں بھیج چکا ہوں۔ اب گرامی نامہ آنے پر دوبارہ لکھ رہا ہوں۔ یقین مانتے کہ میں از حد شرمندہ ہوں۔ کہ آپ کو از حد زحمت ہوئی۔ واللہ اس میں میں بالکل بے قصور ہوں۔ دھرم پور میں آپ کو تلاش کیا۔ سٹاؤد کی سڑک اور بڑی سڑک کے مقام اتصال پر طویل انتظار کیا۔ کالکا پہنچ کر دو تین مرتبہ آپ کے نام سے آپ کو پرسنی ٹیلی فون کیا۔ اور ایک تو نہ ملنے کا اور دوسرے آپ کو اس قدر تکلیف دینے کا۔ ان دونوں باتوں کا انتہائی افسوس دل میں نے کر آیا۔ اللہ مجھے معاف کر دیجئے۔ میں از حد نادام ہوں کہ آپ جیسے مشفق کرم فرما کو اس قدر سنجے پہنچا یا۔ اور وہ بھی اس حالت میں کہ آپ میرے کام کے لئے اس قدر تکلیف اٹھا رہے تھے۔ میں نے اپنی طرف سے ہر ممکن احتیاط برتی۔ اور ہر پیش قدمی کی۔ لیکن میری بد قسمتی

اور انتہائی بد قسمتی کہ بجائے اس کے کہ آپ کا شکریہ خود اپنی زبان سے آپ کی خدمت میں ادا کر سکتا۔ اگلا آپ کو پریشان کیا۔
میں کل ایک مفصل خط لکھ چکا ہوں۔ اب اپنے کسی کام یا غرض کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ کس منہ سے آپ کو کہوں کہ آپ مجھے در خود اعتناء سمجھیے۔ بہر حال اگر آپ جوگستانی یا غفلت میری طرف سے سرزد ہوئی ہے اس کے لئے مجھے معاف کر دیں۔ تو میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھوں گا۔

دوبارہ عرض کرتا ہوں کہ میں از حد تادم اور معافی کا خواستگار ہوں۔ میرا تصور میری بد قسمتی کے سوا کچھ نہیں اور آپ کی پریشانی کی کوئی قیمت میں ادا نہیں کر سکتا۔ سوائے اپنے مجز و انکسار کے۔
گر قبول افتد زہے عز و شرف
خط مکان کے پتہ پر لکھا کیجئے۔

خاکسار
بخاری

۲۰۔ پھر تھوڑی راج روڈ، نئی دہلی

برادر محترم

سلام مسنون!

پنے درپے آپ کو دق کر رہا ہوں۔ لیکن آج گرامی نامہ مورخہ
۵۔ جون ۱۹۵۱ء میں ایک فقرہ آیا ہے کہ
”بہر حال اس معاملے میں آپ کی طرف سے جواب کا انتظار
ہوگا۔“

بمقتضا اس فقرے کے آج پھر آپ کی خدمت میں پیش

ہو رہا ہوں۔ واپسی کا مسئلہ اس وقت چھیڑنا اس لئے مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ

۱۔ گریڈ اور واپسی بیک وقت دو سکتے سامنے آجانے سے صاحب موصوف کو پریشانی ہوگی۔ اور ایک کے پیچھے دوسرا بھی معرضِ خطر میں پڑ جائے گا۔

۲۔ اگر میں واپس نہ آؤں اور یہیں گریڈ مل جائے تو اس گریڈ میں وہاں کوئی اور قائم مقام ہوگا۔ چنانچہ ایک کی بجائے دو آدمیوں کا بھلا ہو جائے گا۔ اغلباً صاحبِ موصوف کو یہ شکل زیادہ مرغوب ہوگی۔

۳۔ بعض کوائف یہاں ایسے ہیں کہ اگر میں فی الحال کچھ عرصے یہاں اور ٹھہر جاؤں تو غیر مناسب نہ ہوگا۔

۴۔ واپسی کا مسئلہ ہر وقت چھیڑا جاسکتا ہے۔ بلکہ واپسی کا حق میرے پاس ہے۔ جب چاہوں واپس کر سکتا ہے۔ کوئی مجھے روک نہیں سکتا۔ اور کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ جب واپسی کا موقع آئے گا۔ تو اس وقت اس مسئلے کو بھی چھیڑا جاسکتا ہے۔ کہ کسی عہدے پر واپس آؤں۔

۵۔ گریڈ کا مسئلہ جولائی کے شروع میں ختم ہو جانا چاہیے۔ اس کے بعد اگر اکتوبر تک بھی واپسی کا سامان ہو گیا۔ تو جو مصالح آپ کے پیش نظر ہیں ان کو گزند نہ پہنچے گا۔

۶۔ فی الحال میری واپسی کی وجہ سے صاحبِ موصوف کو یقیناً بعض وقتیں پیش آئیں گی۔ جن کی وجہ سے وہ پریشان ہوں گے

اور ان کی قوتِ فیصلہ تذبذب ہو جائے گی۔ کچھ عرصہ بعد حالات میں زیادہ سہولت کی گنجائش ہوگی۔

ان سب باتوں پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ فی الحال باقی سب باتوں سے قطع نظر کر کے گریڈ کے معاملے کو بچتہ اور بہت بچتہ کر لینا چاہیے۔ اصل چیز یہی ہے۔ واپسی کا مسئلہ ایسا ہے کہ اسے ہر وقت اٹھایا جاسکتا ہے۔ جتنا کہ آج۔ البتہ آج اٹھانے سے گریڈ کے معاملے میں کچھ رکاوٹیں حائل ہو جائیں گی۔ اور ممکن ہے کہ غلط بحث کی رو میں اصل مقصد بھی بہہ جائے۔ چنانچہ میرا مشورہ یہی یہی ہے کہ آپ اپنی جانب سے گریڈ کی گفت دشنید کو خاطر خواہ طور پر منہتمم کر آئیے۔ واپسی کے مسئلے کو ہلکے سے چھیڑ دیجئے۔ اور کہیے کہ اس پر انشا اللہ تعالیٰ سردیوں میں مفصل بحث ہوگی۔ یا ایسی ہی کوئی بات کہہ دیجئے۔ تاہم اس پر گفتگو کرنے کا حق بھی آئندہ کے لئے برقرار رہے اور گریڈ کا کام فی الحال یکسوئی سے ہو جائے۔

جن مصالح کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ وہ بہت اہم ہیں اور یقین مانئے کہ میں اس قدر خود غرض نہیں کہ مجھے ان کا بحیثیت مصالح ملی کے کبھی خیال ہی نہ آیا ہو۔ لیکن میں نے اہل رائے سے جب اچھی طرح مشورہ کر لیا۔ تو طریق کار وہی بہتر معلوم ہوا جو میں عرض کر چکا ہوں۔

جب صاحب موصوف سے آپ مل چکیں تو مجھے اس کے نتیجے سے ضرور مطلع فرمائیں۔ کہ میں چشم براہ رہوں گا۔

دھرم پور میں ملاقات نہ ہونے کا واقعہ عمر بھر کے لئے ایک لطیفہ بن کر رہ جاتا۔ بشرطیکہ اس میں مجھے ندامت کا احساس نہ ہوتا۔ بہر حال جب آپ کی کوفت دور ہو جائے گی اور آپ بالکل معاف کر دیں گے۔ تو مجھے بھی اس واقعہ پر ہنسنے کی جرأت ہوگی۔ کیونکہ واقعہ فی الواقع مضحکہ انگیز ہے۔ کہ دو عاقل و بالغ جو سوئبر کی فرض

سے ایک دوسرے کے منتظر تھے۔ ایک دوسرے کو باوجود تلاش کے نہ دیکھ سکے۔

زخود در جستجوئے خویش رفتم
 عیارم سمرمہ چشم عاشقاں را
 بندہ خاکسار
 بخاری

۹ اشوکا روڈ، نئی دہلی

۱۳ نومبر

برادرِ محترم سلام مستون و تہنیتِ عید۔

گرامی نامرطا۔ جس نے مجھے صنفیے میں ڈال دیا۔ بیس فیصدی کا اضافہ تو غیر معمولی بات نہیں۔ جب خدمات مستعار لی جائیں۔ تو عموماً یہی ہوتا ہے۔ لیکن سوچتا ہوں کہ یہ ہو لیا تو بہر حال استقبال کیا ہے۔ بہت کچھ سوچنے کے بعد فیصلہ کیا تھا۔ کہ واپسی پر کالج کا تقرر ہونا چاہیے۔ لیکن پوزیشن سامنے رکھ کر کام کرنا چاہیے۔ لیکن جو پوزیشن اب آپ نے بیان کی ہے۔ اس سے تو استقبال کے سبب دروازے اغلباً بند ہو جائیں گے۔ نہ معلوم آپ نے اس پہلو پر غور کیا یا نہیں۔ اس لئے قدرے متامل ہے۔ لیکن متامل کرتے ہوئے بھی متامل ہوتا ہوں۔ کیونکہ آپ نے لکھا ہے کہ "متامل اربابِ نظر کے لئے تکدر کا باعث ہوگا"۔ اس فقرے نے کچھ خائف کر دیا۔ اس کی تفصیل اگر

۱۔ آپ کر سکیں تو سوچنے میں آسانی ہوگی۔ اس لئے آپ کے مزید خط کا منتظر ہوں۔

۲۔ کیا یہ صورت تو نہیں کہ واپسی پر میرا کہیں کھپانا مشکل نظر آ رہا ہے۔ بلکہ اس کے کہ اوروں کو متزلزل کیا جائے، اس لئے یہ تجویز ہو رہی ہے؟

۳۔ علاوہ برآں اب تک سلیکشن گریڈ کا فیصلہ نہیں ہوا۔ اس کا انتظار بسا اوقات مایوسی کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ اس لئے پہلے وہ بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

ان تینوں امور پر آپ روشنی ڈال سکیں۔ تو میں کچھ رائے بھی دے سکوں۔ اور ضرورت ہو تو خود بھی آ جاؤں۔ گو ہفتہ اتوار سے پہلے آنا مشکل ہوگا۔ میں نے اپنا پتہ خط کی پیشانی پر لکھ دیا ہے۔ اسی پتہ سے خط بھیجئے گا۔ تاکہ ملنے میں تاخیر نہ ہو۔ سلام شوق۔

حاکسار

بخاری

۱۔ تیرے وعدے پر جیتے ہم۔۔۔۔۔ الخ
۲۔ ساک بے مہر کو آتے دیکھا۔ میری بد قسمتی کہ آپ کا گھر دستے میں داخل تھا۔

بخاری

۳۔ آپ خط کا جواب ہمیشہ کسی ایسے کاغذ پر دیتے ہیں۔ جو انگریز لوگ حوائج ضروریہ کے سلسلے میں استعمال کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ عدیم الفرستی کی وجہ سے بیت الخلاء میں بھی خط لکھنے رہتے ہیں۔ لہذا ایک سادہ کاغذ بھی ارسال خدمت

۷۔

۱۶ مراد یہ ہے کہ سالک اکیلے تھے۔ میرے ساتھ نہ تھا۔ دوسرے معنی ظاہر ہیں۔

۱۷ بخاری صاحب اس زمانے میں بیڈن روڈ پر اس مکان میں رہتے تھے۔ جو شاہ ابوالمعالی والے چوک اور فلیمنگ روڈ والے چوک کے تقریباً وسط میں تھا۔ میں اس کے قریب رہنماں بلڈنگ میں موجودہ قومی دواخانے کی بالائی منزل میں رہتا تھا۔ سالک صاحب بیل روڈ پر مقیم تھے۔ بخاری صاحب اپنے مکان کے برآمدے میں بیٹھے تھے۔ دُور سے دیکھا کہ سالک صاحب آ رہے ہیں۔ لیکن وہ راستے میں میرے ہاں ٹھہر گئے۔

۱۸ جو کچھ لکھنا ہوتا تھا۔ پنسل سے مضمون لکھنے کا سپیوں پر لکھ دیتا تھا۔ بخاری صاحب کے نزدیک وہ کاغذ حوائج ضروریہ میں استعمال کا مستحق ٹھہرا۔

۱۹ تاکہ جواب اس پر لکھوں۔

صوفی غلام مصطفیٰ اتہم

کے نام

۱

نیویارک

عزیزی و محبتی !

سلام مسنون !

ابھی ابھی ایسی کا خط ملا۔ جس سے آپ کی اہلیہ مرحومہ کے انتقال کا علم ہوا۔ عین مصروفیت کا زمانہ ہے۔ اسمبلی کا اجلاس روزانہ ہوتا ہے۔ اجلاس گاہ ۲۵ میل دُور ہے۔ صبح جاتے ہیں۔ رات کے ساڑھے سات بجے لوٹتے ہیں۔ یک لخت ارادہ کیا۔ کہ آپ کو تار ڈوں۔ کسی زمانے میں تار مستعدی اور جذبہ فرمائی کی علامت تھا۔ کاروبار کے سلسلے میں اتنے تار بھیجے ہیں، کہ ان کی حقیقت کھل گئی ہے۔ کہ تار کاہلی اور اتمام حجت کی ایک ترکیب معلوم ہونے لگا ہے۔ اس لئے اس اتوار (یعنی آج) کا انتظار کیا۔ تاکہ آپ کو خط لکھ سکوں۔ بو صدمہ آپ کو پہنچا ہے۔ اس کے متعلق میں کیا بات ایسی کہہ سکتا ہوں۔ جو پامال اور بے معنی نہ ہو گئی ہو۔ لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ایک مرتبہ نہیں سو مرتبہ آپ کے گھر کا

نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ آپ کی بے فکری، آپ کی ضیافتیں، آپ کی مجلسیں انہی کی طفیل تھیں۔ نہ معلوم اب آپ پر کیا گزرمے گی۔ یقیناً آپ کو بار بار ایک ایسا خلا محسوس ہوتا ہوگا۔ جس کو اب آپ کسی طرح پُر نہیں کر سکتے۔ میری ہمدردی بے کار ہے۔ تاہم اگر اس سے آپ کا غم ذرہ بھر بھی کم ہو جائے۔ تو مجھے اطمینان ہوگا۔ خدا ان کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ اور خدا آپ کی زندگی کا انتظام آپ پر آسان کر دے۔ مرنے والے مر جاتے ہیں۔ زندہ کا خیال نہیں کرتے۔

عبینہ بھر ہوا۔ میں نے مستعدی سے ایک نادر لمحہ میں ایسے کو ایک طویل خط لکھا تھا۔ خیال تھا۔ دوستوں کے دل کو اس سے دستک ہوگی۔ ایسے سے کہا بھی تھا۔ کہ خط اجاب میں نشر کر دینا۔ اگر وہ آپ کی نظر سے گذرے گا۔ تو میری زندگی کا نقشہ آپ کو معلوم ہوگا۔ نئے ملک میں گھر یاد کرنا خصوصاً اس عمر میں جب کہ عادتیں راسخ ہو چکی ہوں۔ اور دل کا درجہ حرارت تنزل پر ہو۔ ایک مہم ہے۔ بہر حال کچھ صورت سہولت کی پیدا ہو ہی گئی ہے۔ صحت کے متعلق

تشویش رہی اور تشویش سے زیادہ مصروفیت۔ یا انسان ڈاکٹروں کا ہو رہے۔ یا زندہ رہنے کی کوشش کرے۔ دونوں باتیں مشکل سے یکجا ہوتی ہیں۔ ڈاکٹروں کی گود میں بیٹھ رہنا زندگی نہیں۔ حمید الدین سے ایک مفصل ملاقات ہوئی تھی۔ لیکن اب یہ دوہینے پرانی بات ہے۔ ذرا اسمبلی کا کام ہلکا ہوئے۔ تو پھر ان سے ان کے دل کا حال سنوں گا۔

آپ کو خطوں کی اتنی ضرورت نہ ہوگی۔ جتنی مجھے ہے۔ سالک کو میرا پیار اور سلام کہیے گا۔ انہیں بھی خط لکھنا ہے۔ ہو سکے تو مجھے کوالف

ستہ آگاہ کیجئے۔ عابد، ہاشمی، تاثیر اور دیگر احباب آج کل کس بحر
میں شعر کہتے ہیں۔

خاکسار

بخاری

۱۷۔ اپریل ۱۹۵۹ء

صوفی میرے بھائی۔

ایلیس فیض کی معرفت آپ کو شاید میرا پیغام پہنچا ہو۔ کہ مجھے
یہاں اس سال کے دوران، ایک یونیورسٹی میں اردو زبان اور ادب
کی تاریخ و ارتقاء پر چند لیکچر دینے ہیں۔ چاہتا ہوں۔ اس کے لئے مکمل
تیاری کروں۔ اور آپ کی خدمت میں بوسیہ ایلیس یہ درخواست کی
تھی کہ فی الحال ایسی کتابوں کی فہرست (تیس یا چالیس) بھیج دیجئے۔
جنہیں پڑھ لینا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ ان میں کلیات اساتذہ اور تنقید
کی کتابیں (اردو اور انگریزی) سب شامل ہوں گی۔ چنانچہ آپ بھی
فہرست مرتب کرتے وقت اس بات پر نگاہ رکھیے۔ جب یہ فہرست
میرے پاس پہنچ جائے۔ تو دیکھوں گا کہ اس میں کون کون سی کتابیں
یہاں موجود ہیں۔ باقی پاکستان سے منگوا لوں گا۔ فی الحال صرف فہرست
کتب مطلوب ہے۔ جو آپ سے بہتر کوئی مرتب نہیں کر سکتا۔ کیونکہ
آپ اس مضمون کے ماہر بھی ہیں۔ اور مجھے دعوت ہے کہ میرے دوست
بھی ہیں۔ امید ہے کہ یہ دو باتیں آپ کے پر غالب آئیں گی۔
آپ کے بغیر میں بالکل یہاں بے دست و پا ہوں۔

لہذا عاجزانہ درخواست ہے کہ اس میں غفلت یا تاخیر نہ کیجئے ممنون
ہوں گا۔ لاہور کے چند بگین ایام ایک ایسا خواب ہے جو محو ہونے

میں نہیں آتا۔ الحمد للہ کہ یہ دن نصیب ہوئے۔ اور دوستوں کو بولتے ہنستے
دیکھ لیا۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔

ندرت کو میرا سلام کہیے گا۔ یہی نام تھا نہ اس دل چپ اور گرم
دل خاتون جو ہوائی اڈے تک آئیں۔ اور جنہوں نے مجھے اپنے غصوں
سے نوازنا۔

میرا یہ پتہ کافی ہے۔ میرا نام

United Nations, New York U.S.A.

خاکسار

بخاری

نیویارک

۲۱ اکتوبر ۱۹۵۸ء

برادیر عزیز

قلم میں وہ اثر کہاں سے لادوں۔ جو آپ کے دل کو گھلا دے۔

باوجود عاجزانہ منت سماجت کے آپ کے خط سے محروم ہوں۔ نہ معلوم

آپ کو کیا ہو گیا ہے؟

سکینہ کی تاریخ ادب اُردو اور مرزا عسکری کی اسی مضمون کی کتاب

کی اشد اور فوری ضرورت ہے۔ لیکن کسے لکھوں۔ سب سے زیادہ بھروسہ

آپ پر تھا۔ لیکن آپ نے وہ چپ سادھی ہے کہ میں بے بس ہو گیا ہوں۔

خاکسار

بخاری

بنام سید ماشم رضا

یونائیٹڈ نیشنز - گزبرگ (پہلیں)
مشغ و مکرری

سلام مسنون!

روما سے ونیس اور ونیس سے پیرس پہنچ گیا۔ یہاں
سے لندن جاؤں گا اور وہاں سے ہفتے عشرے کے اندر انشا اللہ ،
نویارک۔

وطن کا حج ہمیشہ مبارک ہوتا ہے۔ خواہ حالات تلخ یا باعث
تشویش ہی کیوں نہ ہوں۔ اب کے بھی یہی عالم تھا۔ احباب سے
مل کر ایسا اطمینان ہوا کہ اب اُونٹ کی طرح اسے کوہان میں برس
دو برس اٹھائے پھروں گا۔ اور تشنگی اس سے پرڈیس کے صحراؤں
میں بجاتا پھروں گا۔ اس مرتبہ آپ سے بھی ملاقات ہوگی۔ اپنی
خوش قسمتی بردناز تھا۔ قدرے اپنی محرومی کا ماتم بھی کیا۔ کہ اس سے
پہلے آپ سے نیاز کیوں حاصل نہ ہوا تھا۔ آپ جس اخلاق اور محبت
سے پیش آئے۔ اس کی دل کشی ذہن سے محو نہیں ہوتی۔ دوحرف
شکریتے کے لکھ رہا ہوں۔ قبول کیجئے۔

اے وقت تو خوش کہ وقت ماخوش کردی بندہ خاکسار

مجھے اپنا خادم سمجھے اور کوئی خدمت میری لائق ہو۔ تو ہمد شاہ بخاری
ارشاد کیجئے۔ اپنی بیگم صاحبہ سے بھی یہ سلام کہیے گا۔ ۲۳۔ نومبر ۱۹۵۲ء

سید امتیاز علی تاج

کے نام

۱

۲۔ نومبر

ڈائری اقتیاز !

دسمبر کے آخر میں دو مہینے کی رخصت لوں گا۔ جو بیشتر دہلی میں اور
باقی کسی پہاڑی مقام پر گزاروں گا۔ یکم مارچ کو پرنسپل گورنمنٹ کالج کا
چارچ لینا ہے۔

جوں جوں واپسی کے دن قریب آتے جاتے ہیں۔ دل میں محب
امنگیں پیدا ہو رہی ہیں۔ ہیجان کے اتنے سال تم سے وابستہ رہ کر
گزارے ہیں۔ کہ ہر امنگ کے ساتھ تم ہی آپ دل میں چلے
آتے ہو۔ کبھی کبھی ڈرتا ہوں کہ نامعلوم اس درمیانی عرصہ میں
طبیعتوں کی آب و ہوا بالکل ہی بدل نہ گئی ہو۔ لیکن پھر سوچتا
ہوں کہ جوانی کے علاقے اور رستے کبھی ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور کبھی

تق جاتے ہیں۔ لیکن موت سے پہلے ٹوٹتے نہیں اور الحمد للہ کہ تم اور
میں ابھی موت سے بہت دور ہیں۔ اس امید کی بنا پر لاہور آنے
کے خیال سے یجز مسرت کے اطمینان کے کوئی جذبہ دل نہیں اٹھتا۔

تاجستان کی طویل دوپہر میں اور زمستان کی طویل راتیں اور احباب کی طویل پرزہ گونیاں پھر یاد آتی ہیں۔

بہت تنگ گیا ہوں۔ گیارہ سال بجز بیماری کے ایک دن کی رخصت بھی نہیں لی۔ موسم گرما کی تین مہینے کی چھتیاں اور دوستوں کی گرم محبتیں پھر مٹا رہی ہیں۔ زبیدہ واپس جانے پر اتنی خوش ہیں کہ بیان نہیں کر سکتا۔ حجاب کو ہم دونوں کا سلام قبول ہو اور یا سچین کو پیار۔ کل حمید صاحب اور تاثیر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ خدا نریا کی زندگی کو کامران بنائے۔ بہت سی باتیں کرنے کو دل چاہتا ہے۔ لیکن اب ان کے لئے کئی موقع نصیب ہوں گے۔ ۲۰ نومبر کو چند دن کے لئے شاید دورے پر بھی لاہور آجاؤں۔ کیا تم اس خط کے جواب میں خط لکھو گے؟

خاکسار

بخاری

یکم جون

بادشہی بخیر!

"درجینا" ۳ جون سینچر کو دہلی سے ہو رہا ہے۔ رفیع پیر اور رشید خود پارٹ کر رہے ہیں۔ اس لئے عین آخری وقت میں انہوں نے پروڈکشن میرے حوالے کر دی ہے۔ وقت تھوڑا ہے۔ مصروفیتیں زیادہ۔ اس لئے داد فن کاری نہ دے سکوں گا۔ اس کا افسوس رہے گا۔ تاہم ایک آدھ بات آپ ضرور ایسی پائیں گے۔ کہ دل پڑا ہوا نہ ہوگا۔ فرصت ہو تو سن لیجئے گا۔

اور مجھے اپنی رائے سے مطلع کیجئے گا۔ فرست نہ ہو یا —
 RECEPTION بُرا ہو۔ تو لکھ بھیجئے۔ تاکہ آپ کو ریکارڈ بھرا
 دیں اور آپ کسی وقت لاہور اسٹوڈیو میں جا کر اسے سن لیں مدت
 کے بعد کھیل کے سلسلے میں آپ سے پھر تعلق قائم ہوا۔ گو اس کی
 حقیقت بوسہ بہ پیغام جیسی ہے۔ تاہم پرانی یاد تازہ ہوئی اور دل کو
 جیسے کسی نے دستک دی۔ برسات میں دہلی آؤ گے؛ ساکھ اور تم دونوں
 آنے کا پروگرام بناؤ اور یہاں اگر رام پور کے شاہی باغیچے کے آم کھاؤ۔
 بخاری

گورنمنٹ کالج لاہور

۱۰ جولائی

ڈیر اقیاد!

نیویارک کو میں نے چارج ۱۰ جون کو ہی لے لیا تھا۔ خیال تھا
 کہ اس کے بعد مہینے دو مہینے کے لئے لاہور آؤں گا۔ لیکن مہلت
 صرف پندرہ دن کی ملی۔ اس میں سے پانچ چھ دن کراچی میں ضایع
 ہو گئے۔ آتے ہی بیمار پڑ گیا۔ بالآخر پانچ جولائی کو لاہور پہنچا۔
 اب پرسوں کراچی واپس چلا جاؤں گا۔ اور پندرہ جولائی کو وہاں
 سے انشا اللہ نیویارک۔ پھر نہ معلوم کب مراجعت ہو۔ گھر کا سامان
 سب پیک ہو چکا ہے۔ بیشتر کراچی جائے گا۔ وہاں ایک مکان
 کا انتظام ہو گیا ہے۔ منصور وہاں رہتے گا۔ اوز زبیدہ بھی
 فی الحال وہیں رہیں گی۔ وہ بھی ہفتے عشرے تک کراچی چلی جائیں گی۔
 احباب سے فرداً فرداً رخصت ہوں۔ آپ سے تاثیر صاحب
 سے ملاقات نہ ہو سکی۔ میں یہاں پہنچا۔ تو تاثیر ایک دن پہلے انگلستان
 روانہ ہو گئے تھے۔ اب آپ سے اور حباب سے نہ ملنے کا افسوس

رہے گا۔ نہ معلوم پھر کب ملاقات ہو۔ میرے امتیاز آئینز منصوبے بدستور جاری ہیں۔ جانے سے پہلے آپ سے کئی باتیں کرنی تھیں۔ کہ اگر یہ کیا جائے تو کیسا ہو۔ اور وہ کیا جائے تو کیسا خیال ہے۔ چاہتا تھا۔ لاہور سے پھر کچھ تجدید عہد کرتا جاؤں۔ بڑے رنگین دن اور راتیں اس شہر میں اور ریوے روڈ پر گزاری ہیں۔ لاہور چھوڑنے کا کچھ افسوس ہے۔ تاشی کا پہلو صرف اتنا ہے کہ دو سال کی جہاں گردی کے بعد کہیں تو قیام ہوگا۔ میں سفر سے تنگ آ گیا ہوں۔ ٹکٹ، پاسپورٹ سوٹ کیس کا خیال آتے ہی وحشت ہونے لگتی ہے۔ لاہور میں جم کر بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ نہ توقع تھی کہ آئندہ ہوگا۔ یہ آخری لمحے یہاں اس طرح گزر رہے ہیں۔ کہ کچھ آپ ہی اسے سمجھ سکتے ہیں۔ یا آپ یا سالک باقی دُنیا کے عشق میں نوارد بس۔ کہاں تک انہیں ہمراز بنائے۔ کون انہیں بتائے کہ دہلی مسلم ہوٹل کتاب زندگی میں کس مضمون کا ورق تھا۔ رحمت علی خاں کا تھیٹر کیسا مردم خیز گوشہ حیات تھا۔ مچھلی کے شکار کا مولانا عبدالمہید خاں سالک کی مدح پر کیا اثر پڑتا تھا۔ حکیم احمد شجاع خشک ہو گئے۔ حفیظ جو بلی منا کر جینے جی مکہ و کٹوریہ سے واصل ہو گئے۔ یوں بھی مدت سے ان کا دین اود ان کی دُنیا ہم سے الگ ہے۔ لو پھر بسنت آئی کا زمانہ یاد کیجئے۔ اور پھر الحمرا میں ان کا شام بھر (رات بھر) نظیں پڑھنا یہ اس کے مقابلے میں ہیچ معلوم ہوتا ہے۔ باقی کون رہ گئے؟ آپ کے فلم یونٹ کا حال کتنا۔ آپ ہوتے تو اس میں بطور مشیر کے دخل دیتا۔ مشیری میرا پڑانا پیشہ ہے۔ آپ میرے پڑانے کا ہک ہیں۔ یہ کا دیار عادت ہو گیا ہے۔ اب نہ معلوم نشہ کیوں کر پورا ہوگا خلیفہ عبدالمکیم سے بھی خدا حافظ کہنے گیا۔ معلوم ہوا۔ وہ مری چلے گئے ہیں۔

ان کا پتہ مجھے معلوم نہیں۔ ان کو میرا سلام اور پیار کہئے گا۔ بلا تکلیف کر کے ان سے بالخصوص مل لیجئے گا۔ (تکلیف کی تکلیف سیر کی سیر) بعض لوگوں نے یہاں میرے متعلق مجھ سے بدگمانی کا اظہار کیا۔ سند میں خلیفہ عبدالحکیم کا نام لیا۔ کہ ان کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ نہ معلوم خلیفہ صاحب نے کیا غیر محتاط باتیں میرے متعلق کم فہم آدمیوں کے حلقے میں کی ہیں۔ خلیفہ صاحب کو ذرا متنبہ کر دیجئے۔ ان کی دوست پروری پر شبہ نہیں مردم شناسی پر ضرور ہے۔ وہ خود بھی کچ ہیں۔ اور کچ فطرت لوگوں کی بدولت غلط فہمی کا شکار ہو چکے ہیں۔ میری طرف سے ان کے کئے توہج کر ان سے کہیئے۔ کہ برخوردار اب تم بڑے ہو گئے ہو۔ اگرچہ بادہ فرح بخشی دبا دگلیز است۔ بیانگ چنگ نورمے کہ محتسب تیز است۔ لوگ آج کل شرکا رستہ ڈھونڈ نکالنے میں بڑے طاق ہیں۔ بات پر بیاں زبان کھتی ہے۔ یونیورسٹی وغیرہ کے حالات جس قدر ٹٹے اتنے ہی کم سمجھ میں آئے۔ بہر حال اب اُمید ہے اصلاح کے رستے لوگوں کو سوجھیں گے۔

خط لکھنے کا شوق آپ کو مدت سے کم ہو رہا ہے۔ مجھے ابھی باقی ہے۔ لیکن تحریک ہونی چاہیئے۔ رسالک اس معاملے میں وفاکش ہیں۔ خط لکھنے ہی رہتے ہیں۔ جن سے یہاں کی محفلوں کا پورا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ انہیں جواب میں ضرور خط لکھتا ہوں۔ اگر آپ بھی کبھی کبھی کرم فرمائی کریں۔ تو مجھے دور افتادگی کا احساس کم ہوگا۔ بہر حال آپ کی خیریت کی خبر ہمیشہ طمانت کا باعث ہوگی۔ حجاب سے میرا سلام کہیئے۔ اور یاسین کو میری جانب سے پیار۔ میرا پتہ نیویارک میں مختصراً یہ ہے۔

ہوائی اٹھے سے خط بھجنا ہنگام پڑتا ہے۔ لیکن نہ اتنا کہ خط و کتابت کے مانع ہو۔ والسلام

آپ کا مری کا پتہ معلوم نہ ہو سکا۔ لاہور کے پتہ پر خط بھیج رہا ہوں۔ سنا ہے کہ آپ عنقریب آنے والے ہیں۔

خاکسار

بخاری

نیویارک
۲۵ اگست ۱۹۵۸ء

ڈیر امتیاز!

تمہارا خط ملا۔ تمہاری پریشانیوں کا حال پڑھ کر دل کو بہت صدمہ ہوا۔ یہ قدرت کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ تم جیسا انسان جس نے عمر بھر زندگی کے لطیف اور مرعجاں مریخ پہلو ہی سے سروکار رکھا۔ اور خاندان میں اپنے فرائض کو تندہی سے سرانجام دیا۔ نہلنے کے ٹاکٹوں یوں تکلیف اٹھائے۔ مجھ جیسا آدمی تو معلوم ہوتا ہے۔ اپنی فطرت سے مجبور ہے۔ کہ وقتاً فوقتاً کسی کی محاسنت یا ایذا رسانی کا ہدف ہے۔ لیکن تمہارے حسن طبیعت اور حسن اخلاق کا صلہ یہ ہرگز نہیں کہ لوگ تمہاری مخالفت پر آمادہ ہوں۔ یا تم سے انصاف کرنے میں متامل ہوں۔

یہ دور ایسا ہے کہ اس میں دوستیوں اور رفاقتوں کے خون ہوتے ہی رہیں گے۔ شاید لوگ اس زمانے میں کسی ذہنی مرض میں مبتلا ہیں۔ جس کی وجہ سے حرص و آرزو بے مروتی سب باتوں پر غالب ہے۔ خدا تمہیں تقویت دے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اپنے عفو طبیعت اور اپنی بیوی اور بچی کی محبت اور رفاقت کی بدولت اپنی پریشانیوں

پر غلبہ پاؤ گے۔ میں تمہارا ایک حقیر دوست ہوں۔ اور بے بس اور دور افتادہ لیکن اگر میری محبت تمہارے کسی کام آسکتی ہے۔ تو یقین جانو کہ وہ تم سے نہ کبھی دریغ رکھ سکتی ہے۔ نہ رکھ سکتا ہوں۔ میں ایسا شخص نہیں۔ جسے باآسانی سلیم الطبع کہا جاسکے۔ میری کمزوریاں تم پر اور سب دوستوں پر واضح ہیں۔ کیوں کہ تم سب کو ان سے پالا پڑ چکا ہے۔ اور تم سب نے وقتاً فوقتاً بلکہ اکثر نہیں درگزر کیا ہے۔ لیکن میرا علم بھر کا تجربہ اور خود میرا رجحان طبیعت یہ کہتا ہے۔ کہ دنیا میں دوستی سے بڑھ کر اور کوئی نعمت نہیں۔ اس لئے کوئی دوست چھن جائے۔ یا دُور ہو جائے۔ تو میں کئی راتیں اور کئی دن اس کا ماتم کرتا ہوں۔ افسوس کہ ہمارے دوست کم رہ گئے ہیں۔ تقریباً ہر ایک تفکرات یا ہوس کی گرداب میں آچکا ہے۔ اور نکل نہیں سکتا۔ تاہم سالک جیسے لوگ معتقاتِ روزگار میں سے ہیں۔ وہ تمہارے پاس نہ آئیں۔ تو تم ہی چلے جایا کرو۔ اس سے غم غلط ہوگا۔ اور جو مصائب پہاڑ سے نظر آتے ہیں۔ وہ اتنے صبر شکن معلوم نہ ہوں گے۔ فیض اور ایس بھی واپس آچکے ہوں گے۔ ملنا لوگ ہیں۔ اور ان کی محبت بھی مرہم کا کام دے گی۔ سب سے بڑھ کر خدا نے تمہیں نیک طینت اور نفاقت فہم بیوی عطا کی ہے۔ اور ایک بچی جو یقیناً تمہاری بہترین امیدوں کا مجسمہ ہوگی۔ ان کی صحبت میں تفکرات کو بھول جاؤ۔ اگر ہمیشہ کے لئے نہیں تو کم از کم ہر روز چند گھنٹوں کے لئے ہی سہی۔ جو لوگ تمہیں اطمینان سے محروم کر رہے ہیں۔ غور سے دیکھیں۔ تو ان کو خود تم سے آدھا اطمینان بھی نصیب نہیں۔

کتابیں میں نے کتب فروش کی دکان پر منتخب کی تھیں۔ اور ان ہی سے کہا تھا کہ پارسل بنا کر تمہارے پتہ پر بھیج دیا یہی

وجہ ہے۔ کہ ان کے ساتھ تمہیں کوئی خط یا پرزہ نہ ملا۔ بلیوں کی کتاب میں نے اس خیال سے بھیجی تھی کہ شاید اس کا اردو میں ترجمہ ہو سکے۔ اور ان بیسیوں کے کام آئے۔ جو بلیاں پالتی ہیں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ خود حجاب ہی سب سے پہلے اس کی قدر دان ہوگی۔

اس سال کے آخر تک یو۔ این۔ او سے کنارہ کش ہونے کا ارادہ ہے۔ کولمبیا یونیورسٹی نے پروفیسری کا وعدہ کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک آدھ سبیل کچے اور کرتی پڑے گی۔ ورنہ آمدنی میں جو کمی واقع ہوگی۔ اس کا سہارا مشکل ہوگا۔ دو گھر چلانے پڑتے ہیں۔ ایک یہاں، ایک زبیدہ کے لئے کراچی میں۔ پھر کچے ڈاکٹروں کی نذر بھی کرنا پڑتا ہے۔ اور یہاں کے ڈاکٹر قابل سمی۔ لیکن دنیا بھر سے زیادہ فیس لیتے ہیں۔ سالک صاحب کا خط آیا۔ انہوں نے اطمینان قلب کے لئے ترجمے کی راہ نکال لی ہے۔ اور دھڑا دھڑا ترجمے کر رہے ہیں۔ از بس غنیمت ہے۔ ترجموں کے علاوہ موت کا خوف ان پر ضرورت سے زیادہ طاری رہتا ہے۔ شاید انہیں یہ احساس ہے۔ کہ زندگی سے کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔ وہ نہ ہوا۔ حالانکہ کم از کم ان کو یہ شکایت۔ ہونی چاہیے۔ آپ اور وہ دونوں ہمیشہ دوستوں اور سب دوستوں اور سب لوگوں کے منظور نظر رہے ہیں۔ یہ بھی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ خدا آپ کو ہمیشہ ہمیشہ عزت و آبرو سے رکھے۔ کولمبیا میں مجھے اُس وقت زبان پر بھی بیکر دینے ہیں۔ اس کے لئے میرے پاس کوئی کتاب یہاں نہیں۔ ضرورت پیش آئی تو کسی نکتہ رس دوست کی معرفت ایسی کتابیں فی الفور جمع کروں۔ تاکہ دسمبر جنوری تک بیکر تیار کر سکوں۔ صوفی تبسم ذہن میں آئے۔ انہوں نے فہرست تو مرتب کی۔ لیکن کتابیں بھجوانے کا کام مستعدی سے انجام

نہ دے سکے۔ چنانچہ معاملہ کہیں ان کے اور بک سیر کے مابین لٹک رہا ہے۔ آپ مدد کر سکیں اور اس کے لئے فرصت نکال سکیں تو کیا کہتے۔ میں نے تو دانستہ آپ کو تکلیف نہ دی تھی۔ کہ آپ اپنے قصوں میں گرفتار ہوں گے۔ اُردو افسانوں کا ترجمہ میں پھر بھی کرنا چاہتا ہوں۔ بلکہ یہ میری زندگی کی بہت بڑی آرزو ہے۔ عبدالحکیم صاحب سے امید نہیں کہ وہ میری مدد کریں گے۔ آپ اور فیض صاحب خود ہی افسانوں کا انتخاب کر لیجئے۔ مجاہد کو میرا سلام اور یاسمین کو میرا پیام پہنچے۔ خط ضرور لکھتے رہا کیجئے۔

آپکا خادم
بخاری

پاکستان ہاؤس نیویارک
۱۲۔ اگست

ڈیرا تیاز !

تنہائیوں میں آپ اکثر یاد آئے۔ اور اس ایک سال کے عرصہ میں کئی تنہائیاں مجھ پر گزریں۔ لیکن پے در پے معروفیتوں اور بیماریوں نے کئی شگفتہ ارادوں کو پشمرہ کر دیا۔ کبھی خط لکھنے کی نیت باندھی تو شروع کرنے کی نوبت نہ آئی۔ حال میں سالک صاحب کے دو تین خط آئے۔ ن۔ م۔ راشد نے کچھ ادبی لطیفے لکھ بھیجے۔ اور اُردو کتابوں کا ایک بندل۔ ایسے ہی دو تین واقعات سے طبیعت کا بیخ ٹوٹا۔ پرسوں آپ شدت سے یاد آئے۔ ایک کتب فروش کے ہاں دل پشاور سی کر رہا تھا۔ ملک راج انند کی ایک تازہ تصنیف "انڈین ٹھیٹر" نظر آئی۔ بڑے طمطراق اور شان و شوکت سے بھپی ہے۔ لیکن کتاب مختصر ہے۔ وہیں کھڑے کھڑے پڑھ لی۔ جہل اور تعصب کا

لعوبہ ہے۔ آندھرا تھیٹر اور بینگالی تھیٹر کو بہت سراہا ہے۔ منہ بولتانی
 تھیٹر کے تحت میں بہت کچھ زہر اگلا ہے۔ خواجہ احمد عباس
 اور پرتھوی راج کپور کو تھیٹر کا امام قرار دیا ہے۔ آغا حشر کے بارے
 میں از حد بخل، بغض اور پستی کا ثبوت دیا ہے۔ ان کا ذکر یوں کیا
 ہے کہ *A Hack writer called Agha*
Hastur a third rate Poetaster
 اور اسی طرح کی خرافات بک کر انہیں تین چار سطروں میں ڈرنا
 دیا ہے۔ پڑھ کر تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اسے کاشش آپ
 اُردو تھیٹر پر اب بھی ایک کتاب لکھ ڈالیں۔ جو مصالحہ آپ کے پاس
 ہے اور جتنی جوانی آپ نے تھیٹر پر چھڑکی ہے۔ وہ کسی اور کو ابد اللہ آباد
 تک نصیب نہ ہوگی۔ کتاب اُردو انگریزی دونوں میں چھپنی چاہیے۔
 نیویارک اور لاہور میں جو بُعد ہے۔ وہ نہ معلوم کب تک رہے گا۔
 لیکن مجھے اس کام میں شریک کرنے کا ارادہ ہو تو یہ بُعد پچاندا جاسکتا
 ہے۔ جب تک زندگی ہے کوئی کام محال نہیں۔ البتہ موت رستے میں
 حائل ہوگئی تو اسے کوئی نہ پچاند سکے گا۔ لیکن ایک شرکت کا کام
 مشکل معلوم ہوتا ہو۔ تو آپ کم از کم خود ہی اللہ کا نام لے کر اُردو
 کی کتاب لکھ ڈالئے۔ آپ کا وسیع تجربہ اور علم تو آئندہ نسلوں کے
 لئے محفوظ ہو جائے گا۔ ورنہ تھیٹر کا یہ دور ہمیشہ کے لئے یاد سے
 محو ہو جائے گا۔ ایسے آثار بھی باقی نہ رہیں گے کہ ہزار سال کے بعد
 مورخو داڈو کی شکل میں دریافت ہو سکیں۔

لاہور کے حالات سے محض بے خبر ہوں۔ البتہ سالک صاحب کے
 خط سے معلوم ہوا کہ وہ ادبی گہا گہی اب نہیں۔ نہ معلوم سالک صاحب
 ہجرت کے بعد لاہور سے بے تعلق ہو گئے ہیں۔ یا دورِ زمانہ نے رنگینی
 کو ان کی آنکھوں سے اوجھل کر دیا ہے۔ بہر حال لاہور ہم سب کا

معتوق ہے۔ اور مرتے دم تک معتوق رہے گا۔ ہماری جوانی اس سے ہے۔ اور کبھی کبھی شباب کے غرتے میں یہ بھی گمان ہوتا تھا۔ کہ اس کی جوانی ہم سے ہے۔ دیا۔ محبوب کی بہر خیر طبیعت میں ایک طلاطم پیدا کر دیتی ہے۔ اور کوئی خبر نہ آئے تو زندگی ایک مسلسل فراق معلوم

ہوتی ہے۔ ہندوستان سے جو تناؤ ہے۔ اس کی اطلاع ہمیں محض سرکاری ذرائع سے پہنچتی ہے۔ اور تفصیلات کے لئے طبیعت تشذرتی ہے۔ اور اکثر متفکر، نہ معلوم نہرو صاحب کے سر میں کیا سوزا سما یا ہے۔ کہ حق و ناحق میں انہیں تمیز باقی نہیں رہی۔ شاید آئندہ الیکشن کی ہوس نے عمل و فکر میں کچھ کمی پیدا کر دی ہے۔ اخبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹنڈن نے ان کے ڈنڈن کر رکھا ہے۔ خدا ہم لوگوں کا حامی و ناصر ہو۔ یہاں کے کالم نویس اور سیاست دان بیش از بیش پاکستان کی ہمت اور حق بینی کے معتزف ہونے جاتے ہیں۔ اور پاکستان بیڈرون کے تدبر اور تن دہی کے قائل۔ لیکن کوئی خدا کا بندہ ہندوستان کے کان نہیں مردناتا۔ سب اپنا اپنا اوسیدیا کرتے ہیں۔

بڑے بڑے فلم دیکھنے میں آئے اور اکثر غائبانہ آپ کو ٹھیٹر اور سینما میں اپنے ساتھ لے گیا۔ اور آپ سے تبادلہ خیالات کرتا رہا۔ لیکن طبیعت کو اس سے کیا تسکین ہوتی۔ ہندوستان کے متعلق ایک بڑے ٹھاٹھ کا فلم "The River" ستمبر میں یہاں آنے والا ہے۔ "Jean Renoir" نے اسے ڈائریکٹ کیا ہے۔ ہندوستان کی سر زمین میں بنا ہے۔ اور ایکٹر امریکن انگریز اور ہندوستانی ہیں۔ زوروں کی پلبٹی ہو رہی ہے۔ پاکستان کے "دستاویزی" فلم بہت فوٹے ہیں۔ اور اچھے نہیں۔ اس بارے میں بہت کچھ کہہ سکتا

ہوں۔ لیکن پھر کبھی لکھوں گا۔ قلم زنگ آلودہ ہے۔ آپ کی جانب سے کوئی خط آئے۔ تو طبیعت پھر شگفتہ ہو جائے گی۔ حجاب کو میرا سلام شوق، یاسمین کو پیار۔

خیر و بہبود کا طالب خاکسار
بخاری

نیویارک

۱۱ مئی ۱۹۷۷ء

ڈیر اختیاز!

دوپس پہنچنے کے چند دن بعد آپ کو ایک خط لکھا تھا۔ جو ہر چند کہ جواب طلب نہ تھا۔ تاہم بتقاضائے عشق جواب کا منتظر رہا۔ لیکن اب تک آپ کے خط سے محروم ہوں۔ خیال تھا کہ آپ اپنے ادبی عزائم کے متعلق مزید کچھ بتائیں گے۔ کیا ادھیڑا کیا بنا۔ دو ایک کتابیں بھی آپ کو بھجوائی تھیں۔ بہت اچھی نہ تھیں۔ لیکن میری ونا شعاری کا ثبوت ضرور ان سے ملا ہوگا۔ افسوس کہ کتابیں خیراً سمندر کی ڈاک سے بھجوانی پڑتی ہیں۔ ہوائی ڈاک سے بھجوانے تو پانچ ڈالر کی کتاب پر کم و بیش اتنا ہی خرچ آئے۔ جیب اجازت دے تو عقل اجانت نہیں دیتی۔ میتھ (MYTH) کے آغاز کے بارے میں میں نے اپنے ماہر دوستوں سے کہا۔ کہ بھائی دو صفحے لکھ دو۔ وہ ضرورت سے زیادہ ماہر نکلے۔ سب کہتے ہیں کہ اس کے متعلق تو کئی نظریے ہیں۔ میں فلاں کا قائل ہوں۔ اور فلاں تو اس بارے میں بد معاش آدمی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ آخر فیصلہ کیا ہے کہ ان سے پوچھ پانچھ کے میں خود ہی کچھ گھسیٹ لوں گا۔ اگلے ہفتے آپ کو ایک کتاب (بذریعہ سمندری ڈاک)

انشاء اللہ بجزاؤں گا۔ حال ہی میں لکھی ہے۔ اس کا نام ہے "نظرِ بد" یعنی "EVIL EYE" ایک ماہر چشم ڈاکٹر نے لکھی ہے۔ اور اس کی آنکھ اور نظر کے متعلق جو جو توہمات لوگوں میں مروج ہیں۔ انہیں یکجا کر دیا ہے۔ "نظرِ بد" بھی ان میں سے ایک ہے۔ اور اس کی تاریخ بھی مختصر طور پر لکھ دی ہے۔ کئی باتیں طبی نقطہ نظر سے مفید اور انوکھی ہیں۔ مثلاً عام خیال ہے۔ کہ بہت پڑھنے سے یا باریک لکھائی پڑھنے سے نظر پر زور پڑتا ہے۔ اور آنکھیں خراب ہو جاتی ہیں۔ مصنف نے صاف صاف بیان کیا ہے۔ کہ یہ غلط ہے۔ اور اس 'وسم' کا ڈاکٹری میں کوئی جواز نہیں ملتا۔ کتاب کا ثانوی عنوان ہے - STUDIES IN THE FOLK LORE OF VISION

میرا خیال ہے۔ اس کتاب کا اردو میں ترجمہ یا خلاصہ بے حد مفید ثابت ہوگا۔ باقی کتاب پہنچنے پر آپ خود اندازہ لگا لیجئے۔

مجھے اس سال موسم خزاں میں ایک یونیورسٹی میں چند لیکچر اردو زبان و ادب کی تاریخ پر دیتے ہیں۔ صوتی تبسم سے بوساطت ایس فیض دکیونکو صوفی صاحب تو خود گل محمد قسم کے انسان ہیں، مناسب مفید کتابوں کی (انگریزی اردو دونوں) فہرست منگوا بھیجی ہے۔ وہ آنے پر دیکھوں گا۔ کہ کون سی کتابیں میرے پاس موجود ہیں۔ جو نہ ہوں گی وہ پاکستان سے منگواؤں گا۔ اور غالباً اس میں آپ کی دستگیری کی ضرورت بھی ہوگی۔ آمید ہے دینے نہ رکھیں گے۔ کیئے وہ افسانوں کے ترجموں کا منصوبہ جو آپ کے مکان پر بعد طعام باندھا گیا اور جس میں مجلس اقبال کو عموماً اور آپ کو خصوصاً پہلی کرنی تھی۔ اس کا کیا ہوا۔ لاہور سے چلا آیا۔ تو اس کے بعد صدائے برنخاست۔ کچھ اس پر بھی روشنی ڈالیئے میں معنی سے اس کا منتظر ہوں۔

چند ہفتوں کی بات ہے۔ میں ایک لٹچ کے موقع پر برسرِ عام

یک لخت بے ہوش ہو گیا۔ اس کے بعد دو ایک مرتبہ پھر یہی واقعہ پیش آیا۔ اچھے اچھے ڈاکٹروں کو دکھایا۔ خاطر خواہ علاج جاری ہے۔ لیکن کچھ ٹھیک تشخیمیں نہیں ہو سکی۔ کیوں کہ دل وغیرہ بالکل درست ہیں۔ کام اور تفکرات کی کثرت کو مجرم ٹھہراتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ہلٹ کی بے ہوشی کے اسباب مفسرین میں فتناز مد فیہ ہیں۔ ہماری بے ہوشی بھی آنے والی نسلوں کے لئے مبہم رہے گی۔ لیکن حد ہو گئی۔ میں سمجھتا تھا کہ ”غش کھانا“ وغیرہ دانتانوں کے ساتھ ختم ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ اس رسم کے زندہ رکھنے والے ابھی باقی ہیں۔

ساکت، فیض، صوتی ان تینوں کو جب میں میرا سلام کہتے گا۔ چغتائی صاحب کے ہکلام ہونے کا موقعہ نکلے تو ان سے کہتے کہ وہ مجھے فوراً خط لکھیں۔ کہ ان کے یہاں آنے میں کیا رکاوٹ پیش آئی۔ خلیفہ صاحب میں تو ا۔ ن۔ گ۔ ل۔ ی کر دیجئے گا۔ ہاں بھائی آغا بشیر اور رفیع پیر کو بھی سلام کہتے گا۔ حجاب، یاسمین کو میرا سلام و پیار۔

خاکسار

بخاری

بنام عبدالرحمن چغتائی

۱

محترم بندہ جناب چغتائی صاحب
سلام مسنون!

سر عبدالقادر (اور بعد ازاں بیڈمی عبدالقادر) نے بہت تاکید کے ساتھ "کاروان" منگوا بھیجا ہے۔ اور مجھے ہدایت کی ہے۔ کہ میں آپ سے درخواست کروں۔ کیا آپ انہیں "کاروان" کی ایک جلد بہت جلد بھجوا سکتے ہیں۔

خاکسار

بخاری

اور اگر ناگوار نہ ہو تو "مرقع چغتائی" کی کوئی بھی کچی جلد مجھے اپنے لئے بھی چاہیے۔ کیا کہیں سے مل جائے گی؟

۱۳۔ تعلق روڈ، نئی دہلی

۱۱۔ اکتوبر

منشی و کرمی چغتائی صاحب،

سلام مسنون! افسوس کہ لاہور میں آپ کی ملاقات سے محروم رہا۔
معلوم ہوا آپ شکار کو تشریف لے گئے تھے۔

وایسی پر ایک خط ملا۔ جو بعینہ ارسال خدمت ہے۔ خط کے دو حصے ہیں ایک آپ کے نام۔ دونوں بھیج رہا ہوں۔ مطلب آپ پر خود ہی ظاہر ہو جائے گا۔ مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ لکھنے والے بیٹی۔۔۔۔۔
 "EVELY WOOD" صاحب آج کل واٹر تھا پسن کمپنی میں ملازم ہیں۔ جو "ADVERTISING" کمپنی ہے۔ اور آرٹ کے نقطہ نظر سے اپنی پبلسٹی کو ہر وقت دکھش بنانے کے درپے رہتی ہے۔
 WOOD صاحب بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ لٹریچر اور مصوری دونوں کے طالب علم اور نقاد ہیں۔ اور آپ کے معترف اور مداح معلوم ہوتے ہیں۔ آج کل کلکتے میں ہیں۔ لیکن اس سے پہلے سالہا سال بمبئی میں تھے۔ یہی ان کا روزگار تھا۔ علاوہ برآں بمبئی کے اہل فن میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ اور اکثر تصویروں کی نمائش میں کھنڈال والا ہنر وادیا اور اس قسم کے لوگوں کے ساتھ شریک رہتے تھے۔ جو جواب آپ ان کو بھیجنا چاہیں۔ وہ خواہ براہ راست ان کو بھیج دیں یا میری معرفت۔

بندۂ خاکسار

بخاری

۱۳۱ تعلق روڈ۔ نئی دہلی

۱۹ اکتوبر

مشفق چغتائی صاحب

سلام مسنون! گرامی نامے کا شکریہ۔ آپ کے خط آنے پر میں نے وڈ صاحب کو لکھ دیا ہے۔ مزید گفت و شنید وہ غالباً براہ راست آپ سے کریں گے۔ کوئی خدمت میرے لائق ہو۔ تو یہ خیر خواہ دیہینہ کوتاہی نہ کرے گا۔ ایچنگ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ کے نقش کے ہوئے

لیمپ شیڈ اب تک میرے مکان بلکہ میری زندگی کی زینت ہیں اور
میں ان کا ذکر ہمیشہ فخریہ کرتا ہوں۔ اور آپ کو دعا دیتا ہوں۔ ظم لائٹس
کا معاملہ میں نے سنا بہت ٹیڑھا اور وقت طلب ہے۔ ملاقات ہوتی تو
تفصیلاً عرض کرتا۔

خاکسار
بخاری

۲۶۔ جیل روڈ
۱۸۔ اگست ۱۹۳۷ء

مشفق من چغتائی صاحب

سلام مسنون! بیگم سراج الدین صاحبہ کا جواب آگیا ہے۔ ان کا لفظی

ترجمہ یہ ہے۔

”آپ کے خط کا شکریہ۔ یہ آپ کی بڑی نوازش ہوگی۔ کہ آپ
مجھ پر اس قدر اعتماد رکھتے ہیں۔ چغتائی صاحب سے کہہ دیجئے۔ کہ میں
ان کی بھی بے حد محنتوں ہوں۔ کہ وہ باوجود اس امر کے کہ فن کے متعلق
میرا علم بہت محدود ہے۔ وہ اپنی کتاب کی تمہید مجھ سے لکھوانا چاہتے
ہیں۔ میں اپنے آپ کو بہت مغتر سمجھتی ہوں۔ اور کوشش کروں گی۔
کہ ان کے کمال کی کما حقہ داد تحسین دے سکوں۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتی
ہوں کہ زیادہ سے زیادہ کتنے دن کی محنت مجھے دی جائے گی۔ علاوہ
برآں مجھے ”مرقع“ کی سہلہ بھواد دیجئے۔ کیوں کہ میرا نسخہ میرے پاس
موجود نہیں۔“

آپ ان کو نئی ایڈیشن مرقع کی (یعنی جس شکل میں اب آپ
اسے شائع کرنا چاہتے ہیں) بھواد دیجئے۔ عبدالرحیم صاحب وہ مجموعہ
میرے پاس لائے تھے۔ جس میں صفحے دیباچے کے خالی چھٹے ہوئے

تھے۔ وہ بیگم سراج الدین صاحب کو بھواد دیجئے۔ اس کے علاوہ میرا مشورہ

یہ ہے۔ کہ پہلی ایڈیشن کے دیباچے (یعنی کنرز صاحب اور ڈاکٹر اقبال کے مقالے) بھی انہیں بھیج دیجئے۔ تاکہ وہ ان کے پیش نظر رہیں کہ پٹ کیا کچھ کہا جا چکا ہے۔ اگر اس دوران میں آپ کے موقع پر اخبارات یا رسائل میں کہیں کوئی ریویو چھپا ہو اور اس کی نقل آپ کے پاس موجود ہو تو وہ بھی بھیج دیجئے۔ ایسی چیزوں سے غالباً ان کو مدد ملے گی۔

دیگر سوالات کا جواب یا براہ راست آپ ان کو بھیج دیجئے یا جیسا مجھے حکم کریں۔ میں ہر خدمت کے لئے تیار ہوں۔ (ان کا پتہ گرینڈ ہوٹل نمبر ہے) افسوس ہے کہ آج شام آپ کھانے پر نہ آسکے۔ متعدد دوستوں کی ملاقات تھی۔ لیکن جس کس نے مجھ سے تقریب پوچھی۔ میں نے یہی کہا کہ "نفسِ چغتائی" کے شائع ہونے پر مسرت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ خیال تھا کہ آپ آئیں گے۔ تو آپ کو اصحاب کی طرف سے مبارک باد پیش کی جائے گی۔ خیر میری ایک شکایت آپ کے خلاف رہی۔ آپ اسے یاد رکھیے۔ اگر آپ اپنے بھائی کی روانگی کا عذر پیش نہ کر چکے ہوتے تو میں شام کو باوجود آپ کے انکار کے خود آپ کو جا کر لے آتا۔ آپ کے نہ آنے سے دوست بہت مایوس ہوئے۔ ہم لوگ، یعنی خاکسار، سالک صاحب، حفیظ صاحب، ہری چند اختر صاحب، جگن صاحب، چراغ حسن حسرت

صاحب یعنی جو لوگ کل یہاں جمع تھے۔ وہ بقول آپ کے اس قابل تو نہیں کہ آپ کے آرٹ کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ لیکن آپ کے معتقد اور نیاز مند ضرور ہیں۔ ہمارا دل نہ توڑا کیجئے۔

آپ کا عزم انگلستان آپ کو مبارک ہو۔ میں نے یکم سراج دین کو لکھ دیا تھا کہ تمہیں ایسی ہونی چاہیے کہ انگلستان میں نقاد ان

کی بدولت چغتائی صاحب کے فن کی قدر کرنا سیکھیں، تاکہ آئندہ
قدر داتی کے لئے راستہ صاف ہو۔ اب دیکھیں وہ کیا لکھتی ہیں۔ میں
جواب کا منتظر رہوں گا۔

خاکسار

بخاری

پاکستان ڈاکس

۱۲ ایسٹ ۶۵ سٹریٹ نیویارک ریور ایس۔ اے

۲۵ اپریل ۱۹۵۲ء

مشفق جناب چغتائی صاحب

سلام مسنون! گرامی نامہ ملا۔ بھائی آپ کو ایسے سوالات پوچھنے
کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی۔ جب تک میں یہاں ہوں۔ آپ یہ
سمجھتے کہ گویا آپ خود یہاں ہیں۔ جو خدمت میرے لائق ہے۔ بلا تامل
فرما دیا کیجئے۔ مسودہ ضرور بھیجئے۔ کم از کم دیکھ تو لوں۔ اس ملک میں
کسی بھی مسودے کو خواہ وہ کتاب کا ہو، قلم کا یا ریڈیو کا یا ٹیلی ویژن
کا منزل مقصود تک پہنچانا شادی بیاہ یا حملہ یورپ کے انتظامات
سے کم نہیں ہوتا۔ ہزاروں (MIDDLE MEN) مشاطگی کے رشتے
روکے بیٹھے رہتے ہیں۔ جہاں کروڑوں کا ہیر پھیر ہو اور ہر دن گل میں
لاکھوں چھوٹے بڑے پہوان زور آزمائی کر رہے ہوں۔ وہاں علم و
فن، علم و فن نہیں محض بزنس بن جاتا ہے۔ اور بزنس ہی
کے طریقوں پر چلتا ہے۔ تاہم آپ کی تجویز سے دماغ کو گدگدی
ہوتی۔ فلم کا مرکز نیویارک نہیں۔ کیلیفورنیا (یعنی ٹالی قڈ) ہے۔
لیکن آپ مسودے تو بھیجئے۔ آنکھیں تو اس سے روشن ہوں۔ اس
کے بعد کاری گروگوں سے مشورہ کر دوں گا۔ اور نشیب و فراز سے

آپ کو مطلع کرتا رہوں گا۔

لاہور کا قیام از حد مختصر تھا۔ جہاں برسوں تک شباب رنگین کیا ہو اور بڑھاپے کو بھی شباب بنایا ہو۔ وہاں دل کی تنگی ہنختے عشرے میں کیا بھجتی۔ لیکن قسمت پر نازاں ہوا۔ کہ احباب کی صحبت میں مسرت بلکہ نشے کی چند گھڑیاں تو گزار لیں۔ آپ سے سالہا سال دل کا سودا رہا ہے۔ آپ کی محبت اور اخلاص برسوں سے دل کا جزو تھیں۔ اور ہیں۔ للہ الحمد کہ آپ سے مل لیا اور آپ کی محبت اور

آپ کے کرم سے دوبارہ فیض یاب ہوا۔ واپس آکر امتیاز صاحب سے دو ایک جھٹیوں کا تبادلہ ہوا۔ اس کے بعد پنجاب میں فسادات نمودار ہوئے۔ تو سلسلہ قدرے رک گیا۔ وہ طیں تو انہیں میرا سلام کہتے گا۔ ہاشمی صاحب کا بھی ایک بہت محبت آمیز خط ملا۔ ابھی انہیں جواب نہیں لکھا۔ انہیں بھی میرا سلام پہنچا دیجئے گا۔ اور کس کس کا ذکر کروں۔ پورے گلزار کو حسرت و عشق کا پیغام پہنچانا ہوتا کہاں تک ایک ایک پھول کا نام لوں۔ جو ملے ان سے کہئے کہ عزیز الوطن سلام کہتا ہے۔

جو پتہ اس خط کی پیشانی پر لکھا ہے۔ اسے کہیں نوٹ کر لیجئے۔ تاکہ آئندہ میں لکھنا بھول جاؤں۔ تو آپ کو تشویش نہ ہو۔
بندہ خاکسار
بخاری

نیویارک

۱۲۔ جنوری ۱۹۵۲ء

مشفق جناب چغتائی صاحب

سلام مسنون! بھائی آپ کی شکایت بجا ہے۔ مجھ سے سہو ہوا۔ کہ

میں نے مسودے کی رسید آپ کو فوراً نہ بھیجی۔ آپ کو یقیناً تشریح رہی ہوگی۔ آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ میں آخر اگست میں سخت بیمار پڑ گیا۔ دو ہفتے مسلسل بے ہوشی اور نیم بے ہوشی کے عالم میں رہا۔ آٹھ ہفتے ہسپتال میں اور اس کے بعد دو مہینے گھر پر صاحب فراش رہا۔ تقابہت کے عالم میں بھی کام سے مخلص نہ ہونی لیکن مصروفیت کو ضروریات تک محدود رکھا۔ اس عرصے میں آپ کا مسودہ پہنچا۔ نہ معلوم ترجمے کے لئے ہمت کب نصیب ہو۔ کوشش کر رہا ہوں۔ کہ ہو سکے تو فروری مارچ میں کبھی پاکستان کا ایک چکر لگاؤں۔ اس شدید بیماری کے بعد اہل و عیال مجھ سے اور میں ان سے ملنے کو بے قرار ہوں۔ موت زیست کا کسی کو علم نہیں۔ اگر آنا نصیب میں ہوا۔ تو خوب باتیں ہوں گی۔

آپ کے افسانے میں کئی جدتیں ہیں۔ جنہیں پڑھ کر بہت لطف آیا۔ اور ذہن کو گہر گہری ہوتی۔ میں نے ایک دو فلم باز دستوں سے ذکر کیا۔ اور اس کے چند حصے بھی ان کو سنائے۔ وہ کہتے تھے۔ کہ کوئی **EXPERIMENTAL GROUP** سے فلمائے۔ تو بہتر ہو۔ ورنہ تاجرانہ کمپنیوں کے بس کا تپہ روگ معلوم نہیں ہونا۔ آج کل فلم کمپنیاں عجیب مشکل میں ہیں۔ آمدنی سرعت سے کم ہو رہی ہے بڑی طرح لائق پاؤں مار رہے ہیں۔ اکثر ایکٹر فلموں کو چھوڑ کر ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ملازم ہو رہے ہیں۔ مزید سعی کروں گا اور آپ کو اس سے آگاہ رکھوں گا۔ اس دوران میں کیا یہ بہتر نہ ہو۔ کہ آپ سیناریو کو بعینہ اسی طرح کسی اردو ادبی رسالے میں چھپوا دیں؟ میں نے اکثر سیناریو انگریزی رسالوں میں چھپتے دیکھے ہیں۔ اور لوگ انہیں شوق سے پڑھتے ہیں۔ اپنے ہموطنوں کے لئے یہ ایک نئی چیز ہوگی اور اس کا سہرا آپ کے سر رہے گا۔ علاوہ برائے کاپی رائٹ بھی محفوظ

ہو جائے گا۔ کہیے کیا خیال ہے؟

خاکسار

بخاری

۱۴۔ جون ۱۹۵۳ء

مشفق جناب چغتائی صاحب

سلام مسنون! آپ کی تصاویر کو یو۔ این میں آویزاں کرنے کی رسم چند دن ہوئے بڑے ٹھاٹھ سے ادا کی گئی۔ ہماری سفارت کا سب عملہ نیز ۱۰۰ تمام پاکستانی جو یو۔ این میں ملزم ہیں۔ اور اخباروں کے نمائندے اور فولگوگرافر وغیرہ سب جمع تھے۔ میں نے مناسب الفاظ میں آپ کی تعریف و تحسین سے اپنی زبان کو فخر بخشا۔ سیکرٹری جنرل نے جو خود آرٹ کے بڑے ماہر ہیں۔ آپ کے فن کو سراہا تصویریں یو۔ این

کے ڈائنگ روم میں آویزاں کی گئی ہیں۔ اور یہ موقع اور محل ان کے لئے بہت تنگ و دود کے بعد حاصل کیا گیا۔ کیونکہ ہر قوم کے نمائندے نے اپنے ملک کی ناموری کی خاطر کوئی نہ کوئی تحفہ بھیج رکھا ہے۔ اور ہر ایک کی خواہش اور کوشش یہی ہے۔ کہ سب سے نمایاں جگہ اس کو حاصل ہو۔ ڈائنگ روم پر سب کی نگاہ تھی۔ کیوں کہ یہاں نہ صرف ڈیلیگیٹ اور سیاست دان ہر روز کھانا کھانے آتے ہیں۔ بلکہ سیارح بھی جن کی روزانہ تعداد دو تین ہزار سے کم نہیں۔ یہیں رجوع کرنے ہیں۔ جس دیوار پر تصاویر لٹکائی گئی ہیں۔ اس کا رنگ ہلکا سنہری سا ہے۔ کوشش کر رہا ہوں۔ کہ دیوار کا رنگ سیاہی مائل کر دیا جائے تاکہ آپ کی تصاویر کے رنگ خوب اچھی طرح ابھر آئیں۔

آپ کی ٹھکڑوں کے خاکے بھی پہنچے اور حسب ارشاد محکمہ متعلقہ کو

بجوادینے گئے ہیں۔ آپ کی تصاویر کی نمائش کا خیال ایک دن بھی
میرے دل سے محو نہیں ہوا۔ لیکن کچھ تو ارشاد ہو کہ کیا حکومت پاکستان
تصاویر کو لانے کے جانے اور دیگر اخراجات کی کفیل ہوگی۔ ذرا یہ
اندازہ ہو جائے تو ہم اس پار کوشش بھی کریں۔ ورنہ وہ نہ ہو کہ
مدعی سست اور گواہ چست۔

عسرت صاحب کی بیماری اور پھر صحت یابی کی خبر ملی۔ جذبات
نے اس بارے میں عجیب نشیب و فراز دیکھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ
اب وہ پھر جوان ہیں۔ بعض ذرائع سے معلوم ہوا کہ کافی ہاؤس کی
رونق اب ان سے پھر جو گئی ہو گئی ہے۔ خدا انہیں چمکتا اور نہکتا رکھے۔
سالک پھر لاہور آگئے۔ سب احباب نو مبارک ہو۔ البتہ سستا ہوں کہ
ہاشمی صاحب کراچی ہجرت کر جائیں گے۔ امتیاز کو میرا بہت بہت سلام اور
پیار۔ کبھی صوفی میں تو ان سے کہتے کہ دو گھونٹ میری یاد میں بھی پی
لیں۔ کبھی خط بھی لکھنے کے روادار نہیں اور ہم ہیں کہ ہر راہگزر سے
ان کا ذکر فخر سے کرتے ہیں۔ اور ان کی خیریت بے قرار ہو کر پوچھتے ہیں۔
خدا آپ سب کو خوش رکھے۔ اکتوبر میں وطن آنے کا ارادہ ہے۔
انشاء اللہ۔

خاکسار

بخاری

بنام حکیم یوسف حسن

مترم بندہ جناب حکیم صاحب !
 سلام مسنون ! آپ کا خط ملا۔ گویا یاد آوری سلام دوستائی کے سلسلے
 میں تھی۔ لیکن پھر بھی ممنون ہوں۔ ڈاکٹر اقبال کی ذمہ افزائی سے میرا حوصلہ
 تو بہت بڑا۔ لیکن نہ اتنا کہ مضمون کا وعدہ کر سکوں۔ جون کو میرا پہلا مضمون
 ہے۔ ادا صرموم اس قدر خوشگوار ہو رہا ہے۔ کہ دریا کے کنارے اس
 جھیل کے پاس جہاں بائرن کے تخیل کو پرواز نصیب ہوئی تھی۔ کسی
 پھول سے لڑے ہوئے سبزہ زار میں گھسنے اور بلند دختوں کے درمیان
 زندہ رہنے کو دل چاہتا ہے۔ اس ددگونہ عذاب کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ
 امتیاز جیسے عزیز دوستوں کی فرمائشوں کی تعمیل سے بھی معذور ہوں اور
 سالک جیسے مقتدر شفیق کے خط کی رسید تک بھیجنے سے قاصر، مزا بگت
 رہا ہوں، عرصہ ہوا دوستوں نے خط لکھنا بند کر دیا۔

سوچتا ہوں۔ تعطیلات شروع ہو جائیں۔ وہ خط لکھوں گا۔ وہ خط
 لکھوں گا۔ دستوں میں کھلبلی مچ جائے۔ اس ہیجان کے دریاں میں ہوسکا۔
 تو نیرنگ خیال کی خدمت بھی کروں گا۔

رسلا دیکھ کر آنکھیں روشن ہو گئیں۔ پھر بھی میری کج بیس طبیعت
 کو اصلاح کی گنجائش نظر آئی۔ لیکن اس کا الزام آپ کو نہیں دیتا۔

ہندوستان کی بد نصیبی ہے اور کیا کہوں۔ مجھے ذرا لاہور واپس آ لینے
دیجئے۔

خاکسار
بھاری، عمانویل کالج کیمبرج

بنام کلیم الرحمن

نیویارک

۲۱ دسمبر ۱۹۵۵ء

عزیز و مشفق

سلام مسنون! گرامی نامہ ملا۔ آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر۔ کام۔
دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال ایسی مشقت نہیں کہ ابھی سے کانوں پر
لاکھ دھروں۔ "I BELIVE THIS" یا اسی قسم کے عنوان سے
بو قلموں کتابیں اور مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ نہ معلوم آپ کے زیر
نظر کون سی کتب اس نام کی ہیں۔ اس لئے نیویارک کے دفتر سے
کتابیں پہنچیں گی۔ تو پورا حال معلوم ہوگا۔

آپ کا نام جب زبان پر آتا ہے۔ تو آپ کے والد مرحوم (مفتی
خلیل الرحمن) کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ میں ان کا خادم اور معتقد اور
ان کے دسترخوان علم و دانش کا خوشہ چینی تھا۔ آپ نے جس خاندان
میں تربیت پائی ہے۔ وہ آپ کے حسن اخلاق اور علوفت کا ہمیشہ
ہمیشہ کے لئے کفیل ہے اور رہے گا۔ اس کے علاوہ آپ خود بھی
ماشاء اللہ روشن دماغ اور نشائستگی کا نمونہ ہیں۔ اس لئے ستمہ صاحب

یا کسی اور صاحب کے سامنے آپ سے اپنائیت جتا کر مجھے فخر ہوتا ہے۔ خدا آپ کی زندگی ہر طرح کامران کرے۔

آپ کی بہبود کا طالب
خاکسار بخاری

یتام حامد علی خاں

۱

مشفق حامد علی خاں صاحب

سلام مسنون!

مجھ سے سہو ہوا کہ میں نے آپ کے خطوط نیز آپ کے مسودوں کی رسید آپ کو نہ بھیجی۔ سو دے یہ مطابق فہرست مجھے مل چکے ہیں اور ان سب پر میں نے نظر ثانی کر لی ہے۔ کسی مضمون کو مختصر کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ کیونکہ گو ایک آدھ مضمون پیمانے سے ذرا طویل ہے۔ لیکن نہ اتنا کہ قینچی استعمال کئے بغیر چارہ نہ ہو۔ البتہ ترجموں میں بہت سی جگہ ثقالت تھی۔ جو اکثر ترجموں میں پائی جاتی ہے۔ اسے میں نے دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ ورنہ بسا اوقات تو مطلب ہی فوت ہو جاتا تھا۔

تمہید تقریباً تیار ہے۔ محض انتظار صرف اس بات کا ہے۔ جو آپ نے مزید مسالہ بھیجنے کا وعدہ کیا ہے۔ اسے بھی دیکھ لوں۔ ترتیب کے بارے میں میرا مشورہ یہ ہے کہ پہلا حصہ پاکستانی اور دوسرا امریکن

ہونا چاہیے۔ پاکستانی حصے میں پہلا مضمون قائد اعظم اور امریکن حصے میں پہلا مضمون آئین اور کا۔ باقی مضامین کی ترتیب الجبد کے لحاظ سے تاکہ کسہ کو شکایت نہ ہو۔ کہ شمع پہلے میرے سامنے کیوں آئی۔ کیا آپ کو اس سے اتفاق ہے؟

ایک بات اور ذہن میں آئی۔ وہ یہ کہ جہاں جہاں (خواہ امریکن حصے میں خواہ پاکستانی حصے میں) مضمون انگریزی سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ وہاں مضمون کے آخر میں نوکسین کے اندر بجز خفی لکھ دیا جائے۔ (انگریزی سے ترجمہ) تاکہ لوگ طرزِ تحریر کی اجنبیت کو خود صاحبِ مضمون کی اختراع نہ سمجھیں۔

مضامین نگار میں خود شامل ہونا مناسب نہیں سمجھتا۔ میرے لئے تمہید نگار ہونا ہی مناسب ہے اور بس۔ جواب کا منتظر۔

خاکسار

بخاری

کیا تمہید اور مضامین ابھی بغیر مزید مسالے کے انتظار کے بیچ دوں۔ تاکہ کتابت شروع ہو جائے؟

نبویارک

۹ ستمبر ۱۹۵۹ء

مشفق سلام مسنون!

ابھی ابھی آپ کا رجسٹری خط مورخہ ۲ ستمبر معہ بقیہ مسودات کے

ملا۔

مضامین کی ترتیب کے متعلق میں حال ہی میں آپ کو ایک خط لکھ چکا ہوں۔ لہذا اس کے متعلق جو میرا مشورہ ہے۔ اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ امید ہے آپ اس سے متفق ہوں گے۔ اب اگلی ڈاک سے انشاء اللہ دیباچہ ارسال خدمت کروں گا۔

اور مسودات بھی واپس بھیج دوں گا۔

خاکسار
بخاری

مشفق جناب حامد علی خان صاحب

سلام مسنون !

آج ہی ایک علیحدہ پکیٹ بصیغہ رجسٹری آپ کے نام روانہ کر دیا گیا ہے۔ جس میں ۲۹ پاکستانیوں کے مسودے اور ۳ غیر پاکستانیوں کے شامل ہیں۔ نیز ۹ مضمونوں کی اصل انگریزی بھی اسی پکیٹ میں بھیج دی ہے۔ زحمت نہ ہو۔ تو رسید سے ضرور مطلع فرمائیے۔ میں میں منتظر رہوں گا۔ دیباچے کا مسودہ منسلک ہوا ہے۔

ترجموں پر نیز دیگر مضامین پر میں نے حتی الامکان بڑے غور سے نظر ثانی کی ہے۔ مترجمین نے بعض حصے تو اپنی بساط سے بڑھ کر پائے۔ بعض جگہ ذرا گھاس کاٹی۔ مضامین یوں بھی ABSTRACT ہیں۔ اگر ان میں روانی اور سلامت بھی نہ ہو تو ان کا پڑھنا اور ان سے لطف اندوز ہونا بالکل ہی مشکل ہو جاتا ہے۔ بہر حال اب جس حالت میں بھی مسودات آپ تک پہنچ رہے ہیں۔ امید ہے آپ انہیں خاطر خواہ پائیں گے۔

تاخیر کے لئے میں آپ سے نادم ہوں۔ اول تو اسمبلی کی وجہ سے اور کچھ بیماری کے الجھاؤ سے فرصت کم رہی۔ پھر ایک طویل دیباچہ لکھا تھا۔ جسے حالات کے تغیر و تبدل نے بے کار بنا دیا۔ دوسری مرتبہ لکھا۔ تو پھر وہی کیفیت ہوئی۔ آخر تنگ آکر میں نے ایک مختصر سے دیباچے پر اکتفا کی ہے۔ آپ پڑیں گے تو یقیناً اندازہ ہو جائے گا کہ میرے دیباچے کس وضع کے اور کس موضوع

پر پختے۔ اب ان کا موقع نہیں۔

مضامین کو الجید کے لحاظ سے آپ خود ترتیب دے لیجئے۔ اور اپنے نظم و نسق کے مطابق کتابت موقع پر شروع کر دیجئے۔ اب تو سب مرحلے طے ہو چکے۔ اب زیادہ تاخیر کے لئے کوئی جواز باقی نہیں رہا۔ جب میں نے سنا کہ مکتبہ فرینکلن کے کرتا دھرتا آپ ہیں۔ تو بے حد مسرت ہوئی۔ آپ یقیناً اس کام کے لئے بہت موزوں ہیں۔ میرے لایق کوئی خدمت ہو تو بہرگز مجھ سے دریغ نہ رکھیں۔ بلکہ خادم دیرینہ سمجھیں۔

خاکسار

بخاری

بنام عید القدر رشک

عزیزی رشک سلمہ اللہ تعالیٰ

سلام مسنون!

آپ جانتے ہیں کہ اردو ادب سے مجھے گہرا لگاؤ رہا ہے۔ خیال تھا کہ عمر اسی دشت کی سیاہی میں کٹے گی۔ لیکن شرافت ملاحظہ ہو کہ آنکھیں اردو کتابیں دیکھنے کو ترس گئی ہیں۔ اول تو کتابیں ملتی ہی نہیں۔ بل جائیں تو فرصت کہاں؟

پہلے آدمیوں کی طرح صبح صبح اٹھتے ہی۔ جلدی جلدی کھانا کھایا۔ اور کسی مار پر نکل گئے۔ شام کو واپس ہوٹل میں وارد ہوئے۔ شام کا رُوح افزا وقت ہو یا صبح کا سُہانہ سماں۔ طبیعت چھپتی ہوئی ہو یا افسردہ۔ ہم ہیں کہ ادلے فرض کی خاطر نہایت شگفتہ طبعی اور غنچہ دہنی

سے باتیں کئے جا رہے ہیں۔ اس وقت اس شہر میں ہزاروں لوگ ہوں گے۔ جو دنیا طیفہا سے بے خبر نیند کے مزے اڑاتے ہوں گے۔ لیکن ہم کچھ ایسے برخوردار سعادت شعار واقع ہوئے ہیں کہ نہ نیند کی پرواہ۔ نہ صحت کا ہوش۔ خداوندان سیاست کا حکم ہوتا ہے۔ کہ بعض باتیں کہے جاؤ۔ ایسے ماحول میں رہ کر اردو ادب کو کیا کہوں۔

بات بگڑی ہے کچھ ایسی کہ بنائے نہ بنے

دقتاً فوقتاً اردو ادب کی جو کتابیں نظر سے گذری ہیں۔ ان سے تو بھی اندازہ ہوتا ہے کہ آج سے چند سال پہلے آپ کا اردو ادب فرسودہ اور تقلیدی عناصر سے بڑی طرح الجھا ہوا تھا۔ جس میں زندگی کے خدو خال نمایاں تھے۔ نہ ان صلاحیتوں کی ترجمانی جو تخیل کی آغوش میں نہیں۔ واقعات کی دنیا میں پرورش پاتی ہیں۔ ان میں کئی اشعار نشتر سپاں ہوں گے۔ اور کچھ مصرعے دھڑکتے دل۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس میں حیات کے نشیب و فراز زندگی کی معززش و استقامت اور انسانی منزل کی امید افزا کرتیں نہیں بھڑکتیں۔

جوں جوں زندگی کے تقاضے بدلتے گئے۔ ہمارے یہاں اکثر ادیبوں نے راہ گریز چھوڑ کر زندگی کو اپنا یا۔ انہوں نے نرم و نازک زبان کے ذریعے ملکی ادب کو یہ آرٹ کی نئی قدروں سے دو چار کر دیا۔ حالانکہ پاکستان میں جس زمانے کے سائے میں اردو ادب کی نشوونما ہوئی۔ تاریخی اور سیاسی اعتبار سے ایک ایسے امتلا کا زمانہ ہے۔ جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں مشکل ہمارے مل سکتی ہے۔

رُومانیّت کا دور گزر چکا - اب اُردو ادب زندگی کے تلخ
حقائق اور شعوری محرکات کا ادراک رکھتا ہے - وہ انسانی
عظمت اور انسانی کارناموں کے اظہار سے مملو ہے اور یہ
ایک حقیقت ہے کہ دُنیا میں صحت مند ادب جب تک زندہ ہے
گا - اس کا اہم ترین موضوع انسان ہی ہوگا -

سماجی زندگی میں ادیب کی حیثیت سنگِ میل کی سی ہوتی
ہے - معاشرہ کی سر بلندی اور انسانی بہبود کے لئے افکار و
تاثرات کو دوسرے افراد کی نسبت انسانی جذبات میں زیادہ
آلہ کار ہونا چاہیے - دورِ حاضر کے جن ادیبوں نے اُردو
ادب میں زندگی کو اپنا یا ہے - ملک کے دانش اور عوام ان کی
خدمات سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے -

ہم نہ رُوس کے ہنگامی ادب کی استوار کردہ عمارتوں کو مٹا
دینا چاہتے ہیں اور نہ ایسے ادیب کی پشت پناہی کر سکتے ہیں - جو
انسانی خدمت کے لئے زیادہ آلہ کار نہ ہو -

کاش میرے پاس وقت ہوتا اور میں زیادہ کچھ آپ کو بتا
سکتا لیکن عذیم الفرستی کے ہاتھوں مجبور ہوں - خاکسار

بخاری

بیگم آمنہ مجید ملک کے نام

نیویارک

۱۵ ستمبر ۱۹۵۱ء

عزیز بہن!

وہ جسے فراغ کہتے ہیں - نہ معلوم وہ دنیا سے اٹھ گیا - یادوں
پر تکان چھا گئی - یا بڑھاپے نے سب کو آن لیا - بہر حال کچھ نہ کچھ

انقلاب ضرور آگیا ہے۔ دفتری خط اور تار و صڑا دھڑا آتے۔ کسی دوست کا خط نہیں آتا۔ حال میں ریاض احمد صاحب (ریڈیو انجنیر) آئے تو ان کی زبانی معلوم ہوا۔ کہ مجید صاحب بہت عرصہ صاحب فرانس رہے۔ زمانے کا رنگ بدل نہ گیا ہوتا۔ تو میں اتنا عرصہ ایک عزیز دوست کی علالت سے بے خبر نہ رہتا۔ آپ ہی مجھے لکھ بیعتیں کہ مجید صاحب بیمار ہیں۔ دُعا کیجئے۔ گناہ گار کی دُعا پر آپ تو کیا تمکبہ کرتیں۔ لیکن دوستوں، بھائیوں اور عقیدت مندوں کو اپنے دکھ میں شریک کرنے کا بہانہ ہوتا۔ کچھ عرصہ ہوا۔ ایک

شنا ساسے سرسری سنا تھا۔ کہ مجید صاحب کو دل کی تکلیف ہے۔ میں نے سن کر حسب معمول مہنسی میں اڑا دیا۔ ان کا یہ وہم یا ران سرپل کے حلقہ میں مدت سے ایک لطیفہ بن چکا ہے۔ جنہوں نے خبر سنانی وہ کچھ تفصیل بھی نہ بتا سکے۔ لیکن جب ریاض صاحب سے مفصل حال معلوم ہوا۔ تو بہت تشویش ہوئی۔ اور میں از حد ادا کس ہو گیا۔ مجید صاحب کے کئی نقشے ذہن میں آتے ہیں اور آسکتے ہیں۔ ایک سے ایک بے ڈھنگا۔ لیکن یہ نقشہ ذہن میں نہیں آتا۔ کہ وہ بستر پر دراز ہوں۔ خدا ان کا حامی و ناصر ہو۔ اور خدا انہیں اور آپ کو ہر پریشانی سے مامون و مصنون رکھے۔ انہیں میرا بہت بہت پیار دیجئے۔ اے کاش میں ان کے پاس ہوتا۔ اور ان کا دل بہلا سکتا۔ ہو سکے تو ان کی خیریت کے متعلق دو لفظ لکھ بیجئے تاکہ مجھے کم از کم اس قدر لُجبد کا احساس نہ ہو۔ اور میں آپ کی تشویش میں آپ کا اور ان کا شریک ہو سکوں۔ میں کام کرتے کرتے تھک گیا۔ خیال تھا۔ کہ جس وقت ڈاکٹر گراہم کشمیر کی اجد سیکنے میں مصروف ہوں گے میں چپکے سے ایک

مہینہ تعطیل کا کسی گوشہٴ عافیت میں گزارنے چلا جاؤں گا۔ اور صحت کچھ رفو کروں گا۔ لیکن گراہم کے پہنچتے ہی وہ ہنگامہ برپا ہوا کہ میں کام سے ہل نہ سکا۔ اب نومبر میں پیرس پہنچنا ہے وہاں اسمبلی تین چار مہینے رہے گی۔ درمیان میں کرسمس کا وقفہ بھی ہوگا۔

لیکن نہیں معلوم کتنا طویل یا کتنا مختصر۔ نامعلوم پاکستان کب کا نصیب ہو۔ دل سخت ادا کس ہے۔

احیاب کی یاد کبھی دل سے محو نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی کوئی لطیفہ کانوں تک پہنچ جاتا ہے۔ تو طبیعت دن بھر کو رنگیں ہو جاتی ہے ورنہ اکثر یہ کیفیت رہتی ہے۔ کہ اماں میرے بھتیجا کو بھجوری کہ سا دن آیا۔

ہم نے دوست خدا کے فضل سے ایسے پائے ہیں۔ کہ کہنے میں تو ان میں ہر ایک عالم اجل اور شاعر عزا اور جانے کیا کیا ہیں۔ لیکن خط لکھنا کسی کو نہیں آتا۔ کسی زمانے میں ایسے ہی بے بس لوگوں کے لئے شاہ عالمی دروازے اور چاندنی چوک وغیرہ میں ایک کتاب "عاشقانہ خط و کتابت" کے نام سے بکا کرتی تھی۔ کئی عشق اس کتاب کی بدولت پہنچے۔ اور سرخرو ہوئے۔ وہ کتاب بھی اب نایاب ہے۔

تمہیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا

بتوں کی ہر اگر ایسی ہی خو تو کیوں کر ہو

نہ معلوم خلیفہ حکیم صاحب کا کیا حال ہے۔ اور وہ کہاں ہیں۔ میں نے امریکہ میں کئی مرتبہ ان کا ڈنکا بجایا۔ اس کی گونج ان تک بھی پہنچی ہوگی۔ لیکن ان کی جانب سے تالی تک نہ سُنائی دی۔ بیگم شاہد حامد صاحبہ (کسی قدر ادب سے ان کا نام لے رہا ہوں) کو

میرا سلام پہنچے۔ خدا کرے میرے خط پہنچنے تک آپ کی تشریحات مجید صاحب کے بارے میں دُود ہو چکی ہو۔ اور آپ اطمینان سے مجھے ان کا اور اپنا ادا اجاب و اقرار کا حال بتا سکیں۔

آپ کا خاکسار بھائی
بخاری

بیگم فیض کے نام

لندن

۲۹ اپریل ۱۹۵۸ء

پیاری ایس!

سخت تعجب ہے کہ تم میرا القاب صرف "بخاری" لکھتے ہو۔ نہ مسٹر، نہ صاحب، نہ پروفیسر، تم عورتیں ہم مردوں کے برابر کب سے ہوئی ہیں۔ جو یہ بے تکلفی برتنے لگیں۔ بچے بڑوں کے ہمسر کب سے ہو گئے۔ کب سے ----- لیکن خیر اتنا ہی کافی ہے۔ میں ہمیشہ سے مختصر ڈانٹ کا قائل ہوں جو شفقت اور قریبے سے پلائی جائے۔ اس کا اثر زیادہ دیر پا ہوتا ہے۔ مجھے ذرا بھی شبہ نہیں کہ تم ابھی سے اپنے کئے پر نادم اور آئندہ کے لئے مؤدب اور محتاط رہنے کا عہد کر چکی ہو۔

تو پیاری ایس تمہاری خط سے بہت مسرت ہوئی۔ لاج (۱۵۵۷) سے جو خط آتے ہیں۔ ان میں اکثر تم سے قبل ملاقات کا ذکر رہتا ہے۔ کہیں تم نے میری یہ بات

۱۵ لاج۔ پرنسپل گورنمنٹ کالج کے پرنسپل کی رہائش گاہ۔ جہاں اس زمانے میں بخاری صاحب مقیم تھے۔

پتے تو نہیں باندھ لی۔ کہ میرے بعد 'یو بی' (زبیدیہ) کا خیال رکھنا۔ وہ تو یونہی اپنی تشویش کی جانب اشارہ تھا۔ اور مجھے امید ہے تم اس کی پیروی میں بہت وقت نہیں گنوار ہی ہو۔ بہر صورت اہل بخارا کے لئے تمہاری محبت کا شکر گزار ہوں۔ تمہارے گھر کو اکثر احسان مندی سے یاد کرتا ہوں۔ کہ شہر کا سب سے رفیق گوشہ وہی ہے۔

بہت اچھا ہوا کہ تم نے یاد کر لیا۔ جی چاہتا تھا کہ کہیں سے (فیض) گھرانے کی خبر آئے اور میں جانتا تھا کہ وہ خود تو کہیں لکھے گا نہیں۔ شاعر مست جو ٹھہرا، کیوں؟ کہیں سے سنا تھا۔ کہ اسے جیل بھیج رہے ہیں جہاں سادہ پانی اور نان جویں سے اس کی تواضع کریں گے۔ پھر سنا کہ اپنی بات سے پھر گئے ہیں۔ اور میزبانی کی پیشکش واپس لے لی ہے۔ ٹھیک سے کہہ نہیں سکتا۔ کہ کس بات پر زیادہ ہنسی آئی۔ اس پر کہ اسے بند کر رہے ہیں۔ یا اس پر کہ نہیں کر رہے۔ دوسری بات یہ ہی تھی کہ وہ تو راہِ حق میں کام آنا زیادہ پسند کرتا لیکن میں اور تم (کہ حرص و آند کے بننے ہیں) غالباً یہی چاہیں گے کہ وہ ہمارے پاس ہی رہے۔ اس کے بجائے کہ اسے دیکھنے کے لئے فارم پُر کرتے پھریں۔ ویسے وہ تو تمہارے پاس ہے ہی؟ میرا مطلب ہے پہلے سے زیادہ۔ اب میں جو دہان نہیں ہوں امید تو یہی ہے ادویں نہیں تو پھر؟

یہاں موسم مستقل خوشگوار ہے۔ کیو (KAW) باغ میں "گاڈینیا" میگوئیا ادویہ کے ٹگوفوں سے آگ سی گف رہی ہے۔ لیکن یہاں کے لئے تمہارا دل بہت ترسنے لگے تو یہ بھی سن لو کہ یہاں زندگی واقفی کٹھن ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ جن گھر والوں کی آمدنی آٹھ دس پونڈ فی ہفتہ سے زائد نہیں۔ وہ بسر کیے کرتے ہیں۔ کھانے پینے کا چیزیں کیا اب ہیں اور جو ہیں انہیں پکانے میں غلط کر دیتے ہیں۔ لوگ لا پرواہ ہو گئے ہیں۔ میرے لئے۔

سہ بیگم بخاری۔

آپ کے سامنے چیزیں یوں لاکے ٹپکتے ہیں۔ کہ میاں لوجی چاہے تو اٹھا
لو ورنہ ہوا کھا ڈ۔

آج کل لندن میں لنکا ٹھائیر (LANCHISHIRE) والوں
کا ہجوم ہے اور شاہی جوڑے کی شادی کی تقری ساگرہ کے جلوس
(ہائے کیسی پیاری گگ رہی تھی) گزشتہ ہفتے گروز سکویئر میں مسز ہنڈیٹ
اور ان کے خاوند مجھے کا قصہ تھا (مجسرا اچھا ہے) تو یونہی چلتا ہے۔
لندن شہر آج کل تھیٹر کے دن نہیں۔ لیکن پھر بھی جوں توں شکسپیر،
برنارڈشا، گوگل اور شاں رکھی کے کچھ کھیل دیکھ لئے۔ اور کچھ نہایت
ہی عمدہ اطالوی، جرمن اور فرانسیسی فلمیں کچھ کرزن میں دیکھیں۔ کچھ اکلڈی
اور سٹوڈیو وغیرہ میں۔ تمہیں تو معلوم ہے کہاں کہاں۔ اگلے دن میں
آڈن (ANDEN) میں ان کی نظیں سننے گیا تھا۔ لونی میک نیس
(MACNIEA) نے اہتمام کیا تھا۔ فیض کو سلام بھیجا ہے۔
کنگریس مارٹن سے ابھی ملاقات نہیں ہوئی۔ کل شام ایک تقریب میں ان
کا انتظار تھا۔ لیکن رہ دکھائی نہیں دیے۔ ہمارا کام ابھی شروع نہیں ہوا۔
ہندوستانی وفد ابھی نہیں پہنچا۔ تاخیر کی کوئی وجہ تو کسی نے بتائی نہیں۔ یہ
یاد رکھنے کی توقع کی جاتی ہے۔ کہ خسرو بھوٹ پڑی ہوگی۔ یا ایسی ہی معصوم
اور قدرتی دھم کوئی اور ہوگی۔ چنانچہ فی الحال آج کل متفرق کام کر رہا ہوں۔
چھپی (اچھا بھئی سلید ہی سہی) اکثر یاد آتی ہے۔ اسے میرا پیار پہنچا
دینا۔ میرا مطلب ہے واقعی پہنچا دینا۔ اور تمہارے دوسرے بچوں کو بھی یا
شاید ایک ہی بچہ ہے یاد نہیں رہتا بھئی۔ یہاں سے کوئی چھوٹی موٹی
چیز تمہیں چاہیے تو لیتا آؤں۔ کچھ ہو تو لیکھ دینا۔ محبت سے
اسے۔ ایس بخاری

اسے بخاری صاحب انڈیا آفس لاہور میں کی تقسیم کے سلسلے میں لندن گئے تھے۔

میں نے فیض کے نام

۳۔ ادا دیویرس نیویارک

۲۰۔ نومبر ۱۹۵۸ء

پیاری مینزہ

کافی عرصہ ہوا۔ تمہارا ۲۶۔ اگست کا خط ملا تھا۔ تم میری طویل خاموشی کے باعث جواب سے مایوس ہو گئی ہو۔ تو حق بجانب ہو گی۔ سبھی بات یہ ہے۔ کہ ان دنوں میری صحت اچھی نہیں رہی۔ اس کے باوجود مجھے کام بھی کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے خط و کتابت کا سلسلہ بند رہا۔ اب میں تندرست ہوں اور تمہارا خط سامنے رکھ کر جواب لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔

میں تمہیں خط اپنے دفتر سے لکھ رہا ہوں۔ جو اقوام متحدہ کے سیکرٹریٹ کی عمارت میں دسویں منزل پر واقع ہے۔ اس عمارت کی اڑتیس منزلیں ہیں۔ ایک مستطیل سا مینار ہی سمجھو۔ دُور سے دیکھو تو ایسی لگتی ہے۔ جیسے ماحس کی ڈبیا اپنے کناروں پر کھڑی ہو۔ مطلع آج اتفاقاً نہایت صاف ہے۔ سورج کی روشنی کھڑکیوں میں سے اندر آرہی ہے۔ یہ کھڑکیاں دریا کی جانب کھلتی ہیں۔ جو اُدپر سے نظر آتا ہے۔ وہ دریائے ہڈسن کی ایک شاخ ہے۔ جو یہاں سے کچھ فاصلے پر بحر اوقیانوس میں گرتا ہے۔ یہاں دریائے ایسٹ کہتے ہیں۔ اس وقت جب میں لکھ رہا ہوں۔ تو بڑی بڑی کشتیاں اورتیل کے بیڑے دریا میں تیرتے پھرتے ہیں۔ پانی دھوپ میں چمک رہا ہے اور وہ نیچے کی طرف مجھے ایک پلوں میں سے ایک پل نظر آ رہا ہے۔ جو دریائے ایسٹ پر باندھے گئے ہیں۔ اس پل کا نام ولیمز برگ ہے۔ ویسے ان سب میں مشہور پل ریکٹاٹن

ہے۔ یہ اتنا ہی مستہر ہے۔ جتنا ہڈ سن کی مغربی شاخ پر حیارے
 واشنگٹن پل ہے جس کی تصویر تم نے دیکھی ہوگی۔
 موسم سرما کی آمد آمد ہے۔ اگرچہ سردی ابھی بہت اہلی ہے۔
 نیویارک شہر میں ابھی برف نہیں پڑی۔ کہیں دسمبر کے آخر اور جنوری
 فروری میں پڑے گی۔ یہاں خزاں کا موسم سب سے دکھن ہوتا ہے۔
 امریکی لوگ اسے "FALL" گزنا کہتے ہیں۔ یہ ستمبر میں ہوتا ہے۔
 اس موسم میں درختوں کے پتے پہلے زرد اور پھر تانبے کی طرح
 سُرخ ہو جاتے ہیں۔ جنگلوں میں جیسے آگ سی لگ گئی ہو۔ جہاں
 کہیں درخت اُگے ہوتے ہیں۔ وہ جگہ بس رنگریز کا کارخانہ معلوم
 ہوتا ہے۔ جیسے اس نے پیارے پیارے رنگوں میں کپڑے رنگ
 کر سونے کے لئے پھیلا دیئے ہوں۔ بڑی سڑک کے دونوں طرف
 دور دور تک دونوں طرف قدرتی مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ سڑک
 پر گاڑی چلانے میں بڑا لطف آتا ہے اور جی چاہتا ہے۔ کہ
 گھنٹوں ان گھنے جنگلوں میں بیٹھ کر تالابوں اور جھیلوں میں پڑے
 ہوئے آئینوں کے درختوں کے عکس کا نظارہ کیا جائے۔
 اس سال بھی فصل خزاں خوب رہی۔ عام طور پر موسم خوشگوار رہا
 کئی روز تک جنگلوں میں گھوما جاسکتا ہے۔ اور سیر کی جاسکتی تھی۔
 جب تم نے مجھے خط لکھا تو تمہاری امی ولایت سے واپس
 آچکی تھیں۔ اور آیا ابھی وہیں تھے۔ اب تک تو وہ بھی لوٹ
 آئے ہوں گے۔ انہیں میرا سلام کہنا اور چھٹی کو پیار دینا۔ مجھے
 یہ بھی بتانا کہ تم نے تیرنا سیکھ لیا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو اس
 کی مشق کرتی رہو۔ یہ ایک ایسی تفریح ہے جو حاصل نہ کی
 جائے تو زندگی میں ایک خلا سا محسوس ہوتا ہے۔ تمہارا ہنڈ
 کھیا تو خوب چپتا ہوگا۔ جب جی چاہے مجھے خط لکھنا
 تمہارا پیارا
 اے۔ ایس۔ بخار